افسانے
ہی
افسانے
نقوش
گولڈن جوبلی نمبر
پچاس سالہ انتخاب

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

گولڈن جوبلی نمبر

حصہ دوم

شمارہ ۱۴۸

۲۰۰۵ء

بانی: محمد طفیل

مدیر: جاوید طفیل

خط و کتابت کا پتا

نقوش * اُردو بازار * لاہور فون: ۷۲۲۶۵۱۶۔۷۳۵۳۵۲۵
۷۳۱۱۲۹۱
فیکس: ۷۲۲۹۳۸۹۔۴۲۔۹۲

ای میل: nuqoosh@wol.net.pk
nuqoosh586@yahoo.com

قیمت جلد اوّل، دوم۔ ۲۰۰۱ روپے

جاوید طفیل نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

تیرا میرا تاج محل

ستیش بترا

اگر میں کہوں کہ مجھے اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے تو وہ ایک عام سی بات ہو کر رہ جائے گی۔ دراصل اس کمر توڑ مہنگائی کے دنوں میں خوبصورت الفاظ اور استعارے بھی تو نہیں ملتے جو ایک سپاٹ اور بے رس زندگی میں تھوڑی سی دیر کے لیے ہی سہی دھنک کے رنگ بکھیر سکیں۔ ساری زندگی ہی ایسی رنگ برنگ تتلیوں کا پیچھا کرتے بیت جاتی ہے۔ لیکن یہ تتلی کبھی کبھار مشکل سے ہاتھ لگتی ہے اور کبھی تو وہ بھی نہیں!

ایسی ہی تتلی کا پیچھا کرتے ہوئے، شادی کے کچھ دنوں بعد ہی، میں سوشیما کو تاج دکھانے لے گیا تھا۔ پونم کی بکھری چاندنی میں سفید دودھیا تاج محل، ہوا کی دوش پر اڑتا سا دکھائی دیتا تھا۔ دور دور سے آئے ہوئے سیاحوں کی بھیڑ سے الگ، باغ کے ایک کونے میں بنچ پر بیٹھے ہم لوگ اس نظارے کو روح میں اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سوشیما کا سر میرے سینے سے لگا تھا۔ اور اس کی غلافی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ اس کی سحر انگیز آنکھوں میں ایک پیار اور خود سپردگی کا جذبہ جھلک رہا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی لڑکی جب اس طرح دیکھتی ہے تو کسی بھی مرد کا دل قابو میں رکھنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ابدی محبت کی قسم کھائی اور ایک دوسرے کی مہکتی سانسوں میں اس ناپائیدار زندگی میں جنت کا لطف اٹھایا۔ میں نے سوشیما کی دہکتی ہوئی آنکھوں میں عورت کے ازلی سوال کو بھی محسوس کیا۔ کیا تم میرے لیے بھی کوئی ایسا یادگار تاج محل بنا سکو گے؟ کیوں نہیں! میرا پیار کسی شاہجہان سے کم ہے کیا! میں نے دل ہی دل میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر نہایت ہی گرمجوشی سے اسے اپنے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

جوانی کے دنوں میں تو ویسے ہی عورت کا پیار عقاب کے پروں پر سوار مرد کو اونچائیوں میں اڑا کر لے جاتا ہے ایسے میں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے۔ لیکن فرصت کے لمحوں میں ٹھنڈے دل سے سوچنے پر یہ سوال گہرائیوں میں سے سر ابھارتا ہے۔ کہ آخر جلد بازی میں کیا گیا تاج کا جذباتی وعدہ کیسے اور کس طرح سے نبھانا ممکن ہو سکتا ہے۔

شروع شروع میں اس اٹوٹ پیار کے ناطے سوشیما کے لیے میں کبھی کبھار بیش قیمت تحفے لانے کی کوشش کرتا رہتا۔ کانجی پور، بنگلور اور بنارس کی ریشمی ساڑھیاں، حیدر آباد کے موتیوں کے دل لبھانے والے ہار، پنجاب کا نکین جالی دار کام جو تن

محل کے سنگِ مرمر کی جالیوں کو بھی شرما دیتا ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب تحفے میری مالی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہوتے اور سوشیما ایک مسکراہٹ کے ساتھ انہیں قبول بھی کر لیتی لیکن نہ جانے مجھے کیوں احساس ستاتا رہتا کہ سوشیما ان سے بھی زیادہ کسی بیش قیمت تحفے کی مجھ سے امید رکھتی تھی۔

سوشیما ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ کم سے کم میری سطح سے کہیں اونچا۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں اس کے والد کے کاروبار میں ایک ادنیٰ سا ملازم تھا۔ کچھ میری لگن، کچھ اس پروردگار کی رحمت میں نے اپنے تئیں تعلیم حاصل کی اور خود کو اس قابل بنایا کہ میں آج ایک ترقی پذیر کاروباری کمپنی کا ذمہ دار افسر بن سکوں۔ سوشیما خوبصورت، پڑھی لکھی لڑکی تھی اور ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ شاید سوشیما کی وجہ سے ہی مجھ میں اتنی ہمت اور خود اعتمادی پیدا ہوئی کہ میں زندگی میں اپنے لیے کوئی جگہ بنا پایا ہوں۔ اس نے مجھے سیڑھی بہ سیڑھی، قدم بہ قدم اوپر جاتے دیکھا ہے، میرے پاؤں جب کبھی ڈگمگائے۔ میں نے اس کے ہاتھ سہارا دیتے منتظر پائے۔ اس نے قدم قدم پر میری ہمت بڑھائی۔ ایک حادثے میں اس کے والدین کی موت ہوگئی تو میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔

سوشیما میرے مالی حالات سے بخوبی واقف ہے، اسے معلوم ہے کہ تاج محل تو کیا، میرے لیے ایک سنگِ مرمر کی سادھی تک بنوانا مشکل ہوگا، لیکن حسین سپنے تو کسی کی جاگیر نہیں۔ ان سے کوئی بہلنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ دراصل یہ سپنے ہی تو ہیں، جو ہمارے آدرش بن جاتے ہیں، ہم ان کی کھوج میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اور اچنبھا تو اس بات کا ہے کہ یہ سپنے کبھی کبھی سچ بھی ثابت ہو جاتے ہیں، میں اپنی بیتی زندگی پر نگاہ دوڑاتا ہوں، تو میری تمام تگ و دو ایک خواب کو سچ ڈھالنے کی کوشش ہی تو ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے ہر کسی کو ایک خواب کی ضرورت رہتی ہے۔

پھر ہمارے آنگن میں ایک پھول کھلا۔ آشیش ہمارا بیٹا۔ اس نے کھلونے میں ہم دونوں کھو گئے۔ بچے کے ساتھ ساتھ زندگی کی ضرورتوں میں اضافہ ہوا۔ محدود آمدنی اور بڑھتے خرچ، آنکھ مچولی کھیلنے لگے اور اس پس منظر میں سوشیما کے تاج محل کی فرمائش کا سپنا دھندلا ہوتا چلا گیا۔

آشیش کے پالنے پوسنے میں کئی رکاوٹیں آئیں جس میں گھر کی مالی حالت ہمیشہ سدِ راہ رہی۔ ہم دونوں چاہتے تھے کہ آشیش میں اچھی عادتوں کی داغ بیل ڈالی جائے۔ اسے اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی۔ اچھے سے اچھے سکول میں پڑھوایا اپنی ضرورتوں پر فوقیت دی۔

وہ دو ایک بار بہت بیمار ہوا، تو سوشیما اور میں نے ان گنت راتیں آنکھوں میں کاٹ دیں۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کا علاج کیا، منتیں مانیں۔ خدا سے دعائیں کیں۔ اس رب عالمین کا شکر ہے کہ اس نے ہماری سن لی۔

آشیش نے سکول ختم کر کے کالج میں داخلہ لیا، تو اخراجات اور بھی بڑھ گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری آمدنی میں بھی خاصہ اضافہ ہوا، لیکن ضرورتوں اور مہنگائی کا پلڑا سدا ہی بھاری رہا۔ ہماری چادر کبھی بھی ضرورتوں کو نہ ڈھانپ سکی۔ اگر

اسے سر کی طرف کھینچے تو پاؤں ننگے رہ گئے اور پاؤں ڈھانپنے چاہے تو سر سے چادر کھسک گئی۔

اس جدوجہد میں سوشیما کا جسم اور چہرہ سوکھ کر رہ گئے۔ وقت کے تھپیڑوں نے ہماری تمام طاقت چوس لی۔ لیکن ہم دونوں کے دلوں میں ابھی تک محبت کا دیا روشن تھا۔ میں جب بھی سوشیما کی طرف دیکھتا تو مجھے لگتا جیسے اس میں تاج محل کی حرص ابھی تک زندہ ہو۔

آشیش پڑھائی ختم کرنے کے بعد زندگی کی جدوجہد میں کود پڑا۔ اس نے نوکریوں کے لیے کئی مقابلوں میں شرکت کی۔ کئی جگہ درخواستیں دیں۔ وہ ہمیشہ اپنے اچھے نمبروں اور قابلیت کی بنا پر انٹرویو کے لیے بلایا جاتا۔ لیکن انٹرویو اور نوکری ملنے کی کھائی اکثر پاٹنا مشکل ہو جاتی۔ سفارش کے دور میں قابلیت کو کون پوچھتا ہے! وہ ہمت ہارنے لگتا تو ہم اسے دلاسا دیتے۔

ایک شام جب ہم چائے پی رہے تھے۔ آشیش کی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگنے کی آواز آئی وہ برآمدے میں داخل ہوتے ہی چلا اٹھا۔ پاپا! ممی! مجھے نوکری مل گئی! بارہ سو روپے ماہوار! وہ ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ اسے اس طرح خوشی سے پھولا نہ سماتے ہوئے ہم دونوں بھی مسکرا اٹھے۔ آج کئی مہینوں بعد ہم نے آشیش کے چہرے پر خوشی لہراتے دیکھی تھی۔ سوشیما نے اٹھ کر اس کی بلائیں لیں منہ میٹھا کروایا مجھے ایک بار پھر وہ جوانی کے دنوں کی گمشدہ سوشیما نظر آ گئی تھی جسے میں ایک لمبے عرصے سے کھوج رہا تھا۔

"آشیش بیٹے چائے پی لو" سوشیما نے نہایت پیار سے چائے کا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

نہیں ممی ۔ میں ابھی آیا ۔ ذرا دوستوں سے مل آؤں" اور پھر وہ اسی تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

سوشیما اور میں بخوبی جانتے تھے وہ کسے ملنے جا رہا تھا۔ وہ یہ خوش خبری مونیکا کو سنانے جا رہا تھا۔ وہی مونیکا جو اس کے دوست کی بہن تھی اور جسے آشیش بہت چاہتا تھا۔

سوشیما اپنی کرسی سے اٹھ کر بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ جہاں سے تیز تیز قدم لیتا آشیش صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں بھی سوشیما کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ہم دونوں اسے فخریہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوشیما کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "سوشی! وہ دیکھ تم نے! تیرا میرا تاج محل!"

سوشیما نے ایک لمحہ میری طرف دیکھا اور پھر نہ جانے کہاں سے دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر کانپنے لگے۔ کہتے ہیں تاج محل شاہجہان کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو ہے لیکن سوشیما کی آنکھوں سے رستے ہوئے یہ آنسو شاہ جہاں کے اس آنسو پر کہیں بھاری تھے۔

بابو گوپی ناتھ

(’’چغد‘‘ میں سے)

سعادت حسن منٹو

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ ’’منٹو صاحب، بابو گوپی ناتھ سے ملیے‘‘۔

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے۔ ’’بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے، لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب، مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ، ہے اینٹی کی پینٹی پو؟‘‘

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی، دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جنہیں وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ ’’آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے‘‘۔

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا ’’نمبر ون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجیے کہ بڑے اینٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے‘‘۔

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا۔ ’’ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب‘‘۔ پھر سینڈو سے پوچھا: ’’کیوں سینڈو کیا آپ بھی اس کا شغل کرتے ہیں‘‘۔

عبدالرحیم سینڈو نے مسرت سے تبسم کیا: "بابو ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پیچی ترک کر دی ہے، اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھ دیا۔ جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش، پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا۔ "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو۔ پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں، کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی امید نہ تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔۔۔"

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان۔ کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا: "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کوششیں عمل میں لائی گئیں اس کو پھانسنے کے لئے مگر اس نے کہا ذر اور زن۔ میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیے میں پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیری کبوتری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں، مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الہڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے۔۔۔ دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا: "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: "جناب یہ ہے ٹیٹ بٹ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم۔۔۔ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے، مگر ویسے بڑی سٹ فورٹیٹ قسم کی عورت ہے"۔

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا "بکواس نہ کر"۔ اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے تعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے۔ میں نے کہا: "چھوڑو یار، آؤ کچھ باتیں کریں"۔

سینڈو چلایا "بوائے وسکی اینڈ سوڈا۔۔۔ بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا، اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا "او گوڈ۔۔۔ او میرے رب العالمین۔۔۔ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا۔۔۔ جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ"۔

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے۔۔۔ جیو بابو گوپی ناتھ جیو"۔

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ"؟

وہ چونک پڑا "جی میں۔۔۔ میں۔۔۔ کچھ نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔۔۔ اور ہمیں کیا سوچ ہوگی"۔

سینڈو نے کہا۔ "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب، بڑے خانہ خراب ہیں۔۔۔ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کٹی نوٹی نہ رہ چکی ہو"۔

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔ "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب"۔

اسکے بعد واہیات گفتگو شروع ہوگئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نتھ تھی، کون کس کی نوچی تھی، نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ، یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا، مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت، بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پیئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی؟ اس کا پتہ مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا ''منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے''؟

میں نے سوچا کیا کہوں، زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: ''بڑا نیک خیال ہے''۔

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ ''منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا، جانِ من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ ... کیا کروں گی مکان لے کر، میرا کون ہے ... منٹو صاحب موٹر کتنے میں آ جائے گی''؟

میں نے کہا: ''مجھے معلوم نہیں''۔

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا: ''کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب ... آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو کل چلئے میرے ساتھ، زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیئے''۔

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ... لیکن آپ مجھے بتائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا'' مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا ... بہت گنہگار آدمی ہوں ... وسکی منگاؤں آپ کے لئے

اور . . .

میں نے کہا ”نہیں نہیں . . . بہت ہی اچھے ہیں“

وہ اور زیادہ جذباتی ہوگیا ”اور جب منٹو صاحب . . .“ یہ کہہ کر جیب سے روپوں کا پلندہ نکالا اور ایک نوٹ الگ کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیے ”سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟“

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہوگئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا ”منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا . . .“

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لیے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا ”جلدی کھانا لے آؤ۔“

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ”منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ . . . وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں، لیکن میں انہیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا الو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہوگئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے، لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں، کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔“

میں نے اس سے پوچھا ”رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟“

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا ”اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟“

میں نے ایک اور سوال کیا ”آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟“

اس نے جواب دیا ”بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی سر ہ

ہلاتا رہوں۔۔۔ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی اور پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا، لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لئے اس نے فلیٹ موٹر خریدی، یاد نہیں رہا، لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لنگڑا ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی۔ لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے نخرے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا تھا جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا، عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا، نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، بذلہ سنج طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاج کی جھلک ہو، بہت ہی جاذب نظر تھی، وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے یہ حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتاً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔ جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق

نے مجھے دیکھا اور کہا: "او بسم اللہ، بسم اللہ، کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا "تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں بحرِ ن تحتہ"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر پچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے جیسے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو، سادہ لوح، صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو اس میں بھونڈا پن تھا اس کے علاوہ۔۔۔ کچھ یوں ہے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سندو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آیئے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اسکی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک رائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گرو رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اسکی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو۔ جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں، کل مجھے بھکاری ہونا ہے، تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جانے والی طوائفیں ایکٹرسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس

کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہوگی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے، کوئی اچھا آدمی تلاش کرلو۔۔۔ منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، کسی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپے جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی۔۔۔ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے، سردار سے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے، لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سیندو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق"۔

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے۔۔۔ کیوں زینو جانی۔۔۔ پسند ہے تمہیں"۔

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل بات نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹرس بنانے کے لئے اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا۔ "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھیے۔ لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں"۔

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے، مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اسے تلاش کیا، لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا

لگتے ہیں اور زیوروں سے بھی لدی پھندی۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے بلکہ افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔۔۔ ایسی عورتوں سے جو بیویاں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت سے سردار نے ہاتھ ملایا اور حیدرآباد سندھ کا ایک زمیندار آ گیا۔ پندرہ دنوں میں مٹھوں سے کئی کلیں پرزوں پھوٹے۔ بعد میں اس نے شادی کی باتیں کیں۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے کہا کہ حالات امید افزا ہیں، کیونکہ اس مل سے پہلے وہ کئی مل کا مالک تھا۔ زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہاربنی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں"۔

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی۔۔۔ اچھی لڑکی ہے یار"۔ یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران یٰسین نے زینت کو چھ بہت عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں اور یٰسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے۔۔۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے یٰسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یٰسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں، بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے، اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی میاں اگر تم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو۔۔۔ میں کیا کروں منٹو صاحب، بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے"

یٰسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور روزانہ تیس آدمی پھانس کر لاتے تھے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا: ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

اس نے بڑے الھڑ پن سے کہا ''مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جان، یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، مان لیتی ہوں''

جی چاہتا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے حس تھی۔ بے عقل اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے، حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔

بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا، ''سینڈو''۔

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا ''دھڑن تختہ''

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا ''آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو'' لیکن سینڈو نے کہا ''ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجئے، مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں''۔

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا۔ دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے کہا ''واپس لے چلو''

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا ''منٹو صاحب، زینت کی شادی ہونے والی ہے''

میں نے حیرت سے پوچھا ''کس سے؟''

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا ''حیدرآباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے وہ وہاں خوش رہے۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینت کا جہیز بن جائے گا۔۔۔ کیوں کیا خیال ہے

آپ کا"؟

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدرآباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں، لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ حقیقتاً حیدرآباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدرآباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدرآباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہوگئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دونی ہوگئی۔ مجھ سے اس نے کہا "منٹو صاحب خوبصورت جوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔۔۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخشؒ کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں"۔

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیے اور پانچ ہزار نقد دیے۔

محمد شفیق طوسی، محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو میوزک ٹیچر، میں اور بابو گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا۔ "دھڑن تختہ"۔

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا۔ "منٹو صاحب ذرا اندر جائیے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے"؟

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی۔۔۔ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے زینت سے کہا۔" یہ کیا مسخرہ پن

ہے''۔

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ ''آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان''۔ اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب میں سمجھتا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں۔۔۔ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا''۔

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا ''خدا تمہیں خوش رکھے''۔

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی۔۔۔ بہت ہی دکھ بھری ملامت۔۔۔ اور وہ چلا گیا۔

پھن پھول

ڈاکٹر سلیم اختر

تب دیوتا انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ اس نے تیسری آنکھ کھولی، جو کرن بن کر سنسار کو اجالے سے دھو گئی، دور
بہت اونچے پربت کی چوٹی نے برف کا گھونگھٹ سرکایا تو دھوپ نے چہرے پر گلال مل دیا۔ دھوپ سے روشنی اور روشنی سے ذرات،
دھرتی کی اس اور سے اس اور تک پھیل گئے یوں کہ پاتال بھی روشنی سے بھر گیا۔ لہروں نے جگ جگ کا آنچل ... میں
روشنی کے سات رنگوں کے تال میل سے نیا رنگ چمک رہا تھا۔ گنگا نے نیلی جھیل کا رخ ... یہ رنگ سندرتا میں
انوکھا اور دھرتا میں نرالا تھا۔ جب اندر دھنش سے رنگوں کا مینہ لگایا تو گگن ... کہ دھرتی سے ... کاری کا
جواب نہ تھا۔ اس سمے کہ دھرتی رنگوں اور روشنی کا اشنان کر رہی تھی تو دیوتا کی نگاہ بھی دھرتی سے گگن تک پھیلی یوں کہ سورج
اور چاند اس کے پھیلاؤ میں گم ہوئے اور ستارے کھو گئے۔ دیوتا نے سب کو دیکھا اور شانت اور خوش ہوا۔

اس سمے کہ دھرتی آکاش اور سورج سب اپنی تکمیل کی مدھ میں ڈوبے خوشی کی ترنگ میں تھے تو دیوتا کو اپنی خوشی کا
بلبلہ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ کہیں نہ کہیں کچھ کمی رہ گئی تھی ضرور کوئی چوک ہوئی ہے یقیناً کوئی بھول ہوئی ہے۔ اس نے ڈمرو بجایا
اور تانڈو ناچ میں مصروف ہو گیا۔ آکاش اور چندرماں سے لے کر دھرتی اور پاتال تک کی مخلوق ناچ میں شریک تھی مگر آج
تانڈو ناچ کی مدھرتا رس سے خالی تھی۔ اس نے بے چینی سے سیاہ گھٹاؤں جیسی جٹاؤں میں جھٹکیں تو ان کے چھالے کی مانند گنگا
پھوٹ بہی، دھرتی نہال ہو گئی، دنیا شانت ہوئی، مگر دیوتا اشانت ہی رہا۔۔۔ کہاں چوک ہوئی، کہاں بھولا؟ اور اس سے بھی
بڑھ کر یہ کہ اگر بھولا تو کیوں؟ یہ چوک کیسے ہوئی۔ دیوتا سے غلطی؟ اگر دیوتا غلطی کرنے لگے تو دنیا کا کیا بنے گا۔۔ منش کیا کرے
گا؟

دیوتا نے بے کل ہو کر سوم رس کے کئی پیالے پئے، مگر آج تو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے سوم رس کی جگہ گرم پانی پی لیا
ہو۔ بدمزہ اور باؤلا پانی، اسی لئے سوم رس پینے کے باوجود ہردے کا کنول نہ کھلا۔ من مرجھایا اور مست شریر میں تانڈو ناچ کے
لئے جیسے جان ہی نہ ہو۔ اس نے اپنی آتما کے نصف حصہ کو من پسند روپ دیا اس کے ساتھ سوگ کیا، مگر شریر شانتی کے سروور میں
جل پنچھی بن کر نہ اڑا بلکہ اشانتی کے گہرے پانیوں میں پتھر کی طرح گرتا چلا گیا تو اب کیا کرے؟ منش نے بعد کرنے کو کیا رہ
گیا؟

وہ اسی چنتا اور دبدھا میں بیاکل تھا کہ ایک تک پسلی پھڑکی۔ ۔ ۔ ہیں "یہ کیا؟ پسلی پھر پھڑکی، اس کی تو کبھی آنکھ پھڑکی تھی تو یہ پسلی کیسے پھڑک اٹھی' اور کیوں' سب سے بڑا سوال اس کیوں کا تھا، 'یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے' کہیں یہ تو نہیں کہ اس کی شکتی چھنی جا رہی ہے یہ سوچ کر وہ ہراساں ہو گیا۔ اگر واقعی شکتی چھین لی گئی اور اسے محض پرش بنا دیا گیا تو وہ کیسے زندہ رہ سکے گا۔ ضرورت پڑے پر دیوتا مانش تو بن سکتا ہے مگر مانش نہیں۔

وہ اسی چنتا میں تھا کہ پسلی پھر زور سے پھڑکی یوں کہ باہر آ گری، ہائیں یہ کیا" یہ پسلی کیسے ٹوٹ گئی تو کیا کوئی اس سے بھی بڑا دیوتا اب اس پر چھا گیا ہے جو یوں انگ انگ ادھیڑ رہا ہے؟ ——— مگر نہیں یہ پسلی نہیں تھی بلکہ ایک نئی جاندار چیز تھی گو وہ پسلی جیسی ہی ٹیڑھی تھی مگر پسلی نہ تھی۔ اس نے جھک کر اسے دیکھا کھال پر اندردھنش کے رنگ، کنول نینوں میں تولی سرخی اور وہ شاخ زباں ۔ ۔ ۔ دیوتا نے ایسا وجود نہ دیکھا تھا وہ حیرت زدہ دیکھتا رہا، کیا یہ اس کی آتما کا شریر ہے؟ مگر اس سوال سے بھی بڑا سوال اسے پریشان کر رہا تھا وہ اس کا پتا ہے یا ماں۔ کس جوگ کے کارن اس نے جنم لیا۔ یہ کس منتھن کا پھل ہے؟

آج دیوتا کی پریشانی کا دن تھا۔ ایسے کٹھن سوالات کہ درست جواب کی تلاش میں یگ بیت جائیں، یقیناً جنم ہونے والا تھا جو اسے ایسے سوالوں کے جنجال میں ڈال گیا ہے۔

تب اس نے اپنی تیسری آنکھ سے اسے دیکھا مگر پھر بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔ یہ من موہن سندرتا اس جگ کی تو نہ تھی کیا یہ اندر سے بھاگی ہوئی اپسرا ہے' مگر نہیں یہ کسی اور یگ کی باسی تھی۔ جو غلطی سے اس جگ میں آ گئی مگر یہ تو اس کی پسلی سے نکلی ہوئی ہے اگر میں نے ہی اسے جنم دیا تو کیسے؟ میں پتا یا ماتا مگر ایک بات تھی کہ اس من موہنی صورت کو دیکھ کر اس کی اشانتی اور دبدھا ختم ہو گئی تھی۔ شریر جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا اور رس مور ناچنے کو تیار، وہ کول اور سرخی کی مدھرتا میں ڈوبی آنکھیں اس کی آنکھوں سے گویا منتھن کر رہی تھیں، اس کا ہردہ ہنڈولے لے رہا تھا۔ فضا کی خاموشیوں میں ایسے سازی آواز گونجی جسے آج تک کسی نے نہ سنا تھا۔ عجب تال تھی اور عجب گت یہ آواز شریر کو ساگر بنا کر اس میں عجب جوار ابھار رہی تھی گویا شریر کا ساگر متھا جا رہا ہو۔

اس نے ڈمرا اٹھا کر تانڈو ناچ شروع کیا تو سنگت کو دھرتی گگن اور چندرما بھی تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ نین کٹوروں میں مدھر رس لئے وہ بھی ناچ کی ساتھی تھی۔ وہ اپنے پورے قد سے کھڑی تھی وہ جو پسلی نظر آتی تھی اب دیوتا سمان تھی، وہ کیا تھی اندردھنش تھی رنگوں کا میلہ تھی، رس کا جوار بھاٹا تھی۔ سوم رس کی گاگر تھی۔ مدھرتا کا ساگر تھی اور شانتی کی گھنگھور گھٹا تھی۔ دونوں کے نین ایک دوسرے کا درپن تھے۔ دیوتا کی بڑی بڑی آنکھوں میں روشنی کی گھٹا اتر آئی تھی جبکہ اس کی کول آنکھوں سے عجب جادوئی لہریں خارج ہو رہی ہیں ایسی لہریں جو اس کی آتما اور شریر کے گرد جال بنتی جا رہی تھیں اب آنکھیں خون بھرے کٹورے تھیں ان میں مقناطیسی لہروں کا جوار بھاٹا تھا۔ ان میں بھنور تھے بھنور میں بھنور، وہ ان میں ڈوبا جا رہا تھا، ڈوبتا جا رہا تھا، مگر یہ ڈوبنا جا رہا تھا کیا آنند تھا۔ اور اچانک اسے احساس ہوا کہ اب وہ اسے نہیں نچا رہا بلکہ وہ اسے نچا رہی ہے ڈمرا اس کے ہاتھ میں تھا۔ مگر گت اس کی نہ تھی۔ مقناطیسی لہروں کا جال تنگ ہوتا جا رہا تھا بلکہ اب تو وہ خود بھی اس جال کو دیکھ رہا تھا جس میں شریر اور آتما دو مچھلیوں کی مانند پھنستی نظر آئیں، پہلے دونوں کے منہ مخالف سمت میں تھے مگر پھر وہ آہستہ

آہستہ جیسے کسی غیر مرئی دائرہ میں گھومنے لگیں تب ان کی قوس مل کر ایک ہو گئی اور انہوں نے دائرہ کی صورت اختیار کر لی
۔۔۔منڈل،،

تانڈو ناچ اب منڈل ناچ میں تبدیل ہو چکا تھا،

دونوں ناچ کئے، ندی تھک گئی، دھرتی تھک گئی، گگن تھک گیا۔ سورج چاند اور ستارے تھک گئے، مگر وہ نہ تھکے، وہ مر پچار ہا آتما کی جوالا نے شریر کو جوالا مکھی بنا دیا۔ تن من شعلوں میں تبدیل ہو گئے۔ اب وہ تیار تھا متھن کے لئے، اس متھن کا پھل آکاش اور پرکاش بیچ ایک میں ایک ہو گا۔ اس نے رک کر اسے، پنی باہوں میں لے لیا اور مین مدھرتا سے سندر پل میں دو شاخہ زبان بجلی بن کر دیوتا پر گری۔۔۔۔۔۔ یہ عجب ٹیس اور نرالی پیڑا تھی آج تک دیوتا پیڑا کے ڈنک اور اس کی مستی سے ناواقف تھا اس لئے اس ٹیس میں سوم رس کی ہزاروں گاگروں کا مزا تھا۔ وہ گر گیا، دیوتا گر گیا، پپوٹے بھاری ہو کر دانتوں آنکھوں پر گرتے جا رہے تھے، ٹیس کے جوار بھاٹا پر شریر چن بیتوار کی نیا بنا تھا۔ اس نے پوری آتما شکتی سے کام لے کر بند ہوتی تیسری آنکھ کو کھولنا چاہا مگر پھر سوچا کیا فائدہ، پیڑا کی مٹھاس انجانی سہی مگر آتما راس تھی۔۔۔ جب تیسری آنکھ پر کبھی نہ اٹھنے کو پپوٹے گرے تو دیوتا کی سوچ یہ تھی۔ یہ اگر موت ہے تو بری نہیں کہ اس کا آنند نرالا ہے۔

(۲)

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا، منظر چاندنی کی دودھیا چادر اوڑھے سو رہا تھا، درخت خاموش، پکھیرو خاموش، رات خاموش، اور ہوا بھی خاموش، صرف جھرنے کی ترل جاری تھی۔ اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا، تو آنکھوں میں طلب کے سرخ ڈورے۔ شام کی گہری ہوتی شفق کا رنگ لئے تھے۔ اگرچہ جسم پر اندر دھنش کے رنگوں کی بہا تھی مگر آنکھوں کی سرخی سب سے بڑھ کر تھی کہ من موہنی تھی ۔۔۔۔۔۔ دو شاخہ زبان لہرائی، وہ اب پورے قد پر کھڑی تھی۔ اس خاموش منظر کی رانی، اور رانی بن کر ہی اس نے ارد گرد دیکھا مگر سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ منظر پر خاموش رات کا پہرہ تھا اور یوں لگتا گویا چاند کے دودھ کی گاگر اب الٹنے کو ہے، اس سے کرن کا آخری قطرہ بھی گر جائے گا اور منظر پرچھائیوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔

دو شاخہ زبان لہرائی تو جی میں آئی کہ اس سے اپنے وجود کو پیار کرے، بہلائے، یوں کہ زبان کا نشہ، انگ، انگ میں اتر جائے یوں کہ متھن کی رس بھری پھوار سے نیا جنم پائے۔

وہ پھر پورے قد سے کھڑی تھی مگر بے چین، بیاکل، آتما شانت اور زبان میں انجانے ذائقوں کے لئے تڑپ۔

تب اسے اپنے سامنے رنگوں کا پنکھا کھلتا نظر آیا اور رنگوں کی گھٹاؤں میں سنہری آنکھوں کا جال تنا۔ لمبی خم دار گردن جو اس کے اپنے وجود سے مشابہت رکھتی تھی، اس کی آنکھوں میں مستی کی جو گھٹا ناچ رہی تھی، اس نے رنگ بدل کر سر پہ تاج کی صورت اختیار کر لی تھی، سندر تن، من موہنا روپ اور چال میں مدھرتا۔ وہ سب سے بے پروا اپنے رنگوں کے درپن میں اپنا نظارہ کر رہا تھا۔ جھوم رہا تھا۔

دونوں ٹھٹکے، ایک دوسرے کو دیکھا، آنکھ آنکھ کا درپن بنی۔ انگ نے انگ کی پکار سنی، انگ انگ کو سمجھ رہا تھا۔ وہ

پورے قد سے کھڑی تھی، وہ پک پک بڑھ رہا تھا۔ اور پھر مضمحل کر رہ گیا، کول آنکھوں کی سرخی اس کے خون میں عجب جوار بھاٹا پیدا کر رہی تھی، وہ اس سے خوفزدہ بھی تھی مگر وہ اس سے دور بھی نہ رہ سکتا تھا یہ کون ہے؟

یہ وہ تو نہیں سوچ رہی تھی

وہ اب بھی پورے قد سے کھڑی تھی، وہ جھجکتا جھجکتا اس کی اور بڑھا آ رہا تھا، اس نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اس کو تک رہی تھی، یہ دیکھنا نیا تھا، ان آنکھوں میں لیا تھا، اس ساگر کی لہریں ان میں سمائی تھیں کہ وہ ان میں ڈوبتا جا رہا تھا، اس کے وجود میں عجب سنسناہٹ تھی رگوں میں عجب سرسراہٹ تھی۔ پاؤں جیسے انگاروں پر ہوں اور پھر اس نے پاؤں مارنا شروع کئے۔ کبھی ایک پاؤں اٹھتا، کبھی دوسرا اور پھر جیسے اس اگنی کے شعلے سرگم میں تبدیل ہو گئے اب اس کے پاؤں سرگم کے سروں پر اٹھ رہے تھے، وجود کی پائلیں پاؤں میں گھنگھرو بن کر چھنکنے لگی تھی، پردے کی لپٹیں اسے خون کی جو بھڑکا دی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ مستی کی گھٹا میں یوں اڑا کہ اپنے وجود سے بھی نکل گیا۔

وہ اپنے پورے قد سے کھڑی تھی، وہ اس کے ارد گرد ناچ رہا تھا۔ رنگوں کا پنکھا اسے مستی کی ہوا دے رہا تھا۔ ایسی ہوا جو اس کے تن میں تو کھا جو ربھاتا پیدا کر رہی تھی۔ اس کا تن ڈولنے لگا، انگ ہلکورے لینے لگا اور شریر گھومنے لگا۔ دونوں آمنے سامنے تھے، درپن کے سامنے درپن، وہ اس کی گردن سے لپٹ گئی اور اب وہ دونوں ناچ رہے تھے۔ دونوں ایک ہی اگنی کے شعلوں کے سر میں تبدیل ہو گئے۔ وہ یوں مست ہو کر ناچا کہ خاموش رات کی سانسوں کے سر جاگے، نیند میں ڈوبی کرن کلیاں پھول بن کر مہکیں اور رات کے بوجھل پل میں بجھتے دیپ جیسے ستارے لودے اٹھے۔

وہ دونوں اپنی اپنی مستی کی آگ میں جلتے ناچے جا رہے تھے اس کے وجود کے انگارے دھک اٹھے تب شعلوں کی زبان نے ان کے انگ انگ کو پیار سے سہلایا، رنگوں کا پنکھا شعلوں کے پنکھے میں تبدیل ہو گیا، ادھر اس نے شعلے کی زبان یوں منہ میں لے لی کہ دو شاخہ زبان اور شعلے کی زبان ایک ہو گئیں

وہ اس کی گردن سے لپٹی تھی جسم کا باقی حصہ رنگوں کے پنکھے کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ جسم کا دائرہ بنتا ٹوٹتا، اور پھر جڑتا آنکھوں میں رات اتر آئی تھی، جسم میں سمندر نے بسیرا لے لیا تھا اور ہر وہ اگن کنڈ بن گیا تھا۔ وہ دونوں لپٹے ایک ہو گئے اور تب عین اس لمحہ کہ مقصد سے منڈل کے دائرے نے مکمل ہونا تھا۔ اس نے اس کی گردن چھوڑے بغیر پاؤں کو یوں جکڑ لیا کہ وہ ساکت ہو گیا تب دو شاخہ زبان بجلی بن کر اس کے تاج، اس کی آنکھوں، اس کے منہ اور اس کی گردن پر گری یوں کہ رنگوں کا پنکھا صرف چتر بن کر رہ گیا۔

اس نے گردن اٹھا کر رنگوں کی بے جان مورت کو دیکھا جو اب کبھی نہ تھرکے گی۔ جس کی کوک سر نہ جگائے گی اور جس کے رنگ جنگل میں پھول نہ کھلائیں گے۔ یہ تو پہلے بھی زندہ نہ تھا، کہ صرف اپنی اگنی میں جلتا تھا، دوسرے کی آنچ سے بے خبر، یہ اپنی پیڑا کے مزہ کا رسیا تھا۔ دوسرے کے درد سے بے خبر اور اب یہ محض ایک چتر تھا، مردہ رنگوں کا چتر۔

اس کا سفر جاری رہا۔۔۔۔ وہ کہاں ہے؟

گردن اٹھا کر دیکھتی جیسے آنکھیں کھوجتی ہوں جیسے آہٹ لے رہی ہوں مگر کچھ نہیں، صرف پاؤں دبا کر چلتی ہوا

صرف جنگل کی سرگوشی، صرف آبشاروں کا زور، صرف بارش کا شور، صرف پرندوں کی آواز، صرف بھاگتے جانوروں کی دھمک اور ان سب آوازوں کی گونج۔ گونج میں گونج اور یہ سب دل کے خالی مکان میں گونجے۔

کہاں ہے وہ؟''

بے کلی نے جسم کی چلت چھین لی تھی، انگ انگ جیسے دکھ رہا ہو۔ آنکھوں کے پیالوں کی مدھر تاریکی کافی پھیل گئی جو اسے جسم سے چپکتی نچڑتی محسوس ہو رہی تھی، من کی جوالا من چاٹ رہی تھی، بے چینی دور کرنے کے لئے وہ کانٹوں بھری جھاڑی میں گھس گئی کہ چھلنی ہو کر جسم سکون پائے۔ اس کانٹوں بھری جھاڑی میں کانٹوں سے کھیلتی رہی لڑتی رہی، الجھتی رہی اور بالآخر جب باہر نکلی تو نئے رنگ میں تھی، اس کے جسم نے اندر دھنش اتار پھینکی تھی اور اب وہ اس رنگ میں تھی، جو پہلے رنگوں سے میل نہ کھاتا تھا، کہ یہ رات کے دل کا رنگ تھا۔

جب رات کے دل سے تاریکی کا آخری قطرہ بھی نچڑ گیا اور وہ نڈھال ہو کر صبح کی گود میں جا گی تو طلوع ہوتے سورج کی ٹیڑھی کرنوں نے کانٹوں کی زبان پر شبنم کے قطرہ کو نیزے کی انی میں تبدیل کر دیا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی اور کانٹے کی نوکیلی زبان پر جلتے اور رنگ بدلتے موتی کو دیکھتی رہی اندر دھنش کے سبھی رنگ اس میں چمک رہے تھے، یہ رنگوں کا میلہ تھا، کہ رنگوں کی لیلا، رنگوں کی یہ وہی جوالا تھی جس نے اس کے تن پر اندر دھنش سجائی تھی مگر من کی جوالا ان رنگوں نے کاروں سلگی تھی اور یوں سلگی کہ تن کے سبھی رنگ اس میں جل کر سیاہ ہو گئے اور پھر ان کی سیاہی اس کے تن کو اپنے رنگ میں رنگ گئی اور وہ دن سے رات بن گئی۔

رنگوں کی رنگ بدلتی جوالا آنکھوں کا منظر بدل رہی تھی دل کا موسم تبدیل کر رہی تھی اور وہ جھوم رہی تھی جھوم رہی تھی، رنگوں کی مستی سے اپنے من کی اگن اور تن کی لگن سے۔ وہ اپنے چاروں طرف موسیقی کی لہروں کا رقص محسوس کر رہی تھی۔ یہی موسیقی جس کے زیر و بم میں شعلوں کی لپک تھی تن مستی اور من اگنی ایک لے پر ناچ رہی تھیں، اور وہ بھی اس ناچ میں شریک تھی وہ اپنے پورے قد سے کھڑی ناچ رہی تھی ایسا ناچ کہ تن من اور آتما ایک ہو گئے۔ وہ ناچتی رہی، ناچتی رہی اور موسیقی آگ بنی اس کے وجود میں انگارے بھرتی گئی، ناچ کا دائرہ بنتا اور بگڑتا رہا، پھیلتا اور سکڑتا رہا تن، من، آتما، ناچ، موسیقی، رنگ اور آگ۔ یہ سب دائرہ در دائرہ تھے مگر مرکز ایک ہی رہا۔ بلکہ وہ تو خود ہی مرکز بن چکی تھی۔

جب بالآخر اس نے کانٹے کو منہ میں لیا تو پیاس شبنم سے نہیں بلکہ اپنے لہو سے بجھی۔

(۳)

گدھ اپنے لمبے لمبے پروں سے منزلیں مارتا چلا آ رہا تھا۔ بھوک کی منزلیں، پیاس کی منزلیں، آرام کی تلاش میں تکان کی منزلیں۔۔۔ اس کے نیچے صحرا کا سمندر موجیں مار رہا تھا، جھکڑ ریت کے تودوں کو ٹیلوں میں تبدیل کر رہے تھے، ٹیلوں کی ریت رقص کرتی بارش کی طرح برس رہی تھی اور ریت کی اس بارش میں بگولے خوشی سے متحرک رہے تھے جھوم رہے تھے، اپنے دائرہ میں گردش کرتے رکتے تو ذرات میں تبدیل ہو جاتے اور چلتے تو رقص کے انداز میں۔

گدھ یہ سب کچھ دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کی تجربہ کار آنکھیں ریت کے سمندر میں بدلتے مناظر کی شناسا تھیں، ریت سمندر کے جزیرے اور ان ریت جزیروں میں ریت جھیلیں وہ ان سے آگاہ ان کی اصلیت جانتا تھا اس لئے وہ کبھی بھی انسان کی مانند سراب کے آسیب کا اسیر نہ ہوا تھا اور غالباً اسی لئے انسان کی مانند وہ کبھی بھی ریت سمندر میں ڈوب کر نہیں مرا تھا۔ لیکن اب اس نے جو دیکھا وہ نظر کا دھوکا نہ تھا واقعی نیچے بستی کے آثار تھے جیسے سیاہ بادل اچانک پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے ایک ستارہ چمک اٹھتا ہے۔ اسی طرح ریت کے خشک سمندر میں ستارہ سا پانی چمک رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ کی سبز رنگت گدھ کی آنکھوں میں تراوٹ کا سرمہ لگا گئی، ذرا نیچے آیا تو اسے متحرک سایوں کی صورت میں انسان بھی نظر آ گئے، ور گھر بھی جن سے دھوئیں کی انگلیاں گویا اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

وہ اترنے کو تھا کہ بستی سے باہر مردہ گائے پر نگاہ پڑی جس کی اکڑی ٹانگیں فضا میں معلق تھیں گردن ایک طرف کو ٹیڑھی تھی، کھلی آنکھوں کا پانی ایک لکیر بناتا بہہ چکا تھا، پیٹ پھولا تھا اور نتھنوں کے راستے مکھیاں آ جا رہی تھیں۔

سڑے ہوئے گوشت سے بدبو کے اٹھتے بھبھکے اس کی تھکن دور کر رہے تھے اور اعصاب کو تقویت دے رہے تھے وہ اپنے پر پھیلائے قدم قدم اس کے گرد پھر رہا تھا، کہیں کہیں سے گل کر کھال پھٹ گئی تھی۔ اور اس میں سے گوشت باہر نکل آیا تھا، گائے کی اکڑی ٹانگوں میں اس کے تھن پھولے پھولے تھے، اور ان پر خون جما تھا، یہاں بھی مکھیوں کی بھیڑ تھی۔ گائے کے چاروں طرف سنہری چیونٹیوں اور سرخ اور سیاہ چیونٹیوں کی فوج تھی جو دیوانہ وار گائے کے سوراخوں میں داخل ہو رہی تھی۔

گدھ کو اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کھاجے کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ اس نے خوشی خوشی گائے کے اردگرد اچھلتے ہوئے دو تین چکر لگائے۔ پھر آسمان کی جانب دیکھا جہاں اور کوئی گدھ نہ تھا پھر گردن ٹیڑھی کر کے بستی کو دیکھی کوئی کوا اور کتا بھی حصہ بٹانے کو نہ تھا۔۔۔ یقیناً وہ اس دعوت کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں لذت کے احساس سے چمک رہی تھیں۔

اور تب اس نے گائے کے نرم حصے پر چونچ ماری۔ نرم کھال کو چیر کر چونچ چربی میں اترتی گئی اس کا معدہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے چونچ بھر کر نوالہ لیا تو تمام جسم میں لذیذ کپکپی کی لہر دوڑ گئی، معدہ کی آگ پر جیسے بارش کے پہلے چھینٹے پڑ گئے ایک نوالہ، دوسرا نوالہ، تیسرا نوالہ۔۔۔ اور پھر تو نوالوں کی بارش ہو گئی وہ خوشی سے پر پھڑپھڑاتا، جھوم جھوم کر گوشت میں چونچ اتارتا رہا حتیٰ کہ معدہ نے مزید قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔ یہی نہیں بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا معدہ اب کھانا ہوا باہر نکالنے پر تلا ہو، معدہ میں گوشت گویا چنگاریوں میں تبدیل ہو گیا ایسی چنگاریاں جو کوئلوں میں تبدیل ہو رہی تھیں ایسے کوئلے جنہوں نے کبھی نہ نکالی تھیں۔ اس نے پر پھڑپھڑا کر اڑنا چاہا مگر وہ اب خود کو پر نچا چوزہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ دھپ سے ریت پر گرا، کرب سے ایک دو مرتبہ پنجے کھلے اور بند ہوئے اور اس کے بعد اس کے پر ساکت ہو گئے گردن میں رسی کی طرح بل اور کھلی آنکھوں میں درد کا سمٹا ہوا صحرا۔

گدھ کی آنکھ پر اگر بھوک نے پٹی نہ باندھی ہوتی تو وہ یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ گائے کی سفید کھال نیلی ہو رہی تھی جب وہ یہ نہ دیکھ سکا تو پھر اس نے گائے کے پہلو میں ریت پر ٹیڑھی لکیر کیسے دیکھنی تھی۔؟

چیونٹیوں کی ایک قطار نے اب گدھ کا رخ کر لیا تھا۔

شام کے ڈھلتے سایوں کیساتھ ہی دو طویل ہوتے ہوئے انسانی سائے گائے اور گدھ کے مردہ جسموں کے پاس رک گئے چار آنکھیں دلچسپی سے انہیں دیکھ رہی تھیں ان میں سے ایک بوڑھا تھا سر داڑھی اور بھنوؤں کی برف میں اس کا سیاہ رنگ پسینے سے چمک اٹھا تھا، چہرہ پر وقت کی پگڈنڈیوں نے جھریوں کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ مگر اس کی چال بے آواز سے بڑھاپے کا اظہار نہ ہوتا تھا چال میں سوکوس پر دم لینے والی سانڈنی جیسی تیزی اور آواز میں کرنج، اس کے ہاتھوں پر اگرچہ نیلی رگوں کا جال تھا، مگر ان کی گرفت اب بھی مضبوط تھی اس کا ساتھی نوجوان تھا۔ اس کے چہرہ کا تانبہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اشکارے مار رہا تھا۔ سر پر سنہری بالوں کا تاج سوٹی آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں بھنورہ جیسی پتلی ایسی سیاہ کہ من جھوم اٹھے، تراشے ہوئے رس بھرے ہونٹ۔ ٹھوڑی کے گڑھے میں سیاہ تل اس کا سینہ اور اس پر گھنے بال مردانگی کی تصویر تھے، مگر اس کے جسم میں عجب لچک تھی، آواز میں عجب نرماہٹ اور انداز میں عجب کوملتا تھی

"دیکھا داتو" بوڑھے کی انگلی گائے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"ہاں بابا۔"

کیا سمجھے۔"

"اسے سانپ نے کاٹا ہے۔"

"ادھر دیکھو۔ اس نے خون آلود تھنوں کی طرف اشارہ کیا۔"

"کچھ سمجھے؟"

"سانپ نے دودھ پیا اور اس دوران اسے کاٹ لیا۔"

یقیناً بوڑھا بولا۔ عام طور سے سانپ دودھ پیتے وقت کاٹتا نہیں وہ گائے کی پچھلی دونوں ٹانگوں کو یوں جکڑ لیتا ہے کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی اور اس کے بعد وہ اطمینان سے سارا دودھ پی لیتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو گائے اس کے قابو میں نہیں آئی یا دودھ تھوڑا ہوگا۔ اس کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے جھنجھلا کر اسے ڈس لیا۔"

پھر اس نے گدھ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ "یقیناً یہ بڑا زہریلا سانپ ہوگا۔"

"سنگچور؟" داتو نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے وہی ہو۔ یہ کم بخت ایسا خطرناک ہے کہ ایک مرتبہ اگر پتھر پر زہر تھوک دے تو وہ بھی چورا ہو جائے اس لئے تو اسے سنگچور کہتے ہیں۔"

داتو ہنس کر بولا۔ "آج رات کئی گیدڑوں کی موت آنے والی ہے۔"

وہ دونوں چلنے کو تھے کہ بوڑھے کی نگاہ اس لکیر پر پڑی جو گائے کے پاس سے ہو کر گزری تھی۔ وہ رک گیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ کیا دیکھ رہے ہو بابا۔ نوجوان نے پوچھا۔

"یہ لکیر۔"

"سانپ کی ہے۔"

"ہاں ہے تو سانپ کی مگر ------"

"مگر کیا..."

"اس میں کچھ ایسی بات ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

داتو نے اب نئی دلچسپی سے لکیر کو دیکھا مگر کچھ سمجھ نہ پایا ویسے اگر بابا کہتا ہے تو پھر ٹھیک ہی کہتا ہوگا کیونکہ وہ تو لکیر سے سانپ کی نسل اور بعض اوقات تو نر اور مادہ تک کے بارے میں بتا دیتا تھا۔ "کچھ سمجھے۔" نوجوان نے انکار میں سر ہلایا تو اس نے انگلی سے اشارہ کیا

"یہ دیکھو۔"

اب وہ سمجھا۔ سانپ کی لکیر ریت پر ہوتی ہے مگر یہ لکیر ریت کے اندر تھی صرف کہیں کہیں سے باہر، گویا وہ ریت کی مچھلی ہو جو ریت کے سمندر میں تیرتی جا رہی ہو، اور کہیں کہیں پانی سے گردن باہر نکال کر جھانک لیا ہو۔

"کمال ہے۔ میں نے ایسی لکیر آج تک نہیں دیکھی۔ ریت کے اندر" حیرت اور دلچسپی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

"سانپ ہی ہو سکتا ہے۔"

"اگر سانپ ہے تو کسی نے آج تک ایسا سانپ نہیں دیکھا جو ریت کے اندر سفر کرے۔ اس نے انگلی ریت میں کھبو دی تو اندر سے مکمل دائرہ برآمد ہوا جو دور تک ریت میں چلتا گیا تھا بوڑھے نے تعجب سے سر ہلایا وہ جوش سے بولا۔" دیکھا گویا کسی نے لاٹھی کو ریت میں دبا کر اسے نہایت احتیاط سے کھینچ لیا ہو۔

وہ دور تک لکیر کے کنارے چلتا گیا حتیٰ کہ جھاڑیوں تک جا پہنچے اور تب اس نے اس خوفناک پھنکار کو اپنے پاؤں کے قریب محسوس کیا وہ اچھلا اور پھر منہ کے بل گر گیا اس کی آواز سن کر داتو بھاگا آیا بوڑھے کو اٹھانے کے لئے جھکا ہی تھا کہ سیاہ ناگن سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ان آنکھوں سے عجیب مقناطیسی لہریں خارج ہو رہی تھیں۔ ایسی لہریں جنہوں نے پاؤں جکڑ لئے۔ جسم جکڑ لیا۔ آنکھیں اسے اپنی جانب بلا رہی تھیں۔ گویا آواز دے رہی ہوں گویا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی ہوں... اس کی دوشاخہ زبان باہر نکلی پھر جیسے اس نے بوڑھے کو ڈسنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جھاڑیوں میں سرک گئی۔ بوڑھا اسی طرح زمین پر گرا رہا۔ داتو اسی طرح کھڑا رہا وہ ایک ثانیہ تھا کہ صدی کچھ سمجھ نہ پائے کہ کیا ہو گیا۔ خوفناک سرشاری کا ایسا لمحہ جو وجود کی جڑیں ہلا گیا اس نے ایک مرتبہ پھر ان جھاڑیوں کو دیکھا جہاں اب ہوا سے پتے ہل رہے تھے۔ اس نے جھاڑیوں کے گرد دو تین چکر لگائے، وہ یہ دیکھ کر چکرا گیا تھا کہ چیونٹیوں بھی ایک خاص حد تک آ کر رک جاتی تھیں، کمال ہے۔

داتو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بوڑھا چلا تو اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔"

"میں سمجھ نہیں سکا مگر اس ناگن میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔"داتو نے چلتے ہوئے بوڑھے پر نظر ڈالی جس کا چہرہ پسینہ کی بارش سے بھیگ گیا تھا۔ بوڑھا جیسے خود سے مخاطب تھا۔ میں نے ساری زندگی سانپ پکڑتے گزاری ہے۔ بڑے سے بڑے زہریلے سانپوں کو ان ہاتھوں سے پکڑا ہے کئی مرتبہ ڈسا بھی گیا ہوں مگر مجھے آج تک خوف نہیں محسوس ہوا۔" جھرجھری لے کر بولا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں سانپ سے ڈرا ہوں اور شاید میری کوئی چیخ بھی نکلی تھی۔

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ "شاید کوئی بدروح ہو۔

"نہیں۔" بوڑھا قطعی لہجہ میں بولا۔ عورت زندگی ہی میں ناگن ہوتی ہے اس نے مرنے کے بعد ناگن بن کر اسے کیا لینا؟ ہنس کر بولا۔ ویسے ہی ہر وقت ڈستی رہتی ہے۔"

"پھر۔؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ لیکن جس کی ایک شوک نے مجھے منہ کے بل گرا دیا وہ عام ناگن نہیں ہو سکتی۔"

داتو بولا۔ "بابا، وہ تمہیں کاٹ سکتی تھی مگر اس نے کاٹا نہیں۔"

"ہاں شاید وہ کاٹنے کو تھی مگر یوں لگا جیسے تمہیں دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا ہو۔

"مجھے؟"

"میرا خیال ہے۔"

"کل ہے مگر ایک بات اور بھی ہے۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ناگن ہے۔"

"ہاں مجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ناگن ہے۔" بوڑھے نے جھرجھری لے کر گویا اپنے آپ سے سوال کیا

دونوں خاموش چلتے رہے داتو کی آنکھوں میں پھیلتی شام کے سائے سمٹتے جا رہے تھے جبکہ بوڑھا کبھی کبھی کانپ اٹھتا بستی کے قریب پہنچے تو جانوروں اور انسانوں کی آوازوں نے ان کا استقبال کیا۔

گائے کے ڈسنے کی خبر خاصی سنسنی خیز تھی۔ یہ سپیروں کی بستی تھی۔ ہر گھر میں دس بیس سانپ پل رہے تھے اور ان سانپوں کو پالنے والے مردوں اور ان مردوں کو سمجھنے والی عورتوں اور ان کے ملاپ سے جنم لینے والے بچوں کے لئے سانپ خوفناک چیز نہ تھی۔ مردوں کے لئے یہ روزگار کا ذریعہ تھا، عورتوں کے لئے چاندی کے زیورات کے بعد جہیز کی سب سے قیمتی چیز اور بچوں کے لیے کھلونا۔ انہوں نے سانپ پکڑ پکڑ کر ارد گرد کا علاقہ ان سے پاک کر دیا تھا اس لئے سانپ یہاں کہاں؟ وہ تو خود سانپ کی تلاش میں جنگل اور تھل میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اسی لئے اس سانپ کی آمد نے ساری بستی میں سنسناہٹ کی برقی لہر دوڑا دی تھی اور پھر دودھ دینے والی گائے کا نقصان کوئی معمولی بات نہ تھی، وہ بچھڑس کی قیمتی گائے تھی کوئی معمولی گائے نہ تھی۔ وہ دونوں بستی والوں میں گھرے ماجرا سنا رہے تھے بلکہ زیادہ بھر داتو سنا رہا تھا کیونکہ بوڑھے کو تو چپ سی لگ گئی تھی۔ گائے کا گوشت کھا کر گدھ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو یقیناً یہ بے حد زہریلا سانپ ہوگا اس پر پہلی بار بوڑھا بولا۔ "سانپ نہیں ناگن۔"

"ناگن کیسے؟"

"میں نہیں جانتا۔" بوڑھا بولا۔ "لیکن وہ ناگن ہے۔" وہ سب اسے گھور رہے تھے۔ مگر مجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ناگن ہے بوڑھا جیسے خود سے سوال کر رہا ہو۔ "لیکن اس کے باوجود مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ناگن نہیں عورت ہے۔" وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "ہاں ہاں وہ عورت ہے۔ مجھے یقین ہے کیا وہ عورت ہی ہے۔"

"بابا کیا کہہ رہے ہو؟"

"یقیناً یہ ڈر گیا ہے۔" ایک عورت بولی۔

"ہاں۔" وہ بولا: "میں واقعی ڈرا ہوں۔" وہ جھرجھری لے کر بولا۔ "میں نے آج تک ایسی شوک نہیں سنی۔"

"بابا ٹھیک کہتا ہے" داتو بھی بولا۔ "یہ تو منہ کے بل گر گیا تھا۔"

"سپیرے۔" مجمع میں سے کوئی بولا۔

"عجب بات ہے۔" بوڑھا پھر بولا۔ "وہ مجھے کاٹنے کو تھی۔ میں نے اس کا منہ کھلتے اور زبان لہراتی دیکھی تھی مگر پھر جیسے اس نے ارادہ تبدیل کر دیا۔"

"کمال ہے۔" کسی کی آواز نے مجمع کی حیرت کے آئینہ کو توڑا۔

اس رات ہر گھر میں یہی موضوع تھا سپیروں میں جوش پیدا ہو گیا تھا اور ہر ایک اس نایاب اور بے حد خطرناک ناگن کو پکڑنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ ویسے تو سانپ پکڑنا ان کے معمولات میں سے تھا اور اب اس کام میں کوئی انوکھی لذت نہ رہی تھی لیکن بابا نے جن الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا تھا اس سے وہ ناگن محض ناگن نہ رہی تھی بلکہ ایک پراسرار وجود میں تبدیل ہو گئی تھی اب یہ محض ایک ناگن پکڑنے کی بات نہ تھی بلکہ کسی اور جنم کی مخلوق قابو میں کرنے والی بات تھی، کسی خزانہ کی تلاش یا حسینہ کو اڑانے والی بات تھی۔ سو بھی جوش میں تھے۔

اس رات بابا نہ سو سکا، ناگن گویا نگاہوں کے سامنے لہرا رہی تھی اس کی دوشاخہ زبان اور اس کی شوک۔ اس تصور سے ہی وہ لرز لرز جاتا اور سب سے زیادہ اس بات سے پریشان تھا کہ وہ خوفزدہ کیوں ہے، وہ زندگی میں کبھی کسی سانپ سے نہ ڈرا تھا۔ وہ تو راتوں کو جنگلوں میں پچھل پائیوں سے بھڑ جانے والوں میں سے تھا اور اب ایک شوک نے اسے پانی کر دیا۔ اسے ہر قیمت پر پکڑنا ہوگا اس نے تہیہ کیا اور نہیں تو صرف اسی وجہ سے کہ وہ اس سے خوفزدہ ہو گیا تھا آخر اپنا خوف بھی تو دور کرنا تھا اس لئے ہر قیمت پر۔۔۔ حتیٰ کہ جان کی قیمت پر بھی۔۔۔ اسے پکڑنا ہوگا

جب رات خاصی بیت گئی، اور بستی کے مرد عورت بچے اور ان کے ساتھ ساتھ جانور بھی سو گئے تو داتو نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا کہکشاں اب کھجور کے جھنڈ پر تھی۔۔۔ وقت آ گیا ہے۔ اس نے سوچا اور کواڑ بھیڑ کر چپکے سے گھر سے نکلا خاموش بستی سے وہ ایک سایہ کی مانند گزر رہا تھا یوں کہ پاؤں کے نیچے کنکر بھی نہ ہلنے پائے۔ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس تھیں اور وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں پہنچنا ہے وہ سانس روکے آہستہ لیکن تیز چلا جا رہا تھا۔

بستی کے کنارے پر کنوئیں کے ساتھ کھجوروں کے جھنڈ میں زینا اس کی منتظر تھی وہ اندھیرے میں کسی درخت کے تنے کی طرح ساکت تھی۔ اسے آتا دیکھ کر تنے سے الگ ہو کر اس کی طرف بڑھی۔ اور پھر قریب آ کر جیسے ٹھٹھک گئی

۔۔۔"داتو۔۔؟"

وہ اندھیرے میں ہاتھوں سے اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھی۔ اس کی گرم سانس چہرہ پہ پھیل رہی تھی "داتو۔

وہ اس کے ہاتھوں میں پگھل رہی تھی۔

"داتو۔داتو۔" وہ بار بار بے چین ہو اٹھتی "داتو داتو۔"

اور پھر ساکت ہو گئی۔ دونوں خاموش تھے صرف تیز سانسیں جو کہہ رہی تھیں۔ "کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں زینا۔"

نہیں کچھ تو ہے۔"

"کچھ نہیں۔"

"پھر۔؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تم ایسے تو کبھی بھی نہ تھے۔"

"ہاں، میں ایسا تو کبھی نہ تھا۔"

"کیا کوئی اور۔"

"نہیں زینا۔۔۔" وہ جیسے تڑپ کر بولا۔ "صرف تم ہی میری عورت ہو۔"

"تو پھر سچ۔"

وہ چپ رہا۔"

"کیا زیادہ تھک گئے ہو؟" وہ ہمدردی سے بولی۔

"نہیں تو۔"

"پھر۔؟"

"زینا میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیا۔" وہ اس کے ہاتھ کو اپنے گال پر رگڑ رہی تھی۔

"وہی جس نے آج گائے کو کاٹا ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر تعجب سے بولی۔ "اس کے بارے میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ صبح جاکر اسے پکڑ لینا۔"

"خاص بات کیا ہوئی۔" وہ بولی "کسی عام ناگوں جیسی ناگن ہے بابا کیونکہ ڈر گیا اس لئے تم بھی اس کے بارے میں اتنا سوچ رہے ہو۔"

"نہیں زینا۔ اسمیں کوئی خاص بات ہے۔" وہ پھر بولا۔

"میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔"

''ہاں،، وہ تمسخر اڑانے والے لہجے میں بولی۔ ''میری آنکھیں تو دیکھتے نہیں اور ناگن کی آنکھوں میں جھانکتے پھرتے ہو۔،،

مگر وہ جیسے اس کی بات سنے بغیر بولے جا رہا تھا۔ ''اس کی آنکھوں سے عجب لہریں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں گویا مقناطیس کی ڈوریاں ہیں جو مجھے جکڑ رہی ہیں وہ گول آنکھیں نہ تھیں، کنواں تھیں، کہ میں ڈول کی طرح ان میں اترتا چلا گیا۔''

زینا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ جھرجھری لے کر بولا۔ ''زینا نہ جانے کیا تھا ان آنکھوں میں۔،،

زینا نے داتو کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر اندھیرے میں یہ بھی ممکن نہ تھا وہ بالآخر بولی۔ ''داتو تو تم کملے ہو۔ کملے'' ''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔،،

وہ دونوں خاموش، دو پریشان بچوں کی مانند، ایک دوسرے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے، جیسے اپنا اپنا ڈر دور کر رہے ہوں داتو کے جسم کی گرمی زینا کو عجب سکون دے رہی تھی مگر داتو کو زینا کے جسم کا احساس بھی نہ تھا، ٹھنڈا یخ وہ کسی اور کا لگتا تھا، آج کی ملاقات سے زینا خوش نہ تھی۔ وہ پریشان تھی یقیناً یہ کسی اور کے چکر میں پڑ گیا ہے یا پھر مجھ سے اکتا گیا ہے مگر نہیں مجھ سے کیسے اکتا سکتا ہے؟،،

وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''دیر ہو رہی ہے، چلیں؟

''ہاں۔،، وہ جیسے چونک کر بولا۔ ''دیر ہو رہی ہے۔،،

وہ راستہ بھر یہی سوچتی رہی کہ داتو کو کیا ہو گیا ہے یہ ناگن کا کیا چکر ہے۔ بابا بھی بے حد خوفزدہ تھا یہ بھی کملی باتیں کر رہا ہے ناگن ناگن ہوتی ہے پکڑ کر پٹاری میں بند کرنے کے لئے۔ تماشہ دکھانے کے لئے بیچنے کے لئے جہیز میں دیے کے لئے۔ کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ داتو کا پیار اس کے سینے میں دل بن کر دھڑک اٹھا۔ وہ دیواروں کے سائے میں چلتی جا رہی تھی اپنے سائے سے بھی بچ کر۔ تو کیا میری سوت ناگن بنے گی؟ یہ سوچ کر وہ خود ہی ہنسی، میں بھی کملی ہو گئی ہوں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں تو عورت کو جان سے مار دوں ناگن تو پھر پاؤں تلے کچلی جا سکتی ہے۔۔ میرے غصہ کے آگے اس رسی کی کیا حقیقت؟ اور عین اس وقت اس نے اپنے سامنے ناگن کو دیکھا وہ اپنے پورے قد پر کھڑی تھی . زینا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ ناگن ہے جس کی وجہ سے داتو پریشان ہے اور جس سے بابا خوفزدہ ہے مگر میں عورت ہوں میں اس سے کیوں ڈروں؟ یہ ناگن اور میری سوت، ہاہا یہ میری دشمن؟ ہاہا۔

سب ایک ثانیہ میں ہو گیا ذہن میں ابھی سوچ کے بلبلے ابھر رہے تھے کہ ناگن کی شوک خاموش بستی میں گونجی اور ساتھ ہی زینا کی چیخ۔۔۔۔ ایسی چیخ جو آج تک اس بستی کی کسی عورت کے حلق سے نہ نکلی تھی۔

یقیناً اس بستی پر آسیب کا سایہ ہے ہر شخص یہی سوچ رہا تھا ورنہ ناگن کو بس میں کرنا کوئی ایسی ناممکن بات تھی۔ وہ بستی جس کا روزگار سانپ ہوں۔ وہ بستی جہاں کے بچوں کا کھلونا سانپ ہوں ور وہ بستی جہاں سانپ بہترین جہیز ہوں اس بستی کے ماہر سپیرے اس ناگن کو نہ پکڑ سکیں، کمال ہے۔ یقیناً وہ کوئی بدروح ہے ورنہ اب تک جا چکی ہوتی۔

زینا کی موت نے بستی کے اعصاب پر ناگن سوار کر دی وہ زینا جو زندگی سے شرابور تھی اور کاجل جس کی آنکھوں سے

سیاہی ادھار مانگے۔۔۔ وہ زینا یوں ماری جا سکتی ہے۔ یہ کسی نے کبھی نہ سوچا تھا۔ داتو اور [illegible] کی موت سے قبل مار دیا تھا مگر اس کے دل میں ناگن کے لئے نفرت یا غصہ یا انتقام کے جذبات نہ تھے بلکہ عجب کون کا احساس ہو رہا تھا جیسے ناگن نے اس کی مشکل آسان کر دی ہو۔ ہر چند کہ زندگی میں داتو نے کبھی بھی مشکل نہ محسوس ہوئی اور نہ ہی اس نے کبھی داتو کو کسی مشکل میں ڈالا۔۔ پھر بھی اس کی موت سے داتو خود کو جیسے آزاد سا محسوس کر رہا تھا مگر آزادی کس بات کی، یہ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی۔

ساری بستی کے مردوں پر جیسے زینا کی موت کا انتقام جنون بن کر سوار ہو گیا۔ مکران کی بہترین کوششیں اور تمام مہارت رائیگاں گئی سب نے منہ کی کھائی کہ ناگن کو پکڑنا تو کجا وہ اس کی لکیر تک نہ دیکھ پائے۔۔۔ ان کوششوں سے صرف دو اشخاص غیر متعلق رہے ایک بابا اور دوسرا داتو۔۔۔ اگرچہ ان دونوں میں کبھی ناگن کے موضوع پر بات نہ ہوئی مگر دونوں کی چپ ان کے اندرونی اضطراب کی غماز تھی۔ دونوں صبح گھر سے نکلتے اور باقی سپیروں والا راستہ چھوڑ کر دوسری سمت جاتے۔ جہاں سانپ ملنے کا امکان نسبتاً کم تھا۔۔۔۔"

زینا کی موت کا انتقام نہ لیا جا سکا۔

داتو کئی دن بخار میں پھنکتا اور بدبودار بوٹیوں کا بدمزہ پانی پیتا رہا تھا آج ٹھیک ہو کر اٹھا تو کمزوری سے جیسے چکر آ گیا مگر تنہا گھر میں لیٹے لیٹے طبیعت میں اتنی بیزاری اور اکتاہٹ آ چکی تھی کہ اب گھر میں بیٹھنے کی سکت نہ تھی۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ گھروں کے باہر بچے کھیل رہے تھے اور اندر عورتیں رات کا کھانا پکانے میں مصروف کچھ بوڑھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے الغرض بستی کی زندگی اپنے معمول کے مطابق تھی زینا کی موت اور ناگن بھی کسی حد تک فراموش کی جا چکی تھی۔ سپیروں کے لئے سانپ کے کاٹنے کی موت ویسے ہی معمولات کی طرح تھی جیسے ملاحوں کے لئے پانی کی زینا کی موت کا انتقام لے لیا جاتا تو اچھا ہوتا مگر وہ ناگن نہ پکڑی جا سکی تو سائیں کی مرضی۔ صحرا میں سانپوں کی کمی نہ تھی اور عمر سانپ پکڑنے ہی کے لئے تھی۔

داتو کو آج بخار کے بعد کمزوری سے کانپتی ٹانگوں کے باعث زینا بری طرح یاد آ رہی تھی آج اس نے صحیح معنوں میں اس کی کمی محسوس کی تھی کہ زینا کھوئی طاقت بحال کر سکتی تھی۔ گائے کے تازہ اور نیم گرم دودھ کا کٹورا پیا تو جسم کو قدرے بہتر محسوس کیا ادھر ادھر بیٹھ کر لوگوں سے گپ کی مگر مزا نہ آیا۔ طبیعت میں عجیب سی الجھن تھی جس کا بخار یا اس کی کمزوری سے کوئی تعلق نہ تھا جیسے کسی چیز کی کمی کا احساس، زینا کی کمی کا بھی نہ تھا۔ جیسے کچھ کرنے کو جی چاہے مگر یہ نہ معلوم ہو کہ کیا کرنا ہے۔ یا پھر بھوک ہو مگر یہ نہ معلوم ہو کہ کس سے یہ بھوک مٹے گی۔

بخار نے منہ کا ذائقہ بھی خراب کر دیا تھا اس لئے سوچا چلو نیم کے درخت سے داتن توڑ کر منہ کی کڑواہٹ ہی دور کر لوں بدمزہ منہ میں نیم کی کڑواہٹ نے گھل کر عجب اثر کیا کہ طبیعت قدرے بہتر ہوتی محسوس کی۔ وہ چلتا گیا۔

اب بستی اس کی پشت پر تھی۔

غروب ہوتے سورج کی کرنوں نے افق کو دہکا کر ذروں کو سنہری تاج پہنا رکھے تھے پانی کی چمک والی ریت کی لہروں پر اس کے قدموں کے نشانات بنتے جا رہے تھے، سورج ریت کے جھلمل جھلمل کرتے سمندر میں اترتا جا رہا تھا۔ چاروں

اور خاموشی صرف کبھی کبھی کوئی پرندہ تیزی سے پر مارتا گزر جاتا پھر آسمان کی نیلاہٹ پر رات کا ہاتھ پھر گیا اور وہ چاند جو افق پر تصویر کی مانند تھا جیسے اپنی چاندنی سے زندہ ہو گیا۔

وہ ٹھنڈی ریت پر بیٹھا رہا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے جسم سے بخار کی بدمزگی کو دھوئے جا رہے تھے۔ اس نے ٹھنڈی ریت سے مٹھی بھری اور دبایا تو ریت نے عورت کی طرح مس دیا مٹھی میں سے ریت آہستہ آہستہ کھسکتی جا رہی تھی۔ اور پھر مٹھی خالی رہ گئی۔ اس نے پھر ریت سے مٹھی بھری اور پھر اسے خالی کیا پھر بھری اور پھر خالی کیا وہ بچہ بنا اسی کھیل میں مگن رہا۔

صحرا میں تاحد نگاہ چاندنی کا کھیت تھا۔ جس میں کبھی کبھی کوئی ذرہ جگنو کی طرح چمک اٹھتا اس کا جی مچل اٹھا کہ ان جگنوؤں کو پکڑے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے جسم میں خنک توانائی بھر رہے ہوں اور اب وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر وہ لیٹ گیا دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے خاموش صحرا میں ریت کے بستر پر لیٹا وہ چاند کو تکتا رہا تکتا رہا اس نے زندگی میں خود کو کبھی بھی اتنا پرسکون محسوس نہ کیا تھا گویا وہ چاندنی میں نہیں بلکہ سکون کی بارش میں نہا رہا ہو۔ جیسے اس کی رگوں میں ریت موجزن ہو۔ جیسے اس کے وجود کی روشنی سے صحرا میں اجالا ہوا اور وہ محض ایک انسان نہ ہو بلکہ ریت کا ایک ذرہ ہو۔ ریت کے سمندر کی موج ہو بلکہ خود صحرا ہو۔

نہ جانے اس پر نیند نے کب غلبہ پا لیا اور وہ کب سویا، کتنا سویا اسے کچھ احساس نہ تھا، ہاں آنکھ کھلی تو چاندنی کے فرش پر ناگن کا پھول کھلا تھا، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے خود کو ناگن کی آنکھوں کے سرخ بھنور میں ڈوبتے پایا اس کی دوشاخہ زبان لہرائی مگر داتو نہ تو اس رہاں سے خوفزدہ ہوا اور نہ ہی آنکھوں کے بھنور سے ہراساں ۔۔۔ دو آنکھیں سرخ سیہ کول بدامی ۔۔۔ یوں ہیں کہ وہ ایک دوسرے میں ڈوبتے گئے دوشاخہ زبان پھر لہرائی مگر اس میں بجلی بن کر گرنے والا غضب نہ تھا بلکہ عجب سندرتا تھی ایسی من موہنی کہ من پنچھی باؤلا ہو جائے۔

وہ ایک پل تھا کہ یگ، کون جانے کہ پل پر سے صدیاں گزر گئیں یا لمحہ منجمد ہو گیا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا آنکھ آنکھ کی تصویر بنی تھی اور بس۔

داتو کو اس کے جسم سے عجب حرارت نکلتی محسوس ہو رہی تھی، ایسی تپش جو کسی لکڑی سے نہ نکلی تھی۔ ایسی آنچ جو گرم ریت میں نہ تھی، ایسی گرمی جو کسی عورت کے جسم نے خارج نہ کی تھی خارج کرنا تو دور کی بات یہ گرمی تو عورت کو لاکھ کی مانند پگھلا دے، بہا دے داتو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے گرد حرارت کا ایک حصار بنتا جا رہا تھا۔ ہوا کی خنکی کے باوجود اسے پسینہ آ رہا تھا وہ خود کو ٹھنڈی ریت کی بجائے جلتی بھوبل میں پھکتا محسوس کر رہا تھا اس کی تپتی آنکھوں نے اسے جھومتے دیکھا وہ یوں جھوم رہی تھی گویا داتو کا جسم بین میں تبدیل ہو گیا ہو اور سر اس کے مساموں سے پھوٹ رہے ہوں۔ داتو اس کی شوک کو اپنے چہرہ کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ دوشاخہ زبان لہرا رہی تھی اور سرخ بھنور طوفان میں تبدیل ہو رہا تھا، وہ جھومتی جا رہی تھی۔ بلتے سر کی پھیلتی قوس سے دائرہ بنتا جا رہا تھا۔ اس کا پورا وجود اب اپنے دائرہ کا اسیر تھا، دائرہ میں دائرہ بھنور میں بھنور، آنکھ میں آنکھ وہ اپنے پورے وجود پر کھڑی ناچ رہی تھی۔ دوشاخہ زبان لہرا رہی تھی بے چینی کے عالم میں بے کلی کے عالم میں مگر دونوں کی آنکھیں جس تار سے بندھی تھیں، وہ نہ ٹوٹتے پایا کہ آنکھوں کا یہ تار گویا ڈوری تھا جس سے وہ دونوں بندھ چکے تھے۔

داتو ساکت تھا، بت بنا۔ صرف اس کی آنکھوں میں جان تھی، اس لیے کہ اس میں اس کی نرت کی بھوک تھی۔ وہ اچانک رکی ایک پل جیسے ہوا میں معلق رہی اور پھر وہ اس کے قدموں میں ڈھیر تھی اب اس کا رنگ سیاہ [illegible] رہا تھا بلکہ اس کے وجود پر اندر دھنش کے تمام رنگوں کے پھول کھل اٹھے تھے۔ ان رنگوں سے عجب روشنی خارج ہو رہی تھی یوں لگتا تھا کہ وہ [illegible] حال تھا۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس کی آنکھوں میں بھی رنگوں کے بھنور پھیلے نظر آئے اس کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں کیا؟ جل کی کہانی سے کی کتھا، صدیوں کی حکایت۔

داتو نے دو شاخہ زبان اپنے تلوؤں پر محسوس کی۔ اس کی زبان ہولے ہولے اس کے تلوے سہلا رہی تھی۔ وہ دم سادھے لیٹا تھا، وہ چاہتا بھی تو اٹھ نہ سکتا، کہ اس عجیب لمس کی زنجیر سے بندھا تھا۔۔۔ وہ زبان بڑھتی جا رہی تھی تلوے، ٹخنے، پنڈلیاں اور رانیں، اس کے جسم پر اس کا جسم بلکورے لے رہا تھا، اس کا جسم داتو کو اپنے رنگوں میں رنگ رہا تھا۔ داتو کا جسم لذت کے سیلاب میں تنکا بنا بہہ رہا تھا، وہ لذت کی آندھی میں پتہ بنا اڑا جا رہا تھا۔ اس نے اب داتو کو پوری طرح اپنے جسم کے حصار میں لے رکھا تھا اس کو سہلا رہی تھی، سینے کے بالوں میں سرسرا رہی تھی، دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑک رہی تھی اور گلے کا ہار بنی ہوئی تھی اس نے داتو کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا دونوں زبانیں ایک ہوئیں اور پھر وہ دونوں ایک ہو گئے۔ فضا میں رنگوں کی پچکاریاں تھیں کہ اندر دھنش زمین پر اتر آئی تھی۔

سانپ ندی میں سانپ جل تھا، سانپ جنگل میں سانپ پتے تھے سانپ کلی میں سانپ پھول تھا۔ سانپ پنکھڑی میں سانپ رس تھا، سانپ پھل میں سانپ من تھا۔

وہ ناگ شجر کے سایہ میں تھے ناگ شاخوں پر پھن پھول کھلے تھے اور دونوں پھن پھولوں کی بارش میں تھے۔"

الاؤ

سہیل عظیم آبادی

گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت۔ اتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے اس کے بیچ میں کئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اسکے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی کنواں اور اس کے بعد کھیت۔۔۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ ور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر پر سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پرجا ہی پرجا۔۔۔ راجہ کو مرے، برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا، اس کا راج محل تو میدان ہے۔

یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ رِدکھ پیڑنے کو کولہو بٹھاتے اور کولہو سار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کتنی دھان کا

کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔

کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ بھگوا پورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی نیچے کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگوا نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر پھر پیپل کی جڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کرتا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہیے۔ ٹھیک ویسی ہی، یا اس سے بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں وہ کھڑا ہو کر لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

بھگوا اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آ گیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناطے میں بھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا:

"بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گڑا سا لگے تب"۔

بھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

"ہاں چچا! پر گڑا سا اچھا سا مل جائے تب نا"۔

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا کر کے دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ سامو اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آ گئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا،

''ارے بھیا ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا، ابھی سے الاؤ تاپنے لگے''؟

اکلو بولا "بھگوا اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی''۔

باڑھو بولا۔ ''مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی''۔

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔

سانول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا:

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھے بھی آگ تاپنے۔ واہ"!

باڑھو بولا۔

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ہم نے ٹوکا کب تھا، ارے ایسے ہی بول رہ تھا"۔

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا:

"ارے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے"۔

سانول نے کہا

"کیا چچا! ہم لوگوں نے کوئی بدمعاشی نہیں کی"۔

باڑھو بولا:

"نہیں۔ تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھ ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھپی اور چھیدو کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح بھک بھک کھینچ کر دھواں اڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھسکتے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائے گا"۔

اتنے میں چھپی آ گیا اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی لیکن چھپی نے کہا

"بھیا، اب و جمانا ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک دفعہ کا قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے، ہم میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا رتیو، کلوا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے، جانے دو رتیو۔۔۔ تو رتیو کہتا ہے ایسے کیسے بھوجی، ویسے کہو

موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر ہوئی

یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی انڈیل دوں گی تو راستے سے بھاگا"۔

"چچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہو گا۔۔۔جانتے ہی ہو رتیو کیسا مسوڑ ہے"۔

لیکن چھمی نے بزرگانہ انداز میں کہا:

"ہش، یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی"۔

سانول چپ ہو گیا اور بازھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا لیکن ساھو نے بیچ ہی میں روک کر کہا:

"ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں، سنا ہے دھرمپور میں بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی"۔

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے باقی سب کاٹھ کے الو ہیں۔ پھر بولا:

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں"۔

سانول بولا۔

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں"۔

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی اس لئے بازھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا۔

"بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا"۔

بھاگو بولا:

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس دھرمپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے"۔

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آ گئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کرگھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا نَریا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چپ ہو گئے جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔

"ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی"؟

ساتول نے جواب دیا

"بچاگو دھرپور گیا تھا، طوفانی چچا، وہیں کی بات تھی"۔

"کیا بات تھی"؟

طوفانی میاں نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں سب کا سننا بے کار ہوا۔ بچاگو نے پھر سے ساری بات دہرا دی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا:

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے"۔

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ چھکو تیلی نے کہا:

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا۔۔۔"

چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا:

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا؟ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کرے گا"؟

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا۔ سب کی باتیں سن کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آ کر اس کے ہونٹوں پر رک جاتی تھی لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا:

"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے"۔

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت، چین، جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اسکو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا

"ہم لوگوں کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا"۔

ساتول نے کہا:

"ٹھیک کہتے ہو دلو۔۔۔"

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماگ کھراب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چھنو اور چھکو اور ایک دو آدمی اٹھ کر چلے گئے اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پروا نہ ہوئی۔ بلکہ ساتول نے کہا:

"جلم پر جلم ہے، پرسوں ہی کی بات ہے، میکھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے میکھو کی عورت آ کر ان کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا"۔

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل میکھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے"۔

دلو نے رائے پیش کی اور سب نے ہاں کہی۔۔۔ پھر آگے چل کر کیا ہو گا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پروا ہو کر یہی فیصلہ کیا کہ پٹواری جی کو رسیدانہ نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں، وہ بھی بند اور بیگاری آخری طور پر ختم"۔۔۔

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔ ساتول نے کہا:

"تب دلو ٹھیک ہے نا"؟

دلو نے کہا:

"پکا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں پلٹتا"۔

بھاگو نے کہا۔۔۔ "بالکل ٹھیک"۔

پھر سیتل بولا:

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا، کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کر دے گی"۔

سیتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی برائیاں وہ سن چکا تھا اس نے کہا:

"دلو بھائی۔۔۔ کانگریس۔۔۔ مولانا صاحب تو کہتے تھے۔۔۔"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا:

"دھت۔۔۔ یہ سب بکتے ہیں۔ گریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپنے کرنا ہو گا جو ہو"۔

یہ کہتے ہوئے دلو اٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اٹھتے ہی سب کے سب اٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب، کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے، ''آج سبھا ہو گی''۔ بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجہ پر غور کر رہے تھے کہ بھس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر مہتوں ور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے گا۔۔۔ اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دوچار نوجوان میدان میں جمع ہوئے۔ مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے اور سب سے کہا۔ ''سب کا حشر طوطا رام اور اندر مہتوں کا ہو گا، تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ''۔

صبح اٹھ کر ساتول منہ دھوتے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آ کر کہا:

''ساتول بھائی! تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے''۔

ساتول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا، پھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ پھاگو نے ساتول کو دیکھتے ہی کہا:

''بھیا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہیں۔۔۔ کیا رائے ہیں۔۔۔؟''

ساتول نے جواب دیا۔

''چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے''۔

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک چھٹو دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے ساتول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا'

''دو سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کچھڑ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی''۔

دلو نے کہا:

''غصہ کرنے کی بات نہیں ساتول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہو گا۔''

ساتول نے کہا۔

"ایسے سانول کو سزا ضرور ملنی چاہیے"۔

پھاگو نے پوچھا:

"تو اب کیا ہو گا"؟

سانول نے کہا:

"ڈرنے کی بات کیا ہے، ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے"؟

سانول چلا گیا۔ دلو اور پھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اس کو غصہ آ جاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن پھاگو نے کہا

"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو سانول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں"۔

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا:

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا"۔

پھاگو بولا:

"پھر بھی۔۔۔"

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ سانول تیزی کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ دلو آ گیا اور آتے ہی بولا:

"پھاگو لاٹھی تو دے۔۔۔"

دلو اور پھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتا جا رہا تھا۔۔۔ اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کر دیا اور چاہتا تھا کہ مارپیٹ کرے مگر وہ اس طرف کی دیوار کو جو نیچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چھنو اور جھیمی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر کنڈی لگا دی۔ پھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں

بار بار دیکھ چکا تھا۔ بچو گو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

اب کیا ہو گا دلو بھائی"

دلو بولا

"دیکھا جائے گا"۔

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آ گئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہو گی۔ ساتول چلا گیا لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا:

"بولو اب کیا ارادہ ہے؟ اب عزت چاہتے ہو یا ذلت"؟

ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچ نیچ بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر ساتول کو پوچھنے آئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جھیمی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جھیمی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ جھیمی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا:

"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ"۔

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی۔ ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہیے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر آتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے۔ کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے ـــ اور ان کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور دو دوسری طرف عزت

کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بپتا تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا۔ ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کو سزا دینا سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں، کس وقت کیا کام کرنا چاہیے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرے ور بہکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ ساتول، دلو اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور نہ کچہری کی طرف۔۔۔ گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی۔ لیکن آگ جو سلگی تھی، وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔

ساتول صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جھبی آتا ہوا دکھائی پڑا۔ ساتول ٹھہر گیا۔ جھبی جیسے ہی پاس آیا، ساتول بولا:

"تم کو ہم سب سے بیر کاہے کا جھبی بھائی تم کو سوچنا چاہیے کہ تم بھی کسان ہو"۔

جھبی بولا:

"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو"۔

ساتول کو اس کا یہ کہنا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا:

"دیکھو جھبی بھائی، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے۔۔۔ اپنی بے عزتی بھی

بھول گئے''؟

جھیبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا:

''بیکار باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں''۔

سانول نے کہا:

''یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے''۔

لیکن سانول اس بات کو بھول گیا تھا کہ پھاگو کا باپ گاؤں کا پٹوال تھا اور اسی زمانے میں بہت سا کھیت جھیبی سے لے کر زمیندار نے پھاگو کے باپ کو دے دیا تھا۔ اس سے اس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پرانی ہو چکی تھی۔ جھیبی نے کہا:

''سنو سانول! تم بیچ میں نہ پڑو۔ پھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر۔۔۔''

''یہ بات بڑی پرانی ہو چکی اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو پھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت دلوا دوں —— لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے باڑھو چاچا نے تو لیا نہیں۔ لیا تو تھا زمیندار ہی نے۔ قصور کس کا ہے''؟

مگر جھیبی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اس نے کہا:

''سانول میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں۔۔۔''

''سب ٹھیک۔ پر یہ تو بتاؤ اس دن تم پیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو کیوں بتایا تھا کہ سانول پھاگو کے گھر پر ہے۔ میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا''۔

جھیبی کھسیا گیا اور اس نے کہا:

''مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں''۔

وہ دو قدم آگے بڑھا۔ لیکن سانول نے اس کا راستہ روک لیا اور ذرا تیکھا ہو کر بولا:

''سنو جھیبی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہو گا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں۔ یہ تمہارے حق میں بڑا برا ہو گا''۔

جھیبی جانتا تھا کہ سانول غصیل آدمی ہے۔ اس لئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ پھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا، وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدہ کے لئے گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا۔ مگر اب برے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ سانول کو جواب دیے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا:

"ساونل دیر ہو رہی ہے۔ مجھے کام ہے راستہ چھوڑ دو"۔

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جھمی کسی دوسرے طرف سے چلا جاتا مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل تنگ تھا۔ اس کے بیچ میں بھی ساونل کھڑا رہتا تھا۔ جھمی نے چاہا، اس کو ہٹا کر چلا جائے۔۔۔ لیکن ساونل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھمی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا اور بولا:

"لڑنا چاہتے ہو کیا"؟

ساونل بولا۔

"ہم لڑنا نہیں چاہتے لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے بھی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا"؟

جھمی کو غصہ آ چکا تھا اس نے کہا

"کیا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا۔۔۔"

ساونل کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھمی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس نے جھمی کے سر پر دے مارا جھمی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولیس آئی اور ساونل گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہیے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہیے۔

ایک طرف ساونل کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف دھو اور پھاگو اور دوسروں کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آ گیا تو ان سب پر، جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا۔۔۔

آخر اس طرح کب تک چلتا لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اس لئے چپ رہنا ہی بہتر لیکن چپ رہیں تو کب تک۔ دھو نے پھاگو کو ایک

دن بلا کر کہا:

"اب کچھ کرنا چاہیے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔"

بچاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اٹھے۔ دوسرے گاؤں میں جلسے کیے جائیں اور اسی پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا، سر جوڑ کر بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ دھنی رام بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش سے کام کر رہا تھا جب سانول کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول پڑا اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آ گیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت ہر طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا۔ پھر ایک دو چار پانچ دن۔۔۔ وہ آدھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولیس آئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو، بچاگو، جمن، ہرکھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے۔ ان پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے۔۔۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا، لیکن آئندہ کیا ہو گا، یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھرتا جا رہا تھا لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولیس کے سپاہی نظر آتے تھے۔ انہیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پا چکے تھے مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے۔ وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا تو ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا:

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا:

"سالے پٹواری کا مچھڑ، وہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت"۔
اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔
کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا۔

چور

نوشتہ: دستوفسکی

ترجمہ: شاہد احمد دہلوی

دو سال کی بات ہے۔ اس وقت میں ایک نواب کے ہاں ملازم تھا۔ سارے گھر کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ نواب صاحب چند روز بعد اپنی املاک دیکھنے باہر جانے والے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ادھر نواب صاحب روانہ ہوئے اور دھر مجھے ملازمت سے جواب ملا۔ اللہ ہی جانے پھر کیسے گزارہ ہو گا؟ قریب کے ایک شراب خانہ میں انہی دنوں مجھے ایک شخص عامیلن ملا۔ وہ بہت غریب اور بے یارومددگار تھا۔ کبھی وہ بھی کسی جگہ ملازم تھا مگر پینے پلانے کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ ان حرکتوں کی وجہ سے اسے رکھتا بھی کون؟ جو مل گیا پہن لیا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس میں بھی شبہ ہوتا تھا کہ اس کے بوسیدہ لبادے کے نیچے قمیص بھی ہے یا نہیں۔ جو چیز بھی اس کے ہاتھ میں آ جاتی سے بیچ کر شراب پی جاتا۔ مگر شراب پینے کے بعد وہ اودھم نہیں مچاتا تھا۔ بالکل نہیں، وہ بڑی اچھی اور شریف طبیعت کا آدمی تھا۔ ہر ایک سے اچھی طرح اور محبت سے پیش آتا تھا۔ کبھی کسی سے کچھ مانگتا نہ تھا۔ اس معاملے میں وہ بڑا حساس تھا، بغیر اس کے کچھ مانگے ہی معلوم ہو جاتا کہ اب بے چارہ پینے کے لئے مرا جا رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی اور کوئی نہ کوئی اسے پلا دیتا۔ خیر تو ہم دونوں دوست بن گئے اور ایک چھوٹے کتے کی طرح وہ میرے ساتھ لگ گیا۔ اب جدھر جاؤ ساتھ ہے۔ پہلی ہی ملاقات کے بعد یہ کیفیت ہو گئی۔

اس رات کو وہ میرے ہی ساتھ رہا۔ اس کے پاسپورٹ میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ اور وہ خود بھی ٹھیک ہی تھا۔ دوسری رات بھی ساتھ ہی گزری۔ تیسری رات کو بھی اس نے میرا گھر نہ چھوڑا۔ اگلے دن برآمدے کی کھڑکی میں سارا دن بیٹھا رہا اور وہیں رات بھی گزار دی۔ میں نے دل میں کہا "دیکھا! کیسی ہتھیا دی ہے اس نے۔ اب تمہیں اسے کھلانا پلانا پڑے گا

اور رہنے کی جگہ دی ہو گی۔ غریب آدمی کو تو بس یہ چاہیے کہ کوئی نہ کوئی اس کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی وہ کسی اور سے اسی طرح وابستہ ہو گیا تھا جس طرح مجھ سے اب ہوا ہے۔ دونوں ساتھ پیتے تھے مگر وہ کسی غم کی وجہ سے گھل گھل کر جلدی مر گیا۔ میں سوچتا رہا، اس کا کیا علاج کروں؟ نکال دوں گھر سے باہر؟ میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا تھا۔ اس قدر فاقہ زدہ حال اور دھتکارا ہوا کہ میں اسے دیکھ کر کانپ جاتا تھا اور پھر ایسا بے زبان کہ اپنے منہ سے کچھ نہ مانگتا تھا۔ خاموش بیٹھا بس میری آنکھوں کو تکے جاتا جیسے کوئی بڑا ہی وفادار کتا ہو۔ شراب سے انسان اس حد تک برباد ہو جاتا ہے۔ پھر میں نے اپنے جی میں کہا فرض کرو میں اس سے کہوں "یہاں سے نکل جاؤ عالمین! یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ میرے پاس تو خود کھانے کو نہیں ہے، بھلا تم یہ کیسے توقع رکھتے ہو کہ میں تمہیں بھی کھلاتا رہوں گا"؟ پھر میں نے سوچنا شروع کیا کہ میرے اس کہنے کے بعد وہ کیا کرے گا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ میری بات سننے کے بعد وہ دیر تک مجھے تکتا رہے گا اور اس کی سمجھ میں میرا ایک لفظ بھی نہیں آئے گا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی سمجھ میں آ جائے گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اور کھڑکی میں سے اٹھ کر اپنا چھوٹا سا پلندا اٹھائے گا۔ چھیچھڑے لال کپڑے میں لپٹا ہوا۔ نہ جانے اس میں کیا کیا لپٹا ہوا تھا۔ جہاں بھی جاتا اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اپنے گلے ہوئے لبادے کو جھاڑ پونچھ کر اس طرح پہنے گا کہ اس کے سوراخ اور پیوند کم سے کم دکھائی دیں۔ آدمی وہ نازک احساسات کا تھا۔ پھر وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر دروازہ کھولے گا اور چلا جائے گا۔

تو پھر کیا ایک آدمی کو بالکل ہی مر جانے دیا جائے؟ مجھے ایک دم سے اس پر بہت ہی ترس آیا۔ مگر اس کے ساتھ دل میں یہ بھی خیال آیا کہ آخر میں کیا کروں گا؟ کیا میری حالت اس سے بہتر ہے؟ پھر دل میں کہا: "اچھا عالمین! تم زیادہ عرصے تک تو میرے سر پر نہیں کھا سکو گے۔ مجھے خود یہاں سے عنقریب نکلنا ہے۔ اس کے بعد تمہیں میرا پتہ بھی نہیں چلے گا" نواب صاحب اپنی املاک کے معائنہ کے لئے تھوڑے دنوں بعد چلے گئے اور جاتے وقت مجھ سے کہہ گئے کہ "ہم تمہارے کام سے بہت خوش ہیں۔ جب ہم یہاں واپس آئیں گے تو تمہیں پھر رکھ لیں گے"۔ نواب صاحب بہت اچھے آدمی تھے مگر اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

نواب صاحب اور ان کے خاندان والوں کو چھوڑنے میں تھوڑی دور تک ساتھ گیا۔ انہیں رخصت کر کے واپسی پر اپنا سامان سمیٹا۔ جو کچھ پس انداز کیا تھا اسے لے کر وہاں سے چلا اور ایک بڑی بی نے اپنے کمرے کا ایک گوشہ کرایہ پر دے دیا تھا، اس میں رہنے لگا۔ یہ بڑی بی

کسی اونچے گھرانے میں دایہ تھیں۔ جب بہت ضعیف ہو گئیں تو انہیں وظیفہ دے کر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا "لو دوست عالمین، تم سے رخصت ہونے کا وقت آ پہنچا۔ اب تم مجھے نہیں پاؤ گے" اور صاحب پھر کیا ہوا؟ جب میں شام کو گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میر [illegible] گٹھڑی لئے عالمین بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے بوسیدہ لبادے میں لپٹے پڑے میرا انتظار [illegible] بڑی تنہائی محسوس کی ہو گی جبھی تو بڑی بی سے اس نے دعاؤں کی کتاب [illegible] کتاب الٹی پکڑ رکھی تھی۔ اس نے آخر میرا پتہ چلا ہی لیا تھا۔ میرے ہاتھ بے جان ہو کر لٹک گئے۔ لو بھئی۔ اب اس کا کوئی علاج نہیں۔ میں نے اسے پہلے ہی کیوں نہ نکال دیا؟ میں نے اس سے پوچھا بھی تو کیا "عالمین، تم نے اپنا پاسپورٹ لے لیا تھا"؟ اس کے بعد میں بیٹھ گیا اور اس معاملہ پر غور کرتا رہا۔ یہ جو ایک گھومتے پھرنے والا آدمی ہے کیا یہ میرے کاموں میں حائل ہو گا؟ جب میں اس پہلو پر خوب غور کر چکا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ حائل نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ مجھ پر کچھ ایسا زیادہ بار بھی نہیں ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ اسے کھلانا پڑے گا۔ لیکن یہ ایسا کونسا بڑا خرچ تھا۔ صبح کو ذرا سی روٹی اور پیاز کی ایک آدھ ڈلی۔ دوپہر کو پھر کوئی روٹی اور پیاز اور رات کے لئے پھر روٹی اور پیاز اور رائی کا ٹکڑا۔ اور اگر مل گیا تو بند گوبھی کا شوربہ، چلو دونوں کا پیٹ ناکوں ناک بھر جائے گا۔ میں کم خوراک ہوں۔ عالمین پینے پلانے والا آدمی ہے، وہ کھاتا ہی کتنا ہو گا؟ اسے تو صرف سستی شراب ملنی چاہئے۔ اس کا پیٹا میرا کام تمام کر دے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک عجیب طرح کا احساس مجھ پر طاری ہونے لگا کہ اگر عالمین چلا گیا تو میری زندگی میرے لئے وبال ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس کا محسن بن جاؤں۔ میں اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دوں گا۔ اسے برباد ہونے سے بچاؤں گا اور رفتہ رفتہ اس کی شراب بھی چھڑا دوں گا۔ دل میں میں نے کہا "رہ جاؤ بیٹا ذرا تم میرے پاس، عالمین! جو کچھ میں کہوں اسے سنو۔ میرا حکم مانو"۔

میں نے یہ سوچا کہ پہلے اسے کوئی کام سکھاؤں گا۔ مگر فوراً ہی نہیں۔ ذرا وہ غریب پہلے آرام کر لے۔ اس عرصے میں میں تلاش کروں گا اور معلوم کروں گا کہ اس کے لئے آسان سے آسان کام کیا ہو سکتا ہے۔ کام بھی ایسا ہو جسے وہ کر سکے کیونکہ ہر کام کرنے کے لئے آدمی میں اس کے کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے اور میں نے چپکے چپکے اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ عالمین تو بڑا عجیب نکلا۔ میں نے پہلے چاہا کہ میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کے دل کا بھید لوں، مثلاً میں نے اس سے کہا۔ "دیکھنا عالمین! تم ذرا اپنا خیال زیادہ رکھا کرو اور وقت گزارنے کے لئے تھوڑا بہت کام کیا کرو"۔

"چپنا چھوڑ دو۔ ارے بھئی ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو۔ چیتھڑے لٹک رہے ہیں۔ تمہارا لبادہ چھلنی ہو رہا ہے۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اب تمہیں ہوش میں آنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے"۔

عالمین سر جھکائے میری باتیں سنتا رہا۔ وہ اس حالت کو پہنچ چکا تھا جب شراب کا اثر زبان پر ہو جاتا ہے اور منہ سے کوئی معقول بات نہیں نکلتی۔ آپ کھیت کی کہیے تو وہ کھلیان کی سنتا ہے۔وہ سنتا رہا سنتا رہا۔ دیر تک چپکا سنتا رہا اور پھر اس نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس بھرا

میں نے اس سے پوچھا: "ٹھنڈا سانس کس بات پر لے رہے ہو؟"

"کچھ نہیں اصطفی۔ تم گھبراؤ نہیں۔ آج کا ایک واقعہ یاد آ گیا تھا اصطفی دو عورتیں لڑ رہی تھیں۔ اتفاق کی بات کہ ایک سے دوسری کا ٹوکرا الٹ گیا۔ اور جنگلی بیر بکھر گئے"۔

"اچھا تو پھر؟"

"اور اس عورت نے جس کے بیر گر گئے تھے۔ دوسری عورت کے ہاتھ سے اس کا ٹوکرا چھین کر سارے بیر زمین پر گرا دیے اور پھر یہ کیا کہ ان سب کو پیروں سے کچل ڈالا"۔

"اچھا تو عالمین، پھر اس سے کیا؟"

میں نے دل میں کہا: "عالمین! اس لعنتی شراب نے تمہارے حواس خراب کر دیے ہیں"۔

اس کے بعد عالمین نے پھر کہا: "اور یہ ہوا کہ ایک نواب نے گورو بازار میں دیکھا کہ اس کی جیب میں جو نوٹ رکھے تھے وہ کہیں گر گئے ہیں۔ ایک اور شخص نے جیب میں سے گرتے انہیں دیکھ لیا تھا۔ "یاقسمت" کہہ کر اس نے گڈی اٹھانی چاہی کہ ایک اور آدمی اس سے بھڑ گیا اور بولا "نہیں، یہ میری قسمت کے ہیں۔ میں نے انہیں پہلے دیکھا ہے۔۔۔"

"پھر عالمین؟"

"اور دونوں آدمیوں نے لڑنا شروع کر دیا اصطفی! اس پر طرہ یہ ہوا کہ ایک پولیس والا آیا اور اس نے گڈی اٹھا کر نواب کے حوالے کر دی اور ان دونوں کو دھمکایا کہ اگر زیادہ شور مچاؤ گے تو ابھی تم دونوں کو حوالات میں بند کر دوں گا"۔

"اچھا تو پھر اس سے کیا ہوا؟ عالمین! آخر اس میں ایسی کونسی عجوبہ یا حیرت ناک بات ہے؟"

"بات تو خیر کوئی نہیں لیکن لوگ ہنسنے لگے، اصطفی"!

میں نے کہا: "عالمین! لوگوں کو اس سے کیا غرض؟ تم نے اپنی لافانی روح کو ٹکے میں بیچ ڈالا۔ مگر کیا تمہیں معلوم ہے میں تم سے کیا کہنے والا ہوں؟"

''کیا مصطفیٰ''؟

''بہتر یہ ہے کہ تم کوئی کام کرو۔ تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے۔ میں تم سے سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں کہ تمہیں بچے اوپر رحم کرنا چاہیے''۔

''مگر مصطفیٰ! میں آخر کروں تو کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کام کہاں سے شروع کروں۔ اور مصطفیٰ! مجھے کوئی نوکر نہیں رکھے گا''۔

''عالمین! تمہیں اسی وجہ سے نوکری سے نکال دیا گیا۔ یہ سب پینے پلانے کی بدولت ہے''۔

عالمین نے کہا: ''اور آج انہوں نے بے فروش کو دفتر میں بلایا تھا''۔

میں نے پوچھا۔ ''اسے کیوں بلایا تھا عالمین''؟

''مجھے معلوم نہیں کیوں بلایا مصطفیٰ! شاید اس کی ضرورت ہو گی، اس لئے بلایا ہو گا''؟

میں نے اپنے دل سے کہا ''کچھ نہیں جی! ہم دونوں کسی اچھے نتیجے پر نہیں پہنچیں گے۔ یہ تو ہمارے گناہوں کی وجہ ہے کہ اللہ ہمیں سزا دے رہا ہے''۔

بھلا ایسے آدمی کے ساتھ کوئی کیا کر سکتا ہے۔

مگر صاحب! وہ تھا بڑا چالاک، وہ میری باتیں سنتا رہا، سنتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ میری باتوں سے اکتا رہا ہے۔ جیسے ہی اس نے بھانپا کہ مجھے تاؤ آنے والا ہے اس نے چپکے سے اپنا لبادا سنبھالا اور کھسک گیا اس کے بعد وہ سارا دن دکھائی نہیں دیا۔ شام کو پھر واپس آ گیا۔ نشے میں دھت، نوابوں کی طرح مست۔ اسے شراب کس نے پلائی؟ پینے کے لئے اس کے پاس پیسے کہاں سے آئے؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں نے اسے ایک کوڑی بھی نہیں دی۔

میں نے اس سے کہا ''سنتے ہو عالمین؟ تمہیں شراب چھوڑنی پڑے گی۔ ضرور چھوڑنی پڑے گی۔ اب کے اگر تم پی کر آئے تو تمہیں زینے میں سونا پڑے گا۔ میں تمہیں اندر نہیں آنے دوں گا''۔

اس کے بعد دو دن تک عالمین گھر ہی میں رہا۔ تیسرے دن وہ پھر چپکے سے سٹک گیا۔ اس کی راہ تک رہا ہوں، مگر وہ ہے کہ آتا ہی نہیں۔ سچی بات ہے، میں تو ڈر گیا۔ ڈر کے علاوہ مجھے بڑا رنج ہو رہا تھا کہ نہ جانے اس پر کیا گزری؟ میں اس غریب کے سر خواہ مخواہ ہو گیا۔ ضرور وہ مجھ سے ڈر کر بھاگ گیا۔ نہ جانے وہ بدنصیب کہاں ہو گا؟ یا اللہ! کہیں وہ مر نہ جائے۔ رات گزر گئی اور وہ نہیں آیا۔ صبح کو میں نے بڑے کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہ نیچے کی سیڑھی پر سر رکھے پڑا ہے اور سردی سے اکڑا ہوا ہے۔

"کیا ہو گیا تمہیں عالمین؟ اللہ تم پر رحم کرے۔ یہاں کیوں پڑے ہو تم؟"

اس نے کہا "مگر تم تو جانتے ہو اصطفیٰ! کہ تم کلے دن مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔ میں نے تمہیں غصہ دلا دیا۔ تم نے کہا تھا، میں تمہیں اندر نہیں آنے دوں گا۔ بس سے مجھ میں۔۔۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اندر آ جاؤں۔ اور میں یہیں پڑ رہا۔"

مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔ میں نے کہا "تمہارے لئے یہ بہتر ہو گا عالمین کہ تم کوئی بہتر کام تلاش کرو۔ بجائے اس کے کہ پڑے سیڑھیوں پر بد صورت بنے رہو"۔

"مگر کام آخر کیا کروں اصطفیٰ"؟

مجھے یک دم سے غصہ آ گیا "کمبخت درزی کا کام ہی سیکھ لے۔ ذرا اپنے لبادے کو تو دیکھ، لنجارے پڑے ہوئے ہیں اس میں اور بیریں لگ رہی ہیں۔ اتنا تو تم کر سکتے ہو کہ سوئی لے کر اسے ٹھیک کر لو۔ ذرا تو اس کی شکل بن جائے۔ بس شراب میں دھت ہونا آتا ہے اور کچھ نہیں"۔

تو صاحب! پھر بھلا کیا ہوا؟ اس نے سوئی سنبھالی۔ میں نے تو یونہی چڑانے کو کہا تھا۔ اس نے سچ مچ سوئی سنبھال لی مارے ڈر کے، اس نے اپنا لبادہ اتار کر وہ پھینکا اور لگا سوئی میں تاگہ پرونے۔ نتیجہ ظاہر ہے اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا اور دیدے سرخ ہو گئے ہاتھ کپکپانے لگے۔ وہ تاگے کو بار بار پروتا مگر ناکے میں تاگہ نہیں گیا۔ اس نے تاگے کو منہ سے تر کیا، مروڑیاں دیتا رہا، اسے سیدھا کیا مگر سوئی نہیں پروئی گئی۔ آخر اس نے سوئی تاگہ دور پھینکا اور مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا: "اچھا کیا تم نے عالمین! اگر تمہیں کوئی تاگہ پروتے دیکھ لیتا تو میں مارے شرم کے مر جاتا۔ میں نے تو مذاق میں تم سے کہا تھا اور اس لئے بھی مجھے تم پر غصہ آ رہا تھا۔ خیر، چھوڑو اس سینے پرونے کو۔ اللہ تمہیں گناہوں سے بچائے۔ تم کچھ نہ کرو۔ بس بیہودگی سے دور رہو۔ اور زینے میں مت سوؤ کہ مجھے بعد میں شرمندہ ہونا پڑے"۔

"مگر میں کروں کیا آخر، اصطفیٰ؟ میں اپنے آپ کو جانتا ہوں کہ میں ہمیشہ نشے میں رہتا ہوں اور مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا اور میں تمہیں اپنے مح ---- محسن کو بلاوجہ ناراض کر دیتا ہوں"۔

اور ایک دم سے اس کے نیلے نیلے ہونٹ کانپنے لگے۔ پھر اس کے زرد رخسار اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ایک آنسو ڈھلک آیا۔ پھر ایک اور، ایک اور۔ اور میرے عالمین کی آنکھوں سے آنسوؤں

کا دریا امنڈنے لگا۔ اللہ اکبر! ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر چھری چلا دی ہو۔

"افوہ! بھئی تم تو بہت حساس آدمی ہو۔ لو مجھے تو اس کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ اور بھلا یہ گمان ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ نہیں بھئی، تمہیں تو تمہارے ہی حال پر چھوڑ دینا چاہیئے، عالمین! جو تمہارے جی میں آئے کرو"۔

بس صاحب! اور کہنا کیا باقی رہ گیا۔ یہ سارا واقعہ ہی اس قدر غیرضروری اور حقیف ہے کہ اسکا ذکر کرنا اس پر وقت ضائع کرنا ہے۔ مثلاً جناب اس کے دو ٹکے بھی نہ دیں، مگر میرے نزدیک اس کی قیمت زیادہ ہے۔ اگر میرے پاس کچھ ہو تو میں سب کچھ دے دوں اور وہ بات نہ ہونے دوں جو ہو گئی۔ بات یہ ہوئی کہ میری ایک برجس تھی نیلے رنگ کی اور اس پر ٹکیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بڑی اعلیٰ درجے کی چیز تھی خدا غارت کرے، ایک بڑا زمیندار یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے سلوائی تھی۔ مگر جب وہ تیار ہو گئی تو زمیندار نے کہا یہ تو بہت تنگ ہے۔ وہ چھوڑ کر چلا گیا اور پھر لینے نہیں آیا۔

میں نے سوچا کہ کپڑا تو اعلیٰ درجے کا ہے اگر میں اسے گدڑی بازار میں بھی بیچوں تو اچھی قیمت مل جائے گی۔ ورنہ اس میں سے ایک اچھی پتلون نکل آئے گی جسے کوئی شہری ہاتھوں ہاتھ لے گا اور ایک ٹکڑا میری واسکٹ کے لئے بچ رہے گا۔ غریب کے لئے تو کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی۔ عالمین اس وقت بہت فلاکت زدہ ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے شراب خوری چھوڑ دی تھی۔ ایک دن گزرا، دوسرا گزرا، تیسرا گزرا، وہ بڑا مایوس سا دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ اس کی یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ اس کے پاس پینے کے لئے پیسہ نہیں ہے۔ یا پھر اس کی عقل نے اس کا ساتھ دیا اور وہ راہِ راست پر آ گیا۔

قصہ مختصر، ایک ضروری چھٹی کا دن آ گیا اور میں شام کو دعاخوانی میں چلا گیا۔ جب گھر لوٹا تو میں نے دیکھا کہ عالمین خوب پیے پلائے نوابوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ میں نے جی میں کہا تو جناب یہ کر کے آئے ہیں۔ اور میں نے کچھ نکالنے کے لئے اپنا ٹرنک کھولا۔ لو! وہ برجس غائب ہے۔ ادھر دیکھا، ادھر دیکھا، کہیں نہیں۔ جب میں نے اسے سارے کمرے میں تلاش کر لیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ برجس غارت ہو گئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سن سے کوئی چیز میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے بڑی بی کا رخ کیا۔۔۔ رہا عالمین، ہرچند کہ اس کے پیے ہوتے سے اس کے خلاف بہت کچھ ثابت ہو رہا تھا مگر نہ جانے میرا خیال اس کی طرف کیوں نہیں گیا۔

بڑی بی نے کہا: "لو خدا نہ کرے۔ بھلے آدمی میں بھلا برجس کا کیا کروں گی؟ کیا میں

اسے پہنوں گی؟ کل میرا گھاگرا کھو جاتا رہا۔ اب تک اس کا پتہ نہیں چلا''۔

میں نے پوچھا ''کوئی آیا تو نہیں تھا''؟

بڑی بی نے کہا ''یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا میں ... سے باہر نکلی کہ ابھی ... تمہارا دوست ذرا سی دیر کے لئے باہر گیا تھا، پھر واپس آ گیا۔ وہ بیٹھا ہے کس سے کیوں نہیں پوچھتے''؟

''تم نے تو کسی کام سے عالمین میرے ٹرنک میں سے برجس کہیں نکالی'' وہ جو تمہیں یاد ہو گی ایک زمیندار نے بنوائی تھی۔

وہ بولا ''نہیں اصطفیٰ! میں نے نہیں لی''۔

''تو پھر وہ گئی کہاں''؟ اور میں نے پھر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا مگر بے سود۔ اور عالمین کھڑکی میں بیٹھا نشے میں جھوم رہا تھا۔

میں زمین پر گھٹنے ٹیکے عالمین کے بالکل سامنے جھکا ہوا ٹرنک میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے یک دم سے انکھیوں سے اسے دیکھا۔ میرا دل جل رہا تھا اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ ایکا ایکی اس سے آنکھیں چار ہو گئیں۔

عالمین نے کہا ''نہیں اصطفیٰ! تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے ـــــ میرا مطلب ہے کہ ـــــ تم سمجھ گئے ہو گے ـــــ مگر میں نے نہیں لی۔

''پھر آخر وہ گئی کہاں عالمین''؟

اس نے کہا ''نہیں اصطفیٰ، میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں''۔

''اچھا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ خود ہی کہیں جا کر کھو گئی۔ کیوں عالمین''؟

''ہو سکتا ہے کہ یہی ہوا ہو اصطفیٰ''۔

اس کے بعد اس سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹرنک میں قفل لگایا اور لیمپ جلا کر اپنا کام لے بیٹھا۔ میں ایک سرکاری کلرک کی واسکوٹ دوبارہ ٹھیک کر رہا تھا وہ نچلی منزل ہی میں رہتا تھا۔ مگر میرا دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ خیال آیا کہ اس سے اچھا یہ تھا کہ آگ لگ جاتی اور میرا سارا سامان جل کر راکھ ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالمین کو میرے غصہ کا احساس ہو رہا تھا۔ جب دل میں چور ہو تو یہی حال ہوتا ہے۔ اسے پہلے سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب کوئی آفت آنے والی ہے بالکل اسی طرح جیسے چڑیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب طوفان آنے والا ہے۔

''اور بھی کچھ سنا تم نے اصطفیٰ! ڈاکٹر نے کوچین کی بیوہ سے شادی کر لی''؟

یہ بات اس نے یک دم سے کہہ دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا مگر شاید اتنے غصے

سے کہ وہ سمجھ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ میرے بستر کے قریب گیا اور سامنے ٹٹولنے لگا۔ آپ ہی آپ کہتا جاتا تھا۔ "آخر گئی کہاں؟ غائب ہو گئی جیسے شیطان اڑا لے گیا ہو"۔

میں چپکا بیٹھا رہا کہ دیکھو ابھی اور کیا کرتا ہے۔ پھر عالمین میری چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

میں نے کہا "عالمین! تم چارپائی کے نیچے کیوں گھسے ہو"؟

عالمین نے چارپائی کے نیچے ہی سے کہا۔ "میں برجس ڈھونڈ رہا ہوں مصطفیٰ! شاید اس کے نیچے کسی طرح چلی گئی ہو"۔

"مگر جناب! آپ مجھ غریب کی خاطر اس طرح اپنے آپ کو زحمت کیوں دے رہے ہیں؟ خواہ مخواہ اپنے گھٹنے میلے کر رہے ہیں۔

غصہ میں اس سے آپ جناب سے باتیں کر رہا تھا گویا وہ بھی کوئی صاحب تھے۔

"مگر مصطفیٰ میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے نیچے تلاش کیا جائے تو شاید مل جائے"۔

"ہوں، ذرا ایک بات میری سنو عالمین"۔

"کیا مصطفیٰ"؟

مارے غصے کے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ چارپائی کے نیچے وہ اس لیے گھس رہا تھا کہ جو چیز وہ جانتا تھا کہ وہاں نہیں ہے اسے تلاش کرے۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"کیا تم نے بدمعاش چور کی طرح اسے نہیں چرایا اور یوں میرے نان و نمک کا بدلہ تم نے مجھے دیا؟ سیدھی بات کیوں نہیں کرتے"؟

"نہیں مصطفیٰ"۔۔۔ اور وہ دیر تک چارپائی کے نیچے پڑا رہا۔ پھر وہ ایکا ایکی رینگ کر باہر نکل آیا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔۔۔ میری آنکھوں کے آگے اب بھی اس کی تصویر پھر رہی ہے۔ گناہِ مجسم کی طرح بھیانک۔

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا: "نہیں" وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا اور اپنی انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں کچھ ایسا مبہوت ہو گیا کہ کھڑکی کے قریب بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ "میں نے تمہاری برجس نہیں لی، مصطفیٰ"۔

میں نے کہا۔ "اچھا تو عالمین! مجھے معاف کر دو کہ میں نے تم پر چوری کا اتہام لگایا۔ رہی برجس، تو چلو اسے غارت کرو۔ ہم بغیر اس کے ہی زندہ رہیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس اپنے ہاتھ ہیں اور ہمیں چوری کرنے کی ضرورت نہیں

پڑے گی اور اب بھی ہمیں کسی غریب کو دھوکہ دینے کی ضرورت نہ ہو گی۔ ہم اپنے روزی آپ کمائیں گے"۔

عالمین کچھ دیر تک میرے سامنے کھڑا رہا۔ میری باتیں سنتا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور بے حس و حرکت رات گئے تک بیٹھا رہا۔ جب میں سونے کے لئے لیٹا تو وہ اس وقت بھی بیٹھا ہوا تھا۔

صبح کو جب میں جاگا تو دیکھا کہ وہ اپنا لبادہ لپیٹے زمین پر پڑا سو رہا ہے۔ اسے اتنی نفرت ہوئی تھی کہ اپنے بستر پر جا کر سو رہنے کو بھی اس کا جی نہ چاہا

تو صاحب اس دن سے مجھے اس شخص سے شدید نفرت ہو گئی۔ شروع شروع میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے لڑکے ہی نے میری چوری کی ہو اور مجھے سخت متنفر کر دیا ہو۔ مجھے ہر وقت عالمین ہی کا خیال آتا رہتا اور صاحب عالمین تھا کہ دو ہفتے کے لئے اپنا غم غلط کرتا پھرا۔ صبح سے شام تک جانوروں کی طرح پیتا اور پورے دو ہفتے اس نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ شاید اسے کوئی گہرا غم کھائے جا رہا تھا یا پھر وہ اس طرح اپنی زندگی ختم کرنا چاہتا تھا۔ آخر تھک کر اس نے شراب چھوڑ دی۔ شاید اس کے پاس ٹھرا خریدنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔۔۔ جو کچھ بھی اسے ملا سب کی شرب پی گیا۔ اور پھر کھڑکی میں اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں وہ پورے تین دن تک خاموش بیٹھا رہا۔ ایک دم سے اسے دیکھا کہ رو رہا ہے۔ کھڑکی میں بیٹھا ہے اور رو رہا ہے۔ اور رونا بھی کیسا رونا! آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔ صاحب کسی بڑی عمر کے آدمی کو روتا دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اور پھر جب کہ عالمین کی طرح کوئی معمر ہو اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہو۔

میں نے اس سے کہا: "عالمین! تمہیں کیا تکلیف ہے"؟

وہ چونک کر کانپنے لگا۔ اس دن کے بعد میں نے آج پہلی دفعہ اس سے بات کی تھی

"کچھ نہیں اصطفیٰ"۔

"اللہ تم پر رحم کرے عالمین! تم اس کا خیال نہ کرنا۔ گزشتہ را صلوٰۃ۔ ارے بھئی اس کا ملال نہ کرو"۔

مجھے اس پر بڑا ترس آ رہا تھا۔

"بات یہ ہے، یہ کہ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ کچھ کام کرنا چاہتا ہوں، اصطفیٰ"۔

"مگر کام آخر کس قسم کا ہو عالمین"؟

"کسی قسم کا بھی ہو، شاید میں کوئی نوکری ہی کر لوں، پہلے کی طرح۔ جہاں میں پہلے

نوکر تھا وہاں میں پوچھنے گیا بھی تھا۔ یہ میرے لئے ٹھیک نہیں اصطفٰی، کہ تم پر ہی پڑا رہوں۔ مجھے اصطفٰی! شاید کوئی ملازمت مل جائے گی اور پھر میں تمہیں سارے خرچ دے سکوں گا۔ کھانے کے علاوہ سارے خرچ"۔

"ایسا مت کہو عالمین! یہ مت کہو۔ تم نے ایک گناہ کیا تھا۔ چلو وہ ختم ہوا۔ لعنت برکارِ شیطان۔ اب ہم اسی طرح رہیں گے جس طرح پہلے رہتے تھے۔ گویا کوئی بات ہوئی ہی نہیں"۔

"تم اصطفٰی، تم شاید اسکی طرف اشارہ کر رہے ہو مگر میں نے تمہاری بر جس نہیں لی"۔

"اچھا، تو پھر جو تم کہو وہ درست عالمین"۔

"نہیں اصطفٰی، ظاہر ہے کہ میں تمہارے ساتھ اب نہیں رہ سکتا۔ معاف کرنا تم مجھے اصطفٰی"۔

"مگر خدا کے لئے عالمین! تمہیں آخر کون ناراض کر رہا ہے یا گھر سے نکال رہا ہے؟ کیا میں"؟

"نہیں" مگر یہ میرے لئے مناسب نہیں ہے کہ تمہاری مہمان نوازی سے اب غلط فائدہ اٹھاؤں۔ اصطفٰی! اب یہاں سے جانا ہی بہتر ہے"۔

میں نے دیکھا کہ واقعی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا بوسیدہ لبادہ پہن لیا۔۔۔ اس نے بُرا مانا تھا۔ یقیناً اس نے میرے کہے کو محسوس کیا تھا اور اس کے دل میں سما گئی تھی کہ چلا ہی جائے۔

"مگر تم کہاں جا رہے ہو عالمین؟ عقل کی بات کرو، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہاں جاؤ گے تم"؟

"نہیں، یہی بہتر ہے اصطفٰی! مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو"۔

اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"جانے دو مجھے اصطفٰی! اب تم وہ نہیں رہے جو پہلے تھے"۔

"کیوں نہیں ہوں؟ میں تو بالکل وہی کا وہی ہوں۔ مگر تم اکیلے رہ جاؤ گے تو مر جاؤ گے عالمین۔۔ بے عقل بچے کی طرح مر جاؤ گے"۔

"نہیں اصطفٰی! اب تم نے یہ کرنا شروع کیا ہے کہ جب گھر سے باہر جاتے ہو تو ٹرنک میں قفل ڈال کر جاتے ہو اور میں، اصطفٰی! اسے دیکھتا ہوں اور روتا ہوں۔۔۔ نہیں، بہتر یہی ہے کہ تم مجھے جانے دو، اصطفٰی! اور دیکھنا تمہارے ساتھ رہنے میں اگر میں نے تمہیں اپنی کسی بات سے ناراض کیا ہو تو مجھے معاف کر دینا"۔

تو جناب! وہ آخر چلا ہی گیا۔ ایک دن تک میں نے انتظار کیا اور سوچتا رہا کہ رات کو آ جائے گا۔ مگر ایک دن گزر جاتا ہے، دوسرا گزر جاتا ہے۔ مگر وہ نہیں آتا۔ تیسرے دن وہ نہیں آتا۔ مجھے اب اندیشہ ہونے لگا اور شدید غم میرے دل پر چھا گیا۔ میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور ساری ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتا۔ اس شخص نے تو مجھے تین دن میں رلا دیا۔ چوتھے دن میں اسے تلاش کرنے نکلا۔ میں نے قریب کے تمام شراب خانوں میں اسے ڈھونڈا اور دریافت کیا کہ اسے کسی نے دیکھا تو نہیں۔ مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ غائب ہو گیا تھا۔ خیال آیا کہ شاید اس نے اپنی دکھ بھری زندگی کا خاتمہ نہ کر لیا ہو، کسی [illegible] کی دیوار کے نیچے کتے کی موت نہ مر گیا ہو۔ تھکان اور ناامیدی سے چُور ہو کر گھر لوٹا یہ سوچ کر کل پھر اسے ڈھونڈوں گا۔ اپنے آپ کو کوستا رہا کہ اس شخص سے بار بار [illegible] تھی تو میں نے بھلا کیوں جانے دیا" لیکن پانچویں دن علی الصباح (چھٹی کا دن تھا) دروازے پر دستک کی چاپ سنائی دی۔ اور لو عالمین آ گیا۔ مگر کس حال میں! اسکا چہرہ نیلا پڑا ہوا تھا اور آنکھیں دھنسی ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بازاروں میں سوتا پھرا تھا۔ بے چارا سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ [illegible] سے اپنا لبادہ اتارا اور ٹرنک پر بیٹھ گیا اور میری طرف تکنے لگا۔ صاحب! مجھے بے حد خوشی ہوئی مگر ساتھ ساتھ میرے دل کو غم محسوس رہا تھا۔ معاملہ کچھ ایسا تھا، مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ اگر یہی واقعہ مجھے پیش آتا تو میں کتے کی موت مرنا پسند کرتا، واپس ہرگز نہ آتا۔ اور عالمین واپس آ گیا بہرحال، یہ ایک قدرتی امر ہے کہ آپ کسی کو بھی ایسے برے حال میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ میں نے ہر طرح سے اسے بہلانا اور دلاسا دینا شروع کیا۔

میں نے کہا۔ "عالمین! مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم واپس آ گئے۔ اگر تم اتنی جلدی واپس نہ آتے تو میں تم کو یہاں نہ ملتا کیونکہ میرا ارادہ تمہاری تلاش میں نکل جانے کا تھا۔ تم نے کچھ کھایا بھی"؟

"کھایا ہے مصطفیٰ"۔

مجھے یقین نہیں آتا۔ لو یہ کرم کلے کا شوربہ ہے۔ کل کا بچا ہوا اچھا شوربہ ہے گوشت والا۔ وہ نہیں جس میں برائے نام گوشت ہوتا ہے۔ اور یہ لو روٹی اور پیاز کی ڈلی۔ بس شروع ہو جاؤ۔ اس سے ذرا تم میں جان آ جائے گی"۔

میں نے یہ سب چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں۔ جس طرح گر گر کر اس نے کھایا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پچھلے تین دن سے اسے فاقہ ہی تھا۔ اچھا تو یہ بھوک تھی جس کی وجہ سے وہ میرے پاس واپس آیا۔ اس بچارے کو میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس پر بڑا ترس آیا اور میں

نے طے کیا کہ پاس کے شراب خانہ لپک کر جاؤں اور اس کے لئے ٹھرا لے آؤں۔ اس سے [illegible] اس میں جان آ جائے گی اور ذہنگ کی باتیں بھی ہو سکیں گی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، مجھے [illegible] کوئی شکایت نہیں ہے اور میں جا کر ٹھرا لے آیا اور اس سے بولا ''آؤ عالمین [illegible] کی [illegible] میں ہم تم دونوں ایک دوسرے کا جام صحت پئیں، آؤ پیو اس سے تمہیں فائدہ پہنچے گا''

[illegible] کر پھیلا دیا پھر بھرا ہوا گلاس اٹھایا، منہ تک لے گیا۔ ہاتھ کانپ رہا تھا، اس [illegible] سب کچھ گرایا۔ بہرحال منہ تک کسی نہ کسی طرح لے ہی گیا مگر فوراً ہی [illegible]

''[illegible] عالمین، پیتے کیوں نہیں''؟

''[illegible] نہیں، میں نہیں پیوں گا اصطفیٰ''۔

''تم نہیں پیو گے''؟

''ہاں اصطفیٰ! میرا خیال ہے کہ اب میں کبھی نہیں پیوں گا اصطفیٰ''۔

''کیا تم نے چھوڑنے کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے کر لیا ہے عالمین، یا صرف آج کے لئے''؟

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا سی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر اپنے ہاتھ پر جھکا لیا۔ میں نے پوچھا ''کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے عالمین''؟

''نہیں، اچھی خاصی ہے، اصطفیٰ''۔

میں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اس کی حالت واقعی اچھی نہیں تھی۔ اس کا سر جل رہا تھا او وہ بخار میں پھلا رہا تھا۔ میں سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہا۔ شام ہوتے اس کی حالت بگڑنے لگی۔ میں نے اس کے لئے رائی کی شراب، مکھن اور پیاز کا کھانا تیار کیا تھا اور اس میں روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ڈال دیے تھے۔ میں نے کہا ''اٹھو، کچھ کھا لو، شاید اس سے تمہاری طبیعت سنبھل جائے''۔

مگر اس نے سر ہلا کر کہا: ''نہیں اصطفیٰ، آج میں کھانا بالکل نہیں کھاؤں گا''۔

میں نے بڑی بی کو زحمت دی اور ان سے چائے بنوائی مگر عالمین نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔

میں نے دل میں کہا معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ تیسرے دن صبح ہی صبح میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے ہاں گیا۔ اس نے میرا علاج بڑا اچھا کیا تھا۔ ڈاکٹر آیا۔ مریض کا معائنہ کیا اور بولا: ''مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بچارا تو بہت دور جا چکا ہے۔ پڑیاں لکھے دیتا ہوں، کھلا

دینا"۔

میں نے اسے پڑیاں بالکل نہیں دیں، مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صرف دل رکھنے سے لئے نسخہ لکھ گیا ہے۔ اب پانچواں دن لگ گیا۔

اب صاحب! وہ میرے سامنے پڑا مر رہا تھا۔ میں کوٹھڑی میں بیٹھا تھا اور میری بیوی ... کام پڑا تھا بڑی بی چولھا جلا رہی تھیں۔ ہم سب خاموش تھے۔ بے چارے بے حس و حرکت مرنے والے پر میرا دل رو رہا تھا۔ جیسے میرا اپنا بچہ مجھ سے جدا ہو رہا ہو۔ میں جان رہا تھا کہ عالمین کی نظریں ایک سال مجھی پر جمی ہوئی ہیں۔ صبح سویرے سے ہی میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے مگر بظاہر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کہہ سکے۔ آخر میں نے بھی اس کی طرف دیکھا اور وہ اب بھی مجھے تکے جا رہا تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے اپنی نظریں فوراً جھکا لیں۔

"مصطفیٰ"!

"کیا ہے عالمین"؟

"اگر میرا لبادہ گدڑی بازار لے جایا جائے مصطفیٰ تو کیا اس کی کچھ رقم مل جائے گی"؟

میں نے کہا: "ابھی میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر تین چاندی کے سکے تو مل ہی جائیں گے اس کے، عالمین"! میں نے یہ بات محض اس بے چارے کا دل رکھنے کے لئے کہہ دی ورنہ میں اس چیتھڑے لگی چیز کو اگر بیچنے جاتا تو بازار والے میری ہنسی اڑاتے۔

"اور میرا یہ خیال تھا کہ کچھ اور زیادہ مل جائے گا مصطفیٰ! یہ کپڑے کا بنا ہوا ہے۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین سکوں سے زیادہ وہ اس کے نہیں دیں گے"؟

"بات یہ ہے عالمین کہ اگر تم اس کو بیچنا چاہو تو بے شک تم اس کا زیادہ بھی مانگ سکتے ہو"۔

عالمین ذرا سی دیر خاموش رہا اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

"مصطفیٰ"!

"کیا ہے عالمین"؟

"جب میں مر جاؤں تو تم میرا لبادہ بیچ ڈالنا۔ مجھے اس میں کفنانے کی ضرورت نہیں۔ میرا کام اس کے بغیر بھی چل جائے گا۔ اسکی اچھی قیمت مل جائے گی اور تمہارا ہاتھ تنگ نہیں رہیگا"۔

یہ سنکر میرے دل میں ایسی ٹیس اٹھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ موت کی مایوسی مرنیوالے پر چھائی جا رہی تھی۔ اب پھر ہم دونوں خاموش تھے اسی طرح ایک گھنٹہ گذر گیا۔ میں نے پھر اس

کی طرف دیکھا۔

وہ مجھے دیکھے جا رہا تھا اور جب آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

میں نے اس سے پوچھا: ''ٹھنڈا پانی پیو گے عالمین''؟

''تھوڑا سا دے دو۔ اللہ تمہیں اس کی جزا دے اصطفیٰ''!

''کچھ اور چاہیئے عالمین''۔

''نہیں اصطفیٰ، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ مگر میں۔۔۔''

''کیا''؟

''تمہیں معلوم ہے کہ۔۔۔''

''تمہیں کیا چاہیئے عالمین''؟

''نرجس۔۔۔ تمہیں معلوم ہے۔۔۔ میں نے ہی لی تھی اصطفیٰ''۔

میں نے کہا: ''خیر، اللہ تمہیں معاف کرے گا عالمین، بے کس و بدنصیب ہو، چین سے رخصت ہو''۔

اور مجھے اس کی طرف سے منہ پھیر لینا پڑا کیونکہ مارے غم کے میرا سانس رک گیا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے''۔

''اصطفیٰ۔۔۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔۔۔ اس کے چہرے پر سرخی آئی اور اس نے میری طرف دیکھا۔۔۔ میں نے دیکھا کہ ایک دم سے رنگ زرد پڑنے لگا۔ پلک جھپکتے میں اس کا سکا ڈھلک گیا، بس ایک سانس لی اور اپنی جان اللہ کے حوالے کر دی۔

جینی

شفیق الرحمن

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ نیلے [illegible] سے پوچھا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا، جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین [illegible] اور تب [illegible] چپ چپ آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے کافی دیر تک اکٹھے رہے کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی۔ پھر ایک دوسرے سے [illegible] ہو گئے اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی

طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گزاری جائے اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی حد تک بدل چکا تھا موٹاپے نے اس کے تیکھے خد و خال کو مبہم بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا وہ تجسس، نگاہوں کی وہ بے چینی، وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دوہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا لڑکی نے بتایا کہ شام کا وقت وہ گرجے کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے اس نے بھی معذرت چاہی کیوں کہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری کے گھر پہنچے اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبوئیں بھی آ رہی تھیں اور کبھی کبھار آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھلا وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہوا تو اچھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آ کر اس نے ٹیلیفون پر کوشش کی، تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی لیکن شام کو اس کی امی اسے نانی جان کے ہاں لے جا رہی تھیں۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی۔ میرے لئے بھی انڈیلی اور اصرار کرنے لگا، یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے چھوا، کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا پھر ٹہلتا ٹہلتا دریچے تک گیا، ایک بڑے سے گملے میں انڈیل کر واپس آ گیا۔ اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی مجھے بھی دی، میں پھر اٹھا اور اپنا حصہ کھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ پر روزانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا، کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت طوط چشم تھیں شراب کے متعلق جو دن بدن مہنگی ہوئی جا رہی تھی۔ اپنے معاشقوں کے متعلق جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی لیکن وہ اس سے مہینوں نہ ملتا۔ جب کبھی بھولے سے گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ عاجز آ جاتا۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ ایک ہواباز کی زندگی کس قدر خطرناک زندگی ہے۔ گرچہ یہ زندگی اس نے خود منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا جسے اس وقت گرجے میں ہونا چاہئے تھا وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکی آ گئی جس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ تیسری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے۔ چچی امی یا نانی جان کے ساتھ نہیں، ایک دوسرے ہواباز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا، نہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکہ دیتی ہیں۔ ہمیشہ دغا دیتی ہیں آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کئے جا رہا تھا میرے حصے کی ساری شراب گملوں اور پودوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کے دنوں میں باقاعدہ سگریٹ بھی نہ پیتا تھا اب ایسا شرابی ہو گیا کہ اتنی پی چکنے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا تھا۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جینی تھی۔ جو رقص کا لباس پہنے، ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ ابھی ابھی آئی تھی۔ ہم دونوں اٹھے، ہمیں دیکھ کر جینی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی تعارف ہوا۔۔۔ میرے خاوند سے ملئے۔۔۔ اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں۔۔۔

میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کے خاوند کو مبارکباد دی۔۔۔ اور کہا کہ وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، وہ چالیس سے اوپر کا ہو گا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ، دھندلی تھکی تھکی آنکھیں، بے حد معمولی شکل، پستہ قد۔ اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا تو شاید ہم اس کی طرف دوسری مرتبہ نہ دیکھتے۔ لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے، اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ویسی ہی ہے اس کے ہونٹوں کی وہ دلاویز اور مخمور مسکراہٹ ویسی کی ویسی ہے، وہ مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی، جسے مونالزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔۔۔ نہایت پراسرار اور ناقابل فہم مسکراہٹ، جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جو ہمیشہ رہی

اور یہی مسکراہٹ میں نے سالہا سال سے دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ سے میں مدتوں شناسا رہا۔ جینی کے خاوند کے دوست آ گئے اور مقامی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے، جہاں بوتل اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیں لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ان تین لڑکیوں کے لئے اداس تھا جو اسے دھوکہ دے کر دوسروں کے ساتھ چلی گئیں۔ آج یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا اور یہ لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں، پرانی دوست تھیں۔ اس کے ساتھ باہر جا چکی تھیں۔ اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں دراصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر طرف سے لگ رہی تھیں ریس، برج، سٹا ہر جگہ وہ ہار رہا تھا۔ ایک ادنیٰ فلم کمپنی کی ایکسٹرا لڑکی جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا، اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی۔۔۔ اور میں دزدیدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں جینی تھی۔ وفور مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا اس کی آنکھیں روشن تھیں۔۔۔ وہی آنکھیں جو کبھی غمگین اور نم ناک رہا کرتیں اب مسرور تھیں۔ رخسار جن پر مدتوں آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں اب تاباں تھے۔ وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے جو جینی کی قسمت بن چکا تھا۔ اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زائد مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟ اور اس پراسرار مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی روح بہت دور تھی وہاں تک میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ اذیت کن، کرب ناک شدید

تلاطم۔ یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا؟ یا وہاں سب کچھ یخ ہو چکا تھا؟ برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا۔

اسکا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔

وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ کئی مرتبہ وہ بالکل قریب سے گزرے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی اس نے ماضی وحال کی حدوں کو محیط کر لیا وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے تاریک گوشوں میں مدفون تھیں۔

میں۔۔ برسوں پہلے پہلے آپ کو یونیورسٹی کے مباحثے میں دیکھا۔ میرے ساتھ میرا پرانا رفیق اور ہم جماعت۔ جی بی تھا۔ وہ ان دنوں بہترین مقرر تھا۔ سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج پر آئی۔ گھنگھریالے بال، جھکی ہوئی آنکھیں، لبوں پر محجوب مسکراہٹ، ملجلا انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے۔۔۔

ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی نئی کہیں سے آئی ہے اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے لیلیٰ کہتے ہیں۔ شاید اس کی ملیح رنگت اور گھنگھریاں پریشان زلفوں کی وجہ سے۔

کچھ دیر وہ شرماتی رہی، بول ہی نہ سکی۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جی بی کی تقریر کی مخالفت شروع کی۔ ایسے ایسے نکتے لائی کہ سب حیران رہ گئے۔ جی بی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی۔

جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جی بی اور اس لڑکی میں تقسیم کیا جائے گا لیکن جی بی نے ججوں سے درخواست کی کہ انعام کی وہی حقدار ہے اور اسی کو ملنا چاہیے جی بی کے رویے کو سراہا گیا، ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی پہلا انعام جیت رہی تھی، وہ بھی ایسی لڑکی جو بالکل نووارد تھی۔

جب لیلیٰ سٹیج پر چاندی کا بڑا سا وزنی کپ لینے گئی تو اس کی پریشان زلفیں اور پریشان ہو گئیں، نگاہیں اور جھک گئیں جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا گیا تو جی بی نے لپک کر کپ کا چوبی حصہ خود اٹھا لیا۔ لیلے نے جی بی کو جھکی ہوئی نگاہوں سے ایک مرتبہ دیکھا۔

اس بھولی بھالی الھڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جی بی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہردلعزیز کالج میں سب سے ذہین، چست، خوش شکل اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کار پروفیسروں کی کاروں سے بھی بڑھیا

تھی۔ جہاں کہیں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جی بی کو مدعو کیا جاتا۔ ہمارے کالج سے لیلے کو بھی بلایا جاتا۔۔۔ لیلے کے خد و خال حسین نہیں تھے۔ اگر اسے نقادانہ طور سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہیں تھی۔۔۔ لیکن اگر حسین خد و خال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہو سکتا ہے تو وہ لیلے تھی۔ اس کی بہرتی ہوئی زلفیں جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ننھے سے ہونٹ تیز چمپئی رنگت۔۔۔ اور نہایت معصوم باتیں۔۔۔۔ سب مل کر نرالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بے حد پیاری معلوم ہوتی۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ سب سے الگ تھلگ۔ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں۔ اس کے خون میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی ہندوستان کی تھی، اس لئے نہ اس کا کوئی خاص مذہب تھا نہ کوئی نسل۔ لیلی کا نام بھی عجیب سا تھا۔ اس کا سارا نام بھی ملا جلا سا تھا۔ وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کرتی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار ہے وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے۔

پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ لیلے جی بی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ یہ افواہ بنی، پھر عام ہو گئی ہر جگہ اس نئے معاشقے پر تبصرے ہونے لگے۔ سب نے دیکھا کہ لیلی کے دل کا راز عیاں ہو چکا تھا۔ وہ جی بی کو چاہتی ہے طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملتی۔ جانے پہچانے راستوں سے ایسے وقت گزرتی کہ جی بی نظر آ جاتا۔ جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا بھر کی نعمتیں مل جاتیں۔ یہ نوزائدہ محبت اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی۔ وہ مسرور رہنے لگی۔ ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی اس کا اجنبی لہجہ درست ہوتا گیا، اس کی گفتگو میں مٹھاس آ گئی۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کتنی ہی مرتبہ اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی وہ لیلی سے ملتا، اسے ملنے کے موقعے دیتا، خوب باتیں کرتا بڑی شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو، جس کا وہ عادی تھا۔

چاندنی رات میں دور ایک باغ میں تقریب ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ لیلی بھی آئی۔ جی بی ہمارے ساتھ نہیں آیا، معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو لے کر آئے گا۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی۔ یہ اس کی نئی محبوبہ تھی۔

جی بی دیر میں آیا، کار سے وہ اکیلا اترا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی، وہ مایوس اور کھویا کھویا سا تھا، اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا، لیکن اسے اجازت نہ ملی، وہ تو ایسی محفلوں کی جان

تھا۔ جب وہ اپنا سانیٹ سنا رہا تھا تو لیلیٰ اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے آئینے میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو، جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو۔ جی بی نے خلاف توقع غم آمیز اشعار سنائے جن میں شکوے تھے، التجا تھی اور وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی۔

لیلیٰ نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔ میں نے لوکا۔ ایک طرف لے جا کر ڈانٹا بھی لیکن جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ بجلی آ گئی۔ جی بی چند ثانیے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا۔ وہ مبہوت سی چپ چاپ چلی گئی۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا پہلے بوسے پر وہ کانپ اٹھی۔ اس جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جی بی کے سینے سے سر لگا دیا۔ وہ اسے چپکے ہونٹوں سے چومتا رہا۔ ایسے الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جو لیلیٰ کے لئے نہیں کسی اور کے لئے تھے۔ اس کے بازوؤں میں لیلیٰ نہیں تھی، کوئی اور بے وفا حسینہ تھی جس کے لئے وہ بے تاب تھا۔

لیلیٰ شدت احساس سے آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی، وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی۔ وہ شعر و نغمے کی وادیوں میں جا پہنچی جہاں اسکے تھپے ہوئے خوابوں کی تعبیریں آباد تھیں جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں، جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے، جہاں صرف خوشیاں تھیں اور محبت پاشیاں۔

اسکے بعد لیلیٰ کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر نیا نکھار آ گیا جو پہلے محض تخیل تھا وہ تخلیق ہو گیا۔ غنچے چٹکے، خوش الحان طیور چہچہانے لگے۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں۔ زمین سے آسمان تک قوس قزح کے رنگ پھیلنے لگے، ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا۔ اس کے بعد نہ موت اور نہ زندگی۔ محض خواب تخیل اور حقیقت کی حدوں پر چھا گیا۔

بہت دیر کے بعد لیلیٰ اس خواب سے چونکی دفعتاً پھر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی۔ جی بی کو اس سے محبت نہ تھی۔ جی بی کے لئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اسکا تعاقب کرتی تھیں۔ بغیر کسی صلے کے اسے چاہتی تھیں۔

جب بات بہت مشہور ہوئی تو جی بی کترانے لگا، اس نے تقریبوں میں آنا جانا بند کر دیا۔ لیلیٰ کو دیکھ کر کار تیز کر دیتا اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر لیلیٰ کو یقین نہ آیا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ

یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اس صدمے کو س نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا لیا لیکن اسکی محبت، جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی، تحائف بھیجتی۔

وہ دوسرے کالج میں تھی، پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو پریشان کیے رکھتی۔

ایک روز سب نے لیلیٰ کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے۔ بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے، میں بھی گیا، سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا دلچسپ فقرے نذر کیے، خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی بی کو برا بھلا کہا، کہ یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلیٰ نے سے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے ملتا ضرور رہا ہے لیکن کیسے علم تھا کہ معاملہ یہ رنگ کی شکل اختیار کرے گا اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔ محض لیلیٰ کی وجہ سے دوسری لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا گہرا دوست تھا، ہم دونوں ہم عمر تھے، ہمارے خیالات یکساں تھے۔۔۔ میں خاموش ہو گیا۔ دیر تک خطوط کا چرچا رہا، لیلیٰ کئی دن کالج نہیں آئی، تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔۔۔ جو کچھ اسے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلیٰ کی سہیلیوں کی منتیں کیں کہ اسے سمجھائیں، کسی طرح سے دور رکھیں، اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا جہاں لیلیٰ کے نظر آنے کا امکان ہوتا، اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں جن کی طرف لیلیٰ گزرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی۔

ایک دن مجھے ترس آ گیا، میں جی بی سے خوب لڑا، جہاں ہم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہیں وہاں کبھی کبھی لیلیٰ سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ بولا۔۔۔ تمہیں معصومیت اور سادگی پسند ہے مجھے نہیں۔ مجھے ناپختہ اور الھڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ خوش ہوئیں تو رونے لگیں، غمگین ہوئی تو آنسو بہنے لگے۔ دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں۔ ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جی بی کے اس رویے کا اثر یہ ہوا کہ لیلیٰ اس سے ڈرنے لگی، وہ اسے دور دور سے دیکھتی کہیں آمنا سامنا ہوتا تو راہ کترا جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی رہی۔ کئی مرتبہ میں

نے خود اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں اس کی تصویریں بھی دیں جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ اس کے کچھ رشتہ دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تجار تھے۔ اسی سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور ان کے لئے تعلیم اتنی اہم نہ تھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا، ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے کہ میں نے اسے لیلیٰ سے آخری مرتبہ ملنے کو کہا، اس نے انکار کر دیا جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دلایا تو وہ راضی ہو گیا، میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا، اس نے آخر جلد کے لئے اپنا بہترین لباس پہنا، سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے، ان کے مشورے سے سنگار کیا اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لئے اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ اس رات جی بی پئے ہوئے تھا، بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے محض میری وجہ سے پی تھی تا کہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا، جلد لوٹنے کے وعدے کئے۔ لیلیٰ کو ایک بار پھر اس فردوس گمشدہ کی جھلک دکھائی دی جسے محبت کے پہلے بوسے نے تخلیق کیا تھا۔ لیلیٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی اور اس کا انتظار کرے گی اگر اس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ سزا کی طالب ہے۔ اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے۔ اگر وہ چاہے تو لیلیٰ مر جائے۔ جدا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا۔ یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا کہنے لگا، ''شاید تمہارے پاس محفوظ رہے ورنہ میں تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا۔ رومال سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، ایک کونے میں سرخ دھاگے سے ننھا سا دل بنا ہوا تھا جسے لیلیٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلیٰ ذرا بھی غمگین نہ ہوئی، اسکے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔

پتے زرد ہو کر گر پڑے، پھول مرجھا گئے، ٹہنیاں ٹنڈ منڈ رہ گئیں، خزاں آ گئی۔ وہ نہ آیا۔ جھکڑ چلے سوکھے پتے اڑنے لگے، گرد و غبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی، تاروں کو بے نور کر دیا، وحشتیں پھیل گئیں ـــ وہ نہ آیا۔

کونپلیں پھوٹیں، ہریالی میں پیلی پیلی سرسوں پھولی، رنگین تتلیاں اڑنے لگیں، غنچے مسکرانے لگے، پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے، بہار آ گئی لیکن وہ نہ آیا

دن لمبے ہوتے گئے، لمبی لمبی جھڑیاں لگیں۔ سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی

ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل آئے اور برس کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے، قوس قزح سے رنگین ہو گئے ۔۔۔ لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک لیلیٰ کھوئی کھوئی سی رہی۔ بہت دیر کے بعد [illegible] سنبھل سکی۔ جب جی پی لوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔ جی پی اکیلا نہیں آیا اس [illegible] کی بیوی بھی تھی [illegible] گوری چٹی فربہ عورت، جو کسی لکھ پتی کی بیٹی تھی۔ جس کا گول مٹول چہرہ [illegible] سے بھرا تھا، جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی، [illegible] مادی [illegible] دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی پی کو [illegible] اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں لیلیٰ کو بھی جانتا تھا اور جی پی کو بھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ [illegible] اس وقت رقص گاہ میں تھے۔ جی پی میرا وہ پرانا دوست تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا اور پی رہا تھا اور یہ [illegible] وہ جینی تھی جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

لیلیٰ کو بدستور چھیڑا جاتا۔ طعنے دیئے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ اگلی باتیں بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد لیلیٰ کا ذکر ایک پرانی بات ہو گئی۔

ایک دن وہ کہیں سے آ کر کالج میں داخل ہوئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی لیلیٰ نہیں بلکہ شوخ و بے باک جینی تھی۔ یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کئے نگاہیں اٹھائے سائیکل پر آتی تو لڑکے ٹھٹھک کر رہ جاتے۔ ہر وقت اسکے لبوں پر نہایت بے باک مسکراہٹ ہوتی۔

یونین کا جلسہ ہے تو جینی تقریر کر رہی ہے، ڈراما ہے تو وہ ضرور حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو جینی اچھے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی سے لوگ ڈرتے تھے۔

جینی کی بے باکی کو سراہا جانے لگا۔ اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے

یونین ڈے کا صدر تھا، وہ دبلا پتلا سا بنگالی لڑکا تھا، اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا، میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پڑوسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں اس کے انوکھے نظریئے، اس کا حساس پن، وائلن پر غم ناک نغمے ۔۔ یہ

سب مجھے اچھے معلوم ہوئے لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ویسے اس میں کوئی نمایاں عیب یا خامی نظر نہیں آئی۔ شاید یہ دل کا جذبہ سا ہے۔ اس کی آنکھوں کی مجرمانہ بناوٹ اس کے چہرے کا فاقہ زدہ اظہار تھا جو مجھے ہمیشہ اس سے دور رکھتا

کبھی کبھی شام کو جی اسے ہمراہ لے جاتا۔ اسی طرح اس کی جینی سے ملاقات ہوئی۔

غالباً ان سب سے بڑی خوبی اس کا انکسار تھا۔ اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا۔ بعض اوقات تو وہ اس قدر انکسار سے کام لیتا کہ ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طالب ہے۔ شروع شروع میں شاید جینی کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔

وہ جینی کی صورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے جیسے جینی ابھی اس کی جانب ملتفت ہوئی تھی۔ جب وہ اس پر درد چہرے لئے سامنے آتا تو اس کی نگاہیں جینی کے چہرے پر جم جاتیں۔ پروا بہت مختصر ہوتی۔ ہتھیلیوں سے لے کر جینی کے ... تک۔۔۔

جب وہ دونوں فلسفے کی کتابیں ہاتھ میں لئے بحث میں مصروف ہوتے تو الفاظ بہت جلد جاتے، آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی اشاروں اور کنایوں کی حدود سے نکل کر کھلم کھلا ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ جینی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چلا تھا۔ وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی، جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی۔ کالج کی کئی لڑکیاں اسے دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دنوں ہم ڈراما کھیل رہے تھے، دوپہر سے ریہرسل شروع ہو جاتی، شام بھی اکٹھے گذرتی۔ اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا، اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی، کسی روز تو یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرا سبز وال پیپر ہے جس پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں، گلدانوں میں لمبی لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں، سبز ننھے روشن ہیں، فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش و نگار، دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں سبزی مائل پردے، گملوں میں رکھے ہوئے پودے یوں معلوم ہوتا جیسے درندوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پھر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا۔ دیواریں، پردے، غلاف، قالین، قمقموں کے شیڈ، گلدانوں میں صحرائی پھول اور خشک ٹہنیاں ہوتیں، انگیٹھی کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے تصور میں لق و دق صحرا ابھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے حدی خوانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نظارے آنکھوں کے سامنے آ جاتے، کبھی آرائش میں بھی طوفان

زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی چنگھاڑتی لہریں، ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اور آندھیوں میں بچے کی طرح کانپتا ہوا سفینہ۔۔۔

اس کے کمرے میں کبھی ایک جیسا گلدستہ میں نے دو مرتبہ نہیں دیکھا۔ گلدان میں بڑے بڑے پھول بھی ہیں۔ شوخ پھول بھی ہیں، لیکن صرف ننھی ننھی کلیاں نمایاں ہیں، باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کچی غنچے، کلیاں، پھول سب کہیں جا چھپے ہیں۔ صرف خوشنما وضع کے پتے سامنے آ گئے ہیں، اس کے ترتیب دیئے ہوئے گلدستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایسے حسین و جمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں جنہیں کشش میں کوئی پاتی تک نہیں۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی طے ہوا کہ وہیں شام کو چاندنی میں چھوٹا سا ڈرامہ بھی کھیلا جائے۔ جینی کو الیہ پارٹ ملا، وہ دن اس نے اپنے گزارا کہ ن سے بہت سی کی، دن بھر اداس رہی۔ لیمپوں کی روشنی میں ڈراما شروع ہوا، جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا۔ لیمپ بجھا دیے گئے۔ سب نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا ہے، وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی، جس میں چودھویں کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سادا سا گیت اور وائلن کا تھرتھراتا ہوا نغمہ اس کی انگلیوں کی جنبش، جسم کے لوچ اور گھنگھرو کی تال پر چاند تارے ناچنے لگے، پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دیوداسیاں سنگار کئے کنول کے پھول تھامے آ گئیں، پجاریوں کے سر جھک گئے۔ فضاؤں میں تقدس برسنے لگا، چراغوں سے دھواں اٹھا اور دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صرف جینی رہ گئی اور اس کا محبوب۔۔۔ پجاری اور دیوتا

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم نہیں ہوا۔ ساز اور لے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ڈے نے ان پیار بھرے جذبات کا اظہار کر دیا جنہیں وہ دیر سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت کے ساتھ محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے، عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق سنہرا ہار دے گا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہو گا ان دونوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے آرٹ نے۔ وہ دونوں آرٹسٹ ہیں۔ انسان فنا ہو جاتے ہیں آرٹ فنا نہیں ہوتا۔ آرٹ جاوداں ہے۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے، معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے، مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی، میں نے اسے جانے پہچانے نغمے گنگناتے سنا تھا۔ پیانو پر اس کی

انگلیاں خوب چلتیں۔ کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بج رہا ہے اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں مختلف نغموں کا مرکب ہے۔ ایسے نغمے جو مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں۔ رنج و مسرت، انبساط و حسرت آشامیاں، شک، وسوسے، امید و بیم، اعتراف غم، ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں، اسی طرح غم کی گھٹائیں بھی اکثر محبت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور دیرپا نہیں ہوتا۔ یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔۔ تبھی سمفنی میں اتنے اتار چڑھاؤ آتے ہیں اور کئی کئی [illegible] ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیے جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا۔ اسے یہ نغمے نہایت دلکش معلوم ہوئے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے درباری کی تشریح کی کہ جیسے ایک بہت بڑا ہال ہے، سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ قندیلیں روشن ہیں، فانوس جگمگا رہے ہیں، دور دور تک امراء و وزراء بیٹھے ہیں، پُرہول خاموشی طاری ہے، موسیقار کو بلایا جاتا ہے، ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی تصور ہو گی، غمگین موسیقی بھی موزوں نہیں، ہلکی پھلکی چیزوں سے بھی موسیقار گریز کرے گا وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے۔۔۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر وہ جو چیز چنے گا وہ درباری ہے۔

جینی سنتی رہی۔ پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں جو اس نے خود بنائی تھیں، اسے مصوری کا شوق ضرور تھا لیکن یونہی معمولی سا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی۔ ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات برش کے ذریعے کاغذ پر منتقل کئے تھے۔ وہ تاثرات جو مختلف راگنیاں سن کر اس نے محسوس کئے نغمے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ جوگیا کی تصویر میں تاحد افق ننھے منھے خود رو پھول کھلے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول جن میں کلیاں بھی شامل تھیں اور ادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔ پتیوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں، اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں۔۔۔ جن سے نورانی شعاعیں منعکس ہوتی تھیں۔ پودوں کے سائے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں۔۔۔ سب اس امر کے شاہد تھے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی نوزائیدہ دھند جس نے فضا میں رنگ و بو کے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر مالکوس کی تھی، اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردوں سے کھیلتے ہوئے

دکھایا تھا۔ سفید اور سیاہ پردوں کی لڑیاں لہروں پر تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی تو سارے پردوں کو یک لخت بلندیوں پر لے جاتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کے کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھایانٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے شوخ نغمے مرقش تھے چنچل رقاصائیں گھنگھرو باندھے ناچ رہی تھیں، جو [illegible] میں [illegible] کی [illegible] تھی۔

جینی نگار کرتی رہی لیکن میں نے ان تصویروں و نقوش میں [illegible] میں تھے، کسی نے یونہی جینی کا نام لے دیا۔ چند لمحوں میں ہجوم [illegible] تھے جو اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی مشہور ہوتی جا رہی ہے۔ [illegible] بہت بھیڑ ہو رہی تھی ایک چینی پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا [illegible] سے اسے دیکھنے آئے تھے۔ اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں وہ [illegible] وہاں اس کے حریف کو جو مقامی پہلوان تھا کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی [illegible]۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر دفعتاً مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا، سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے جو اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس پر آوازے کسنے شروع کر دیے۔ اس پر اشتہار اور کاغذوں کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تنہا چھوڑ دیا۔ سانگ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا، جینی مسکراتی ہوئی گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا معطر رومال دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دلکش باتوں نے اسے موہ لیا، ان باتوں میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کو اپنی زبوں حالت کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکٹھے گزاری جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈے کے والدین آ گئے وہ ہوٹل سے چلا گیا، اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا۔ جینی کو ان کے گھر بلایا گیا، لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز ڈے جینی سے ملا اور جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے اخیر تک ساری کہانی سادگی سے سچ سچ بتا دی۔ ڈے اس پر برس پڑا یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں۔ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہوں گے۔ اب اسے کیوں کر یقین آ سکتا ہے کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا، کھیل تھا، اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہیے۔

میں نے سنا تو ڈے کو سمجھایا کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی ڈے بنگال سے

آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈے پر اتنی دور کیوں کر عاشق ہو سکتی تھی اور وہ بھی بن دیکھے بن سنے اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ کی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے پروا نہ کی لیکن ڈے نے نہیں مانا۔ اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چہلیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر صرف اسی کو چاہے گی۔ اس کی فطرت کی پیشین گوئی سے اسے الہام ہو جائے کہ فلاں مرد آج سے اتنے سال بعد اسے چاہنے والا ہے۔ وہ خواہ خود ہرجائی ہو گا لیکن چاہنے سے پہلے لڑکی کی گذشتہ زندگی کو اچھی طرح کرید کر پوچھ گچھ کرے گا۔

جینی نے سارے وعدے یاد دلائے جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کیے تھے وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ تو جیسے کسی بہانے کی تلاش میں تھا، دیکھتے دیکھتے جینی میں بے شمار نقص نکل آئے۔ نہ اس کا کوئی خاندان تھا نہ مذہب، سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے والدین کے زیرِ سایہ ہوئی جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی، جس میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غریب بھی تھے۔ اور پھر جینی کچھ ایسی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈے کو مل سکتی تھیں۔ ایک حسین اور بہتر لڑکی تو ڈے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد رائے بہادر تھے۔ لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائداد دے رہے تھے۔ انہوں نے ڈے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ میرے نام دعوتی رقعہ آیا۔ میں خاموش رہا۔ جب جینی کے نام رقعہ بھیجا گیا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ طیش میں آ کر میں نے کئی منصوبے باندھے، سب سے پہلا منصوبہ ڈے کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے جینی شادی کا تحفہ لے کر گئی۔ سب کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈے کی بیوی کے لئے سنہری ہار تھا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈے کی بیوی سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو آرٹ سے۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے زہر دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی جو اس قسم کی فضولیات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ بھلا ستار یا وائلن سیکھنے کی کیا ضرورت ہے جب صبح سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے میں کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی

ہیں۔ اگر کسی نے لفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ شعر کہہ لئے تو اس پر آنسو بہانے یا بے قابو ہوجانے کی کیا ضرورت ہے۔

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا۔ مصروفیتوں نے آن دبوچا۔ ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ مدتوں تک میں نے جینی کے متعلق نہیں سنا۔

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جینی کا ذکر کیا تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک معاشقہ ختم ہوا ہے تو دوسرا عنقریب شروع ہو گا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی۔ اکثر آزادانہ طور پر رہتی ہے۔ ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے، قسم قسم کے لوگ آتے ہیں، نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افواہیں اڑتی ہیں، لوگ شیخیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا وہ کیا، میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چپکا ہے وہ جینی کا ہے۔ یہ تصویر جینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جینی کے ہونٹوں کی ہے۔

پچھلے سال سیلاب آیا۔ لوگ بے گھر ہو گئے، قحط پڑا۔ جینی نے کچھ لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لیا، گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی، امیروں سے فلرٹ کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا، رات دن محنت کی۔ کئی مرتبہ بیمار ہوئی، کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جینی کی وجہ سے محتاجوں کی امداد پر تیار ہو گئے۔ اسے چھیڑا، تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے، اسے شراب پلانی چاہی، جینی نے گروہ کے سرغنے کے بال نوچ لئے، اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دیا۔ وہ ایسے گھبرائے کہ اسی وقت جینی کو واپس چھوڑ گئے۔

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نکلوا دی، اس کی تعریف بھی شامل تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تبادلے نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا۔ محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے جاتا۔ سچ مچ اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی۔ پہلے سے کہیں تندرست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی، نکھار تھا، ہونٹوں میں رسیلاپن اور رخساروں پر سرخی آ چکی تھی۔ اب وہ اک شعلۂ فروزاں تھی۔ وہ طرح طرح سے میک اپ کرتی شوخ و بھڑکیلے لباس پہنتی۔ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، قسم قسم کی خوشبوئیں۔ وہ ہر موضوع پر بلادھڑک گفتگو کر سکتی تھی۔ کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ہفتے بھر کی شامیں پہلے ہی مختلف مصروفیتوں کے لئے وقف ہو جاتیں، پرانی سیدھی سادی

جینی کی جگہ اس شوخ و شنگ لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ چڑ سا گیا۔ یہ جذبہ محض حسد و رشک کا جذبہ تھا۔ شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ ہرا دے۔ تاش کھیلتے وقت میں بغلیں جھانکنے لگوں۔ رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے، اور اس کے لئے بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی رہے جن کا مجھے شوق تو ہے لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہے۔

شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رویا کرتے کہ کس طرح قدرت نے ان کو دغا دی اور نہایت بدمذاق اور تُرش طبیعت کی رفیقہ پلے باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں [illegible] سیہ خانے میں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے --- وہ ہے جینی۔

پر مغز اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پر بحث کرتے۔ کارل مارکس، فرائیڈ اور مولانا روم کے تذکرے چھیڑتے، سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے، مشاہیر پر تنقیدیں کرتے، بے لوث اور سچی دوستی کا دم بھرتے لیکن موقعہ پا کر عشق بھی جتا دیتے۔

ایک طبقہ نفاست پسند اور نازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے رہتے، اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے، اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور کم تر سمجھتے بار بار جینی سے پوچھتے.... اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی، جگری اور روحانی صدمہ پہنچے گا--- مگر ہر شام کو آ دھمکتے۔

کئی ایسے شرمیلے بھی تھے جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جینی پر نظمیں کہہ کر اسے بدنام کرتے، سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو اپنے آپ کو جینی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبود کے خواہاں رہتے لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشہ دیکھ کر غصہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے یہ سب کے سب تو اسے پسند آنے سے رہے، سارے ہجوم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے میرا ارادہ بھی ہو کہ اسے ٹوکوں، پھر سوچ کہ بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں، دیکھا جائے تو میں خود اسی ہجوم میں سے ایک ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جا رہی ہے یہ شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا

ہے؟ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کا وقتی کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت، نفرت، زندگی، موت، انسان، خدا۔۔۔ سب سے منکر تھا۔ ہر بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب کی سب مترادف تھے، اسے کامریڈ کے نام سے پکارا جاتا۔ محض جینی کی وجہ سے میں اس سے ملتا ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت تب اس دن پیدا ہوئی جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی۔ کامریڈ عورتوں پر ہمیشہ ... چیبیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ابتدا سے تکلیفیں ... کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے، لڑکوں کے مقابلہ میں اس کی پرورش کم اہمیت دی جاتی ہے۔ بھائی اسے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصہ چھین لیتے ہیں ... احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا بڑی ہونے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا ذرا سر سے اتر جانا خاندان کی ناک پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے ... دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے، مساوات اور آزادی کے سبق دیئے جاتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا، اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو چند ... مزاج بزرگ چاہتے ہیں، لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے۔ وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ محبت کا واسطہ دلا کر سب کچھ منوا لیتے ہیں پھر چند خدائی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار سکتے ہیں اور سلیٹ کی طرح ہر بار سب کچھ دھل جاتا ہے۔ ان کا ماضی کوئی معنے ہی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے لیکن لڑکیوں کے لئے شادی نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش معاشی بے بسی، ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ عمر رسیدہ ہو جانے پر اولاد بے مصرف سمجھتی ہے، مذاق اڑاتی ہے۔۔۔

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ ویسے عورت اور مرد برابر ہیں لیکن مرد کا رتبہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔ اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور وزن کا ذکر بھی کیا۔ مرد کے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا۔ وہ رہتا کہاں تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی کہاں اور کیسے گزری۔ بس یہ مشہور تھا کہ وہ جینی کا مداح ہے۔

جینی ان دنوں بڑی ٹھوس قسم کی کتابیں پڑھتی مشکل مضامین کی بے حد خشک اور سنجیدہ کتابیں جب وہ دونوں باتیں کرتے تو بہت کم لوگ سمجھ سکتے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی

ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا، جینی کی مدلل اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں کہ وہ دماغی ارتقاء کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم پک نک پر گئے، اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن جب جینی نے ایک خاص زاویے سے انہیں دیکھنے کو کہا تو یوں معلوم ہوا جیسے اس باغ اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ وہ منظر جیل پڑا۔ جو صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ ہی اس زاویے کو دیکھ سکتی تھی۔

جب قصے کہانیاں ہو رہی تھیں تو ایک لڑکا اپنا رومان سنانے لگا۔ اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی، اشارے ہوتے، پتھروں سے لپٹے ہوئے خطوط آتے، عہد و پیماں ہوتے۔ لیکن وہ فاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔ نہ وہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔ تنگ آ کر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا۔ کئی دنوں کے بعد پیغام ملا۔ لڑکی نے بڑی منت سماجت کی، اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دو گی تو آئندہ کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ رضامند ہوئی، بار بار یہی کہتی۔۔۔ آپ وعدہ کیجئے کہ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تو مانی۔ یہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نقص تھا، وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے ہنستے لوگ دوہرے ہو گئے۔ لیکن جینی خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں، دیر تک وہ چپ چاپ رہی، مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ انگیز نہیں تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے۔ سب نے کچھ مانگا۔ جب جینی کی باری آئی تو اس نے کہا کہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہیے، مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی، بس مجھے ایک زندگی ملی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ عش عش کر اٹھا۔ کہنے لگا جینی کہ یہ نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے، ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ اس سے بہتر نظریہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں۔ ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے۔ اپنے حالات سے مجبور ہے۔ زندگی کے اٹل ارادے، شدید جذبے سب حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لئے ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اتفاق نے ہمیں ملا دیا۔ اسی طرح محض اتفاق سے ہم ان لوگوں کی رفاقت سے محروم ہیں جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے۔

پھر ایک روز وہی کامریڈ جو افلاطونی دوستی اور خلوص کے گن گایا کرتا تھا۔ جینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی۔ پکچر دیکھی، چھوٹے موٹے تحفے خریدے جب ٹیکسی میں

دونوں واپس آ رہے تھے تو اس نے جینی کو چومنے کی کوشش کی۔ جینی نے پلسی بھرا لی جتنے روپے کامریڈ نے اس شام صرف کیے تھے اس کے منہ پر مارے اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا، پھر معافی مانگنے آیا۔ جینی نے کہا، مجھے [illegible] نہیں [illegible] مایوسی ہوئی ہے۔ میں تمہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم [illegible] میں سے نہیں ہو لیکن تم میں اور ایک عام انسان میں فرق نہیں۔

کامریڈ نادم تھا۔ بولا: ---"میرے نظریے خواہ کیسے ہوں میں انسان بھی ہوں۔ تم میں بڑی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا، تمہاری بے چین روح کو دیکھا ہے اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔ اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے تو تم زیادہ خوبصورت ہوتیں تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی"

جینی عورت تھی، کامریڈ کے رنگین فقروں نے اسے موہ لیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں دل دھڑکنے لگا۔ رخسار سرخ ہو گئے، جب کامریڈ نے بازو پھیلائے تو جینی نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا۔ "محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں بلکہ دونوں کے ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے۔ محبت میں اگر رفاقت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے"--- اسی قسم کی باتیں بار بار دوہرتا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوتا، اس کی چند چیزیں مجھے پسند تھیں، اس کی صحرانوردیاں، بے چین طبیعت، سیلانی پن--- لیکن اس کے شکست خوردہ نظریے، بلاوجہ کا حزن، تلخ خیالات برے معلوم ہوئے۔ وہ قنوطی تھا اور ذہنیت پسند۔ اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا۔ مصیبت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ رستہ کترا جاتا۔ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا، دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح سرگرداں رہے گا، اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔

میرا تبادلہ ہوا تو جینی مجھے چھوڑنے اسٹیشن پر آئی۔ جدا ہوتے وقت میں نے رومال مانگا پوچھنے لگی: "رومال لے کر کیا کرو گے"؟ "رومال تمہاری شوخ مسکراہٹ کی یاد دلاتا رہے گا"۔ بولی "تم ہر مرتبہ رومال ہی کیوں مانگتے ہو"۔ بتایا کہ اس کی مخمور خوشبو اور ننھے سے سرخ دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جینی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا۔ جینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ چلتے وقت اس نے جینی سے کہا کہ بے سروسامانی اس کی تقدیر میں ہے۔ اس کی منزل مفقود ہے۔ وہ جینی سے محبت کرتا رہے گا، اس کی تصویریں سینے سے لگا کر رکھے گا۔ دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھا کرے گا۔ اسے ہمیشہ

یاد رکھے گا..... اور بس.....

جینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا، جو کچھ اس کے پاس تھا فروخت کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں، جب وہ واپس آئی تو طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جینی کے والد نے جو اب تنہا رہتا تھا اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن جینی وہ شہر چھوڑ کر کہیں اور نکل گئی۔

کیری سے میں سمندر پار ملا۔ وہ ہندوستانی تھا لوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے کیزانووا کہتے۔ اس سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑوں میں ایک کیمپ میں ہوئی۔ ہم نے قصبے سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ قصبے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی وجہ ایک روسی لڑکی تھی۔ کیری نے فوراً اسے ڈویل کی دعوت دی۔ اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں اور روسی سے بولا۔ ہم اسے باری باری اپنے کان سے چھوا کر چلائیں گے۔ اس میں صرف دو گولیاں ہیں..... جس کی قسمت میں گولی لکھی ہو گی اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پیے ہوئے تھا۔ فوراً راضی ہو گیا۔ پہلا فائر کیری نے اپنے آپ پر کیا وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا، کچھ نہ ہوا۔ کیری تیسرا فائر کر چکا تو ہم نے بڑی مشکلوں سے انہیں علیحدہ کیا، روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں، اس نے یونہی لبلبی دبا دی، دھماکہ ہوا، گولی خیمے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہو، وہ ہمارے کیمپ میں آ گیا۔ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی، ہم دونوں گئے۔ نہایت دلچسپ پروگرام تھا۔ آغا نے کیری کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا

کیری اس سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ محفل گرم ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک گھڑی دیکھ کر کیری اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دور کیمپ میں اس نے کسی لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردیوں کی اندھیری رات تھی کیمپ وہاں سے سو میل کے لگ بھگ تھا۔ ہمیں سب نے منع کیا، کیری کا وعدہ تھا، کیونکر پورا نہ ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی پیچیدہ دشوار گزار سڑک برف سے سفید ہو چکی تھی۔ ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اٹھ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دعوت ختم ہو چکی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ لڑکی منتظر تھی۔ کیری نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا۔ مہینوں سے مجھے کسی دوست یا عزیز کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی۔ اسے یہ باتیں

اچھی معلوم ہوئیں، ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ کیری ایک دو بار ہمارے پاس آیا کیں جلد اٹھ کر چلا گیا۔ جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا۔۔۔ "میں کیمپ میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا"۔

"اور یہ لڑکی"۔۔۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ اب تمہاری ہے۔۔۔ میں یاروں کا یار ہوں۔ میں تمہارے چہروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں اس روشنی کی چمک دیکھی ہے جو پہلی ملاقات پر بلاوجہ پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں، لیکن تم بھی میرے دوست ہو"۔

اس کی شخصیت عجیب تھی، نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا، نہ ... کا ذرہ وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد یہ سوچتا کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہئے تھا ... مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی۔ کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ ... بات پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا۔ اسے سکون سے نفرت تھی۔ اس ... جنگی محاذ سے واپس آیا ہے تو ڈوئل لڑ رہا ہے، جوئے میں آج ہزاروں جیتے تو کل سب ہار ... ۔

سب اس کے کامیاب معاشقوں پر رشک کرتے، اس کامیابی کا راز پوچھتے وہ ہنس کر کہتا، یہ تو کچھ بھی نہیں، ہزاروں محبتیں ایسی بھی تھیں جو ادھوری رہ گئیں، جو کبھی نہ پنپ سکیں۔ جنہوں نے بار بار میرا دل توڑا۔

ہمارے قریب ایک چھوٹا سا خوش نما قصبہ تھا۔۔۔ گلشن ... آس پاس کے باشندوں میں کیری شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا، موت کی سزا یقینی تھی، پھر عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک نئی زندگی سمجھے گا جو اسے تحفتاً ملی ہے۔ اس زندگی کا گزشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ہمیشہ مسرور رہے گا، آزاد رہے گا، جو چیز ناپسند ہوئی اسے فنا کر دے گا، جو بھا گئی اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا

اس کا پیار آندھی کی طرح اٹھا، آناً فاناً میں چھا گیا اور طوفان کی طرح گزر گیا۔

وہ چھٹی پر ہندوستان آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام بنا، اسے شک گیا، وہ نہیں ملی مگر وہاں ایک اور لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ لڑکی جینی تھی جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ کیری نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا۔ جتنے دن وہ وہاں رہا اسے نعم البدل سمجھتا رہا۔ اس نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی۔ اپنی دلچسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے

جینی پر جادو کر دیا۔ بھڑکیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا۔ ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیرنے گئے تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو شیمپین پلائی۔ عمر بھر باوفا اور صادق رہنے کا حلف اٹھایا، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیمان کئے۔ یہ سب کچھ اس قدر پرخلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا۔

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی، جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دیتا، جب دیر تک تنہا رہنا پڑتا، کوئی بری خبر سننے میں آتی، اداسیاں عود کر آتیں تو اسے جینی کی معصومیت، اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک خیمے میں بیٹھے رہتے۔ باہر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں کو یاد کر کے شرمندہ ہوتا۔ اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا۔ بار بار کہتا کہ جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی جو اس کی زندگی میں آئیں۔ اگر اس کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ جینی سے ضرور شادی کرتا۔ وہ نہایت غیرمعمولی لڑکی تھی، اسے کسی نے سمجھا نہیں۔ کسی کی نگاہیں اس کے خدوخال سے آگے نہیں پہنچیں۔ اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا۔ اس میں کسی مصور کی روح تھی۔ کسی عظیم شاعر اور بت تراش کی روح، اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ ان کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بچوں کی معصومیت تھی۔ اس میں سیتا کا تقدس تھا، مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ صرف ایک مرد سے محبت کی——ایک مرد جسے اس نے کلبلاتے رینگتے ہجوم سے چنا اور دوسروں سے مختلف سمجھا، لیکن اس مرد نے اسے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ اس کی مسکراہٹ کیسی تھی——بالکل مونالیزا کی مسکراہٹ، معصوم، اداس اور پراسرار، اس کی مسکراہٹ کے سامنے کیری جیسا انسان بھی کانپ اٹھتا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتا اور اگلی صبح اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ میں نے سب کچھ بھلا دیا، جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل کے فاصلے سے واپس ملک میں آیا تو پھر دور بھیج دیا گیا۔ اس عرصے میں کبھی کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا خیال آ جاتا تو میں یہی سوچتا کہ غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے کٹھن لمحوں کے بعد مجھے مختصر سی چھٹی ملی، میں قریب کی پہاڑیوں پر چلا گیا وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا۔ دور دور تک چائے کے باغات تھے اور مالدار

سوداگروں کی آبادیاں، جہاں میں مقیم تھا وہاں خوب رونق تھی۔ میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے چند ہی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ باوجود تمام چہل پہل اور شور شغب کے وہ احساس تنہائی کم نہیں ہوا جو مجھے یہاں کھینچ کر لایا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا کہ مجھے جینی مل گئی، ایسے دور دراز خطے میں اسے پا کر مجھے از حد مسرت ہوئی اس کی باتوں میں حزن کی آمیزش تھی۔ اس کے چہرے پر پژمردگی تھی لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجیب جاذبیت تھی جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں قریب معلوم ہو رہی تھی، اس مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی جو چائے کے سوداگر تھے وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کلب، رقص، پارٹیاں، بے حد اکتا دینے والی تھیں۔ وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا، اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم جو تنہا رہتا جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں کام سے لوٹ کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ دونوں پڑھتے، بحث کرتے، لڑتے، اب ہم تین ساتھی ہو گئے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا واپس آ کر میں نے تبادلہ کرا لیا اور جینی کے پاس چلا گیا۔ ہم جنگلوں میں نکل جاتے، سیریں کرتے، کتابیں پڑھتے، بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے، میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا اتنی ہی نئی خوبیاں پاتا۔ وہ بہترین رفیق تھی۔ اکثر مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اسے پہلے کبھی نہیں ملا، اس کی بے پناہ جاذبیت سے آشنا نہیں ہوا، ہم رقص پر جاتے تو وہ سارا وقت مجھے دیتی، میری جانب متوجہ رہتی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہتیں، مجھے اس پر فخر ہونے لگتا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے۔ کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی، لیکن ہمارے خیالات ہم آہنگ ہوتے، دلوں میں طمانیت ہوتی، خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب رکھا۔ غالباً دوستی کا جذبہ۔ یہ قرب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ذرا سی جدائی شاق گزرنے لگتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی، یہ نظمیں جینی نے لکھیں تھیں، یہ نظمیں کس قدر حزنیہ تھیں، کتنی کرب انگیز اور دردناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں، یہ اس کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں معلوم ہوتیں، جسے میں جانتا ہوں، دلیر اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر کو ہم سیر سے واپس آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تو درختوں

کے نیچے چھپتے رہے۔ جب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تو بھاگ کر ایک شکستہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں نے اپنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پر بچھا دیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نظموں کی باتیں کرنے لگا۔ یونہی تنگ کرنے کو کہا کہ پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ اب بزرگوں اشعار زبانی یاد ہیں، کہیں اسے کوئی شاعر تو پسند نہیں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے معافی مانگی۔ شاید میں نے کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی تھی یا تلخ یادیں تازہ کر دی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوبارہ معافی مانگی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ جب وہ میرے شانے سے سر لگائے بیٹھی تو وہ ایسی ننھی منھی بچی معلوم ہو رہی تھی جو راستہ بھول گئی ہو، بالکل بے یار و مددگار۔ جو سہارے کی طالب ہو۔ میں نے اس کے آنسو خشک کئے، دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر پیار کیا۔ ان بار بار چومے ہوئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی۔ ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی۔ ان رخساروں پر وہی جلد تھی، یہ لڑکی اب تک وہی تھی جسے میں نے برسوں پہلے جی بی کے ساتھ مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ایسی بھی رہ گئی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی۔ یہ کہانی اس نے خود سنائی یہ ایک شاعر کے متعلق تھی، جو شرابی، جواری تھا، مفلس اور جھوٹا تھا، اپنی خودداری اور انفرادیت کو خیرباد کہہ چکا تھا، جس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس کی بجائے غصہ آتا۔ جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی، سفارشیں کر کر کے اس کا کلام چھپوایا، اسے ادھر ادھر متعارف کرایا، اس کی حوصلہ افزائی کی کہ شاید یہ اسی طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے اور وہ بیش بہا خزانہ جو اسکے دماغ میں محفوظ ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا جینی غیر شعوری طور پر اس کے قریب ہوتی گئی، پھر اس جذبے نے ایک اور شکل اختیار کی۔ جینی کو خود علم نہیں تھا کہ جسے وہ محض جذبۂ ترحم سمجھ رہی ہے ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ جینی نے ایک آوارہ و بے خانماں کو پناہ دی، اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو ہرگز اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ اسے جینی کی گزشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں، اب تو اسے اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا۔ اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا پتہ نہیں اس سے پہلے وہ کیوں کر جیتا رہا، لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا۔ تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں۔ محبت کا قلزم رواں ہے، تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر

رات دن کا تسلسل قائم ہے، زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ جذبات جس دن فنا ہو گئے انسانیت فنا ہو جائے گی۔ دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی، یہاں کچھ بھی نہ رہے گا۔

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے۔ ابھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے۔ کاش کہ وہ تندرست ہوتا، تب کسی روز وہ دونوں شادی کر لیتے، زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی۔ کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں۔ تب وہ سب اذیتیں بھول جاتیں جو دنیا کے جہنم میں اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ یونہی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے ایک نرسنگ ہوم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی، رات کو ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی، لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی وقت گزرتا گیا، ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا، اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے—— یہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ بعد میں ملا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی، یونہی کسی نے اڑا دی ہو گی۔ وہ وہاں رات دن ایک سے ماحول میں رہ رہ کر تھک گیا ہو گا۔ اسے تفریح بھی تو چاہیئے۔ کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب وہ اسے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی تحائف لے جاتی ان دونوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہیں کیا، لیکن یہ افواہ محض افواہ نہیں رہی شاعر سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر آیا تو اس نے شادی کر لی۔ نرس کے ساتھ۔۔۔ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی، اسے روپے دیتی رہی۔ آخر نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسی لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا، اپنے کارنامے سناتا، جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے لے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے، خلوص پر میرا ایمان ہے، میں انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں جس میں خلوص کارفرما ہو خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے، ہمیشہ صادق رہتے ہیں اس لئے وہ مدوجزر جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے، تم سچی تھیں، تمہارے جذبات سچے تھے، میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے، تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ باہر جانا بند کر دیا۔ وہ ہر وقت میری منتظر رہتی۔ لیکن اب وہ مسرور نہیں تھی۔ اب اسے ماضی یا حال کا اتنا خیال نہیں رہا تھا جتنا مستقبل کا۔ وہ تنہا اور اداس تھی۔ کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے دیکھا۔ ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ عجیب سی باتیں کرنے لگی۔ کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اس طرح سو جاؤں گی۔ وہ خاموشی کتنی سہانی ہو گی؟ موت کے بعد اگرچہ محض خلا ہو گا، ہر روز تاریکی ہو گی لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہیں ہو گی۔ اپنی نظم کا ایک بند اس نے کئی بار دہرایا۔ ”میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں جنہیں ہر صبح نہایت قلیل روشنی ملتی ہے۔ امید کی اتنی سی چھاؤں کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں۔ جس روز یہ روشنی نہ مل سکی میں ظلمتوں میں کھو جاؤں گا“۔

میں نے حسین اور خوش نما چیزوں کی باتیں کر کے موضوع بدلنا چاہا لیکن وہ بولی۔۔۔ ”کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں کس قدر غمگین ہوں، کس قدر دل شکستہ ہوں، اگر اب مجھے سہارا نہ ملا تو میرے خواب تمام ہو جائیں گے، اصول ختم ہو جائیں گے میں گم ہو جاؤں گی“۔

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا جو ہم دونوں کے بارہا اپنے متعلق سنی تھیں وہ کہنے لگی۔۔۔۔ تم مجھے جانتے ہو، کہتے ہو، میں بھی تمہاری سیاح روح سے آشنا ہوں، تمہارے ان گنت مشغوں طرح طرح کے خوابوں کا مجھے احساس ہے، میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں، بالکل ذرا سا سہارا اپنی زندگی کا قلیل سا حصہ مجھے دے دو، میں ہمیشہ قانع رہوں گی، میں کبھی تم پر بار نہیں ہوں گی، تم میرا ساتھ نہ دینا میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

میں اس اشارے کو سمجھ گیا، پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے ایسی باتیں کی تھیں۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ عورت اور مرد کی دوستی نہایت محدود ہے، اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عاید ہیں۔ یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں، آخر ایک مقام آتا ہے جہاں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو میں بزدل ثابت ہوا، میں خاموش ہو گیا۔ خاموش ہو کر میں اس گروہ میں شامل ہو گیا جو جینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا، وہ گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا۔ جینی سمجھ گئی، پھر اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا، اگرچہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا لیکن طے ہو گیا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں پرانے دوستوں کی طرح رہیں۔

میں نے تبادلے کے لئے کہا تو مجھے دوسری جگہ بھیج دیا گیا۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے

آئی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے دیکھا۔ ان آنسوؤں کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی، میں نے رومال مانگا، اس نے بالکل پہلی سی شوخی سے پوچھا کہ رومال لے کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اسے یاد کے طور پر رکھوں گا۔

"اور میرے آنسو کیوں کر خشک ہوں گے۔۔۔" اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے پوچھا۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا تھا وہ نہیں ملا۔ پھر ایک لخت محسوس ہوا کہ موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ رقص ختم ہو چکا تھا، لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ میں اور جی بی بھی چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا۔

مجھے یونہی خیال سا آیا کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں اس سے دور دور رہا۔ نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا اس سے رومال بھی تو نہیں مانگا۔

نہ جانے کیوں، میں اس گوشے میں چلا گیا جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میز کے نیچے ایک مسلا ہوا رومال پڑا تھا جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آ چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا، جھاڑا، سلوٹیں دور کیں، فضا جانی پہچانی خوشبو سے معطر ہو گئی۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا، جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی یا یونہی اتفاق سے رہ گیا۔

دیر تک میں اس رومال کو لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے سرخ دل کو دیکھتا رہا جو اب تک خمار آگیں خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

جینی کا دل --- عورت کا دل۔

سیندور کی ڈبیا

شکیلہ اختر

آج بے اختیار مجھے ڈولی یاد آ رہی ہے، جس مسکراتی قہقہے بکھیرتی، چھوٹے سے قد والی سانولی سلونی سی ڈولی، جو کئی نوریم کے سارے وارڈوں، سرخ نرم بچھی بجریوں والے راستوں، اور احاطے بھر میں ایک تیتری کی طرح دوڑتی پھرتی تھی، اس کی بھولی بھالی صورت میں کوئی چیز بھی علیحدہ کر کے خوب صورت نہیں کہی جا سکتی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اس کو دیکھا تو اس کی چمکیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب مجھے بہت اچھے لگے میں ابھی اسے اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ خود بخود میرے قریب آ گئی اور میری انگلیوں کو اپنے دبلے پتلے ہاتھوں میں لیکر بڑے پیار سے مسکراتی ہوئی بولی۔

''او جی چاہتا ہے کہ ان ہاتھوں کو سدا کے لیے اپنے سینے سے لگا لوں'' اور پھر اس نے بے اختیار میری ان انگلیوں کو چوم لیا تھا۔ میں حیرت زدہ سی، اس لڑکی کو تکتی رہ گئی جو کس طرح اچانک میرے ہاتھ کو چوم کر جلدی سے واپس جا رہی تھی۔ میں نے اس چھوٹی سی نرس کا اس وقت تک نام بھی نہ سنا تھا، کئی نوریم کے اس وارڈ میں آئے ہوئے ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے تھے، اور بس اتنی سی دیر میں وارڈ کے لمبے کمرے میں سفید بستروں والے میں بیڈ ہی گن سکتی تھی جو تعداد میں صرف آٹھ تھے، اور جو برابر بچھے ہوئے تھے۔ اور جن پر ٹی بی کی مریض عورتیں کچھ لیٹی ہوئی کھانس رہی تھیں۔ اور کچھ سوکھی مرجھائی سی بیٹھی اور کچھ چل پھر رہی تھیں ان بیمار صورتوں کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ مجھ کو سب سے کنارے کا بیڈ ملا تھا، اسی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی، میں اپنے غموں اور حسرتوں کو چھپائے یہ سوچ رہی تھی کہ میں کہاں آ گئی ہوں؟'' یہاں آتے ہی مریض عورتوں کی ہمدردنگاہیں میرے دل پر نشتر لگانے لگی تھیں۔ جن سے میرے زخم جگر کے سارے ٹانکے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ میرے ہاتھوں میں لگی مہندی کی لالی نے میرے دل کے رستے ہوئے زخموں پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔

کچھ مریض عورتیں میرے پاس آ کر بولیں، نئی دلہن بے چاری، مہندی ابھی دمک ہی رہی تھی کہ

پھولوں بھری سیج چھوڑ کر اس بیاباں میں آنا پڑا۔ میں نے بڑی بے بس نگاہوں سے انہیں دیکھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میرے کانوں میں کہیں دور سے ڈھول کی دھمکتی ہوں گونج سنائی دینے لگیں۔

ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھا نہیں تھا، کہ ڈاکٹروں نے مجھے بجرے بذریعت اتنا کر مجھے یہاں بھیج دینے کا مشورہ دیا۔ انہیں اکسرے میں میرے داہنے پھیپھڑے میں ٹی بی کا شبہ ہوا تھا اور جلدی سے جلدی سینی ٹوریم بھیج کر مجھے بچا لینے کی کوشش کی جانے لگی تھی قیسی کو یہ ... کر اتنا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح میری انہی انگلیوں کو اپنے گالوں سے لگا ... رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو تڑپ تڑپ کر پایا تھا، مگر نجانے کس کی نظر کھا گئی تھی جو ہم دو مہینے بھی ... رہ سکے تھے کہ اتنی جلدی جدا ہو گئے۔

ڈاکٹروں نے یقین دلایا تھا کہ اگر میں صرف چند مہینوں کیلئے سینی ٹوریم چلی جاؤں تو ... یہ بالکل سائی بی کا شک ہے وہ بھی ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا اور ہماری زندگی بڑی مطمئن ہو جائے گی ... ان ساری باتوں کو سن کر قیسی نے بڑی مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے الگ نہیں رہ سکتا ہے چاہے جو بھی ہو

قیسی کی اس ضد کو دیکھتے ہوئے اس کے گھر والوں کے ساتھ اس کے فیملی ڈاکٹر نے چپکے سے مجھے یہ بتایا کہ اگر میں اپنے علاج کے لئے جلد سے جلد سینی ٹوریم نہیں چلی گئی تو میرے ساتھ قیسی کو بھی یہ خطرناک بیماری لگ سکتی ہے اور اس طرح ہم دونوں پھر ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ میں نے جب یہ ساری باتیں سنیں تو پھر قیسی کی زندگی اور صحت کے لئے آخر بڑی مشکلوں سے رو دھو، اور منتیں کر کے اسے راضی کر لیا اور اس کے فیملی ڈاکٹر کے ساتھ یہاں چلی آئی۔

راستہ بھر آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ امنڈا چلا آتا تھا۔

آنے کے وقت نقلی مسکراہٹوں کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کر قیسی کو ------ خدا حافظ کہنا چاہا تو اس نے بے اختیار میرے ہاتھ کو اپنے گالوں سے لگایا۔ اسے چوما اور پھر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت میری آنکھوں میں اتنے آنسو بھر آئے تھے کہ میں اسکو جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکی تھی اور اب میں سینی ٹوریم کے بیڈ پر پاؤں لٹکائے غمگین بیٹھی تھی کہ نرس ڈولی نے میری انگلیوں کو چوم کر میرے دل کے رستے ہوئے زخموں کے سارے ٹانکے اچانک توڑ دیئے تھے۔

بڑی صبر آزما گھڑیاں گزار کر جب میں سینی ٹوریم کے حدود سے ہوتی اس وارڈ میں پہنچی تو جیسے میرے ضبط کی ساری طاقتیں یک بیک ختم ہونے لگی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ ان آٹھ بستروں والے کمرے کے درو دیوار سے لپٹ لپٹ کر خوب روؤں ---- اپنی منزل پر پہنچ کر میری ہمت ٹوٹنے لگی تھی ہر طرف کھانسی اور بخار میں جلتی ہوئی مریض عورتوں کو دیکھ کر میں اپنی صحت اور اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی

تھی ۔۔۔۔ میں نے جب ایسی بے بس نگاہوں سے اپنی منزل اور اپنی دنیا کو دیکھا تو بے اختیار مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ ابھی تو قیصی کی پیار بھری باہوں میں میری آنکھ ہی لگی تھی کہ موت کا ٹھنڈا ہاتھ مجھے میری جنت سے چھین کر کہاں لے آیا تھا۔؟

نرس ڈولی جب اپنی نرم نرم میری انگلیوں کو اس طرح چوم کر چلی گئی تو مجھ کو ایسا لگا جیسے میں یہاں تنہا نہیں ہوں اور چند لمحوں کے لئے میرا سارا درد مٹ گیا۔ زندگی کی کوئی کرن نظر تو نہ آئی۔ اس روز رات تک مجھے اس کچھوے سے ندوا ان ہنستی مسکراتی سانولی نرس کا بڑا انتظار رہا۔ مگر وہ نہ آئی۔ رات نے نو بجے ایک دوسری نرس آ کر ... گھنٹی زور زور سے بجنے لگی پہلی دوسری گھنٹی اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد تیسری اور ... گھنٹی ... تک بجتی رہی تھی، گھنٹی بجتی رہی اور کوری ڈور کے سوا پورے وارڈ کی ایک ایک کر کے ساری بتیاں بجھتی چلی گئیں مریض عورتیں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔ ہر طرف چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا چھا گیا تو میں نے بڑی حسرت سے اپنے پلنگ کو دیکھا، ہلکی تاریکی میں وہ سفید بستر کسی کفن کی طرح ڈراؤنا لگ رہا تھا اپنے بیڈ پر لیٹ کر میں نے جب اپنے شانوں تک کمبل کھینچ لیا تو بے اختیار ایک بڑی ٹھنڈی اور گہری آہ چپکے سے میرے ہونٹوں پر آئی ۔۔۔۔ آج میں تم سے کتنی دور ہوں قیصی پیارے اور پھر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

صبح کا ہلکا ہلکا دھندلکا، رات کی تاریکیوں کے نقاب سے ابھی جھلک رہا تھا کہ میری نیند ٹوٹ گئی ایک لمحے کے لئے میرا تھکا ہوا دماغ سے رہ گیا نیند کی مدہوشی نے مجھے کیسا سکون بخشا تھا؟ جیسے میں کسی قیامت سے گزری ہی نہیں تھی، مگر جب آنکھ کھلی تو حقیقت نے تڑپا کر رکھ دیا، وارڈ کے اندر دودھیا بلب کی ہلکی روشنی میں کچھ مریض عورتیں کھانسی سے بدحال ہوئی جاتی تھیں، کوئی کراہ رہی تھی اور ایک لمبی سوکھی سی نرس جو سیاہ کنارے کی سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی باری باری سب کا ٹمپریچر لے رہی تھی۔ وارڈ کے سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ باہر احاطے کی طرف سے پھولی ہوئی ڈالیوں اور ملتی کی خوشبوؤں سے لدی سرد اور بوجھل ہوائیں چلی آ رہی تھیں۔ چڑیوں کی چہکار نکھرتی ہوئی صبح کو بے حد حسین بنا رہی تھی ساکھو اور ساگوان کے خوب صورت گھنے جنگلوں میں سے سنہرا افق بڑے دھوم دھام سے چمکنے والا تھا، میرے اداس جی کو کسی چیز نے متاثر نہ کیا۔ میں افسردہ سی اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی جہاں مہندی کی لالی اب ہلکی ہو کر پیلی پڑ چکی تھی۔ دو دو کیسے ناخن آنے والی باتوں کی جھلکیاں دکھا دیتے تھے، جن میں اپنی مہندی لگی انگلیوں میں اپنی بیتی ہوئی مسرت کو دیا دیکھ رہی تھی۔

پھر سارا دن ڈاکٹروں کا چکر چلتا رہا اور زندگی کی ناؤ ڈوب ڈوب کر ابھرتی اور میرے دل کے اندر زندگی کے ساحل پر پہنچنے کی تڑپ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں اس لمبے وارڈ کے اندر ٹی بی کی مریض عورتوں کے درمیان خود کو تندرست محسوس کر رہی تھی یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنے مرض کو

اتنا بھیانک نہیں سمجھا تھا، مگر یہاں آتے ہی مجھے ان بیڈ کر دیا گیا اور رہا وہ بولنے پر پابندی لگا دی تب سے میرا جی ڈوبا سا رہنے لگا تھا اب تک میں اسی خوشگوار خیال کے ساتھ یہاں تک پہنچی تھی کہ اس عمر میں حیات کا کوئی ستون چھوڑ کر میں اپنی رنگین دنیا میں سدا لوٹ جاؤں گی۔

میرے قریب ہی ایک خوب صورت عورت کا بیڈ تھا وہ صحت یاب ہو چکی تھی اور اسے ٹہلنے والکنگ کی اسے اجازت مل گئی تھی اور یہی ایک ٹیل کی بی بی تھی۔ یہی وارڈ میں اچھی اور نازک صحت مند سمجھی جاتی تھی اس کے گورے چٹے رنگ چہرے کی تراش بہت پیاری تھی مسکراتے ہوئے اس سے دلی بات کہی نہ جاتی تھی وہ بڑا گہرا رنگ پہنے کی عادی تھی ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے رہنے کا اسے بڑا شوق تھا اس کے لبوں پر پان کی لالی دمکتی رہتی اور اس کی آنکھیں کاجل سے کھینچے ہوئے دمبالے سے مسکراتی رہتی تھیں۔ میں نے اس وارڈ میں آتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس جگہ چھائی ہوئی موت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک بس وہی زندگی کی چلتی ہوئی نبض تھی جس کو دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں بھی امید و آس کی جوت جاگ جاتی ہے۔

اس لمبے وارڈ میں بڑی یکسانیت نظر آتی تھی، ایک ہی طرح کے بیڈ تھے، سرہانے تپائیاں دھری تھیں اور مریضوں کے بیڈ کی پائتی میں لٹکے ہوئے چارٹ میں بخاروں کے اونچے نیچے ٹمپریچر آڑی ترچھی لکیروں کے ساتھ دور ہی سے نمایاں نظر آتے تھے، یہاں دلوں کی دھڑکنیں بھی ایک جیسی تھیں اور تمنائیں بھی، خوف و دہشت میں رینگتے ہوئے سایوں میں زندگی کی تھرتھراہٹیں بھی ایک ہی طرح کی تھیں۔ سہمی ہوئی کمزور حیات موت سے پناہ لینے کو اس ویرانے میں آگئی تھی لیکن موت یہاں بھی ان کا پیچھا کرتی چلی آئی تھی۔

میں دوسرے دن بھی اس سانولی ہنستی ہوئی چھوٹے قد والی نرس کا انتظار کرتی رہی تھی مگر وہ نہ آئی دوسری نرس میرے پاس آکر بڑے پیار سے بولی۔

''آپ کو نرس ڈولی سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟ وہ پگلی لڑکی کبھی کبھی اپنے آپ پر قابو پا نہیں جاتی، بھلا آپ نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟'' یہ کہتے کہتے وہ ہنس پڑی۔ اس کے صندلی رنگ کے چہرے پر جگمگاتی ہنستی ہنسی نے کیوں مجھ کو بہت اچھی لگی اور اسی وقت میں نے سمجھا کہ یہاں کی نرسیں اپنے مریضوں کو بہت پیار سے رکھتی ہیں۔

پھر وہ نرس میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھتی ہوئی بولی۔

''آپ کے ہاتھ سچ مچ بڑے پیارے ہیں کل رات سے نرس ڈولی کا موڈ بڑا اوف ہے آپ کے اس بیڈ سے اس کو بڑا گہرا لگاؤ رہا ہے۔ آپ کو دیکھ کر اسے بالکل یاد نہ رہا۔ کہ آپ ایک نئی پیشنٹ ہیں۔ پھر اب اسے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔''

نرس کی ان باتوں کو سن کر میں اداس ہوگئی۔ دم بھر کے لئے اس ویرانے میں نرس ڈولی کے پیار سے جو سکون ملا تھا وہ ایک دم ختم ہوگیا۔ میں کل رات سے اس کا کس شدت سے انتظار کر رہی تھی جیسے یہاں ایک وہی تو میری اپنی تھی مگر آج وہ سہارا بھی ٹوٹ کر رہ گیا۔۔۔۔

جب وہ نرس چلی گئی تب میں نے اس بیڈ کو گہری نظر سے دیکھا مگر وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ صرف اپنے سفید بستر پر میں اکیلی پڑی تھی۔ لیکن میرے ذہن میں کسی لڑکی کے پیارے پیارے ہاتھ ابھرتے رہے جس نے ... میں نرس ڈولی نے میری انگلیوں کو بے اختیار چوم لیا تھا اسی بیڈ پر وہ خوبصورت ہاتھوں والی لڑکی میری ہی طرح لیٹی ... رہی ہوگی کیا اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی کسی کی یاد تڑپتی ہوگی؟ ... دیر تک میں اس لڑکی کا نقشہ اپنے تصور میں بناتی رہی۔

اس کی بیمار کمزور آنکھیں اس کے تھرتھراتے بخار میں جلتے ہوئے لب اور مرجھایا ہوا، نازک سا چہرہ، بیاہ؟ پھر اس لڑکی کا انجام کیا ہوا ہو؟ ... کتنی آس لگا کر وہ اسی بیڈ پر آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کرتی رہی ہوگی۔ میرا دل اداس ہوگیا۔ اس نرس نے خواہ مخواہ میرے دل کے شکستہ تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔

ساری رات میں جاگتی رہی۔ ـــ اگر وہ لڑکی اس بیڈ پر مرچکی ہے تو اس کے خوب صورت ہاتھ اب کہاں نظر آئیں گے۔

اللہ، میں کس مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ سینی ٹوریم کے اندر تاریک رات کے سناٹوں کا کاٹنا کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ آنے والی صبح اگرچہ ہر روز کی طرح ہم مریضوں کے لئے کوئی خوشی کا پیغام نہیں لایا کرتی تھی پھر بھی طلوع سحر کا ہمیں کتنا انتظار رہتا تھا۔۔۔۔ تاریکیاں چھٹتی جاتی تھیں اور سنہرا دن نکھرتا تھا۔ شاید اسی طرح ہم بھی کبھی اپنی مسرتوں کی صبح کو پالیں گے۔

میرے پاس ہی مسز علی کا بیڈ صبح بہت سویرے ہی خالی ہوجاتا تھا۔ انہیں لمبی واک کی اجازت مل گئی تھی اور دھوپ پھیلنے سے پہلے ان کو واپس آجانا ہوتا تھا۔ مسز علی کے مسکراتے لب یہاں مایوس مریضوں کے لئے نوید حیات تھے۔ کھلی نگاہیں اور ابھری ہڈیوں والے چہرے کبھی کبھی ان کی طرف بڑی حسرت سے تکا کرتے تھے۔ مگر انسان کتنا بے بس تھا کس قدر مجبور۔

سامنے آم کے باغوں میں سے جب کسی کوئل کی پکار سنائی دیتی تھی اس آواز کو سن کر ایسا لگتا جیسے بچی ہوئی زندگی ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے مگر ہم کہاں تھے؟ اور پھر جیسے کوئی سرگوشیوں میں ہم سے پوچھتا تم کہاں آگئیں۔۔۔؟ تمہارے وہ سنہرے دن، وہ ردو پیلے اور رنگین خواب اچانک کیوں چھین لئے گئے؟۔۔

صبح ڈاکٹروں کا راؤنڈ ختم ہوچکا تھا اور میں لیٹی لیٹی قیس کو خط لکھ رہی تھی۔ تو اچانک بلا انتظار کئے ڈولی اپنے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ لئے ذرا شرماتی ہوئی میرے پاس آگئی ۔۔۔ اس نے کچھ کہنے

سے بغیر میرے گلاس میں پھولوں کو سجا دیا، اور پھر مجھ پر ذرا جھکتی ہوئی بولی۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

میں ہنس پڑی۔ ''آج آپ نے میرے ہاتھوں کو پیار نہ کیا؟'' اس کے دبلے اور سانولے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ باقی ہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

۔۔۔۔۔''اس روز؟ اس روز نہ جانے کیوں اچانک بھولے سے میں نے آپ۔۔۔ [illegible] تھا

۔۔''

''پونم ۔۔۔۔تو پونم کے بیڈ پر جب میں آ گئی ہوں، تو آپ مجھے پونم ہی سمجھیں میں کوشش کروں گی کہ آپ کے لئے آپ کی پونم بن سکوں۔'' اس نے کیسے جذباتی طور پر میری آواز [illegible]۔ ایسی وحشت ناک تنہائی میں شاید مجھ کو کسی دوست کی ضرورت تھی۔ ڈولی نے جس سب سے پہلے [illegible] سے میری انگلیوں کو چوم لیا تھا اور جب اس کے کپکپاتے ہوئے گرم لبوں کی جنبش نے ذہنی طور پر اس کو مجھ سے قریب کر دیا تھا تو اب میں یہ چاہتی تھی کہ ڈولی اپنا سارا خلوص، مجھے دے دے۔ ایسے ویرانے میں اس کی محبت کے سوا مجھ کو اور کوئی سہارا ابھی تو نظر نہ آتا تھا۔

میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے بستر پر بٹھایا اس وقت یہ بھول چکی تھی کہ ٹی۔ بی کے مریض اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پاس کسی کو پیار سے دم بھر کے لئے بٹھا بھی نہیں سکتے۔

ڈولی میرا ہاتھ تھام کر سکنے لگی۔ ''مجھ کو آپ کے ان ہاتھوں سے بہت پیار ہے۔ مہندی لگی یہ لمبی لمبی تازہ سی انگلیاں۔ بالکل جیسے میری پونم کے ہاتھ ہوں'' پھر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اگر سسٹر مجھے اس طرح آپ کے ساتھ بیٹھے دیکھ لے گی تو مجھ پر بڑی ڈانٹ پڑے گی۔

پھر وہ معصومیت سے ہنس پڑی۔ ''اچھا تو پھر ہم دوست ہیں؟'' اور وہ اپنی سفید ساری کا پلو تھامے مجھ کو پلٹ پلٹ کر دیکھتی اور ہاتھ ہلا ہلا کر ٹاٹا کرتی وارڈ سے نکل گئی۔

مسز علی سوئٹر کی سلائیاں تیزی سے چلاتی ہوئی مسکرا کر بولیں تو آخر اس نے آپ کو پونم بنا ہی دیا ۔۔۔۔شاید بہت دیر سے وہ ہمارا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

آپ نے یہاں کی دنیا تو دیکھ لی نا۔؟ ہمارا یہ وارڈ بڑا اچھا وارڈ ہے۔ ایک ساتھ مل کر جب ہم اپنا غم مناتے ہیں تو اس وقت صرف اپنی ہی بے چارگی پر ترس نہیں آتا۔ دکھوں سے بوجھل کئی آنکھیں ۔۔۔۔ایک ساتھ اونچے آسمان سے شکوہ کرتی نظر آتی ہیں۔ مسز علی نے اپنے وارڈ کا جیسے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر گرچہ صحت کی سرخی دوڑ رہی تھی مگر ان کی آنکھوں میں گہری اداسی کے سائے تیر رہے تھے مسکراہٹ اس وقت بھی ان کے لبوں پر موجود تھی مگر غم کی پرچھائیں نجانے کہاں سے،

ن پر چھا گئی تھیں۔

ایک بجے ریسٹ پریڈ کی گھنٹی بجتے ہی ہر طرف ہو کا عالم چھا جاتا تھا جیسے زندگی یہاں پر کبھی رواں دواں تھی ہی نہیں، بس کبھی کبھی ہلکی چاپ سے کوئی نرس اپنے کاموں میں لگی سامنے سے گزر جاتی تھی۔ اپنے سناٹے میں اس کے قدموں کی مدھم سی گونج بھی دور تک سنائی دیتی تھی۔

اس روز دوپہر بھر مجھے ذرا بھی چین نہ ملا۔ گھڑی گھڑی پونم کی خیالی صورت نگاہوں میں پھرتی رہی۔ اب تک مجھ کو کسی سے یہ نہیں پتا تھا کہ پونم کا انجام کیا ہوا؟ اور میں کسی سے چھیڑ کر یہ پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ جس بیڈ پر میں پڑی تھی یہی بیڈ تو پونم کا تھا۔ اور۔۔۔۔۔۔ اور اگر پونم اب زندہ نہیں ہے تو پھر کیا پتہ کہ میرا بھی۔۔۔۔ حشر کیا ہونے والا ہے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تو کیا پھر۔۔۔۔ پھر میں اپنی خوشیوں کی دنیا میں لوٹ سکوں گی؟

نرس کیتھرائن نے مالتی کے سرخ پھولوں سے بھری ایک مہکتی ہوئی ڈولی میری بند آنکھوں پر دھیرے سے ماری اور میں ڈر کر چونک پڑی۔

''ارے۔۔۔۔۔ اتنا تو نہ سویا کیجئے مسز۔۔۔۔۔ وہ بڑے ناز سے اٹھلاتی ہوئی بولی۔ ان دنوں میں نئی دلہن کے اس دکھ نے نرسوں اور مریضوں کے دلوں میں میرے لئے بڑی ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

کیتھرائن کی نزاکت اور چہرے کی نمکینی سارے سینی ٹوریم میں مشہور تھی وہ اپنے آپ کو اس اونچے آسمان تلے سب سے بلند و بالا سمجھتی آ رہی تھی۔ ڈولی سے اس کی ذرا نہ بنتی، دونوں کی فطرت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ڈولی ٹوٹ کر محبت کرتی ہوئی نثار ہو جانے والی لڑکی تھی۔ مگر کیتھرائن شمع کی طرح خاموشی سے جلتی ہوئی اپنے پروانوں کو قربان ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔۔ میں نے جب پھولوں بھری ڈالی کیتھرائن کے ہاتھوں سے لی تو وہ اسی کو ناگن بتا کر چلی گئی۔۔۔۔۔۔ میں نے گھبرا کر پونم اور ڈولی دونوں کا خیال ترک کر دینا چاہا۔۔۔۔ اپنا ہی غم کون سا کم تھا جو دوسری کی آگ میں سلگتی رہتی۔

مسز علی جاگ رہی تھیں، کیتھرائن کے جانے کے بعد کروٹ بدل کر آہستہ سے بولیں۔

''یہ کیتھرائن کیا کہہ رہی تھی جھک کر۔۔۔۔؟

''کہہ رہی تھی کہ ڈولی سے بچی رہنا پونم کو اسی نے ڈس لیا تھا۔ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہوں۔۔۔۔۔'' مسز علی نے بڑی لمبی سانس لی۔

بچاری ڈولی۔۔۔۔ وہ تو اپنی جان دے کر بھی پونم کو بچانا چاہتی تھی۔ اس کو ڈسنے والی کون ناگن تھی۔ میں تمہیں کبھی یہ بتا دوں گی۔ دم بھر کے لئے ان کے سرخ لبوں پر مسکراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

اتنے دنوں میں، میں سینی ٹوریم کے اندر رچی ہوئی زندگی کی عادی بن چکی تھی۔ پہاڑیوں کی خوشبوؤں سے بوجھل ہوائیں جب بچھڑی ہوئی پیار بھری گھڑیوں کی یاد دلاتیں تو دل میں ہوک سی اٹھتی اور آنکھیں خود بخود بھیگ جایا کرتیں۔

وارڈ کے اندر صبح بہت سویرے ہو جاتی تھی، صفائی کا بڑا اہتمام ہوتا، جلد جلد تازہ پھولوں کے گلدان سجائے جاتے اور دھلے ہوئے پردے لٹکائے جاتے اور بستروں کی چادریں بدلی جاتیں۔ فنائل پوڈر اور فنائل سے فرش اتنا چمکایا جاتا تھا کہ اس پر بوٹ پٹ پٹ کرتے کوئی چلتا ہو تو ... بڑے بڑے سرخ رنگ کے گملوں میں پام کے ہریالے بڑے بڑے پتوں کو دھو کر چمکایا جاتا تھا ... ہر طرف تازگی اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔۔۔۔ کبھی کبھی ہمیں یہ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ ہم ... موت کے سائے میں رہ کر زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سامنے دور تک خوبصورت پگڈنڈی ... سبزہ زاروں کے بیچ سے مرم کی سرخ بل پہ بل کھاتی ہوئی سڑکیں گزرتی چلی گئی تھیں جگہ جگہ پودے لگے ہوئے تھے جن میں رنگ برنگے پھول مہک رہے تھے ہر طرف اونچے نیلوں کے اوپر اور نیچے پہاڑوں کے دامن میں سکھو، اور ساگون کا ہرا بھرا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ کہیں پر جنگلی آموں، اور کہیں جامن کے خودرو درختوں کے جنگل پھیلتے چلے گئے تھے۔

وارڈ کے اندر صبح سویرے کا وقت بڑا اچھا لگتا تھا، مریض تھوڑی دیر کے لئے اپنا غم بھول جاتے تھے، دھلا دھلایا تر و تازہ سویرا ہماری زندگی میں جب طلوع ہوتا تو ہمارے افسردہ دل بھی امیدوں سے بھر جاتے تھے، اور ہر بار یہی خیال آتا تھا کہ ایک تاریک پہاڑ سی رات کاٹ کر آخر ہم نے صبح کا اجالا پا ہی لیا ہے۔۔۔۔ اور شاید اسی طرح کبھی نئی زندگی اور مسرتوں کی منزلیں بھی ہمیں نصیب ہو جائیں گی۔

نرسیں بڑے پیار سے مریضوں کو دیکھتیں ان کے بستروں کو بدلتیں، ان کے بالوں کو سنوارتیں ان کے کپڑوں پر جراثیم کش لوشن چھڑکتیں اور المونیم کے ڈھکن لگے اسپوٹم فلاسک میں تازہ فنائل دے کر ہر ایک بیڈ کے پاس اسٹول پر رکھوا دیتیں۔ اور جب یہ سب کچھ ہو چکتا تب سینی ٹوریم کے سب سے بڑے ڈاکٹر اپنے اسٹاف کے ساتھ آتے اور ایک ایک مریض کو بڑے پیار سے دیکھتے انہیں تسکین دیتے، ہنساتے بہلاتے اور آنے والے اچھے صحت مند دنوں کے خوب صورت سپنے دکھلاتے۔ اور شاید انہی سہاروں کو پا لینے کے لئے ہمیں روزانہ بڑے صاحب کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا، وارڈ کی طرف آتے ہوئے ان کے جوتے کی مخصوص آہٹ کو سنتے ہی ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی تھیں۔۔۔۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی محسوس ہوا کرتا تھا جیسے بڑے صاحب کے روپ میں زندگی سامنے کھڑی نس نس میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔ ساری مریض عورتیں بڑی آس اور التجا بھری نگاہوں سے بڑے صاحب کے سیاہ چہرے کی مہک خوشی اور اداسی ان کی بے فکری اور فکرمندی کے انداز بڑی بے چینی سے دیکھتیں

اور پل بھر میں اپنی اپنی قسمتوں کا کچھ دنوں کے لئے ہم خود ہی فیصلہ کر لیتے تھے۔۔۔ بڑے صاحب کا چہرہ ان کی سوچتی ہوئی آنکھیں اور پھر ان کے لبوں کی مسکراہٹ ان کی پونٹ اور سنجیدگی ایسی ہوا کرتی تھی جو ہمارے بیمار پھیپھڑوں کے لئے اکسیر کا کام کر دیتی اور ڈاکٹر صاحب کے دلاسے و تسلیں کے باوجود ایکسرے کا اچھا اور بری رپورٹ ہر دو ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔۔۔ شاید اسی سکون اور ... ہم سارا دن اور ساری راتیں اتنی بے چینی سے گزارا کرتے تھے ۔اور جب ان کا راؤنڈ ختم ہو جاتا تو وارڈ کے سناٹے میں اچانک طور پر ٹی بی کے خطرناک جراثیم کا شدید طور پر احساس ہونے لگتا تھا جو اس وارڈ کے اندر اور باہر ہر طرف فضا میں تیر رہے ہوں گے۔۔۔۔

کبھی کسی بیڈ کی طرف سے آتی ہوئی سوکھی اور حلق میں اٹکی ہوئی کھانسی کی آواز دوسرے مریضوں کو دہلا دیتی تھی۔ مسلسل کھانستے دہل پڑنے والی کمزور آنکھیں اور دھنستے ہوئے سینے کے اندر سے ابھرنے والی گھبراہٹ کی آوازیں کبھی کبھی مجھے ڈرا دیا کرتی تھیں اور میرا جی چاہنے لگتا تھا کہ میں یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔

ڈولی کی ڈیوٹی دوسرے وارڈ میں تھی مگر جب بھی اس کو فرصت ملتی اپنے کوارٹر جانے سے پہلے میرے پاس ضرور آتی چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی مسکراتی ہوئی نرس جب میرے پاس آتی تو اسے دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا تھا۔۔۔ وہ آتے ہی سب سے پہلے میرا چارٹ دیکھتی۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پیار سے کہتی۔ بس اب تو جلدی سے اچھی ہو جا۔۔۔ پھر ہم یہاں جھیل کنارے جائیں گے پہاڑ کے دامن میں آنکھ مچولی کھیلیں گے ۔۔۔ اور۔۔۔ اور کیا کریں گے؟ ڈولی پھر شرارت سے ہنس پڑتی۔۔۔ اس کے سفید خوب صورت دانت ہنستے میں بہت اچھے لگتے تھے۔ اور اس کی معصوم تمناؤں کو سن کر کبھی کبھی میں بڑی بے چینی سے اپنی صحت کا انتظار کرنے لگتی تھی۔

ایک دن ڈولی بہت سے پھل لئے میرے پاس آئی۔ کل وہ اپنی چھٹی کا ایک دن گزارنے قریب ہی شہر چلی گئی تھی جہاں دن بھر گھومتے پھرتے ہوئے اس نے مارکیٹنگ کیا تھا اور مارکیٹنگ کرتے ہوئے اپنے چند چھوٹے چھوٹے کھلونے چرا کر اپنے بلور کے اندر بھی رکھ لئے تھے اور پھر میٹنی شو دیکھ کر واپس آگئی تھی۔

ارے آج تیرے چہرے پہ یہ انار کیوں پھوٹ رہے ہیں؟" ڈولی نے بڑے تعجب سے مجھ سے پوچھا میں ہنس پڑی۔ قیس کا آیا ہوا خط اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"میری خوشیوں کا دیوتا دیکھو مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"اور۔۔۔ تیرے لئے تو خوشیوں کی کوئی دیوی جیسے ہے ہی نہیں۔۔۔ ڈولی کا مسکراتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔۔۔ جیسے وہ اپنی محبت میں کسی دوسرے کو حصہ دار بنانا نہیں چاہتی ہو۔ مجھ کو ڈولی

کا یہ انداز اچھا نہ لگا۔۔۔ قیسی کے پیار بھرے دعا کی یہ تضحیک تھی۔ شاید ڈولی نے میرے بدلتے ہوئے موڈ کو پہچان لیا تھا، کہنے لگی۔

"یہ آدمی لوگ، کبھی کبھی ہمیں بے وقوف بھی بناتے رہے۔۔۔۔ مجھے بعد میں جب انہیں ہوش آتا ہے تو پچھتاتے بھی ہیں اور غم بھی مناتے ہیں۔ مگر وہ سب بے کار ہوتا ہے۔۔"

میں ہنس پڑی۔ "لگتا ہے کسی نے تمہیں بہت ستایا ہے۔۔"

ڈولی دھیرے سے مسکرائی، بالکل اس طرح جیسے کوئی مریض ڈر وعظ کرتے ہوئے بڑے حوصلے سے مسکرا دے

"بھلا مجھ سے یہ کھیل کون کھیلتا؟ مگر اسی جگہ ایک نمبر بیڈ پر پونم کے ساتھ یہ ہوتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔۔"

ڈولی کی آواز بھرا گئی ابھی وہ مجھ سے کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ اچانک وارڈ میں میٹرن آ گئی۔ سات نمبر بیڈ کی مریضہ کو تیز بخار آ گیا تھا۔ ڈولی چپکے سے میرے سرہانے کے اور وارڈ سے باہر نکل گئی اور پونم کی کہانی میرے بیڈ کے گرد منڈلاتی ہوئی بھی مجھ سے دور ہو گئی۔۔۔۔ پھر دن تک طبیعت بڑی اچاٹ تھی، کسی کا انتظار بھی تو نہیں تھا، ڈولی کو بخار آ گیا تھا۔ دوسرے وارڈ کی تازہ خبریں مجھے پھر کون سناتا۔۔

دوپہر کا ریسٹ پیریڈ بڑا لمبا ہوتا تھا ایک بجے سے چار بجے تک تھا۔ سوتے اونگھتے اور خاموشی سے لیٹے لیٹے طبیعت اکتا جاتی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ اس وقت کتاب تک پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے سمے میں میں نے چپکے سے مسز علی کو پکارا۔ وہ اپنے بیڈ پر میری طرف، ذرا اور سرک آئیں۔

"کیا بات ہے بھئی ۔۔۔ نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟" وہی پرانا تبسم اس وقت بھی اس کے لبوں پر موجود تھا۔

"میرا یہ پہلا بیڈ۔۔۔۔ کبھی مجھ کو چین سے رہنے ہی نہیں دیتا ہے۔۔"

"تو پھر میرے جانے کے بعد تم میرے بیڈ پر آ جانا۔۔۔۔"

"مگر پونم کی کہانی تو وہاں پر بھی منڈلائے گی۔ اور مصیبت یہ ہے کہ وہ کہانی کوئی مجھ کو سناتا بھی نہیں ۔۔۔۔"

مسز علی شاید گھر جانے کی خوشی میں بڑے اچھے موڈ میں تھیں ... کہنے لگیں

"میں نے تمہیں پونم کی کہانی اب تک اس لئے نہیں کہی تھی کہ تم اسی کے بیڈ پر ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر کوئی اثر پڑے، اور تم پریشان ہو جاؤ۔ پونم بڑی خوب صورت لڑکی تھی بڑی پیاری۔۔۔۔ وہ یہاں بیمار ل خون اگلتی ہوئی لائی گئی تھی اس کے بھائیوں کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی آیا تھا۔ جو سب سے زیادہ خوب

صورت تھا اور بدحواس ہو رہا تھا ۔۔۔ بڑے صاحب نے پونم کو دیکھتے ہی صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ہوسپٹل میں اتنا کمزور، اور سیریس کیس کبھی نہیں لیں گے پونم اسی وارڈ میں اسٹریچر پر پڑی، سارے وارڈ کو تک تک تکتی رہی تھی آخر بڑی مشکلوں سے بڑے صاحب کو راضی کیا گیا اور پونم کو اسی ایک نمبر بیڈ پر جگہ دے دی گئی تھی ۔۔۔۔۔ وہ گھبرایا ہوا لڑکا پل بھر کے لئے بھی پونم سے الگ ہونا نہ چاہتا تھا کبھی اس کے بکھے بالوں پر ہاتھ پھیرتا اور کبھی اس کے ہاتھ کو پیار سے سہلاتا اس کی آنکھیں پونم کو ایک ٹک سے دیکھتی رہتیں جن میں پیار کے ساتھ ایک گہرا غم بھی چھپا رہتا تھا، پتہ نہیں پونم کی حسین آنکھوں کا اثر تھا یا اس کی پیاری شخصیت کی کشش تھی کہ اس وارڈ کے سارے لوگ اپنے دلوں میں اس کا درد محسوس کرنے لگے تھے پونم بالکل ایک قربانی کی طرح لگتی تھی اس کی بیماری اور بے بسی کا سارا دکھ اس کی آنکھوں میں جیسے سمٹ کر آ گیا تھا ۔ اس کے پیارے سوکھے ہوئے لبوں پر ان کی داستان الم کی اتنی تھرتھراہٹیں تھیں کہ اس کی طرف نظر بھر کے دیکھنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی ۔

ان دنوں ڈولی کی ڈیوٹی اسی وارڈ میں تھی پونم کے کے آنے سے اس کا کام بہت زیادہ بڑھ گیا تھا ۔۔۔ پہلے تو دیر تک وہ بڑے صاحب پر جھلاتی رہی تھی کہ انہوں نے اتنا سیریس کیس لیکر اس کی جان مصیبت میں ڈال دی ہے پھر منٹوں ہی میں اس کو پونم سے زیادہ اس گھبرائے ہوئے لڑکے پر رحم آنے لگا تھا ۔۔۔ جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور جس کی چمکیلی آنکھوں میں بار بار آنسو چھلک آتے تھے ۔

یہ دیکھو تو بھلا ۔۔۔ ہائے یہ مرد ہو کر رو رہا ہے ڈولی نے ہنستے ہوئے میرے کان میں چپکے سے یہ کہا تھا ۔۔۔ لگتا ہے جیسے رومیو جولیٹ والی کوئی بات ہے ۔۔۔ ہے نا؟ ۔۔۔ اور اتنا کہہ کر ڈولی پھر پورے انہماک سے اپنے کاموں میں لگ گئی تھی

میں نے گہری نگاہوں سے رومیو کو دیکھا سچ بڑی پرکشش شخصیت تھی اس کی ۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر آپ ہی آپ گلاب کی شگفتہ ہوتی ہوئی وہ کلیاں یاد آ رہی تھیں، جو تیز دھوپ سے مرجھا گئی ہوں ۔۔۔ وہ بے چارا بار بار بڑی مایوسی سے کبھی اس وارڈ کو دیکھتا کبھی اس کی چھت کو تکتا کبھی ایک قطار سے بچھی ہوئی ہماری پلنگوں پر اس کی نگاہیں جاتیں پھر ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کو تسکین کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے ۔ میں نے بڑے غور سے پونم کی مانگ کو دیکھا مگر وہ سیندور کے بنا سونی تھی اور اس کی انگلی میں انگیجمنٹ کی رنگ چمک رہی تھی ۔۔۔۔،،

دھیرے دھیرے پونم اچھی ہونے لگی ۔ اس کی آنکھیں صحت مند ہو کر اور بھی خوبصورت نظر آنے لگیں تھیں، اس کے لبوں کے خم گداز ہو کر بڑے پیارے لگتے تھے، ڈولی نے پونم کی بڑی محبت اور پیار سے خدمت کی تھی بالکل اس طرح جیسے اس نے اپنی زندگی کا بھی ایک مقصد بنایا ہوا ۔۔ ۔ ڈولی کی ڈیوٹی دن بھر کی ہوتی پھر بھی وہ ساری ساری رات پونم کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر گزار دیا کرتی تھی، ایسی تنہائی

ویرانے اور اس خطرناک بیماری میں اگر پونم کو ڈولی کی محبت کا سہارا نہ ملتا تو [illegible] جلدی [illegible] تھی۔ ڈولی اسے ہنساتی، بہلاتی اور اس کو زندہ رہنے کی ہمت دلاتی تھی [illegible] زندگی کے سنہرے دنوں کی جھلکیاں دکھایا کرتی، جیسے [illegible] پونم کی آنکھوں میں [illegible] سوکھے ہاتھوں کو اپنے پیار چہرے سے لگا کر کبھی سسکتی سی رہتی تھی [illegible] ڈولی [illegible] زندہ نہیں رہے گا ۔۔۔۔ اس کی آواز میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی [illegible] ستیش کے جیون کی بھکارن نظر آتی تھی ۔۔۔۔۔

ڈولی نے گویا اپنی جان نچھاور کر کے پونم کی صحت [illegible] کھلاتی پہناتی اور جب ڈاکٹر نے وارڈ کے اندر تھوڑی دیر [illegible] تو ڈولی ہی پونم کا ہاتھ تھامے وارڈ کے اندر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چلایا کرتی تھی

جب کبھی پونم ڈولی کے ہاتھوں کو پیار سے تھام لیتی یا اس کی انگلیوں [illegible] ڈولی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا تھا، جیسے اس کی ساری محنت اور [illegible] مسرت [illegible] کی رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ ڈولی پونم پر چھا گئی۔ ایسی خوب صورت اور [illegible] جب کبھی ڈولی اپنے انتظار میں بے چین دیکھتی تو اس کا دل کھل اٹھتا تھا ۔۔۔۔۔ پونم ڈولی کو [illegible] لگی تھی کہ وہ ڈولی کی پسند کے کپڑے تک پہنتی ۔۔۔۔۔ اس اندھیرے میں شاید اس اکیلی محبت وہ اپنے لئے ایک سہارا سمجھ کر وہی کچھ کرنا پسند کرتی تھی جو ڈولی کو اچھا لگتا تھا ۔۔۔ ڈولی کو پونم کی اداس ہتھیلیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسی لئے وہ پونم کے ہاتھوں میں مہندی لگاتی اور پونم کی لال لال ہتھیلیاں جب مہندی کی خوشبو سے رچی ہوتی تو ڈولی بڑے پیار سے ان سنگ مرمر کی تراشی ہوئی سفید ہتھیلیوں پر مہندی کی سرخی کو دیکھتی اس کی خوشبوؤں کو سونگھتی اور پھر ان دہکتی ہوئی نازک انگلیاں کو چوم لیا کرتی تھی ۔۔۔۔۔ ڈولی کی پونم سے ساتھ اس محویت اور سرشاری کو دیکھ کر دوسری نرسیں اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ ورکیتھرائن تو ڈولی کے نام تک سے بیزار تھی۔ اور اس نے ہر جگہ یہ بات پھیلا رکھی تھی کہ "ڈولی ایک دق کی بیمار لڑکی سے عشق کرنے لگی ہے۔

چند مہینوں کے بعد پونم کو ایک فرلنگ ٹہلنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اور اب وہ بڑی بے صبری سے اپنے گھر جانے کی راہ تکنے لگی تھی ۔۔۔۔ اس کے پاس گھر سے اتنے خط آیا کرتے تھے، جتنے وارڈ بھر میں سب ملا کر بھی نہ آیا کرتے تھے۔ وہ بڑی خوش ہوتی تھی اس کی خوشی کے اظہار میں بچوں کی معصومیت کا انداز ہوتا تھا۔ اس کو اپنے رومیو سے بڑا پیار تھا۔ جس کا نام ستیش تھا اور جو ٹینس کا بڑا اچھا چیمپئین تھا اور جس کو پہلی بار کھیل کے میدان میں جیتتے ہوئے دیکھ کر پونم اپنے آپ کو ہار گئی تھی۔ شاید خوب صورت آنکھیں جب محبت کے بوجھ سے اور بھی جھک جاتی ہیں تو پھر اس پیار کو ٹھکرایا کہیں جا سکتا ہے اسی لئے ستیش نے بھی

اپنی محبت اور انگیجمنٹ کی انگوٹھی سب کے سامنے پونم کو پہنا دی تھی مگر خوشیوں کی یہ گھڑیاں بہت مختصر ثابت ہوئیں۔۔۔

مسز علی نے بڑی ٹھنڈی اور گہری سانس لی اور چونک [illegible] کا شور ہر طرف سے اٹھ رہا تھا۔ ہم کار [illegible] ہو چکا تھا [illegible] اندر [illegible] کے ساتھ ہی زندگی کی ہماہمی شروع ہو گئی تھی۔

میرا دل [illegible] ادھوری کہانی کو سن کر افسردہ ہو گیا۔ لیکن مسز علی کا چہرہ ویسے ہی دمک رہا تھا نجانے [illegible] وقت مسز علی کی مسکراہٹ مجھے ذرا بھی اچھی نہ لگی۔

[illegible] بہت دیر تک میری نیند اچاٹ رہی، اور میں پونم کی سنی ہوئی کہانی کے سہارے اس کو یاد کرتی ہوئی [illegible] سوچتی رہی پتہ نہیں، کیسے میں اپنے آپ کو پونم کا سایہ سمجھنے لگی تھی۔۔۔۔ اور اب میرا کیا حال ہے [illegible] ڈولی جیسی کہہ نہیں سکتا تھا۔

ڈولی کئی دنوں سے بیمار تھی۔۔۔ پھر بھی سارا دن مجھ کو اس کا انتظار رہا جیسے ہی اس کی طبیعت سنبھلی وہ میرے پاس آ گئی۔ وہ شام بڑی اداس تھی اور ایسا لگتا تھا کہ عام شاموں کی طرح اس روز بھی شفق پھیلی ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ مغرب کی طرف آسمان پر بہت سی چتاؤں کے شعلے لپک رہے ہوں۔۔۔۔۔

میں نے ڈولی کا سوکھا اور گہرا سانولا ہاتھ تھام لیا۔۔۔۔۔ ڈولی میں نے تمہاری پونم کی ادھوری کہانی سن لی ہے اور یہ جان گئی ہوں کہ پونم کو تمہاری محبت اور ان تھک خدمتوں نے بچا لیا تھا پھر کیا ہوا، ڈولی وہ نامکمل کہانی تم مجھے سنا سکو گی؟۔۔

ڈولی پہلے چپ رہی، بڑی گہری اور اداس نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر آنسو آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اس کے کمزور چہرے کا رنگ مدھم پڑتا گیا۔ پھر اسکے لب تھرتھرانے لگے۔۔۔۔ اور وہ میری انگلیوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔

''پونم کی جوانی صحت پا کر ایک پھول کی طرح کھل اٹھی تھی جس میں شعلے کی لپک بھی تھی اور چودھویں رات کی ٹھنڈک بھی۔ اسکو ستیش سے بے حد محبت تھی پونم ستیش کی محبت میں کبھی کبھی اتنی گم ہو جاتی کہ اس کو دیکھ کر میرا دل اداس ہو جاتا تھا۔ وہ دور رہ کر بھی پونم کو پا نہ سکی تھی۔ جب کبھی مجھ کو چھٹی ہوتی اور میں پونم کیساتھ واکنگ چلی جاتی تو وہ ہر دلکش موڑ پر ستیش کو یاد کیے جاتی۔ نجانے کیسے میں نے پونم کو اپنی زندگی سمجھ لیا تھا ستیش سے دور رہ کر اس کو جو چیز تسکین پہنچانے والی تھی وہ اس کی منگنی کی انگوٹھی تھی وہ گھنٹوں اسی سے کھیلتی رہتی، وہی اس کی تنہائی کی ایک اکیلی رفیق بھی تھی اور شاید رازداں بھی۔

جس دن ستیش کا خط آتا پونم کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا اس دن مجھ کو ایسا لگتا جیسے پونم مجھ سے

بہت دور ہو گئی ہے اسکی آنکھوں میں مسرتوں کے اتنے چراغ جھلملاتے تکتے تھے جن کی روشنی میں میرا وجود اکیلا اور بے سہارا نظر آتا تھا۔

پونم کو سینی ٹوریم میں آئے ہوئے آٹھ مہینے ہو چکے تھے اس عرصے میں اس کے گھر کے لوگ کئی بار آ چکے تھے مگر ستیش اب تک نہ آیا تھا اس نے لکھا تھا کہ اب وہ یہاں آکر اسے دیکھے پونم آج چودھویں کا چاند بن کر چمک رہی تھی ستیش اپنے کھیلوں کا موسم ہوتے ہوئے بھی آگیا اور پونم کو اتنا اچھا پاکر بے حد حیران رہ گیا۔۔۔۔۔ پونم کے ساتھ اس کے پیار میں ذرا بھر فرق نہ آیا تھا۔۔۔۔ لیکن میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ سینی ٹوریم کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ڈرنے لگا ہے اور جب بھی وارڈ کے اندر آتا تو اپنے کپڑوں پر یوکلپٹس کی پوری شیشی چھڑک کر آتا تھا اس کو دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی نے اس کو ٹی بی کے کیڑوں سے ڈرا دیا ہے۔۔۔ اسکے چہرے کی رونق مرجھائی سی رہتی اور وہ پونم کو پیار کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔۔۔۔ جب میں نے یہ محسوس کیا تو جیسے میرے دل میں اچانک اک ٹھنڈک سی پڑ گئی اور میرے دل نے مجھ سے کہا کہ تو اس زہریلی فضا اور ماحول میں پونم سے بے حد قریب ہے اور ستیش پونم کے دل سے قریب رہ کر اس جگہ اس سے بہت دور ہے۔۔۔

پونم جب ستیش کے ساتھ باہر نکلتی تو میں دور کھڑی انہیں دیکھتی ہوئی سوچا کرتی تھی کہ وارڈ سے باہر بھی ستیش پونم کو اپنے قریب محسوس کرتا ہے یا نہیں، لیکن میں اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ ستیش کے آتے ہی کیتھرائن اس وارڈ کے چکر لگانے لگی تھی، پونم کے لیے اسکا خلوص بہت بڑھ گیا تھا وہ بڑے پیارے پیارے گلدستے بنا کر لاتی اور پونم کے سرہانے گلدانوں میں سجا دیتی اس کی مسکراہٹوں کے انداز بدل گئے تھے۔ آواز میں اور بھی مٹھاس بھر گئی تھی اور اس کی آنکھیں جیسے نئی دلہن کی طرح جھکی جھکی سی رہنے لگی تھیں۔۔۔۔ کیتھرائن ہمیشہ اپنے شکار پر دور دور سے حملہ کرنے کی عادی تھی۔۔۔۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر پونم ستیش کی محبت اور اس سے ملنے کی خوشی میں اتنی مگن اور اتنی گم تھی کہ اس کو کیتھرائن کی نگاہوں کی پیاس کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ اور یہی ہوا کہ ریسٹ پیریڈ کی ظالم گھڑیوں نے کیتھرائن کو ستیش سے بہت قریب آنے کا موقع دے دیا تھا، ویسے بھی بے کاری کا وقت کسی نہ کسی طرح تو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔ پونم بیمار تھی اور اس کی ہر سانس میں ستیش کو ٹی بی کے کیڑوں کا خطرہ محسوس ہو سکتا تھا۔۔۔ اور کیتھرائن تندرست تھی اور وقتی طور پر ایسے ویرانے میں اس کو خوب صورت کھلونوں سے کھیلتے رہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ ستیش کیتھرائن سے بچ نہ سکا۔

ستیش دو چار دنوں ہی کے لئے آیا تھا مگر وہ یہاں ہفتہ ٹھہر گیا۔ ستیش چیمپین تھا؟ کسی کھیل کے میدان سے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ اس کے بٹن ہول میں لگی ہوئی ہر ایک تازہ کلی مجھ کو چپکے سے کیتھرائن کی گزری ہوئی محبت کی داستان سنا دیتی تھی۔ کیتھرائن ستیش کے حسن و جوانی سے کھیلنے کی خاطر پونم پر چھا جانا

چاہتی تھی ۔۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک نکھار آ گیا تھا ۔ وہ جان جان کر ستیش اور پونم کو چھیڑتی اور پھر بڑے ناز و ادا سے کہتی، ستیش بابو کا دل کون جیت سکتا ہے بھلا ۔۔۔۔ پونم بڑی معصومیت سے کھل کھلا کر ہنس دیتی ۔ ۔ اور ستیش کے دل کا چور اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے ظاہر ہونے لگتا تھا ۔ میں ڈرتی رہتی تھی کیتھرائن کی ہر ایک چال ایسی ہوتی تھی کہ اگر ذرا بھی پونم کو شک ہوتا تو ساری باتیں اپنے آپ کھل کر رہ جاتیں ۔۔۔ جس رنگ کی کلی ستیش کے بٹن ہول میں نظر آتی ۔۔۔ ویسی ہی کلیاں اور پھول کیتھرائن اپنے جوڑے میں ضرور لگا کرتی تھی ۔۔۔۔ میں ان اشاروں کو دیکھ دیکھ کر جلتی اور کڑھتی رہتی مگر پونم اس اعتماد کے ساتھ ستیش سے محبت کر رہی تھی کہ اس کی نگاہیں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے کبھی ٹکرا نہ سکتی تھیں ۔

ستیش جب چلا گیا تب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ۔ مگر پونم غمگین تھی اس پر اچانک افسردگی چھا گئی تھی ۔ ۔ اور میرا جی ہر گھڑی ڈرتا رہتا تھا کہ پونم کی صحت کہیں کمزور نہ ہو جائے یا کیتھرائن پونم کو اشاروں میں ستیش کے ساتھ اپنے کھل کھیلنے کی کہیں کوئی بات کہہ نہ گزرے ۔

کیتھرائن کی جب بھی نگاہیں مجھ سے ٹکراتیں وہ بڑے ناز سے مسکرا دیتی، جیسے کہہ رہی ہو ۔۔۔ میں تو کسی مندر کی دیوی ہوں ۔ میری چرنوں پر محبت کے پھول چڑھائے گئے تو کیا ہوا؟! ان قدموں پر تو زندگیاں بھی لٹائی جا سکتی ہیں ۔۔''

گرمیوں کے دن تھے، ٹی ۔ بی سوکھیں یہ تو رہم بڑی قیامت کا سمجھا جاتا ہے مریضوں پر کبھی کبھی تو یہ گرمی اتنا برا اثر ڈالتی ہے کہ انہیں سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔۔۔ کیتھرائن ایک دن پونم کے پاس آئی تو اس کے بلوز کے گلے میں ایک رومال اڑسا ہوا دیکھ کر پونم نے مذاق میں آہستہ سے نکال لیا ۔۔۔ کیتھرائن کو پتہ بھی نہ چلا کہ پونم نے کیا چیز چوری کی ہے ۔۔۔ مگر جب پونم نے کیتھرائن کے جانے کے بعد اس کو دیکھا تو وہ اسی کے ہاتھ کا بنا ہوا رومال تھا اور جس پر اس نے ستیش کا نام بھی لکھا تھا ۔ اسی ایک معمولی سے رومال نے پونم کو ڈھا کر رکھ دیا تھا ۔ جیسے ساری تازہ اور رنگین کلیوں کی داستانیں اچانک طور پر پونم کو اسی رومال نے کہہ سنائی تھیں ۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی گئیں ۔۔۔ ایک ہلکی سی چنگاری نے اس کی زندگی سلگا کر رکھ دی تھی ۔۔۔ اس نے مجھ سے بھی کوئی بات نہ کہی، لیکن میری نگاہوں نے پہلے ہی بہت سے تماشے دیکھے تھے، میں سمجھ گئی کہ کیتھرائن کا وار خالی نہ گیا تھا ۔۔۔ پونم کا ویٹ تیزی سے گرنے لگا اور ایک روز جب وہ سو کر اٹھی تو بخار سے جل رہی تھی میں پونم کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی ۔۔۔ مگر پونم، ذرا بھی پریشان نہ تھی ۔ بس اسے ایک ہی چیز کی حسرت تھی کہ ستیش کو صرف ایک بار اور دیکھ لے، جی بھر کے دیکھ لے ۔ میں نے پونم کی اس بیماری میں ساری ساری رات خدا باپ کے آگے رو رو کر اس کی زندگی کی دعائیں مانگی تھیں ۔۔۔ مگر ایسا لگا جیسے قبولیت دعا کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں ۔

پونم جب سے بیمار پڑی تھی ایک عجیب سی تمنا اس کے دل میں تڑپ اٹھتی تھی۔ [illegible] ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ ڈولی مجھے سیندور کی لالی بڑی اچھی لگتی ہے ایک چھوٹی سی ڈبیہ [illegible] آواز میں اتنی تھرتھراہٹ اور التجا تھی کہ میں اٹھی اور کرشیری اور وہاں سے [illegible] ڈبیہ میں سیندور خرید کر لے آئی۔ پونم نے سیندور بھری ڈبیہ لیتے ہوئے میرا ہاتھ چوم [illegible] کہ اس نے میرا ہاتھ چوما تھا۔۔۔۔ اب تک اس نے [illegible] ڈبیہ ہر گھڑی اس کے تکیے کے نیچے دھری رہتی تھی۔۔۔۔ [illegible] اتنی چھوٹی سی تمنا کے سوا اس کو اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

رفتہ رفتہ پونم کی حالت بگڑتی چلی گئی۔۔۔۔ جیسے کوئی دوا [illegible] ۔۔۔ بار بار یہی ایک خیال میرے دماغ میں آتا کہ پونم آتے ہی کیوں مر [illegible] یاد دینے کے لئے اس کی زندگی نے چند مہینوں کے لئے موت سے کیوں مہلت مانگی تھی۔؟

بڑے صاحب نے گھر والوں کو خبر کر دی تھی ستیش کے سوا [illegible] کمپنی کے سلسلے میں ہندوستان سے باہر گیا ہوا تھا اس کو پونم کی بیماری کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔

ہوش اور بے ہوشی کے درمیان پونم کی کمزور سانس چل رہی تھی وہ سیندور کی ڈبیہ کو سب سے چھپائے رکھتی تھی۔ پونم کی زندگی کا آخری دن بڑا حسرت ناک تھا۔ اس کی حیات کی مدھم لو میری آنکھوں کے سامنے لرز رہی تھی۔۔۔ نبض رہ رہ کر ڈوبنے لگتی تھی اور اس کا زرد چہرہ موت و حیات کی کشمکش میں بڑا معصوم نظر آتا تھا زندگی اپنا رشتہ توڑ رہی تھی اور موت کا سایہ ہر طرف سے چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

یک بیک ہوش میں آتے ہوئے پونم نے بہت ہی دھیرے سے مجھ کو پکارا۔

"ڈولی ... میں اپنے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔

"۔۔۔۔۔۔ اگر ۔۔۔۔۔۔ اگر ستیش آجائے تو اس سے کہہ دینا ۔۔۔۔ کہہ دینا ۔۔۔ کہ ۔۔۔۔ وہ میری مانگ میں اپنے ہاتھ سے یہ ۔۔۔۔ سیندور ۔۔۔۔۔ یہ سیندور بھر دے ۔۔۔۔"

سیندور کی ڈبیہ ایک امانت کی طرح اس نے میری انگلیوں میں تھما دی۔

مرتے ہوئے، اس بے بسی کے عالم میں زندگی سے بھری ہوئی پونم کی یہ آخری تمنا سن کر میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رونے لگوں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اس لئے کہ پونم مر رہی تھی اور اس کی یہ آرزو بھی چند لمحوں میں دم توڑ دینے والی تھی۔۔۔ اور میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ مرتی ہوئی پونم کی مانگ اب تک سونی تھی اور لال سیندور سے بھری ہوئی ڈبیہ میرے ہاتھ میں کانپ رہی تھی ۔۔۔ اور ستیش ہندوستان سے بہت دور نجانے کس میدان میں اپنا کھیل رہا تھا۔

پونم کی ارتھی جب اس جگہ سے اٹھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی جاتے جاتے پونم نے اپنی حوالات مجھے سونپی تھی۔ شاید اسی امانت نے اتنے بڑے غم کو اٹھا لینے کا بھی مجھے سہارا بخش دیا تھا۔۔۔ کتنا بڑا کام تھا میرا لال لال سیندور سے مجھے پونم کی سونی مانگ سنوارنی تھی۔۔۔ موت کی گود میں سستے ہوئے بھی سیندور کی ڈبیا میں وہ زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اور وہی سیندور کی ڈبیہ لئے میں اپنی پونم کا سنگھار اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی نجانے کہاں سے ہمت لے آئی تھی۔۔۔۔ چتا پر جب آخری بار پونم کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی تو مجھے ایسا لگا جیسے سہاگ رات، کوئی دلہن اپنے دلہا کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔۔۔۔۔۔ ڈولی کے آنسو بے اختیار بہنے لگے اور پھر وہ وہ سسکتی ہوئی بولی۔

چتا جلنے سے پہلے میں نے وہ لال سیندور سے بھری ہوئی ڈبیہ پونم کے سرہانے رکھ دی۔

یہ پونم کی آخری تمنا تھی اس کو اسی چتا میں جلنے دو۔۔

چتا سلگ اٹھا، اور پھر شعلوں کی لپک نے پونم کی سونی مانگ میں لال لال سیندور بھر دیا۔ اس کو دلہن کی طرح سجا دیا اور سیندور کا سہاگ آخر پونم کے ساتھ ہی چلا گیا

ڈولی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، ڈوبتی ہوئی شام بھی سسکتی نظر آ رہی تھی اور آسمان کے کنارے پر شفق کی پھیلی ہوئی لالی کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح لگ رہی تھی۔

میں کانپ کر رہ گئی۔۔۔۔۔ جیسے میری زندگی اور خوشیوں کی چتا بھی سامنے دہک رہی ہو ۔۔۔۔ ''

اجل کار

شمع خالد

اناؤنسر نے پروڈیوسر سے فرمائشی خطوط کا پلندہ لیا۔ تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ یقیناً ان سینکڑوں خطوط میں وہ ایک ننھا منا خط بھی ہوگا جسے پانے کے بعد جانے کیوں اس کا دل یوں دھڑکنے لگتا جیسے پسلیوں کے قید خانے سے باہر نکل آنا چاہتا ہو۔ قید خانے کا تصور آتے ہی وہ بے نام چہرہ بے تحاشا یاد آنے لگا جس کے نقوش روزانہ ذہن میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں یادوں کے قبرستان میں وہ روزانہ ایک نئے نام کی تختی اس چہرے پر آویزاں کرتی رہتی ہے۔ یہ چہرہ بچپن سے اس کے سائے کی مانند پیچھا کر رہا ہے۔ جب وہ آٹھویں میں آئی اور جوانی کی نشانیوں کو چھپانے کی شعوری کوشش کرنے لگی تب ہی وہ نجانے کہاں سے آوارد ہوا۔

وہ جب بھی سکول جانے کے لیے قدم گھر سے باہر نکالتی' وہ دروازے کے پاس کھڑا ہوتا۔ شروع شروع میں اسے احساس ہی نہ ہوا۔ اور جب احساس ہو تو وہ گھر سے کبھی جلدی نکل جاتی اور کبھی دیر سے .... کبھی برقعہ پہن لیتی اور کبھی چادر اوڑھ لیتی کہ شاید وہ پہچان نہ پائے' لیکن وہ جب بھی گھر سے قدم نکالتی وہ وہاں موجود ہوتا اور ایک خاص فاصلے سے اس کے پیچھے چلتا رہتا۔ سکول سے واپسی پر کسی دوست کے گھر کو جاتے ہوئے جانے وہ کہاں سے سامنے آ موجود ہوتا۔ شروع شروع میں اسے گھبراہٹ ہوتی تھی اور وہ گھر میں بہانہ بنا کر سکول سے چھوٹی کر لیتی۔ ماں پوچھتی رہتی ناہید، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ...... اور پھر واقعی اس کی طبیعت بگڑنے لگتی کیونکہ وہ اسے سامنے نہ پا کر ماؤتھ آرگن بجانا شروع کر دیتا۔ ماؤتھ آرگن سے نکلتے سر فضاؤں میں بکھر کر اسے اپنے حصار میں لے لیتے اور وہ بولائی بولائی کبھی آنگن میں اور کبھی کمروں کے چکر کاٹنے شروع کر دیتی۔ یہ آواز کچھ اس انداز سے اس کے دل و دماغ کو جکڑ لیتی کہ وہ گھبر کر ماں سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر گھر سے نکل جاتی۔ کبھی سہیلی کے گھر جانے کا' کبھی استانی سے کوئی سوال پوچھنے کا اور کبھی بازار سے کچھ چیزیں خریدنے کا جواز بنا کر ماؤتھ آرگن کی آواز

اسے گھر سے باہر نکال لیتی۔ اور وہ سایہ بنا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔ آہستہ آہستہ وہ اس پیچھے آنے والے کو اپنے سے ضروری سمجھنے لگی۔ اسے دیکھ کر تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ عجیب بات تھی کہ نہ تو وہ چند قدم آگے اور نہ چند قدم پیچھے چلتا۔ نہ اس نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ سوچتی اسے کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟ یہ کہیں پڑھتا یا نوکری کرتا ہے یا نہیں۔ پھر کچھ نہ سمجھ پاتی۔ سکول سے کالج' پہنچنے کے باوجود اس شخص کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ ہی وہ آگے بڑھا اور نہ ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بی اے کے امتحان کے بعد ناہید کچھ عرصہ کے لیے ماموں کے گھر چلی گئی' ماں اور ماموں کے آپس کے فیصلے کے بعد وہ نکاحی بن کر واپس گھر آئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ وہ سوچتی' اتنی جلدی تو گڈے گڑی کا بیاہ بھی نہیں رچایا جاتا۔ ماں اور ماموں نے دونوں سے پوچھے بغیر ان کے لیے زندگی کا نیا بندھن تیار کر دیا اور وہ دونوں اس میں چپکے سے بندھ گئے۔ تیاری کے بہانے ماں نے کچھ وقت مانگا تو وہ بے حس بنی سوچتی رہی کہ میں تو اس پودے سے بھی بے وقعت نکلی جسے ایک گملے سے اکھیڑ کر دوسرے میں لگایا جاتا ہے لیکن اس سوچ میں اس کا نام اس کا پرتو نہیں۔ یہ بھی کہ جس نے زندگی کے اتنے سال چپ چاپ خاموشی سے اس کی نذر کیے تھے۔

گرمیوں کی دوپہر کو وہ اپنے جہیز کے دوپٹے پر تارے ٹانک رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سب ہی سو رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ اپنے ساتھ ایک بوڑھی عورت کو لیے کھڑا تھا۔ چہرے پر انتظار کے دیے جلائے اب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ناہید نے اسے مردانے میں بٹھایا اور بوڑھی عورت کو اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی۔ بوڑھی عورت اس کی آنکھوں کو دیکھتے بڑبڑا رہی تھی۔ بالکل میرے ندیم جیسی آنکھیں۔ دیکھو یہ زیور میں اس کی بیوی کے لیے لائی ہوں۔ ماں نے آواز سنی تو اٹھ کے آ کر پاس بیٹھ گئی۔ جان پہچان کے تانے بانے ادھیڑے گئے۔ کوئی ننھیال یا ددھیال کی ڈوریں تلاش کی جا رہی تھیں کہ مردانے سے پیام آیا کہ آئیں واپس چلنا ہے۔ بوڑھی عورت میٹھی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پر دروازے کے پاس پہنچے تو اسے آواز آئی ''اماں چلیے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ دولہا دلہن کی تصویر بیٹھک میں لگی ہے۔'' ماں کبھی اسے مڑ کے دیکھتی رہی اور کبھی بیٹے کو۔ اور پھر وہ غائب ہو گیا۔

شادی کے ہنگامے' جیون ساتھی کی محبت' نئے جہانوں کی آدرگی ایک دوسرے کو جاننا اور قریب سے قریب لانے کی فکر میں وہ اسے بالکل ہی بھلا بیٹھی۔ یاد تو خیر پہلے بھی کبھی نہ کیا تھا۔ آخر کچھ عرصہ ایک ساتھ گزارنے کے بعد جذبات کے بہاؤ سے جوش کی جولانی رخصت ہوئی تو اس نے اپنے بارے میں سوچا اور شوہر سے ملازمت کی اجازت مانگی۔ پارٹ ٹائم جاب کے طور پر اسے ریڈیو پر اناؤنسمنٹ کی اجازت ملی۔ اور آڈیشن میں کامیابی کے بعد اس نے اپنے آپ کو اچھی اناؤنسرز کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ زندگی

پھر مرتے کم بخت اور بے جدوجہد کے پانے سے عادی تھی خوشی آتی [illegible]
ہی اس کے پر اعتماد ہونے کی دلیل تھی۔

آواز کی دنیا بڑی نرالی ہوتی تھی [illegible]
اتار چڑھاؤ کے مرہون منت ہوتے تھے۔ اور وہ اس [illegible]
شناخت اور اپنی ذات پر اعتماد دیا۔ اور جب [illegible]
کا باعث بنی تو اپنی ذات کو گھر اور ریڈیو کے [illegible]
آسماں بنا دیا تھا۔ فرمائشی خطوط میں اس کی آواز سے [illegible]
ہوتا تھا 'پڑھ کر اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ یک ایک [illegible]
کہ ایک خط نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ لکھنے والے نے اس [illegible]
رہے دی تھی۔ جیسے وہ گھونٹ گھونٹ ان لفظوں کو کانوں کے راستے دل [illegible]
ہو۔ ہر دفعہ کوئی نیا جملہ کوئی تعریف کا نیا انداز کوئی نئی بات [illegible] جملہ
شروع میں وہ اسے صرف ایک فرمائشی خط سمجھتی رہی۔ اور پھر اسے ان خطوط کا [illegible]
کے انبار سے سب سے پہلے اسی خط کو نکالتی۔ یہ خط اس کی نظر میں لکھے الفاظ موتیوں [illegible]
جملے اسے نئے جہانوں کی سیر کراتے اور وہ ان لفظوں کے حصار میں مقید ہوتی چلی گئی۔ حسین اشعار
خوبصورت اقوال زریں' نت نئے سوچن' بڑے لوگوں کے افکار سب ہی کچھ ان خطوط میں ہوتا اور بڑے
ادیب شاعر۔ فلاسفر' ماہرین نفسیات کے نام پڑھ پڑھ کر وہ اس شخص کی علمیت سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ اپنی
تعریف میں لکھے الفاظ کو حذف کر کے وہ سارا خط نشر کر دیتی۔

اور پھر کچھ دنوں کے لیے یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اور پھر لکھنے والے کو
بھلا بیٹھی۔ لیکن پروگرام کے دوران اکثر اسی کے لکھے جملے وہ روانی میں بول جاتی کہ ایک دن خطوط کے
ڈھیر میں وہ مانوس تحریر نظر آئی۔ خط پڑھنے کے بعد آخر میں لکھا تھا موت کا قیدی' کوٹھڑی نمبر 22۔ وہ
چونک اٹھی۔ پہلی دفعہ بھیگی آواز میں اس نے خط پڑھا۔ اناؤنسمنٹ کے دوران وہ بار بار اٹک جاتی رہی۔
ڈیوٹی افسر نے اس کے خلاف رپورٹ لکھی۔ پروڈیوسر نے جھاڑ پلائی۔ اور دوسرے دن وہ خط پھر آیا تھا۔
اس نے جلدی سے کھولا تو لکھا تھا۔ آواز کی دنیا میں رہتے ہوئے آپ اس اجل کا رکو نہیں بھولی ہوں گی۔
جو ماؤتھ آرگن سے نکلی تھی۔

تو وہ سوچنے لگی: یہ تم تھے جس نے دھوپ' سردی' گرم لو کے تھپیڑوں اور برفانی ہواؤں میں
سائے کی طرح میرا پیچھا کیا۔ بارشوں میں آندھیوں میں میرے انتظار میں آنکھوں کی جوت جگائے رکھی۔
پہلے پیچھا کر کے میری ضرورت بنے اور پھر لفظوں کے حصار میں میری روح کو جکڑ لیا۔ اب جب ایک بار پھر

میرے لیے اہم بن گئے تو موت کے قیدی بن کر   وہ یہی سوچتی یہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اناؤنسمنٹ
میں صرف اس نے یہ ایک یادوں کے کھنڈروں جیسا گیت ہی نشر کر سکی۔ جس میں بہت سے ان کہے ان
پوچھے سوال تھے۔

جواب میں اس نے لکھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے جس شخص کے قتل پر پھانسی کی سزا ملی ہے
اسے میں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ ہاں میں نے ایک قتل جوانی میں کیا تھا جب میں صبح سے شام تک آپ کا پیچھا
کرتا تھا۔ ان دنوں ... نے آپ کو اغوا کر کے آپ کو اپنے پاس ایک گیراج میں بند رکھنے
کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھے یہ اطلاع مل گئی اور میں نے اس کے سرغنہ کو قتل کر دیا۔ میں پولیس سے صاف بچ نکلا۔
ساری کارروائی ایسی ... تھی کہ پولیس نے مجھ پر شک تک نہ کیا۔ مجھے کسی کے لیے بھی نہ بلوایا گیا۔ اور
میں سوچنے لگا کہ اگر میں نے اپنی محبت کی عصمت بچانے کے لیے قتل کیا تھا۔ شاید اسی لیے بچ گیا ہوں

قدرت کی عدالت سے تو کوئی نہیں بچ سکتا۔ سو اس قتل کے الزام میں گرفتار ہوں۔ سپریم کورٹ نے
بھی سزا بحال رکھی ہے۔ اب میری اپیل صدر کے پاس ہے۔ شاید قبول ہو جائے شاید بچ جاؤں۔ پر آپ
سے صرف پہلی اور آخری درخواست ہے۔ آپ اپنے ریڈیو کی ٹیم لے کر یہاں آ جائیے۔ آپ اپنے سٹیج
پروگرام ہسپتالوں، درگاہوں میں جا کر سٹیج کرتے ہیں ایک پروگرام ہمارے لیے بھی کر دیجئے تو میں اور
میرے ساتھ سزا پانے والے مرتے لمحے بھی دعائیں دیں گے۔ جیل میں ہماری آخری تفریح یہ ریڈیو تو ہوتا
ہے میرے لیے یہ تفریح نہیں عبادت ہوتی ہے کہ میں آخری بار آپ کو دیکھ سکوں گا۔ آپ کی اناؤنسمنٹ کا
ایک ایک حرف میرے پاس کیسٹوں میں محفوظ ہے۔ اور شاید میرا آخری سرمایہ بھی یہی ہے۔ نجانے کیوں
دل صرف آخری بار آپ کو پروگرام کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ خط پڑھ کر وہ پروڈیوسر، پروگرام منیجر، اسٹیشن ڈائریکٹر، کنٹرولر ہوم ڈائریکٹر اور پروگرام
ڈائریکٹر جنرل سے ہوتی ہوئی انفارمیشن منسٹری کے ایک ایک افسر تک پہنچی اور آخر جیل میں پروگرام پیش
کرنے کی اجازت لے کر آ گئی۔ اس رات وہ بے حد خوش تھی۔ اس نے بہت خوبصورت اشعار لکھے تھے۔
موسیقی کے استاد سے باقاعدہ اشعار پڑھنے انہیں موسیقی سے سنوارنے کی تربیت لی تھی۔

جب گاڑی جیل کے سامنے پہنچی، تو پروڈیوسر، میوزک ڈائریکٹر، سازندے سب ہی کچھ ہراساں
اور پریشاں تھے کہ زندگی کا انوکھا پروگرام پیش کرنے جا رہے تھے۔ جیلر نے جب ہال میں پہنچایا تو قیدیوں
نے پورے جیل کو پھولوں سے گلشن کی طرح سجا رکھا تھا۔ سب قیدی اپنے چہروں پر انتظار اور معصومیت کے
دیپ جلائے بیٹھے تھے۔ وہ معصومیت جو انسان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے جو ہمیشہ اس کے پاس ہوتی
ہے لیکن کبھی حالات کی ستم ظریفی اور کبھی قسمت کی نامہربانی اس معصومیت کو نگل کر جرائم کا نوحہ ان چہروں پر

لکھ جاتی ہے پر آج یہ نوسے پردے میں جا سوئے تھے۔ دو چہرے معصومیت اور انتظار کی روشنی سے دیکھ رہے تھے۔ ناہیدہ نے اپنی زندگی کا حسین ترین پروگرام پیش کیا۔ اناؤنسمنٹ کرتے اشعار پڑھتے وہ صرف اس ایک چہرے کو درمیان میں رکھے تھی۔ گھنٹے کا پروگرام اتنی جلدی گذرا جیسے چند منٹوں کا ہو۔ ناہیدہ سوچنے لگی: ریڈیو پر اکثر ایک منٹ کو فل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کے فل گیپ کے لیے دل و دماغ ساتھ نہیں ہوتے پر آج تو وقت پر لگا کر اڑ گیا ہے۔

جیلر نے پوری ٹیم کو جب اپنے کمرے میں چائے کے لیے بلایا تو اس نے ڈرتے ڈرتے جیلر سے ندیم قیدی کال کوٹھڑی نمبر 22 کا پوچھا تو جیلر نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا اوہ وہ قیدی اسے تو آج صبح چار بجے پھانسی دی جا چکی ہے ناہیدہ اس سے آگے کچھ بھی نہ سن سکی۔

دولت خانہ

شوکت تھانوی

میں ابھی بستر کی چائے پی کر پان کھانے کے لیے بیگم کو پاندان کی طرف متوجہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور مجبوراً اسی حالت میں باہر آنا پڑا۔ باہر نکل کر دیکھا ریاض کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر لپٹتے ہوئے کہا۔

"ارے ریاض۔ کمال کر دیا تم نے۔ یعنی تم مرے نہیں۔"

بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے اور جب جالندھر کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہوا ہے تو اس حملے کے بعد جتنے ساتھی نظر نہ آئے ان سب کے متعلق یہ طے کر لیا تھا کہ شہید ہو چکے ہوں گے بلکہ لاہور پہنچ کر ریاض کی تو غائبانہ نماز جنازہ تک میں شریک ہو چکے تھے۔ مگر ریاض زندہ سلامت کھڑا ہوا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب یہیں کھڑے کھڑے محبت بگھارو گے یا گھر میں بھی لے چلو گے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "گھر؟ ہاں ٹھیک ہے یہ گھر ہی تو ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" اور دروازے کے اندر جھانک کر کہا۔ "میں نے کہا سنتی ہو ریاض آ گیا ہے ذرا پردہ کر لو۔ اندر ہی بلا ئیں۔"

ایک منٹ میں پردہ ہو گیا اور ریاض کو میں نے ڈرائینگ روم میں بلا لیا۔ ریاض نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف وحشت سے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا

"کیا مطلب یعنی بس۔ صرف ایک دروازے کی کوٹھڑی جس میں صرف ایک ہی ہوا آ سکتی ہے تم اس میں رہتے کس طرح ہو؟ اور یہ جو تم نے بھابھی سے پردہ کرنے کو کہا ہے وہ آخر گئیں کہاں اور کس دروازے سے گئیں مجھ کو تو صرف ایک دروازہ نظر آ رہا ہے جس سے میں داخل ہوا ہوں"

میں نے کہا۔ "ہاں دروازہ تو اتفاق سے ایک ہی ہے۔"

ریاض نے ایک اور دروازہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ ہوگا اندر جانے کا دروازہ"

اس کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے عرض کیا۔ "جی نہیں یہ الماری ہے۔ اور ... الماری کھول کر ریاض کو دکھا دی جس میں تین تختے لگے ہوئے تھے۔ ریاض ... قریب ہوتے ہوئے کہا "ارے بھائی تو بھابی کہاں سما گئیں۔"

اب میں نے اس معمے کے حل میں دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ میں ... حالات معلوم کرنے کے لیے بے صبر ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میاں مبارک باد دو مجھ کو مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے اور تم ... نہیں ہوئی جہاں تمہاری بھابی کو تم سے پردہ بھی نہ کرا سکتا۔ خوش نصیب ہوں ... ہے اس پروردگار کا جو خود لامکان ہے مگر مجھے مکان دے دیا۔"

ریاض نے جل کر کہا۔ "عجیب آدمی ہیں آپ یعنی آپ اسے مکان کہہ رہے ہیں۔"

نہایت اطمینان سے کہا۔ "ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے۔ ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود۔ سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں یہی میرا ڈرائنگ روم ہے یہی میرا بیڈ روم ہے۔ یہی میرا آفس ہے۔ یہی میری لائبریری ہے۔ یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانا پکانے کا کمرہ۔" اور پھر میں نے ذرا پکار کر کہا۔ "ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو ذرا پان بھیج دینا۔" اس پر ریاض نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا کہ یہ آواز سننے والی آخر کہاں ہو سکتی ہے۔ آخر اس نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا۔ "بھابی آخر ہیں کدھر؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "یہیں ہیں اور کہاں ہو تیں

عفو کیسا جلوۂ رحمت بھی نکلے گا یہیں

ذوقِ عصیاں چاہیے عرفانِ عصیاں چاہیے

ریاض کو غالباً یہ شعر قطعاً پسند نہ آیا۔ اس نے ذرا تلخی سے کہا۔ "یہ آخر معمہ کیا ہے بتاتے کیوں نہیں صاف صاف۔"

میں نے کہا۔ "بھائی میرے کہہ چکا ہوں تم سے بس یہی اتنی سی جگہ ہے اسی میں اپنی تمام ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ یہ الماری دیکھ رہے ہو اس کے تینوں تختوں پر تینوں بچے سوتے ہیں تمہارے ذرا اوپر والے خانے میں بڑا بچہ درمیانی تختے پر منجھلا نیچے چھوٹا جو ابھی حال ہی میں پیدا ہوا تھا۔"

ریاض نے حیرت سے کہا۔ "کہاں ہے یعنی اس الماری میں۔ ارے بھئی اس میں تو نالکیں بھی۔

چھپاتے ہوں [illegible] ''

میں نے کہا '' [illegible] پچھلا نا یا کسی رہنا سب عادت پر منحصر ہے ۔ اب ان [illegible] نہیں [illegible] کی عادت [illegible] تکلیف نہیں ہوتی ۔ صبح اٹھنے کے بعد دن بھر تکلیں چھپاتے [illegible] تو تم [illegible] چھپائے جاتے ہیں ۔ میں نے اس میں کی [illegible]

اماری [illegible] ''

[illegible] '' بچے نہ ہوئے اچار کا مرتبان ہو گئے ۔ شربت کی بوتلیں ہو گئے کہ اماری [illegible] اور بھابی اس وقت کس لماری میں ہیں ؟ ''

[illegible] اچھل کر کھڑا ہو گیا ۔ اس کے چہرے سے سخت وحشت برس رہی تھی ۔ وہ وحشت جو [illegible] پر برس رہی ہے ۔ ایمان کی بات یہ ہے [illegible] کی یہ حالت [illegible] پوچھا ۔ '' کیا ہوا ؟ ''

اس [illegible] انداز سے پلنگ کو گھورتے ہوئے کہا ۔ '' اچھا یہ تھا ۔ [illegible] مجھے ۔ '' [illegible] کہا ۔ '' لاحول ولا قوۃ ۔ وہ بیٹھی ہوں گی کہ میں ادھر بیٹھا ہوں ۔ '' اور پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر خاصدان لے لیا ۔ ریاض آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھتا رہا جیسے [illegible] سکتہ ہو گیا ہو جب میں نے خاصدان کھول کر پان اس کی طرف بڑھائے تو اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا

'' تو کیا بھابی پلنگ کے نیچے ہیں ؟ ''

میں نے کہا ۔ '' جب کوئی آ جاتا ہے وہ پلنگ کے نیچے ہی پردے میں چلی جاتی ہیں ۔ کافی [illegible] پلنگ ہے اور اس کے نیچے دری بچھی ہوئی ہے چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے اچھا خاصا [illegible] ہے

ریاض نے جست کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔ '' لاحول ولا قوۃ ۔ چلو باہر چلیں یہ کیا بیہودگی ہے کہ ان کے سر پر سوار بیٹھے ہیں ۔ ''

بیگم نے پلنگ کے نیچے سے فرمایا ۔ '' نہیں بھائی صاحب آپ تشریف رکھیے یہ تو خانہ [illegible] بے تکلف ہے یہاں ان باتوں کا خیال چھوڑ دینا پڑتا ہے ۔ ''

اور میں نے بھی ریاض کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا ۔ '' بھیا وہ عادی ہو چکی ہیں آخر یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے احباب آخر آتے ہی رہتے ہیں ۔ دوسرے وہ تو نہایت آرام سے بیٹھی ہوں گی اس پلنگ کے نیچے دری ہے چادر ہے ایک گاؤ تکیہ ہے پورے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں جب تک ہم لوگ بیٹھے رہیں گے وہ مزے سے چھالیہ کترتی رہیں گی ۔ ''

ریاض کی حیرت کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہنے لگا۔ ''صاحب عجیب مہمل زندگی ہے الماری میں بچے پلنگ کے نیچے بیوی ایک در کی قبر نما کوٹھڑی اور اسی میں ساری کائنات۔''

میں نے کہا۔ ''توبہ کرو ریاض توبہ کرو۔ یہ بڑا بول ہے میں تو بخدا اس کوٹھڑی پر ناز کرتا ہوں۔ اور میرے دوست میری قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے۔ وہ جو زندگی بھر گوشۂ عافیت ڈھونڈتے آئے تھے، اب پتہ چلا ہے کہ وہ دراصل یہی کوٹھڑی ہے۔ اب ذرا اس کوٹھڑی کا پروگرام سن لو کہ رات کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تینوں بچے احتیاط سے الماری میں رکھ دیے جاتے ہیں اور ہم دونوں میاں بیوی اسی پلنگ پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جس طرح جوتے کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ادھر پنجہ اُدھر۔ صبح اٹھ کر وہ دیکھو کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہے اس پر بیگم چائے بناتی ہیں اور بڑا بچہ الماری کے اوپر والے خانے سے نکل کر دودھ لے آتا ہے۔ پھر سب مل کر چائے پیتے ہیں اور بچے رات کا بچا ہوا کھا کر اسکول چلے جاتے ہیں صرف چھوٹا بچہ رہ جاتا ہے اس کے بعد بیگم برقع اوڑھ کر اور بچے کو گود میں لے کر شاپنگ کے لیے نکل جاتی ہیں اس لیے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ مجھے نہ دراصل گوشت کی پہچان ہے نہ میں ترکاری لا سکتا ہوں میں اس موقع کو غنیمت جان کر اس پلنگ کو کھڑا کر دیتا ہوں فرش سمیٹ لیتا ہوں اور سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی لا کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل شروع کر دیا۔''

ریاض نے ٹوکا۔ ''جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل؟''

میں نے کہا۔ ''صاحب غسل کا غسل صفائی کی صفائی یعنی اپنی بھی صفائی کوٹھڑی کی بھی صفائی۔ نہاتا جاتا ہوں اور جھاڑو دیتا جاتا ہوں۔ پھر یہ جو میز تم کو نظر آ رہی ہے نا۔ یہ بے نقاب ہو جاتی ہے اس کا سامان اٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہوں اور میز پوش ہٹاتا ہوں تو تلے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک نمودار ہو جاتے ہیں ان میں سے اوپر والے ٹرنک میں میرے دفتر جانے کے کپڑے ہیں۔ وہ پہن کر پھر ٹرنکوں پر میز پوش ڈال کر اس کو میز بنا دیتا ہوں اور اس کا سامان جوں کا توں اس پر سجا دیتا ہوں۔ فرش پھر کر دیا جاتا ہے۔ پلنگ پھر بچھ جاتا ہے اور میں سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی اور لا کر رکھ دیتا ہوں کہ دن میں بیگم کو تکلیف نہ ہو۔ اس عرصے میں بیگم واپس آ جاتی ہیں اور اپنی شاپنگ کے کمالات کا بڑے فخر سے اظہار فرماتی ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں گوشت پھر یہ کہ سارے شہر میں اتنا سستا شاید ہی کہیں ملے اور ٹماٹر تو دیکھو سیب نظر آ رہے ہیں۔ میں کچھ اخلاقاً اور کچھ انتظاماً داد دیتا ہوا ان سے رخصت ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ دفتر سے واپسی کا سودا میرے ذمے ہے یعنی صبح کے ناشتے کے لیے بسکٹ۔ ہاں۔ رات کے لیے کچا گوشت ترکاری وغیرہ اس سلسلے میں روز باتیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ گوشت آخر کس جانور کا اٹھا لائے ہو اور یہ جو ترکاری لائے ہو یہ اصلی ہے یا بناسپتی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر اگر آدمی ذرا مسکرا دے تو

عادی ہو جائے تو بات زیادہ نہیں بڑھتی ورنہ اتنی سی کوٹھڑی میں بات کا بڑھ جانا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی تو خیر برحق ہے بشرطیکہ باقاعدہ میدان جنگ میسر ہو۔ ایک کمرہ لڑنے کے لیے ہو۔ دوسرا بیوی کے پھول سوج کر لیٹنے کے لیے تیسرا شوہر کے اینٹھ کر پڑ رہنے کے لیے اور چوتھا سہمے ہوئے بچوں کے لیے پھر یہ کہ اس جنگ کے باوجود ملازم کم سے کم کھانا وغیرہ پکاتے رہیں۔ ظاہر ہے یہ تمام ارمان اس کوٹھڑی میں ہرگز پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا مجبوراً صلح صفائی سے کام رکھنا پڑتا ہے۔"

ریاض کو اب جو کچھ ہنسی آئی کہنے لگا۔ "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی ......"

میں نے کہا۔ "یہی کون کافر تم سے مسخرا پن کر رہا ہے۔ میں تو بخدا اظہار واقعہ کر رہا ہوں۔ مگر استاد عجیب عجیب فوائد ہیں اس کوٹھڑی کے۔ تم کو معلوم ہے لکھنؤ میں میرا گھر سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئے دن بھانت بھانت کے مہمان تو مستقل قیام کے لیے آتے رہتے تھے۔ پھر مقامی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کسی کے لیے چائے بن رہی ہے تو کسی نے کہا چائے نقصان کرتی ہے شربت منگاؤ۔ کوئی بے تکلف دوست ناشتہ مانگ بیٹھا دن بھر اور آدھی آدھی رات تک دربار گرم رہتا تھا۔ مگر جب سے یہ کوٹھڑی ملی ہے اول تو کوئی مہمان آیا ہی نہیں اور اگر آ بھی جائے تو اس کوٹھڑی میں رہنے کے بجائے غالباً یہی مناسب سمجھے گا کہ قیام کا انتظام کرنے کے لیے کسی کی جیب کاٹ کر جیل چلا جائے۔ مگر بہت سے مہمان ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھہرانے کے لیے خود جی چاہتا ہے کہ اور پھر کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔ مثلاً اب تم آ گئے ہو۔"

ریاض نے بات کاٹ کر کہا۔ "بندہ نواز میں تو دو مہینے سے یہاں ہوں اور صرف دو چیزیں تلاش کر رہا ہوں ایک اپنے لئے مکان دوسرے جناب کا دولت خانہ۔"

میں نے کہا۔ "شکر ہے کہ ایک چیز تو آپ کو مل گئی رہ گیا مکان اس کے متعلق اگر آپ فارسی جانتے ہوتے تو یہ مصرع پڑھتا کہ۔

ع   ایں خیال است و محال است و جنوں

"اور فی الحال آپ ہیں کہاں۔"

ریاض نے بیزاری سے کہا۔ "ہوتا کہاں ہوٹل میں ہوں۔ میرا کیا ہے اکیلی جان نہ بیوی نہ بچے۔ پھر بھی آخر ہوٹل میں زندگی بھر تو کوئی رہ نہیں سکتا جی چاہتا ہے کہ اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔"

میں نے کہا "خیر اپنا گھر تو خدا کے فضل سے پورا پاکستان ہے البتہ یہ ہوٹل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔"

ریاض نے کہا "بھیا اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہوں مجھے ایک مکان مل رہا تھا کرایہ زیادہ تھا اور مکانیت کم۔ تین کمرے تھے۔

میں نے حیرت سے کہا۔ ''یک نہ شد دو شد۔ اچھا تو پھر۔''

کہنے لگا۔ ''میں نے لینے سے انکار کر دیا زیادہ تر تلاش نے مکان کی تلاش میں ناکام رہ کر پھر جو گیا اسی مکان کو لینے تیسرے دن تو معلوم ہوا کہ اب اس میں تین خاندان آباد ہیں۔ اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔ پھر پتہ چلا کہ ایک اور مکان خالی ہے وہاں گیا تو صاحب خانہ نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا کہ شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہہ دیا نہیں۔ کہنے لگے کہ اگر میں اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کر دوں تو آپ اسے کہاں لے کر جا کر رکھئے گا۔ عرض کیا کہ گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہوں۔ وہ حضرت فرمانے لگے میں تو شادی اس لیے تو کرنا چاہتا ہوں کہ لڑکی جائے تو کچھ گنجائش پیدا ہو جائے۔ آپ اپنے لیے خود جگہ تلاش کیجئے۔ چپ چاپ پھرتے نظر آیئے۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی ریاض صاف بات یہ ہے کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر ایک مکان میری نظر میں خالی نظر آیا تھا۔ کچھ دن ہوئے دیکھو اس کی بات کرتا ہوں۔''

ریاض نے ٹوپی پیروں پر رکھنے کے انداز سے کہا ''میرے بھائی اگر وہ مل جائے تو میں بک جاؤں گا تمہارے ہاتھوں تم ابھی چلو میرے ساتھ۔''

لاکھ لاکھ کہا کہ یہ دفتر کا وقت ہے۔ مگر آخر دفتر کے ایک صاحب کو جا کر عرضی دینا پڑی، اور ریاض کے ساتھ اس موٹر گیراج کی تلاش میں نکل گئے مگر تو پہنچے وہاں ایک بزرگ والدین اپنے ایک درجن بچوں کو لئے گیراج کے باہر ہی نظر آئے۔ گیراج پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا جس کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا اور اندر کسی ہانڈی میں میتھی کا بگھار دیا جا رہا تھا۔

اب ریاض کو بھی مجھ پر رشک ہے اور میں شب و روز اس کے لیے مکان اور رشتہ دونوں چیزیں ڈھونڈ رہا ہوں کہ یا تو مکان مل جائے ورنہ کوئی اسے گھر داماد بنا لے۔ آج خبر آئی ہے کہ ایک رئیس کے گھوڑے کا انتقال ہو گیا ہے خدا کرے اصطبل ہی مل جائے اور یہ چھینکا ریاض ہی کی قسمت سے ٹوٹا ہو۔

تیسرا آدمی

شوکت صدیقی

دونوں ٹرک سنسان سڑک پر تیزی سے گزرتے رہے!

چتمبر پور روڈ مشرق کی طرف مڑتے ہی ایک دم سے نشیب میں چلی گئی ہے اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رات اب گہری ہو چکی ہے اور آغاز سرما کی ٹھٹھری ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دونوں ٹرک ڈھلوانوں پر کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا ہے۔ یکایک اندھیرے میں سے کسی نے چیخ کر کہا

"اے' کون جا رہا ہے ٹرک روک لو!"

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی' وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں تیزی سے گزرتے رہے۔ اس دفعہ ذرا دور سے آواز سنائی دی ____

"روکو' روک لو ٹرکوں کو!" اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ ابھرنے لگی۔ اس کی تیز روشنی کبھی کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر بہہ جاتی ہے۔ لیکن ٹرک رک نہیں سکتے' اس لئے کہ یہ خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل ویران ہے اور دونوں ڈرائیور بڑے اکسپرٹ ہیں۔

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جا رہی ہے' اور قریب!! اور اس کا شور ٹرکوں کے نزدیک ہی دھڑکنے لگا ہے۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے' اس لئے کہ ڈھلوان پر ٹرکوں کے بے قابو ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن نیلی آنکھوں والا وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ پھر ایک

بارگی کوہستانی ٹیلوں کی گہرائی میں ریوالور چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز سے گرجنے لگی اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا

"روک لو ٹرک کو نہیں تو میں ٹائر برسٹ کر دوں گا۔"

اور اس وارننگ کے ساتھ ہی دونوں ٹرک ٹھہر گئے۔ ٹرک کے اندر سے صرف وانچو اتر کر نیچے آیا۔ باہر بت جھڑ کی شوریدہ سر ہوائیں چل رہی تھیں اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے لمبے اوور کوٹ کے کالروں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجلاہٹ کے سے انداز میں سڑک پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا اور بڑے تیکھے لہجے میں پوچھنے لگا

"اس طرح ٹرکس کو رکوا لینے کا مطلب کیا چاہتے ہیں آپ؟"

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر وانچو کے اس انداز سے ذرا بھی متاثر نہ ہو بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا "میں اینٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں اور دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

وانچو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا اور ریوالور ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ وانچو نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر پوری طرح دہشت زدہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جھٹ سے کاروباری پینترا بدلا اور ذرا بے تکلفی سے کہنے لگا "اچھا تو آپ ہیں۔" اور پھر وہ مسکرا دیا۔ "گر آپ آفیشلی پوچھتے ہیں تو دیکھیے دونوں ٹرکوں پر آلو کے بورے لدے ہوئے ہیں۔ میں ثبوت میں ڈسٹرکٹ آکٹرائے آفس کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا یہ محصول ابھی پچھلے ہی ناکہ پر ادا کیا ہے اور جو کچھ اصلیت ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے اس لئے کہ آئرن شیٹ کو اس طرح لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں یہ سلسلہ تو ایک مدت سے چل رہا ہے۔"

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا ـــــ

"جی ہاں سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر تپسیا کر رہا تھا۔"

وانچو ہنسنے لگا "یہ تپسیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر مول لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ ٹیلیفون کیا۔ گر آپ دفتر میں مل جاتے تو آپ کو اس طرح کیوں پریشانی اٹھانا پڑتی اور خود مجھے بھی یہاں سردی میں آنا پڑتا۔ مگر چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا۔ اس بہانے آپ کے درشن تو ہو گئے!"

اور وہ تین سو روپے جو احمد پور کے اس ٹرپ میں وہ بچا لینا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب میں سے نکالا اور انسپکٹر کی طرف ان کو بڑھا کر کہنے لگا ـــــ

"آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجئے ان کو رکھ

لیجئے۔ فرمایئے اور کیا سیوا کی جائے!"

انٹی کرپشن کا انسپکٹر روکھے پن سے بولا۔

"اس مہربانی کا شکریہ! اب اتنی اور مہربانی کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے۔"

وانچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے رہے اور کوہستانی چٹانوں میں بہت تیز کی بپھری ہوئی ہوائیں چیختی رہیں۔ آگے کھڑے ہوئے ٹرکوں کے اندر سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں۔

وانچو سمجھ گیا کہ یہ آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور بھی دکشا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن کے اندر ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے ہیں۔ اس لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ ہسٹری شیٹر بن سکتا ہے اور کارہائے نمایاں انجام دینے والا سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہسٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے اور سرمایہ کاری کے لئے گورنمنٹ سے سازباز کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ وانچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی نوٹ نکالے اور آہستہ سے کہنے لگا

"انسپکٹر تیواری جب تک اس سرکل میں تعینات رہے ہماری انڈسٹری کی طرف سے ان کو اسی حساب سے ان کا حق برابر پہنچتا رہا۔" پھر خوشامد کے سے انداز میں وہ مسکرا کر بولا "لیکن آپ کو اس طرح جاڑے پالے میں آ کر پریشان ہونا پڑا ہے۔ اب اس پریشانی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔ لیجئے یہ دو سو اور ہیں۔ دیکھئے اب کچھ نہ کہئے گا اور اپنا یہ ریوالور تو آپ اب اندر رکھ لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

مگر بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اسی طرح ناراضگی کے سے انداز میں بولا ــــــ

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں ان دونوں ٹرکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت خراب کر رہے ہیں اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اور وہ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی تیکھی نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس کو خطرے کی نوعیت کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے کہ دونوں ٹرکس کسی طرح بھی پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا یہی ہدایت تھی اور اس ذمہ داری کے لئے کمپنی سے اس کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ مینجنگ ڈائریکٹر کی طرف سے چھ سو روپے اکسٹرا الاؤنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اپنی اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔ کمپنی اس کی کارگزاریوں کو سراہتی رہتی ہے اور بورڈ آف

ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں بہت سی باتوں کے لئے اس کو جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے اور ایسے ایسے بے تکے سوالوں سے اس کو سابقہ پڑتا کہ وہ بدحواس ہو جاتا۔ اس لئے وہ پانچ سو روپے سے زیادہ [illegible] کے لئے رشوت نہیں دے سکتا۔ ورنہ آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی اعتراض اٹھ گیا تو بہت مشکل ہے۔ [illegible] رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے اور بات بھی چھپانی ہے۔ دراصل ابھی تک فیکٹری کی تعمیر [illegible] اپنے پاس سے صرف روپیہ ہی لگا رہی ہے۔ شوگر پلانٹ کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ البتہ جن [illegible] کی کاشت ہوگی ان میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں [illegible] بھر کر قصباتی بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بھیج دیے جاتے ہیں۔ آلوؤں سے [illegible] اور آئرن شیٹس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر بلیک مارکیٹ میں جاتے ہیں۔ [illegible] کے لئے سیمنٹ اور آئرن کا بہت بڑا سرپلس کو ٹال گیا ہے جس کی [illegible] پر ہوتی ہے اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک تھے۔

وانچو غور کرنے کے سے انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں اور چہرے کے تیکھے نقوش مجسموں کی طرح ٹھوس نظر آ رہے ہیں۔ پھر ایک بار کی اس نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ انہیں وحشت ناک موقعوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے اس کے فیصلے کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں وہ کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے اور وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا ــــــ

"نیل کنٹھ! اے نیل کنٹھ مہاراج۔"

اور ٹرک کے اندر سے مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا ــــــ

"کیا ہے سکتری ساب؟"

پھر وہ اتر کر نیچے آ گیا اس کا آہنی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔

وانچو کہنے لگا "دیکھو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو مانتا ہی نہیں اور تم جانتے ہو کہ دونوں ٹرک تھانے پر بھی نہیں جا سکتے۔"

وہ سینہ تان کر بولا۔

"تو جو حکم ہو!"

گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر سازش کرنے کے سے انداز میں اس نے ایک آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا

"مجھ کو تو صرف لائن کلیئر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہیے۔" پھر مڑتے ہوئے اس نے کہا "میں جا کر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تم ٹرکوں کی پشت پر سے گھوم کر جانا۔ سمجھ گئے نا!"

اور میں احمقوں جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں وانچو وہاں سے سیدھا انٹی کرپشن کے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے بولا

"آپ نے ٹرکوں کو سٹارٹ نہیں کروایا، خواہ مخواہ دیر ہو رہی ہے۔"

وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا، "آپ تلاشی لیں گے یا ٹرک یوں ہی چلیں گے؟"

وہ کہنے لگا "بھئی ہم کو اب کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے۔ یوں جیسے آپ کی مرضی!"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرا دیا "انسپکٹر صاحب مرضی ہماری کہاں، مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آپ کی نا، تسلی ہی نہیں ہوتی۔"

وہ بےزاری سے بولا "دیکھیے ان بےکار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو تو آپ تھانے پر چل کر ہی کہیے گا۔"

وانچو سنجیدہ ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آئرن شیٹس اور سیمنٹ کا پرمٹ کو بنا لے سکتے ہیں اور جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں، وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ چور چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا رستہ بھی پہلے دیکھ لیتا ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس لئے کہ "یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ" کے دو ڈائریکٹر ایم۔ ایل۔ اے ہیں اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے اور زور بھی ہے۔ لیکن بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ان رازہائے سربستہ کو نہیں جانتا۔ اس سرکل میں ابھی اس کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقے میں وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے اور اس کے لئے ایک آدھ بڑا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی اور پولیس کی تکنیک کے مطابق ایک بار جہاں ہوا بندھ گئی پھر تو لکشمی آ کر خود قدم چومتی ہے اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آ سکتا۔ وانچو کی باتوں پر جھنجھلا کر اس نے جواب دیا ___

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ چل کر ذرا حوالات میں ٹھہریے۔ پھر دیکھیں گے کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔"

اس دفعہ وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا

"انسپکٹر صاحب مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانہ تک جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی طے کر سکتا ہوں۔ آپ کے ایسے انٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے یہاں اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ مگر ان میں سے آپ کو کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔"

انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آ گئی۔ وہ اس کو بڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیل کنٹھ نے اس کے سر پر "آہنی راڈ" زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے پھٹی ہوئی بھیانک آواز نکالی اور لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس کی مٹھیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے بوجھل جوتے سے روند دیا اور ریوالور چھین کر ٹیلوں کی طرف پھینک دیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا ———

"دھت تیرے کی' سالا کسی طرح مرتا ہی نہ تھا۔" اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا "بہادر' ڈال دو سالے کو ادھر کنارے کی طرف۔" اور پھر اطمینان سے ایک سگریٹ سلگا کر پوچھنے لگا "ہاں یہ دیکھ لو کہ زخم گہرا تو نہیں' ورنہ بلاوجہ بات اور بڑھ جائے گی۔"

نیل کنٹھ کہنے لگا "ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پر بے سدھ پڑے ہوئے بھاری بھرکم جسم والے انسپکٹر کو اٹھایا اور اس کو گھسیٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا کرخت چہرا خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا اور سانس بھی ہولی سی چل رہی تھی۔ وہ اسی طرح جھکے ہوئے کوہستانی ٹیلوں کے دامن میں کسی لاش کی طرح بے جان پڑا رہا اور آغازِ سرما کی تیکھی ہوائیں پتھریلی چٹانوں میں ہانپتی رہیں اور یک بارگی کہیں نزدیک ہی گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ سنسان رات میں اُبھرنے لگی اور وہ موٹر سائیکل کو بُری طرح روندتے ہوئے سڑک پر پھر چلنے لگے۔ لیکن احمد پور جانے کے بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے اور کوئی سترہ میل کا چکر کاٹنے کے بعد دونوں ٹرک پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا:

بلیپر گھاٹ اکیاون میل

بھنواں کلاں' اٹھارہ میل

شیام باڑہ' چوراسی میل

احمد پور ایک سو باون میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ آکٹرائے چُنگی آفس تھا۔ جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھولے ہوئے کھانس رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں پر دونوں ٹرکوں کی چونگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔ وانچو ٹرک پر سے اُترا اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا اور سرگوشی کے لہجہ میں آہستہ سے بولا ———

"منشی جی میرے خیال میں آپ کے رجسٹروں میں ٹائم تو درج نہ ہوتا ہوگا" اور پھر جواب کا انتظار

کئے بغیر اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تیس روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "لیجئے ان کو رکھ لیجئے اگر کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرک کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نہ آپ۔"

اور بوڑھے محرر نے اپنی گردن ہلا دی 'ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں؟"

وانچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا

"جب تک ہم موجود ہیں اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آ سکتی ہے۔"

وہ ہنس پڑا "سو تو ہے پر بات اتنی ہے سرکار کہ اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سرے بازار کھال کاٹ لیتے ہیں۔"

اور پھر بوڑھے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہوئے۔ جمبیر روڈ اندھیرے میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس پر جانے کی بجائے راہیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت دیکھا' اب ڈیڑھ بج رہا تھا' اور پھر دو بجنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک بیر گڑھ پولیس سٹیشن کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ وانچو تھانہ کے اندر چلا گیا اور ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپے دے کر اس نے ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں درج کر دیا گیا۔

"ٹرک نمبر ۳۱۳۶' نو بجے شب کو راہیل روڈ پر سے گزرتے ہوئے
بغیر ہیڈ لائٹس کے پایا گیا تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ' اس کی بیٹری خراب
تھی۔ ٹرک مذکور یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے اور اس میں آٹو کے
بورے لدے تھے۔"

اور اسی طرح کھیم پور کے تھانہ پر مزید ڈیڑھ سو روپے رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا گیا' اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری روزنامچہ میں اندراج کرنے لگا :۔

"پونے دس بجے شب کو ٹرک نمبر ۶۲۲۸ راہیل روڈ پر اتنی تیز رفتار
سے گزر رہا تھا کہ کسی حادثہ کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈیوٹی انسپکٹر ہرنام سنگھ
نے اس کو روک کر تحقیقات کی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈرائیور مسمی نذر محمد کے پاس
ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔"

اس کے بعد دونوں ٹرک پھر راہیل روڈ پر تیزی سے گزرنے لگے اور صبح کاذب کی گہری دھند میں دونوں ٹرک بلبیر گھاٹ پہنچ گئے۔ پھر چھ بجے سے پیشتر ہی وانچو بھارت انجینئرنگ ورکس کی نئی اسٹوڈی بیکر پر واپس لوٹ پڑا اور ابھی دھوپ اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

وانچو اپنے دفتر میں جا کر حسبِ معمول کمپنی کے کاموں میں الجھ گیا اور رات کے حادثہ کی اہمیت سمجھ کے روز ہونے والے اس ایکسیڈنٹ سے زیادہ نہ رہی جس میں ریلوے کی ایک ویگن فیکٹری کے یارڈ کے اندر ڈی ریل ہو گئی تھی اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار روپے کا کلیم کیا تھا اور عدالتی کارروائیوں کے لئے ہیرندر پرشاد ایڈووکیٹ کمپنی کے مشیر قانونی موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ تفتیش برابر ہوتی رہی اور اس مریض کا بھاری بھرکم منتظم والا آدمی ہسپتال میں پڑا کراہتا رہا اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ جسے چوکیدار کی حیثیت سے نامیوں بات ور اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا رات گئے تک اونچی آواز میں الاپتا گاتا رہا۔

"اور اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو؟"

"پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"

"لیکن دیپ چند تمہیں معلوم ہے کہ میں کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں!"

کمرے کے اندر اسی طرح تیز لہجے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آتشدان میں کوئلے شعلے دے رہے تھے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں وانچو کا گنجا سر چمکنے لگا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بھدا سا پائپ پیتا رہا۔ دریچے سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے اندر آ رہے تھے اور فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے اور اس دھند میں لپٹی ہوئی مینجنگ ڈائریکٹر کی خوبصورت کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، جس کے باہر ہی برآمدے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ لگائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ برآمدے میں بالکل اندھیرا تھا اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا سیاہ آبنوسی جسم آسیب زدہ سایہ کی طرح ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

نیل کنٹھ اسی طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب کبھی دیپ چند تیزی سے بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف گھبرا کر دیکھتا جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔ لیکن دیپ چند اندر بیٹھا ہوا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے "شیڈ" کی پرچھائیں پڑ رہی ہے اور اس دھندلی روشنی میں اس کا منحنی جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر دیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔ کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا وانچو بھی جانتا ہے اور اس کی اہمیت مینجنگ ڈائریکٹر کو بھی معلوم ہے، جس کو فیکٹری کے اندر سب لوگ کنور صاحب کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار ہے۔ وہ کاروباری تکنیک سے زیادہ گھوڑوں کی نسلوں اور عورتوں کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے زندگی بھر ریس میں گھوڑے دوڑائے ہیں اور عورت کے جسم پر کسی کیمیاگر کی طرح کوک شاستری تجربے کئے ہیں، اور جب سے جاگیرداری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں اس نے بھی اپنے سرمائے کو محفوظ

کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا اور اس دور اندیشی نے اس کو کنور شیوراج سنگھ سے ایکدم ہی یونائیٹڈ انڈسٹریز کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے۔ لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے بڑی بے نیازی سے کہہ دیا۔

"اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں۔"

مینجنگ ڈائریکٹر یہ سن کر برافروختہ ہو کر بولا___

"ٹھیک ہے۔ سارے رجسٹر تمہاری نگرانی میں رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے تمہارا مطلب"

وہ تو آپ جانتے ہی ہیں [illegible] انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کنور صاحب آپ میرے ساتھ حق تلفی کریں گے تو میں بھی [illegible] سارے [illegible] ڈائریکٹروں کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں۔"

مینجنگ ڈائریکٹر کے سانس کی رفتار یک دم سے تیز ہو گئی اور وہ منحنی جسم والے دیپ چند کو عقابی نظروں سے گھورنے لگا لیکن دیپ چند بیٹھا ہوا مزے سے اپنی چٹکی کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مینجنگ ڈائریکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔

دیپ چند اس کی سازش کے کتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔
بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن داموں میں چور بازار میں فروخت ہوتا ہے کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے اور اس طرح اب تک مینجنگ ڈائریکٹر نے پوشیدہ طور پر کوئی دو لاکھ روپیہ جمع کر لیا ہے۔ لیکن دیپ چند کو اپنے اعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فیصد کا شرکت دار بنا لیا تھا اور اس بیس ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے اس کی نیت بدل گئی اور دیپ چند کے اکثر تقاضہ کرنے پر بھی وہ برابر ٹالتا رہا۔ لیکن دیپ چند یہ طے کر کے آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر کے جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی بڑی لڑکی کی شادی بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی ہے۔ گھرانا اچھا ہے اس کے لئے کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے کائستھوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ تلک میں دینا ہے۔ ورنہ یہ سگائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مینجنگ ڈائریکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے سفارش کر کے اس کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہانہ سے ساڑھے تین سو کروا دے۔ مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں ہے۔ اسے بیس ہزار روپیہ چاہئے___ اس لئے کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلدی کر دینا چاہتا ہے۔

مینجنگ ڈائریکٹر کا چہرہ جھنجھلاہٹ کے اثر سے برابر غضبناک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یک بارگی وہ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سے صرف رانی بازار کے علاقہ کا کنور شیوراج سنگھ رہ گیا۔ اس نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا۔

"تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ۔" اور پھر وہ چیخ کر زور سے بولا "جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

اور منحنی جسم والا ناٹک کا مسخرہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے سے باہر چلا

گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے ہیں اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پھر وانچو نے اپنا پائپ میز پر رکھ دیا اور مینجنگ ڈائریکٹر سے کہنے لگا ___

"کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے علیحدہ کر دو۔"

وانچو گھبرا کر بولا

لیکن اس طرح سے کام تو نہیں چلے گا۔ بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے ہم کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں۔"

کنور شیوراج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا ___

"اچھا تو اب کچھ تم ہی کرو۔"

وانچو کہنے لگا "آپ ذرا اندر کوٹھی میں تشریف لے جائیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آ سکتا ہے۔"

کنور شیوراج سنگھ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا اور اس سے کہنے لگا ___

"نیل کنٹھ مہاراج" دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ' کہنا کہ سیکرٹری صاحب نے بلایا ہے۔" اور نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہمراہ دیپ چند بھی تھا۔ نیل کنٹھ پھر جا کر برآمدے میں ٹھہر گیا اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا

"اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں بوڑھے ہونے لگے مگر مزاج پہچاننا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے۔"

لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا "ترپ" ٹھیک پڑا ہے' اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا ___

مگر سیکرٹری صاحب یہ تو دیکھئے کہ کنور صاحب تو میرا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائے کہ میں کرتا بھی کیا؟"

وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا ___

"کمال کر دیا آپ نے اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے

میں آ کر پھنسے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے۔ دیکھئے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے۔"

اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا

"اب کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب مجھے بھی اس وقت نا معلوم کیا سوجھی کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا۔ دراصل میں اپنی لڑکی کی سگائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں پرانا ذیابیطس کا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے۔ اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں بس اب تو یہی لگن ہے۔"

وانچو ہمدردی کرنے لگا

"جی ہاں لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہی ہے۔ لیکن بات کے اسی پہلو پر آپ نے زور دیا ہوتا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ ریس بازی پر تباہ کر دیا ہے۔ کیا اس کنیادان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے۔"

"اچھا تو آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

وانچو کہنے لگا "کیجئے گا کیا! کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو اپنا روپیہ ملے گا۔"

منحنی جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر یک بارگی زندگی کی رمق ہویدا ہو گئی۔ وہ مسکرا کر بولا

"تو پھر اس کام کو اب کرا ہی دیجئے سیکرٹری صاحب! آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا۔"

وانچو جلدی سے بولا ___

"آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔" پھر اس نے میز کی دراز سے کنجی نکالی اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا "لیجئے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال لیجئے۔ میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کئے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس پہنچنے سے پہلے ہی میں ان سے دستخط کروا کے آپ کو چیک دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔"

اور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہو گیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی اور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے سبزی مائل چھوٹے سے بلب کو دیکھا جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔ آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا اور وانچو گردن موڑے ہوئے مجرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا اسی وقت وانچو نے دیوار

میں لگے ہوئے سوئچ کو دبایا۔ دیپ چند ایکا ایکی بڑی بے چینی سے تڑپا [illegible]
آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کے اندر [illegible]
گہری سرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ سامنے والی [illegible] دیپ چند [illegible]
اندر سے بلیوں کے غرانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں اور باہر [illegible]
جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف بار بار [illegible]
وانچو بڑا پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور [illegible]
پھر وہ خواب میں بھٹکنے والے سایوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا [illegible] اور
ذرا دیر تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف [illegible] ہینڈل
سے الجھا ہوا تھا اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ [illegible]
معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وانچو خونخوار نگاہوں سے کھڑا ہوا [illegible] نیل کنٹھ کو
آواز دی اور نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا

"کیا حکم ہے سیکرٹری صاب؟"

وانچو کہنے لگا "جاؤ ذرا [illegible] میں لگے ہوئے مین سوئچ کو آن کر دو اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا۔"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر آہنی سیف پر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب جھپ سے بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی اور اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل پر سے چھوٹ گیا اور اس کا بے جان جسم فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نیل کنٹھ اندر آ گیا۔ وانچو اس سے کہنے لگا ___

"اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں۔" اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا؟ پھر اس نے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لاد لیا اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوئچ کو احتیاط سے دبا کر آف کر دیا اور پھر اپنی کوٹ کی جیب میں سے ٹارچ نکال کر اس کو روشن کیا۔ اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا اور اس کی پشت پر لگے ہوئے [illegible] کو علیحدہ کر دیا اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لیڈ شیٹ چڑھا کر دونوں اسکرو اچھی طرح کس دیئے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا اور جب وہ اس کے دروازے کو بند کرنے لگا تو یکبارگی اس کو دیپ چند کی بھی

ہوئی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا اور آتشدان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کی جلتی ہوئی چتا کی طرح چٹخنے لگے۔ واچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی اور بدحواس سا ہو کے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے مین سوئچ آن کر دیا اور ایک دم سے دریچوں پر روشنی کی ہلکی ہلکی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازہ بند کر دیا اور تیزی سے زینے کی سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا برلان میں چلا گیا جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چپکے سے کوٹھی سے اندر نکل کر اندھیرے سے آ ملا اور دونوں گہری دھند میں کھوئے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستے پر دور تک سنائی دیتی رہی ___!!

راستے سے جب نیل کنٹھ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے ٹھٹھرا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ بیپ چند اکاؤنٹنٹ کا لڑکا منا تھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا۔

"پربھو بابا اے پربھو بابا!" اور پھر پربھو بابا اندر سے کھانستا ہوا باہر نکلا اور اس کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا

"ارے تم اس سمے کہاں نکل پڑے ہائے رام کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے۔"

سردی سے سکڑا ہوا منا کہنے لگا___

"بابو جی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں۔ سو انہوں نے مجھ کو پوچھنے کے لئے بھیجا ہے اور کرشنا دیوی تو رات کو نکلتی ہی نہیں۔"

بوڑھا چوکیدار کہنے لگا کہ "وہ کنور صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر ان سے کہہ دوں گا۔ چلو پہلے تم کو کوارٹر تک چھوڑ آؤں۔" اور وہ لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر چل دیا۔ نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر یک بارگی اس نے سنا کہ منا ٹھہر کر کہنے لگا تھا___

"پربھو دادا تم جا کر بابو جی کو لے آؤ۔ میں کوارٹر چلا جاؤں گا۔ تم جلدی سے آ جانا۔ وہ ننھی بلو ہے نا بابو جی کے بنا اس کو نیند نہیں آتی۔ خوب زور زور سے روتی ہے۔"

اور جیسے نیل کنٹھ کے کان کے پاس کوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا "جاؤ منا اب تمہارے بابو جی کبھی نہیں آئیں گے اور ننھی بلو روتے روتے ان کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے اندر چپ چاپ پڑے ہیں نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کی کچھ سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی۔"

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی

طرح کھسنے لگا ہے اور اس کے چاروں طرف جیسے دبی دبی سسکیاں دھڑک رہی ہیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا اور اس کو کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اس شور سے وہ اچانک چونک پڑا اور اس کو یاد آ گیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر وہ کوارٹر کی پشت پر جا کر آنگن کی پچھلی دیوار کو پھاند کر وہ اندر آ گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی چہار دیواری کی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہرے داروں کی سیٹیاں بہت دیر تک چیختی رہیں اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا وہ بڑی رات تک نہ جانے کیا کیا الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہو گئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی ہے۔ اس نے الیکٹرک جنریٹر کے تار کو غلطی سے چھو لیا تھا اور اس حادثہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے یارڈ میں یہ بھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خودکشی کر لی ہے اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی۔ اور کنور شیوراج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے بے سہارا خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔

فیکٹری کی تعمیر ایکا ایکی سست پڑتی جا رہی ہے ___!

پھاگن کی مہکتی ہوئی ہوائیں چلنے لگی ہیں اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگی ہیں اور کھیتوں میں جیسے بسنتی آنچل لہراتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانجیں بجا کرتی ہیں اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے ہیں۔ پھر گاؤں کے اندر بڑے بڑے الاؤ دہکنے لگیں گے اور عبیر و گلال اڑنے لگے گا۔ پھاگن کی ہوائیں چیختی پھر رہی ہیں کہ ہولی آ رہی ہے۔ ہولی آ رہی ہے پھر گیہوں کی لہلاتی ہوئی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی اور دور کے شہروں میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں جھیلوں پر اکٹھے ہونے والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے قلی دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی ہے۔ اس بات سے قلیوں کے روکھے چہرے پر ہر وقت جھنجھلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ شام کیمپ آفس میں اکٹھے ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں ____

"یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آ رہا ہے۔ ہم کو پیسہ چاہئے ہے۔"

"ہاں' ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔ ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔"

لیکن مزدوری اتنی نہیں مل سکتی' اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے کہ شوگر کا پلانٹ جلد ہی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ مگر مزدور لوگ اس کے باوجود بھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے ـــــ

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

ان تین ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بلکہ ہولی کا لاؤڈ بجتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام پر سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینجنگ ڈائریکٹر کے آفس میں جاتا اور سہمی ہوئی سی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینجنگ ڈائریکٹر جھنجھلا کر مزدوروں کے ساتھ سمجھتے ہوئے ٹائم کیپر کو بھی گالیاں دینے لگتا۔ پھر ایک روز اس نے وانچو کو اپنے دفتر میں بلایا اور پریشانی کے عالم میں اس کو کہنے لگا ـــــ

"مسٹر وانچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا؟"

مگر وانچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا ـــــ

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کنور صاحب' بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ بھی سن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انہیں فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی اور یہ زمینداری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا ـــــ

"تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو۔"

وانچو ذرا دیر تک مینجنگ ڈائریکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہو گا۔"

میننجنگ ڈائریکٹر جلدی جلدی کہنے لگا

"ذرا اپنے کو بچا کر کام کرنا، اور روپیہ کی تم فکر نہ کرو۔ میں ڈائریکٹروں سے نپٹ لوں گا اور یوں بھی کچھ کم خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر آئندہ سیزن تک فیکٹری اسٹارٹ نہ ہوئی تو سمجھ لو یہ کمپنی [illegible]۔"

وانچو پوچھنے لگا "آپ کے خیال میں یہ بنگالی کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

وہ گردن ہلا کر بولا:

"میں سمجھتا ہوں کہ آدمی تو وہ کام کا ہے۔ انارکسٹ پارٹی میں کئی سال تک رہ چکا ہے۔ انہی دنوں پولیس نے ایک بار گرفتار کر لیا تھا۔ بہت بری طرح اس کو ٹارچر کیا مگر اس نے ذرا بھی زبان نہیں کھولی۔ تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو۔"

پھر وانچو نے چپراسی کو آواز دی اور اس کو سانیال کے بلانے کے لئے بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد بھدے چہرے والا کیمسٹ دفتر کے اندر آ گیا۔ وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر پوچھنے لگا

"مسٹر سانیال۔ نومبر کے مہینے میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں آپ نے گورنمنٹ لیبارٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں کوئی آپ کا جاننے والا تو نہیں ہے؟"

بھدے چہرے والا سانیال ذرا دیر تک غور کرنے کے بعد بولا ___

"جی ہاں، میری وائف کے ایک رشتہ دار اس میں کام کر رہے ہیں۔ جن کے فلیٹ میں میں دو روز تک ٹھہرا بھی تھا۔"

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ یک بارگی جیسے دمک اٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا "پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھئے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچ جائیے۔ آپ کو گورنمنٹ لیبارٹری کے ذریعے ایک بڑا اہم کام کرنا ہے۔"

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دے دیا۔ پھر شام کے وقت میننجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر سانیال وانچو کے ساتھ بند کمرے کے اندر دیر تک رازدارانہ باتیں کرتا رہا اور پروگرام کے مطابق شب کی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گیا۔

پانچویں دن فیکٹری میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلیگرام آیا، لکھا تھا

"ہارڈ ویئر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سنڈر ابھی تک نہیں ملا۔"

وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا اس "کوڈ مینوز" پر غور کرتا رہا۔

پھر کئی روز اور گزر گئے کوئی اطلاع نہ آئی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک روز فیکٹری کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔

وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا

"کیا گھبرا رہے ہو؟"

"[illegible]"

وانچو مسکرانے لگا۔ "تو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

سانیال دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا ———

"مجھے اس شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

وانچو لمحہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا

"اچھا آپ جا کر ذرا نہا دھو کر آرام کیجئے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دفتر سے باہر چلا گیا اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھدے چہرے والا کیمسٹ فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔

وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا اس کو دیکھتا رہا اور جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر اپنی میز پر آ گیا اور ٹیلیفون اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کو رنگ کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی اور گہرے سناٹے میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی۔ جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ فیکٹری کے احاطے سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک ہے اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی کے ساتھ گزرتی رہی مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آ گئی تو جیپ کو جھٹکے لگنے لگے اور وہ کھڑکھڑانے لگی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بڑا پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ باہر پھاگن کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ پھاگن کی ہوائیں جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہیں اور ہولی جو اب ختم ہو چکی ہے۔ اب تو گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور ہنسیا کی تیز باڑھ سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ جانے اشیر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے جس کی کتائی کا چوپال پر بڑا چرچا رہا کرتا تھا اور ایکا

ایک بانسری کی لے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا ـــ

"میں ایک کسان ہوں' ہاں میں کسان ہوں۔"

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا "نہیں تو مجرم ہے تو مجرم ہے۔ پولیس تیرے وارنٹ لئے تیری تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور جیپ پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھا رہی تھی اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر یک بارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔ نیل کنٹھ کا سینہ جیسے پیٹ سے ہٹ گیا۔ لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی آہستہ آہستہ گنجان درختوں کے نیچے چھ دور تک چلتی رہی اور پھر گہرے اندھیرے میں جا کر ٹھہر گئی اور دونوں اتر کر نیچے آ گئے۔

وانچو نے آگے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنامیٹ سے بھری پیٹی کو باہر نکالا۔ یہ ڈائنامیٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جس کو گورنمنٹ لیبارٹری سے سمگل کیا گیا تھا اور جس پر کمپنی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پھر نیل کنٹھ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور درختوں سے الجھتی ہوئی کوہستانی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اندھیرا بہت گہرا تھا اور پتھریلی چٹانوں میں بہنے والی کوئیلا ندی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں اسی طرح کئی فرلانگ تک چلتے رہے۔ پھر ایک جھکے ہوئے ٹیلے پر سے گزر کر جب وہ نشیب میں پہنچے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا دریا کا شور بڑا ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس وادی میں کوئیلا ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ دونوں طرف سربلند کوہسار ہیں اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اس مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کروایا ہے۔ اس باندھ کے پاس پانی گرجتا ہوا اونچائی پر سے گرتا ہے اور قریب ہی پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے۔ جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے رہتے ہیں۔

وانچو کی ہدایات کے مطابق نیل کنٹھ ڈائنامیٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے لگا اور وانچو اس کے وائر کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی چٹانوں کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی تیکھی نظریں سامنے پتھروں پر جاتے ہوئے نیل کنٹھ کا پیچھا کرتی رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر، چانک وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا اور دریائے کوئیلا کا تیز دھارا ڈیم کے نیچے گرجتا رہا اور مہیب شور میں ہواؤں کی سائیں سائیں جیسے سو گئی تھیں اور سربلند کوہسار خوابوں میں ڈھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایکا ایکی ڈیم کے دیے کی دھندلی روشنی میں ایک انسانی سایہ لہرایا اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے پہرے دار نے چیخ کر کہا ـــ

"ہالٹ!"

"کون ہے؟ ٹھہر جاؤ۔"

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دھڑکنے لگی۔ لیکن نیل کنٹھ آہنی گارڈ سے چپٹا ہوا ڈائنامیٹ کو فٹ کرتا رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے پاس سے گزر گئی۔ وانچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں گونجنے لگی اور اس کی دھڑکن کوہساروں کی پہنائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ وانچو کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ پھر ایک دم سے ڈائنامیٹ کا وائر زور سے ہلنے لگا جیسے اب اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔ مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کوئی منٹ اس کے انتظار میں گزر گیا۔

پھر کئی منٹ بڑی بے چینی کے عالم میں گزر گئے۔"

وانچو نے بیحد بیزاری سے جھنجلا کر سوچا کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر کرنا بہت خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ طے نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ وہیں مر گیا اور بعد میں اس کی لاش شناخت کر لی گئی تب تو بہت خطرہ پیدا ہو جائے گا اور یہ سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں سے گزرتا رہا اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر رات کی مدھم روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ وہ پتھروں پر جھکا ہوا آہستہ آہستہ آ رہا تھا جب وہ بالکل قریب آ گیا تو وانچو نے آہستہ سے صرف اس قدر پوچھا "سب ٹھیک ہے؟" اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ وانچو نے مزید تاخیر کئے بغیر یک بارگی ڈائنامیٹ کو "آن" کر دیا اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سربلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم چیتھڑوں کی طرح بکھر کر رہ گیا اور دریائے کوکیلا کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا وانچو نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر درختوں کے گہرے اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کے کندھے پر سے برابر خون بہہ رہا تھا جو گولی سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچے تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا بے جان ہو کر پچھلی سیٹ پر گر پڑا اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ راستہ بھر وہ کراہتا رہا اور اس کے زخم سے خون بہتا رہا۔ جیپ ہچکولے کھاتی تیزی سے گزرتی رہی اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا تھا اور اسی لئے کوارٹر پر بھیجنے کی بجائے اسے مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر ٹھہرا دیا گیا۔

دریائے کوکیلا پر بنے ہوئے ڈیم کے اس طرح تباہ ہو جانے پر ترائی کے علاقے میں بڑی سنسنی پھیل گئی ہے اور سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس باندھ کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کئی کروڑ روپیہ

خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے تمام سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے فیکٹری کے "گیسٹ ہاؤس" میں مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر پولیس بری طرح "ٹارچر" کر رہی ہے اور انھیں وثوق ہے [illegible] ڈپٹی کمشنر کا [illegible] فیکٹری میں آ گیا۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائریکٹر ہے۔ رات کو مینجنگ ڈائریکٹر [illegible] اس کے پاس پہنچا تو ایک دم سے اس پر برس پڑا۔

"کنور صاحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ [illegible] یہ فیکٹری اب برباد ہونے والی ہے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے [illegible] وہ اور بھی بدحواس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میں [illegible] عاجز آ گیا ہوں۔"

مگر وہ کہتا ہی رہا "اب تو آپ ایسے کہیں گے ہی۔ مگر آپ کو تم سے تم یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ گورنمنٹ کا اینٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں کہ اتنی بڑی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہوم سیکرٹری نے پرسوں جو رپورٹ بھیجی ہے اس میں فیکٹری پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے' اس لئے کہ ادھر جو لیبر کی بالکل کمی پڑ گئی تھی اور جس طرح یہ مشکل خود بخود ختم ہو گئی ہے اس بات پر کون نہیں شبہ کر سکتا ہے۔ دراصل ہوا بھی ایسا ہی ہے' [illegible] کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گرد و نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کمپنی کا لیبر آفیسر ہر روز سویرے صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے اور وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر کھریا سے سفید نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس فیکٹری میں کام مل گیا ہے اور جو وہ آئے روز مزدوری لے گی۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھاٹک سے باہر کھڑے ہوئے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سہمے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔"''

مینجنگ ڈائریکٹر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ بڑے شکست خوردہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وانچو تو مجھے بھی کہتا رہا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھ کر جیسے وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا اور اس کی بات کا اثر بھی ٹھیک ہی ہوا۔ یوں بھی کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ وہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار بھی تھا۔ اس لئے نرائن دیو ایک دم سے وانچو پر بگڑنے لگا۔۔۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وانچو مجھ کو بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کی سازشوں کو نہیں سمجھ

سکتے۔ دیکھئے اب یہی بہتر طریقہ ہے کہ وانچو کو اس اشوع پر فیکٹری سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہر وقت خطرہ سامنے ہے۔

آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔

تھوڑی دیر ڈائریکٹر گہری خاموشی میں کھو گیا اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا تھا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔ وہ اس کے ہر خطرناک راز کو جانتا ہے۔ اس طرح نوکری سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا بڑا خوف تھا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا___

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بات پر اگر وہ کمپنی کا مخالف ہو گیا تو سرکاری گواہ بن کر بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی اور طریقہ سے اس کو یہاں سے فی الحال ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔" اور یہ بات نرائن داس کی سمجھ میں بھی آ گئی اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دیر تک کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

اور جب نرائن داس کمرے سے باہر چلا گیا تو کنور صاحب نے وانچو کو بلوا لیا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو چلا جائے۔ سرحد کو پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ اس لئے کہ راجہ دلیر جنگ جو ریاست کے ایک اہم رکن تھے وہ کنور صاحب کی شکارگاہوں میں اکثر شکار کھیل چکے تھے اور دونوں کے آپس میں اچھے مراسم تھے اور جب تک وہ کھٹمنڈو میں رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ مینجنگ ڈائریکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔ پھر ایک روز فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کلکتہ جا رہا ہے اور وانچو کار میں خاموش بیٹھا ہوا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا' جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں اور وہ فیکٹری اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بڑی پراسرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری ڈیم کے تباہ ہو جانے سے کوکیلا ندی میں بڑا بھیانک طوفان آ گیا ہے۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے میدانی علاقوں میں شب خون مارنے والے غنیم کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔ گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں پانی کے بہاؤ میں بہہ گئی ہیں۔ ساری بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں اور تباہ حال کسان اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں اور راہیل روڈ پر مریل انسانوں کے قافلے گزرا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سیلاب زدگان کے لئے امیر گڑھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کا جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کمیونسٹوں کی دہشت پسندی کو دخل ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر سے کمرے میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل

ہو گیا ہے۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا۔

بنتِ قمر

صادق الخیری

اب کے موسمِ بہار کس تابانی سے آیا ہے۔ ہر جگہ سبزہ، ہر طرف پھول، ہر سمت تازگی۔ گویا کائنات دلہن بنی ہوئی ہے۔ لیکن یہ ہریالی اور یہ شادابی جاوداں نہیں۔ ایک دن سے نذرِ خزاں ہونا ہے۔ زندگی کی بہار بھی عارضی ہے، ہماری خوشیاں بھی زوال آمادہ ہیں، مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ گلشنِ حیات میں دائمی بہار کیوں نہیں آتی؟ ایسی بہار جو خزاں کو جنم نہ دے، جس کے بطن سے فسردگی پیدا نہ ہو۔

میرا دل چاہتا ہے کہ والد کی طرح، جنہیں میں بچپن سے ڈیڈی کہتی ہوں، اپنے اہم واقعات باقاعدہ تحریر کروں۔ وہ کہتے ہیں اس سے جی بہلتا ہے اور جو بات زبان پر برملا نہیں آ سکتی وہ نوکِ قلم پر پوشیدہ طور پر آ کر دل کی پھانس نکال دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی ڈائری کسی کو نہیں دکھاتے، مجھ تک کو نہیں، بلکہ ایک دفعہ میں نے ضد کی تو وہ خاموش ہو گئے اور اس کے بعد پھر کبھی مجھے اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ڈائری صرف اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے کسی غیر کو پڑھنے کا حق نہیں، ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے کی ڈائری پڑھنا، لکھنے والے پر ظلم ہے، یہ تو دل کی کتاب ہے اور دل کا حال سوائے خدا کے کسی اور کو جاننا زیب نہیں دیتا۔۔۔ آج میں نے ڈائری لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس میں لکھا کروں گی، اسے کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا۔

۳۱ مارچ

یہ ڈائری نہ جانے کب شروع ہوئی، لیکن شام کو عجیب بات شروع ہو گئی، یونیورسٹی کی طالبات لان کے ایک کونے میں جمع تھیں۔ گفتگو کا موضوع بار بار بدل رہا تھا اور بات سے بات نکلتی تھی، ہم سب ہنس بول رہے تھے، چہلیں ہو رہی تھیں، کبھی سلمیٰ، کبھی عابدہ اور کبھی احمری کو نقلِ محفل بنایا جا رہا تھا کہ ناموں کا ذکر چل نکلا۔ عابدہ ایک دفعہ ہی مجھ پر ڈھل گئی، کہنے

گئی "چلو میرا نام تو ماں باپ نے غلط رکھا، مگر تم تو! یہ بہت قمر کیا ہوا" قمر نے میری طرف سے جواب دیا۔ "ان کا نام تو بالکل ٹھیک ہے شکل جو چاند کی پائی ہے۔ چشم بد دور ... ذرا پیچھے ہٹ کے دیکھو، ماہ پورا ہے یا نہیں" یہ قد موزوں، یہ ستھرے بال، یہ میدہ شہاب رنگ، یہ ماہتاب سا چہرہ..." مگر میں چپ ہو گئی، دماغ میں بے شمار افکار یک وقت ہجوم سا کرنے لگے۔ میں ایک بات اچھی طرح نہیں سوچ پاتی کہ دوسری تلخ ذہن پر ابھر آتی تھی

---- میں ان سے نہ کہہ سکی کہ ہاں میرا نام بہت قمر ہے۔ میں قمرالزمان کی بیٹی ہوں، ڈیڈی نے یہ نام اس لئے تجویز کیا کہ وہ مجھے صرف اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں وہ مجھے سرتاپا اپنا ہی عکس تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جانا چاہتے ہیں کہ میری رگوں میں ایک اس عورت کا بھی خون دوڑتا ہے جس نے دوسرے مرد کی خاطر، ان سے بے وفائی کی۔ یہ عورت میری اپنی ماں تھی جس نے میرے بڑے چچا کو اپنی زندگی کا ساتھی چنا اور میری ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے ... کی ہو گئی، ڈیڈی نے اس سانحہ کو بہادر انسان کی طرح برداشت کیا اور اس کے بعد ان کی تمام توجہات اور ساری شفقتیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ وہ زیادہ تر وقت میری تربیت اور نگرانی پر صرف کرتے ہیں۔ میرا بچپن اور لڑکپن، ان ہی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے وہ ہی میرے باپ اور وہی میری ماں ہیں۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے میرا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے... لیکن یہ گھر کے لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ ممی نے کیوں بے وفائی کی؟ کیوں انہوں نے ڈیڈی جیسے نیک دل اور اپنی ہنستی کھیلتی بچی کو چھوڑ کر دوسرے آدمی کا گھر بسایا؟

جب وہ ڈیڈی سے علیحدہ ہوئیں تو میں بہت چھوٹی تھی، جدائی کے وقت کیا ہوا ہو گا، یہ مجھے خبر نہیں بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں سن شعور کو پہنچ چکی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں الگ رہنے کی عادی تھی مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا، لیکن ڈیڈی رنج سے نڈھال ہو گئے، مجھے یاد ہے جس روز ان کے مرنے کی خبر آئی وہ میرے طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے بہت دیر تک یونہی دیکھا کئے حتی کہ مجھے رونا آ گیا، میں اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی اور انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

ہمارا بھرا پُرا گھر ہے۔ کنبہ وسیع اور آسودہ حال ہے۔ جب تک ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع نہیں کیا، میں رشتے داروں سے اکثر ممی کے متعلق پوچھتی تھی، مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈیڈی کی یہ شادی بھی غلط انتخاب کا نتیجہ تھی۔ پہلی شادی اس لیے ناکام رہی کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف والدین نے کی تھی۔ ڈیڈی کو پہلی بیوی ایک آنکھ نہیں بھائی اور انہوں نے ولایت سے

آ کر اسے طلاق دے دی۔ ولایت میں انہوں نے ممی سے شادی کی اور وہ چند سال بعد انہیں چھوڑ کر بڑے پاپا کے پاس چلی گئی، تو گویا دونوں شادیوں میں انہوں نے ٹھوکر کھائی۔ دوسری ٹھوکر بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی، اس لئے انہوں نے پھر شادی نہیں کی۔۔۔ لیکن شادی میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میاں بیوی کا غلط انتخاب زندگی کو اس قدر برباد کر دیتا ہے؟

۱۸ مئی

حمید سے میری نسبت ہوئی ہے مجھے وقتاً فوقتاً خط لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ پہلے وہ اپنی برتری جتاتے تھے۔ مگر میرے ٹوکنے پر انہوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اپنا رویہ بدل لیا لیکن جب سے وہ پی اے ایس کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں، انہوں نے پھر شیخی بگھارنی شروع کر دی ہے۔ ان کے خیالات میں چھچھوراپن ہے اور ان کی نظر میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں معلوم ہوتی۔ دس پندرہ دن ہوئے میں نے انہیں پھر لکھا کہ آپ یہ نہ بھولئے، عورت بھی انسان ہے اور شریف انسان عزت نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ بس اس بات سے جیسے عتاب چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب کے جو خط آیا ہے اس میں وہ بدتمیزی پر اتر آئے ہیں اور مجھے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ میں عنقریب ان کی بیوی بننے والی ہوں، اس لئے مجھے ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہئے جو ان کی شان میں گستاخی ہو۔ انہوں نے میرے اس خیال کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ میں ایم اے میں پولیٹیکل سائنس لوں گی اور تاکید کی ہے کہ میں اب مزید تعلیم کا سودا اپنے دماغ سے نکال دوں۔ آخر میں انہوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں بے حجابی اور بے باکی یک سر ترک کر دوں اور شریفوں کی سی خوبو پیدا کروں تا کہ جب میں ان کے نکاح میں داخل ہوں تو ہر لحاظ سے ان کے دق بن جاؤں۔۔۔ اس خط کو پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا ہے۔ جی میں آئی اس خط کے پرزے پرزے کر دوں اور انہیں لکھ بھیجوں کہ آئندہ آپ مجھے خط نہ لکھئے۔ لیکن اس سے ان کا کیا بگڑتا؟ میں غصے سے بری طرح کانپتی رہی اور جب تک میں نے اس کا جواب نہیں لکھ لیا مجھے قطعی تسلی نہیں ہوئی۔

۴ جون

میرا خط پڑھ کر حمید آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس دفعہ اس نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی مجھے کبھی توقع نہ تھی۔ کیا وہ اس قدر گرا ہوا ہے جو اس نے مجھے ممی کا طعنہ دیا ہے؟ اس نے لکھا ہے: ''اتنا مغرور ہونا اچھا نہیں، ایسی بدزبان نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ شبہ ہونے

لگے کہ تم اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلو گی''۔ یہ اس نے خط نہیں لکھا، میرے دل پر گھونسہ مارا
ہے۔ شادی کے بعد تو وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا۔ اٹھتے بیٹھتے ممی کے طعنے دے کر مجھے
کچوکے دیا کرے گا۔ میری حالت کو کیا ہو گیا ہے؟ رونا چاہتی ہوں تو آنسو نہیں نکلتے چیخنا
چاہتی ہوں تو فریاد حلق میں اٹک جاتی ہے، ضبط کرتی ہوں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔
ڈیڈی، اے ڈیڈی! کیا آپ مجھے اس مردود سے بیاہ دیں گے؟ اس خناس سے جو [illegible]
کی جوتی سمجھتا ہے؟ کیا یہ شریف آدمی ہے؟ کیا یہ کبھی مجھے رفیقِ حیات سمجھے گا؟

۱۴ اگست

آج جشنِ پاکستان ہے۔ چاروں طرف خوشیاں ناچ رہی ہیں۔ میری قوم کو آج کے دن
آزادی ملی تھی اور میں بھی آج آزاد ہوئی ہوں۔ شب و روز سوچتے سوچتے، آخر آج میں نے
ڈیڈی کو حمید کے خطوط دکھا دیے، میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، پیشتر اس کے
کہ میں کچھ کہتی ڈیڈی نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''میں یہ
منگنی ابھی توڑے دیتا ہوں''۔

آزادی کتنی بیش بہا شے ہے اسے میرا دل سمجھتا ہے۔ سچ کہتی ہوں، کل تک مجھے یہ
محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا ہے۔
میری راتیں اندھیری ہو گئیں اور میں سمجھتی تھی کہ اب صبح کبھی نہیں ہو گی۔ مگر ڈیڈی،
پیارے ڈیڈی نے میری قید کی بلائیں کاٹ ڈالی ہیں انہوں نے غلامی کے گھٹاٹوپ اندھیرے پر
ضربِ کاری لگا کر، چراغِ نور پاش نصب کیا ہے۔ ہاں اب وہ سیاہی میری زندگی کے مطلع سے
ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہے۔ میرے سامنے آزادی کا سورج سرِ بام جگمگا رہا ہے۔ آج ۱۴ اگست
ہے۔

۲۳ اکتوبر

یہ سارا ہفتہ بڑا لطیف و پُرکیف گزرا، صبح و شام سیر و تفریح، دن رات خوش کن باتیں،
میری عم زاد بہن کے شوہر، جنہیں میں بھائی صاحب کہتی ہوں، جب کراچی آتے ہیں تو گویا عید
آ جاتی ہے، وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں۔ کوئی پینتیس چالیس سال عمر ہو گی۔ مگر صحت
مند اور جامہ زیب ایسے ہیں کہ بالکل جوان لگتے ہیں۔ طبیعت ایسی شگفتہ پائی ہے کہ ہر وقت
کنول کا کھلا ہوا پھول معلوم ہوتے ہیں۔ سست آدمی سے انہیں چڑ ہے، خود اس قدر چست و
چالاک ہیں کہ جوانی کا سراپا کہئے ان کی زندگی رواں دواں ہے، ان کی گفتگو نغمہ ریز آبشار ہے،

جمود سے انہیں وحشت ہوتی ہے، ان دنوں انہوں نے ہمیں خوب سیر کرائی، چچازاد اور پھوپھی زاد بہنیں، بھائی، بھاوجیں اور کنبے کے دولہا، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر گئے، کبھی کلفٹن کے ساحل پر، کبھی ملیر کے باغوں میں، کبھی ہم سینڈزپٹ کی لہروں میں گھنٹوں کھیلتے رہے، کبھی ہم نے ہوکس بے کی دلکش شاموں کا لطف اٹھایا، جس دن گھر سے نہیں نکلے، تو ہم نے سینما دیکھا، ہندوستانی فلم حد سے بڑھتے ہوئے جا رہے ہیں، ان میں بے حیائی رچتی جا رہی ہے، جسے دیکھ کر بعض دفعہ تو سینہ دھڑکنے لگتا ہے۔

اب سے میں نے ایک نئی بات محسوس کی، بہنوں، بھاوجوں یا بھائیوں میں اگر کوئی مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے، بھائی صاحب فوراً میری حمایت کرتے ہیں، انہوں نے کئی مرتبہ کہا "بھئی بنت قمر پھول ہے، اسے کوئی رنج نہ پہنچایا کرو ورنہ یہ کملا جائے گی"۔ اور ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے "اب سے تم مجھے بہت یاد آؤ گی"۔ بھائی صاحب مجھے بے حد چاہتے ہیں، ان کے پیار میں خلوص اور بزرگی میں حمایت و حفاظت ہے۔ لیکن ان کی گھریلو زندگی کیوں تابناک نہیں؟ آپا نہ جانے کیسی بیوی ہیں۔۔ دل کی اتنی پیاری، پر زبان کی کڑوی، ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی ہیں اور بھائی صاحب ہر دفعہ مسکرا کر ٹال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں بڑا صبر و ضبط ہے لیکن آپا ان کے سامنے اتنی چڑچڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟ کیوں صرف انہی سے بدمزاجی کرتی ہیں؟ باقی سب کے ساتھ باتیں کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ باجی سے ان کی بڑی دوستی ہے۔ دونوں پرانی سہیلیاں ہیں، دوپہر کو وہ ان سے راز دارانہ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے چپکے چپکے سنا، کہ بھائی صاحب کو خوبصورت عورتیں بڑی پسند ہیں اسی لئے وہ ان پر انکس رکھتی ہیں، لیکن انہوں نے یہ نہیں کہا کہ بھائی صاحب آوارہ ہیں، بدچلن ہیں۔

یہ میاں بیوی کا تعلق کیسا ہے؟ چاہے دونوں میں اچھی نبھتی ہو لیکن اندر سے ٹٹولا جائے تو یہ اس سے نالاں، وہ اس سے شاکی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں، امانت مرزا۔ وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی محبت کا اظہار اتنی شد و مد سے کرتے ہیں کہ عجیب سا لگتا ہے، مگر کسی کو اس سے کیا۔ وہ خود تو اپنی بیوی کے پرستار ہیں اور ان کی بیوی ان پر جان چھڑکتی ہیں۔ دراصل امانت بھائی مولوی طبیعت کے ہیں، نماز کبھی قضا نہیں کرتے اور سارے شرعی احکام کی باقاعدہ تعمیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ابھی ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر ان کا حلیہ دن بدن اسلامی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ماتھے پر سجدوں کا نشان، بھروال داڑھی، کتری ہوئی لبیں اور کثیر الاولاد۔۔۔ اللہ میاں کی ساری برکتیں انہیں میسر ہیں۔ پچھلی دفعہ جب ہم سیر کو گئے تو میں ایک دن سمندر میں اتر کر پانی سے خوب کھیلی تھی، سب ہی ہنسنے بولنے میں مشغول

تھے۔ میں نے ایکا ایکی جو نظر اٹھائی تو امانت بھائی میری پنڈلیوں کو جو پائنچے کھسکنے سے کھل گئی تھیں بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا، پھر بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی نظریں مجھ پر کثر جمی رہتی ہیں۔ آخر وہ مجھے یوں کیوں دیکھنے لگے ہیں ---- مگر نہیں، یہ میرا واہمہ ہو گا۔ وہ بیاہتا ہیں، اور اپنی بیوی پر فدا ہیں۔

۱۲ جنوری

اس دوران میں میری کئی نسبتیں آئیں مگر ڈیڈی نے میرے لئے جو رشتہ پسند کیا ہے وہ سب سے اچھا ہو گا --- ایک دن پھوپھی، چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں "خدا کرے --- قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں، بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں"۔ لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلد ان کے گھر سے چلی جائے اور میرے ڈیڈی تو مجھ کو اتنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کر کے رنجیدہ نہیں ہوں گے؟ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولہا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و شاداں رہوں گی۔

۲ فروری

اس وقت میں بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں۔ پرسوں --- میری زندگی میں ایسا طوفان آیا جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے۔ رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند بڑی سو رہی تھی کہ --- ہائے میں کیسے لکھوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پر کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ خوف سے میری زبان گنگ ہو گئی، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ جلتا ہوا ہاتھ، کبھی میری باہوں، کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ ذرا دیر میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ یہ دہکتا ہوا ہاتھ، یہ بھبکتا ہوا چہرہ --- بھائی امانت مرزا کا تھا مولوی امانت کا، اور وہ دم بہ دم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے بچھے جا رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا: "ایسا نہ کرنا، ایسا نہ کرنا، تم بدنام ہو جاؤ گی --- تم عورت ہو"۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا، میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور مجھے بے حس و حرکت پا کر اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، "چھوڑ دے ظالم چھوڑ دے میں تیری بہن ہوں، دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی --- خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا، میری شادی ہونے والی ہے۔ میرے کنوار پنے کو بے داغ رہنے دے۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں' --- لیکن یہ سب

باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت، میرے چہرے کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر دفعتاً میرے کانوں نے سنا کہ میری زبان میں گویائی آ گئی ہے اور میری روح چیخ کر فریاد کر رہی ہے "ڈیڈی"۔

اس کی گرفت یکلخت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہوتے گئے، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پر پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح، دبے پاؤں رکھتا ہوا میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

۱۰ فروری

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں۔ غصے، حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے۔ نئی نئی طرح طرح کی باتیں آتی ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا پھوپھی سے کہہ دوں، پھر خیال آتا ہے اس کا نتیجہ بہت برا ہو گا، نہ جانے ڈیڈی کیا کر گذریں، اور خود امانت کی بیوی کا کیا حال ہو گا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر میرا عاشق ہے۔ یہ بات کھل گئی تو صرف میری ہی نہیں سارے خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی۔ گھر کے کسی فرد پر کسی کو بھروسہ نہیں رہے گا۔ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، کم حوصلگی اور مصلحتوں نے میرے لبوں پر مہر خاموشی لگا دی ہے، لیکن امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی، اس نے میری عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

۱۵ فروری

وقت تیزی سے پرواز کر رہا ہے، آج سو کر اٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا، ڈیڈی نے کہا۔ "تمہاری طبیعت کئی دن سے ست ہے، تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں؟ آج ڈاکٹر کو ضرور بلوا لو"۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اگر یونہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہو گی چنانچہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو بیچ کے کمرے میں وہ صاحب ایمان، امانت جا نماز پر کھڑا تھا۔ میرے پاؤں رک گئے اور اس نے معاً نیت توڑ کر میرے طرف دیکھا، میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اس کے پاس پہنچی تو اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، بہت دن سے دل کے ارمان دل میں دبے ہیں۔۔۔" میں غصے سے بے قابو ہو گئی "فریبی! شادی شدہ ہو کر۔۔۔" میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ شکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا "تم راضی ہو جاؤ تو میں فیروزہ کو چھوڑ دوں گا اور ۔۔۔" یہ تو حد ہو

گئی۔ مجھے ایک دھکا سا لگا اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تو کمینہ ہے"۔۔۔ اتنے میں بھابی فیروزہ کی دور سے مسرور لہجے میں آواز آئی "دیکھو تم جو میرے لئے آف چکن کا کرتہ لائے لاجواب ہے"۔

میرا خیال خودبخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا، جو صحن میں بیٹھی جھپ جھپ چکن کا کرتہ سی رہی تھیں لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا دم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر جس وقت چاہے مجھے لات مار کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ اس تصور نے میرے غصے کو فرو کر دیا اور میں نے حیرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا، جو میری نشستگاہ میں بیوی کے ڈر سے مصلے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا۔

۲۸ فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی، پرہیزگار، مولوی امانت ہے، اس کی بزرگی کا بت زمین پر ڈھیلے منہ گر پڑا ہے۔ پہلے میں اس کا جس قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں۔ عمر کے تفاوت اور اس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا، اب میں نڈر ہوں اور اسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں، وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا، احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴ اپریل

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے۔ ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے، لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے، یہاں کی آب و ہوا آپ کے لئے مفید ہو گی، ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا "تم چلو گی"؟ میں نے کہا "شوق سے چلوں گی"۔ بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں، اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵ مئی

سنگ زار بلوچستان کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہو بے آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے۔ راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کیم شحیم بھونڈے اور بھدے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے، تازک شاداب اور حسین، یہاں ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، جہاں ساری فضا پرسکون اور خیال افروز ہے

کوئٹہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے۔ جہاں امیر بہت زیادہ آسودہ حال اور غریب بہت زیادہ فلاکت زدہ ہے۔ یہاں کانیں ہیں، منڈیاں ہیں، خوبانی ہے، یہاں مزدوری ہے، بیماری ہے، گندگی ہے، سیاحوں کے لیے تفریح ہیں، پھل ہیں، اور گوشت کی فراوانی ہے۔ بلوچیوں کے لیے فاقہ کشی ہے، محرومی ہے اور آمدنی کی نایابی، اتنی کہ وہ بمشکل روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے ہیں۔ لیکن خدا نے انہیں غیرت سے مالا مال کیا ہے۔ شکستہ پائی اور بوسیدہ حالی کے باوجود وہ تندرست و توانا ہیں ان میں خون کی کمی نہیں، انہیں طاقت کی دوا نہیں پینی، انہیں قدم قدم پر احتیاطوں کی ضرورت نہیں۔۔ وہ جو سیاح یہاں دور دور سے آتے ہیں، مزے سے اپنی خواب گاہوں میں آرام کرتے ہیں، یہ جو بلوچی روپے ان مہمانوں کے بھیس میں آنے والوں کی خاطر، خون پسینہ ایک کرکے اپنے گھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور خود الگ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لے جاؤ، یہ سیم و زر تمہارا ہے، اس پر تمہارا ہی حق ہے، تم اتنی دور سے چل کر ہمارے لیے آئے ہو، دولت مند ہنستا رہتا ہے اور غریب بلوچی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا ہے کہ اب تک یہ جہالت کا اندھیرا چھایا رہے گا؟ کب علم کی روشنی یہاں تک پھیلے گی؟ کب خدا ہمیں احساس اور اہلیت دے گا کہ ہم اپنی دولت سے خود متمتع ہوں؟

۲۰ مئی

یہاں کئی قدرتی سیرگاہیں ہیں جہاں انسان بازاروں کی گہماگہمی اور آمدو رفت کے ہنگاموں سے محفوظ ہو کر اپنے تفکرات بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ خاموش مقامات ہمیشہ یاد رہیں گے۔ خصوصاً برودری جہاں ہم لوگ کل پکنک کے لیے گئے تھے۔ شہر سے دور یہ ایک عمدہ تفریح گاہ ہے جہاں چٹانیں اور پہاڑیاں اس طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑی ہیں گویا انہیں کسی خاص طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں بھائی صاحب، ڈیڈی، آپا، بچے اور ملازم شامل تھے، برودری کی طرف خراماں خراماں آگے بڑھتا جاتا اور ہمارا راستہ کبھی کشادہ کبھی تنگ اور کبھی پھر وسیع ہو جاتا تھا۔ دائیں جانب ایک ایسی پختہ نالی تھی جس میں چشمے کا شفاف پانی اٹھلاتا، ناچتا، گاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہم آب رواں کا مخرج نہ دیکھ سکے جو کہیں بلندی پر پہاڑیوں میں چھپا ہوا گا، لیکن وہ ہم سے بے خبر، اپنی منزل کی طرف مصروف سفر تھا، جو بہت دور نیچے آبادی میں تھی۔ چلتے چلتے بچے تھک جاتے تو کسی کی گود میں آ جاتے آپا کچھ تھک سی گئی تھیں، ڈیڈی بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور بھائی صاحب حسب معمول لطیفے سنا سنا کر ہمیں اور آگے بڑھنے پر اکسا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا میدان آیا جس کے ایک جانب اونچی اونچی پہاڑیوں

کے دو سلسلے حبش کے وفادار غلاموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے، معلوم نہیں ان کے درمیان راستہ قدرتی تھا یا انسانی ہاتھوں نے پتھر کے سینے کو چیر کر اسے بنایا تھا۔ ہ جو غیر متمدن ہندوستان کو فتح کرنے والے جانباز سینکڑوں سال پہلے اسی راہ پر گامزن ہوئے ہوں اور اس وقت ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازسے یہ سارا سلسلۂ کوہ گونج اٹھا ہو۔ جب ہم اس درے سے گذر کر باہر آئے تو آپا کی ہمت نے جواب دے دیا اور ڈیڈی نے ایک اونچی ی بی ی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا کہ یہیں ہمارا ڈیرہ جمے گا۔ دن بھر سب لوگ گھومتے پھرتے رہے، بچے روتے کھیلتے رہے، آپا کھانا کھلا کر فارغ ہوئیں تو پاندان لے کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی تب بنی میں مشغول ہو گئے۔ میرا دل اس ماحول سے کسی طرح نہیں بھرتا تھا، دور دور تک ہو نے کے باوجود میری طبیعت یہی چاہتی تھی کہ ابھی اور چلوں، اچھی اور دوڑوں، بھاگوں، سب کر ستانے بیٹھ گئے، مگر بھائی صاحب نے میرا برابر ساتھ دیا، بلکہ جب میں نے ڈیڈی سے کہا کہ بس سامنے والی پہاڑی کے اوپر اور ہو آؤں تو اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری چنانچہ جب ہم منزل، منزل چوٹی پر پہنچے تو میرا سانس پھول گیا، بھائی صاحب بھی ہانپنے لگے تھے۔ ل ئے ہم ایک کالی سی عمودی چٹان کی اوٹ میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ میلوں پرے نشیب میں کوئٹہ کی چھوٹی سی آبادی سبزے میں گھری ہوئی نظر آ رہی تھی، جگہ جگہ پھولوں کے باغات کھڑے لہلہا رہے تھے۔ دور دراز سے آنے والی ہوا اپنے دوش پر جنگلی پھولوں کی خوشبو اور بلوچستان کی خنکی لئے آ رہی تھی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں دور و نزدیک ایک طلسم سا بندھا تھا اور اس میں گم ہو کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اسی جگہ کے لئے پیدا ہوئی ہوں یہ چٹانیں، یہ بلندیاں، یہ خاموشی، یہ پرسکون مقام، کتنا امن ہے یہاں، کتنی آزادی ہے اس ماحول میں۔۔۔ اور جب میں اپنے خواب سے چونکی تو آپ ہی آپ میرا سر بھائی صاحب کے شانے پر آ گیا، وہ بڑی ملائمت سے بولے ”کس گہری سوچ میں ہو، واپس نہیں چلو گی“؟ میں نے جواب دیا ”ذرا اور ٹھہر جائیے میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا“۔ پھر ہم دونوں قدرت کی بوقلمونیوں اور زندگی کے اجلے رخوں پر باتیں کرنے لگے، ایسی باتیں جن میں شیرینی اور خلوص تھا ہمدردی اور ہم خیالی تھی اور جب سورج ارغوانی ہونے لگا تھا تو بھائی صاحب نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا، ان کے کندھے پر سر رکھ کر، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر، ان کے اتنے قریب بیٹھ کر مجھے بڑی راحت ہوئی، افسوس یہ وقت کتنی جلدی گزر گیا۔

۱۵ جون

آپا کو اللہ نے ایک اور چاند سا بیٹا دیا ہے۔ بالکل چینی کا بنا ہوا لگتا ہے، مسکراتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے، ہمکتا ہے تو جی چاہتا ہے سینے سے چمٹا لوں۔ بھائی صاحب کے سب بچے پیارے پیارے ہیں مگر یہ سب سے بڑھ گیا، اس کے خد و خال بھائی صاحب کے سے ہیں، اس کی آنکھوں میں ان ہی کی چمک ہے۔ مجھے ننھے بچے اچھے نہیں لگتے۔ وہ کلبلاتے ہیں تو مجھے جھرجھریاں سی آتی ہیں، مگر بھائی صاحب کا یہ منا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ ہی آپ مجھے اس پر پیار آتا ہے، پرسوں ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔ روانگی کے خیال سے میں افسردہ ہو گئی ہوں کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکتی۔

۳ جولائی

۱۲ تاریخ کو میری شادی ہے، جوں جوں دن قریب آتا جاتا ہے، شوق و وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ خدا جانے ایوب کس مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے خیالات کیسے ہیں، ان کے رجحانات کیا ہیں اور ہم دونوں کی کیسی نبھے گی؟ صبح میں نے ان کی تصویر بھی دیکھی بڑے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں، طبیعت بھی ہو گی، میں کوشش کروں گی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھیں تو ہمارا مستقبل ضرور خوش آئند ہو گا لیکن سب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتی ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر شادیاں ناکام ہیں، میاں بیوی کے جذبات و احساسات میں ہم آہنگی نہیں۔ وہ درگذر، چشم پوشی اور فراخدلی کو اپنی عادت نہیں بناتے۔

یکم ستمبر

الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ شادی کے نام سے مجھ پر یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے؟ ایوب میں تو سرے سے آدمیت ہی نہیں، وہ تو انسان کا نقلی چہرہ لگا کر بیاہنے آیا تھا، وہ سر تا پا ——— حیوان ہے اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ شروع میں تو میں ہکا بکا رہ گئی اور سوچتی رہی کہ مرد اور عورت کا یہ رشتہ آخر بنا کیوں ہے؟ عورت کو پا کر مرد کیوں بلندیٔ خیال اور پاکیزگیٔ نفس سے محروم ہو جاتا ہے؟ کیوں تنہائی میں وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا؟ لیکن سب مرد تو ایسے نہ ہوتے ہوں گے، یہ ایوب ہی ہے جو صرف میرے جسم کی لذت چاہتا ہے۔ وہ میرے دل میں کبھی نہیں اترتا، میں اس سے بات کرتی ہوں، تو کوئی اثر نہیں لیتا، اسے صرف میرا حسن

چاہیے حسن، اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جب میں [illegible] کے بعد میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بھدی اور بے ڈول ہو جاؤں گی تو وہ مجھ سے [illegible] ہو جائے گا [illegible] مجھے [illegible] چھوڑ دے گا۔

ایوب ریچھ کی طرح ہے، اس کے سینے، چہرے، ہاتھوں حتیٰ کہ سارے جسم پر [illegible] بال ہیں کہ دیکھ کر کراہیت ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے ہاتھ میرے بدن پر [illegible] ہے تو [illegible] سینکڑوں چھپکلیاں رینگ جاتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے [illegible] کہیں بھاگ جاؤں [illegible] ہو جاؤں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا، میں ہنوز اپنی سسرال میں قید ہوں میری [illegible] نہیں، جو میرے دل کا حال سن سکیں جس سے میں پوچھ سکوں، کہ [illegible]"

۲ اکتوبر

میں نے کنوارپنے میں شادی کے جو محل بنائے تھے وہ ٹوٹ گئے ہیں۔ ایوب [illegible] اور اوباش ہے۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ مجھ سے یوں پیش آتا ہے جیسے میں اس کی رفیقہ حیات نہیں، بس ایک عورت ہوں۔ اس کے دل میں بہت سی عورتیں ہیں۔ وہ جب کسی عورت کا خیال، جسے وہ نہیں پا سکا، اسے دیوانہ کر دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ مجھ سے اتارتا ہے۔ کبھی کبھی تو بے رحمی سے گھسیٹ کر مجھے اپنے سے چمٹا لیتا ہے، میں مزاحمت کرتی ہوں تو اس قدر زور سے دھکا دے دیتا ہے۔ کل میرے بڑی چوٹ لگی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں خیالات میں کھو گئی اور روتے روتے مجھے بھائی صاحب اور آپا یاد آ گئے، تو میں نے کہا، "آپا بھائی صاحب کو کچھ نہ کہا کرو، تم نے مرد نہیں دیکھے"۔

۲۰ اکتوبر

میں بڑی مشکل سے میکے آئی ہوں، یہ میرا اپنا گھر تھا مگر آج یہ مجھے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی غیر ہوں۔ مہمانوں کی طرح میری خاطریں ہوتی ہیں اور بار بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں بہت جلد اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ ڈیڈی بھی جو میرے آنے سے بے حد خوش ہیں۔ موقع دیکھ کر یہی نصیحت کرتے ہیں کہ میرا اصلی گھر میرے شوہر کی دہلیز ہے اور مجھے تمام عمر وہیں رہنا ہو گا۔ جیسے رخصت کے وقت انہوں نے مجھے سمجھایا تھا، اب بھی وہ باتوں باتوں میں یہی دہراتے ہیں کہ جس شخص سے ایک دفعہ دامن بندھ جائے ساری زندگی اسی کی ہو کر گزار دینی چاہیے، یہی شرافت کا تقاضا اور نسوانیت کا فرض ہے، مگر وہ مجھے یہ سبق دیتے ہیں۔۔ جی میں آتا ہے کہ ان سے کہہ دوں ڈیڈی! میں بڑی تکلیف

میں مبتلا ہوں، میرے اور ایوب کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت نہیں۔۔۔ نہیں نہیں یہ
میں کبھی نہیں کروں گی۔ ان کو اگر شبہ ہو جائے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور کیا خبر غیرت
میں آ کر وہ میری جان کا دشمن ہو جائیں کہ میرے خون میں شوہر پرستی کا جذبہ اور شرافت موجود
ہے، اس لیے مجھے اپنے جذبات پر [illegible] کی مہندی لگانی پڑے گی۔ ایوب میری امانت ہے۔ ان کا
اور میں اسے ہر امتحان پر [illegible] گی۔ وہ مجھے چاہتے ہیں اور میں ان کی مشتاق رہوں گی۔

۲۵ اکتوبر

کل رات مجھے تار آیا کہ دل کی حرکت اچانک بند ہو جانے سے ایوب کا انتقال ہو گیا
ہے، تھوڑی دیر میں وہاں جا رہی ہوں [illegible] سوار ہو جاؤں گی۔ دنیا کی رسموں کے مطابق مجھے سوگ
کا پیرہن پہننا پڑے گا لیکن در اصل میں رنجیدہ نہیں ہوں، [illegible] ان کی موت کا صدمہ نہیں ہے، ہاں افسوس
ضرور ہے۔

۱۳ مارچ

میں عدت پوری کر کے واپس آ گئی ہوں۔ ڈیڈی ایوب کی موت سے بے حد متاثر ہیں۔
ان کے دل پر دہا کر بیٹھ گیا ہے، کہتے ہیں یہ میرے گمان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمہاری
بیوگی دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ ان کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرا گھر پھر بسا دیں، مگر
میں اب شادی نہیں کروں گی، میرا دل پک گیا ہے۔

۳۱ مارچ

کوئٹہ سے خط آیا ہے کہ بھائی صاحب سخت علیل ہیں، معمولی سی بیماری نے خطرناک
صورت اختیار کر لی ہے۔ ان کی گھبراہٹ نے آپا کو پریشان کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر میرا
کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں۔ ان کی آئی کسی اور کو آ جائے، ان
کی بجائے امانت مر جائے، میں مر جاؤں۔

اگر خدا نخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اس تصور سے ہی میری آنکھوں کے سامنے
اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ میں کسی ایسی دنیا میں چلی جاتی ہوں جہاں خزاں آ گئی ہے، جہاں ہر
طرف حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، جہاں گل بوٹے نہیں کھلتے، جہاں سبزہ نہیں لہلہاتا۔ یہ
کیسی فضا طاری ہو رہی ہے؟ ایک بھائی صاحب کے نہ ہونے سے، کس نے زندگی کی آرائش نوچ
لی ہے، کس نے اس چمن کا سہاگ لوٹ لیا ہے؟ کیوں ایک، صرف ایک شخص کے چلے جانے

سے آبشاروں کے نغمے ٹوٹ گئے ہیں، خوشیوں کی تابندگی مٹ گئی ہے، زندگی کا بانکپن خراب ہو گیا ہے؟

میں ڈیڈی کے ساتھ کوئٹہ جا رہی ہوں، کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی، ساری پہاڑ سی رات باقی ہے، ایک ایک پل گذارنا عذاب معلوم ہو رہا ہے۔ ابھی صرف دو ہی بجے ہیں، اتنی دیر سے یہی بج رہا ہے، سوئیاں کیوں تیزی سے نہیں چلتیں، یہ سیاہ رات کیوں جلدی دم نہیں توڑتی؟

صبح ہوتے ہی ہم سوار ہو جائیں گے، خدا کرے گاڑی کہیں لیٹ نہ ہو، پھر دن دوپہر تک کوئٹہ پہنچ جائیں گے اور میں سیدھی بھائی صاحب کے پاس چلی جاؤں گی، خوب ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لوں گی اور آہستہ آہستہ سہلاؤں گی، ان سے باتیں کروں گی، بوردی کی پہاڑیوں پر جو ہم نے شام گذاری تھی وہ انہیں یاد دلاؤں گی، انہیں سکون مل جائے گا، انہیں ضرور نیند آ جائے گی ـــــ لیکن، لیکن، کوئی میری راہ میں حائل ہو رہا ہے، کہتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں ان سے سب کے سامنے کھل مل کر باتیں نہیں کر سکتی، ان کے پاس یوں آزادانہ نہیں بیٹھ سکتی، کوئی میرا دل پکڑ کر کھینچتا ہے، میرے اٹھتے قدم روکتا ہے۔۔۔ یہ ناصح ٹھیک کہتا ہے۔ یہ میرا نادیدہ ہادی مجھے عرصہ سے سمجھا رہا تھا، مگر میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، میں یہی کہتی رہی "تو جھوٹا ہے، تو مجھے نہیں سمجھا، میرے دل میں چور نہیں ہے، میں بھائی صاحب کو آپا سے چھیننا نہیں چاہتی"۔ اور وہ مجھے یہ جواب دیتا "تم بے شک سچ کہتی ہو اور میں تمہیں جانتا ہوں، مگر دنیا نہیں جانتی، اسے تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں آئے گا، تم جس حد کو توڑ کر آگے جانا چاہتی ہو، وہ بہت سنگین اور بلند ہے، اس سے ٹکراؤ گی تو پاش پاش ہو جاؤ گی"۔ پہلے میں نے اس کا کہا نہ مانا، لیکن ابھی ابھی اس نے یہ بات بھی کہی ہے "صرف تم ہی برباد نہیں ہو گی، اس کی لپیٹ میں دوسرے بھی آ جائیں گے، تمہاری آپا، ان کا ننھا منا گھرانہ، تمہارے بھائی صاحب"۔۔۔

یہ میرے دل نے بھرپور وار کیا ہے، جس سے میں پسپا ہو گئی ہوں ـــ مجھ میں بغاوت کی بھی ہمت نہیں رہی، میں کوئٹہ جاؤں گی تو دور ہی دور سے انہیں دیکھوں گی، آنکھیں روئیں گی تو آنچل کی اوٹ میں انہیں بہلا لوں گی، مجھے اپنی قسمت معلوم ہو گئی ہے، میرے لئے موسم خزاں آ گیا ہے، میں اب چراغ کشتہ کی مانند خاموش ہو جاؤں گی۔

بُوفے

صادق حسین

بلا کی چہل پہل تھی۔۔۔ مرد، عورتیں، بہترین لباس زیب تن کئے جِم خانہ کلب کی رومانی فضاؤں میں تیر رہے تھے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے یہ کلب افرنگیوں کے لئے مخصوص تھے ۔۔۔ لیکن وہ تو غلامی کا زمانہ تھا، اب ہم آزاد ہیں، اب اس کلب میں پاکستانیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہاں ریشمی غراروں، ساٹن کی چکیلی شلواروں، جارجٹ کی رنگ برنگی ساریوں اور کالی شیروانیوں کی بہار ہے۔

اس رات ایک وسیع پیمانے پر بوفے کی تیاریاں کی گئیں تھیں۔ برقی قمقموں سے جگمگاتے ہوئے بڑے ہال کے وسط میں میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، صدر دروازے کے بائیں جانب دیوار سے لگی ہوئی ایک میز پر خالی پلیٹیں، چھریاں، کانٹے ترتیب سے دھرے تھے۔ بغلی دروازے کے قریب ایک گول میز پر پانی سے بھرے جگوں اور خالی گلاسوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مقابل کی دیوار سے لگی ہوئی ایک اور میز پر گلدستوں کے اردگرد فرنی اور پڈنگ کی بڑی بڑی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔

کھانے کا اعلان ہوا اور لوگ گروہ در گروہ اندر آنے لگے۔ چھریوں، کانٹوں اور چمچوں سے کھانے کی میز پر ہر طرف سے دھاوا بول دیا گیا۔ ادھر خالی پلیٹوں والی میز پر افراد کا ایک بادل سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ پلیٹیں ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے اور کھانے کی میز تک ان کی رسائی نہ ہو رہی تھی۔ چند لوگ مجبوراً تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پلیٹوں والی میز تک پہنچتے ہی پہنچتے کھانے کا صفایا ہو جائے گا۔۔۔ حفیظ انہی لوگوں میں شامل تھا۔ تنہائی کی تاریکیوں سے نکل کر دفعتاً اس رنگ و بو کی دنیا میں پہنچ کر وہ متحیر کھڑا تھا۔ پلیٹوں سے چھریاں اور کانٹے ٹکرانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں گھل رہی تھی۔ ہجوم کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر اور روج سے

آراستہ نسوانی چہرے انسانوں کے [illegible] چاروں طرف پھیلتے چلے جا رہے تھے [illegible]
بیٹوں والی میز تک بھی نہ پہنچ پایا تھا۔

گزشتہ اتوار کو حفیظ نے کل پاکستان انجمن [illegible] کی بہبود کے [illegible] ٹکٹ خرید لیا تھا۔ بوفے کا انتظام خواتین [illegible] تھا۔ [illegible] روپے کے عوض چٹاگانگ کلب کی زیارت کرنے چلے آئے تھے

اس ہنگامے کا مقصد فقط انجمن [illegible] ہونے سے پہلے باہر لان پر قناتوں [illegible] برآمدے میں ڈانس کا رنگ رچا کر جیبوں [illegible] خاصی بڑی رقم بٹوری جا چکی تھی۔

اب حفیظ پلیٹ ہاتھ میں تھامے میز [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص خود ہی مہمان ہے اور خود ہی میزبان [illegible] بھی کرائے جا رہے تھے۔ گفتگو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہو رہی تھی۔۔۔ قہقہے، چھیڑ چھاڑ، آپس میں ہنسی مذاق، عورتیں نہایت پرتکلف انداز میں [illegible] دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں"۔۔۔ قبل اس کے کہ حفیظ ابھی [illegible] دو گورے گورے نسوانی ہاتھوں نے ایک تنوری روٹی اور دو شامی کباب اس کی پلیٹ میں رکھ دیے۔

"آگے بڑھیے صاحب! مرغ سے شوق فرمایئے"۔۔۔ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت نے ایک طرف کو ہٹتے ہوئے حفیظ کو دعوت دی۔ وہ میز کے قریب چلا گیا، سانولی عورت نے جھٹ شوربے کے دو چمچے حفیظ کی پلیٹ میں ڈال دیے۔ حفیظ نے شکریہ ادا کیا اور سانولی عورت پتلی سفید جارجٹ کی ساڑی کمر میں کستے ہوئے ایک انگریز سے باتیں کرنے لگی۔

حفیظ سوچنے لگا کہ کلب کی زندگی بھی تو بڑی دلچسپ ہے، یہاں ہر شخص دوسرے سے کھلم کھلا بات چیت کر سکتا ہے۔ یہاں دو گورے گورے نسوانی ہاتھ بغیر کسی جھجک کے ایک اجنبی کی پلیٹ میں روٹی اور شامی کباب رکھ سکتے تھے، یہاں ایک سانولی حسینہ مسکرا کر بے ساختہ [illegible] مرغ پیش کر سکتی ہے۔ شاید اس زندگی کو وہی لوگ برا سمجھتے ہیں جن کی یہاں تک پہنچ نہیں، مثلاً اگر وہ خود چاہتا بھی تو اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا تھا، اس لیے کہ ممبر ہونے کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور اس کے اقتصادی حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔

"چٹنی پسند ہے آپ کو؟" پھر انہیں گورے گورے ہاتھوں نے حفیظ کی پلیٹ میں ایک

چمچہ چٹنی ڈال دی۔ اور شاید یہ ان ہاتھوں کی آخری پیشکش تھی، اس لئے کہ یہ ہاتھ چلتے پھرتے ہجوم میں گم ہو گئے اور حفیظ سرکتا ہوا پانی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جہاں اعلیٰ اعلیٰ وردیاں پہنے ہوئے بیرے کمال پھرتی سے پانی پلا رہے تھے۔

میز کے قریب ہی ایک گوری چٹی دراز قد عورت پتلی پتلی سپید انگلیوں میں گلاس تھامے ایک ایک گھونٹ کر کے پانی پی رہی تھی اور ایک انگریزی فرم کا منیجر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ تجویز [illegible] سے باکمال طور اور آئندہ اتوار کو پکنک کا پروگرام طے پا گیا۔۔۔ حفیظ پاس ہی کھڑا تھا۔ اس عورت نے اپنے گندمی چہرے پر کس قدر پاؤڈر اور روج کیوں لیپ رکھا تھا۔ بھنویں صاف کر کے ان کی جگہ سیاہ مصنوعی کمانیں کیوں کھینچ لی تھیں۔ حفیظ کو یہ محسوس ہوا۔ اس عورت کو برسوں سے گہری نیند نصیب نہیں ہوئی۔ حفیظ نے پلیٹ ایک بیرے کے ہاتھ میں تھما دی، پانی پیا اور پھر دوسروں کے ساتھ بہتا ہوا فرنی اور پڈنگ کی میز پر جا پہنچا۔

"ارے حفیظ اچھے تو ہو؟" ایک پختہ عمر کے وکیل صاحب نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"منور! تم حفیظ کو جانتی ہو نا؟ اپنے گاؤں کا ہے، تم دونوں تو ایک ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہو۔" وکیل صاحب نے اسی سانولی عورت سے مخاطب ہو کر کہا جس نے کچھ دیر پہلے حفیظ کو مرغ پیش کیا تھا۔ منور نے فرنی سے بھری پلیٹ حفیظ کے ہاتھوں پر رکھ دی اور پھر لمبے لمبے پالش کئے ہوئے ناخنوں والی انگلیوں سے ساڑی کا پلو تھام کر اونچے کٹے ہوئے سر کے بالوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ وکیل صاحب ان دونوں کے خاندانوں کی تعریفیں کرنے لگے اور حفیظ کی آنکھوں کے سامنے چھوٹی سی منور مشرقی بنگال کے ایک دورافتادہ گاؤں، کالی پور کے کچے رستوں پر گھومنے لگی۔ وہی منور جو پیلا کپڑا باندھے سرخ کرتہ پہنے دھان کے کھیتوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کبھی اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ وہی منور جو سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ٹوٹے پھوٹے دیہاتی نغمے گایا کرتی تھی وہی منور جو بندریا کی طرح کھجور کے درخت پر چڑھ جاتی اور رس سے بھری ہوئی ٹھلیا کوری سے کھول کر دھم سے زمین پر دے مارتی۔ وہی منور جس نے ایک دن کھلیان میں بچوں کے معصومانہ انداز میں حفیظ سے کہا تھا۔ "مجھ سے شادی کرو گے؟" اور پھر دھان کے ڈھیر میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔

آج حفیظ اسی منور کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔

"تم سچ مچ حفیظ ہو؟" منور نے اتنے قریب سے کہا کہ اس کی سانس حفیظ کے گالوں کو

چھونے لگی۔

"ایں، ہاں! تم منور!" حفیظ گویا نیند سے چونک [illegible]

وکیل صاحب کہیں کے کہیں جا پہنچے تھے اور منور، حفیظ جھوٹی پلیٹیں ہاتھ میں تھامے پڈنگ والی میز سے کافی دور تھے۔ زندگی کے دو مسافروں کی اچانک چودہ برس بعد ملاقات ہوئی تھی--- کالی پور کے ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں سے دور، ایک اونچی پہاڑی پر، چٹاگانگ کلب کے جگمگاتے ہوئے ہال میں، ایک نئی دنیا کے رنگ و بو کے بیچ

"ہیلو، مسز جمیل! آپ تو عید کا چاند ہو گئی ہیں"۔ ایک ادھیڑ عمر، جو شکل و صورت سے پریشاں معلوم ہوتا تھا، منور سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے کلب آنا جو بند کر دیا"--- منور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مسز ناصر اچھی تو ہیں؟" منور نے پوچھا۔

"ابھی یہیں تھیں، کہیں مسز جمیل سے رومانس نہ لڑا رہی ہوں"۔ [illegible] نے چٹکلہ چھوڑا اور پھر آس پاس کے لوگوں نے قہقہے لگا کر اس برجستہ فقرے کی داد دی۔

"مسز جمیل! گھنٹوں سے تمہیں ڈھونڈھ رہی ہوں"--- ایک ساٹن کی شلوار والی نے منور کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے؟" منور نے پوچھا۔

"آئندہ سنیچر ہم شکار کھیلنے دوہزاری جا رہے ہیں۔ وہاں ہرنوں کے غول کے غول ملیں گے، محکمہ جنگلات کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنے کا انتظام ہو گیا ہے"--- ساٹن کی شلوار والی نے سب کچھ ایک سانس میں کہہ ڈالا۔

"بھئی مجھے تو ہرنوں کا شکار قطعی پسند نہیں"--- منور نے شانے اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہا--- "ہرن زخمی ہو کر آنسو بہاتا ہے مجھ سے وہ منظر دیکھا نہیں جاتا اور پھر مجھے تو اڑتے ہوئے سانپ پر گولی چلانے میں بڑا مزہ آتا ہے"۔

حفیظ کو چارسو زندگی موجیں مارتی نظر آ رہی تھی--- خوش و خرم چہرے، خوبصورت لباس، گہنوں کی چھوٹ، سینٹ کی خوشبو، قہقہے، مسکراہٹیں اور منور سے ایک عرصۂ دراز کے بعد اچانک ملاقات ہو جانے سے تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس نے صدیوں کی کھوئی ہوئی زندگی ازسرِنو پا لی۔

ہجوم کے رخ کے ساتھ ساتھ وہ بھی صدر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی پلیٹ میز پر رکھ کر برآمدے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ من چلے نوجوان کرسیوں پر

بیٹھے سگریٹ کے کش لگا لگا کر ہوا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بنا رہے تھے۔ یاران طریقت پر جھاڑتے ہوئے ڈائس ٹیبل کی طرف اڈے چلے آ رہے تھے۔ ایک سانولا سا ہو ممبر ڈائس ٹیبل پر پانسے الٹ پلٹ کرتا ہو ٹرائی یورلک کی صدائیں لگا رہا تھا۔ دو قدم پرے ایک مرد کھڑا ایک یورپین لیڈی سے باتیں کر رہا تھا۔ مرد بایاں ہاتھ برآمدے کے ستون سے ٹیکے، دائیں ہاتھ سے دانتوں میں دبے ہوئے پائپ سے دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔ یورپین لیڈی کے ایک ہاتھ میں شیری سے لبریز جام اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں میں سلگتا ہو سگریٹ تھا۔ کبھی وہ شیری کی ایک چسکی لگا لیتی اور کبھی سگریٹ کا ایک کش۔

"مسٹر جمیل! نمبر چار خالی ہے"۔۔۔ ڈائس کھلوانے والے نے ڈنر سوٹ پہنے ہوئے مرد کو داؤ لگانے کی دعوت دی۔

"شکریہ مجھے اس سے دلچسپی نہیں"۔۔۔ مسٹر جمیل نے پائپ کو دانتوں کی گرفت سے علیحدہ کر کے جواب دیا۔

"جمیل صاحب! تو آئیے پھر دل ہی کی بازی سہی"۔ فلیٹ ہیٹ کے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون نے ایک شوخ سے انداز میں مصرعٔ طرح چھوڑا۔ اس پر ڈائس کھلوانے والے نے استادانہ رنگ میں طبع آزمائی کی اور پھر ایک منچلی عورت نے ایڑیاں اٹھا کر ایسی گرہ لگائی کہ ڈائس ٹیبل کے اردگرد قہقہوں پر قہقہے بلند ہونے لگے۔ مسٹر جمیل مسکرائے اور پھر پائپ دانتوں میں دبا کر دھوئیں کے حلقے ہوا میں اڑانے لگے۔ گولڈ فلیک کے خالی ٹین میں پانسے زور زور سے ہلا کر میز پر پھینک دیئے گئے۔ ایک شور ہوا، کوئی جیتا، کوئی ہارا۔

حفیظ ڈائس ٹیبل کے قریب کھڑا دیکھ رہا تھا۔۔۔ سن رہا تھا۔۔۔ سوچ رہا تھا۔

"حفیظ"! دفعتاً عقب سے منور نے حفیظ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا اور قبل اس کے کہ حفیظ کے ہونٹ ہلتے، منور اسے بازو سے پکڑ کر مسٹر جمیل کے پاس جا پہنچی، جو مسز ہیملٹن سے باتیں کر رہے تھے۔

"جمیل! آپ سے ملئے۔۔۔ یہ ہیں میرے پرانے دوست مسٹر حفیظ۔۔۔ مسز ہیملٹن"!

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" جمیل نے حفیظ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت خوشی ہوئی"۔۔۔ مسز ہیملٹن نے چٹکی سے جلتے ہوئے سگریٹ کو ہوا میں اچھال کر حفیظ سے ہاتھ ملایا۔

"حفیظ میرے بچپن کے ساتھی ہیں، آج میں بہت خوش ہوں برسوں کے بعد ہماری اچانک ملاقات ہوئی ہے"۔۔۔ منور نے ہوا میں اس انداز سے باہیں پھیلاتے ہوئے کہا کہ جیسے وہ ابھی

حفیظ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے گی۔

حفیظ ایک عجب بیچارگی کے عالم میں تھا۔ جیسے ابھی [illegible] ... جمیل سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کا یہ عمل سب [illegible] ... ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"جمیل! کل رات حفیظ ہمارے یہاں [illegible] ... ہاتھ میں لے کر کہا۔

"مسز میتھلن! معاف کیجئے گا، [illegible] ... باتیں کروں گی"۔۔۔ منور نے باہر قناتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے [illegible] ... ہاتھ میں لئے ادھر بڑھ گئی۔

بال روم میں مردوں اور عورتوں کے جوڑے [illegible] ... تھے۔ ڈائس ٹیبل پر سکوں اور نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ [illegible] نہایت مستعدی سے [illegible] بڑے پیگ تقسیم کر رہے تھے۔ جمیل بدستور پائپ دانتوں میں دبائے دھوئیں سے مرغولے [illegible] رہا تھا۔ مسز میتھلن بال روم میں پہنچ چکی تھیں اور اب ایک فربہ عورت جمیل [illegible] برج اور پوکر کے دلچسپ قصے سنا رہی تھی۔

"حفیظ! آج میں بہت خوش ہوں"۔۔۔ منور نے حفیظ کے پاس بنچ پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔

حفیظ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس طویل مدت کے بعد منور سے اچانک اور [illegible] ماحول میں ملاقات ہو جانے پر اس کے دل میں جہاں خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں وہاں اضطراب کا ایک طوفان بھی موجزن تھا۔ ایسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ چوری کے لئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

"تم چپ کیوں ہو"؟۔۔۔ منور نے حفیظ سے اور قریب ہو کر پوچھا۔

"منور!"۔۔۔ حفیظ نے ایک عجیب گھبراہٹ کے عالم میں کہا: "میں ڈر رہا ہوں"۔

منور کھلکھلا کر ہنس پڑی، حفیظ کھسیانا سا ہو گیا۔۔ "تم ڈر رہے ہو؟ [illegible]"۔۔۔ منور نے پرے سرکتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

اتنے میں ایک میم اور صاحب کا جوڑا، بانہوں میں بانہیں ڈالے، بہکے بہکے قدم رکھتا ہوا بنچ سے کچھ فاصلہ پر رک گیا، "سکاچ اور تمہارے بغیر میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا"۔ صاحب نے تیز سانسوں کو مجتمع کر کے ڈرامائی انداز میں کہا اور پھر اس کا ایک ہاتھ میم کے جھٹکے سے دوں

بازوؤں پر رینگتا ہوا، نکلس کے قریب پہنچ کر رک گیا

حفیظ کو یک بیک محسوس ہوا کہ لعل و گہر کے بے بہا خزینوں کو لوٹ لینے کے بعد اس کے ہاتھوں میں نئی قوت عود کر آئی ہے۔ "منور ...!" حفیظ نے منور کی ساڑی کے پلو کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"شاید تم بدل گئے ہو" منور بولی۔ "جب ہم پان کے کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے تو کسی [illegible] ملتا تھا"... منور نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "[illegible] ہے؟ [illegible] ہیں، تو پھر کیا ہوا؟ یہ ہم اب ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی نہیں [illegible]"... منور کے [illegible] گفتگو میں محبت تھی، معصومیت تھی، خلوص کی مہک تھی

جیسے [illegible] نے حفیظ کے شانے پکڑ کر اسے زور سے جھنجھوڑ دیا۔ اس کے دل کا اضطراب آناً فاناً کافور ہو گیا۔ "منور! آج میں بہت خوش ہوں"۔ وہ دفعتاً پکار اٹھا۔ "اور [illegible] رہے ہو"؟ منور نے پھر قریب سرکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، اب میں صرف خوش ہوں..." حفیظ نے پہلی مرتبہ جوان منور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا... ان دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کالی اور [illegible] حسین وادیاں مسکرا رہی تھیں۔

ڈانس ٹیبل سے نمبر تین کا نعرہ بلند ہو کر رمبا ناچ کی شورشوں میں گم ہو گیا۔ بال روم میں انسانی خون تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ قدموں میں لغزشیں آنے لگی تھیں۔ ذہنیں آداب محفل کی قیدوں سے آزاد ہوتی جا رہی تھیں۔

"جینا تو یہ لوگ جانتے ہیں"... حفیظ نے ناچنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، یوں کہو کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا جانتے ہیں..." منور نے بنچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے"؟ حفیظ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ان میں شاید ہی کوئی خوش ہو" منور نے آہستہ سے کہا، جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو... "میری ہی مثال لے لو، میں امیر ہوں، لیکن مجھ سا غریب کوئی نہیں"... منور داہنے ہاتھ کو پیشانی پر رکھے یوں بول رہی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ حفیظ سوچنے لگا کہ منور کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔ کلب کی پرکیف زندگی، موٹرکاریں، شاندار بنگلے، رمبا ناچ، ننگے سڈول بازوؤں پر رینگتے ہوئے ہاتھ، اگر یہ لوگ بھی خوش نہیں تو کون خوش ہے؟

"شاید اس دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں اور اگر خوش ہے تو وہ خوشی کی حقیقت سے واقف نہیں"۔۔۔ منور نے رُک رُک کر کہا۔

یکایک جیسے فضا میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا اور کلب کی تیزی سے دوڑتی ہوئی زندگی نے ایک جھپکی سی لے لی۔ حفیظ کا ہاتھ اس کے پرانے کوٹ کی جیب میں سکے ٹٹولنے لگا۔ ایک، دو، تین۔۔۔ اٹھنی، چونی، دونی۔۔۔ اسی میں کل کا ناشتہ اور دن کا کھانا۔۔۔ اتنے میں پیچھے والا صاحب ایک دوسری میم کی بغل میں ہاتھ ڈالے لڑکھڑاتا ہوا بھر بیچ سے بچ نکلتے پر [illegible] رک گیا۔۔۔ "سکاچ اور تمہارے بغیر میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا"۔۔۔ اس نے تمام حواسوں کو مجتمع کر کے ڈرامائی انداز میں کہا اور پھر اس کا ایک ہاتھ میم کے ننگے شانوں پر رینگتا ہوا اس کے سنہری بالوں سے کھیلنے لگا۔

"حفیظا! تمہیں یاد ہو گا"۔۔۔ منور بولی۔ "جب میں سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر گایا کرتی تھی تو تم چپ چاپ بیٹھے سنا کرتے تھے۔ تمہارے ہونٹوں پر جنبش تک نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ جب تم بولتے تھے تو میں گانا بند کر دیتی تھی۔ چپ سادھنا شاید تمہاری عادت ہو گئی ہے، مگر آج میں گا تو نہیں رہی ہوں"۔

"تمہاری باتوں میں بھی میرے لئے گیتوں کا رس ہے"۔ حفیظ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہ جانے کیوں"۔۔۔ منور نے بھرائی ہوئی آواز سے کچھ کہنا چاہا۔۔ حفیظ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"میں صرف تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں"۔۔۔ منور نے بے حد دردانگیز آواز میں کہا۔

"کیا"؟۔۔۔ حفیظ گھبرا گیا۔

"میری زندگی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چکر کاٹ رہی ہے"۔۔۔ منور نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "مجھے ہر روز وقت پر ناشتہ کرنا ہوتا ہے، دن کے ٹھیک ایک بجے لنچ، ٹھیک چار بجے شام کی چائے۔۔۔ ٹھیک نو بجے رات کا کھانا اور پھر ایک معین وقت پر نپا تلا ٹھنڈا مکینیکل خاوند کا پیار، برتھ ڈے پر پھولوں کے ساتھ قیمتی تحفے، ہر عید پر ایک جڑاؤ زیور"۔

"منور!"۔۔۔ ایک آواز آئی، مسٹر جمیل سامنے کھڑے رسٹ واچ کی سوئیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ "ہمیں پندرہ منٹ میں گھر پہنچ جانا چاہیے"۔ جمیل صاحب نے کہا۔

لوگ بار سے جھومتے جھامتے باہر نکل رہے تھے۔ بال روم میں ایک عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈانس ٹیبل برآمدے سے ہٹائی جا چکی تھی۔ تمام مرد اور عورتیں کلب کی سیڑھیوں سے نیچے

اتر رہے تھے۔۔۔ مسٹر اور مسز جمیل خداحافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔ حفیظ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے سوچ رہا تھا کہ اتنی رونق، چہل پہل اور گہما گہمی کے ٹھیک بعد تیزی سے چھاتی ہوئی خاموشی کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے دو گورے گورے ہاتھ تنوری روٹی اور شامی کباب تھامے رقص کرنے [illegible] ایک سانولی حسینہ مرغ پیش کرتی نظر آئی۔

کاش! [illegible] بھی [illegible] کالی پور پہنچ سکتا اور وہاں کی مسکراتی ہوئی وادیوں کو منور کی دکھ بھری داستان سنا سکتا۔۔۔!

سنبھالا

صالحہ عابد حسین

سارے گھر میں بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مریضہ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر معائنے میں مشغول تھے۔ موہنی کا شوہر پرتاب اور اس کا بھائی کمرے سے باہر تھے۔ ان کی جٹھانی سرسوتی برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موہنی کی تیرہ سالہ بچی سونی اور [illegible] سال کا لڑکا پریم کمرے کے باہر دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے اور ہاتھوں سے اشارے کرتے۔ ان کے چہروں سے رنج و غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔۔۔ موہنی کا محبوب کتا ہیرا بھی ایک طرف خاموش اور اداس سا بیٹھا تھا۔ گویا وہ بھی آنے والے افسوسناک حادثہ سے سہما ہوا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرنل شہاب سر جھکائے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے نرس اور دو تین اور ڈاکٹر بھی باہر آئے۔ پریم اور سونی ایک ساتھ دوڑے اور ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سونی نے بے قراری سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب بتایئے ممی کو ہوش آیا" اب وہ کیسی ہیں؟ اچھی ہو جائیں گی نا؟ بولئے ڈاکٹر صاحب ایشور کے لئے کچھ تو کہیئے''۔ پریم نے منہ سے کچھ نہ کہا مگر آنکھوں آنکھوں میں سینکڑوں سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر نے محبت اور افسوس بھری نگاہ سے دونوں بچوں کو دیکھا اور سونی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر صرف اتنا کہا ''گھبراؤ نہیں اللہ پہ بھروسہ رکھو''۔

موہن نے بیوی کو اشارہ کیا اور وہ سونی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ پرتاب نے دوسرے ڈاکٹروں کو فیس دے کر رخصت کیا اور ڈاکٹر شہاب، موہن اور پریم چاروں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر موہن نے اس خاموشی کو توڑا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

سوہن۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا رائے قائم کی، سوشی بچ جائے گی؟

ڈاکٹر مسٹر سوہن آپ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ آٹھ دن سے بالکل بے ہوش ہیں۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے۔ طاقت کی دوائیں اور انجکشن سب اب تک بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

پرتاب ڈاکٹر! کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟

ڈاکٹر پرتاب اگر تم صاف صاف پوچھتے ہو تو سچ یہ ہے کہ مسز پرتاب کا بچنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ (ڈاکٹر پریم کو دیکھ کر) لیکن اگر انہیں ہوش آ گیا تو دوا ضرور اثر کرے گی۔ تم ذرا شرف سے کہو سب اٹھ جائیں (کچھ دیر بعد) پرتاب مجھے تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنا ہیں۔

سوہن اور پریم اٹھ کر باہر چلے گئے۔ پرتاب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

پرتاب: کیوں شہاب کیا واقعی اب میری بیوی نہیں بچ سکتی؟

ڈاکٹر: خدا میں بڑی طاقت ہے، لیکن میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اب مسز پرتاب نہیں بچیں گی۔

پرتاب شہاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کچھ تو کرو۔ آپریشن! کیا آپریشن کرنے سے زندگی کی امید ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر آپریشن بالکل فضول ہے وہ پہلے ہی شدید تکلیف اٹھا رہی ہیں۔ میں انہیں اور زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ ان کا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ آپریشن تو بڑی چیز ہے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

پرتاب افسوس

ڈاکٹر پرتاب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مسز پرتاب کی بیماری کا سبب تم اور صرف تم ہو۔ اگر وہ مر گئیں تو ان کا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔

پرتاب: (خفگی سے) شہاب یہ کیا بک رہے ہو؟ میں ان کی بیماری کا سبب کیسے ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر: مجھ سے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں بیس برس سے تمہیں اور انہیں جانتا ہوں۔ تمہارا دوست ہوں اور تمہارے خانگی حالات سے پوری طرح واقف۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب تم نے پہلی مرتبہ اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ مسز پرتاب اس وقت سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوں گی۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے کہ میں انہیں دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ کیسا بے

مثل حسن تھا اور پھر کتنی نیک اور بھولی طبیعت، لیکن تم نے انہیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ پہلے انہیں سوسائٹی سے روشناس کرایا۔ ہر اچھی بری محفل میں زبردستی لے گئے۔ پھر کم ظرف اور ذلیل طینت دوستوں تک سے ان کی ملاقات کرائی۔ اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے تم نے انہیں تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا۔ شراب جیسی مذموم چیز اور مہلک زہر کی تمہیں نے زبردستی لت لگائی۔ ان کے حمل دواؤں سے ضائع کرائے جس کی وجہ سے ان کی صحت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی اور پھر خود ہی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ خود بری صحبت میں پڑ گئے اور ان پر الزام رکھے۔ ان پر بے جا تہمتیں لگائیں اور ہر طرح ان کے نازک دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ شراب پینے لگیں۔ اور تم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس عادت کو جو خود تمہاری ہی ڈالی ہوئی تھی، آہستہ آہستہ چھڑاتے، اس کی پروا بھی نہ کی۔ بجائے دلجوئی کے دل آزاری سے کام لیا۔ نتیجہ جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ شراب کی کثرت اور دلی رنج و غم نے ان کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ ان کے قویٰ غیر معمولی طور پر اچھے تھے جو وہ اتنے سال بھی یہ سب جھیل گئیں۔ دوسری عورت دو چار سال بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ پرتاب! سوہنی کی غلطیوں کا کفارہ تو ان کی بیماریوں نے کر دیا مگر تم خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

پرتاب سر جھکائے ڈاکٹر کی لعن طعن سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ آنکھیں غیر معمولی انہماک سے ایک طرف جمی ہوئی تھیں اور گزشتہ بیس سالہ زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح اس کے دماغ کے پردوں پر ابھر رہے تھے۔

نرم و گداز بستر پر سوہنی بے سدھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا سرخ و سفید رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو کبھی چشم آہو کو شرماتی تھیں، گہرے گہرے گڑھوں اور سیاہ حلقوں سے گھری ہوئی ہیں، لمبے لمبے سیاہ بال ماتھے اور تکیے پر پریشان ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اور پاؤں جو موزونیت میں بے مثل تھے اب سوج کر ڈبل روٹی کی طرح ہو رہے ہیں اور شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر بھی ورم ہے۔ باقی تمام جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے پہلی نظر میں دیکھنے والے کا دل کانپ اٹھتا ہے اور وہ ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھال اور ہڈیوں کا یہ پنجر کبھی حسن اور موزونیت کا مکمل نمونہ ہو گا۔ اس کی صورت "آثار پدید است صنادید عجم را" کا عبرتناک مرقع ہے۔

پریم اور سوہنی ماں کے پلنگ کے پاس تصویر کی طرح خاموش بیٹھے اس کی صورت ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک طرف سرسوتی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہن بے چینی سے کمرے

میں ٹہل رہا ہے۔ موہنی کے سرہانے نرس ہاتھ میں انجکشن کی خالی پچکاری لئے کھڑی ہے۔ ڈاکٹر شہاب موہنی کی سوکھی اور زرد کلائی اپنے مضبوط اور طاقتور ہاتھ میں تھامے نبض پر انگلیاں رکھے اس کی طرف جھکا ہوا کھڑا ہے --- ایک منٹ --- دو --- تین --- چار --- پانچ --- دس --- بیس --- منٹ گذر گئے۔ کمرے میں ہر شخص کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں۔ آخر ڈاکٹر نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ موہن کی طرف دیکھ کر "مسٹر موہن! مسز پرتاب کی نبض اب بہتر حالت میں ہے۔ تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آ جائے گا"۔

موہن اور پریم کے چہرے کھل گئے۔ "سچ ڈاکٹر صاحب"؟

"ہاں بیٹا ٹھیک ہے"۔

بیس پچیس منٹ اور گذر گئے۔ موہنی کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے منہ پر انگلی رکھ کر کمرے کے بے چین لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستہ آہستہ موہنی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بچوں پر جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ لب ہلے --- بہت خفیف سی جنبش ہوئی --- کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہا ہے --- ڈاکٹر نے اپنا کان اس کے لبوں کو لگا دیا۔ "موہن --- پریم --- بلاؤ"۔

ڈاکٹر شہاب نے دونوں بچوں کو، جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے ضبط گریہ کی انتہائی کوشش کر رہے تھے، اشارہ کیا۔۔ وہ جلدی سے ماں کے قریب آئے۔ موہنی کی آنکھوں سے دو قطرے ادھر ادھر گرے، کمزور آواز نکلی: "میرے بچے"۔

دونوں نے اپنے سر ماں کے سینے پر جھکا دیئے۔ آنکھوں سے دریا امنڈ آیا۔ ماں نے اپنا ہاتھ بڑی کوشش سے اٹھا کر بچوں کے سر پر رکھا۔

کچھ دیر یونہی گزری۔ یکایک موہنی نے نسبتاً بلند آواز سے کہا: "پریم --- سوہن بھیا کو --- تار دے کر --- بلا دو"۔ موہن بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "موہنی، موہنی، میری پیاری بہن، میں تمہارے پاس موجود ہوں"۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فرطِ گریہ سے آواز رُک گئی۔ موہنی نے بھائی کی طرف نظریں پھیریں۔ چہرے پر کچھ آثار زندگی ہویدا ہوئے رُک رُک کر بولی۔ "بھیا تم آ گئے ہاں اب میں اطمینان سے مروں گی"۔ ڈاکٹر نے اتنے میں دوسرا انجکشن تیار کر لیا تھا وہ موہنی کے بازو میں لگایا اور سب سے کہا "آپ لوگ باہر جایئے، ان کو آرام کرنے دیجئے۔ اب بے ہوشی نہ ہو گی بلکہ نیند آئے گی"۔ نرس نے پردے گرا دیئے۔ موہنی نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر نکل کر دونوں بہن بھائی ڈاکٹر شہاب سے لپٹ گئے۔ "ڈاکٹر صاحب [illegible] صاحب، ممی اب اچھی ہو گئیں؟ اب کوئی خطرہ تو باقی نہیں؟" "شکر ہے ہماری دعائیں [illegible] ہیں۔" خوشی سے مارے پورے جملے ان کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ موہن نے بھی سوالیہ نظروں سے [illegible] کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا۔ "میں سمجھتا ہوں خطرہ اس وقت [illegible]" سوشی نے پریم کا ہاتھ پکڑا۔ "آؤ بھیا پاپا کو فون کر کے خوشخبری سنائیں۔" دونوں خوشی سے ناچتے ہوئے چلے۔ پیچھے پیچھے سوشی کا کتا ہیرا دم ہلا ہلا کر اظہار خوشی کرتا ہوا جا رہا تھا

آج سوشی کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہیں [illegible] اور تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔ اس کے ملنے والے اور دوست ڈاکٹر کی اجازت سے [illegible] کے لئے اس کے پاس آ کر مزاج پرسی کر جاتے ہیں۔ وہ مسکرا کر ان سے [illegible] ہے۔ سارا گھر خوش خرم ہے کہ وہ اب اچھی ہو رہی ہے

جب سب ملنے والے جا چکے تو سوشی نے بھائی کو بلا کر کہا "بھیا میرے [illegible] اور بھابی کو بلا لو۔ آج میں تم سب سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔" موہن نے [illegible] شہاب کی طرف دیکھا جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی اپنی مریضہ کو دیکھنے آئے تھے۔ "ایسا نہ ہو کمزوری ہو جائے"۔ سوشی نے آزردگی سے کہا "کچھ ہو مجھے آج ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے"۔ ڈاکٹر شہاب نے کہا۔ "آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں" اب آپ روبصحت ہیں مگر آپ کی مکمل صحت کے لئے سب سے لازمی چیز یہ ہے کہ آپ خود ہمت اور پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر دل میں یہ بات جما لیں کہ میں ضرور اچھی ہو کر رہوں گی"۔

سوشی نے ڈاکٹر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ مجھے۔۔۔ مریض کو دھوکا دیتے ہیں۔۔۔ مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے میں اچھی ہوں گی یا نہیں۔۔۔ یہ صحت نہیں سنبھالا ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ کر کہیئے کہ میری حالت اچھا ہونے کی ہے؟" ڈاکٹر شہاب نے سر جھکا لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔

موہن، سوشی، پریم اور سرسوتی کو بلا لایا۔ چند منٹ بعد پرتاب بھی کمرے میں داخل ہوا اور سوشی کی مزاج پرسی کی۔ سوشی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد موہن سے بولی۔ "تم سب میرے قریب آ جاؤ تا کہ میری آواز اچھی طرح سن سکو۔ ڈاکٹر صاحب آپ بیٹھے رہیئے۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔ ہاں سسٹر (نرس) تم کچھ دیر کو باہر چلی جاؤ"۔ نرس باہر چلی گئی باقی سب لوگ آ کر سوشی کے پلنگ کے قریب بیٹھ گئے، صرف پرتاب

در سے بہت پر آرام کرسی پر پڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ڈاکٹر نے اشارہ کا مرق سوتی کو پلایا اور سوتی آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی۔

"جانتے ہو میں نے تم سب لوگوں کو کیا کہنے کو بلایا ہے؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ وصیت کروں گی۔ نہیں مجھے کوئی وصیت نہیں کرنی۔ میں تو تم لوگوں کو اپنی دردبھری مصیبت کی کہانی سنا کر دل ہلکا کروں گی۔ دنیا ہمیشہ اس دھوکے میں رہی کہ میں بڑی خوش نصیب ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ خوبصورت ہوں، بال بچے والی ہوں، گھر میں روپیہ پیسہ کی ریل پیل ہے۔ نام، عزت، دولت، حسن کیا چیز تھی جو میرے گھر میں نہ تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی کی خوش نصیبی ہے کہ میاں کو لکھوں اور بیسیوں سے ایک لمحہ میں ڈپٹی کلیکٹر بنا دیا۔ مگر یہ خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے! مگر آہ کسی کو کیا معلوم، کوئی کیا جانے کہ اس عزت اور دولت کے حصول کی خاطر ایک غریب شریف لڑکی کی شرافت کا خون کیا گیا، اس کے ارمان اور آرزوؤں، اس کی محبت اور سکون قلب، اس کی صحت اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خون کیا گیا ہے۔ کاش ---- کاش مجھے یہ بناوٹی عزت، یہ منحوس دولت نصیب نہ ہوتی ---- کاش میں ہمیشہ ایک غریب دوردیس کی بیوی رہتی۔ ہائے کیا اچھے دن تھے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں قدم رکھا تھا، بھیا آپ کو تو یاد ہو گا اس وقت میری عمر کیا ہو گی؟"

"چودہ یا پندرہ برس کی"۔

"تو بھیا پھر آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ شادی کے بعد تین چار سال میں نے کس قدر خوشی اور اطمینان سے گذارے! یہ (پرتاب کی طرف اشارہ کر کے) جو اب میری صورت سے بیزار ہیں۔ اس وقت پروانہ وار مجھ پر نثار تھے۔ میری ہر خواہش پوری ہوتی، دن رات میری دلداری اور دلجوئی کی جاتی۔ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجا جاتا تھا.... آہ میں اس وقت انہیں ایک فرشتہ سمجھتی تھی۔... دنیا کا بہترین انسان تصور کرتی تھی۔ دیوتا جانتی تھی۔--- مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اس ملمع کے نیچے کھوٹی چاندی بھی نہیں۔ سیاہ لوہے کا ٹکڑا ہے۔-- ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوتا کے بھیس میں شیطان ہے"

پریم اور سوہن نے حیرت اور خوف سے ماں باپ کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سرسوتی نے پرتاب پر جو خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا، نفرت کی نظر ڈالی۔ موہن نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملائمت سے کہا "سوتی میری جان ذرا شانتی سے کام لو۔ سوتی نے آنسو بھری آنکھیں بھائی کی طرف اٹھائیں، بھیا سولہ سترہ برس سے میں یہ سب مصیبتیں سہہ رہی ہوں اور کبھی کسی کے سامنے اف نہیں کی۔ کون سا الزام انہوں نے مجھ پر نہیں لگایا۔ کیا کچھ جسمانی

تکلیف اور روحانی اذیت میں نے نہیں اٹھائی؟ پر اپنا حال لوگوں پر کھلنے نہ دیا۔ حتیٰ کہ اپنے میکے والوں پر کبھی اپنے مصائب کا اظہار نہ کیا۔ کیا اب آخری وقت میں بھی تم میرے دل کی بھڑاس نہ نکالنے دو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ساری دنیا کی طرح میرے بھائی بہن اور میری اولاد بھی مجھے مجرم، گنہگار اور سیاہ کار سمجھیں۔ میں گنہگار ضرور ہوں، بہت ہوں مگر اتنی نہیں جتنی دنیا نے اور اس شخص نے مجھے مشہور کر رکھا ہے"۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی جب پریم بیٹا تم پیدا ہوئے۔ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میں سچ مچ اپنے کو دنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی۔ تھوڑے دن بعد پرتاب نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کا ایک افسر جو ان پر بہت مہربان تھا۔ انجینیر ہو کر اس شہر میں آیا۔ پرتاب کو امید تھی کہ اگر یہاں ٹھیکیداری لی جائے تو انجینیر صاحب کی عنایت سے خوب چلے گی۔ کچھ روپیہ ہم لوگوں نے کئی سال میں جوڑا تھا، کچھ میرا زیور بیچ کر فراہم کیا۔ افسروں کی سرپرستی سے انہیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ وہ ہمارے گھر میں دولت کی گنگا بہہ گئی۔ سارا خاندان خوش تھا، دوست احباب خوش تھے، یہ خوش تھے اور خود میں بہت خوش تھی۔۔ آہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اس پر عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ دولت کے ساتھ ساتھ حیثیت بھی بڑھی اور ہم اونچی سوسائٹی میں آنے جانے لگے۔ تعلیم یافتہ فیشن ایبل عورتوں کے سامنے میں بالکل جاہل گنوار اور بے وقوف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ان عورتوں کی عادتیں اور طریقے ناپسند تھے۔ دل میں ان سے نفرت کرتی تھی مگر جب ان کے سامنے جاتی تو اپنے کو کچھ کمتر اور ذلیل سا محسوس کرتی۔۔ پرتاب نے مجھے انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا اور ایک میم خاص اس لئے رکھی کہ مجھے موجودہ تہذیب اور آداب و معاشرت اور "ہائی سوسائٹی" کے "ایٹیکیٹس" کی تعلیم دے۔ بہت جلد یہ سب باتیں میں نے سیکھ لیں۔

ہم لوگ خوب سیر تماشوں میں مصروف رہتے۔ کبھی سینما، کبھی تھیٹر، کبھی پک نک اور دعوتیں، کبھی بال روم میں جا کر تماشا دیکھنا، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنے خاص خاص دوستوں سے میری ملاقات بھی کرا دی تھی۔ جنہوں نے مجھ سے بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ رفتہ رفتہ میں سوسائٹی میں روشناس ہو گئی، ہر جگہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی دعوتوں اور تقریبوں میں سب سے پہلے میرا بلاوا آتا۔۔۔ ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ مجھے ملتا، پارٹیوں میں مرکز نگاہ میں ہی ہوتی۔۔۔ ہر روز کہیں نہ کہیں آنے جانے دعوت وغیرہ کا پروگرام بنایا جاتا۔ میری گھریلو زندگی روز بروز ختم ہونے لگی۔ اور میں اپنے گھر سے بیگانہ ہوتی گئی۔۔۔ گھر

کا انتظام اور خرچ باورچی اور بیرے وغیرہ کے ہاتھ میں تھا۔ جن عورتوں سے میں نفرت کرتی تھی اب خود بھی ان کے رنگ میں رنگی جا رہی تھی۔

دو تین سال بعد سوئی، تم پیدا ہوئیں۔ کئی مہینے بیماری کے سبب مجھے بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ اس زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ پرتاب میری بیماری سے پریشان نہیں بلکہ بیزار سے ہیں۔ دراصل گذشتہ کئی سال بودوباش اس قدر مصروفیت اور کھیل تماشوں میں بسر ہوئے تھے کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے یا پرتاب کے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں، بچی روئی تو خفا ہوئے کہ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کر لیا اور کہا آج کل یہی فیشن ہے کہ میاں بیوی کا بیڈروم بھی الگ الگ ہو۔ یہ پہلا صدمہ تھا جو مجھے پہنچا مگر میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ بچوں کے لئے آیائیں اور گورنس رکھ دی گئی اور مجھے حکم ملا کہ ان کے کمرے بھی الگ کر دو۔ خیر چند مہینے بعد میں اچھی ہو گئی۔ کچھ دن بعد ایک پارٹی میں چیف انجینئر صاحب نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا، پرتاب کا اصرار تھا کہ ضرور جاؤ۔ بہرحال میں گئی، میں اس شخص کی دوستی سے بچنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا وہ میری حد سے زیادہ تعریف اور بے حد خاطر مدارات کرتا اور ان کی طرف رخ بھی نہ کرتا۔ یہ چیز مجھے کھٹکتی تھی اور ناگوار گزرتی تھی مگر پرتاب اس کی بہت تعریف کرتے اور اس سے تعلقات بڑھانے پر زور دیتے، کیوں؟ تاکہ ان کا فائدہ ہو۔ اور انہیں اور زیادہ بڑے بڑے ٹھیکے ملیں۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں پرتاب کی لئے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا کہ یہ شخص اس قدر بے غیرت اور خودغرض ہے کہ غیرلوگوں سے بیوی کی دوستی کراتا ہے، اس لئے نہیں کہ ان سے کوئی عقیدت ہے یا ان کے اخلاق و عادات سے بہت متاثر ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اور زیادہ دولت سمیٹ سکے۔ اسے جائز یا ناجائز ہر طریقے سے لاکھوں کے ٹھیکے ملیں۔ خواہ اس کے لئے بیوی کو بدچلن مردوں سے دوستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ سوتی نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ موہن نے تھوڑا سا انگور کا عرق اسے پلایا اور زائد تکئے ہٹا کر آرام سے لٹا دیا۔

ان کی دولت روز بروز بڑھنے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی بدلتی گئی۔ راتوں کو غائب رہتے۔ مجھ سے بے اعتنائی برتتے۔ مزاج میں بھی سختی آ گئی تھی صرف سوشل موقعوں پر مجھ سے اظہارِ محبت اور خصوصیت ظاہر کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ان سے بالکل متنفر کر دیا۔ ڈاکٹر آپ تو جانتے ہیں وہ واقعہ کیا تھا؟ نہیں میں خود بتاتی ہوں۔ انہوں نے ایک بے تکلف پارٹی میں مجھے جبراً شراب پلائی، میں اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گی۔۔۔

مجھ میں اتنی طاقت اور برداشت نہیں۔۔۔ انہیں اس زمانے میں کسی بات کی بھی فکر تھی
اور انہوں نے اپنے خیال میں چیف انجینئر کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ اس دن سے
ہمارے تعلقات اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ یہ روز بروز آزاد اور بےپرواہ ہوتے گئے۔ میں نے
ایک مرتبہ شکایت کی تو مجھے سخت سست کہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ پر بہت شرمناک الزام
لگایا۔ میں غصے میں آپے سے باہر ہو گئی اور برس پڑی۔ انہوں نے بھی مجھے نہیں چھوڑا
مارنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ اس کے بعد سے مجھے ان کی صورت سے بھی نفرت ہو گئی۔
انہوں نے مجھ پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کر دی۔ صرف ان پارٹیوں اور جلسوں میں جانے کی
اجازت تھی جس میں یہ خود بھی جائیں۔ یہی حال تھیٹر اور سینما وغیرہ کا تھا۔ اگر کبھی ملنے
والی عورتوں سے یا عزیزوں سے بھی ملاقات کرنے جاتی تو دو تین نوکر خفیہ پولیس کی طرح میری
نگرانی کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ دفتر سے دس مرتبہ فون آتا کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں۔ میری
ذلت کی انتہا ہو چکی تھی۔ دن رات کی کوفت اور روحانی اذیت نے میری صحت برباد کر دی اور
اس پر طرہ یہ ہوا، مجھے کہتے بھی لاج آتی ہے۔۔۔ ڈاکٹر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں! جب کبھی
بچہ ہونے والا ہوتا زبردستی دوائیں پلا کر اور انجکشن لگوا کر اسے ضائع کر دیا جاتا۔ اس طرح پانچ
مرتبہ ہوا۔ صحت اور بھی بدتر ہو گئی۔ شراب کی لت تو یہ لگا ہی چکے تھے۔ اب میں اپنا غم غلط
کرنے کو باقاعدہ شراب پینے لگی۔ اگرچہ یہ خود بھی پیتے تھے۔ اور خود ہی اس منحوس شے کو مجھے
زبردستی کر کر کے پلایا کرتے تھے۔ مگر پھر اس پر بھی ملامت اور طعن کرنے لگے۔ میں ضد
میں آ کر اور زیادہ پیتی۔ مجھے اندر ہی اندر یہ گھن کھائے جاتا کہ اس شخص نے جسے میں اپنا
دین، اپنا ایمان، اپنی جان، اپنا دیوتا، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اس نے میری غیرت پر، میری
وفاداری پر شک کیا اور مجھ پر اتنا بڑا شرمناک الزام لگایا"۔

موہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرتاب جو اب تک بالکل خاموش بیٹھا تھا آگے بڑھا
اور موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "موہنی۔۔۔ آج مجھے سچ سچ بتا دو کیا میں غلطی پر تھا
اور میری بدگمانی بالکل بے بنیاد تھی۔۔۔ یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی"۔ موہنی نے بے باکی سے
پرتاب کی نظروں کا مقابلہ کیا۔ "میں آخری وقت میں جب کہ پرمیشور کے سامنے جانے کو
تیار ہوں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گی۔۔۔ تم نے مجھ ناسمجھ کم عمر لڑکی کو یہ آزادی کی راہ دکھائی اور
اپنی اس ذلیل سوسائٹی سے روشناس کرایا۔۔۔ میں کچی لکڑی تھی جس طرف جھکایا جھک گئی، بے
شک میں لوگوں سے ہنستی بولتی تھی۔ مذاق دل لگی کرتی تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب
لوگ میرے حسن و جمال کی تعریفیں کرتے تو مجبور کرنے پر ڈانس بھی کیا۔۔۔ لیکن پھر بھی۔۔۔

میں پاک ۔ باعصمت ہوں۔ میں جھوٹ نہ بولوں گی۔ چیف انجینئر مجھ سے کثر اشاروں کنایوں میں اظہار الفت کرتا تھا مگر میں مذاق میں اڑا دیتی۔۔۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے صاف صاف اظہار محبت کیا۔ مگر میں نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی۔۔۔ اتنی غیرت دلائی۔۔۔ اس قدر شرمندہ کیا کہ وہ رونے لگا۔ مجھ سے معافی مانگی اور تب سے آج تک۔۔۔ اس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا۔ ہمیشہ محبت اور احترام کا برتاؤ کیا۔۔۔ بے شک وہ شریف آدمی ہے اور تم ۔۔۔ تم ۔۔۔ نہایت ذلیل ۔۔۔ کم ظرف۔۔۔ بدچلن۔۔۔ بدمعاش ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ ایشور کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔۔۔ تم نے خود بدکاریاں کیں اور اپنی ۔۔۔ بیوی پر الزام لگائے۔۔۔ تمام دنیا میں بدنام کیا۔۔۔ میرے بچوں کو مجھ سے جدا کر کے ۔۔۔ پاس بھیج دیا کہ وہ ماں کی بری عادتیں سیکھیں گے۔۔۔ ان تک کے سامنے مجھے ذلیل کیا۔۔۔ چپ ہو۔۔۔ یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔۔۔"

موہنی کا سر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پریم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سوہنی ہچکیوں سے روتی رہی۔ موہن کا چہرہ رنج اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی سرخ ہو جاتا کبھی زرد اور کبھی سفید۔ پرتاب تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہاب نے نرس کو بلایا، دونوں نے مل کر خدا جانے کیا کیا تدبیریں کیں۔ انجکشن دیئے دوائیں منہ میں ڈالیں تب کہیں گھنٹہ بھر بعد میں موہنی ہوش میں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریم اور سوہنی کو اشارے سے قریب بلایا اور گلے سے لگایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "میرے بچو۔۔۔ تمہاری ماں گنہگار ہے، تم اس کی مکتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے رہنا۔۔۔ اور ۔۔۔ اس کی ناکام و نامراد زندگی سے سبق لینا۔ دنیا کی جاہ و منزلت۔۔۔ عزت اور دولت کی خواہش سے کبھی مغلوب نہ ہونا۔۔۔ ہمیشہ اپنی ماں اور باپ کی ناکام زندگی کی مثال پیش نظر رکھنا۔ سچی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ سچی محبت اور اعتبار سے، قناعت اور خدمت خلق سے حاصل ہوتی ہے"۔ اس کی آواز ڈوبتی ہوئی جا رہی تھی۔ "بھیا میں بہت گنہگار ہوں۔۔۔ ایشور سے میرے لئے دعائیں کرتے رہنا۔۔۔ اور دیکھنا میرے بچوں کا خیال رکھنا۔۔۔ یہ بھی میری طرح تباہ نہ ہو جائیں"۔ موہن سے ضبط نہ ہو سکا۔ بہن کی پٹی پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ ڈاکٹر شہاب بہت پریشان، کبھی موہنی کی نبض دیکھتے، کبھی سانس کی رفتار گنتے، کبھی انجکشن دیتے اور پاؤں کے پاس گرم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ موہنی کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا اور اس پر ایک خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی۔۔۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ بہت نحیف آواز میں کہا۔ "پرتاب کو بلاؤ۔۔۔ میں آخری دفعہ انہیں دیکھنا چاہتی

ہوں"۔ سرسوتی جا کر چاچا کو بلا لائی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بال پریشان تھے۔
کمرے میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا جو کبھی کبھی سوہنی کی ہچکیوں سے ٹوٹ جاتا تھا
پرتاب نے جھک کر اپنا ہاتھ سوہنی کے ماتھے پر رکھا۔۔۔ اس کی آنکھیں بند تھیں پر لب ہل رہے
تھے۔۔۔ پرتاب نے اپنا کان اس کے لبوں سے ملا دیا۔۔۔ "میں نے ۔۔۔ معاف [illegible]۔۔۔ معاف
کر دیا۔۔۔ مجھے اب بھی ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اب بھی ان سے ۔۔۔ محبت [illegible] ہے۔۔۔ [illegible]
میرے گناہ ۔۔۔ بخش دے ۔۔۔ شاید"۔ پرتاب لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا اور ۔۔۔ [illegible]
چیخ اٹھا۔ "سوہنی۔۔۔ میری معصوم سوہنی۔ تم بے قصور ہو۔۔۔ تم ۔۔۔ [illegible] نے تم
پر بے جا شک کیا۔ خواہ مخواہ الزام دیا۔۔۔ میں گنہگار ہوں۔۔۔ سیہ کار ہوں۔ [illegible] تو
دیوی ہے۔۔۔" سوہنی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں [illegible] اس
وقت بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں [illegible] ان میں سے موت جھانک رہی تھی۔ [illegible] پرتاب
کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔۔۔ لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور ایک نامعلوم سی آواز منہ
سے نکلی۔ "اب میں شانتی سے مروں گی، ایشور ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ معاف۔۔۔"

ڈاکٹر نے ہلکے سے سوہنی کی کھلی ہوئی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر دیں جن سے
آنسوؤں کے دو قطرے ادھر ادھر ٹپک پڑے ۔۔۔ ڈاکٹر نے چادر سے سوہنی کا منہ ڈھک دیا اور اس
کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔۔۔ سارا گھر شور و آہ کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

ہڈی کا داغ

صدیقہ بیگم سیوہاروی

سچی بات تو یہ ہے کہ سید شرافت حسین نہ صرف نام سے شریف تھے بلکہ وہ طبعاً شریف النفس انسان تھے اور یہ بھی ایک طرح کی شرافت ہی تھی کہ بی راشدہ شادی کے آٹھویں دن سارے گھر کی مالکہ تھیں۔ یوں تو کہنے کو ساس سدیں بھی تھیں لیکن کچھ تو دبیں سے بیچاری بیمار تھیں۔ اس لیے ان کا ہر فرض حق بن چکا تھا اور وہ تو گویا بیٹھی تھیں بس دلہن کی نازبرداری کرنے کے لیے۔ پھر یہ بھی کہ ساری بیچاری سیدھی اور نیک ہونے کے ساتھ ساتھ بے زبان بھی تھیں۔ یہی بات ہے جوان کی ایک چپ سو کو ہراتی تھی۔ بی راشدہ کی نندیں سچ پوچھو تو ماں کے نقش قدم پہ چلتی تھیں اور یہی ان کی نہاں تھی جس نے شرافت حسین کو بھی متاثر کیا۔ بھلا جب ایسا ماحول ہو اور اس میں راشدہ جیسے لڑکی داخل ہو جائے تو گویا میدان صاف تھا۔ جہاں مقابلہ کرنے والا کوئی نہ ہو وہاں ہار جیت کا سوال ہی کیا ہے۔ ساس نے صندوقچی کی کنجی پہلے ہی بہو کے آگے ڈال دی تھی اور بہو کے لیے تو گویا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ور شرافت حسین اس معاملے میں چپ وہ اپنا الگ لئے دئے رہے جیسے گھر بار سے انہیں نہ پہلے واسطہ تھا نہ اب ہے۔ وہ بولتے تو کیا بولتے۔ ان کے لیے جو بھی ہوتا ٹھیک تھا۔

بہو کا یہ تیور ماں کو برا تو لگتا۔ لیکن شادی کے چوتھے سال ہی وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں اور اس روز روز کی داتا کلکل سے انہوں نے گویا اپنا پنڈا چھڑا لیا۔ اور یہی نہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی موت پہلے سے دیکھ لی اسی لیے انہوں نے اپنے جیتے جی دونوں لڑکیوں کو اپنے گھر بار کا کر دیا۔

اب بی راشدہ تھیں اور ان کا بڑا گھر۔ شرافت حسین گھر میں اس طرح رہتے کہ کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلتا کہ کون آیا کون گیا اور یہی وجہ ہے کہ بی راشدہ اور شرافت حسین کی ایسی نبھی کہ محلے کے پڑوسیوں کے لیے ایک مثال قائم ہو گئی۔

بیس سال کے اندر ان کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے۔ بڑی لڑکی ساجدہ کی شادی ہو گئی' شاہدہ ابھی کالج میں پڑھ رہی تھی اور چھوٹی نسرین ہوگی یہی کوئی چھ سات سال کی' اس نے بھی ابھی ابھی پڑھنا شروع کیا تھا فرحت حسین اور راحت حسین ساتویں اور آٹھویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔

جیسے خالد نے اس [illegible] سے ہی ہنڈیا اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ تھپڑ کی چوٹ بھی وہ شاید برداشت کر لیتی لیکن وہ خالد کی زبان سے صرف شاہی [illegible] تھی اور وہ پھر بھی مناتے ہوئے ذرا آہستہ سے کہتی "کیوں ناراض ہو گئے مجھ سے؟"

اور خالد بھی [illegible] سے، دونوں گالوں کو چٹکی سے دباتے ہوئے کہتا "تجھ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ پگلی شاہی بہن سے۔"

"نہیں [illegible] ناراض ہو" وہ ٹھنکنے لگتی [illegible] "ہوں [illegible] سوں [illegible] سچ سچ [illegible] بتا دو تا [illegible] آ [illegible]"

خالد [illegible] میں اس سے ایک عجیب و غریب چمک آ جاتی اور وہ اس بات کا جواب زبان کے بجائے آنکھوں ہی آنکھوں میں دے [illegible] اور شاہدہ کی یہی ادا تھیں جو بہت جلد خالد کو یقین ہو گیا کہ شاہدہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایک خلش تھی اور یہ خلش کبھی کبھی کانٹا بن کر اس کی رگوں میں چبھتی اور وہ اچھل پڑتا۔ وہ اس کی تصدیق کیسے کرے [illegible] شاہدہ کی زبان سے کیسے سنے۔

مہینوں وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا اور بالآخر اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس نے بار بار اس کا ریہرسل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیا نیا واکار ہے کہیں زبان سے لغزش نہ ہو جائے اور پھر زبان کا بھی تو بھروسہ نہیں کہیں عین وقت پر اس کا ساتھ نہ دے۔ کہیں وہ حلق میں ہی اٹک کر رہ جائے اور وہ شاہدہ کے سامنے شرمندہ ہو اور پھر اس کمرے میں شاہدہ کے فلک شگاف قہقہے کی گونج سنائی دے اور یہ قہقہہ جو پھر زندگی بھر خالد کا پیچھا کرتا رہے۔ اس کی زبان پھر زندگی بھر اس کے حسین جذبات کا ساتھ نہ دے سکے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب اس نے اور زیادہ غور سے سوچا تو یہ بہت معمولی سی بات معلوم ہوئی۔ تب بھی اس نے خوب اچھی طرح مشق کر لی اور وار کرنے کے لیے اپنے کو اچھی طرح تیار کر لیا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آج کی شکست زندگی بھر کی شکست ہو گی۔ آخر جب اس نے ہر طرح اطمینان کر لیا تو اس نے شاہدہ کے کان میں چپکے سے کہا "شاہدہ بی! مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے ذرا کمرے میں آ جاؤ۔" اس نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن اس کا رنگ فق ہو گیا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی اس کے لب کانپنے لگے اور وہ سوچنے لگا کہ ابھی اصل بات تو بہت دور ہے اور یہ تو تمہید بھی نہیں تھی۔ پھر جب ابھی سے یہ حال ہے تو آگے کا کیسے بھروسہ اور ابھی تو پورا پارٹ پڑا تھا۔ کون جانے! وہ کہہ بھی سکے گا یا نہیں اور اب تو اسے اپنے اوپر سے رہا سہا اعتماد بھی جاتا نظر آیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کا پاؤں کسی چٹان پر سے پھسل گیا ہے اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا آ رہا ہے اور شاہدہ کا یہ حال تھا کہ گویا کوئی آسمان کی بلندیوں پر سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہو کہ "شاہدہ بی! مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے ذرا کمرے میں آ جاؤ۔"

اس وقت تو یہ عالم تھا کہ شاہدہ کو ذرا سی دیر کے لیے بھی یہ خیال نہ ہوا کہ خالد نے شاہی کیوں نہ کہا۔ وہ گھبراہٹ میں اتنی ذرا سی بات پر ناراض ہونا بھی بھول گئی اور خالد کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ کمرے کے اندر جا کر اسے خیال آیا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اور محض اس جذبے کی وجہ سے وہ اپنے اندر ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے

قطرے نمودار ہو گئے۔ اس کا جی چاہا کہ الٹے پاؤں بھاگ جائے اور اس کا سانس چھوٹ گیا۔ اس سے بیٹھے پر بھی اتار چڑھاؤ
محسوس ہو رہا تھا اور ہرنی کی طرح اس کے دونوں کان کھڑے تھے۔ نہ جانے کون، پیچھا کہیں [illegible]
اس کو محسوس ہوا گویا چاروں طرف لوگ کھڑے ہوئے اس کو غور غور سے دیکھ رہے ہیں اور [illegible] کھڑی ہوئی کہہ رہی
ہیں۔ "اچھا یہ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہو رہی ہیں" اور ابا جان کی آنکھیں جن میں محبت اور شفقت [illegible]
نہ آیا تھا آج یہی آنکھیں اس کی طرف ابلی پڑی تھیں اور اس انکار [illegible] محلے پڑوس
کے لوگ دیکھ رہے تھے۔ وہ گھبرا گئی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا "ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا۔"

حالانکہ وہ اکثر خالد کے ساتھ اکیلی کمرے میں بیٹھی ہے اور گھنٹوں دونوں میں باتیں ہوتی رہی ہیں [illegible] مذاق ہوئے
لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ یہ محسوس کر رہی تھی گویا خالد کے ساتھ پہلی بار کمرے میں تنہا ہو۔

اور اب وہ دونوں کمرے میں تنہا تھے۔ دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ نہ خالد [illegible] دونوں میں پوچھنے
کی تاب تھی۔

خالد نے سوچا کہ اس وقت بات ٹالنی ہی چاہیے نہ جانے وہ گھبراہٹ میں کیا [illegible] اور پھر یہ بھی کہ
زندگی میں اسے یہ پہلا تجربہ تھا اور وہ اسے بھرپور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔

"شاہی بی! تمہارے پاس دو روپے ہوں گے؟ مجھے دے دو۔ ثمرائی سے نہ کہنا میں سینما جاؤں گا اور آج ذرا دیر
سے آؤں گا تم ہی اٹھ کر دروازہ کھولنا۔ جاگ جائیں گی کہ اتنی رات گئے تک کہاں رہے؟" خالد یہ ساری باتیں ایک سانس
میں کہہ گیا۔

یہ سن کر شاہدہ کو اطمینان ہوا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آندھی آ کر ختم ہو گئی ہو۔ فضا میں مکمل سناٹا چھا گیا گویا
سیلاب کا پانی اتر گیا۔ ہر طرف میدان ہی میدان ہے۔ شاہدہ نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور آنچل سے اپنے پسینے کے
قطرے پونچھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس نے سارے ماحول پر ایک بار پھر قابو پا لیا اور اب اس کی حکومت واپس
آ گئی۔ وہ پہلے کی شاہی بی ہو گئی اور اس نے اپنا امتحان لینے کے لیے خالد کے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "بس اتنی سی
بات تھی جس کے لیے مجھے یہاں تک لائے؟ وہیں کھڑے کھڑے کیوں نہ کہہ دیا۔ دو روپلی کے لیے۔ میں تو سمجھی تھی کہ نہ جانے
کیا بات ہو۔"

اور اس کے جواب میں خالد تڑپ کر کہا۔ "نہ جانے کیا بات ہوتی۔ تم سمجھی تھیں کہ عشق کرنے کے لیے لایا ہے۔"
اور یہ کہتے کہتے اس نے شاہدہ کے گالوں پر ایک ہلکا سا پیار کر دیا۔ "میری شاہی بی۔" اور شاہدہ مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی چلی گئی
اور ذرا سی دیر میں اس نے نسرین کے ذریعے دو روپے خالد کو بھجوا دیے اور خود اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔

خالد ایک عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ بات کیوں اور کیسے کہی۔ کبھی تو وہ
سے اپنی انتہائی کامیابی سمجھتا اور کبھی اپنی ہار۔ اور اسے اپنے اوپر غصہ آتا کہ اس نے کیوں انتظار نہ کیا۔ مگر وہ ذرا سا انتظار اور

کر لیتا تو شاید پھر شاہدہ اپنے منہ سے خود کہہ دیتی لیکن اس نے پہل کر کے سارا مزا کرکرا کر دیا اور دوسرے لمحے وہ اپنے اوپر غش غش کرتا کہ اس نے کس طرح پہلا وار خالی جانے نہ دیا اور شاہدہ پر بھرپور حملہ کیا۔

سینما جانے کا تو نہ ارادہ تھا اور نہ اس کا جی چاہ رہا تھا لیکن پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ اسے اس وقت چند گھنٹوں کے لیے گھر سے باہر چلے جانا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ذرا سی دیر میں چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

ادھر شاہدہ کا یہ حال کہ بظاہر وہ کمرے میں چپ چاپ لیٹی تھی۔ اس کے ذرا بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا دماغ بھکولے لے رہا تھا جیسے آج اس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ ایک بے نام خوشی تھی جو اس کے دل میں موجیں مار رہی تھی اسے اس میں ایک سنسنی سی محسوس ہو رہی تھی اور اس کسک سے بھی زیادہ احساس تو اسے اپنے گالوں پر تھا۔ جیسے خالد نے کوئی نشان چھوڑ دیا ہو۔ وہ تڑپتی ہوئی اٹھی اور لپک کر اس نے آئینہ اٹھا لیا۔ غور سے اپنے گالوں کو گھورتی رہی لیکن وہاں تو کوئی بھی نشان نہ تھا لیکن پھر بھی ایک احساس تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا گال دمک اٹھا ہو۔ اتنے میں نسرین نے آواز دی۔ "باجی! ذرا میرا قمیص تو کاٹ دینا۔"

یہ سن کر شاہدہ اور بھی گھبرا گئی۔ اس نے سوچا کہ باہر جاؤں تو کیسے جاؤں۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ سب کو معلوم ہو جائے گا۔ اس نے اپنا گال خوب اچھی طرح رومال سے رگڑا لیکن اس کے باوجود وہ کیفیت اپنی جگہ پر قائم رہی۔

شاہدہ لپک کر غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ اسے شک تو ہوا کہ جیسے کسی نے اس کا گال دیکھ لیا لیکن پھر غسل خانے سے اس نے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے جلدی جلدی صابن سے اپنا منہ رگڑ رگڑ کر دھویا۔ مگر وہ کیفیت اپنی جگہ پر قائم رہی۔ اب تو وہ اور پریشان ہو گئی۔ اس کو خالد پر غصہ آیا۔ "خواہ مخواہ کے لیے میری مصیبت کر دی۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔"

جب وہ غسل خانے سے نکلی تو منہ پونچھتی ہوئی اور چپ چاپ آنگن میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ گھر کا ایک ایک فرد اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا کتا ٹائیگر بھی تو اس کے گال کو گھورتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ شرما رہی تھی، لجا رہی تھی اور بار بار اس کا ہاتھ اپنے گال پر جاتا تھا اور وہ نوچ رہی تھی جیسے وہ نوچ نوچ کر اس نشان کو ختم کر دے گی۔ لیکن اس کے بار بار نوچنے اور رگڑنے سے واقعی اس کے گال پر ایک سرخ نشان پڑ گیا تھا۔ یوں بھی اس کا رنگ گورا تھا اس لیے یہ سرخی اور بھی جھلک رہی تھی۔ اب یہ نشان کافی نمایاں تھا اور وہ سوچنے لگی کہ اس کے گال کے گرد ایک گہرا سرخ حلقہ پڑ گیا تھا جو دمک رہا ہے۔ اس کو رہ رہ کر خالد پر غصہ آ رہا تھا لیکن پھر یہ غصہ خوشی کی ایک لہر میں تبدیل ہو جاتا۔ اس میں ان کا قصور بھی کیا تھا۔ انہوں نے تو صرف ہلکے سے پیار کیا تھا۔ وہ سوچ کر شرما گئی اور اس کا جی چاہا کہ اپنا منہ دوپٹے سے چھپا لے۔ پھر اسے اپنا تمتماتا ہوا گال یاد آ گیا۔ کم بخت گال ہی کا قصور ہے۔ آخر میں باجی کے منے کو کتنا پیار کرتی ہوں۔ اس کے گال تو کبھی نہیں تمتماتے اور نہ کبھی ان پر سرخ حلقہ پڑتا ہے۔ میرے ہی گال میں کم بخت۔ یہ کوئی بات ہے جو یہ خواہ مخواہ کے لیے یوں لال ہو رہے ہیں اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنے گال پر ہلکے سے ہاتھ پھیرا۔

اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نسرین نے کہا: "باجی! یہ تمہارے گال پر کیا ہو گیا؟ ذرا آئینہ تو دیکھو۔"

نسرین کے اس سوال سے وہ بالکل گھبرا گئی لیکن پھر اسے [illegible] "مچھر نے کاٹ لیا ہے۔ بڑی کھجلی اٹھ رہی تھی۔"

باجی کے بیٹے نے بھی سامنے آ کر غور سے دیکھا اور بولا۔ "خالہ امی نے [illegible] "اور یہی نہیں اس نے انگلیوں پر تھوک لگا کر اس کے گال پر [illegible] اور غور سے اپنی انگلی [illegible]

آناً فاناً شاہدہ نے بیٹے کے ایک چانٹا مارا۔ "بدتمیز کہیں کا۔" اور غسل خانے میں [illegible]

لیکن بعد میں اسے بے حد افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ بیٹے کو مارا اس لیے [illegible] سے زیادہ لال ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار تو یہ بھی سوچا کہ کہیں خالد نے [illegible] پیار کیا ہو۔ لیکن پھر اسے اپنے اس احمقانہ تصور پر خود ہی ہنسی آ گئی۔

منہ دھونے کے بعد جب وہ آئی تو اس نے یوں تو اپنے آپ کو کاموں میں الجھا دیا لیکن [illegible] کے ذہن سے نہ نکلا اور وہ کسی نہ کسی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا سوچتا اور غیر شعوری طور پر [illegible] چلا جاتا اور وہ شعلے کی طرح دمکتا ہوتا۔ اس نے سوچا کہ خالد کو شاید خیال بھی نہ ہو اور وہ [illegible]

تاہم مجموعی طور پر وہ خوش تھی۔ اس لیے کہ پہلی بار اسے یہ یقین ہوا تھا کہ خالد اس سے محبت کرتا ہے [illegible] پوچھو تو اسے خود بھی اپنی محبت کا یقین کمرے کے اندر جانے پر ہی ہوا تھا ورنہ اسے خیال بھی نہ تھا کہ وہ خالد سے اتنی محبت کرتی ہے۔

اس نے سوچا کہ وہ آج ضرور خالد کا انتظار کرے گی۔ چنانچہ کھانا کھانے کے بعد ہی سب اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ لیکن شاہدہ کو بھلا نیند آنے والی تھی! اسے تو آج جیسے بڑی ذمہ داری کا احساس تھا۔ زندگی میں پہلی بار رات جاگ کر خوشی ہو رہی تھی

شاہدہ چپ چاپ اٹھی اور الماری میں سے ایک ناول نکال لائی۔ لیکن ہو بھی اس وقت تو اس کی اپنی زندگی ناول کا ایک باب ہو رہی تھی۔ بھلا ناول سے کون دلچسپی لے۔ جس میں کوئی بات بھی تو سچی نہیں ہوتی۔ بس یوں ہی الٹی سیدھی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ بھلا کون اس طرح عشق کرتا ہے۔ "میرے پیارے میں تم پر اپنی جان نثار کر دوں گی۔ تیرے ایک بوسے کے لیے اپنی زندگی کے بہترین لمحات نذر کر دوں گی۔" عشق نہ ہوا مذاق ہو گیا۔ عشق کرنے کے لیے الفاظ تو ملتے نہیں، اتنے بڑے جملے کہاں مل سکتے ہیں بلا [illegible] اسے خیال آیا کہ کس طرح یہ کہتے ہوئے کہ "تم مجھے عشق کرنے کے [illegible]" خالد نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

اب اس کے سامنے اور مسئلہ تھا۔ اگر خالد نے کوئی بات کہہ دی تو وہ کیا کرے گی، [illegible] اگر کہیں اباجی کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا کہیں گے اور اماں اور ابا تو پھر بھی دور ہیں اگر کہیں نسرین نے بھی سن لیا تو جان کو آ جائے گی۔ میں اسے کیا سمجھاؤں گی۔ سچ مچ اچھی بھلی مصیبت کر لی۔ یہ بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا ہو گیا۔ مزے میں زندگی کٹ رہی تھی اب اللہ جانے کیا حشر ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود اسے زندگی میں پہلی بار جینے کا مزا آ رہا تھا۔ پہلی بار اسے دنیا میں کشش محسوس ہوئی تھی۔

اور یہ بوسہ۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا گال پھر تمتمانے لگا۔ یہ نقش تو اب دائمی ہو گیا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے رخسار کے اس حصے پر کوئی پھول کھل گیا ہو۔ اس نے چٹکی سے اس پھول کو مسلنے کی کوشش کی۔ اسے خالد کے ہونٹوں کا گداز محسوس ہو۔ اس کا جی چاہا کہ کاش خالد اس وقت آ کر پھر اپنے ہونٹ دوسرے گال پر بھی پیوست کر دے۔ اسے اپنے تمام جسم میں اینٹھن سی محسوس ہوئی۔ ایک لذت انگیز سی تھی جو اس کے جسم میں ہراری تھی اور سچ پوچھو تو اس کی زندگی کا بڑا انوکھا تجربہ تھا۔

وہ نہ جانے کتاب ہاتھ میں لیے کتنی دیر بیٹھی رہی۔ وہ کتاب پڑھ رہی تھی لیکن اس کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور اچانک اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اوہ دس بجے تھے۔ اب کون سا کھیل ہوگا جو ختم نہ ہو گیا ہو اور پھر یہ بھی کہ یہ بھی کوئی وقت ہے باہر گھومنے کا۔ سینما کی ابھی شو ختم نہیں ہوا ہوگا تو یہ کیا ضروری ہے کہ فلم اخیر تک دیکھی جائے۔ انجام تو آدھی فلم کے بعد ہی معلوم ہو جاتا ہے۔

شاہدہ نے انتظار سے تنگ آ کر اپنا منہ تکیے سے لگایا اور گھڑی کی طرف منہ کر لیا۔ گھڑی کی سوئی اپنی جگہ پر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت رک گیا ہے۔ لیکن اس خاموش فضا میں اس کی ٹک ٹک برابر سنائی دے رہی تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کے سینے کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بجلی کی روشنی کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے سینے کے تناؤ کو اور اس نے ایک کسک سی محسوس کی۔ وہی کسک جو خالد کے پیار کرتے وقت محسوس ہوئی تھی جب اس کا سینہ خالد کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

اب گھڑی میں دس بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ انتظار کی حد ہوتی ہے۔ اب وہ کتنی دیر انتظار کر سکتی ہے۔ ان کو اس وقت تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ اب اگر ابا ناراض ہوں تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ کتنا وقت خراب ہوا۔ بھلا سینما جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر آج خالد ٹھہر تا تو وہ اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لیتی۔ اس سے سب کچھ کہہ ڈالتی۔ لیکن اسے تعجب تو اس بات کا تھا کہ اس نے اتنا وقت خراب کیا۔ برسوں سے وہ خالد سے محبت کرتی تھی۔ اس کو کھلائے بغیر خود کھانا نہ کھاتی۔ اس کے آرام کا ہر وقت خیال رکھتی لیکن اس کے باوجود سے اس بات کا ذرا برابر بھی احساس نہ تھا کہ وہ خالد سے محبت کرتی ہے۔ کتنی بار خالد نے اس کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھے ہیں۔ اس کے گالوں پر چٹکی لی ہے لیکن اسے ذرا بھی محسوس ہوئی اور نہ کبھی اس نے سوچا کہ خالد اس سے محبت کرتا ہے۔

وہ انہی خیالات میں نہ جانے کتنی دیر غلطاں رہی۔ اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی جیسے کوئی ہلکی آواز میں کہہ رہا ہو "شاہدی بی"۔ اس نے سوچا کہ اس کے کان تو نہیں بج رہے ہیں۔ لیکن نہیں واقعی خالد سے آواز دے رہا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور جھپک سے اس نے دروازہ کھول دیا۔

اب وہ خالد سے بے حد قریب ہو گئی۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے۔ جب لوگ سینما چلے جاتے اور وہ اکیلی رہ جاتی اور اس تنہائی میں صرف خالد اس کا ساتھ دینے والا ہوتا۔ پھر تو جیسے زندگی کی ساری مسرتیں پرے کے پرے جمائے اس کے سامنے کھڑی ہو جاتیں اور وہ دونوں ہوتے زندگی کی مسرتیں ہوتیں، خوشیاں ہوتیں اور وہ دونوں سرمست ایک دوسرے سے

باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ عہد و پیماں ہوتے، عشق و محبت کا اظہار ہوتا، زندگی کے رازوں کے افشا کرنے کی باتیں ہوتیں۔ خوابوں اور حقیقتوں، افسانے اور واقعات کے تذکرے ہوتے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھو جاتے اور اس وقت وہ یہ سچائی بھول جاتے کہ وہ ایک دوسرے کی روح و جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ جسم و جان کے رشتے بڑے پائیدار ہوتے ہیں۔

چاند کی روشنی بادلوں کے باوجود چھنتی ہے۔ جب محبت بھی کہیں چھپائے سے چھپتی ہے۔ شاہدہ اور خالد نے لاکھ کوشش کی کہ کس طرح اس راز کو سربستہ رکھیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں۔ لیکن سید شرافت حسین اور ان کی بیگم ایسے بیوقوف نہ تھے۔ انہوں نے بھی بچی کی آنکھیں نہ کھیلی تھیں اور نہ اپنے بال دھوپ میں سفید کیے تھے۔ وہ اپنی لڑکی کی نیچی نگاہوں میں ہی سب کچھ سمجھ گئے تھے اور شاید وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ ... جو ابھی پھوٹنے کے سوتوں سے پھوٹا تھا لیکن انہوں نے یہ اس لیے نہ کیا کہ وہ خود بھی اس رشتے کے بارے میں پہلے سے سوچ چکے تھے جب شاہدہ اور خالد کے دل و دماغ میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب خالد اور شاہدہ ایک دوسرے سے قریب ہو گئے تو انہوں نے روکنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ یہ اور بات ہے کہ ایک بار سید شرافت حسین نے اپنی بیگم سے کہا "ابھی شاہدہ اور خالد کا ایک دوسرے سے اتنا گھلنا ملنا مناسب نہیں، تم شاہدہ کو سمجھاؤ۔" لیکن شرافت حسین کی بیوی بڑی تیز طرار تھیں اور اس گھر میں ان کا حکم ہی چلتا تھا۔ انہوں نے جھلا کر کہا۔ "شاہدہ کے ابا، تم خواہ مخواہ شک کرتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ مانا کہ شاہدہ خالد کا اتنا خیال رکھتی ہے اس کے بغیر سارا دن بے چین سی رہتی ہے لیکن اس کے یہ معنی بھی تو نہیں کہ ایک دوسرے کو اس طرح روک دیا جائے اور پھر جب کہ یہ رشتہ ہمارا اپنا سوچا ہوا ہے پھر یہ بھی تو ہے کہ جب ایک ساتھ زندگی گزارنی ہے تو اچھا ہے ابھی سے محبت کرنا سیکھ لیں، دیکھتے نہیں کہ خالد اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ جب بھی بازار جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی چیز ضرور اس کے لیے لا کر دیتا ہے۔ ذرا بھی شاہدہ کے ماتھے پر بل پڑا اور خالد میاں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں تو خدا سے دعا کرتی ہوں کہ دونوں آگے چل کر اسی طرح زندگی گزاریں۔"

اور بیگم کا یہ جواب سن کر شرافت حسین اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ کہتے بھی تو کیا کہتے، بی راشدہ بات معقول کہہ رہی تھیں اور ہر بات کے پیچھے ایک دلیل تھی۔ لیکن اس کے باوجود سید شرافت حسین اس بات کو بھی اتنی آسانی سے نہ پی جاتے اگر اس میں ان کی اپنی مرضی نہ شامل ہوتی اور وہ پان کا بیڑا منہ میں دبائے ہوئے باہر نکل گئے۔

شاہدہ نے یہ ساری گفتگو سن لی تھی کیونکہ وہ بالکل ملے ہوئے کمرے میں تھی۔ کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ یہاں ہے اور جب امی چلی گئیں تو چپ چاپ خالد کے کمرے میں گئی۔ لیکن خالد کمرے میں نہ تھا۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ شاہدہ اتنی اچھی بات اپنے دل میں لیے ہوئے تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح وہ یہ خبر خالد کو سنائے۔ اسے خالد پر غصہ آنے لگا۔ بالآخر جب اس نے دیکھا کہ خالد نہیں آ رہا ہے تو اس نے اپنے صندوق میں سے ایک تصویر نکالی اور بولی۔

"جانتے ہو کہ امی اور ابا نے ہماری شادی پہلے سے ہی طے کر دی تھی۔ آج میں نے ابا اور امی کو باتیں کرتے ہوئے۔

پنے کانوں سے سنا، سنی سنائی نہیں کہہ رہی ہوں اور امی سچ مچ بڑی تیز ہیں وہ ہمارے لیے لڑ پڑیں اور سچ پوچھو تو ابا بھی کتنے اچھے ہیں۔ وہ بالکل بھی ناراض نہیں ہوئے اور چپ چاپ اٹھ کر چلے گئے اور میں ان کی ساری بات چیت دروازے کے پیچھے سے سنتی رہی، کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔'' اور ابھی وہ کتنی دیر باتیں کرتی اگر فرحت کمرے میں نہ آ جاتا۔ اس نے داخل ہوتے ہی کہا۔ ''باجی کس سے بات کر رہی ہو؟''

''کسی سے بھی نہیں۔'' اس کے جی میں تو آیا کہ صاف صاف کہہ دے۔ آخر جب ابا اور امی کو معلوم ہے تو پھر اس بے چارے سے چھپانے سے کیا فائدہ؟ لیکن پھر اس کی ہمت نہ پڑی اور وہی القاظ کا کال پڑ گیا۔ اس نے تصویر بکس میں رکھ کر بکس بند کر دیا اور باہر نکل آئی۔

شام کو جب خالد آیا تو آنگن میں سب کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اب شاہدہ کا یہ حال کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح خالد اٹھ کر کمرے میں جائے تو وہ اس سے بات کرے۔ لیکن خالد میاں اس وقت کچھ ایسے عالم میں تھے کہ وہ شاہدہ کے علاوہ سب ہی سے مزے لے لے کر باتیں کر رہے تھے اور شاہدہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اس کو خالد کی ان بے تکی باتوں پر غصہ آ رہا تھا جن کا کوئی سر تھا نہ پیر اور یہ بات تھی کہ کترنی کی طرح چل رہی تھی اور یہاں وہ اتنی اچھی خبر لیے ہوئے سنانے کے لیے۔ آخر خدا خدا کر کے خالد میاں کمرے میں داخل ہوئے لیکن اس وقت ایک مصیبت یہ آئی کہ سب نے شاہدہ کو اپنے پاس زبردستی بٹھا لیا۔ اب مرتا نہ کرتا کیا، دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔

آخر کار آدھے گھنٹے کے بعد کہیں اسے کمرے میں جانے کا موقع ملا۔ لیکن اب اس کا موڈ کتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ تمام باتیں اس کے ذہن میں الجھی ہوئی ڈور کی طرح الجھ گئی تھیں۔ لیکن کمرے میں جاتے ہی جیسے سوال کیا ہو اور اس نے خوش ہو کر خالد کو ساری باتیں سنا ڈالیں۔

لیکن سدا دن ایک سے نہیں رہتے۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ آخر ایک دن اچانک بی راشدہ نے اپنی لڑکی کو الگ بلا کر کہا۔ ''بیٹا ذرا آنکھیں کھول کر چلو۔ زمین میں گڑھے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی اوندھے منہ نہ گرو۔ ماشاء اللہ جوان ہو، سمجھدار ہو، عقل کے ناخن لو۔ خالد کے پاس ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں اور بہتر ہے کہ تم خالد کے سامنے نہ آؤ۔ مانا تمہارا بھائی ہے پر ہے تو دور کا۔ ہمیں محلے پڑوسیوں میں رہنا ہے ان کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ نہ جانے کیا کیا نام دھریں اور آج کل زمانہ خراب ہے۔ لوگ ویسے بھی بے بات کا بتنگڑ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ مارنے کا ہاتھ ہر کوئی پکڑ لیتا ہے بولنے کی زبان کس نے پکڑی ہے''؟ راشدہ بی بولتی رہیں اور شاہدہ منہ سے سنتی رہی اور کہے بھی تو کیا۔ بات کہنے کی نہ تھی اور غالباً خالد سے بھی انہوں نے کچھ کہہ دیا تھا۔ اس لیے خالد بھی شاہدہ کے سامنے آنے سے کترانے لگا تھا اور یہی نہیں تیسرے دن اس کا بستر باہر مردانے میں چلا گیا تھا۔ شاہدہ پریشان تو تھی لیکن ایک خوشی کی بات تھی وہ جانتی تھی کہ اب وہ دن تیزی سے قریب آ رہے ہیں جب وہ خالد کے ساتھ مستقل طور پر رہے گی۔ ایک بار اسے اپنی امی پر غصہ بھی آیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ خالی بھائی سے اس کا پردہ کرا دیا۔ لیکن پھر اس کو ان سے ہمدردی ہوئی۔ اور اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''سچ ہے وہ بے چاری بھی کیا کریں کیسے

پڑوسیوں کا لحاظ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" لیکن اتنی زیادہ نگرانی کی بھی کیا ضرورت تھی۔ یہ امی بھی سمجھتی ہیں مگر نہیں سمجھیں۔ تو کون؟ اب وہ تو کچھ نہیں سکتی تھی اور گھر میں دوسرا کوئی تھا نہیں۔ شروع شروع میں تو وہ اس پابندی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی۔ لیکن اب یہ پابندی اس کے لیے سوہانِ روح بن گئی۔

ادھر خالد میاں الگ پریشان تھے لیکن انہیں بھی شاہدہ نے ایک خط لکھ کر اطمینان دلایا تھا کہ یہ پابندی آنے والی آزادی کا پیش خیمہ ہے اور اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاہدہ کے بغیر کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔ یوں تو چھپ چھپا کر ملاقات ہو جاتی تھی لیکن اس میں اپنی تمام تر رومانویت کے باوجود ایک کرب کا احساس تھا۔ ایک تشنگی تھی جو ہمیشہ رہ جاتی تھی۔ پیاسے کو پانی کے چند قطرے مل جائیں تو پیاس اور بڑھ جاتی ہے۔

اس طرح دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے چلے جا رہے تھے اور ان دونوں کو اپنی قید بے معنی معلوم ہونے لگی تھی۔ شاہدہ مسلسل کوشش کرتی رہتی تھی کہ کسی طرح اور کچھ معلوم ہو لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ ماں اور ابا اس واقعہ کو پسِ پشت ڈال کر بھول گئے ہیں۔ وہ بار بار اپنے وجود کا احساس دلاتی۔ کبھی خاص چیخ چیخ کر گانے گا کر، کبھی جھوٹ موٹ کی بیمار بن کر، کبھی مسلسل فاقے کر کے، لیکن ان دونوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگتی۔

بالآخر ایک دن جب وہ اپنے بستر میں بے سدھ پڑی تھی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ابا اور امی کھسر پھسر کر رہے ہیں اور یہی وہ کھسر پھسر تھی جس کو سننے کے لیے وہ نہ جانے کب سے بے تاب تھی اور پھر اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"کیوں پھر شاہدہ کے بارے میں کچھ سوچا"؟ سید شرافت حسین نے آہستہ سے کہا۔

"اس میں اور سوچنے کی کیا بات ہے۔ سب سوچی سمجھائی بات ہے۔" امی کہہ رہی تھیں۔ شاہدہ کی باچھیں کھل گئیں۔ "میری اچھی سی امی۔" اس کے دل سے امی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں، لیکن ابھی یہ دعائیں پوری نہ ہوئی تھیں کہ امی نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "شاہدہ کی شادی خالد سے ہرگز نہیں ہو سکتی چاہے دھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔" شاہدہ اپنے بستر پر اچھل پڑی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا بات ہے کہیں اس کے کان بج تو نہیں رہے۔ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی اور خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہی ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں خوب اچھی طرح ملیں۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ نہیں، خواب نہیں ہے، لیکن پھر امی ایسی بات کیوں کہہ رہی ہیں۔ اس نے اپنے کان اور قریب کیے۔ امی کہے جا رہی تھیں "میں نے آج خالد سے کہہ دیا ہے وہ اپنا انتظام کہیں اور کر لے۔ ہم نے اس کے لیے بہت کچھ کر دیا۔ اب اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ اس کو جواب تو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ ہم شاہدہ کی شادی اس سے نہیں کر سکتے۔" شاہدہ کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور خالد کا بوسہ زخم بن کر اس کے گالوں میں جل رہا تھا اور ابا اپنی عادت کے مطابق چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو آج تک سمجھنے میں غلطی کی۔ لیکن اس کے ابا تو سمجھدار ہیں وہ کیوں نہیں بولتے۔ لیکن پھر شرافت حسین نے زبان کھولی اور حسبِ عادت ذرا آہستہ سے بولے۔ "میں سمجھتا ہوں اس کا اثر شاہدہ پر بہت خراب پڑے گا۔ وہ بے چاری خالد سے بڑی محبت کرتی ہے۔" اور شاہدہ کو معلوم ہوا کہ

اس گھر میں کوئی اس کا اپنا بھی ہے جو اس کی بات کہہ سکتا ہے۔ لیکن اب وہ امی کے جواب کی منتظر تھی جو کہہ رہی تھیں۔

''شاہدہ کے ابا تم بھی بچوں کی سی بات کرتے ہو۔ دلی مفلسی کا داغ برداشت کر سکتا ہے لیکن بدی کا داغ برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ہمیں نہ معلوم ہوتا کہ خالد کی بدی میں مل ہے تو اور بات تھی لیکن اب جبکہ معلوم ہو گیا ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ آنکھوں دیکھتے مکھی نہیں نگلی جاتی۔ پھر سیدزادوں کا کال نہیں ہے۔ ابھی اللہ کے فضل سے اپنے ہی گھرانے میں کتنے لڑکے ہیں اور مرتی مر جاؤں گی پر یہ رشتہ نہ ہونے دوں گی۔''

[illegible] ہیں۔ چند منٹ تک کمرے میں سناٹا رہا لیکن پھر امی نے کہا: ''کل تک کی اور بات ہے کل خالد یہاں سے چلا جائے گا [illegible]'' سید شرافت حسین پان کا بیڑا منہ میں لیے تھو کھرے ہوئے لیکن شاہدہ نے اب اطمینان کا سانس لے لیا تھا یونہ [illegible] رہی تھی کہ کل وہ بھی خالد کے ساتھ اس گھر سے نکل جائے گی

سبحان تیری قدرت

ظہیر بابر

امام صاحب نے سلام پھیرا، اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو تمام حاضرین [illegible] کی اولادوں کے لئے اور ان کے بزرگوں کے لئے اور ان سب کے لئے جو گن رہے تھے خدا [illegible] جہان کی ہر شے بھی مانگ لی۔ اور اگلی دنیا کے سارے سکھ آرام بھی۔ اپنی ذات کے لئے [illegible] دعا تھی۔ جسے وہ زیر لب دہراتے ہوئے بھی اب گھبراتے تھے۔ کئی دنوں سے ان کے دل میں یہ [illegible] دھرنا دے کر بیٹھا ہوا تھا کہ دوسروں کے لئے ان کی بڑی بڑی دعائیں بھی منظور ہو سکتی ہیں۔ مگر اپنی ذات کے لئے ان کی ننھی سی دعا بھی مستجاب نہیں ہوتی۔ وہ وظیفے پڑھ پڑھ کر اس وہم کو بھگانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر وہ تو آگ سے بنا ہوا کوئی کافر جن تھا، کہ امام صاحب جتنی پھونکیں مارتے تھے وہ اتنا ہی اینٹھتا اور پھیلتا چلا جاتا تھا اور اب تو اتنا شریر ہو گیا تھا کہ ان کی نماز میں بھی خلل ڈالنے لگا تھا۔

یہ پریشانی کچھ ایسی تھی کہ امام صاحب اسے کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اگر جی کڑا کر کے کسی سے کہہ بھی دیتے تو وہ اسے بھی امام صاحب کی انکساری کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ اس لئے کہ لوگ تو یقین رکھتے تھے کہ امام صاحب کے ہونٹوں سے جو بھی دعا نکلتی ہے اس پر قبولیت کی پکی مہر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی شہرت کا یہ چلا راتوں رات ہی بن گیا تھا۔ انہوں نے جس روز اس کاروباری علاقے کی مسجد میں قدم رکھا تھا۔ اس کے دوسرے دن بازار میں تیزی آگئی تھی۔ پہلے افواہیں اڑی تھیں، پھر سٹہ چلا تھا، پھر تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت آدھی رہ گئی تھی۔ بڑے بڑے سوداگروں کے سٹاک کے گودام بیٹھے بٹھائے دوگنے ہو گئے تھے۔ غیر ملکی مال کے نرخ بھی بڑھ گئے تھے۔ مہنگائی کی ہوا اتنی اونچی اور چوڑی تھی، کہ اس میں چھوٹے چھوٹے دکاندار بھی خوب ہاتھ دھو رہے تھے، سینکڑوں کا حساب رکھنے والے بھی ہزاروں کی باتیں کرنے لگے تھے۔ کھیل تو ڈالر داری نے دکھایا تھا۔ مگر بادل کے بغیر تو بارش نہیں ہو سکتی۔ مسجد سے ملحق بازار کے تاجروں کو یقین تھا کہ ان کے کاروبار پر امام صاحب کی پیاری پیاری دعاؤں نے رنگ چڑھایا ہے

۔ امام صاحب کو اس بات کا علم تھا، اس لئے کاروبار میں وسعت اور ترقی کے لئے دعا کرتے وقت ان کی آواز میں رقت بڑھ جاتی تھی۔ اور فراخیٔ رزق والا پینٹ جملہ وہ تین تین بار دہراتے تھے۔ تب اور اب کی دعاؤں میں بس اتنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خدا سے اور آخرت کی تمام منزلیں آسان کر دینے کی تکرار بھی کرنے لگے تھے۔ اور اللہ کو یہ بھی یاد دلاتے تھے کہ وہی سب کا بھرم اور شرم رکھنے والا ہے۔

امام صاحب نئی مسجد پا کر اتنے ہی خوش ہوئے تھے، جتنے مسجد سے ملحق محلے اور بازار کے بیوپاری ان جیسے سائل اور صاف نمازی پا کر مسرور ہوئے تھے۔ پہلے دن جب امام صاحب نے اس صاف ستھری اور چمکتی ہوئی مسجد کو دیکھا تھا تو ان کی روح تک جھوم اٹھی تھی، اور ان کی امامت کی عمر کا ابتدائی حصہ تو پرانی بستی کی ایک کٹیا سی مسجد میں گزرا تھا، جس میں بجلی کے دو بڑے پنکھے لگوانے کیلئے انہوں نے کئی سال تک مسجد کے متصل اور اس کی خدمت کرنے والوں سے فریاد، اظہار کر دیکھ لئے تھے پھر بھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا تھا، ہاتھ پاؤں کا کام ہو تو غریب لوگ سب سے پہلے خدا کے گھر کی خدمت کرنے کے لئے آگے ہوتے ہیں۔ مگر روپے پیسے کی جیب میں کہاں رکھتے ہیں؟ اور ادھر مسجد کے مقتدی، مفلسوں کی تو باتیں بھی مفلس ہوتی ہیں۔

امام صاحب پنکھوں کی امید بھی کھو بیٹھے تھے۔ کہ ایک دن یہ اطلاع ملی تھی کہ شہر کا ایک بہت بڑا ٹھیکیدار مر گیا ہے اور اس کی میت پرانی بستی کے قبرستان میں دفن کرنے کے لئے لائی جا رہی ہے۔ یہ شخص اس بستی میں پیدا ہوا تھا اور جنگ عظیم میں چھوٹے بڑے ٹھیکے لیتا ہوا شہر کی امیر بستی میں پہنچ گیا تھا۔ زندگی میں تو اس نے پلٹ کر اپنی جنم بھومی پر نگاہ نہیں ڈالی تھی، مگر اس کی جڑوں میں تھوڑا سا رس باقی تھا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ اسے باپ دادا کی قبروں کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس کے جنازے کے ساتھ اتنی بہت ساری موٹریں آئی تھیں کہ بستی کی ساری گلیاں بند ہو گئی تھیں۔ امام صاحب تیار ہو کر عارضی جنازگاہ میں پہنچے تھے، وہاں یہ سن کر انہیں افسوس ہوا تھا کہ نماز جنازہ پڑھانے کے لئے محکمہ اوقاف کے ایک بہت بڑے عالم بھی میت کے ساتھ آئے ہیں۔ بڑے عالم فاضل کو بھی وہی درود اور دعا پڑھنا تھی۔ جو سب پڑھتے تھے۔ کالے چغے اور اونچے شملے سے کسی مردے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر میت پر مٹی ڈالنے کے بعد مرحوم کے بڑے بیٹے نے جب یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے ابا کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے قبرستان کی چاردیواری کو بھی پختہ کرا دے گا اور مسجد میں بجلی کے دو بڑے پنکھے بھی لگوا دے گا۔ تو ان کے منہ سے مرحوم کے لئے بے ساختہ دعائے مغفرت نکلی تھی، اور ان کے دل سے سارا میل دھل گیا تھا، وہ نیک آدمی اگر اللہ کو پیارا نہ ہوتا تو مسجد دو پنکھوں سے محروم رہتی اور گرمیوں میں امام صاحب دن کی دو نمازیں تب ہی ادا کرتے رہتے۔

امام صاحب کو اوقاف ڈیپارٹمنٹ بالکل پسند نہ تھا، کسی نے انہیں بتا دیا تھا کہ اوقاف والوں نے اماموں کے ساتھ مسجدوں کے بھی گریڈ بنا دیے تھے، اور یہ بات انہیں بہت بری لگی تھی، وہ اکثر کہا کرتے تھے، کہ خدا کے گھر تو خدا کے گھر ہوتے ہیں، ان میں اونچ نیچ کیسی؟ جہاں خدا رہتا ہو وہاں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا

طلسماتی دنیا کا حال بیان کر رہے ہوں۔ امام صاحب اس کی حیرت سے مزید محظوظ ہونا چاہتے تھے مگر وقت کم تھا۔ اور وہ ظہر کی نماز نئی مسجد میں جا کر ادا کرنا چاہتے تھے۔ چارج سے ہٹنے کے باوجود وہ اندر سے ڈر رہے تھے، کہ کہیں کوئی پیچ والا عالم ان کی نئی مسجد میں جا کر مصلّہ نہ سنبھال لے۔ وہ اپنا سلسلہ کلام منقطع کرکے شکرانے کے دو نفل ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو ان کی بیوی نے بھی اپنے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے اور بیٹھے بیٹھے ہاتھ بلند کر کے ان کا ساتھ دیا

پرانے بازار والی سڑک کے راستے میں یہ نئی مسجد تھی۔ اگرچہ چھوٹی تھی۔ مگر امام صاحب کو جانے کا شوق بہت تھا۔ کہ ان کی مسجد بھی نہ رہے، اور دوسری مساجد کے نمازی چھین لیں۔ مگر وہ کسی کو برا خطبہ سننے سے یا اپنے پیچھے نماز پڑھنے سے نہیں روک سکتے تھے اور لوگ تھے کہ ان کی مسجد کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ بہت سے نمازی ان کی خوش الحانی سے متاثر ہوئے تھے۔ کچھ ان کی دعاؤں میں بھری ہوئی برکت سے اور کئی ایک ان کی کم آمیزی سے کہ جلدی ہی فارغ ہو جاتا ہے۔ ان کے خطبے بھی جلدی سے مقبول ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ نرمی اور خلوص سے مسجد میں وعظ فرماتے تھے، اس طرح بالکل نہیں بولتے تھے کہ سننے والوں کو لگتا کہ مصر کا کوئی فرعون مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہو کر سزائیں سنا رہا ہے۔

امام صاحب سے نئے محلے کے لوگ تو اپنی مسجد کی آبادی دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے، مگر متاثرہ مسجدوں کے خطیبوں اور خادموں کے تن بدن میں تو جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ وہ امام صاحب پر شعلے اگلنے لگے تھے۔ اور ان سے ایسے ایسے عقائد اور مسالک منسوب کرنے لگے تھے۔ جو انہوں نے کبھی سنے تک نہ تھے۔ اس کے باوجود وہ انہیں بھی دعاؤں میں یاد رکھتے تھے ان کے لئے بھی اللہ سے خیر و برکت کی دعا مانگتے تھے، ہاں یہ کبھی کبھی مسجد کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اتنا ضرور کہہ دیتے تھے، کہ خانہ خدا میں کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہئے، جس میں کذب و افترا کی کوئی دھاری بھی شامل ہو۔ مسجد کا رتبہ تو اتنا اعلیٰ ہے کہ اس میں فرشتے بھی باوضو ہو کر داخل ہوتے ہیں۔

امام صاحب کی اصل پریشانی مخالف علماء کی مخاصمت سے کہیں بڑی تھی۔ جب سے مسجد کے خادم نے باتوں باتوں میں انہیں بتا دیا تھا کہ مسجد کا گریڈ تیرھواں ہے۔ ان کے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ان کا اپنا گریڈ بارھواں تھا۔ اور دن رات کے وظیفوں کے باوجود وہ بارھویں گریڈ کی سد سکندری پھلانگ نہیں سکتے تھے۔ چرخے کی ڈوری ٹوٹی ہوئی ہو تو سوت کہاں کت سکتا ہے۔ خدا چھپر پھاڑ کر دولت دے دیتا ہے، مگر کھڑکی کھول کر دری اسناد نہیں دے سکتا۔ وہ تو کسی بڑے دارالعلوم میں پڑھ کر اور اس کا امتحان پاس کر کے ہی مل سکتی ہیں۔ رفتہ رفتہ امام صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس مسجد میں ان کی تقرری کا حکم غلطی سے جاری ہوا تھا۔ اب ان کے تبادلے کا آرڈر آنے ہی والا ہے۔ دن میں کئی بار وہ اپنے آپ سے لڑ جھگڑ کر خود کو سمجھا لیتے تھے۔ کہ خدا کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہ مسجد اگر ان کی قسمت میں نہیں ہے تو اس میں بھی ان کی

بھلائی کی کوئی رمز ہوگی لیکن یہ سوچ کر انہیں وحشت ہونے لگتی تھی کہ تبادلے کا حکم آ گیا تو وہ اپنے محلے کے اور بازار کے لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے جو انہیں شمس العلماء کہتے ہیں۔ ان کی دعاؤں کو متبرک سمجھتے ہیں۔ اور ان کے مخالف طلباء سوغات دے کر حوصلا پیسے کے الزامات دھرتے ہیں، وہ اس خیال سے ہی کانپ جاتے تھے کہ اس کی ذات کے گرد جو عقیدت کی کنڈلی بنی ہوئی ہے۔ وہ کھر جائے گی اور اندر سے وہ ویسے ہی نکل آئیں گے جیسے کہ وہ ہیں۔ انہیں جب پاس پڑوس کی مسجدوں کے خطیبوں اور خادموں سے تبادلے کی باتیں کرتے ہوئے نظر آتے انہیں اپنے جسم پر بچھو چلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس عذاب نے ان کی دعاؤں میں ایک جملے کا اضافہ کر دیا تھا۔ اللہ تو سب کا بھرم اور شرم رکھنا۔ اس جملے کے جواب میں جب سب لوگ بآواز بلند ,,آمین،، کہتے تھے تو ان کی آنکھوں میں غبار آ جاتا تھا۔

آخر ایک رات جاگتے میں انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مسجد میں بیٹھ کر رسوائی کا انتظار کرنا حماقت ہے۔ انہیں محکمے کے دفتر جا کر اپنے تبادلے کا آرڈر خود لے آنا چاہئے۔ افسر بہادر ان کی یہ درخواست ضرور منظور کرے گا کہ انہیں کسی دور افتادہ علاقے میں چھوٹی سی مسجد دے دی جائے۔ اور یہ اجازت بھی مرحمت فرمائی جائے کہ مسجد کے خادم کو چارج دے کر وہ صبح سویرے رخصت ہو جائیں اور نئے امام صاحب ظہر کی نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں تشریف لائیں۔ اس وقفے میں لوگ اپنے اپنے کاروبار میں لگے رہیں گے اور جب انہیں امام کی تبدیلی کا علم ہوگا تو وہ اس نورانی مسجد کو الوداع کہہ کر ڈیڑھ دو سو میل دور نکل چکے ہوں گے۔

یہ فیصلہ کر کے انہیں بڑا سکون ملا۔ ان کا جی چاہا کہ بیوی کو جگا کر اسے اپنا ارادہ بتا دیں مگر اس خیال سے ٹال گئے کہ اس کے سامنے نظریں نیچی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مائی حوا بابا آدم کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ بابا آدم مائی حوا کے لئے تخلیق نہیں ہوئے تھے۔ وہ نیک بخت تو طبیعتاً بھی صابر و شاکر ہے۔ کئی دنوں سے اس کی طبیعت نہیں پوچھی۔ پھر بھی منہ سر لپیٹ کر چپ چاپ سو جاتی ہے۔ اسے برقع پہنا کر جب چاہیں لے لے جائیں گے۔

اس رات وہ کئی دنوں کے بعد ایسی گہری نیند سوئے کہ تہجد کے لئے بھی ان کی آنکھ نہ کھلی۔ بیوی اگر گھبرا کر انہیں نہ جھنجھوڑتی تو موذن کی آواز بھی شاید انہیں نہ جگا پاتی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ جلدی سے نماز پڑھائی درس مکمل کیا اور اپنے حجرے میں واپس آئے۔ دھوبی کے ہاتھ کی دھلی ہوئی سفید شلوار قمیض نکال کر پہنی۔ اس پر کالی واسکٹ چڑھائی۔ سر پر کالی ٹوپی رکھی، اور اس کے اوپر سے چادر اوڑھ کر محکمہ اوقاف کے دفتر کی طرف چل پڑے۔

انہوں نے کوئی سرکاری دفتر دیکھا ہوتا تو انہیں معلوم ہوتا کہ دفاتر کا وقت مسجدوں کے اوقات سے مختلف ہوتا ہے ڈیپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ افسر لوگ ابھی نہیں آئے۔ صرف چپراسی لوگ خالی کمروں میں جھاڑ پونچھ کر کے ٹھیک ہو رہے تھے، انہوں نے دو تین چپراسیوں کو جھک جھک کر سلام کیا

اوران سے تبادلے کرنے والے افسر کا نام پوچھا، وہ سب اس طرح اپنے کام لگے رہے۔ جیسے امام صاحب آدمی نہیں کوئی جیتا ہو۔ ... ایک چپڑاسی نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر انہیں سر سے پاؤں تک گھورا اور اس کے ہاتھ میں ... سیٹی بجانے لگا۔ زندگی میں پہلی بار ان کے ساتھ ایسا سوکھا سڑا سلوک ہوا تھا اس لئے ان کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے قدم گھسیٹتے ہوئے دفتر کے ایک کونے میں بچھے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ کر اپنی منزل مکمل کرنے ... ایسے کھوئے کہ نہیں دفتر میں جھنجھناہٹ کے لحہ بہ لحہ بڑھتے ہوئے صوتی اثرات کا احساس ... ہوا۔

پھر دیر ... بعد ... پر سے رینگتا ہوا ان کے سر تک پہنچ گیا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا تو سامنے ایک ... چپراسی ... تھا۔ ایک نوجوان نے انہیں جھک کر سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیے۔ انہوں نے نظر بھر کر دیکھا تو پہچان گئے۔ وہ ان کی پرانی مسجد کے ایک پکے نمازی کا بیٹا تھا۔ جن دنوں وہ افسری والا امتحان دے رہا تھا، تو اس کی کامیابی کے لئے انہوں نے بڑے خشوع سے چلہ کھینچا تھا۔ وہ پاس ہو گیا تھا تو اس کے باپ نے ان کے گھٹنے چھو کر کہا تھا، کہ آپ کی دعاؤں کی برکت سے ایک غریب لڑکا صاحب بہادر بننے والا ہے۔ اب تو اس کے باپ کے انتقال ہوئے تین سال گذر چکے تھے، ان دنوں وہ ٹریننگ کے لئے ولایت گیا ہوا تھا، انہوں نے اس کے باپ کی آخری خواہش کے مطابق اس کی قبر میں اتر کر اسے اپنے ہاتھوں سے لحد میں لٹایا تھا

”چلئے حضرت،“ کہہ کر نوجوان نے ان کی یادوں کی فلم سنسر کر دی۔ انہوں نے جلدی سے جوتے پہنے اور کچھ بھی سوچے بغیر اس نوجوان کے ساتھ چل دیے۔ برآمدے سے گزرے تو دھوپ کی کرنوں میں بکھرے ہوئے وہ چپڑاسی بھی سراپا عقیدت بن گئے، جو کچھ ہی ساعتیں پہلے ان سے کلام کرنے کے روادار بھی نہ تھے۔ ادھر ادھر جاتے ہوئے لوگوں کو مودب رویہ دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے مرحوم معتقد کا بیٹا واقعی صاحب بہادر بن گیا ہے۔ اس کے دفتر کی سج دھج نے ان کے یقین کی تصدیق کر دی۔ اس کی ایک میز ہی چار پانچ میزوں سے بڑی تھی۔ اس کے گرد بچھی ہوئی ریشمی پوشش میں سے کئی رنگ پھوٹ رہے تھے، اور فرش پر ایک کی بجائے تین تین قالین بچھے ہوئے تھے۔

نوجوان افسر نے ان سے بیٹھنے کی استدعا کی تو وہ کرسی کے بازوؤں پر اپنا بوجھ ڈال کر بیٹھ گئے۔ اس نے پہلے ان کی خیریت معلوم کی، پھر خدمت پوچھی، وہ ایک برخوردار کے سامنے اپنی مشکل بیان کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ مگر اس کی سعادت مندی نے انہیں حوصلہ دیا۔ اور اس کا اصرار دیکھ کر وہ جوڑتے ہوئے۔ انہوں نے جملہ جوڑ کر وہ بات کہہ دی جو ان کے دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپی بیٹھی تھی۔ اور وہ درخواست خود ہی رد کر دی جسے لے کر وہ محکمے کی بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے، انہوں نے بتایا کہ وہ بارھویں گریڈ میں ہیں جبکہ ان کی مسجد تیرھویں گریڈ کی ہے۔ اگر مسجد کا گریڈ کم کر کے بارھواں کر دیا جائے تو ان کے

سر پر سے تبادلے کی تلوار ہٹ جائے گی۔ یہ درخواست سننے کے بعد نوجوان افسر نے پہلی بار نظریں اٹھا کر انہیں غور سے دیکھا تو انہیں ایسا لگا جیسے ان کی آنکھوں کی پتلیاں ان کی کنپٹیوں سے نکل کر فضا میں چکر لگا رہی ہیں۔

افسر نے گھنٹی بجائی تو ایک چپراسی اندر آیا۔ اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ افسر نے ایک چٹ پر لکھا اور وہ چپراسی کے حوالے کر کے ایک خط کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ دروازہ کھلا تو خاموشی کی مہر ٹوٹی۔ چپراسی نے ایک فائل افسر کے سامنے رکھ دی۔ فائل میں جیسے تعویذ پڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ افسر نے فائل کھولی تو جیسے ان کا جسم گھٹنے اور سمٹنے لگا۔ ان کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا۔ مگر ان کے ہاتھوں میں اتنی جان بھی نہ رہی کہ وہ اٹھ کر پیشانی کو پونچھتے انہیں معلوم تھا کہ فائل ان کی کمزوری کا وہ راز اگل رہی ہے جسے چھپانے کے لئے وہ شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔ اب تو ان کے مرحوم معتقد کے صاحبزادے کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان کا مبلغ علم کیا ہے؟ وہ بارھویں گریڈ کیا دسویں گریڈ میں بھی نہیں۔ افسر کبھی فائل کو اور کبھی انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھتا گیا، انہیں اپنی جسارت پر ندامت محسوس ہو رہی تھی، مگر شیطان اپنا کام کر گیا تھا۔ مسجد کا گریڈ کم کرنے کی گذارش کر کے ان سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ وہ اب اگر زندگی بھر سجدے میں پڑے رہیں تو تب بھی اس گناہ کی تختی ان کے سینے پر چمکتی رہے گی، ندامت کے احساس پر ایک اور خوف غالب آ گیا، نوجوان افسر نے ان کی درخواست کو اپنے ایمان پر ایک حملہ تصور کیا ہو گا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو گا۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ ایک معمولی سے امام کو یہ جرات کیسے ہوئی کہ اس سے مسجد کا گریڈ کم کرانے کی درخواست کرے۔ اور اسے گناہ کی راہ دکھائے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس سے معافی مانگ کر اعتراف کر لیا جائے کہ وہ تو اپنے تبادلے کا حکم لینے کے لئے آئے تھے۔ اور صرف یہ عرض کرنا چاہتے تھے کہ انہیں کسی دور افتادہ گاؤں میں چھوٹی سی مسجد دے دی جائے۔ کچے چمڑے کی زبان سے کہنا کچھ تھا کہہ کچھ گئی۔

وہ معذرت کرنے کے لئے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہے تھے، کہ ایک سریلی آواز نے ان پر سے لمحوں کا بڑھتا ہوا بوجھ دور کر دیا'' ٹھیک ہے امام صاحب میں نے آپ کی مسجد کے خطیب کی آسامی کو بارھویں گریڈ میں ڈال دیا ہے اور آپ کی تقرری بھی مستقل کر دی ہے دو تین دن میں آپ کو آرڈر مل جائے گا۔ اور کوئی خدمت،، امام صاحب نے پپوٹے کھول کر نوجوان افسر کی طرف دیکھا تو اس کے مسکراتے ہوئے چہرے میں سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

لیلےٰ

عابد علی عابد

ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی خیموں کے اس وسیع سلسلہ کو جو ریگستان کے چمکتے ہوئے ذروں پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ قرمزی رنگ میں رنگتی ہوئی دو تنومند نوجوانوں کے صحت مند چہروں پر پڑ رہی تھی جو اپنی بندوقوں پر سہارا لئے باتوں میں مصروف تھے۔

ان میں سے ایک جس کا لباس اس کے جسم پر نہایت ناموزوں اور بھدا معلوم ہوتا تھا' اپنی داڑھی کے چند بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''یہ غیر معنی احتیاط کچھ معنی رکھتی ہے۔'' پھر گویا اپنی منطقی کارروائی کے اس محیر العقول نتیجہ پر پہنچنے کی خوشی میں اپنی تنگ چھاتی کو ابھار کر جس سے اس کے کوٹ کے دو تین بٹن ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا تھا' اپنے فقرے کو اہمیت دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہاں ضرور کچھ معنی رکھتی ہے۔''

دوسرے نے جس کی لانبی لانبی گھنی مونچھیں اور مستقل مزاجی کا ایک خاص انداز اس کی بیوقوفانہ شجاعت کے ثبوت دینے میں ایک نمایاں حصہ لے رہا تھا کچھ جواب نہیں دیا۔ پہلا شخص اس کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا رہا' مگر اس نے زیر لب صرف اس فقرے کے کہنے پر اکتفا کیا۔ ''ہاں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہوگی۔''

پھر ارادتاً ذرا آواز بلند کر کے اپنی خودداری کی شکست پر منفعل سا ہو کر دوسرے شخص سے مخاطب ہوا۔ ''حیات خاں تم تو کچھ جانتے ہی ہو گے۔'' مخاطب نے جو اس بات کا خواہش مند تھا' اپنی معلومات کی وسعت پر یہ خراج تحسین وصول کر کے اپنی آنکھوں میں رازداری کی ایک مبہم سی چمک مشتعل کی۔ پھر تفاخرانہ لہجہ میں جواب دیا۔ ''میں کیا نہیں جانتا۔''

سوال کرنے والے نے حیات خاں کے چہرے کی طرف جس پر کئی گہرے زخموں کے نشان پتہ دیتے تھے' کہ وہ جنگ کے ہیبتناک مناظر کے درمیان اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ گزار چکا ہے۔ اور جس کے کرخت نقش و نگار تکالیف کی برداشت کا ایک متحرک ثبوت تھے غور سے دیکھا۔

"پھر کچھ کہو تو۔"

"مرتضےٰ خاں بڑوں کے معاملے میں چھوٹے دخل نہیں دیا کرتے۔"

یہ فقرہ احساس برتری کی اس مخصوص حالت میں کہا گیا تھا۔ ورنہ مرتضےٰ خاں جیسے صادق دوست سے ذرا سے اکسانے پر وہ اپنے راز کو فاش کر دیگا۔

مرتضےٰ خاں نے مصنوعی اشتیاق سے لبریز آواز میں سوال کیا۔ "پھر تم کیا سمجھتے ہو۔۔۔"

حیات خاں نے اپنی ظاہری معلومات کو ایک حقیقت کی صورت میں پیش کرنے کی غرض سے پوچھا۔ "تم کیا اندازہ لگاتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" "یہی تو وجہ ہے کہ تم ابھی تک سپاہی کے درجہ سے نہیں بڑھے۔ میدان جنگ میں ترقی کرنے کے لئے مضبوط بازوؤں کے علاوہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے بازوؤں کے بلوں کی طرف شادماں غور سے دیکھا اور اس کا چہرہ خوشی کے ایک ناگہاں سیلاب سے تمتما اٹھا۔ اسے اس قدر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی ایک جرنیل کو میدان کی لڑائی جیتنے پر بھی نہیں ہو سکتی۔ مرتضےٰ خاں نے ایک ادائے تسلیم سے ان نشانوں کو توفق کا ایک اچھا ثبوت سمجھتے ہوئے ان کی طرف رقابت کی ایسی حریص نگاہوں سے دیکھا کہ خاں کے سمند غرور کو مہمیز ہو گئی۔ اس نے اپنی کارروائی کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے تہیہ کر لیا۔ کہ اپنے بچپن کے اس رفیق کو جس سے وہ بلند رتبہ ہونے کے باوجود برابر کا برتاؤ کرتا تھا اپنی معلومات سے فائدہ پہنچا کر رہے گا اس نے اپنی آواز کو اور زیادہ دبا کے اور اپنی آنکھوں میں ایک مبہم اور تاریک جذبہ مشتعل کر کے مرتضےٰ خاں کے کان میں کہا۔ "دیکھنے میں ہمارا بہادر سردار کتنا سہا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کسی موقعہ پر کبھی نہیں گھبرایا۔ مگر ان دنوں اس کے اندر سے بھی پریشانی برستی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ رات کو خاص طور پر دو سپاہی اس کے خیمے کے آگے متعین کئے جاتے ہیں اور اس وقت دن کو بھی ہم دو گھنٹے سے اس کے خیمے کے آگے کھڑے چپیں مانک رہے ہیں۔ ان باتوں سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ گویا زیادہ کہنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا

"کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

حیات خاں نے چاروں طرف دیکھا اور دل کو پورا پورا اطمینان دلا کر کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ اپنے رفیق کی حماقت پر دل ہی دل میں لعنتیں بھیجتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔ "کہ چپ رہو کہیں کوئی سن لے گا تو کھال ادھڑوا دی جائے گی۔"

مرتضےٰ خاں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور حیات خاں کی سپاہیانہ صفتوں کو بھڑکانے کے لئے کہا۔ "تم کسی بات سے ڈرتے ہو۔"

حیات خاں نے تیز ہو کر جواب دیا "اچھا تو سنو۔ ہمارے سردار کو جان کا خطرہ ہے۔

"جان کا خطرہ" مرتضےٰ خاں کو اس بات کی امید نہ تھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں اس کی اپنی جان کی نسبت ایسی پیشگوئی کی جاتی تو وہ پروا بھی نہ کرتا، مگر ان کا سردار ہردلعزیز سردار جس کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار تھا اس کی نسبت ایسی خبر سن کر وہ بوکھلا سا ہو گیا' پھر اس نے اپنے دل میں ایک خوفناک مگر مستقل ارادے کے خاکے کو محسوس کیا۔ اور اس جذبے کو نشوونما پاتے دیکھ کر اس کا ذہن خوشی سے معمور ہو گیا۔ اس نے بے پروایانہ انداز میں سکون سے جس سے [illegible] اور خوفناک جذبات کی شورش محرک تھی۔ پوچھا "کس طرف سے خطرہ ہے؟"

"ایک عورت کی طرف سے"

مرتضےٰ خاں نے صورت حال کو سمجھنے کے لئے اپنے دماغ کو صرف کاوش کر کے ایک نتیجہ پر پہنچتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں حقیقت کے سمجھنے کا اظہار کیا۔

"جبھی ہر آنے جانے والی عورت کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ہر ایک خوف کی نسبت اطمینان کیا جاتا تھا۔"

"ہاں"

مرتضےٰ خاں نے اپنے سردار کے خیمہ کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا' اندر سے بلند قہقہوں کی آواز آ رہی تھی کبھی کبھی آوارہ ہوا اپنے دوش پر شراب کی ناخوشگوار اور تیز بو کو بھی لے آتی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اندر محفل نشاط گرم ہے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ پہاڑی ریگستان کی خوش نما اور شاعرانہ شام جو ہر ایک شے پر کسی مہیب اور مافوق الفطرت پرند کے سیاہ آبنوسی پروں کی طرح چھا جاتی ہے۔ "تاریکی لحہ بہ لحہ گہری ہو رہی تھی' خیموں میں چراغ روشن ہونے لگے۔ سپاہی جو گرمی کے مارے خیموں میں ایک عارضی اور غیر مطمئن پناہ تلاش کر رہے تھے۔ اب باہر نکل آئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ مرتضےٰ خاں اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ اسے اپنے قریب کئی قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو چند آدمی ایک خوشنما فینس کو اٹھائے آ رہے تھے۔ جس کا وجود وہاں حیرت انگیز تھا۔ فینس کے آگے چند کم عمر چھوکرے شمعیں ہاتھوں میں لئے ہوئے سبک خرامی سے چل آ رہے تھے۔

دونوں نے پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا فینس خیمے کے قریب آ کر ٹھہر گئی ایک چھوکرے نے بڑھ کر حیات خاں کو صحیح طور پر افسر سمجھتے ہوئے نہایت سلیس لہجہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا "کیا سردار شیر علی کا خیمہ یہی ہے۔"

"یہی ہے مگر تم کیا چاہتے ہو"

چھوکرے نے فینس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں کی مشہور طوائف لیلےٰ ہیں' انہیں

آج سردار صاحب نے پورے آٹھ بجے طلب فرمایا ہے۔''

''اچھا ٹھہرو۔ میں سردار صاحب کو خبر کرتا ہوں۔''

حیات خاں خیمہ کے اندر گیا۔ اور واپس آ کر سید حاشمی کے قریب جا کر بولا۔ ''بی صاحب آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مگر کم از کم رسماً میرا فرض ہے کہ میں آپ کی تلاشی لے لوں۔''

پردوں سے ایک سریلی آواز آئی۔ ''کیا وجہ؟''

''سردار صاحب کا حکم۔''

''اچھا میں حاضر ہوں۔''

حیات خاں نے پردے اٹھائے۔ وہ حقیقت میں ایک خوبصورت عورت تھی بلند و بالا، شاندار اور رعب رکھنے والی جو ہلکے سے لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے ایسی مخمور کن نگاہوں سے حیات خاں کی طرف دیکھا جس طرح صرف ایک عورت ہی مرد کی طرف دیکھ سکتی ہے۔

''اچھا اپنا کام شروع کیجئے۔''

''میں آپ سے پھر معافی مانگتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر چارہ نہیں۔''

اُس نے اپنا مرمریں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ کر حیات خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا۔ ''معافی مانگنے کی ضرورت نہیں یہ تو آپ کا فرض ہے۔''

حیات خاں کو ڈر تھا کہ وہ اس کی مدافعت کرے گی۔ اس مغلوبیت کی ادا نے اس کی تمام مدظنی کو دور کرنے کے علاوہ اسے مسحور کر لیا۔ اس نے اپنے تجربہ کار ہاتھوں کی چار پانچ جنبشوں سے اس کے لباس کے تمام سلوٹوں کو ٹٹول کر اطمینان کر کے کہا۔ ''جائیے مگر مجھے بھول نہ جائیے گا۔''

''آپ نے مجھے بڑی تکلیف سے بچایا ہے۔ میں کبھی آپ کو بھول سکتی ہوں۔''

فیلس بالکل خیمہ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کہ لیلےٰ نے اپنا سر پردوں میں سے نکال کر حیات خاں کی طرف دیکھا' جس کی حریص نگاہوں سے اس کے چہرے پر ذلت کی سرخی دوڑ گئی۔ اور خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ ''حوالدار صاحب میری ایک پیش خدمت پیچھے آ رہی ہے اسے بے روک ٹوک اندر آنے دینا اس کے پاس میری چند ضروری چیزیں ہیں۔''

حوالدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''مطمئن رہئے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔''

''شکریہ''

لیلےٰ کے رسیلے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے فتحمندی کا ایک زہریلا تبسم کھیلنے لگا۔ مگر فوراً ہی اس کا سر مخمل اور ریشم کے خوش نما زرتار پردوں میں چھپ گیا۔ فیلس خیمہ میں داخل ہوگئی۔ مگر حیات خاں اسی طرح مخمور نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

۲

نفیس ولطیف تیچوانوں کے دھوئیں نے خیمہ کی محدود ہوا میں ایک تیز وتند خوشبو کا اضافہ کر دیا تھا۔ بیش قیمت ایرانی فرش پر جس کی ہر سلوٹ عیش کی دو ز زدسیوں کا پتہ دیتی تھی۔ شراب کے تازہ داغ موجود تھے۔ جا بجا ارباب نشاط اپنے اپنے سازندوں کو ساتھ لئے بیٹھی تھیں۔ کوئی اپنی شمعی انگلیوں سے پاندان کھولنے میں مصروف تھی۔ کوئی کسی خوشگو لطیفہ پر اپنی آواز کے سریلے پن کو ایک جھوٹے قہقہہ کے لوچ میں ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

لیلےٰ بظاہر دوپٹہ کے ایک شکن کو درست کرتے ہوئے مگر حقیقت میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

سب نے مل کر نو وارد کی طرف ایک خاص نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں جھکالیں۔ لیلیٰ نے تھوڑا عرصہ بیٹھ کر اپنے پیش خدمت کو ایسے انداز تحکمانہ اور شان رعونت سے آواز دی اور ایسی دھیمی اور سریلی آواز میں پانی لانے کا حکم دیا۔ کہ خود نفوس نے حقارت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اب لیلیٰ کا بے پناہ اور سحر ساز حسن ایک ایشائی لیمپ کی لطیف روشنی میں اپنی پوری خیرہ کن عریانی میں ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں رقابت کی چمک اور چہروں پر انفعال کی سرخی دوڑ گئی' لیلیٰ نے اپنی اس بے باکانہ فتح کو دیکھ کر دل میں طمانیت کی ایک گہری سانس لی' مگر ظاہر میں ایک بے پروائی کے انداز میں آنکھیں جھکالیں' وہ مسرور تھی' کہ وہ اپنے حسن سے اپنی ہم جلسوں تک کو مرعوب کر رہی ہے۔ اور اب اس کے لیے ایک کام باقی تھا۔ سردار کو بھی اپنے حسن سے مغلوب کرنا۔

تمام محفل گرم تھی۔ لیکن سردار شیر علی کا دل سرد تھا۔ وہ خیمہ کے آخری سرے پر دو مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے خاموش اس منظر کو دیکھ رہا تھا ایسی گہری سوچ میں کہ اس کی آنکھیں بغیر کسی شے کا جائزہ لئے ہوئے گویا خیمہ کے پردوں میں سے نکل کر دور کسی اور منظر میں مصروف تھیں۔ وہ ایک کریہہ المنظر شخص تھا ہر ایک سپاہی منش خصلت سے ممیز۔ جس کے بازو اور طبیعت کئی لڑائیوں میں کام آ آ کر فولاد کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ ایک تین چار سال کا بچہ خیمہ کا پچھلا پردہ اٹھا کر داخل ہوا۔ لیکن وہ اس شیطانی ہجوم سے کچھ گھبرا گیا۔ کیونکہ اس نے شیر علی کے دائیں بازو کو اپنی ننھی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے توتلی زبان میں کہا۔ "ابا! ابا۔ شیر علی اس آواز کو سن کر اس طرح چونکا جس طرح اچانک کسی شخص کا پاؤں ایک زہریلے سانپ پر جا پڑے اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں دفعتاً پر آب ہو گئیں بچے کو گود میں اٹھا کر وہ اسے پیار کرنے لگا۔ بچے نے اپنی معصوم نگاہوں سے شیر علی کی طرف پیار سے دیکھنا شروع کیا۔

لیلےٰ جس کا رنگ سرخ سے زرد اور زرد سے سفید ہو گیا تھا۔ دزدیدہ نگاہوں سے اس منظر کی طرف،

دیکھ رہی تھی' دیر دیکھتی رہی۔ جب تک بچہ شیر علی کی گود سے اتر کر پھر دوسرے خیمہ میں نہ چلا گیا۔

حیات خاں اور مرتضےٰ خاں باتوں میں مشغول تھے' کہ ایک عورت جو اپنی تراش خراش سے پیش خدمت معلوم ہوتی تھی۔ چلی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نقرئی پاندان تھا جسے طرح طرح سے نقوش سے مزین کیا گیا تھا' وہ خیمہ میں جانا چاہتی تھی۔ مگر حیات خاں نے بڑھ کر روکا۔

حیات خاں کے کرخت ہاتھوں کی گرفت کو محسوس کر کے اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ایک دیوانہ وار کوشش کی۔ اور اپنی کمزوری سے مایوس ہو کر ایک دردناک چیخ ماری۔

حیات خاں نے کڑک کر کہا "کون ہے تو چڑیل۔"

عورت نے جس کا رنگ لحظہ بہ لحظہ زرد پڑتا چلا جاتا تھا' گلوگیر آواز میں جواب دیا "میں لیلےٰ کی پیش خدمت ہوں۔" اس کی سرمگیں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

حیات خاں ہنس پڑا۔ اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔ "جاؤ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

پیش خدمت نے نیم تبسم سے حیات خاں کی طرف دیکھا اور خیمہ کے اندر چلی گئی۔ مرتضےٰ خاں بھی جس کے دماغ میں ایک نئی تجویز کا خاکہ گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا اس کے پیچھے دبے پاؤں چل پڑا۔

لیلےٰ ناچ رہی تھی اس کے مشاق پاؤں کے ساتھ بندھے ہوئے گھونگھروؤں کے گہرائی میں موسیقی کی جھنکار پیدا کر رہے تھے۔ طوائفوں کا گروہ اس کی طرف دیکھ کر اپنی کم مائیگی کو ایک حاسدانہ ہنسی میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں میں غرور کی تمام تمکنت حسن کی تمام

کشش جوانی کی تمام مستی کو لے کر ایک بجتے ہوئے بیل کی طرح' اپنے مرمریں جسم کو جس کی صباحت ململ کے کپڑوں سے پھوٹ نکلی تھی۔ موسیقی کے ہر ایک تال پر سبز شاخ کی طرح لچکاتے ہوئے آگے بڑھی اس نے تمام خیمہ کا تیزی سے چکر لگایا اور چشم زدن میں وہ شیر علی کے سامنے تھی

شیر علی کی آنکھیں لیلےٰ سے ملیں، اور اس نے اس ناچتے ہوئے رنگ و بو کے پیکر میں کسی بھولے ہوئے زمانہ کی یاد کو منعکس دیکھا وہ ابھی آنکھیں پھاڑے ہوئے سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ لیلےٰ کی پیش خدمت داخل ہوئی۔ اور لیلےٰ فوراً اپنے گھونگھروؤں کی جھنکار کو کانوں میں چھوڑتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

شیر علی غور سے لیلےٰ کی طرف دیکھ رہا تھا مگر آخر کار اس نے چونک کر آواز دی "۔۔۔ سہیل خاں ۔۔۔" "حضور حاضر"

جواب دینے والا خود بھی آ پہنچا۔ وہ ایک مکاری کا پتلا معلوم ہوتا تھا دبلا پتلا کوتاہ قد کوتاہ گردن' تنگ پیشانی چھوٹی چھوٹی آنکھیں وہ مسکرانے لگا۔

شیر علی نے سرگوشی سے پوچھا۔ "سب انتظام مکمل ہے نا۔"

"پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

"تلاشی کوئی معتمد آدمی لیتا ہے؟" یہ سوال ذرا گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا گیا۔

"تلاشی نیابت خاں لیتا ہے۔ جو فوج میں سب سے زیادہ بیوقوف اور آپ کا سب سے زیادہ خیر خواہ نوجوان ہے۔"

شیر علی ۔۔۔ ایک مسکراہٹ سے آشنا ہوئے اور اس نے گویا کسی نوپیدا شدہ شبہ کو ذہن سے بالکل دور کر دیا۔ پھر اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "اچھا تم جا سکتے ہو۔"

نیابت خاں تین دفعہ تسلیم بجا لایا۔ اور الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

لیلیٰ پھر کوئی فتنہ خوابیدہ بیدار ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ہلال نما لکڑی کا نیام تھا۔ جو پیش خدمت نے اسی وقت ایک نقرئی پاندان سے نکال کر دیا تھا۔ ناچتے ہوئے لیلیٰ نے اسے پنجی باہوں پر اچھالا اور پھر ایک رنگین تیتری کی طرح نہایت تیزی سے ایک چکر لے کر ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ فن رقص کے اس کمال سے وہ ہر ایک کو متحیر کرتے ہوئے شیر علی کی طرف تیزی سے بڑھتی گئی۔ دس دس قدم کے بعد وہ ناچ کے دوران میں کورنش کے لئے جھک جاتی دائیں ہاتھ سے نیام کو ہوا میں اچھالتی۔ اور وہی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر جھک کر بائیں ہاتھ سے گرتے ہوئے نیام کو روکتی۔

وہ تیزی سے بڑھتی گئی۔ حتی کہ شیر علی کے عین مقابل میں آ پہنچی۔ شیر علی دنگ ہو کر لیلیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکا یک لیلیٰ نے نیام ہوا میں اچھالا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح حرکت دی کہ ہوا سے نیچے آتے وقت نیام کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ لیلیٰ پھر کورنش کے لئے جھک گئی۔ اور اب دونوں ٹکڑوں کی جگہ لیلیٰ کے بائیں ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا آبدار خنجر تھا۔ خنجر ایک لمحہ میں شیر علی کے دل میں اتر جاتا کہ یکا یک خیمہ کا ایک حصہ جو لیلیٰ سے بالکل قریب تھا۔ تلوار کی تیز دھار سے چاک کر دیا گیا۔ اور مرتضیٰ کی زبردست گرفت نے لیلیٰ کا ہاتھ ہوا ہی میں روک دیا۔

شیر علی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیلیٰ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

۳

دوسرے دن لیلیٰ کا کورٹ مارشل ہوا۔ ایک خیمہ ضروری سامان سے آراستہ کر دیا گیا۔ صدر میں شیر علی اور دائیں طرف مرتضیٰ خاں لیلیٰ کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے وقوفانہ وقار سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

سامنے سپاہیوں کے ایک دستے کی حراست میں لیلیٰ کھڑی تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ مگر وہ

مدافعانہ نظروں سے شیر علی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

شیر علی نے ہر قسم کے جذبہ سے خالی آواز میں کہا۔ ''صاحبان کیا مجرم کے بیان شروع ہوں''

مرتضےٰ خاں اور حیات خاں نے کہا۔ ''ہاں۔''

لیلےٰ کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی اور پھر شیر علی نے جو اس وقت اپنے نافذ کردہ اصول کے مطابق خود ہی منصف اور خود ہی مدعی تھی۔ لیلےٰ کی طرف دیکھ کر کہا کہ:

''کیا وجہ ہے کہ تمہیں موت کی سزا نہ دی جائے۔''

''وجہ تم جانتے ہو۔ مگر میں اس کی آگاہی کے لئے گذشتہ سال کے واقعات کی اجازت طلب کرتی ہوں۔''

شیر علی نے پھر پوچھا۔ ''صاحبان آپ کو کوئی اعتراض ہے۔''

مرتضےٰ خاں اور حیات خاں کے منہ سے نکلا۔ ''کوئی نہیں کوئی نہیں'' اور خاموشی چھا گئی

''دو سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں ایک دوشیزہ تھی۔ میری پرورش عشرت اور گناہ کے درمیاں ہوئی لیکن میرا دل تمام خارجی تاثرات سے آزاد رہا۔ میری بوڑھی ماں جو اپنے زمانے کی ایک جہاں دیدہ طوائف تھی' اپنی محنتوں کو اس طرح اکارت جاتے ہوئے دیکھ کر گھبرا اٹھی مگر سب بے سود ثابت ہو۔ گناہ کے اس مہیب عشرت کدہ میں جہاں میری ماں بڑے سے بڑے دام لگانے والوں کے ہاتھ حسن کو بیچا کرتی' میں ہر اثر سے بے نیاز رہی۔ بڑے بڑے رئیس زادے جو ہزاروں روپے میرے ایک تبسم کی قیمت دینے کے لئے تیار تھے واپس جاتے تو میری ماں کا دل بہت کڑھتا۔

وہ مجھے سمجھاتی۔ ''بیٹا اوپر کے دل سے ان کی خاطر داری کیا کرو۔ یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔'' لیکن اس بات پر میں بگڑ کھڑی ہوتی۔ اور وہ یہ سمجھ کر چپ ہو جاتی کہ شاید کسی دن مجھے عقل آ جائے۔ بہت عرصہ یہی حالت رہی اور ہمارے دلوں کے درمیان جو خلیج تھی۔ وہ گہری ہوتی چلی گئی۔ ماں بیٹی کی قدرتی محبت بھی اس خلیج کو عبور نہ کر سکی۔ آخر کار ہمارے دلوں میں ایک خفیہ لڑائی چھڑ گئی۔ ظاہر میں ہم نہایت میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے' مگر نفرت کا کڑوا بیج پرورش پا رہا تھا۔ وہ غالباً اس کوشش میں تھی کہ مجھے کسی رئیس زادے کے پاس اونے پونے بیچ ڈالے مگر ظاہرا اب اس نے ایسی باتوں کا تذکرہ ہی چھوڑ دیا۔

میں بھی بیکار نہیں تھی ہمارے یہاں آنے جانے والوں میں ایک غریب نوجوان بھی تھا۔ جس کی شرافت اور محبت افلاس کے بادلوں میں ستارے کی طرح چمکتی تھی۔ اس کی شریفانہ گفتگو اس کے مہذب اطوار رفتہ رفتہ مجھے ایک نامعلوم کشش سے کھینچنے لگے۔ رفتہ رفتہ میں بالکل بے بس ہو گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں اور خوبصورت چہرے نے مجھے مسحور کر لیا۔ آخر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

دیر کرنا خطرناک ثابت ہوتا۔ ہم نے بہت جلد خفیہ نکاح پڑھوا لیا اور میں اپنی ماں کی دوربین نظروں سے بچ کر بھاگ نکلنے کا موقعہ تلاش کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں بلی کی طرح میری ہر حرکت کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی مکاری کو چکمہ دے کر نکل جانا آسان نہیں۔ میری چھوٹی سے چھوٹی بات اس کے زیر نظر تھی۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ اسی اثناء میں میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میری ماں نے اس پر بہت واویلا مچایا مگر کیا ہو سکتا تھا لڑکا میرے خاوند اسمٰعیل کے سپرد کر دیا گیا۔

عید کی ایک سہانی صبح تھی' اور میں دھانی جوڑا پہنے ہوئے کھڑکی میں بیٹھی تھی' ہمارے دروازہ پر ایک شاندار فٹن آ کر رکی۔ اصیل گھوڑے باگوں کی ایک غیر معمولی سختی سے سر کو بلند کئے ہوئے نتھنے پھلائے زمین پر پاؤں مار رہے تھے۔ گاڑی سے ایک پستہ قد دبلا پتلا آدمی اترا اور ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ میری ماں کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف رہی پھر میرے قریب آ کر پرتبسم نگاہوں سے بولی۔ ''بیٹے تمہارے لئے ایک جگہ سے پیام آیا ہے تم ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔''

میں چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ آنے کو تو میں آ گئی۔ لیکن میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے' کبھی کبھی کوئی لفظ سنائی دیتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے یہ لفظ سنائی دیئے۔ ''بیشمار دولت' بہت دور'' لیکن میں ان الفاظ میں کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ شاید وہ کسی خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔ جو بہت دور تھا یا کسی ناچ مجرے کا ذکر تھا' جس میں بے شمار دولت ہاتھ آنے والی تھی' اسی ادھیڑ بن میں کھڑے کھڑے میرے گھٹنے تھک گئے۔ پنڈلیوں میں درد ہونے لگا۔ میں واپس آنے کو تھی کہ یکا یک میں نے اپنی ماں کو غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کچھ کہتے ہوئے سنا۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ مجھے ایک آواز سنائی دی۔ جو بظاہر میری ماں کی معلوم ہوتی تھی۔

''مجھے منظور نہیں........''

میں نے اتنے ہی لفظ سنے پھر یوں معلوم ہوا گویا کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ ایک بار چپ ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا' گویا نووارد اسے سمجھا بجھا کر دھیمی سنجیدہ آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔

مجھے پھر اپنی والدہ کی آواز سنائی دی۔ ''میں جو ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے منظور نہیں''

اس کے بعد تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''بہت اچھا..''

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا' نووارد آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترا اور گاڑی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ میں کوچوان نے سڑاک سے ہنٹر مارا اور اصیل گھوڑے دھاک دھاک کرتے ہوئے آگے

بڑھے۔ میں بہت عرصہ تک نظر سے غائب ہو جانے والی گاڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ میرے ذہن میں بے شمار دولت 'بہت دور' کے فقرے نوک نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔ آخرکار میں نے منہ موڑا تو اپنی ماں کو پشت پر پایا۔

میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''اماں کیا بات تھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں تمہارے لئے ایک رئیس زادے کا پیغام لے کر آیا تھا میں نے رخصت کر دیا۔''

زیادہ کرید کر پوچھنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ میں خاموش رہی۔ حیدر کی چٹھی بکل میں [illegible] ذہن سے بالکل نکل گئی۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد جب نرم نرم سویوں کی پلیٹ میرے سامنے رکھی گئی تو میں نے فکر سے آزاد ہو کر خوب جی بھر کے کھائیں۔ لیکن سویاں کھاتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے فوراً دھوکے کا شبہ ہوا۔

میں نے اپنی ماں کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''اماں تم نے مجھے کیا کھلا دیا؟''

اس نے جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ میں اسے مارنے کے لئے اٹھی مگر مجھے ایک چکر آیا اور میں بے ہوش ہو کر کمرے میں گر پڑی۔

جب مجھے ہوش آیا۔ میرے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ کمر شدت سے دکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ میرے چاروں طرف تاریکی مسلط تھی۔ میں نے چاروں طرف سہارے کے لئے ہاتھ مارے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی گہرے کنوئیں میں گری جا رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ میرے چاروں طرف سیاہ ریشمی پردے تھے۔ میں نے آہستہ سے ایک پردہ اٹھا کر دیکھا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک اونٹ پر کجاوے میں سوار ہوں اور اسی کے ہچکولوں سے میرا بدن چور چور ہو رہا ہے۔ میں پھر لیٹ گئی۔ میرے ارد گرد گھوڑوں کے سموں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے تعجب سے پھر پردے اٹھا کر دیکھے۔ ایک طرف وہی والا پتلا شخص تھا۔ دوسری طرف ایک نہایت تومند نوجوان آدمی تھا۔ جو ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھا۔

شیر علی نے جواب دیا۔ ''ہاں جس تومند نوجوان کا تم ذکر کر رہی ہو وہ میں تھا۔ اور ابھی وہ دبلا پتلا شخص بھی آ جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر شیر علی نے آواز دی ''سہیل خاں۔''

سہیل خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

لیلےٰ نے اس کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں یہی ہے'' پھر اس نے بیان شروع کیا۔

"ایک نہایت لق و دق بیاباں سے ہوتے ہوئے ہم آخر کار منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ اور مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔"

لیلیٰ نے مرتضےٰ خاں اور حیات خاں کو جو اس تمام بیان سے متاثر ہو کر دل ہی دل میں لیلیٰ کے طرف دار ہو گئے تھے ہی مخاطب کرتے ہوئے کہا "اسی رات آپ کا سردار میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں وہ لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا اور میری مسہری پر بیٹھ گیا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مگر اس نے میرے منہ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف پھیر لیا اور پیار بھری آواز میں کہا۔ 'میری جان محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔"

میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔

اس نے پھر کہا۔ "دیکھو میں تمہارے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں مر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں تیس ہزار روپیہ دے کر خریدا ہے۔ تمہیں تمیں ہزار! مجھ پر رحم کرو۔ اُف اُف میری طرف ان آنکھوں سے نہ دیکھو۔ ان سے آگ برستی ہے۔"

وہ پھر میری طرف بڑھا۔ مگر میں نے اس کو روک کر کہا۔ "خاموش! تم نہیں جانتے کہ تم ایک بیاہی ہوئی عورت سے گفتگو کر رہے ہو۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیاہی ہوئی۔ بیاہی ہوئی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ہاں بیاہی ہوئی تمہیں دھوکا دیا گیا۔ تم مسلمان ہو۔ اس پاک رشتہ کی عزت کرو۔"

تھوڑا عرصہ وہ خاموش بیٹھا میری طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک بڑھ کر میری طرف آیا اور میری گردن کو دبا کر بولا۔ "بتا وہ کون شخص ہے میں اسے قتل کر کے تمہیں اس پاک رشتے سے آزاد کر دوں گا۔"

میرا گلا بند ہو گیا۔ میری آنکھیں باہر نکل آئیں میرے منہ سے ایک چیخ نکلی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور نرم آواز میں بولا۔ "اف پیاری میں نے تم پر بہت ظلم کیا۔ اچھا آئندہ سے میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ مگر تمہیں رہنا یہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہ بتاؤ گی کہ تمہارا خاوند کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ تمہیں چھٹکارا نصیب نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد وہ روز رات کو میرے پاس آتا رہا۔ وہ مجھے سمجھاتا۔ اس کی آواز جذبات کے وفور سے بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے کہتا "لیلیٰ لیلیٰ تم کسی مجہول الاسم خاوند کے لئے سوز دروں نہیں آؤ تم ایک

فوج کی تمام عظمت تمام شوکت تمام سرداری کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھو۔ '' یہ کہہ کر وہ میرے قدموں پر گر جاتا۔

لیکن میں اسے ٹھکرا دیتی۔ ہاں اس طرح ٹھکرا دیتی۔ جس طرح ایک شہزادی اپنے ذلیل سے ذلیل نوکر کو، اپنے حنائی پاؤں کی ایک رنگین ٹھوکر سے ٹھکرا دیتی ہے۔ مگر اب اس کی سعادت اور خوش خواری جاتی رہی۔ وہ ایک وفادار کتے کی طرح میری ٹھوکریں کھا کر میرے پاؤں میں پڑا رہتا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس کی سفاک سپاہیانہ اور گہری محبت مجھے متاثر کرنے لگی مگر میں نے اس مکار خیال کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہ پکڑنے دی۔ میری دلی کوفت دن بدن ترقی پر تھی۔ میں حیران تھی کہ اسمٰعیل ابھی تک میرا پتہ کیوں نہیں لگا سکا۔ محبت میں تو وہ طاقت ہے کہ پہاڑوں کو پانی کی طرح بہا دے۔ پر اسمٰعیل تھک کر بیٹھ رہا ہے۔ کیا اس کی محبت عارضی اور جھوٹی تھی۔ میں نے تو اس کے لئے سب بڑی قربانی دی تھی۔ مگر آہ مرد عورتوں کی قربانیوں کو اپنی مردانگی کا خراج سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی خیالات میں ایک رات میں اپنے وسیع اور شاندار کمرے میں بیٹھی تھی' ہاں اسی طرح بیٹھی تھی' جس طرح کوئی آزاد اور وحشی پرندہ سونے کے ایک خوشنما قفس میں بیٹھا ہو۔ کمرے کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہوا کسی مجروح انسان کی طرح کراہتی ہوئی ریت کے ذروں کو اپنے دوش پر لئے ہوئے سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔ ایک لمپ کی مدھم روشنی فضا کی تاریکی کو ڈراؤنا اور بھیانک بنا رہی تھی۔ میرے دل کا چراغ بھی بجھ چکا تھا۔ اسماعیل کے آنے سے مایوس ہو کر میں اضطراب کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔

یکایک داہنی طرف سے مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ گویا کوئی لوہے پر ریتی رگڑ رہا ہو۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے داہنی کھڑکی کی طرف دیکھا مجھے ایک مبہم سی سیاہ شکل دکھائی دی۔ جو کھڑکی کی سلاخ کو ایک ہاتھ سے مضبوط تھامے دوسرے ہاتھ سے سوہان کی مدد سے سلاخ کو کاٹ رہی تھی۔ میں ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس شخص نے لب پر انگلی رکھ کر کہا ''چپ چپ'' آواز کچھ شناسا سی معلوم ہوئی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لمپ اٹھا کر سامنے کیا۔ اور روشنی کی ایک چمکتی ہوئی شعاع اسمٰعیل کے مسخ شدہ اور مکروہ چہرے پر پڑی۔ انتہائی کرب سے بے قرار ہو کر میں نے دوسری چیخ ماری اور لمپ میرے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ مگر مدھم سی روشنی میں میں نے اسمٰعیل کو کمرے میں کودتے ہوئے دیکھا اس کے ہاتھوں میں ایک چوروں کا لمپ تھا اس نے وہ لمپ میرے چہرے کی طرف پھرایا اور دانت پیس کر کہا '' سردار شور مچا کر آدمیوں کو اٹھا دینا چاہتی تھی۔ ''

یہ کہہ کر اس نے لمپ میز پر رکھ دیا۔ حیرت انگیز واقعات اس تیزی اور شدت سے عمل میں آ رہے

تھے کہ میری زبان بند ہوگئی تھی' رات کا خوفناک وقت اسماعیل کا چوروں کی طرح آنا پھر اس کی یہ حیرت انگیز گفتگو خواب کے سے واقعات معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اب گہری جھریوں کے نشان تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے وہ ابھی تک میری طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن عورت کی محبت جلدی فنا نہیں ہوتی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اسمٰعیل''

وہ دیوانوں کی طرح ہنسا۔ اہاہاہا.......... اسماعیل ہا اسمٰعیل تمہارا پہلا خاوند۔''

میں ڈر گئی۔ میں نے آہستہ کہا۔ ''اسمٰعیل تمہیں کیا ہوگیا۔ دیوانے تو نہیں ہوگئے؟''

اُس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ ''دیوانہ' ہاں تم سچ کہتی ہو۔ مجھے ایک عورت کی بیوفائی نے دیوانہ کر دیا۔''

میں نے چلا کر جواب دیا۔ ''بیوفائی! تم کسے بیوفائی کا الزام دیتے ہو۔''

اُس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا ''تم کو۔''

میں نے گردن جھکا لی۔ یہ تھا میری مصیبتوں کا انجام میری کلفتوں کا خاتمہ جس کے لئے میں نے سب کچھ گوارا کیا' وہ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے بیوفائی کا الزام دے رہا تھا' اس ناگن کی طرح جس کے بچوں کو کسی نے کچل دیا ہو۔ میں نے سر اٹھا کر طعن سے کہا۔ ''پھر تم یہاں کیوں آئے ہو۔''

''مجھے امارت کبھی نصیب نہ تھی تم ہمیشہ سے امیر تھیں اب بھی ہو۔ جس سے تم نے اب بیاہ کیا ہے۔ اس کے پاس دولت ہے عشرت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم ہو۔''

اب اسے سمجھ نا بیکار تھا۔ خدا جانے وہ کن صعوبتوں میں پڑ کر اس حالت تک آ پہنچا تھا۔ کہ اپنی تمام مردانہ غیرت کو چھوڑ کر مجھ سے روپیہ مانگنے آیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں کسی اور کی بیوی ہو چکی ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے یقین کو نہ بدل سکتی تھی' یہ سوچ کر میں خاموش ہو رہی

اُس نے پھر کہا۔ ''میں جوا کھیل کر آ رہا ہوں' ہار کر آ رہا ہوں۔ تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینا ہوگا۔''

میں نے جل کر کہا۔ ''میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔''

اُس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ ''یعنی تم کچھ نہ دو گی۔''

''کچھ نہیں۔''

وہ خاموشی سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور نیچے ''گل محمد'' کہہ کر آواز دی۔ میں نے تعجب سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جہاں اب ایک سیڑھی لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص اس سے سیڑھی سے کھڑکی تک آیا۔

اس کے ہاتھوں میں ایک پھٹے ہوئے چادرے میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ جو اس نے اسمٰعیل کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر لئے ہوئے میری طرف آیا اور اس کا منہ کھول دیا

"پہچانتی ہو۔ یہ کون ہے؟ تمہارے چہروں کی شباہت بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی یقین دلا دے گی کہ یہ تمہارا ہی بچہ ہے' اگر تم اپنی بات پر قائم رہتیں تو میں اسے شیر علی کے پاس لے جاتا اور پھر اس کی اور تمہاری زندگی کا خدا حافظ۔"

میرے سینے میں دودھ بہنے لگا۔ "میرا بچہ" کہہ کر میں نے اس کے ہاتھوں سے اس جان کے ٹکڑے کو چھیننا چاہا۔ مگر اس نے مجھے روک دیا۔ اور کہا۔ "بس اب یہ بچہ صرف میرے کام آئے گا۔ تم یہ جواب دیتی ہو۔"

میرا غرور خاک میں مل گیا۔ میں اس کے سامنے دو زانو ہو کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے منت کی ۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! رحم کرو۔ میں ابھی تک تمہاری بیوی ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف مڑا اور کھڑکی کی راہ سے نیچے اتر گیا' میں نے اسے بہت روکنا چاہا۔ مگر وہ مجھے دھکیل کر نکل گیا۔ میں نے باہر کے دروازے سے کان لگا دیئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے شیر علی اور اسمٰعیل کی آوازیں سنائی دیں میں نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر وہ مقفل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگرچہ شیر علی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس کی محبت رقابت کے اس زندہ ثبوت کو کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ وہ ضرور اسمٰعیل اور میرے معصوم بچے کو قتل کر ڈالے گا۔ میں نے کمرے میں ایک مقید شیرنی کی طرح چکر لگانا شروع کر دیئے۔ اور یکایک میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سٹیبل اور اس کا ساتھی مکان سے نکلے اور بھاگتے ہوئے صحرا کا رخ کیا۔ ان کے پیچھے سہیل خاں اور دو ایک نوکر مشعلیں لئے ہوئے نکلے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ مفرورین بہت دور نکل گئے ہیں۔ واپس مکان میں داخل ہو گئے۔

تھوڑے عرصے بعد جب مکان میں خاموشی چھا گئی۔ میں خدا کا نام لیکر کھڑکی سے نیچے کود پڑی اور اٹھ کر اس طرح بھاگی جس طرح کوئی ہرن شکاری کی بندوق کی آواز سن کر بھاگتا ہے۔

۴

یہ کہہ کر لیلےٰ نے شیر علی کی طرف دیکھا۔ اور بولی "میں اس امید پر زندہ تھی کہ ایک دن تم سے اپنے معصوم بچے کا انتقام لوں' میں ناکام رہی مگر میری روح کو یہ تسلی ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔"

شیر علی نے اٹھ کر کہا۔ "صاحبان مجھے اس قصے کو اختتام تک پہنچانا ہے...... .... سہیل خاں۔"

سہیل خاں آگے بڑھا۔

''جمیل یہاں ہے۔''

تیمور خاں گیا اور چند لمحوں میں ایک معصوم بچے کو لے کر آیا۔ تیمور علی نے بچے کو جو اس مجمع سے خوفزدہ ہو گیا تھا، اپنے ہاتھوں پر لیکر کہا۔ ''بیٹی یہ ہے تمہارا بچہ۔ اس رات جس کا تم ذکر کرتی ہو، میں نے تمہاری تمام گفتگو سن لی تھی۔ میں نے جمیل کو مار کر باہر نکال دیا تھا۔ کیونکہ وہ کسی صورت سے تمہارے لائق نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دوسرے دن تمہیں تمام واقعے کی خبر دوں۔ مگر تم غائب ہو چکی تھیں۔ اب تک میں نے اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالا ہے۔ یہ تمہاری امانت تمہاری نذر ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ لیلے کے بازو کھول دیئے گئے۔ وہ بیتاب ہو کر اپنے بچے کی طرف بڑھی جو مہر و محبت کی کشش سے خود بھی اس طرف کھنچا جا تا تھا۔ لیلے نے اسے گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ جمیل بے اختیار لیلے کے سینے سے لپٹ گیا اور کہا۔ ''اماں۔''

خیمے سے تمام لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے وہ محسوس کرتے رہے کہ انہیں اس مقدس اور آسمانی خوشی میں حارج ہونے کا کوئی حق نہیں۔

زندگی

عاشق بٹالوی

صبح چند مہمان آ جانے کی وجہ سے تمام دن ان کی خاطر مدارات میں صرف ہو گیا۔ عصر کے قریب بمشکل مطالعہ کے لیے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہر کی ہوا خوری بھی ضائع ہو گئی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہو کر صحیفہ فطرت کا مطالعہ کیجئے یا یونہی چہل قدمی کے لیے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا ہوں گا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کے دیکھا تو ایک دبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا۔ گہری شام کے غلیظ دھندلکے میں اسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی۔ لیکن جب اس نے مانوس اور شیریں آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہو سکتی تھی، میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے ,,اصغر،، کہہ کر بے تحاشا سے لپٹ گیا معانقہ ختم ہوا۔ تو سب سے پہلے میں نے اس کی ظاہری وضع قطع پر نکتہ کشائی کی، جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی ہو رہا تھا۔ پرانے بے تکلفانہ انداز میں اس کی کمر پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ,,خیرت تو ہے؟ تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمہیں پہچان بھی نہ سکتا۔،،

اس نے رکتے رکتے کہا۔ ,,میں ملتان سے آ رہا ہوں، راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہو گیا۔،،

ہمدردی کی بجائے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا، پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ,,واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے تمہارے کپڑوں کے بکس کا گم ہو جانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے، بلکہ اس سے بھی شدید، جیسا کسی مصور، نقاش یا سنگتراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کیے ہوئے نوادر کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثے سے صنعت اور فنون لطیفہ کی دنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟،،

اسنے کہا۔ ,,بندۂ خدا مذاق پھر کر لینا۔ پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام و طعام کا

بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھہروں گا،،

،،بسم اللہ۔ آیئے۔،،

میں سیدھا اسے اپنے مکان میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ اور لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی، تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو نہایت لاابالیانہ طریق سے اتار کر میز پر پھینک دیا۔ اور زیر لب گنگنانے لگا۔ لیکن اس کی ہیئت مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ ہنسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل آج کا اصغر اس اصغر سے جسے میں جانتا تھا۔ کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اداس مضمحل سا چہرہ معمولی ادنے درجے کے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں کھویا پن اور کہاں وہ چاق و چوبند، خوش طبع، انگریزی معاشرت کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرت کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اس کا حسن مذاق مسلم اور اس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمارے حلقہ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ تو میں نے کہا۔،،ہاں، تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟،،

،،ارے بھائی کوئی بات ہو تو کہوں۔ سراسر میری ہی غلطی تھی۔ میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی، اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں۔ ریل میں بیٹھا تو بھی وہ ادھیڑ بن طاری رہی اور میں اس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ بعد ازاں میں نے محسوس کیا کہ وہاں دو شخص ایسے موجود تھے۔ جو اپنی حرکات سے بہت مشکوک چال چلن کے معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی۔ اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ٹرنک غائب کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے وہیں ٹھہر جاؤں تاکہ ان کو تلاش و تفتیش میں سہولت ہو۔ مگر میں نے سوچا مضی ما مضی، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا۔ ورنہ جان تو باقی ہے ان کو ضروری ہدایات دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیش نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں۔ وہاں لباس ایسی اہم چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہوگا ،،

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔ ،،اصغر، ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے۔ تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑ بن میں

گزار دو خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بر [illegible] شدت [illegible]
ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوت مدافعت رکھتے ہیں تو میرے [illegible] رتی۔
اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلّی معلوم ہوتی ہے۔۔۔

"تعلّی؟۔۔۔" اصغر چمک کر اٹھ بیٹھا۔۔۔ "تم دیکھتے ہو کہ میں [illegible]
ہو کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو [illegible] ہے کہ میں نے اس بات [illegible] نہیں کی کہ
میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ [illegible] زندگی کی
ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اور منجملہ ان ہال [illegible] حیات و [illegible]
لینے کا دعویٰ تو نہیں ہاں جس نے بزعم خود ایک اسرار از جان لیا ہے۔ [illegible]
ہے۔ اسی روشنی میں نے اپنے لیے چند اصول وضع کر لیے ہیں۔ جو میری رہ [illegible] تم ان باتوں
پر ہنستے ہو۔ لیکن ایسی ہنسی میں پہلے کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں تم مجھے [illegible] مجبور نہیں
کر سکتے۔ لاریب مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کو رفع کرنے کے لیے میں ہمیشہ [illegible] میں مصروف رہتا
ہوں۔ آخر انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردش مدام سے گھبرا نہ جاؤں۔ ہر چند [illegible] جانتا ہوں۔
گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیل حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن میری [illegible] ہوتا تو اس سے یہ
لازم نہیں آتا کہ وہ زریں اصول جس کی حقانیت اور صداقت پر مجھے [illegible] کی [illegible] اعتقاد ہے
اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اس وہم کہتے ہو۔ لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی ایسی چیز
مادی یا غیر مادی بھی ہے جس کی بنیاد وہم نہ ہو؟ عزیز دوست، انسان کے تمام [illegible] و معیار اعتباری
ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر [illegible] کرنے کے کیا معنی؟ تم
میرے ہی کہنے سے اس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو، ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں
جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ علت و معلول کی اس
دنیا میں جہاں پابند [illegible] اور بے جان ایک غیر مختتم سلسلے میں منسلک ہیں۔ اسباب و نتائج کی قطعی کڑی سے کیونکر
آزاد ہو سکتے ہیں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشا [illegible] اسباب [illegible]
حاصل کرنے کا متمنی ہوں مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر [illegible]
ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔۔۔

[illegible] خدا معلوم وہ اس کے بعد کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتہً ایک قہقہہ لگا کر اسے خاموش کر
دیا

میں نے کہا۔۔۔ "سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کے۔ آئینہ لاؤں حضور [illegible] کہ آپ [illegible]
اصول کی حقانیت پر ایمان آ جائے۔ ذرا اس چہرے کو دیکھو جس میں خون زندگی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا۔

اپنی جھریوں سے اٹی ہوئی پیشانی دیکھو۔ رخساروں کی زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ذوق جمال و آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صفر کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کردوں تاکہ یہ گفتگو پس منظر کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابل التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں رہے۔ جن میں سے ایک سال کے لیے میں اور وہ ہم کمرہ بھی تھے۔ صفر کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہ تھے۔ والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات کشیدہ نہ تھے تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے علاوہ کر باوہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ سے اصغر کی صرف اپنی زندگی اس کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے آپ کے یونہی فرصت کا وقت گزار دیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا حالات کی اس ناساعد روش نے جو یقیناً مجھ ایسے ذکی الحس انسان کے لیے بے حد تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی، صفر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور قوت ارادی پیدا کر دی۔

سماج میں فرد کی حیثیت سے انسان پر بہت سے ایسے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں سے مروت، بیوی بچوں کی الجھن، بھائی بہنوں کی محبت، تعلقات کی ایسی سینکڑوں زنجیروں نے ہمیں سماج کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ دراصل انسانی زندگی ایسے ہی خونی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے۔ لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں۔ اور اس کا قیام بھی ممکن ہے۔ جہاں انسان محض اپنے لیے زندہ رہتا تھا ایسا قائم بالذات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لیے آمادہ کار ہو جائے جس کے لیے کل کائنات سمٹ سمٹ کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو، جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے کسی خندۂ استہزاء کے خوف سے یکسر آزاد ہوں، بلا شبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیا دار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں۔ لیکن سچ پوچھیے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اول اول اصغر سے ملا تو اسکی اسی قسم کی آزادی و بے عنانی نے مجھے

بھونچکا سا کر دیا۔ کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعت طلبہ میں بہت کم حریف رکھتا تھا لیکن چونکہ اس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریق سے تقسیم کر رکھے تھے۔ اس لیے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا۔ پڑھنے پر آتا تو زندہ شب زندہ دار کی طرح رات کو آنکھ جھپکنا بھی حرام سمجھتا تھا۔ میں کبھی اسکے لاابالی پن پر لب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ ,, میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں۔ کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصود زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدے کی صلاحیت پیدا نہ کرے، ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لیے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے۔،، اور پھر عالم سرخوشی میں یہ شعر پڑھتا۔

مومن بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہ ہو!

دو سال کے بعد جب اتفاق سے میری اور اس کی رہائش ایک ہی کمرے میں ہوئی تو اس کے حالات واطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اس کا معمول تھا۔ کہ شام کا کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم دس بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا۔ خوبی قسمت سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت بذلہ سنج اور زندہ دل تھے۔ انہوں نے جب بھی سرزنش کی۔ اصغر نے ہنس کر جواب دیا۔ ,, حضرت! نوع انساں پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں۔ بعض کو قدرت مستثنیات کے لیے پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے ،،

اس کی صحبت یقیناً افزائش مسرت کا موجب تھی مگر جب وہ آدھی رات کو آکر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں، اس کا تو مہینے میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلاف معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بڑی بیتابی سے پوچھنے لگا۔ ,, خیر ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے؟ ،،

میں چلانے لگا۔ ,, تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا دن بھر تو کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے۔ رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ گر ایسی ہے آوارگی دماغ میں سما گئی ہے۔ تو کالج کو خیر باد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لیے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے ،،

وہ بستر سے اچھل کر مجھ سے آلپٹا۔ ,, دوست خفا ہو گئے؟ سچ پوچھو تو تمہارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گزر رہی ہے۔ ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید اور بند میں رہنے کا سلیقہ کب تھا۔ یہ تمہی کی

کہ ملاقات کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں ہے۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصول علم کی سینکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لیے کنویں کا مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو۔ دنیا جہان کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو، پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم کتابوں کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے یا ذاتی تجربات سے۔“

صفدر محبت کا طالب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق اس کا نظریہ بھی عجیب تھا۔ وہ کہتا تھا، ”مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو لازمہ حیات تصور کرتے ہیں۔ چودھویں صدی کی شعدہ آشنا دوستیاں پانی کے بلبلے اور آنکھ کے تارے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ بھلا ایسی ناپائیدار چیز وہم یا فکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہو گا۔ جو گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتے اور ایام رفتہ کو یاد کر کر کے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بے چارے اسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لیے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔ نادان نہیں سمجھتے کہ اس تغیر پذیر عالم رنگ و بو میں اکثریت ان کی ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ بھائی اچھا، میں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقت فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لیے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں۔ اسی طرح دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں خلل پیدا نہیں ہو سکتا۔“

اصغر صرف لباس کے معاملے میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج صفا خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعے سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ، ”میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیات انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے ان کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں۔ تمدن جدید کے مطابق شاندار لباس زیب تن ہو اور واقعات عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو تو دنیا کو الو بنا لینا بڑی بات نہیں۔“

ایک دفعہ تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا۔ جس میں شرکت کے لیے اس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی حسب پسند نکٹائی نہ تھی۔ ادھر مہینے کا اخیر تھا۔ اور جیب خالی

ہو چکی تھی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفے کی درسی کتاب (جو اس نے ابھی چند روز ہوئے [illegible] خریدا تھا) ایک کتب فروش کے ہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی۔ اور [illegible] خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کی بوقلمونی کے لحاظ سے اصغر ایک اچنبا تھا۔ ہمیشہ خوش رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کارکنانِ قضا و قدر نے کبھی حکومت پنجاب کی کرسی وزارت مجھے بخش دی تو [illegible] کے باوجود میں تھوڑا بہت مقروض ضرور رہوں گا۔ [illegible] اس سے زیادہ وقعت نہ تھی [illegible] ایک سطحی نگاہ رکھنے والے شخص تصور کرتے تھے۔ جسے حالات دنیا کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا۔ اس لیے بعض سنجیدہ مزاج دوستوں کو بھی اس سے شکایت تھی لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلیاں دیکھ دیکھ کر زیر خند ہونے کی عادت ہو گئی تھی۔ [illegible] کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا تھا اور نیکی بدی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس سے وہ واقف نہ ہو۔ میں اس کی وسعت نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ بے خبری اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا۔ خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کر لیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بن کر گزرا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی نگاہ میں رنگینی داخل کر لو اور کل کائنات قوس قزح کی طرح نظر فریب ہو جائے گی۔ طبیعت میں استغناء پیدا کر لو تو جھونپڑوں میں محلوں کے عیش اٹھاؤ گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اس کی ذہانت اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ اس کا تخیل طوفان زدہ جہاز کی طرح ہمیشہ پریشان و مضطرب رہتا تھا۔ کچھ شاعر، کچھ واہی، قدرے مریض اور اس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہد ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا۔ وہ اصغر کو ہر چگ کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اصغر صاحب تھے کہ اس نام کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلہ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا۔ وہ کہنے لگا۔۔۔ دیکھو بھائی وحید اگر چندے تمہاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہ کنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی۔ اور تم ان کے جانشین کی حیثیت سے مسند تاریخ پر رونق افروز نظر آؤ گے۔ اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدان عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو تمہارا یہ طریق عمل بہت موزوں ہے لیکن اگر زندہ رہنا اور زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو خدا کے لیے اس نیک بخت کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے سنتا ہوں کہ تمہاری محبوبہ ہندوستان کے جذبات کش طرز انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے

کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم کیوں ہمالیہ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی
کمزوری کا نام ہے اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کر ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے۔ جہاں خون کا
جوش زیادہ ہوا محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ میں حیران ہوں کہ کیا غلام ہندوستان میں اور
مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ ایزاد کر دیا جائے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر
کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا لینا، ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا، دنیا کو
دھوکے کی ٹٹی سمجھنا، جنت والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دینداری میں
داخل ہے تم مردوں جیسا ... آنکھیں بند کر کے چپ چاپ گزر رہے ہو حالانکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں، معمولی
معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے موجود ہیں، تمہیں زبانِ حال سے پکار
پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ کوئی بستر علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی فکر فردا اور غم ماضی میں جان گھلا رہا
ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم ابھی تک بحر حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا
کہ سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گراں قدر دفینے اور زر و جواہر کے عظیم الشان انبار مدفون ہیں۔
کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد و معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گزر
جاتا ہے اور تم اس جانفزا شمیم کو مقید کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گزرتے جائیں گے
تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ ان کی عطر بیزی سے اپنے دل و دماغ کو مسرور بناؤ اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی
وسعت بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں۔ اور پھر ان دنیاؤں میں
جاندار مخلوق بھری پڑی ہے۔ اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشم تخیل کے سامنے لاؤ۔ اور سوچو کہ ارض
وسما کے درمیان اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غار عمیق کے کنارے کھڑی باد
مخالف کی تندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنےٰ سا اشارہ تمہیں
ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائیداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر پر سے صحیح و سالم اٹھنے کا
یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے
رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا اوہام و ترددات تمہاری کم ہمتی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو برتو اور
سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا اس نقطہ پر نہیں آ ٹھہرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا
درکار ہے؟ اور پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی کو فاقوں مرتے یا شارع عام پر برہنہ جسم پھرتے
دیکھا ہے؟ یقین جانو کہ ہر شخص قوت لایموت کے مطابق کھا رہا ہے اور منظر عام پر برہنہ پھرنے والے کو
خود حکومت لباس مہیا کر دیتی ہے۔ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیض نہیں
تو دیسی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسر نہیں تو بلا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ
مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر روز ان کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور

رنج و حرماں کے کل مظاہر در حقیقت کامیڈی اور ٹریجڈی کے کھیل ہیں جن سے متاثر ہونا کوئی تک نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض اور غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو ... اپنے احساس کو واقعہ کی نوعیت سے آلودہ نہ ہونے دو۔ اس عالم تغیر میں کسی کی ... ثبات نہیں ... جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے زمانے کی تبدیلیوں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں ... کا تماشا کرتے وقت ایک سائنسدان کی طرح اپنے حسیات کو، الگ علیحدہ رکھو ورنہ یہاں ... تو بے حد ارزانی ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیت دینے کے علاوہ کوئی جذبات پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی وہیں بڑے ہوئے اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح بہجت اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کو حرام کر لے تو مطالعہ کا مقصد فوت ہو گیا۔ وکیل اگر گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر تک ہی زندگی محدود کر لے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے امراض کی تشخیص اور مریضوں کے معائنے تک ہی اپنے آپ کو وقف کر دے تو اس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور باقی پہلوؤں کے لیے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں رد و بدل کرتے رہو گے۔ تو دنیا کی چیزیں زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی ,,فقیروں کا بھیس،، بنا کر ,,تماشائے اہل کرم،، دیکھو تو کبھی اہل کرم ''بن کر فقیروں کا تماشا'' دیکھو۔،،

بی اے تک ہم اکٹھے رہے اس کے بعد میں ایم اے میں آ گیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھ رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ ان کے والد اسے تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لیے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درسگاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گذر گیا اور اگلے برس اصغر نے لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل لیکن شاید اس نے اپنی آبلہ پائی کا یہی علاج سوچا تھا کہ وکالت کی وادی پر خار کے کانٹوں کی پیاس بجھائی جائے۔ ہم جانتے تھے کہ اس تیل کا منڈھے چڑھنا مشکل ہے۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے، وکیل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز صبح آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اس کی باقی زندگی انہی دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی متلاشی تھا اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی حصول جدت کی ایک سعی تھی۔ مگر اس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی

لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دنیا کو صرف دو اور دو چار سے تعبیر کریں۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو انگریزی روزنامہ کے ذریعے ملتان میں ملی۔ اس کے والد جو پہلے ہی سے اسے ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی برس پڑے اور لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف انہوں نے کہہ دیا۔ کہ ،،میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماش بینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا۔،،

یہ حالت تھی جب اصغر صاحب بے دردوں بے پروں کی صورت بنائے افسردہ مضمحل میرے پاس آئے جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا ،،اب کہاں کا ارادہ ہے؟،،

،،میں بمبئی جا رہا ہوں۔،،

،،بمبئی جا کر کیا کرو گے؟،،

وہ کہنے لگا ،،تم حیران کس بات پر ہوتے ہو؟ میں تمہاری طرح آئی۔ سی۔ ایس کے خواب تو دیکھ ہی نہیں رہا کہ اس سے کم کسی چیز پر میری تسلی نہ ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لیے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ چیزیں میں ہر حال اور ہر جگہ اپنے لیے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لیے میرے لیے لاہور، کراچی لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں۔،،

چند روپے اس کے پاس تھے کچھ اس نے مجھ سے لیے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو ڈھائی سال گذر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لیے مر چکے تھے۔ کیونکہ نہ اس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے پرانے ہم مکتب دوست، آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں ان کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے مگر ابھی طے نہیں ہوئیں۔ ممکن ہے چند ماہ تک جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے۔،،

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم کے خط معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

دل دینا

مولانا عبدالحلیم شرر

عشاق ہر صورت زیبا کو دل دے دیتے ہیں۔ شعرا کا دل ہمیشہ کسی کی زلف گرہ گیر میں اسیر رہا کرتا ہے۔ داستان گو دل دینے اور دل لینے کے افسانے بڑے ذوق شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زورِ قلم اس کوشش میں صرف ہوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ دل دینا ایک نہایت ہی آسان شے سمجھ لی گئی اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دل دیتے ہیں۔ صدہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دلدہی اور دلبری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دل دینے اور لینے کا سچا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے نا آشنا ہیں اس لیے ہم اس واقعے کو ان کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے درپیش تھے اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لیے سارا یورپ امڈا چلا آتا تھا۔ فرانس میں نواب شامپین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کرسی، جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین و زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن، جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتاب رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ دکھایا کہ لارڈ

کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور ناجائز الفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کرتا مگر کچھ زور نہ چلتا۔

اسی اثنا میں نواب شامپین تیار ہوا کہ ارض مقدس میں جا کر مسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے، جو مجاہدین فرانس سے اس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے ان کے زمرے میں لارڈ کوسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اس ارادہ کی اطلاع جب اس لیڈی فائل کو دی تو معشوقہ دل نواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دل میں کہا۔ ،، اچھا ہے۔ لارڈ کوسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتش رقابت ٹھنڈی پڑ جائے گی اور شاید ان کی بدگمانیاں دور ہو جائیں۔ ،،

اس کے بعد بہ ہزار حسرت و یاس عاشق دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں، چند جواہرات تھے اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا اور اس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں یورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی رسم تھی کہ اپنے زرہ کو ایک خوبصورت ڈوری سے خود میں اٹکا لیا کرتے، اور اس مقصد کے لیے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی۔ الغرض بصد حسرت و اندوہ عاشق و معشوق جدا ہوئے اور لارڈ کوسی نے شامپین کے نواب کے ہمراہ ارض مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ 587ھ کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقت عظیم چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہوئے تھے خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

لارڈ کوسی نے نئے مجاہدین فرنگ کے ساتھ ساحل فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور و شور سے دھاوے کرنے لگا اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں، پتھروں اور آتشبازی کے نفطوں کو ڈھال پر لیتا ہوا عکہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا اور سیڑھی لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر سر نکالا ہی تھا کہ کسی مسلمان نے تلوار کا ایسا بر دست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آ رہا اور لوگ اٹھا کر خیمے میں لے گئے۔

خیمے میں لیٹ کر لارڈ کوسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی

محبوبۂ جاں تو از یاد رفتی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے ان باقی ماندہ لمحوں کو اس کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا۔ ،، میرے مرنے کے بعد تم فرانس جانا اور اس خط کو میری دلدار مہ جبین کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اس نے مجھے یادگارِ محبت کے طریقے سے دی تھیں اسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مر چکوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکالنا اور اس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے اور اس کو بھی لے جا کر اسی آفتِ جاں کی نذر کر دینا۔،،

یہ وصیتیں کر کے لارڈ کوسی مر گیا اور وفادار ملازم نے ان پر پورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس پہنچا اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جا کر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اس کی محبوبہ کے حوالے کرے۔ اسی انتظار میں تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کوسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اس کے سر پر جا پہنچا اور کہا سچ سچ بتا یہاں کیسے آیا ہے، ورنہ تیری جان کی خیر نہیں۔ ملازم نے قسمیں کھا کر کہا۔ ،،میرے مالک تو ارضِ مقدس میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اب پیام دینے والا کون ہے؟،، لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اس کے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا۔ ،،بتا ورنہ سر زمین پر پڑا ہوتا ہوگا۔ خادم سہم گیا، ہوش و حواس جاتے رہے اور جان کے خوف سے ساری باتیں بول دیں۔ جو چیزیں ساتھ لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیں اور لارڈ کوسی کا خط بھی اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصے کی انتہا نہ تھی اور جوشِ غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا انتقام لے۔ فوراً قصر میں آ کر اپنے باورچی کو بلایا اور وہ لارڈ کوسی کا دل اس کے ہاتھ میں دے کر کہا اس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ۔ کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر ان کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا۔ ،،تمہارے شوق کے مطابق ان کو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے۔،، بیوی نے ان کبابوں کو بڑے شوق سے لیا، مزے لے لے کر کھایا اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہرخند کے ساتھ پوچھا۔ ،،کیسے پکے ہیں؟،، جواب ملا کہ بہت اچھے پکے ہیں اور مجھے بہت مزا آیا۔ کہا ،،ہاں مزا آنے کی چیز تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اس کو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوسی کا دل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟،، لیڈی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگذشت من و عن بیان کر دی اور بیوی کے دیئے ہوئے یادگارِ محبت کے تحفوں کے ساتھ لارڈ کوسی کا خط بھی نکال کر سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

س کے خون شدہ دکھے دل پر یا نامرادی کا ہجوم ہوا مگر ضبط کیا اور استقلال کے تیوروں سے یوں ۔ ,, ہاں سچ کہتے ہو ۔ یہ دل میرا محبوب تھا ۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دل تھا ور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا ور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دل کا مقبرہ بن گیا ہے لہذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی نہ اس اچھے دل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کروں گی ۔ ,, یہ کہتے کہتے پرحسرت زبان رک گئی ۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی ۔ دوستوں ، عزیزوں ، ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا ۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز ملکِ عدم کی راہ لی ۔

تجاوز

عبدالرحمٰن چغتائی

اس کی عمر بہتر سال سے تجاوز کر گئی تھی اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی عمر بہتر سال سے تجاوز کر گئی ہے تو اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ اس وقت اس کے سرخ چہرے پر زندگی کا ولولہ پورا موجود تھا۔ رگوں میں خون گرما رہا تھا۔ خالی آنکھیں پپوٹوں سے ڈھکی ہوئی شاہین کے مانند معلوم دے رہی تھیں۔ آنکھوں کی چمک اور سرخ ڈوروں سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اس کی کچھ حقیقت ہے۔ اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ تھا۔ اپنے علاوہ بھی ہر چیز متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ انتشار ابھر رہا تھا، پل کی پل میں بدن شدت سے کانپنے لگتا تھا۔۔۔ صبح اس نے بڑے چاؤ سے داڑھی اور مونچھوں پر حنا لگائی تھی۔ حنا کا سیاہی مائل سرخ رنگ اس تندرست دہکتے ہوئے چہرے پر حیات افروز معلوم دے رہا تھا۔ جہاں جہاں اس کی نگاہ اٹھتی تھی ہر چیز سے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ آئینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری ماں کا کہنا ہے جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو یہ آئینہ جوں کا توں اسی دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اٹھ کر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے۔ وہ جھکا رہا۔ آئینے کی سطح کے اندر اسے اپنا اور اپنے بالوں کا سرخ رنگ شام کی شعاعوں کے مانند بہت گہرا گہرا نظر آیا۔ اس نے کبھی اس آئینہ کی تاریخ پر غور نہ کیا تھا کہ یہ آئینہ کس کس نے دیکھا ہے اور کس کس عمر میں۔ اس نے آئینے کی سطح پر بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیرا۔ آئینہ آئینہ ہی تو ہے۔ اس کی آب و تاب میں سر مو فرق نہیں آیا۔ اسے یاد تھا ایک بار اسے اس کی ماں نے بڑے پروقار طریق پر آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا آج اسے خیال آیا وہ شروع شروع میں خود بھی کئی بار گھڑی پل کے لئے اسی آئینہ کے سامنے رکی ہو گی، کھڑی ہوتی ہو گی۔ انگلیں کتنی جھوٹی ہیں آئینہ کے سامنے۔ پھر زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ برسوں آئینہ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ سوچنے لگا۔ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے

آہستہ آہستہ ماں کو آئینہ کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہا تھا اور جب اس نے رلدو کو آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا۔ وہ اپنے اندر گدگدیاں محسوس کرنے لگا۔ وہ مسکرایا، وہ ہنس پڑا یہاں تک کہ قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنے قہقہے کے ساتھ ایک اور قہقہہ سنا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا جیسے ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے آئینہ کے سامنے سے ہٹا دیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا مگر آنکھیں آئینہ پر لگی رہیں۔ اس کی نگاہوں میں انسان کی عزت دیوتا سے کم نہ تھی۔ کانسی کا کٹورہ پیاس بجھانے کی غرض سے اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسے پانی سے بھرے پیاس بجھائے اس کی بناوٹ پر غور کرنے لگا اور کہنے لگا اس کی سرگزشت بھی انسان سے کم نہیں ہے۔ اس پر میرے دادا کے دادا اور دادا کے باپ کا نام کندہ ہے۔ وہ کتنا چکیلا اور کتنا خوبصورت ہے۔ گھس گھس کر اس میں رس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر کا کوئی کیا اندازہ لگائے گا۔ تیوری چڑھا کر بڑے اعتماد سے عمر کے سوال پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ آخر یہ عمر کا سوال ہے کیا، اور پھر یہ کم بخت لوگ عمر کے سوال کو طول دے کر زندگی آدھی کر دیتے ہیں انسان کی۔۔۔ میں بہتر سال کا جوان ڈھائی سو سال سے کیا کم بوڑھا ہوں گا۔ سانپ کی طرح تن گیا اور انگوٹھی سے کھیلنے لگا جو اس کے باپ دادا کی نشانی تھی۔ اسے گھر میں ہر چیز کی عمر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آ رہی تھی۔ خود توانا تھا اور تازہ دم تھا۔

باہر سراٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ اس کا دل بے قابو ہو کر اچھلنے لگا۔ دہلیز سے اچھل کر باہر نکل گیا جیسے بچہ ہی تو ہے، ابھی گیند کی طرح پھدکنے لگے گا۔ اور جہاں اس کا من بھائے گا منہ اٹھا کر چل دے گا۔ بہ ظاہر کئی حرکتیں کرتا رہا مگر جو چاہتا تھا یہ محسوس کر رہا تھا، جلنے، چلنے پھرنے سے پورا ہوتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ بدن کے اندر تشنگی سی پیدا ہو رہی تھی۔ چاہتا تھا کوئی قوت رہ میں حائل نہ ہو۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک ایک کا جائزہ لیتا رہا۔ یوں معلوم دیتا تھا جیسے ان کی عمر کا بھی اندازہ لگا رہا ہے۔ جس ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑ رکھا تھا اس کی گرفت میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر ضرورت کی چابی نگاہ میں تھی۔ اسے انگلیوں میں دبا کر سیف کی طرف بڑھا۔ لوہے کا بھاری اور مضبوط دروازہ ایک ہی جھٹکے سے پرے ہٹا دیا اور قدموں پر کھڑا کھڑا سیف کے اندر دیکھنے لگا۔ کرنسی نوٹ، سونے چاندی کے سکے آنکھوں کے سامنے تھے۔ زندگی کی ہر دھڑکن دولت کو چپ سادھے دیکھ کر اسے کہیں سے کہیں بہا کر لے گئی۔ سناٹا اور غنودگی کا عالم طاری تھا۔ پر اس کا فولادی پنجہ پھیلتا اور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جو کچھ بھی اس کی کشادہ مٹھی میں آیا بھینچ لیا۔ کچھ ادھر کچھ ادھر دونوں جیبیں بھر لیں اور خدا کی بخشش پر ایک زہر آلود طنز سے مسکراتے ہوئے سیف کو پھر مقفل کر دیا۔

ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے کمرے سے تیسرے میں ہوتا ہوا صحن میں آ [illegible] اور ڈیوڑھی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ مستعد اور بے فکر نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیوں کا شور، گھر کی گہما گہمی کانوں میں سنائی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک بہت پرانا [illegible] درخت موجود تھا۔ [illegible] اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ [illegible] سب [illegible] پھلانگ گیا۔ باہر آیا تو سرد سرد ہوا سے دوچار ہونا پڑا۔ پیشانی پر [illegible] شانوں کو جھٹکا دے سربلند ہو کر تن گیا۔ نواسے نواسیوں، پوتے اور پوتیوں [illegible] درخت کو اپنی عمر کو کسی کو خاطر میں نہ لایا۔ رخساروں کی سرخی پیشانی کی چمک [illegible] سب کچھ تھا۔ بغیر کسی الجھن اور سوچ بچار کے دور نکل آیا تھا۔ ادھر ادھر [illegible] کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ ایک کھونچے والے نے سامنے سے آواز دی۔ "چمن [illegible] کا کشتہ ہے، تازہ ہے تازہ۔ تازہ دم بناتا ہے"۔ ابھی کھونچے والا نظر سے اوجھل [illegible] تھا کہ ایکا ایکی اسے بچوں کا شور سنائی دیا۔ جیسے پہچانے ہوئے تھے۔ "ددو بابا" [illegible] لپٹ گئے۔ وہ اس سے پیسہ چاہتے تھے۔ یہ عادت اس نے خود ہی بچوں کو ڈال رکھی تھی۔ کہتا تھا پیار کرنے سے زندگی ملتی ہے۔ وہ تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ اور داناؤں کے ساتھ دانا۔ ددو کا ہر وصف دنیا کو اور [illegible] پسند تھا اور سب سے بڑی بات اس کی دولت اس کا دم بھرتی تھی۔ مگر اس وقت بچوں کو دیکھ کر بھی کھڑا نہ ہوا نہ ان سے مخاطب ہوا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال دیے اور جو ہاتھ آیا نکال کر بچوں کی طرف پھینک دیا۔ کچھ سکے ابھی مٹھی میں تھے انہیں ٹٹول ٹٹولتا برابر چلتا رہا۔ موڑ کے قریب پہنچا جہاں ہمیشہ ایک اندھی بھکارن بیٹھی بھیک مانگا کرتی تھی۔ اس کی آواز پر کچھ سکے اس کی طرف بھی پھینک دیے۔ مگر چلنے میں ذرا فرق نہ آیا۔ موڑ مڑا ہی تھا کہ سامنے سے حسنا پہلوان مع اپنے دونوں مینڈھوں کے نظر آیا۔ حسنا پہلوان ہمیشہ بازار سے بڑے انداز میں گزرتا تھا۔ اس کا یہ انداز ہی تھا جو وہ پہلوان کہلاتا تھا۔ کانوں میں مرکیاں، گلے میں سونے کا کنٹھا، کلائیوں پر جڑاؤ کڑے، سفید چکن کا کرتا، ملتانی وضع کا تہبند، طلائی گلدار جوتا، سر پر سجے پوری مدین ڈلی رہتی تھی۔ اس کا ایڑی اٹھا کر چلنا، بھاری بھرکم شانوں کو ہر سانس کے ساتھ جھٹکنا یہ حسنے پہلوان کے خصوصی نشان تھے۔ شہر بھر میں حسنے کا نام تھا۔ اس کے طمطراق اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک بازار سے دوسرے بازار تک جاتے جاتے دن کٹ جاتا تھا پر ملاقاتیوں کا جی نہ بھرتا تھا۔ حسنا تھا تو پہلوان مگر اس کی اخلاقی حالت اچھی تھی۔ مینڈھے جو اس نے پال رکھے تھے کھا کھا کر بے لگام ہو رہے تھے۔ کہتا تھا ان کو سنوارنے اور بنانے میں جتنی ریاضت کی ہے یہ حسنا ہی جانتا ہے۔ ان کی جنسی شوخیاں ہلکی ہلکی لہریں تھیں اور

یہ لہریں حسے کے نزدیک اس کی محنت کا پھل تھا۔ نہایت نفاست سے تراشے ہوئے بال سر سراتیں تھیں، نہ تھار تھی، دراں حرکت پر تھوتھنی اٹھا کر ہوا سونگھنے لگتے تھے۔ راہ گیروں کے پیچھے بھاگتے تھے بچے اکثر ان کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور وہ جو نڈر اور شرارتی تھے، مینڈھوں کو چھوڑ پہلوان کو بھی تنگ کرتے تھے۔ حسا اس پر ان کو زبردست ڈانٹ بتاتا تھا اور مینڈھوں کا رسا ڈھیلا چھوڑ دیتا تھا۔ بچے اس پر بڑے بڑے عجیب و غریب آوازے کستے تھے اور پہلوان کو برا بھلا کہتے ہوئے بھاگ جاتے۔ وہ غصے سے کانپتا تھا پر موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ وہ پہلوان کے مینڈھے اسے پہچانتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ہوں جب وہ ان پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تو وہ ایک اطمینان محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس کی شخصیت پر اتراتے تھے اور جب ایسا ہوتا تھا تو ان کا صحت مند جسم ہچکولے لینے لگتا تھا، رانوں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی تھیں۔ حسے کی بے کاری کا قصہ سلجھانے سے بھی نہ سلجھتا تھا۔ رلدو نے جب حسے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس سے آنکھیں ملانے میں دریغ نہ کیا۔ حسا اس کا پروردہ تھا۔ اس نے رلدو بابا کو دیکھتے ہی بڑے احترام سے کہا۔ آج تو میرا داتا جوش جوانی میں حسے سے بدی لے گیا ہے۔ یہ الفاظ وہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے مینڈھے رلدو پر پل پڑے، پر رلدو نے بڑی بے پروائی سے دونوں کو پرے دھکیل دیا۔ حسا بابے رلدو کی اس حرکت پر ششدر سا ہو کر رہ گیا اور مینڈھوں کو دوبارہ جرات نہ ہوئی کہ وہ اس کی طرف تکتے۔ حسا پہلوان آنے بہانے اس وقت رلدو سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ آج غیر معمولی طور پر چڑھا جا رہا ہے۔ جب تک حسا رلدو بابا کے سامنے کھڑا رہا نہ تو اس نے مینڈھوں کو پکارا اور نہ قصداً کوئی ایسی حرکت کی کہ اسے جواب دینا پڑتا۔

رلدو نے حسے کی ملاقات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ویسے بھی اسے اس کی بے کاری نہ بھاتی تھی اور نہ اس نے اس بات پر غور کیا کہ پہلوان اس کی غیر معمولی شخصیت سے متاثر تھا۔ وہ اس کا سرپرست ضرور تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے خائف تھا۔ محض اس لئے کہ وہ شہر کا ایک نامی پہلوان تھا۔

بابا رلدو کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا اور حسا یہ محسوس ہی کرتا رہا کہ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رلدو بابا کے الفاظ دہرا رہا تھا۔۔۔ بڑے آئے جوان۔ جوانی نام ہی جنس کا ہے۔ بچو تم نے اتنا پانی نہیں پیا جتنا ہم نے گھی کھایا ہے۔ حسا دودھ اور گھی کے چکر میں اتنا الجھا کہ رلدو اسے نامی پہلوان، بڑے پہلوان کہہ کر پکارتا تو وہ پھر بھی نہ سنتا۔ اسے اپنی بے کاری کے احساس کا صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا دولت کسی کے پاس نہیں ہوتی۔

خوشیاں کسی نے نہیں دیکھیں۔ مگر یہ رلدو بابا کی خوشیاں اور انھیں رلدو بابا ہی جانے۔ دولت دولت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

رلدو بابا تھا۔ اس کی عمر بھی بہتر سال سے تجاوز کر رہی تھی۔ اس کی مصروفیتیں بھی دوسروں سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ تھا وہ تھا سب کچھ تھا۔ پر وہ ہفتہ میں ایک بار حنا ضرور لگاتا تھا۔ ہر دوسرے روز ایک پرتکلف جوڑا بدلتا، عطر لگاتا، فلم بینی اس کا ایک من بھاتا شغل تھا۔ میلے تماشے، شکار، بندوق اور آئے دن کی مجلسیں ناقابل فراموش تھیں۔ سب پر کوئی نہ کوئی دھن رہتی تھی اور وہ اسے کبھی نہ بھولتا تھا۔

ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ جوں جوں وہ بازار کو چیرتا بڑھتا چلا جاتا تھا اسے ٹھنڈی اور تیز ہوا نہایت خوشگوار اور بھلی معلوم دے رہی تھی۔ وہ ذرا اور اچھا قدم تیز ہو گئے۔ جسم تن گیا، رگ رگ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے جذبات کی رو میں بہتا گیا۔ جذبات کا تار نہ ٹوٹا۔ اس وقت جب رلدو مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اذان ہو رہی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ تقدس سے سر جھک گیا۔ ادھر ادھر مڑ کر آگے پیچھے دیکھا اور سوچ بچار میں بہت دور نکل گیا۔ طبیعت پر بوجھ محسوس ہوا تو واپس لوٹ آیا۔ غلبے کی صورت مسجد کی سیڑھیاں چڑھ گیا جیسے سارا بناؤ سنگار اس جذبے کا حل تھا۔

بازار میں پہنچا تو پھر ایک سرسراہٹ کروٹیں لینے لگی۔ وہی آرزوئیں وہی ارادے ساتھ تھے۔ چہرے پر وہی سرور وہی انبساط کے نشان تھے۔ بالکل ان تھک چلا جا رہا تھا۔ ایک رنگین تجسس اس کا پیچھا کرتا رہا اور وہ ارادۃً اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

چلتے چلتے بے وجہ ایک پان فروش کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کبھی پان کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور کبھی سگرٹ کی طرف۔ پان کھاتا تھا نہ سگرٹ پیتا تھا۔ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور جو چاہتا تھا حلق سے باہر نہ نکلتا تھا کہ ایکا ایکی بازار کے سرے پر سے ایک شور اٹھا۔ شور میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایک بپھرا ہوا سانڈ بھاگا آ رہا تھا۔ راہ گیر مارے ڈر کے بھاگے جا رہے تھے۔ کیا بوڑھے، کیا جوان، عورتیں اور بچے دیواروں سے چپکے کھڑے تھے۔ رلدو اپنے بل بوتے پر سانڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور چٹان کی طرح ڈٹ گیا۔ اس نے بغیر سوچ بچار اور ہچکچاہٹ کے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سینگوں سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں ادھ موا کر دے گا کہ سڑک کے درمیان اسے چند خوش پوش لڑکیاں بھاگتی، چلاتی اور بے دست و پا نظر آئیں۔ کسی کا پرس گر گیا تھا، کسی کی ساڑھی کا پلو الجھ گیا تھا۔ بابا رلدو پوری مردانگی سے بڑھا اور ڈٹ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ سانڈ سے دوچار نہ

ہوا تھا کہ سانڈ رستہ چیر کر نکل گیا۔ ایک اور شور بلند ہوا۔ سارے کا سارا بازار رلدو بابا کی یہ جرأت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ لڑکیاں دیر تک ہنسی کے ساتھ لگی کھڑی رہیں۔ انہوں نے جی بھر کر رلدو کا شکریہ ادا کیا۔ رلدو کی مسکراہٹ میں لڑکیوں کی سی چاشنی نہ ہو لیکن وہ مطمئن تھیں اور کہتی جا رہی تھیں، بپھرے ہوئے سانڈ کا مقابلہ آسان تھوڑا ہے۔

اب وہ گنڈ بازار کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ نبسو لا سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے قرضدار مولو کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مولو رلدو بابا کا قرض دار تو تھا ہی مگر وہ ویسے بھی رلدو سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ اس کا اور رلدو کا سامنا نہ ہو اگر اتفاقیہ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ بچا کر نکل جاتا تھا۔ آج بے وقت گنڈ بازار میں بابا رلدو کا اسے نظر آنا اس کے لئے تعجب سے خالی نہ تھا اور جبکہ رلدو بابا اس کے چال چلن سے واقف بھی خوب تھا۔ مولو کو اس فراتفری میں اور تو کچھ نہ سوجھا وہ پاس کے ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں داخل ہو گیا اور چھپ کر گدلے سے شیشے کے اندر سے بابے رلدو کو دیکھنے لگا جو ہیئر کٹنگ سیلون کے دروازے سے لگا ہوا تھا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس نے خیال کیا یہ رلدو آج بے وقت اس جانب اس کی تلاش ہی میں آ نکلا ہے۔

گنڈ بازار کا نام اصل میں کھنڈ بازار تھا اور جب سے چھاؤنی والوں کی آمدورفت اس بازار میں ہوئی ہے اس بازار کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ مدراسی، گورکھے، چھاچھی تو دھندے کے لئے آتے ہی تھے مگر جب سے چھاؤنی کا زور بڑھا ہے گورے بھی منہ اٹھائے نجات تلاش کرنے چلے آتے ہیں اور یہ ان کی زبان دانی کا کمال ہے کہ انہوں نے کھنڈ بازار کو گنڈبازار بنا دیا تھا اور وہ گنڈبازار کا مفہوم بھی خوب سمجھتے تھے۔ آتے تھے تو اس نام پر پھبتیاں بھی کستے تھے۔

جوں جوں وہ بازار کی رونق میں پہنچتا گیا اس کی امنگیں بڑھتی گئیں اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کی دھڑکنوں کا مزہ لیتا رہا۔۔۔ کوئی اس کے شانوں سے شانہ ملا کر نکل جاتا تھا اور کوئی نہایت بے تکلفی سے نگاہیں اوپر اٹھائے چوباروں پر بیٹھنے والیوں کو گھور رہا تھا اس بھاگم بھاگ میں اگر کوئی اتفاقیہ اس سے ٹکرا بھی جاتا تو اسے کوئی صدمہ نہ ہوتا تھا اور نہ اس کے وقار میں فرق آتا تھا۔

ایک لذت، ایک سرسراہٹ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ اس طرح مچلتے اور سینہ تانے کسی نے تو کیا اس نے خود بھی اپنے تئیں محسوس نہ کیا تھا۔ روشنی کی زیادتی سے ایک چکا چوند سی پھیلی تھی۔ بازار میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ ہر کوئی انتشار اور جنسی لذتوں سے کھیلتا جا رہا تھا کہ دور دو شرابیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کا بد بولوں

سے توڑنے پھوڑنے پر تل گئے تھے۔ ایک کہرام مچ رہا تھا۔ تماشائیوں نے سارا بازار سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ ایک مجذوب جسی لذتوں کا مارا وحشیانہ طور پر بھاگا آ رہا تھا۔ وہ پان والے کی دکان سے پان اٹھا لایا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے رلدو کے سامنے آ کر رک گیا۔ رلدو نے بھی بڑی بے نیازی سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور سکے نکالے اور بغیر کسی جانچ پڑتال کے مجذوب کی طرف بڑھا دیے۔ مجذوب نے سکے تو لے لئے مگر بڑی بے پروائی سے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور سکے بکھیر دیے۔ جب زمین پر سکوں کے گرنے کی مختلف آوازیں پیدا ہوئیں تو ادھر ادھر بیٹھی ہوئی کسبیوں اور رنڈیوں میں ایک قہقہہ بلند ہوا جیسے سب نے مل کر رلدو اور مجذوب دونوں کو داد دی ہو۔ اتنے میں مجذوب رلدو سے چمٹ گیا اور اس نے جی بھر کر رلدو کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ لذتِ ارتعاش سے تھرتھرا رہا تھا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو رلدو کو پکڑ کر گل فروش کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ وہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دے۔ رلدو نے وہی کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ مجذوب کا دل بھر گیا اور وہ جی سے دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔

پان سگریٹ بیچنے والے کی دکان کے ایک پہلو میں ایک چنچل سی رنڈی بیٹھی انگڑائی لے رہی تھی اس نے رلدو کو دور سے تاکا تھا۔ اس نے رلدو کو اشارہ کیا، اس نے ظاہر کیا وہ اس کی منتظر ہے مگر وہ منہ موڑ گیا۔ موڑ پر وہ ایک دوسری سے دوچار ہوا مگر وہ رلدو کی چمکیلی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی طرف سے ظاہر کرتی رہی وہ داشتہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنا چاہتی ہے مگر رلدو اس کی پیشکش کو خاطر میں نہ لایا اور نہایت اطمینان سے اپنے مقصد کا پیچھا کرتا رہا۔

اس نئے چوک میں نئی دنیا تھی۔ سب کچھ دیکھا بھالا۔ مگر توجہ نہ دی۔ اس خیال سے بھی کہ آخر ہر کوئی رلدو تھوڑے ہے۔۔۔ گڈبازار میں رلدو اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گڈ بازار کے بسنے والے اپنے حقیقی رنگ میں بسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ واقعات کی سرمستیاں جنسی حدود سے بھی تجاوز کر رہی تھیں۔ قرینے سے بیٹھی ہوئی کسبیوں کی سج دھج اور ان کے زرق برق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا رک جائے۔ قدم قدم چلنے لگے۔ اپنا آپ بیچنے والیوں کو جی بھر کر دیکھے مگر قدم ایک پل کے لئے بھی نہ رکے اور نہ وہ تقدس سے جھکا۔ اس کی بائیں جانب ایک کسبی سربازار کھڑی تھی۔ اس نے جرات کر کے رلدو کو بازو سے پکڑا مگر جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اس کے جلال و جمال کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ایک اور کسبی جس کے گال کچھ پچک گئے تھے مگر آنکھوں میں زندگی تھی، حسن تھا، سب کچھ تھا، مگر ذرا سی مایوسی سے راہ گزروں کو اشارے کرنے پر اور بلانے پر اتر آئی تھی۔ اس نے بھی رلدو سے سودا کرنا چاہا

مگر رلدو کی گاہکی کا طریقہ ابھی واضح نہ ہوا تھا۔

ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر ایک سیاہ فام لڑکی بیٹھی تھی، وہ مشکل سے پندرہ سولہ سال کی معلوم دیتی تھی۔ اس کی جلد باوجود سیاہ ہونے کے خون کی سی معلوم دیتی تھی۔ اس میں لطافت کچھ اس طرح نکھر آئی تھی جیسے برسات کے بعد پتے خود بخود چمکنے لگے ہوں۔ بدن سڈول اور تناؤ سے بھرپور۔ وہ خوش وضع تھی۔ شکل و صورت میں لجاجت پائی جاتی تھی۔ غازہ لگانے سے اس کا حسین چہرہ انوکھا وہ سرخی مائل نیلا نیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس نیلے رنگ نے روشنی میں ایک ایسا لپکا پیدا کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ نگاہ اس پر اٹھتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ سے غازہ لگانے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ رلدو کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ لپکا اٹھا۔ وہ فیصلہ کر بھی نہ پایا تھا کہ کوئی دوسرا جو بڑی جرات رکھتا تھا بغیر سوچے سمجھے سیاہ ناگن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا اپنا رنگ سفید تھا۔ عینک کے اندر سے آنکھوں کی چمک بہت بھلی معلوم دے رہی تھی۔ بارونق چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بغل میں چند کتابیں تھیں۔ اوپر والی جیب میں فونٹین پن اور پنسل دونوں قرینے سے لگا رکھے تھے۔ اس سیاہ فام چھوٹی کسبی نے اس کا استقبال بڑے سلیقے سے کیا اور اپنی انگنی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بازار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ رلدو کو اس کے جی بھر کر نہ دیکھنے کا صدمہ تھا۔

ایک اور پھلجھڑی سی بازار میں ادھر ادھر پھدکتی پھرتی تھی۔ نظر تو یہی آتا تھا کہ اس نے اپنی بے قدری کر رکھی ہے مگر فطرتاً وہ چالاک تھی اپنے پیشے کی نوعیت کو خوب سمجھتی تھی اور اپنی برائی بھلائی کو کبھی نظرانداز نہ کرتی تھی۔ گر کوئی اس کی بے تکلفی اور بے نیازی کو دیکھ کر اس سے دام پوچھ بیٹھتا تھا تو وہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس نے رلدو کو ایک بے بہا دینے والی شخصیت سمجھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں اور دوسروں کی پرواہ نہ کی جو اس کے گرد وپیش سے چکر کاٹ رہے تھے اور اسے ایک روح پرور محبوب سمجھ رہے تھے، مگر رلدو اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔

کئی ایک کسبیوں نے بھی رلدو کا راستہ روکا۔ کئی ایک نے اسے بازوؤں سے پکڑا، اشارے کئے مگر وہ بغیر اپنی رفتار کو کم کئے اپنی دھن میں چلتا گیا۔ اس کا بدن پسینہ سے تر تھا۔ اس کا اضطراب اب دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے جرأت والیوں کی دل ہی دل میں داد بھی دی مگر وہ یہ داؤ نہ ہارا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے مقصد سے دور تھا۔۔۔ متانت سے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا یہی تو جگہ ہے جہاں نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے اور نہ اچھے برے کی پہچان۔ چند قدم ہی بڑھا ہو گا کہ دو نوجوانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے بڑے اعتماد سے کہا۔

میری نگاہ ہرگز ہرگز دھوکہ نہیں [illegible] یہ وہ رلدو ہے۔ [illegible] بھی پورے [illegible]
نہیں پھر گیا تمہارا۔ کہاں یہ گند بازار اور کہاں وہ [illegible] کی
وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے مگر رلدو نے بھی اپنے [illegible]
نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ بجھو پڑی [illegible] غیر ارادی طور پر
اتنی خوش تھی کہ بازار بھر میں کوئی اس کی اس خوشی کا اندازہ [illegible] سکتی تھی۔
آج بن بلائے، بن مانگے رحمت چل کر اس کے پاس آ گئی ہے۔ رلدو [illegible] مگر باوقار
طریق سے بیٹھا اس کے انگ انگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت [illegible] چپ چاپ اپنا
تعارف کرا رہی تھی۔ اگر اس کی روح میں کوئی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی تو [illegible] ابھر آئی
تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے رونگٹے رونگٹے سے [illegible] ہو رہی
ہے۔ وہ شدتِ ارتعاش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تقدس سے جُھکی جُھکی دروازے [illegible] پہنچی تو مدھم
نیچے گھڑا آوازیں دے رہا تھا۔ "نازلی بی بی! نازلی بی بی!" اصل میں وہ رلدو کے آنے کی اطلاع
دے رہا تھا۔ نازلی انہی قدموں پر نیچے اتر گئی اور جاتے ہی اس کا گلا دبا دیا اور بڑے نرم لہجے میں
کہا دوبارہ آواز نہ نکالے۔ خود خوشی میں لڑکھڑاتی پھولے نہ سماتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے اور
پھر تیسرے کمرے میں چلی گئی۔ اول تو جرأت نہ ہوتی تھی کہ رلدو کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔
دوسرے یہ بھی چاہتی تھی کہ آئی رحمت کو کوئی دیکھ نہ پائے، کوئی سن نہ پائے۔ بے سوچے
سمجھے غسل خانے میں جا پہنچی اور جاتے ہی ہونٹوں کی سرخی اور رخساروں پر سے غازے کو دھو
ڈالا۔ بال الٹے سیدھے کر کے صورت کو سیدھا سادہ بنا لیا۔ نہ سمجھ سکی اور نہ دیکھ سکی کہ وہ
اس سادگی میں اتنے معصومانہ انداز سے کیا کی کیا بن گئی ہے۔

نازلی بازار والیوں سے ویسے بھی کچھ مختلف واقع ہوئی تھی۔ لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے
آدھی ڈھکی ہوئی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سینے پر سے باڈی کو نیچے کی طرف
سرکا دیا تھا۔ رخساروں پر خوشی کے آنسو آ ٹھہرے تھے۔ اس خواب گاہ کی جہاں وہ بچے گاہکوں
سے ملتی تھی، روشنی بجھا دی تھی۔ زندگی کے بارے میں وہ لحہ بھر کے اندر اندر اتنا کچھ سوچ گئی
تھی شاید اس سے پہلے اس نے ساری زندگی میں اتنا نہ سوچا ہو گا۔ وہ تھرتھرا اٹھی۔ کبھی باہر آنے
کی کوشش کرتی اور کبھی سامنے والے دریچے سے ادھر ادھر جھانکتی اور پھر اندر چلی جاتی اور تخلیہ
میں بیٹھ کر بچے بھاگوں پر غور کرتی اور سوچتی آخر کرے تو کیا کرے۔۔۔ اس کے پاس خدا
کی رحمت چل کر آ گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکی تھی، ہوش

گئی تب تو [illegible] تھے۔ [illegible] کی ان حرکات سے بوکھلا اٹھا۔ وہ سارا بازار چیرتا پھرتا اس تک پہنچ تھا۔ وہ جانتا تھا آخر نازلی ہی تو ہے۔ وہ زندگی کے پاس آیا ہے۔ اس کے آ جانے سے وہ اتنی خوش اور [illegible] ہوتی جا رہی ہے۔ پر وہ رلدو کی آمد کو قدرت کا [illegible] اور [illegible] رہی تھی اور [illegible] تھی کہ وہ [illegible] کا [illegible] ہے۔ [illegible] ایک انسان سے واسطہ پڑا ہے۔ جرات ہوتی تھی [illegible] تھی کہ وہ کس طرح اپنا دکھ درد کہنا چاہتی ہے۔ کس طرح اپنی کیفیت [illegible] اس چیز کو سامنے رکھ دینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے نازک احساسات اور جذبات [illegible] چاہتی تھی کہ آنے والا خود ہی اس کے جذبات، اس کے احساسات کی ترجمانی [illegible] وہ بخشی آئی رحمت میری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گی۔ اس کا جاہ و جلال [illegible] دے گا اور کہے گا وہ اسے اچھی طرح سے سمجھ رہا ہے اور اس کی بخشش اور گناہوں کا کفارہ دینے میں اس کا مددگار ہے۔

[illegible] چاہتا تھا وہ نازلی کو کسی پہلوان کی طرح ایک جھٹکا دے اور اس سے بے تکلف باتیں کرتا چلا جائے اور اپنے قرض دار مولو کی طرح اس کی عزت اتار کر ہاتھ میں دے دے لیکن نازلی کی [illegible] اور گردن کا جھکاؤ دیکھ کر سمٹ سا گیا۔۔۔ نازلی آخر ایک کسبی تھی۔ اسے اپنے اندر کئی طوفان اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے۔۔۔ کسی ہمسائی کو آواز دی، ملازم کو پھل پھول اور چائے لانے کا اشارہ کیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ جو کچھ بھی وہ کرے بڑے عقیدے سے انجام دے۔ نازلی اپنی دوسری بہنوں سے کچھ زیادہ ہی توہمات کی قائل تھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا اور رہ رہ کر دھیان اس طرف جاتا تھا کہ سارے بازار کو اپنے کوٹھے پر آنے کی دعوت دے اور سب کو زندہ کرامات، رحمت صورت رلدو دکھائے اور کہے بخشش کے طریق ہمیشہ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

دہلیز سے آگے بڑھا ہی تھا تو اس نے یقین کر لیا تھا آنے والا زندگی کا تمام بوجھ ہلکا کر دے گا۔ اس کی برکت نازلی کو دنیا پر بھاری بنا دے گی۔ اس کا نورانی چہرہ، فرشتہ صورت، سرخ داڑھی اسے وہ کچھ دے گی جو آج تک کسی نے کسی کسبی کو نہ دیا ہو گا۔ اس کا نامۂ اعمال جو بدتوں سے سیاہ ہو چکا ہے، دھل جائے گا۔ وہ نئے قالب اور نئی روح میں ڈھل جائے گی۔

اس نے اپنی دولت، حسن اور تیرہ کلائی پر بھروسہ نہ کیا۔ صرف عقیدت مندی سے اپنے پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتی رہی اور سمجھتی رہی آنے والا بھی اسے خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا اور وہ دیکھتے دیکھتے دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز ہو جائے گی۔۔۔ اس نے بڑھ کر جرأت سے اپنے پورے خلوص سے اس کی گردن میں پھولوں کے ہار ڈال دیے اور خود تقدس سے

تک جھک گئی کہ اس کا چہرہ بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہر کمزوری کو نسوانی طور پر چھپانے کی کوشش کی کہ رلدو اس کی معصومیت اور معصیت کے فرق کا اندازہ نہ کر سکا۔ ارادے باندھتا رہا۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

آخرکار سادہ دل نازلی اپنے گھر کی زینت بن مانگی رحمت کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک انمول سی روشنی کھیل رہی تھی اور اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ یقیناً وہ اس وقت ایک عورت معلوم دے رہی تھی جس کے سینے میں کندن دل اور نیک آرزوئیں ناچ رہی ہوں۔ بار بار ایک ایک آرزو، ایک سوال اس کے ہونٹوں تک آتا مگر وہ رلدو کا جلال دیکھ کر رک جاتی اور حیا سے آنکھیں جھکا لیتی۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ نازلی جوں کی توں دو زانوں بیٹھی رہی۔ بار بار کی ہاؤ ہو میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ روشنیاں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ رلدو کہتا تھا دنیا کچھ نہ کہتی تو وہ بہتر سال کا جوان اور اڑھائی سو سال کا بوڑھا ہوتا۔۔۔ نازلی کا دل اب دھڑک رہا تھا۔ رلدو اب اور بھی اس کے قریب تھا۔ اس کا بازو ایک اجنبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھا اور اس کی کمرے کے گرد حائل ہو گیا۔ غمزدہ عورت سہم گئی۔ وہ آبدیدہ سی ہو گئی۔۔۔ ''تم عورتیں اپنی اپنی قیمت کے مطابق محبت کرتی ہو۔۔۔ تم چپ ہو۔۔۔ شرما گئی ہو؟ میں تمہارے پاس تمہاری قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔ بھاری سے بھاری قیمت جو تم نے کبھی وصول نہ کی ہو''۔۔۔ اس کا جسم سرد ہو گیا۔ گویا کسی نے اسے کسبی، حرامزادی، گشتی، دو کوڑی کی رنڈی کہہ دیا ہے۔۔۔ رلدو نے اسے زور سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

رلدو نے کھینچ کر نازلی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے دہکتے ہوئے لب اس کے تھرکتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیے اور جب اس کا مضبوط ترین ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گیا تو معاً اسے خیال آیا کہ وہ پیشے بیٹھی ہے۔ بکنے کے لئے، بار بار بکنے کے لئے۔ ہر آنے والا اس کا گاہک ہے۔

فرشتہ

عرش صدیقی

"قبول ہے۔"

دو لفظوں کے اس مجموعے میں یوں بھی کے لئے افسون و سحر اور امید و آرزو کا ایک عالم آباد ہوتا ہے لیکن مراد میاں پر ان دو چھوٹے اور بظاہر معصوم لفظوں کا اثر بہت مختلف اور شدید تھا۔

نکاح پر جب مولوی صاحب نے ایک لمبے سے فقرے میں ان سے سوال کیا تھا کہ "گلرخ ولد احمد کلیم کو تم نے بعوض حق مہر شرعی اپنے نکاح میں قبول کیا؟" تو ان کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ آج اس واقعے کو کم و بیش سترہ برس ہو رہے ہیں۔ ان کی شادی میں شریک ہونے والوں کو تو شاید یہ واقعہ یاد بھی نہ رہا ہوگا لیکن مراد میاں کے ذہن میں تو ایک ایک بات محفوظ تھی، اس دن کا ایک ایک لمحہ نقش تھا اور مٹائے نہ مٹتا تھا۔ نکاح مرضی سے ہو یا بغیر مرضی کے اس واقعے کی تفصیلات بھلائی نہیں جا سکتیں کہ یہ واقعہ زندگی کا سب سے بڑا اور اہم ترین واقعہ ہوتا ہے۔

وہ منظر بظاہر مضحکہ خیز تھا لیکن مراد میاں کے دل پر جو گزر رہی تھی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ ادھر مولوی صاحب جواب کے منتظر تھے اور ادھر مراد میاں زور لگا رہے تھے۔ قبول کیا کے لفظ گلے کی رگوں سے کشتم کشتا ہو رہے تھے مگر راہ فرار نہ تھی۔ زبان اور ہونٹ اس انتظار میں تھے کہ کب گلے کے اندر بیٹھے ہوئے وہ بے چین مہمان اور معصوم لفظ قید سے رہائی پائیں اور کب وہ اس گوگو کی کیفیت سے آزادی حاصل کریں۔ مہمان دیر تک نہ آئے تو زبان اور ہونٹ کسمسا کر رہ گئے۔

تھوڑا بہت تامل نکاح کی روایات کا حصہ ہے۔ یہ تامل جہاں دولہا یا دلہن کی شرافت اور حیا کا مظہر ہوتا ہے وہاں اہل محفل کے لئے دلچسپی اور فقرے بازی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور کوئی پریشان نہیں ہوتا۔

مولوی صاحب نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔ "کہو قبول کیا؟"

مراد میاں نے پھر زور مارا [illegible] تھیں
زبان ہونٹوں پر بار بار یوں آ رہی تھی جیسے [illegible]
دو زانو بیٹھے مولوی صاحب کی ناف پر نظریں... [illegible]

اکثر چہرے مسکرانے لگے۔ دو چار قہقہے بھی بلند ہوئے اور پھر [illegible]

بڑے میاں شرما رہے ہیں...

''ابھی سے ہوش اڑ گئے...''

''آہ! تجربہ کاری...''

ایک نیم بزرگ قسم کے صاحب نے بڑی سنجیدگی اور غصے سے کہا۔ [illegible] بدتمیزی ہے واہ صاحب، واہ صاحب......''

ایک نوجوان نے دوسرے کے کان میں کہا۔ ان کی بے چینی دیکھتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے [illegible] طرف سے آئے ہیں...''

مراد میاں کے والد شیخ باقر علی جو موقع واردات پر موجود تھے آگے بڑھے۔ [illegible] شیخ کے یہ سیدھے سادے بزرگ نہ صرف لرزہ براندام تھے بلکہ غصے کے مارے [illegible] تھا۔ خدا جانے وہ کیا کچھ سوچ رہے تھے۔ شاید یہی کہ لونڈا خاندان بھر میں رسوائی اور جگ ہنسائی کا سبب نہ بن سکے۔ وہ پہلے ہی شادی پر تیار نہ تھا ابھی یہ نہیں ہوا، ابھی وہ نہیں ہوا۔ ابھی یہ باقی ہے اس کی حجت کے پروگرام ختم ہونے میں نہ آتے تھے اور شیخ صاحب کو اب یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ لونڈا کوئی کام نہ کر سکے گا۔ ایم بی بی ایس کے شوق میں اس نے کئی برسوں کا خون کر دیا تھا لیکن میڈیکل کالج کے اس دروازے سے بھی کوسوں دور رہ گیا تھا جس سے داخلہ کی اجازت ملتی ہے۔ ہاں داخلہ کی ایک صورت ضرور باقی تھی یعنی بیمار ہو کر، لیکن یہ بات کسی کو نہ سوجھی، پھر مراد میاں نے کہیں سے سن لیا تھا کہ ہومیوپیتھی بڑی آسان شے ہے۔ چند مہینوں میں ڈاکٹر بن جاؤ۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا۔ سو اب کئی برس سے ہومیوپیتھی کا بھوت سوار تھا۔ وہ حیران بھی تھا کہ یہ کام جو چند ماہ میں ہو جانا چاہئے تھا اتنا طول کیوں پکڑ گیا تھا چند روز پہلے وہ اپنی ماں سے شادی کو غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کرنے کی درخواست کرتا ہوا پکڑا گیا تھا اور بہانہ یہ تھا کہ ابھی تک وہ ہومیوپیتھی میں طاق نہ ہوا تھا۔ شیخ صاحب نے بس کی وہ خبر لی تھی کہ پھر اسے ایسی درخواست کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ہم مر گئے تو تم جیسوں کو پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ انہوں نے غصے سے کہا تھا۔ ''اب تو جو فیصلہ ہو چکا ہے وہی قائم رہے گا۔ تمہاری عمر کے لوگ پوتے پوتیوں والے ہونے کو ہیں...''

غصے سے شیخ صاحب کا گورا چٹا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ دور سے ایسے لگتا تھا کہ سردی ہو تو س

[illegible] نانی [illegible] سکتے ہیں، شیخ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اولاد سے نہیں
پا سکے [illegible] تامل [illegible] ہے اور [illegible] دیکھتے ہیں کہ اولاد [illegible] کی قابل ہوگی [illegible]
[illegible] شادی ہوتی ہے اس لئے مراد میاں کی بھی ہوئی [illegible] اور [illegible]
[illegible] الدین [illegible] کر چکے ہیں۔ [illegible] دے [illegible]
[illegible] آ گئے۔ شادی سے پہلے شیخ ان کی نظروں میں [illegible]
انہوں نے [illegible] کہ دیا تھا کہ شادی ہماری مرضی سے ہوگی اور عزیزوں میں ہوگی اور بالکل
قریبی عزیزوں [illegible] رعایت دینے پر آمادہ ہی نہ تھے کہ [illegible] تامل ہے کہ کوئی
اولاد [illegible] انہیں تامل [illegible] نظر نہیں آ رہی تھی اسی لئے وہ آپے سے
باہر ہوئے [illegible]

مراد [illegible] صاحب [illegible] آئے، [illegible] تو ان کے گلے کی تمام رگیں یک جھٹکے سے کھل گئیں
اور مولوی [illegible] بغیر ہی ان کی زبان سے حلق بلند آواز میں کہا۔

"قبول [illegible] قبول کیا۔۔۔"

اور پھر انہوں نے ایک طویل سانس چھوڑ کر یک طویل سانس یوں لی جیسے شیخ صاحب کو سمجھا رہے
ہوں "لو باباجان۔۔ آپ کا کہا مان لیا ہے اور ایک مصیبت سے چھٹکارا پا کر ایک بلا کو گلے سے لگا لیا ہے
"۔۔

مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں لیکن مراد میاں نے کچھ نہ سنا۔ ان کو ایسے لگا جیسے ہر طرف
قبول کیا۔۔۔ قبول کیا۔۔ کا شور ہو رہا ہے لیکن ان کی اپنی آواز اس شور میں شامل نہیں ہے۔ وہ سوچ رہے
تھے۔ "میری مرضی کے خلاف میری شادی کیوں کر دی گئی ہے۔۔۔ باباجان یہ ظلم کیوں کر رہے ہیں
۔۔۔ میری عمر بڑھ گئی ہے لیکن میں ابھی اس قابل کہاں ہوا تھا کہ یہ بوجھ اٹھا سکوں۔۔۔ کاش میں ہومیوپیتھی
کی تعلیم پوری کر لیتا۔۔۔۔۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ کتنا اچھا ہوتا کہ میں
ڈاکٹری سیکھ لیتا۔۔۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور کوئی غم نہ ہوتا۔۔۔۔۔"

لوگ شور مچا رہے تھے اور احمقوں کی طرح بے معنی خوشی کے عالم میں ایک دوسرے کو چھوارے
اور چھواروں کی گٹھلیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ مراد میاں پر بھی کئی وار ہوئے لیکن وہ کسی جوابی حملے کے لئے
تیار نہ تھے۔ یک بار تو ان کے دماغ میں لہر آئی کہ ان سے پوچھیں۔ "اے لوگو۔۔۔۔ تم کیوں خوش ہو
؟۔۔۔۔۔ کیا تمہاری شادی ہوئی ہے؟۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ بے وقوفو مجھے سمجھاؤ یہ ہنگامہ
کیا ہے۔۔۔۔۔۔ احمقو جانتے ہو تم کتنے بڑے ظلم میں شریک ہو؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" لیکن وہ کچھ نہ
کہہ سکا۔ صرف اس نے دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہہ لیا۔ بے وقوف کہیں کے۔۔۔ احمق۔۔

احمق ۔۔۔ مراد میاں نے آہستہ سے کہا اور بے وجہ ان کی نظریں شیخ باقر علی کی طرف اٹھ گئیں ۔ وہ ہنس ہنس کر لوگوں سے مبارک باد وصول کر رہے تھے ۔۔۔ احمق احمق احمق ۔۔۔۔۔۔۔ '' یہ لفظ مراد میاں کے دماغ میں کوؤں نے پھلانگتے گالیوں جیسے کئی برس کی دیمک کی پوری کی پوری خالی ہوں ۔ خود مراد میاں کو بھی یہی احساس ہو رہا تھا جیسے وہ برسوں سے اپنے ہاتھ میں سے نیچے ہوں اور گولیاں نکل رہی ہوں ۔ احمق احمق ۔'' احمق ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔ یکایک انہیں احساس ہوا کہ اب تک شتوں سے چپٹے لگ چکے ہوں گے ۔ انہوں نے خوفزدہ ہو کر آہستہ آہستہ چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر اطمینان کا سانس لیا کہ سب ٹھیک ٹھاک اور شیخ صاحب زندہ تھے ۔ ان کی نظریں چند لمحوں کے لئے مولوی صاحب پر آ کر رک گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ میں نے کیا کہا تھا ، بڑی مشکل سے انہیں یاد آیا ۔ انہوں نے '' قبول کیا '' کہا تھا ذہن پھر بے چین ہو گیا ۔ '' قبول کیا ۔۔۔ قبول کیا ۔۔۔۔ میں نے کیا قبول کیا ۔۔۔۔ میں نے کیا قبول کیا ؟ ۔۔۔۔۔۔ یہ تو بابا جان کا قصور ہے ۔۔۔۔ انہوں نے قبول کیا ہوگا ۔۔۔۔ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ میں بے قصور ہوں ۔۔۔۔۔ بابا جان کو کون سمجھائے کہ میں ہومیو پیتھی کا کورس پورا کر لیتا تو شادی ہو جاتی مگر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آہ بابا جان ۔۔

(۲)

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا اور لوگ بہت جلد بھول گئے کہ مراد میاں اپنی شادی پر کتنے پریشان تھے ۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت کم تھی ۔ گھومنے پھرنے کے وہ عادی نہ تھے بس بیوی کے ہو کر رہ گئے ۔ گلرخ بیگم بڑے فخر سے گلرخ مراد بنی اور پھر اس کا نام بیگم مراد کچھ ایسا چلا کہ لوگ بھول گئے کہ اس کا کوئی اور نام بھی یک اصل نام بھی ہے جس کا مراد میاں کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ۔ بات عجیب اس لئے تھی کہ انفرادیت اور شخصیت تو مراد میاں کی اپنی ختم ہو گئی تھی اور وہ بیوی کے ساتھ یوں نتھی ہو کر رہ گئے تھے ، جیسے اکثر بیویاں اپنے سخت جابر اور خود غرض خاوندوں کی مرضی اور شخصیت کو ہی اپنی مرضی اور شخصیت بنا لیتی ہیں لیکن نام گلرخ کا بھلا دیا گیا تھا ۔ مراد میاں کا ہومیو پیتھی کا شوق برابر قائم رہا وہ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کرنے لگے تھے لیکن وہ مطمئن نہ تھے ۔ وہ تو بڑی بڑی بیماریوں کا علاج کرنا چاہتے تھے ، انہوں نے ہومیو پیتھی کی کتابوں اور دواؤں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا تھا ۔ اپنے دفتر سے جہاں وہ بحیثیت کلرک کے کام کرتے تھے فارغ ہو کر وہ بیشتر وقت گھر پر گزارتے ۔ محلے کی عورتوں اور بچوں کا علاج وہ آسانی سے کر لیتے تھے لیکن وہ خوش نہ تھے ۔ وہ دوائیں جن کی ان کو تلاش تھی ابھی تک انہیں میسر نہ آ سکی تھیں ۔

بیگم پرستی کی انہوں نے وہ مثال قائم کی تھی کہ محلے کی تمام عورتیں بیگم مراد پر رشک کرتیں اور تمام مرد مراد میاں کو گالیاں دیتے ۔ گو کہ کامیاب ڈاکٹر نہ بن سکنے اور بڑی بڑی بیماریوں کا علاج کرنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا دل نامطمئن رہتا تھا تاہم بظاہر وہ بڑے اطمینان سے زندگی گزارتے نظر آتے تھے

۔ انہیں دیکھ کر یہ خیال کبھی نہیں آتا تھا کہ وہ اب بھی باباجان سے ناراض ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بیوی کے ہاتھ بٹانے اور ہومیوپیتھی کے چکر میں منہمک رہنے سے یہ لگتا تھا جیسے ان کے سامنے کوئی واضح نصب العین ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نصب العین گلرخ کی خوشنودی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اسی لئے تو بیگم مراد کی بیشتر پڑوسیں اس کی خوش بختی پر دل ہی دل میں جلا کرتیں۔ مراد میاں کیسے۔ ''بیگم۔۔۔ بیگم کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ آپ سے چھوٹا لفظ استعمال نہیں کرتے اور کس طرح گلرخ کی آسائشوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ موضوع آس پاس کی عورتوں میں زیر بحث رہتا اور کبھی ختم نہ ہوتا۔ مراد میاں کی محبت کی مثالیں دی جاتیں اور سب کچھ درست معلوم ہوتا کیونکہ گھر سے باہر تو وہ صرف دفتر جاتے یا سودا سلف لانے کے لئے نکلتے تھے۔ باقی سارا وقت وہ گھر پر گزارتے، حقہ پیتے اور کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پر اس کے ساتھ سینما بھی چلے جاتے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگی میں ایک عجیب طرح کا اطمینان نظر آتا تھا یہ اطمینان اتنا گہرا، اتنا بوجھل تھا کہ اس پر مردہ اطمینان کا گمان ہو جاتا کچھ عجب نہ تھا۔

بیگم مراد کو جاننے والیوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جو دل ہی دل میں کڑھنے کی قائل نہ تھیں۔ انہوں نے اپنے اپنے خاوندوں سے باقاعدہ احتجاج کیا اور مطالبہ دا غا کہ ان کو بھی اسی طرح صاحب اختیار اور قابل احترام سمجھا جائے جیسے بیگم مراد تھیں۔ ان کو اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ ان کے خاوند گھر کی فکر بہت کم کرتے تھے اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا تو ایک طرف وہ تو بعض اوقات بازار کا کام بھی بیویوں پر ہی ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا کہ ان بے چاریوں کو سبزی گوشت بھی یا تو خود لانا پڑتا یا پھر محلے کے چھوکروں کی خوشامد کرنا پڑتی اور چھوکرے بھی ایسے خودسر اور بدمعاش کہ اول تو کہنا نہ مانیں اور اگر مان لیں تو آدھ سیر گوشت کا ڈیڑھ پاؤ لائیں اور کھتانے کی اکنی الگ وصول کریں۔

ان عورتوں میں سے ایک نے غصے میں ایک روز گھر کا کوئی کام نہ کیا اور جب میاں رات بارہ بجے شطرنج کی کسی محفل سے اٹھ کر آئے تو خوب جھگڑا ہوا۔ بیوی نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بوؤ گے سو کاٹو گے۔ جیسا سلوک تم ہم سے روا رکھو گے ویسا ہی سلوک ہم تم سے کریں گے۔ پھر اس نے مراد میاں کی تعریفوں کے پل جو باندھنے شروع کئے تو میاں کو غصہ آ گیا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ کون سے خاوند کا جگر ہے کہ اپنی بیوی کی زبان سے دوسرے مرد کی تعریفیں سنتا رہے اور کچھ نہ بولے چنانچہ خاوند بپھر گیا اور شطرنج میں کھائی ہوئی ماتوں کا غصہ بھی بیوی پر ہی اترنے لگا۔ بیوی کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کر اس جوانمرد خاوند نے مراد میاں کو وہ وہ گالیاں دیں اور ان کے بارے میں ایسے ایسے راز افشا کئے کہ آئندہ بیوی نے خاوند کے سامنے مراد میاں کا نام نہ لیا۔ اور اس وقت بھی ہوشیاری سے کام لے کر بھاگم بھاگ باورچی خانے میں گھس گئی اور پھر دس پندرہ منٹ میں تلے ہوئے انڈے اور پراٹھے میاں کے سامنے رکھے تھے اسی بات پر ان کی صلح ہو گئی

وہ وقت تو گزر گیا لیکن مراد میاں کے بارے میں اس آدمی کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ

...دماغ میں ... تھیں جیسے ... ذہن میں چل گئے۔

بیگم مراد سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہتی تھی ... بھی ... باتیں اس کو بتا جاتی۔ ابھی لہجہ تو کلف ہی ہے ... تھیں ... حسب معمول ... کے سرمنڈھ ... آیا ... جورو کا بھائی رکھا ہے اور فلاں خود بیگم مراد کو ... تی ہے۔

بعض عورتیں ایسی بھی تھیں جو بیگم مراد ... ۔۔۔ آفریں ہے اس عورت پر ... کہتیں۔ ... اس کا ... بڑی ہمت ... ہے اور برداشت کرتی ہے۔

بات تھی بھی حیرانی کی۔ عورت اور سب ... رہے ... ہی ہوتی ہیں مگر بیگم مراد تو وہ عورت تھی کہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ... کا ... ختم ہو گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہر بات میں اپنی مرضی کرتی تھی ... تھے۔ ایسی عورت کا سب کچھ خاموشی سے سن لینا واقعی حیران کن تھا۔ جو چند عورتیں ... ان کا خیال تھا کہ وہ بڑی دانائی کا ثبوت دیتی ہے۔ ... وہ ایک عورت ہے جو ... کر دیتی۔ کچھ اور عورتوں نے اسے داد دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہی تو کرتی ہے ایک چپ ... ''

بات بھی درست تھی۔ شاید وہ خود مرکزیت کا شکار بھی تھی۔ اگر ایسا تھا تو یہ بات اس کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ عورتیں اس سے کیوں جلتی ہیں۔ بعض عورتوں نے تو اپنی مصیبتوں اور غلامی کا رونا اس کے سامنے بھی رو دیا اور اس سے پوچھا۔ ''اے بہن تم نے کیا کھلایا ہے مراد بھائی کو۔؟ کس سے تعویذ لیکر پلایا ہے انہیں۔؟ میں نے تو بہت کچھ دیکھا پر الٹا ہی اثر پڑتا رہا۔''

''بیگم مراد مسکرا کر کہتی ''میں نے کچھ نہیں کھلایا پلایا اللہ نے جس کو جیسا چاہا بنا دیا۔''

دل ہی دل میں وہ عورتوں کی جہالت اور سادگی پر ہنستی۔ تعویذ گھول کر پلانے سے کچھ ہو سکتا تو اب تک نہ معلوم وہ کیا کیا کر چکی ہوتی۔ بعض اوقات ان عورتوں کی باتیں سن کر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی جس کا ترجمہ الفاظ میں یوں ہی ہو سکتا ہے۔

''بھاگ جاؤ، دور ہو جاؤ۔۔۔۔ ذلیل کمینی عورتوں ۔۔۔۔ بڑی آئیں مراد بھائی کی بہنیں۔''

یہ لفظ اس کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوئے لیکن اس کے ماتھے پر اور ہونٹوں پر لکھے ہوئے صاف نظر آ جاتے تھے۔ بیزاری کا یہ حملہ شدید تو ہوتا تھا لیکن دیرپا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک لمبی خاموش چپ سادھ لیتی تھی اور عورتیں خاموشی سے رخصت ہو جاتی تھیں لیکن گھر سے باہر قدم رکھتے ہی تجسس کی فطری

[illegible]
[illegible] پر ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی
[illegible] بھول ہی جاتی ہے کہ کوئی پاس بیٹھا ہے۔۔۔
[illegible] ہائے جیسے گھل ہی جائے گی۔۔۔
[illegible]۔۔
[illegible] ۔۔مراد بھائی کو تعویذ پلا کر الو بنایا ہے نا تو اس کا کچھ الٹا اثر ہونا ہی تھا۔
[illegible] ۔ہاں، ہاں۔۔۔ کی آوازیں یوں ابھرتی اور ڈوبتی رہتیں جیسے
[illegible] اظہار کر رہا ہو۔

(۳)

[illegible] دو لڑکیاں۔ لڑکیاں دو تو بڑی تھیں۔ راشدہ کی شادی پار سال ہو گئی تھی۔ اور بچی کا رشتہ [illegible] نور احمد کا رشتہ بیگم مراد نے یوں منظور کر لیا جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی یعنی ادھر سوال پڑا ادھر [illegible] بات بات پر باتیں بنانے والیوں کو ایک اور موضوع مل گیا اور وہ لے اڑیں۔

''وہ پھر ہو گیا تھا بچی کا رشتہ۔۔۔۔۔۔ دوہاجو سے باندھ دی۔۔''

''ہائے دوہاجو سے؟۔۔''

اور نہیں تو کیا، سارا شہر جانتا ہے بس ایک تو ہی رہ گئی ہے بے چاری انجان۔ پہلی شادی کے اگلے سال ہی چل بسی تھی۔ سنا ہے بڑا ظلم کرتا تھا اس پر۔۔۔۔۔ اور اب۔۔۔۔۔ ہائے میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ چودہ سال کی گڑیا کو پینتیس برس کے بڈھے سے باندھ دیا اور وہ بھی دوہاجو۔۔۔۔۔ اللہ پوچھے گا اسے اتنی پیاری بچی کی زندگی تباہ کر دی۔ میں تو بس سوچتی رہ گئی کہ اپنے منجھر کے لئے سوال ڈالوں گی۔ ہائے میرا کتنا جی تھا کیا بتاؤں۔

اور اس نے ایک سرد طویل سانس یوں لی جیسے بہت بڑے نقصان کا احساس ہو رہا ہو۔ ادھر سب عورتوں نے اپنی اپنی جگہ معاملے کی تہہ میں جانے کی کوشش کی اور حسب توفیق تحقیق سے کام لے کر اور کچھ اپنے اندازے کے سہارے بزعم خویش اس معمے کو حل کر ہی لیا اور یہ کہانی کچھ یوں بنی کہ اس رشتے کی منظوری کا سب سے بڑا محرک نور احمد کا بڑا بھائی شیر علی ہے مراد میاں سے اس کا بہت گہرا یارانہ تھا۔ وہ لنگوٹیے یار مشہور تھے۔ شیر علی تجارت کے سلسلے میں گھومتا پھرتا رہتا۔ لیکن سال چھ مہینے بعد جب بھی وہ لاہور آتا مراد میاں کے ہاں قیام کرتا۔ دونوں گھروں کا آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ایک ساتھ سینما جاتے اور کبھی کبھار اکٹھے سیر کا پروگرام بھی بنا لیتے۔

شیر علی اور بیگم مراد علی کے بارے میں بھی بہت سے قصے مشہور تھے۔ یہ شکایت عام تھی کہ وہ بیگم مراد

کو ہمیشہ گل رخ، یا بھی گل رخ، کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شیر علی مراد میاں کا لنگوٹیا دوست ضرور رہا ہوگا لیکن اب ایک عرصہ سے یہ دوستی محض ایک ڈھونگ تھا اور اصل میں شیر علی نے یہ تعلق گل رخ کے لئے قائم کیے رکھا تھا ورنہ ان دونوں آدمیوں میں کوئی بات مشترک نظر نہ آتی تھی۔ یہ سب باتیں بیگم مراد تک پہنچتی رہتی تھیں مگر وہاں تو ایک چپ کی ڈھال تھی جو ہر وار کو ناکام بنا دیتی تھی۔ اس نے کبھی کوئی بات نہیں اٹھائی۔ جو سنا وہ سیدھا دل کے کنوئیں میں ایسا گیا کہ پھر کوئی ڈول اس کو نہ نکال سکا۔ یہ دوستی اور یہ قصے ساتھ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ شیر علی افریقہ چلا گیا۔ اس کو شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ کئی بار بنگال کے جنگلوں میں خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔ افریقہ جانے کا بڑا مقصد تو تجارت ہی تھا لیکن افریقہ کے شیر ببر کا شکار بھی اس کے لئے ایک بڑی کشش تھی۔ جلد ہی احباب کا اس سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور پھر یہ خیال عام ہو گیا کہ شیروں کا یہ شکاری ضرور کسی شیر ببر کا لقمہ بن گیا ہے۔ شیر علی کی جرات کے پیش نظر ایک ستم ظریف نے کہا تھا کہ اب وہ دوبارہ کسی شیرنی کے بطن سے ہی پیدا ہوگا۔

نور احمد شیر علی کا بھائی تھا لیکن اس سے بالکل مختلف تھا۔ شیر علی جتنا تیز طرار اور جری تھا نور احمد اتنا ہی خاموش اور بودا تھا۔ اس کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور خطرات اور جانبازی سے گویا اسے فطری لگاؤ تھا اور اس کو ایسی چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر شیر علی بھی افریقہ چلا گیا تو نور احمد کو اکیلے پن کا احساس مارنے لگا۔ شیر علی کی موجودگی نور احمد کے لئے کچھ مستقل نہ تھی کیونکہ اس کا اپنا گھر بار نہ تھا۔ شادی اس نے کی نہیں تھی۔ جانتا تھا کہ بیوی بچوں کی موجودگی میں شیر کا شکار ناممکن ہوگا۔ رہی جیسی تھکن سے بچنے کی بات تو پیسے اور جرات سے کیا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی نور احمد اپنے کو تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ ماں اس کی اسے چند برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی اور باپ بٹوارے کا شکار ہو گیا تھا۔ بہت سے رشتہ داروں کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ تھوڑے بہت رشتہ دار جو باقی تھے وہ یا تو ہندوستان میں تھے یا وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں تھے۔ اس کو جب کوئی اپنا دکھائی نہ دیا تو اسے شیر علی اور مراد میاں کی دوستی کی روشنی میں مراد میاں کا گھر نظر آیا۔ نہ روشنی تیز تھی اور نہ راستہ واضح تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ صحرائے لاہور میں اگر کوئی نخلستان ہے تو یہی ہے۔ اس بیابان دل و جاں میں کوئی جائے پناہ ہو سکتی ہے تو صرف یہی۔ سو اس نے ڈرتے ڈرتے گھبراتے مراد میاں کے نام ایک خط لکھ ہی ڈالا جو انہوں نے فوراً بیگم کے سپرد کر دیا اور بیگم نے نور احمد کو فوراً بلا بھیجا جو شرماتا، گھبراتا آیا اور آتے ہی رشتے کی منظوری کا مژدہ سن کر اور زیادہ گھبرا گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ چکرا سا گیا، اور سوچتا رہا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ یوں واقعہ گویا ایک حادثے کے کردار کا حامل تھا۔

اس گھر پر بیگم مراد کی حکومت تھی، مراد میاں کی حیثیت تو تصویر کے پس منظر یا کسی اہم کردار کے ساتھ ایستادہ کسی غیر اہم کردار کی سی تھی۔ بیگم مراد جب بیگم مراد نہ تھی اور گل رخ کلیم کہلاتی تھی تب اس کے

حسن کے چرچے دور دور تک تھے۔ اس کی سعادت مندی اور سگھڑپن کا شہرہ تھا لیکن شادی کے چند ہی روز بعد اس نے ماں باپ ماموں چچا سب کو ٹھینگا دکھانا شروع کر دیا۔ کئی بار ذرا ذرا سی بات پر اس نے سب کو جو زبان پر آیا کہا۔ یہ بزرگ لوگ اولاد سے محبت کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتے تو کب کے اس عورت سے دور جا چکے ہوتے ورنہ اس عورت نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ نہ صرف کسی کا کہا نہیں ماننا بلکہ موقع مل جائے تو ان بزرگوں کو بھلی بری سنانے سے بھی گریز نہیں کرنا۔ وہ لوگ اس کے معاملات میں دخل ضرور دیتے تھے گو ہر بار منہ کی کھانی پڑتی تھی اور ہوتا وہی تھا جو وہ خود چاہتی تھی۔ اس کی پہلی بیٹی راشدہ کی شادی پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ سب اس رشتے کے خلاف تھے لیکن بیگم مراد ایسی با اختیار تھی کہ یہ شادی ہوئی اور سب دیکھتے رہ گئے۔ رہے مراد میاں تو وہ تو اس کی رائے کو رد کرنا یا اس کی راہ میں آنا گویا گناہ سمجھتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بیگم کو مجسمہ عقل کل سمجھتے ہوں۔ چنانچہ بانو کے بارے میں بھی فیصلہ وہی رہا جو خود اس نے چاہا۔ بڑوں نے حسب عادت اب بھی احتجاج کیا۔ ''کبھی تو ہماری کوئی بات مان لو۔''

''کچھ تو سنو۔''

''آخر کوئی حد ہوتی ہے۔''

''کچھ سوچ تو لو۔''

اس قسم کے اس نے بہت سے جملے سنے مگر وہ جانتی تھی کہ ان کا خاموشی سے بہتر کوئی جواب نہیں۔

(۴)

مولوی صاحب نے نور احمد سے سوال کیا۔ ''بانو بنت شیخ مراد علی کو بعوض حق مہر پانچ ہزار معجل پانچ ہزار غیر معجل سکہ رائج الوقت تم نے اپنے نکاح میں قبول کیا۔؟''

نور احمد نے ایک تجربہ کار آدمی کے سے تیقن اور اطمینان سے جواب دیا۔ ''جی، قبول کیا۔''

مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں تو مراد میاں کے ذہن میں ایک دم سے جیسے ڈھول بجنے لگے۔ ''قبول کیا ۔۔۔۔ قبول کیا ۔۔۔۔۔ دھم دھا دھم ۔۔۔۔۔۔ دھم دھا دھم ۔۔۔۔ قبول کیا قبول کیا ۔۔۔۔ دھم دھا دھم ۔ دھم دھا دھم ۔۔۔۔''

''قبول کیا'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ دو لفظ وہ کبھی نہ بھلا سکتے تھے اور اب دیواریں کہہ رہی تھیں۔ ''قبول کیا۔''

دروازے قبول کیا۔''

بانو کے جہیز کی ایک ایک چیز پکار رہی تھی۔ ''قبول کیا۔''

سجی سجائی دلہن کی چادر کا ایک ایک تار گنگنا رہا تھا۔ ''قبول کیا۔''

سترہ برس پہلے کی ایک ایسی ہی محفل ان کے ذہن میں برپا تھی اور وہ سوچ رہے تھے۔ ''قبول

کیا؟،،

میں نے کب قبول کیا [illegible] قبول کیا [illegible]

تصور تھا۔۔۔۔اور یہ سوچتے سوچتے [illegible] اور [illegible]

رہے جیسے محفل ان کے اردگرد نہیں [illegible]

پریشان ہو گئے لیکن وہ کچھ جس تیزی سے پریشان ہوئے تھے اسی تیزی سے سنبھل بھی گئے۔

کچھ اس قسم کا دورہ ان کو راشدہ کی شادی پر بھی پڑا تھا لیکن [illegible] ان کی حالت پر مختلف قسم کے تبصرے ہوئے۔

''اولاد۔۔۔۔ہائے اولاد کتنی پیاری ہوتی ہے۔،،

''خدا اڑائی کی گھڑی لانے جدائی کی گھڑی نہ لائے۔،،

''یہ صدمہ تو سب کو سہنا ہی پڑتا ہے۔،،

دولفظوں کے اس مجموعے ''قبول کیا،، پر کچھ دیر تک [illegible] یہ باتیں ہوتی رہیں کہ کس طرح ذرا سی دیر میں یہ دو لفظ ماں باپ سے بیٹی کو جدا کر دیتے ہیں [illegible] وہ ماں باپ جو اپنی شادی پر بڑے شوق سے ''قبول کیا،، کہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کو بیاہتے وقت ان دو نازک لفظوں کی سنگینی سے مجروح ہو جاتے ہیں۔

مراد میاں کی حالت دیکھ کر بڑے بڑے سنگدل اداس نظر آ رہے تھے، اور جب بینڈ باجے کے شور میں عورتوں اور لڑکیوں نے مل کر وہ گیت گایا جو لاکھوں بار گائے جانے کے باوجود پرانا نہیں ہوا اور فرسودہ نہیں ہو گا تو بہت کم آنکھیں تھیں جو پرنم نہیں ہوئیں آنسو گرتے رہے اور گیت دلوں میں اترتا رہا اور پھر اور آنسو گرتے رہے۔ کوئی ایسا دل نہ تھا جو اس گیت میں شریک نہ ہو۔

لکھی بابل مورے

او [illegible] لکھی بابل مورے

کاہے کو دینو بدیس۔،،

بیٹی تو بابل اک چڑیا جو پنکھ لگے اڑ جائے۔

رے جو پنکھ لگے اڑ جائے۔

رے اڑ جائے۔

رے اڑ جائے۔

رے اڑ جائے۔۔۔۔۔

———————————

[illegible] مرد [illegible] بھی کراہوں کی آوازیں بلند ہو ئیں۔ مرد میاں [illegible]
[illegible] باپ [illegible] لگا تو [illegible]

[illegible] ایک [illegible] ہوتی تھی۔ وہ کبھی کبھار سوچ میں گم نظر آتی تھی [illegible]
[illegible] وقت [illegible] کی طرح خوش ہی نظر آتی رہی۔ [illegible]
[illegible]

[illegible] کے بارے میں ڈھیروں باتیں کی ہوں گی۔ [illegible]
[illegible] پر اظہار افسوس کیا گیا [illegible]
[illegible] کے [illegible] پر لعن طعن کیا گیا۔

[illegible] بات نکلتی رہی۔

[illegible] بالکل اکیلا ہے۔۔۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔۔

[illegible] اس میں [illegible] کس بات کا۔۔۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہوتی [illegible]
[illegible] رہو [illegible]۔۔۔۔ بہن ہم سے پوچھو جن پر گزرتی ہے۔ ایک سے
ایک بڑی آفت سے پالا پڑا ہے۔ ہتھیلی پر رکھی گاجر کو اس صفائی سے کاٹتی ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہو۔۔۔۔ تم
کیا جانو۔۔۔۔۔ وہ اتنے اچھے نہ ہوتے تو میں کب کی اس گھر کو آگ لگا چکی ہوتی۔۔۔ پر میں سوچتی
ہوں یہ جو اس نے اتنی عمر کا ڈھا چاہے تو جی ہی جی میں پچھتاتی تو ضرور ہوگی۔ بیس بائیس سال کا فرق ہے
۔ ہائے اللہ ہمارا ان کا صرف دس سال کا فرق ہے۔ بس اسی پر لے دے رہتی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ پانچ
سال کا فرق ہونا چاہئے بس۔۔۔ اپنا بدلہ نکال رہی ہے۔۔۔ ایک تیسری آواز قریب سے آئی اور پہلی
دونو عورتوں نے یہ جان کر کہ کوئی تیسرا شخص ان کی باتیں سن رہا تھا پہلے تو حیرانی کا اظہار کیا پھر انہیں دلی
مسرت ہوئی کہ ان کی باتیں سن لی گئیں۔ چنانچہ اب انہیں باتوں میں زیادہ مزہ آنے لگا۔ انہوں نے مشتاقانہ
اور بے تابانہ اس تیسری عورت کی طرف دیکھا اور انتظار کرنے لگیں کہ وہ کچھ اور کہے کچھ دیر تک جب اس
نے کچھ نہ کہا تو ان میں سے ایک کو صدیوں کی سی یہ خاموشی بڑی صبر آزما معلوم ہوئی اور اس نے حیرانی سے
پوچھا۔

"بدلہ۔؟"

"ہاں بدلہ۔۔۔" اس آواز میں وہ تیقن، وہ زور تھا جو کسی بات کا صحیح علم حاصل ہونے سے ادا ہوتا
ہوتا ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے، مراد بھائی اپنی بیوی سے پورے ستائیس برس بڑے تھے [illegible] بھلا کوئی
لڑکی باپ برابر دولہا پا کر بھی خوش رہ سکتی ہے۔ اس کی خوشی بس دکھاوے کی ہے۔ مہمان آجائے تو گندے
پلید بستر پر دھلی صاف چادر ڈالنا ہی پڑتی ہے۔۔۔"

باتیں ہوتی رہیں اور وقت گزرتا گیا۔ پھر شام ہوئی۔ ایک ایک، دو دو کرکے مہمان بھی چلے گئے اور آخر میں بانو بھی رخصت ہوئی......

(۵)

نور احمد کا گھر مختصر ضرور تھا لیکن اس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، سٹور، صحن اور دو کمرے۔ اسے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ بیگم مرحومہ نے پہلے ہی موقع کے مطابق گھر کی صفائی کا انتظام کروا دیا تھا۔ اس گھر پر کئی برس سے عورت کا سایہ نہیں پڑا تھا اور محلے کے بعض دوست اسے کہا کرتے تھے کہ محض اسی وجہ سے وہ خود اور یہ گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ دوستوں کا اکٹھ عموماً مولوی حمید کی بیٹھک میں ہوتا تھا اس لئے گھر پر عموماً خاموشی طاری رہتی تھی۔ نور احمد کچھ ایسا سادہ مزاج تھا کہ اس نے ریڈیو سیٹ تک نہ خریدا تھا۔ وہ گھر میں بھی ہوتا تو گھر خاموش ہی رہتا۔ وہ سونے کو لیٹتا تو گھر پر چھایا ہوا سناٹا جس کا وہ عادی ضرور ہو گیا تھا کبھی کبھی اسے پریشان بھی کر دیتا اور عجیب عجیب باتیں سجھاتا۔ وہ شاعر یا فلسفی نہیں تھا لیکن اس نے کئی بار محسوس کیا کہ جیسے خاموشی بھی ایک آواز ہے۔ اس نے کئی بار اس آواز کو سنا تھا لیکن اس کے ذہن نے اسے اہمیت نہ دی تھی۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ خاموشی بہت بڑی حقیقت ہے اور یہ کہ خاموشی ہی زندگی کا سرچشمہ ہے اور زندگی کا دریا خاموشی کے سمندر میں ہی جا گرتا ہے اور درمیان کا یہ مختصر سا وقفہ۔

زندگی کہہ لیں جسے

مختصر سا یہ سفر چھوٹی چھوٹی خوشیوں، بڑے بڑے حادثوں، احمقانہ خواہشوں اور لا علاج پریشانیوں سے اٹا پڑا ہے۔ اسے اپنے ماں باپ تو اکثر یاد آتے تھے جو ماضی کی خاموشی کا حصہ بن چکے تھے۔ مرحومہ بیوی یاد آتی تھی جس کی آواز کبھی کبھی خاموشیوں کے بے صدا گیتوں کے قافلے کے ہمرکاب ہوتی تھی۔ یہ خیال اس کے ذہن میں اپنی انتہائی سادہ صورت میں آتے اور کبھی کسی قسم کی شدید الجھن کا سبب نہ بن سکے۔ صبح کی روشنی میں یہ خیالات ماضی کی یہ تصویریں، گم ہو جاتیں۔ رات کی تاریکی کی یہ خصوصیت کہ وہ انسان میں بہت کچھ دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے نور احمد کی سوچ بچار کا مرکز کبھی نہیں بنی۔ اور ان سب باتوں کے باوجود اس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک روز فطرت کا دست تقہقہہ جو ہر وقت سرگرم کار ہے اسے بھی ہنگاموں کے کمزور ہاتھوں سے چھین کر لے جائے گا اور موت کی خاموشی کے حوالے کر دے گا۔

اس کے ذہن میں کوئی خاص الجھن، کوئی واضح کمپلیکس نہ تھا تاہم وہ ادھر کچھ عرصہ سے گھر کی تنہائی سے زیادہ ہی گھبرانے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ اس گھر میں ہنگامے پھر واپس آ جائیں اور ایک کمزور سی امید کا سہارا لیکر اس نے مراد میاں کو خط لکھ دیا تھا اور جب وہ ان سے اور ان کی بیگم سے مل کر گھر واپس آیا اور اپنے بستر پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا کہ خاموشی کا تکلیف دہ پہلو چھپ جائے گا اور بہت جلد نغموں کی سحر

آ جائے گی۔

نفسوں کی سحر آ گئی اور نور احمد بج سج کر اپنے دوستوں کی معیت میں بیگم مراد کے گھر گیا۔ شام کو وہ واپس آیا تو اس کی بھوں مردوں کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کے ماتھے پر سہرا ابھی تک سجا ہوا تھا وہ بانو کو لے کر گھر میں داخل ہوا اور محسوس کرنے لگا کہ یہاں خوشیاں اور ہنگامے اس کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔

(۶)

واپسی پر نور احمد کے ساتھ اس کی دلہن اور دوستوں کے علاوہ اور چند لوگ بھی تھے۔ ان میں بیگم مراد بھی شامل تھی نور احمد کے دوست جلدی چلے گئے اور پھر باقی لوگ رخصت ہوئے بس بانو اور بیگم مراد رہ گئے۔ بیگم مراد نے بہت جلد جہیز کا تمام سامان نہایت سلیقے سے سجا دیا اور مختصر سا یہ گھر اب بھرا بھرا اور گنجان آباد سا نظر آنے لگا۔

شام کو یہ خبر جلد ہی عام ہو گئی کہ بیگم مراد بیٹی کے ساتھ گئی ہے تو اس کے رشتہ داروں کو سخت غصہ آیا لیکن وہ سب خود کو بے بس پاتے تھے اور سوائے اس کے کچھ نہ کر سکے کہ جمع ہو کر ایک بار پھر اس کو برا بھلا کہہ لیں۔

دیکھ لیا بہن۔ کیا زمانہ آن لگا ہے۔ دور کی ایک پھوپھی نے دور کی ایک خالہ سے کہا اور بغل میں دبائی ہوئی گٹھڑی کو چھپانے کی کوشش میں بالکل سامنے کر دیا۔

''کل جگ ہے آپا کل جگ۔ —— یہ عورت تو بس سب سے انوکھی ہے۔ ہائے لو کبھی یہ بھی ہوا تھا کہ ماں ہی بیٹی کے ساتھ چلی جائے۔ یہ رشتہ داروں کا فرض ہوتا ہے۔ اسے نہ بڑوں کا لحاظ ہے نہ رسموں کا خیال نہ بدنامی کا ڈر۔ ماموں چچا سب یونہی نا راض نہیں ہیں۔،،

آنکھ کا پانی مر گیا ہے بہن ——— تو بہ تو بہ ——— وہاں بیٹھی بھی کہہ رہی تھی کہ نور احمد اکیلا ہے اس کا تمام سامان مجھے خود ہی جا کر سنبھالنا پڑے گا ——— بڑی ہی کمینی عورت ہے۔ عورتوں کو بدنام کر دیا ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے بے چارے مراد بھائی پر ——— تنگ تنگ دیدم دم نہ کشیدم ——— بے چارے بے بس پڑے رہتے ہیں جال کی طرح ان کے گرد لپٹ گئی ہے ——— ابھی سگائی پر مجھے کہا بس بانو کے ساتھ تو تم ہی جائیو۔ پر اس کو کس کا لحاظ ہے۔ اپنا کہا بھی بھول گئی۔ سگی نہ سہی سگیوں کے بعد تو میرا ہی نمبر آتا ہے اور سگے اس کو گھاس ہی کب ڈالتے ہیں۔ وہ دیکھو میں تو کپڑوں کی یہ گٹھڑی اٹھائے تھک بھی گئی اور اس کٹنی نگوڑی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ بہن یہ کیا بوجھ لادے پھر رہی ہو۔

اب آپا اس کے منہ کون آئے، میں تو کہتی ہوں اچھا ہی ہوا نہ تم گئیں نہ میں۔ لوگوں کا کیا ہے یونہی

اس کی بدنامیوں کا کچھ حصہ ہمارے نام ڈال دیں اور یہ ایک بات ہو تو کوئی کہے ... اب وہ راشدہ والا قصہ تو تمہیں یاد ہی ہوگا۔۔۔

"ہاں ہاں ۔۔۔۔۔۔ یاد کیوں نہ ہوگا۔۔۔"

"اور نہیں تو کیا ... کوئی بھولنے کی بات تھوڑی ہے۔ تم نے راشدہ ... دیکھا ہے نا کتنا سعادت مند لڑکا ہے۔ شادی کے بعد اس بے حیا نے ضد کی کہ ... جدا ہی رہے۔ ... تو وہ بس جبر کرتا رہا۔ پر جب اس نے دیکھا کہ یہ مری جا رہی ہے تو ... ماں باپ ... راضی ... تھوڑے دنوں کو اس کی خوشی بھی کردو۔ پر ایک مہینہ ... پر وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔۔۔"

"مجھے سب یاد ہے۔۔۔ کل ہی کی تو بات ہے۔۔۔۔"

"ہاں ۔ ۔ کوئی بھولنے کی بات تھوڑی ہے۔ ... آگے تو سنو ... ہی لیا تھا۔ کہتی تھی کہ جانے نہ دوں گی۔ پر ایک روز یوں ہوا کہ یہ راشدہ ... دیکھتی ہے کہ انارکلی کے نکڑ پر راشدہ کا دولہا کھڑا ہے۔ ... اس نے راشدہ کا ہاتھ پکڑ کر ٹیکسی میں بٹھایا یہ جا وہ جا ... یہ بے چاری کھڑی دیکھتی رہی، کر بھی کیا لیتی ... بیچ میں بھی کیسے آتا، ہوا آخر وہ اس کا دولہا تھا۔۔۔۔ اور پھر وہ دن ... اس نے راشدہ ..."

"ہائے تو یوں ہوا؟ مجھے تو کہے گی کہ میں نے ... آپ بھیج دیں۔ پرائے ... جھوٹی مکار۔۔۔"

"لپاٹن۔۔۔"

کمینی ۔۔۔۔ ذلیل ۔۔۔۔" دور کی پھوپھی نے غصہ اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے خوب گالیاں دیں۔

"بس دیکھ لو آپا۔۔۔۔ دور کی خالہ نے بڑے عالمانہ فخر سے کہا۔

"اے بہن یہ تم نے آپا آپا کیا لگا رکھی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تم سے سات برس چھوٹی ہوں۔ تمہاری شادی پر میں بارہ برس کی تھی؟۔۔۔ دور کی پھوپھی کو بھی غصہ نکالنے کا بہانہ مل گیا۔

"ہائے آپا۔ یہ تم پر بھی اس لپاٹن کا رنگ چڑھ گیا۔ مجھے تو صاف یاد پڑتا ہے کہ تمہاری شادی پر میں دو مہینے کم گیارہ برس کی تھی۔۔۔ دور کی خالہ نے اپنے چھوٹے پن کی حفاظت ضروری سمجھی۔

"اے بس رہنے دو یہ جھوٹ۔۔۔"

"جھوٹی تم ہو کہ میں۔۔۔"

اور وہ لڑتی جھگڑتی دور نکل گئیں۔

(۷)

نور احمد نے خواب گاہ کا دروازہ بند کیا تو اسے ناصرہ یاد آ گئی۔ آج ان تمام باتوں کا اعادہ اس پر فرض سا محسوس ہوا۔ یہ اُن روز کی تھیں جب وہ ناصرہ کو بیاہ کر لایا تھا اور اسی خوابگاہ میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔ آج جو غور کیا تو ان دنوں کی ہر بات یاد ہوتا جو حرکت اس سے سرزد ہوتی اس کی ایک واضح تصویر اسے اپنے ماضی کی کتاب کے ایک ایک صفحے پر روشن نظر آئی۔ چھوٹے چھوٹے ان واقعات کا دامن اب اسے پھیلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ان واقعات میں یکسانیت بہت عجیب سی تھی۔ کمرہ وہی تھا صرف بعض اشیا اور ان کی ترتیب بدل گئی تھی۔ باتیں بھی وہی تھیں، وہ خود بھی وہی تھا صرف ناصرہ کی جگہ بانو نے لے لی تھی اور دورانِ گفتگو الفاظ میں معمولی سی تبدیلی ہو گئی تھی۔ واقعات اور حادثات کی یہ تکراری زندگی ہے لیکن نور احمد اس قسم کی گہری فلسفیانہ باتیں نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ناصرہ سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا پریشان تھا لیکن اب تجربے کا حامل ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ اس کا ہم عمر تھا۔ اب وہ تنہا تھا۔ اس کے بڑے پُر اعتماد، مربیانہ اور بزرگانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ شاید اس نے ذہن میں بات کرتے ہوئے اپنی اور بانو کی عمروں کا فرق بھی اسے یہ انداز اختیار کرنے پر اکسا رہا ہو۔ ایک بات کا اسے پوری طرح یقین تھا اور وہ یہ کہ اس نے ناصرہ سے بھی محبت اور خلوص سے باتیں کی تھیں اور آج بانو سے بھی اسی سچے جذبے کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ عموماً شادی بلکہ سگائی ہوتے ہی دونوں متعلقہ اشخاص ایک دوسرے کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں اور جب ان کی ملاقات ہوتی ہے تو گویا مدت سے پہلے سے ... ہوتا ہے۔ کم از کم اپنے بارے میں تو اس کا یہی تجربہ تھا۔

انہوں نے ایک دوسرے کو بتایا کہ وہ ایک دوسرے کے اور مستقبل کے بارے میں کیا سوچ کرتے تھے۔ وہ باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

(۸)

برآمدے میں کھٹکا ہوا اور بانو کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف نگاہ کی۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ رات کے تین بج رہے ہیں۔ پھر اس نے پہلو میں سوئے ہوئے نور احمد کے چہرے پر پہلی بھرپور نظر ڈالی۔

یہ ابا جان سے کتنے مختلف ہیں۔۔۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور چلا گیا۔

نور احمد کے بال اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اطمینان سے سویا ہوا وہ اس کو بہت سیدھا معصوم اور اچھا لگا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر بال ایک طرف ہٹا دے اور اس کی پیشانی کا پوری طرح نظارہ کرے۔ لیکن ابھی اس میں اتنی بے باکی نہیں آئی تھی۔ اس کا ہاتھ ذرا سی حرکت کر کے رک

گیا۔

نور احمد کا سر ریشمی لحاف سے باہر تھا۔ پلنگ کے آخری کونے پر ایک ابھار بتا تھا کہ یہاں اس کے پاؤں ہیں۔ بانو نے اس کے سر سے پیر تک نظر دوڑائی۔

یہ کتنے لمبے ہیں۔۔۔ اس نے سوچا۔ "مجھ سے کم سے کم دو بالشت اونچے ہوں گے۔۔۔" وہ مسکرانے لگی۔ خیر اسٹول کام آجایا کرے گا۔ وہ اور زیادہ مسکرائی۔۔۔

مرد عموماً عورتوں سے لمبے کیوں ہوتے ہیں۔۔ اس نے پھر سوچنا شروع کیا۔ اور زیادہ مضبوط بھی تو ہوتے ہیں۔۔۔۔ شاید اسی لئے مرد اچھے ہوتے ہیں۔ ابا جی بھی کتنے لمبے ہیں۔۔ وہ کتنے چپ چاپ اور دبلے سے ہیں پر امی پھر ان سے ڈرتی ہیں۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ۔۔۔ ٹین پھر باہر کھٹکا ہوا اور قدموں کی آہٹ یوں آئی جیسے کوئی اندر چلا آرہا ہو۔ اس نے گھبراہٹ میں نور احمد کو جھنجھوڑ دیا۔ نور احمد جاگ اٹھا اور بانو گھبرا گئی کہ کیا کہے۔ اسے یہ بتاتے ہوئے حجاب آرہا تھا کہ وہ ایک معمولی سے کھٹکے سے ڈر گئی ہے۔ وہ کیا سوچیں گے۔ اتنی بڑی ہو کر ڈرتی ہے۔ عین اس وقت پھر قدموں کی مدھم سی آواز آئی لیکن اب کے یوں لگا جیسے یہ آواز دروازے سے دور جا رہی ہو۔ بانو کی مشکل آسان ہو گئی۔ "یہ سنا آپ نے۔؟ باہر کوئی ہے۔" اس نے کہا۔

نور احمد مسکرانے لگا۔ وہ بانو کی گھبراہٹ سے لطف لے رہا تھا۔ "امی جان کے سوا کون ہو سکتا ہے؟" اس نے کہا۔ "ماں تم ابھی نہیں سمجھتیں۔ شاید ابھی نہیں سمجھتیں۔ ابھی تم اس فکر کا اندازہ نہیں کر سکتیں جو تمہاری امی جان کو تمہارے بارے میں ہو سکتا ہے۔۔۔۔ خیر سو جاؤ۔۔۔ سو جاؤ۔" اور اس نے لحاف اچھی طرح اس کے گرد لپیٹ دیا۔

اس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی شرارت سے بانو نے اندازہ کر لیا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ خوابیدہ نور احمد کی طرف دیکھا اور ایک انگڑائی لے کر ڈرتے ڈرتے بازو پھیلانے اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کلاک نے آٹھ بجا دیا تھا۔ کمرے میں نئی قسم کی روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ سورج کی یہ روشنی عام نہ تھی؛ آج اس روشنی میں کسی اور نئی روشنی کی خوشگوار آمیزش تھی

"زندگی کتنی اچھی ہے۔۔۔" اس کے اندر سے ایک آواز آئی۔

"زندگی کتنی عجیب ہے۔۔۔" در و دیوار نے کہا۔

"زندگی کتنی خوب صورت ہے۔۔۔" کمرے میں رکھی ہوئی ہر شے نے سرگوشی کی۔

"آج کی نماز قضا ہو گئی۔۔۔" اس کو اس خیال سے دکھ ہوا۔ اس نے نور احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے جلد بیدار ہونے کے امکانات عیاں نہیں تھے۔ ان کے جاگنے سے پہلے نماز پڑھ لوں۔۔۔ اس نے سوچا۔ وہ اٹھنے لگی تو اچانک اسے چند باتیں یاد آئیں جو شادی سے ایک روز پہلے اس کے کان میں ڈالی گئیں

تھیں اور اسے خیال آیا کہ آج وہ نماز نہیں پڑھ سکی۔ وہ لیٹی رہی اور پھر نور احمد کو نظروں میں تولنے لگی۔

’’کیا یہ کام کاج میں، اسی طرح میرا ہاتھ بٹائیں گے جیسے ابا جان امی جان کا ہاتھ بٹاتے ہیں‘‘،،

’’ابا جان آج تک کسی سے سختی سے نہیں بولے۔ نہ جانے یہ کیسے بولا کریں گے۔۔۔ لگتے تو بہت اچھے ہیں۔ ابا جان سے بھی اچھے۔۔۔۔۔،،

’’ان کو پیوں کا کتنا شوق۔۔،،

تو بجنے کے قریب اسے لگا۔ جیسے نور احمد جاگ جائے گا۔ اس نے آنکھ کھولی اور بند کر لی۔ چند منٹ کے بعد پھر اس نے یہ عمل دہرایا اور پھر تیسری بار اس نے پہلو میں ہاتھ مارنے کے بعد گھوم کر دیکھا۔ بانو آئینے کے سامنے کھڑی اپنے ہاتھوں سے اپنے بال درست کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں وہ مصرعہ گھوم گیا جو پہلی شادی کی دوسری صبح اس کے دوستوں نے ایک قوالی کی صورت میں گا گا کر اسے سنایا تھا۔

تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

وہ باہر آئے۔ بیگم مراد نے ناشتہ تیار کیا ہوا تھا اور غسل خانے میں ٹب گرم پانی سے بھرے رکھے تھے۔

نور احمد نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور دل ہی دل میں کہا۔ اے خدا۔۔۔ اے مہربان خدا میں تیرا شکر کیونکر ادا کروں۔۔۔۔۔۔،،

(۹)

رواج کے مطابق بانو اپنی ماں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ نور احمد کو یہ رواج کچھ اچھا نہ لگا۔ بیگم مراد یہ بات سمجھ گئی تھی۔ وہ خود کسی لمبی چوڑی پابندی کی قائل نہ تھی اس نے نور احمد سے کہا تم بھی وہیں ہمارے ساتھ چل رہو۔ لیکن نور احمد کو یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ پھر گھر اکیلا چھوڑنا بھی درست نہ تھا۔ یقیناً اس وقت تک آس پاس بلکہ دور دراز کے چوروں کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس گھر میں شادی کا نیا نیا سامان آیا ہے۔ آخر طے یہی ہوا کہ نور احمد رات گھر پر ہی گزارے گا۔ دو دن کی تو بات تھی

دوستوں نے شام کو اسے سسرال ہی میں آگھیرا۔ مولوی حمید کہ ’’سرخیل حلقہ، یاران طریقت کہلاتا تھا۔ مولوی ضرور تھا لیکن تھوڑا جدید قسم کا مولوی تھا یعنی داڑھی رکھنے اور نماز پڑھنے کے باوجود سیر سپاٹے اور فلموں کا خاص شوق رکھتا تھا۔ اس وقت سب فلم کا پروگرام بنا کر آئے تھے اور چلتے چلتے وہ یہ بھی کہتے گئے کہ رات کے کھانے پر نور احمد کا انتظار نہ کیا جائے۔

ایبٹ روڈ کی مشہور دکان سے نان کباب اور تکے کھا کر انہوں نے فلم دیکھی اور اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ نور احمد کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ سیدھا اپنے گھر جائے۔ گھر پہنچ کر اس نے دروازہ کھلا پایا۔ اندر روشنی بھی ہو رہی تھی۔ پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا یہ تھا۔

''لو ہو گیا چاند نا میا اور چار دفعہ کہئے۔۔''

دو چوروں کے ڈرتے ڈرتے ورتے چوروں کی طرح ... بے ... ...

گوشت کی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ وہ ... ... اور ... ...

آپ۔۔۔ ... ۔۔۔۔۔اوہ۔۔ اس نے اطمینان ... ...''

میں تو ڈر ہی گیا تھا۔۔''

''ہاں۔۔۔۔۔ دوسری چابی میں ساتھ ہی لے گئی تھی تم تو اپنے دوستوں ... ... اور مجھ پر یہ فکر سوار ہو گئی کہ نہ جانے کیا الم غلم کھالو۔ سو میں کھانا ساتھ لے آئی۔ ... ... اب ناشتہ کر کے گھر جاؤں گی۔۔۔۔ پھر کل شام کو تم ... ...''

''وہ آپ کتنی مہربان ہیں۔۔۔۔ میں آپ کا شکریہ ادا ... ... اپنی قسمت پر ناز ہو جائے گا ایسا ہو تو اسے خدا مجھے گنہگار نہ سمجھ لے ... ...

اسے بھوک نہ تھی پھر بھی اس نے تھوڑا سا کھانا کھا ہی لیا۔ ... محسوس ... رہا تھا ... اس وقت ... کتنا وہ ہوگا۔

شب خوابی کا لباس پہن کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ تکیہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا ... ... طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہکا کر پیش کیا جاتا ہے ... ... لگتا ہے کہ یہ خوشبو اس عورت ... ... خوشبو ہے اس کی ذات کا حصہ ہے اور وہ اسے گل بدن کہتا ہے اور جب وہ قریب نہ ہو تو ... خوشبو ... اسے قریب محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے ... وہ ... ہو تو شاعروں کی طرح پھولوں کی ... ان کا مرہون منت قرار دیتا ہے۔ یہ خوشبو بانو کی نہ تھی یہ خوشبو تو ہر اس دلہن کے جسم سے آتی ہے جس کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی خوشبو میں بسا دیں۔ یہ خوشبو جانی پہچانی تھی ... راحمد ... بات پوری طرح یاد آئی کہ ناصرہ کے وجود سے بھی اسی قسم کی خوشبو کی لپٹیں اٹھا کرتی تھیں ... وہ خوشبو اب دور ماضی میں جا چکی تھی اور وہ جسم مٹی میں مل چکا تھا اور گو وراحمد کو اس جسم سے سچی محبت تھی تاہم اب وہ سب کچھ وقت کا ایک خاصا طویل فاصلہ طے کر کے اتنی دور جا چکی تھی کہ اب ... اس ... خوشبو کا احساس بہت کم ہوتا تھا۔

تکیے کی خوشبو کو ذہن میں اتارتے ہوئے اسے مسلسل یہ احساس تھا کہ یہ خوشبو بانو اپنے ساتھ لائی ہے اس لئے یہ اسی کی خوشبو ہے اور وہ خود خوشبو کا پیکر ہے اور نیم غنودگی کی حالت میں وہ محسوس کرتا رہا جیسے اس خوشبو کے واسطے سے وہ خوشبو کا پیکر اس کے پاس موجود ہے اور وہ اس پیکر کو اپنے ذہن کی آغوش میں لے کر سو گیا۔

ابھی نصف شب نہ گزری تھی کہ ... ... میں کچھ آہٹ ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی ... ...

اپنے پہلو کی جانب ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے کہا۔

"بانو۔۔۔۔۔۔"

لیکن یہ کہتے ہی وہ چونک گیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو اور ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

وہ دروازے کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ باہر کون ہے؟ بلی یا امی جان۔۔۔؟ اور وہ بار بار دل میں بلی یا امی جان۔۔۔ بلی یا امی جان کے الفاظ دہرا کر مسکراتا رہا اور پھر سوچنے لگا۔ بلی ہی ہوں۔ آج کی رات پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے پھر اپنے پہلو کی طرف دیکھا جیسے بانو سے داد کا طالب ہو کہ دیکھو ہم نے کیا مزے کی اور حتی معنی تجزیات کی ہے۔

"بلی ہی ہوگی۔۔۔" اس نے دل میں فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہا لیکن پھر وہی آہٹ پیدا ہوئی اور ایسا لگا جیسے کوئی اندر کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اس نے اٹھ کر ایک دم سے دروازہ کھول دیا۔ باہر بیگم مراد کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے سے صرف معمولی سی پریشانی عیاں تھی۔

"اکیلے سونے کی عادت نہیں ہے نا۔۔۔ بھرے کمرے میں سو سو کر عادت بگڑ گئی ہے۔ دل گھبرانے لگا اور نیند بھاگ گئی۔" انہوں نے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔۔" نور محمد نے تسلی دی۔ "آپ بے فکر ہو کر سوئیں۔ ضروری سمجھیں تو بیچ کا دروازہ کھول لیں۔ آپ کا احساس تنہائی جاتا رہے گا۔۔۔" نور محمد نے دیکھا کہ بیگم مراد مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

بیچ کا دروازہ کھل گیا اور وہ بستر پر الٹا۔ تکیے سے منہ لگا کر اس نے کئی لمبی لمبی سانسیں یوں لیں جیسے بستر کی تمام مہک کو پی جانا چاہتا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دایاں بازو بڑھایا۔ جیسے اپنے قریب اسی پیکر خوشبو کو محسوس کرنا چاہتا ہو جسے وہ اپنی آنکھوں میں چھپائے لیٹا تھا اور جس کا وہ دن بھر مسلسل انتظار کر رہا تھا۔ اسے پھر ان تکلیف دہ رسوم و رواج پر غصہ آنے لگا جو دوسرے ہی دن بیوی کو میاں سے الگ کر دیتے ہیں۔ اسے آج یہ بات بہت اچھی لگی کہ یورپ کے لوگ شادی ہی کے دن ایک مہینے کے لیے سب لوگوں سے دور چلے جاتے ہیں تاکہ ہنی مون کا عہد بغیر کسی طرح کی مداخلت کے گزرے۔ بستر اور تکیے میں بسی ہوئی خوشبو جہاں اس کے ذہن کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتی تھی وہاں مسلسل بانو کا خیال بھی پیدا کرتی تھی۔

اس نے تھکن سی محسوس کی اور نیند کے انتظار نے تھکن کے احساس میں اضافہ کیا اس کا سر بھاری ہو گیا۔ اور وہ بستر اور بانو کی خوشبو کے بارے میں سوچتا ہوا کچھ دیر بعد سو گیا۔

وہ سو گیا اور خواب دیکھنے لگا۔ ایک گھر ہے چھوٹا سا گھر خوشیوں سے مالا مال سکون و راحت کا گہوارہ۔۔۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ سر میں گرانی ہے۔ وہ لیٹ جاتا ہے۔ بانو گھر میں نظر آتی ہے اور پاس آ کر سر دبانے لگتی ہے۔ وہ اس کے سرہانے پلنگ کے کونے پر بیٹھی ہے اور سر دباتے دباتے ذرا اور قریب ہو جاتی ہے۔ نور احمد کو بڑا آرام ملتا ہے اور اس پر نیم غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ وہ خواب ہی خواب میں اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ بانو اتنی جلدی واپس آ گئی۔ خوشی سے اس پر نشہ سا طاری ہو جاتا ہے اور وہ بانو کے ہاتھ کی پشت کو اپنی پیشانی پر رکھ کر اپنے ہاتھ سے دباتا ہے۔ وہ کوئی محبت کی بات کہہ کر اس کے ہاتھ کو اپنے رخساروں پر کھینچ لاتا ہے۔ بانو مزاحمت نہیں کرتی۔ وہ اسی طرح چارپائی پر سرہانے ایک کونے پر مگر اس کے بہت قریب بیٹھی رہتی ہے۔ نور احمد بانو کے دوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتا ہے جو پہلے ہاتھ کے ساتھ کر چکا ہے۔ پھر وہ ہتھیلیوں کو آنکھوں میں یوں ملا دیتا ہے جیسے دیوداسیاں اپنے دیوتاؤں کے حضور ملاتی ہیں۔ پھر اس کے ہونٹ بانو کی انگلیوں کے پوروں کی حنا کو چومتا ہے ہاتھوں کی پشت پر پیار کرتا ہے۔ کلائیوں پر اپنے رخسار ملتا ہے اور پھر اس کے ہونٹ بانو کی گردن پر جا پہنچتے ہیں۔ وہ اس کی قمیض سرکا کے اس کے شانوں پر بوسوں کی بارش کر دیتا ہے اور پھر بانو اس کی آغوش میں آ گرتی ہے اور اس کا دماغ سو جاتا ہے چپ ہو جاتا ہے اور جسم پوری طرح جاگ اٹھتا ہے

(۱۰)

جلد ہی نور احمد کے جسم کو نیند آ گئی اور اس کا دماغ جاگنے لگا اور اس کی آنکھیں ماحول کا جائزہ لینے لگیں جیسے جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب خواب تھا یا حقیقت۔ اسکے ہاتھ خوشبو کے پیکر کو اپنے قریب پا رہا تھا اور اس کا جسم اسے اپنے جسم سے مس کرتا معلوم ہو رہا تھا

بانو، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم آ گئیں، تم، تم کب میں۔۔،

میں تو یہیں تھی۔ تمہارے پاس۔ میں تو کہیں بھی نہیں گئی۔۔۔ تمہیں یاد ہے خوشبو کا پیکر۔۔۔ خوشبو کا پیکر۔۔۔

میں ہی تو ہوں وہ خوشبو کا پیکر۔۔۔ خوشبو کا پیکر۔۔۔ اس کے اپنے اندر سے آواز آئی۔

''اوہ خوشبو کا پیکر۔،، اس نے سوچا۔ خوشبو کا پیکر۔۔۔ تو یہ خواب ہی ہے۔۔۔ یہ خواب ہی ہے۔۔۔ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔،، اور اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن قریب پڑے ہوئے جسم کے لمس اور اس کی گرمی کا احساس ایک حقیقی احساس کی صورت میں قائم رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جاگ رہا ہے اور اس نے تیزی سے گھوم کر اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی بانو کی طرف دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ در و دیوار کانپ رہے ہیں۔ زیرو کا بلب بڑی تیزی کے ساتھ دور اندھیرے میں چلا گیا اور دور تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پھر وہ بہت دور ایک ننھے سے ذرے کی طرح نظر آنے لگا۔ اس

اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ جہاں کمرے کی اکثر چیزیں نظر آنا بند ہو گئی تھیں۔ اور ایک دم اندھیرے کے سمندر میں ڈوب سی گئی تھیں وہاں سامنے دیوار پر ایک روشن تحریر بڑی آب و تاب سے چمک رہی تھی۔

''یہ تم نے یہ کیا؟''

نور احمد یہ تم نے کیا کیا؟ سرہانے دائیں جانب رکھی ہوئی سنگار میز کے شیشے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''یہ تم نے کیا کیا''۔ خوشبو سے مہکتے ہوئے تکیے نے سرگوشی کی۔

''یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیسے ہو گیا؟۔ اس نے سوچا اور چاہا کہ اٹھ کر حالات کا جائزہ لے اور اس دور جاتے ہوئے زرد سے بلب کو، اس مدھم روشنی کے سرچشمے کو غائب ہونے سے روک لے۔ واپس لے آئے اور دیکھے کہ اس کمرے میں کیا ہو گیا ہے مگر اس کے جسم میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ اس کا بستر گھوم رہا تھا دیواریں گھوم رہی تھیں چھت گھوم رہی تھی اور دماغ میں لال پیلی تحریریں گھوم رہی تھیں ''تو یہ خواب نہ تھا۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ یہ میں نے کیا کیا۔۔۔۔ یہ کیسے ہو گیا۔۔۔۔ گناہ۔۔۔۔ سزا۔۔۔ موت۔۔۔۔ جہنم۔۔۔۔ موت۔۔۔ گناہ۔۔۔ جہنم۔۔۔ گناہ۔۔۔۔ خودکشی۔۔۔۔ ذلت۔۔۔ خودکشی۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔''

اس کا سر چکراتا رہا اور اس کے سر کے ساتھ تمام چیزیں چکر کھاتی رہیں۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل کر دروازے کی جانب بڑھیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔ کان بھی آنکھوں کے پیچھے پیچھے گئے اور دروازے پر آ کر رک گئے اور اندر ہی بیٹھ رہے اور آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ باہر ایک مجمع کھڑا ہے اور قہقہے لگا رہا ہے عجیب عجیب آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ مسلسل بول رہے ہیں۔ ''ہاں۔۔ یہی ہے۔۔۔۔ یہی ہے۔۔۔۔ نور احمد یہی ہے۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔ یہ نور احمد ہے۔۔۔۔ اس کا نام دیکھو اور اس کے کرتوت دیکھو۔۔۔۔ یہ اس کو امی جان کہا کرتا تھا۔۔۔۔ امی جان۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔''

کانوں کے لئے یہ الفاظ نا قابل برداشت تھے اور آنکھوں میں گلی والے انبوہ سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہ تھا۔ پس آنکھیں واپس آ گئیں اور پھر کان بھی واپس آ گئے۔

نور احمد کے ہاتھ کبھی اپنی بند آنکھوں کی طرف اٹھتے اور کبھی کانوں کی طرف لیکن بند آنکھیں مسلسل باہر کا منظر دیکھتی رہیں اور کان، جن میں نور احمد نے انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ باہر سے آنے والی ہر آواز کو اپنے بالکل قریب محسوس کرتے رہے۔ نور احمد نے بیزاری اور بے بسی کے عالم میں اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ اسے حیرانی ہوئی کہ تاریکی میں بھی وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ ایک خیال آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور اس کو جیسے ایک راستہ اس تاریکی میں باہر نکلنے کا نظر آ گیا۔ اسکے

ہاتھ تیزی کے ساتھ پہلو میں آرام سے لیٹی ہوئی عورت کی گردن کی طرف اٹھے لیکن [illegible]
رک گئے اور پھر اسی تیزی سے واپس آ گئے۔

''نہیں نہیں۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے [illegible]
۔اسے خود سے نفرت سی ہونے لگی اور اب اس کے ہاتھ اس کی [illegible]
کروں۔۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ موت ہی بہتر ہے۔۔۔ مجھے مرنا چاہیے۔۔۔ [illegible] ملیت تھا۔
مگر اب کیا ہوگا۔۔۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔۔ مجھے کیا کرنا چاہیے [illegible]
گھومنے لگے جیسے گراموفون کی سوئی ریکارڈ کے ایک ہی دائرے پر گردش کر رہی ہو۔

اس کا دل ڈوبنے لگا اور جسم سرد پڑ گیا۔ وہ ڈرا ڈرا سہما سہما [illegible] ایک کونے
میں جا کھڑا ہوا۔ اسے وقت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

''اف کس قدر تاریکی ہے۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے [illegible] ''یہ میری قبر
ہے۔۔۔ روشنی دور جا چکی ہے۔۔۔۔ وہ چمکتا ہوا ذرہ، میرے کمرے کا مدھم روشنی دینے والا بلب، [illegible]
کیوں چلا گیا ہے۔۔۔ میں دنیا سے دور کیوں چلا گیا ہوں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ مگر یہاں [illegible] ہوں ہے
۔۔۔۔۔۔۔۔'' اور اس نے اپنے سردی سے کانپتے ہوئے جسم پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا۔ ''اوہ
۔۔۔۔ تو لوگوں نے مجھے پورا کفن بھی نہیں دیا۔۔۔۔ اب میں کیا کروں [illegible]
حالت میں۔۔۔۔۔۔

ساتھ والے کا کفن چرا لو۔ تاریکی میں کہیں سے ایک آواز آئی۔

میں نے کبھی چوری نہیں کی۔۔۔۔ میں چور نہیں ہوں۔ میں برا آدمی نہیں ہوں [illegible]
دیا۔

اچھا، تم برے آدمی نہیں ہو؟'' اس واقعے کے بعد یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہو؟''

''میں [illegible] میں [illegible] میں نہیں جانتا [illegible]''

ٹھیک ہے تم کچھ نہیں جانتے۔ سردی سے بچنا ہے تو میرا مشورہ مانو۔ یہ دیکھو تمہارے سامنے ایک
اور لاش پڑی ہے نا۔۔۔ غالباً یہ لاش ہی ہے اور اگر لاش نہیں ہے تو اسے لاش بنانا ایسا کیا مشکل ہے۔ ایک
عورت کے جسم کی گرمی ختم کرنا کچھ ایسا دشوار کام بھی تو نہیں۔ [illegible] اس کا کفن اڑا لو۔۔۔۔ آگے بڑھو
۔ ڈرو نہیں۔

اور چند لمحوں کے لیے اس کا جسم تن گیا۔ گردن اکڑ گئی اور ہاتھ سامنے اندھیرے میں دراز ہو گئے
۔ پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن اگلے ہی لمحے دو قدم واپس آ گیا۔

''نہیں نہیں۔۔۔۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔'' اس نے سوچا۔

کے لئے موت ہے وہ تو کب کا مر چکا ۔۔۔ میں اپنے اصل روپ میں تمہارے سامنے موجود ہوں ۔۔۔کوئی ہے جو اس روپ کو اصل تسلیم کرنے سے انکار کی جرات رکھتا ہے ۔۔۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا ۔ میں اسوقت بھی زندہ تھی جب تم نہ تھے، میں اسوقت بھی زندہ رہوں گی جب تم نہ ہوں گے ۔۔۔ مجھے کون مار سکتا ہے ۔۔۔کیا تم مجھے نہیں پہچانتے ۔ دیکھو میں کون ہوں ۔۔۔ میں ۔۔۔بیگم مراد ۔۔۔بیگم دلسن ۔۔۔بیگم ایشور سنگھ ۔۔۔بیگم مرلی دھر ۔۔۔میں ۔۔۔میں ۔۔بیگم نور احمد ۔۔۔بیگم نور احمد ۔۔۔بیگم نور احمد ۔۔۔''

اور اس نے محسوس کیا جیسے پھر گراموفون ریکارڈ کی سوئی ایک ہی دائرے پر گھومنے لگی ہو۔

''نہیں نہیں ۔۔۔۔'' وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا اور بیگم مراد نے آنکھیں کھول دیں اور نور احمد خود کو ایک طوفان کے مقابل کھڑا محسوس کرنے لگا۔ وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں [illegible] شان بے اعتنائی سے مسکراتی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا اور اندر سے کنڈی چڑھا کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

بیگم مراد بھی چند لمحے مسکراتی اور سوچتی رہی۔ پھر وہ لباس درست کرتی اٹھی۔ زیرو کے بلب کو اس نے بجھا دیا اور معنی خیز انداز سے کہا۔ اب زیرو کے بلب کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر وہ بناؤ سنگار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور بازو یوں جھٹکے کے ساتھ پھیلائے جیسے تمام غم و فکر اتار کر پھینک دیے ہوں۔ وہ چند لمحے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتی رہی پھر بیچ والے دروازے کے قریب آئی اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

دروازے کے ادھر نور احمد فرش پر بیٹھا کراہ رہا تھا جیسے کسی کرب میں مبتلا ہو۔ بیگم مراد نے دروازے کو ذرا سا چھیڑا اور پاؤں سے ہلکی سی آہٹ پیدا کی اور نور احمد دم بخود ہو کر سوچنے لگا۔ ''وہی آہٹ۔۔۔۔''

''نور احمد۔۔۔۔بیگم مراد نے کہا۔'' جو ہونا تھا ہو چکا۔۔ اب پریشان ہونے کی بجائے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو بیگم مراد نے پھر کہا۔ نور احمد میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ یہ واقعہ اگر کسی پریشانی کا سبب ہو سکتا ہے تو صرف میرے لئے ۔۔۔۔لیکن میں پریشان نہیں ہوں۔۔۔۔ میں نادم بھی نہیں ہوں۔''

ان الفاظ سے نور احمد کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ تنہا قصوروار نہیں ہے اور اس کا یہ خدشہ بھی جاتا رہا کہ یہ عورت جاگ کر نہ جانے کیا اودھم مچائے گی لیکن وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ دنیا کے سامنے جا سکے۔۔۔۔ اس دنیا کے سامنے جو باہر گلی سے شروع ہوتی تھی اور پھر جس کا کوئی دوسرا کنارہ نہ تھا۔

دل سے ایک خوف کم ہوا تو اس کی جگہ شدید نفرت نے لے لی۔

نور احمد کیا تم سو گئے ہو۔؟ بیگم مراد نے سوال کیا۔

''اس جاگنے سے بہتر تھا کہ میں سویا رہتا۔۔۔۔آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔۔۔۔ میں گناہ کے احساس سے مر جاؤں گا۔۔''

''نہ میں نے کوئی ظلم کیا ہے اور نہ تم نے کوئی گناہ۔۔۔۔۔''

''جی۔۔''

''تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔۔تم نے ایک ایسے شخص کی پیاس بجھائی ہے جو کوسوں پیدل چل کر تمہارے پاس آتی تھی۔۔۔۔ایسے لوگوں کا درجہ فرشتوں کے برابر ہوتا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں''۔ نور احمد چکرا گیا اسے توقع تھی ایک طوفان کی۔ مگر یہاں طوفان سے دور ساحل پر ایک پرسکون ہوا سے سامنا تھا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔'' پرسکون آواز آئی۔

''مگر۔۔۔۔آپ نے۔۔۔۔آپ نے بانو سے میری شادی کی ہے۔ اور وہ آپ کی بیٹی ہے۔''

''عورت اتنی بڑی قربانی بہت کم دیتی ہے۔''

''قربانی۔؟؟؟۔''

''ہاں۔۔۔۔قربانی۔۔۔۔کیا تم نہیں سمجھتے۔۔۔۔یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو؟''

''آپ نے اپنے علاوہ بانو پر، مجھ پر، اور مراد میاں پر، سب پر ظلم کیا ہے۔۔۔۔آپ ہم سب کی گناہ گار ہیں۔ آپ خدا کی گنہگار ہیں۔۔۔۔آپ نے مراد صاحب ایسے فرشتہ آدمی سے دغا کی ہے؟

''مراد صاحب اور فرشتہ؟'' بیگم مراد کی آواز ایک دم طنزیہ ہوگئی اور اس نے ایک نفرت بھرا مختصر سا قہقہہ لگایا۔

''ہاں کہتے تو ٹھیک ہو۔ جو شخص مرد ہو کر بھی مردوں والا کام نہ کرے۔ وہ فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔۔۔۔تم نے ان کو باہر سے دیکھا ہے اور میں ان کو اندر سے جانتی ہوں۔ تم سوچ رہے ہو کہ مجھے کیا ہوا ہے۔۔۔۔تم نہیں جانتے لیکن میرے گھر کی دیواریں جانتی ہیں مجھے کیا ہوا ہے۔ اور اب تو شاید تم بھی جان گئے ہوگے۔۔۔۔۔اور سمجھ گئے ہوگے کہ آدمی کا وقار آدمی بننے میں ہے نہ کہ فرشتہ بننے میں۔۔۔۔تمہاری طرح فرشتہ بننا اور بات ہے تم نے تو گویا غیبی سہارا دیا ہے۔

آہ۔ آپ کس قدر خود غرض ہیں۔۔۔۔آپ نے مجھے جہنم کی آگ میں جھونک دیا۔۔۔۔حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔۔۔۔آپ نے مراد میاں اور بانو کے حقوق غصب کئے۔۔۔۔ میں ذہنی پریشانی میں پھنس

ناخوشگوار باتیں بھی اس کے ذہن میں ابھر آئیں جو اس نے اس عورت کے بارے میں سنی تھیں اور جن پر اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ ''تو یہ سب کچھ سچ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کیا ان کے چار دل بیٹوں میں سے کوئی مراد میاں سے نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مراد میاں واقعی ۔ ۔ ۔ ۔ واقعی بے بس ہیں مجبور ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ سب چپ چاپ کیسے برداشت کرتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ جانتے بوجھتے وہ آرام اور خاموشی سے کیسی زندگی گزار رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر انہوں نے شادی ہی کیوں کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ظلم ہی کیوں کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب ظلم ۔ ۔ دریا کے راستے میں میرا چھوٹا سا گھر کیوں آ گیا ۔ ۔ ۔ میرا کیا قصور تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مراد میاں کو اس جرم کی سزا سمجھ میں آ سکتا ہے کہ انہوں نے ایک عورت پر ظلم کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میرا کیا قصور تھا۔ میرا کیا قصور تھا ۔ ۔ ۔ ۔ کیا نیکی کا یہی صلہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا فطرت واقعی، زندگی سے نیکیوں کا انتقام لیتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ،

اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے سر کو گھٹنوں میں زور سے دبا لیا اور دونوں ہاتھوں سے سر کی پشت کو اپنی پوری طاقت سے دبانے لگا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک اور خوفناک خیال نے سر اٹھایا۔

''بانو کا باپ کون ہے؟؟؟''۔

اور اس کے سر میں تیز و تند آندھیاں سی چلنے لگیں۔

یہ سوال سخت تکلیف دہ تھا۔ بانو ایسے شخص کو باپ سمجھے ہوئے تھی جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پہلے تو نور احمد کو یہ اطمینان تھا کہ اکثر لوگ جھوٹ بولتے ہیں بالخصوص عورتوں کے سلسلے میں رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں لیکن اب تو سب پردے اٹھ گئے تھے اور عریاں بدشکل کریہہ المنظر حقیقت سامنے کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی اس کی شرافت پر ہنس رہی تھی اور تکلیف دہ خیالات سے کہ امڈے ہی چلے جاتے تھے۔ ''ہمارے بچے ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مراد صاحب کو ہی نانا کہیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ میں انہیں اصل حقیقت کیسے بتا سکوں گا۔ کیا میں بانو کو بتا سکوں گا کہ اس کا مراد سے کوئی تعلق نہیں اور اس کی ماں آوارہ عورت ہے جس نے بیگم مراد نام کی ایک نقاب اوڑھ رکھی ہے ابھی شاید اس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے وہ بھی بالکل معصوم معلوم ہوتی ہے ۔ کیا یہ اطلاعات اس کی زندگی کو زہر آلود کر دیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میں اس کو ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں۔ میں اسے چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کا کیا قصور ہے ۔ ۔ ۔ تو پھر کیا خاموش ہی رہنا پڑے گا ۔ کیا ضمیر کو مار ڈالوں ۔ ۔ ۔ حقائق سے سمجھوتہ کر لوں کیا مجھے واقعی یہ سمجھوتہ کر لینا پڑے گا

اس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیے، اور اسے دونوں ہاتھوں میں یوں تھام لیا جیسے کوئی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے رہا ہو دماغ میں ایک گرداب تھا ۔ ۔ ۔ ایک طوفان تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شور تھا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا ۔ ۔ ریل گاڑیاں جہاز، سڑک کوٹنے کے انجن اس کے سر میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے اور سر تھا کہ سلامت تھا۔

اور وہ سوچتا رہا۔ بانو بہت اچھی ہے۔ بہت نیک ہے۔۔۔۔۔ وہ تو ان تلخ حقائق سے واقف ہی نہیں ہے۔ میں اس سے یہ راز چھپائے رکھوں گا۔ میں اس کی زندگی کو تلخ نہ ہونے دوں گا۔۔۔ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ سب مرد بھی تو ایک سے نہیں ہوتے۔ مجھے اس سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ۔۔۔ مجھے اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔۔۔ وہ میری ہے۔۔۔ وہ مرادعلی کو باپ سمجھتی ہے۔۔۔ سمجھتی رہے۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔۔

اس نے اطمینان کا ایک مختصر سا سانس لیا ہی تھا کہ پھر ذہن میں ایک نئی بات کا خیال آیا مگر لوگ ۔۔۔ لوگ تو بہت کچھ جانتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک نہ ایک دن بانو کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔۔۔ پھر ۔۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟۔۔۔۔ لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں۔ تکلیف پہنچا کر مزے لیتے ہیں۔ علیحدگی ہی بہتر ہے کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جائے گا۔۔۔ نہیں نہیں اگر بچی ہو گئی تو؟۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ اس کی پرورش اسی گھر میں ہوگی۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ وہ میرے پاس رہیں گے۔۔۔ میں ان کا محافظ ہوں ۔۔۔۔۔"

انہی خیالات میں غلطاں وہ کچھ دیر کے لئے سو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی اس وقت روشندانوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ روشندان سے صبح کے سورج کی پہلی کرنیں سامنے پلنگ پر گول بیٹھے ہوئے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ رات کے واقعات اسے خاصی دور افتادہ شے معلوم ہونے لگے لیکن یہ احساس زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا تاہم روشنی میں وہ خود کو کچھ باحوصلہ ضرور پا رہا تھا۔ اس نے بیچ کے دروازے کی جانب نفرت اور بے چارگی سے دیکھا اور پھر باس میں تھوڑا سا رد و بدل کر کے کمرے کا گلی والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دوسرے کمرے میں موجود عورت بھی جاگ چکی تھی اور اس کی توجہ برابر ادھر لگی تھی اس کو معلوم ہو گیا کہ نور احمد گلی میں نکل گیا ہے۔ وہ بھاگ کر چھت پر پہنچی اور اسے دیوار کے جھنگلے سے جاتا دیکھنے لگی۔ وہ گلی سے گزر کر سڑک پر پہنچا اور پھر دائیں جانب گھوم کر غائب ہو گیا جیسے مکانوں اور دکانوں کی دیواریں اسے ایکدم نگل گئی ہوں۔ اس نے رخ پھیرے بغیر زیر لب کہا۔

"نور احمد اگر تم بانو کے باپ کے بارے میں پریشان ہو تو میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں۔۔۔۔ میں تمہیں بتا دوں گی کہ شیر علی اس کا باپ نہیں ہے۔۔"

وہ کمرے میں واپس آئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا کا نظارہ کرنے لگی۔

"گناہ" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہونہہ گناہ۔۔" وہ مسکرا دی۔ "بے وقوف ناشکرا۔۔"

اس نے دیکھا آئینے میں وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے پیچھے ایک قطار میں چار مرد کھڑے تھے مراد علی افتخار علی۔ یہ نام کہتے ہی اسے یاد آیا تھا۔ شیر علی اور نور احمد۔ اور وہ سوچنے لگی، مذہب نے اجازت دی ہے کہ اگر بیوی مستقل بیمار رہے یا کوئی اور وجہ ہو تو مرد اور شادی کر سکتا ہے۔۔۔ چار تک اجازت ہے، اور دو

اپنے پیچھے کھڑے ہوئے پیار آدمیوں کو دیکھ کر اور زیادہ مسکرائی۔

وہ پلٹی تو سامنے منقش میز پر رکھی ہوئی نور احمد کی تصویر پر اس کی نظر جا پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھایا۔ چند لمحے اسے غور سے دیکھ کر مسکراتی رہی پھر اس کے چہرے پر ایکدم سنجیدگی کا بادل چھا گیا اور اس نے تصویر کو زور سے سنگار میز کے شیشے پر دے مارا

اس ایک واقعے سے قطع نظر بیگم مراد کو اس صبح نے بالکل ویسا ہی پایا جیسی وہ عام طور پر نظر آتی تھی۔ اس نے اطمینان سے ناشتہ کیا اور پھر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خود بازار جا کر ایک آدمی کو بلا لائی جس نے سنگار میز اور تصویر کے ٹوٹے ہوئے شیشے اٹھا کر ان کی جگہ نئے شیشے لگا دیے اور پھر اس کمرے کو مقفل کیا اور اپنے دفتر کی طرف چل دی۔

وہ جانتی تھی کہ نور احمد فوری طور پر اس کے گھر نہیں آئے گا۔ اس لئے اس نے آتے ہی کہہ دیا کہ افسران نے اس کی چھٹی منسوخ کر دی ہے اور کسی ضروری کام کے سلسلہ میں چند روز کے لئے فوری طور پر باہر بھیج دیا ہے یہ کوئی تسلی بخش بات نہ تھی لیکن اس بات کو ٹالنا اس گھر میں ممکن نہ تھا۔ بانو کو دفتر والوں کو یہ سختی بہت بری لگی لیکن وہ مجبور کر سکتی تھی

(ا)

نور احمد کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ان جگہوں سے دور رہے جہاں اسکے دوستوں اور واقفوں کے ملنے کے امکانات زیادہ تھے۔ رات وہ ایک گمنام سے ہوٹل میں رہا۔ وہ گھر سے دور چلا گیا تھا مگر اذیت ناک خیالات نے اس کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ ایک وفادار کتے کی طرح اس کی خوشبو سونگھتے اس کے تعاقب میں چلے آتے تھے۔

وہ یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ کسی مولوی سے فتویٰ لے یا دوستوں سے مشورہ کرے۔ ہر طرح بات پھیلنے اور بدنامی کا خدشہ تھا۔ اسی ادھیڑ پن میں دو دن گزر گئے۔ دوست اس کی اچانک گمشدگی پر حیران تھے۔ مراد میاں کے ہاں سے خاطر خواہ جواب نہ پا کر انہوں نے دفتر سے بھی پتہ کیا لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ دوست محمد کی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی دوست محمد اپنے کسی عزیز سے ملنے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے نور احمد نظر آ گیا اس کا چہرہ اترا ہوا اور زرد تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے کا ایک ایک نقش اذیت کا شکار تھا۔ دوست محمد نے محسوس کیا کہ وہ اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتا ہے اس لئے وہ زیادہ تیز مستعد اور محتاط ہو گیا اور اس تک جا ہی پہنچا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب نور احمد کو اپنے ساتھ لئے بغیر واپس نہ ہو گا۔

اس کے مجبور کرنے پر نور احمد نے بہزار دقت اور بہت تامل کے بعد تمام حالات اس کو سنائے، کچھ دیر تک تو دوست محمد کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ آخر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مولوی حمید سے

بات کی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ بات چھپے گی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کو چھپنے سے روکنے پر بھی قادر نہیں۔

وہ حمید کی بیٹھک پر پہنچے اور چق اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ یہاں حمید کے علاوہ اختر راٹھور اور حیدر گنجا بھی موجود تھے۔ دوست محمد نے نور احمد کو ان کے پاس چھوڑا اور خود چائے کا آرڈر دینے کے لئے ہوٹل کی طرف چل دیا

اس کے باہر نکلتے ہی سب لوگ نور احمد پر پل پڑے۔

''ارے تو کہاں تھا اتنے دنوں سے؟''

''کیا شکل بنائی ہے۔''

''واہ رے میرے قیس عامری ------- یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ یہ دوست محمد تجھے کس دشت جنوں سے پکڑ لایا۔''

اسے کچھ نہ کہو بے چارے کی بیوی بھاگ گئی ہے۔ حیدر گنجے نے مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہیں؟ کیوں۔؟ کس کے ساتھ؟ تو نے پہلے کیوں نہ بتایا؟'' ان سب آوازوں سے مل کر بنی ہوئی ایک آواز ابھری

''پہلے کیا بتاتا۔ حیدر نے وضاحت کی۔ ''مجھے خود ابھی ابھی خیال آیا ہے ---- مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' حیدر نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ذرا میکے گئی ہے اپنی ماں کے ساتھ''

اور سب قہقہے لگانے لگے مگر نور احمد افسردہ اور خاموش بیٹھا رہا۔

''کوئی کہہ سکتا ہے کہ تیری شادی کو صرف چار روز ہوئے ہیں۔ اپنی صورت تو دیکھ۔ مجنوں کا بیمار لگتا ہے۔ سب ہی کی بیویاں شادی کے فوراً بعد میکے جاتی ہیں۔ تیرے ساتھ کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی پھر تو سنیاس لینے پر کیوں آمادہ ہے؟'' اختر راٹھور نے کہا۔

''تجھے کیا پریشانی ہے؟'' حیدر گنجے نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''کون تیرے راستے میں آیا ہے تو، اشارہ کر دے باقی ہم خود سمجھ لیں گے۔ تو اپنی مشکل ایک بار ہم سے کہہ دے تو پھر دیکھ یاروں کے حوصلے ---- کچھ بول تو سہی ---- بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے --- بول۔''

نور احمد خاموش رہا۔

''ارے کچھ کہے گا بھی'' اختر راٹھور چلایا۔

نور احمد پھر خاموش رہا۔

اچانک مولوی حمید کے بستر میں پڑے ہوئے لحاف میں زلزلہ آیا اور اندر سے کسی نے یا علی کا نعرہ لگا

کر کہا۔

دیکھا ہے اختر رنجور
بستر سے اقامت چھوڑ

اور پھر سب ہنسنے لگے۔ یہ عاشق مزاج تھا جسے سردی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی اور جب آتے ہی مولوی حمید کے بستر پر قبضہ جما لیتا تھا۔ اگر کبھی مولوی حمید بستر میں ہوتا تو بھی بے دھڑک گھستا ہی چلا جاتا یہاں تک کہ مولوی حمید بستر چھوڑ کر ایک کمبل میں لپٹ لپٹا کر آرام کرسی پر جا بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اس اونٹ کی طرح تھا جو سر چھپانے کی جگہ مانگ کر پورے خیمے پر قابض ہو گیا تھا۔ پرانی دوستی پر وہ جان دیتا تھا۔ یہ کسی کے بس میں نہ تھا کہ اس پر کوئی پابندی لگا سکے۔

عاشق مزاج کی اس بات پر نور محمد کو بہت دکھ ہوا۔ وہ اس کی بے ہودگی سے ہمیشہ نالاں رہتا تھا اور اس وقت اس کی موجودگی سے حرم کی شہر کا تیغی سامان معلوم ہو رہی تھی۔

نور احمد کی خاموشی اب پریشانی کا سبب بنتی جا رہی تھی۔ سب کو خیال ہونے لگا تھا کہ ضرور کوئی خطرناک بات ہے۔ چنانچہ مولوی حمید نے اسے شانے سے جھنجھوڑ کر کہا ”تو بولتا کیوں نہیں۔۔۔ آخر ماجرا کیا ہے؟“

”اے بھئی یہ کیا بولے گا۔“ لحاف میں سے زلزلہ آیا۔ ”ہم سے پوچھو سالا نامرد ہے۔۔۔ ورنہ عورت کی مجال ہے کہ شادی کے دو روز بعد بھاگ جائے اور پھر خود سے واپس نہ آئے۔“

اب کے ایک بے جان سا قہقہہ بلند ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے صرف ماحول کو ٹھیک کرنے اور پریشانی دور کرنے کا بہانہ ہے۔

دوست محمد داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا ملازم تھا جو چائے رکھ کر چلا گیا۔ دوست محمد نے گفتگو کا آخری حصہ سن لیا تھا اور اب نور محمد کی شکل دیکھ کر اس نے اندازہ کر لیا کہ اسے بہت دق کیا گیا ہے چنانچہ اسے مزید پریشانی سے محفوظ رکھنے اور اصل پریشانی کا حل تلاش کرنے کی غرض سے اس نے مختصراً سارا واقعہ سنا دیا۔ جسے سن کر حیدر گنجے کے سر میں سخت کھجلی ہونے لگی اور کمرے میں ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ سب کو ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز قریب چلتی ہوئی آندھی کی طرح معلوم دیتی تھی۔

”کیا یہ سب سچ ہے؟“ مولوی حمید نے حیرانی سے پوچھا۔ ہم سب تمہیں نیک فرشتہ سمجھتے تھے۔ مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ نور احمد تم نے بہت برا کیا۔

میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ یہ کیسے ہو گیا۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ نور احمد نے عاجزی سے کہا۔

”کچھ کرنا اور کسے کہتے ہیں۔“ مولوی حمید نے برہمی سے کہا۔ ”ہر گنہگار اور ہر مجرم یہی کہتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تم چاہتے تو خود کو بے قابو نہ ہونے دیتے۔“

نور احمد کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا۔ ”کاش میں یہاں نہ آتا۔“

”اس بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ دوست محمد نے کہا۔ ”حمید تم کچھ زیادہ ہی تنگ نظری کا ثبوت دے رہے ہو اس معاملے میں تو زلیخا ایسے نام۔

بس۔۔۔ رہنے دو۔۔۔ نیک لوگوں کے ناموں کو اس معاملہ میں نہ لاؤ۔ مولوی حمید نے احتجاج کیا۔

”تمہارے اس غلط احتجاج پر تو یہ ذکر اور ضروری ہو گیا ہے۔ تمہیں سننا ہی پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ زلیخا نے کیا کیا اور یہ جانتے ہو کہ خدا نے اسے معاف کر دیا۔۔۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ نور احمد نے دانستہ غلطی نہیں کی اور اس کے باوجود اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے اور دکھ پہنچا رہے ہو۔ میں اس کو یہاں اس لئے لایا تھا کہ سب مل کر اسے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔۔۔ تم دیکھتے نہیں وہ کس قدر شرمندہ ہے۔ کتنا نادم ہے۔۔۔ دوست محمد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

ان الفاظ کا حمید پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کس قسم کی عورت ہے؟ یہ کیسی ماں ہے؟ یہ عورت ہے یا ڈائن؟ مائیں ایسی نہیں ہوتیں۔“

دنیا میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ دوست محمد نے سمجھانا چاہا۔ ”آئے دن اخباروں میں ایسی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کوئی عورت چھ بچوں کو چھوڑ کر آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی اور کسی نے آشنا کی مدد سے خاوند کو مروا دیا۔ اور چار بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس مسئلے پر بحث کا وقت نہیں ہے کہ کوئی ماں ایسی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت ایک ماں ہے جو ایسی ہی ہے اور ایک دوست ہے جو بے قصور ہے اور یہ واضح ہے کہ ان حالات میں بانو کا اپنی ماں کے پاس رہنا درست نہیں ہے۔

گناہ بہر حال گناہ ہے۔“ مولوی حمید نے قدرے نرمی سے کہا۔ اور گناہ گار کی رعایت کرنا بھی گناہ ہے۔۔۔ میں کہتا ہوں اگر مرادمیاں کسی کام کے نہ تھے تو ان کی شادی ہی کیوں کی گئی۔

”یہی تو اصل سوال ہے۔“ اختر راٹھور نے کہا۔ ”اور اس کا جواب ہی بیگم مراد کو ایک حد تک اور نور احمد کو بڑی حد تک قابل معافی ثابت کرتا ہے۔

”یعنی؟“

یعنی یہ کہ تم اصل حالات کو نظر انداز کر رہے ہو۔ اختر پھر گویا ہوا۔ تم اس عورت سے واقف نہیں ہو اور نہ ہی اس کے حالات کا علم رکھتے ہو، نہ ہی تم نے ان حالات کو جاننے کی خواہش کا اظہار کیا اور یک طرفہ کارروائی عمل میں لے آئے ہماری بیگم مراد سے دور کی رشتہ داری ہے۔ تعلقات تو نہ ہونے کے برابر ہیں مگر ہم ایک دوسرے کے حالات سے بخوبی واقف ہیں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پوشیدہ رہنا ہی درست ہوتا ہے مگر حالات پردے اٹھا ہی دیتے ہیں۔۔۔ مرادمیاں واقعی صرف نام کے آدمی ہیں لیکن کسی

کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا ہے کہ مجھے فلاں بیماری ہے۔ اس نے اپنے انداز میں ڈرتے ڈرتے شادی سے انکار کیا مگر کسی نے نہ سنی۔ وہ چپ ہو گیا اسے امید تھی کہ وہ ہومیوپیتھی کے ذریعے اپنا علاج کرے گا۔ وہ ڈاکٹر اسی لئے بننا چاہتا تھا۔ شرم کے مارے وہ کسی سے بات کرتا تھا نہ ملتا تھا۔ اس کو صحیح راہ نمائی بھی نہ مل سکی ان حالات میں بیگم مراد کا گمراہ ہو جانا گو اچھا نہیں ہے مگر اس میں کچھ زیادہ حیرت کی بات بھی نہیں ہے ۔۔۔اس مراد کو بھی۔۔۔ جو چار عدد ایسے بچوں کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ بظاہر ان سے محبت بھی کرتا ہے جن سے اس کا دلی تعلق نہیں۔ شاید وہ یہ سب کچھ رضائے الٰہی سمجھ کو قبول کئے بیٹھا ہے۔ میں نے نہیں سنا کہ اس نے آج تک ان سے کوئی شکایت کی ہو۔ شادی پر وہ زیادہ جرات سے کام نہ لے سکا۔ اس پر افسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے کردار کی فطری یا غلط پرورش سے پیدا شدہ کمزوری کو تم کیسے نظر انداز کر دو گے ۔۔۔۔اور یہ تو ایک مثال ہے نہ معلوم کتنے مرد اسی طرح نامردی کی زندگی گزارتے اور دوسروں کے بچے پالتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ایک پردہ اٹھ گیا اور تم بہلانے لگے ہو۔۔۔۔۔ ذرا زندگی میں ڈوب کر دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ اور کیا کیا برداشت کرنے اور کیا کیا معاف کرنے کی ضرورت ہے۔

ایسی مثالیں بھی تو ملتی ہیں جب اس قسم کے حالات میں عورتوں نے انتہائی پاکیزگی اور عفت کی زندگی گزار دی۔ کھلی چھٹی دے کر معاشرے اور اخلاق کی تباہی کے سامان پیدا کرنے کی اجازت بھی تو نہیں دی جا سکتی۔۔۔۔ جرم کی سزا نہیں ملے گی تو جرم کا احساس کیسے پیدا ہوگا۔

میں یہ کب کہتا ہوں کہ جرم کی سزا نہ دی جائے۔ اختر نے کہا۔ ''میں تو یہ کہتا ہوں کہ حالات کا مطالعہ بھی ضرور کیا جائے۔۔۔ پابندیاں لگائی جائیں ضابطے بنائے جائیں، لیکن جرم کو عام زندگی اور مجرم کے حالات سے کاٹ کر دیکھنا کہاں کا انصاف ہے۔۔۔ اور پھر جنس کا جذبہ کون نہیں جانتا کتنا ظالم ہے۔۔۔۔ جہاں اسے ضبط میں رکھنا ضروری ہے وہاں بعض رعایات دینی بھی ضروری ہے بالخصوص اس وقت جب حالات بھی خاص ہوں۔۔۔ پھر فرد کے سلسلہ میں تم معاشرتی کمزوریوں اور ظلم کو کیوں بھول جاتے ہو ۔ یہ بھی خوب انصاف ہے کہ اخلاق کے نام کا لٹھ اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے دے مارا مجرموں پر۔ کسی کا سر ٹوٹا، کسی کا ہاتھ اور جناب کو اطمینان ہو گیا کہ گنہگاروں نے اپنے کئے کی سزا پائی۔۔۔۔۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ سزا تجویز کرنے پر سب آمادہ ملیں گے لیکن حالات کو ٹھیک کرنے کا عزم کسی کے پاس نہیں ۔۔۔ ایک بات کا جواب دو۔ یہیں اس معاملے کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ہم میں ایسے کتنے ہیں جن کو اپنے جنسی جذبات پر ہمیشہ اس قسم کا ضبط رہا ہو جس کا تم مطالبہ کرتے ہو؟ اور جن سے کبھی کسی قسم کی جنسی غلطی کا ارتکاب نہ ہوا ہو۔۔۔ اب خاموش کیوں ہو؟۔۔۔۔۔۔ خاموش رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہو۔ تمہاری خاموشی تمہاری شکست ہے۔ پھر ایسی مثالیں تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ ہملٹ کی ماں میری آف سکاٹ لینڈ اور دیو مالاؤں کے زمانے میں ہیلن اور کلائی ٹمنسٹرا۔۔۔۔ مولوی صاحب ذرا اس دنیا میں رہ کر

سوچو۔۔۔ اور نور احمد سے پوچھو کہ وہ کیا ارادہ رکھتا ہے۔''

''میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' نور احمد نے کہا۔ ''جب ایک خوفناک خیال کو دباتا ہوں تو دوسرا زیادہ خوفناک خیال سر اٹھا لیتا ہے۔۔۔ مجھے ڈر ہے بانو بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر نہ چلنے لگے۔''

بانو بہت نیک لڑکی ہے۔'' اختر نے کہا۔ ''اگر تم اس کو پوری طرح اس ماحول سے نکال دو گے تو وہ محفوظ رہے گی۔ تاخیر نقصان دہ ہو سکتی ہے کیونکہ خراب ماحول سے بچانا آسان نہیں ہے اور شادی کے بعد اس کی زندگی میں اور خیالات میں تبدیلی آنا بھی آسان ہے۔''

یہ ٹھیک ہے دوست محمد نے تائید کی۔

''لوگ بہت سی باتیں جانتے ہیں۔'' نور احمد نے کہا۔ ''یہ بھی کہ مرحوم میاں بانو کے باپ نہیں تھا۔''

''اس میں بانو کا کوئی قصور نہیں۔ تمہیں تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ نیک ہو۔ ـــــ تم اپنی مثال ہی لے لو۔ تم بھی تو خود کو بے قصور سمجھتے ہو۔۔۔۔ تم نے تو کوئی غلطی کی ہی نہیں۔ لیکن بانو کو کسی بھی طرح مطعون نہیں کیا جا سکتا۔'' اختر نے کہا۔

لیکن اسکا باپ۔۔۔۔'' نور احمد نے کچھ اور کہنا چاہا۔

تمہارا باپ کون ہے نور احمد؟'' اختر راٹھور نے ٹوک دیا۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ واقعی امداد علی کے بیٹے ہو اسی امداد علی کے جس کی ناک تمہاری ناک سے دوگنی بلند تھی اور جس کی پیشانی تمہاری سے دوگنا کشادہ تھی۔۔۔۔ معصوم فطرت کس کس کا پردہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ پردہ اٹھ گیا ہے اور تم پریشان ہو رہے ہو؟''

''اختر'' نور احمد چیخا۔

''چلاتے کیوں ہو؟'' اختر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''زندگی میں حادثوں اور مصیبتوں کی گنجائش رکھنا ہی پڑتی ہے۔ انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں کو ان کا حصہ دینا ہی پڑتا ہے۔ دوسروں کو معاف کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ دوسرے بھی تمہیں معاف کر دیں۔ یہاں کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ اگر تم یہ نہیں سمجھتے تو مجھے اس بات کا ثبوت دو کہ تم واقعی امداد علی کے بیٹے ہو اسی امداد علی کے جس کا بڑا بیٹا شیر علی کی طرح جری اور آزاد تھا۔''

نور احمد نے سر گھٹنوں میں چھپا لیا جیسے رونے لگا۔ اختر نے محسوس کیا کہ تیر خطا نہیں گیا۔ چنانچہ وہ پھر وہ بولا۔

''بانو اب عملی زندگی میں قدم رکھ چکی ہے۔ اب اس کے جذبات یقیناً پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں شادی کا تجربہ کوئی معمولی تجربہ نہیں ہوتا۔ اس وقت ذرا سی بھی لاپروائی اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور پھر اس

کا گناہ تمہارے سر ہوگا یا پھر اس مولوی حمید کے سر جو انصاف کا لٹھ آنکھیں بند کر کے گھمانے کا قائل ہے ---- ایک بار پھر سن لو اور غور سے سن لو ---- بیگم مراد کی شادی اس سے پوچھ کر نہیں کی گئی تھی۔ مراد کو اس کی ذات کا حصہ قدرت نے یا حالات نے یوں بنا دیا جیسے گھن دانہ گندم کا بن جاتا ہے اور دیمک لکڑی کا ---- وہ جب گل رخ تھی تو اس کے حسن کا بڑا شہرہ تھا۔ میرے بھائی شجاعت راٹھور نے بہت چاہا کہ اس سے شادی ہو جائے لیکن تولی سٹے والا ہے تھا اور بزرگوں کے حکم سے سرتابی جرم تھا اور پھر اس ظلم کا کیا علاج جو فطرت خود روا رکھتی ہے شجاعت بھائی نے ایک بار گل رخ کو بھگا لے جانے کا پروگرام بنایا تھا مخالفت کرنے والوں میں میں ہی پیش پیش تھا اور آج مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہ بھائی کی مدد کی ---- ہمارے یہ روگ صرف فطرت میں اور دکھ ہیں۔ ہمارا کام مسلسل یہ ہے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو جینے کے قابل بنائیں۔ یہ صرف ایک معقول حد تک ممکن ہے اور یہاں تک جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے قصہ مختصر ان سب باتوں سے مقصود یہ سمجھانا ہے کہ بانو کی واپسی کا فوراً انتظام کرو۔۔

عاشق مزنگی اب تک معصوم کیسے خاموش پڑا تھا۔ اس سنجیدہ بحث میں لوگ اسے کچھ دیر کے لئے بھول سے گئے تھے اور دوست محمد کو تو پریشانی میں خیال بھی نہ رہا تھا کہ عاشق بستر میں گھسا پڑا ہے۔ اس نے اپنی موجودگی کا پھر احساس دلایا اور کفن پھاڑ کر (یہاں لحاف ہٹا کر) بولا ''ارے بھائیو۔ ہم نے کل چار جماعتیں پڑھیں پر عقل کوئی کتابوں سے آتی ہے ---- میاں نور احمد کیوں اپنا جی ہلکان کرتے ہو۔ اپن کے ساتھ روز ایسے معاملے ہوتے رہتے ہیں اور اپن خوش ہیں اپنی سمجھ میں تمہاری رونی شکل آتی نہیں ---- تم پریشان جاتے ہو۔ ورنہ جی چاہتا ہے کہ گرہ میں باندھنے کا ایک ایک بات کہوں۔''

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جنہیں یہ یقین کم ہی تھا کہ عاشق کوئی سنجیدہ اور مفید مشورہ دے گا پھر بھی وہ سننے کو بے تاب تھے کہ آخر اس کے دماغ میں کون سی بات ہے۔ ادھر عاشق مزنگی نے سب کو اپنی جانب متوجہ پایا تو ہونٹ بھینچ کر بیٹھ رہا اور باقی لوگ جو انتظار کھینچ رہے تھے اس سے لطف اٹھانے لگا۔

دوست محمد کو اس وقت یہ حرکت اچھی نہ لگی۔ وہ ملامت کرنا ہی تھا کہ عاشق مزنگی نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔

اپنا تو ہے یہی اصول
تازہ باسی کرو قبول
کرو قبول

وہ جانتا تھا کہ اس مشورے کے بعد اس سے کیا سلوک ہوگا چنانچہ اس نے فوراً مضبوطی سے لحاف کو جسم کے گرد کس لیا اور دوست محمد کے گھونسے ہنس ہنس کر کھاتا رہا۔

''کہہ دو مار ڈالوں گا۔'' عاشق چھیڑنے سے باز نہ آیا۔ ''مارنے والی صورتیں ہی اور ہوتی ہیں

سالا اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی فرشتہ بنا پھرتا ہے۔۔

نور احمد کچھ نہ کہہ سکا اس کے ذہن میں ایک ہی ریکارڈ بج رہا تھا "تم مجھے نہیں مار سکتے ۔۔۔۔ تم مجھے نہیں مار سکتے ۔۔۔۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا ۔۔۔۔"

اس نے بے بسی سے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید نے ہاتھ کوٹ سے نکالا اور کہا۔ "فخر کی رائے درست ہے۔ تمہیں واقعی بانو کے بارے میں کسی قسم کے شبے دل میں جگہ نہیں دینا چاہئے اور اس کی واپسی کا فوری طور پر انتظام کرنا چاہئے اور تمہیں اپنے گھر بھی فوراً پہنچ جانا ہے۔

(۱۲)

وہ ہوٹل میں واپس آیا تو دوستوں کے دیئے ہوئے مشورے اس کے ساتھ تھے اور وہ ان پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے مزید سوچا اور محسوس کیا کہ ابھی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ خود مراد میاں کے گھر جاتا اور بانو کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔ چنانچہ اس نے بانو کے نام ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ادھر نہیں آ سکتا تم فوراً چلی جاؤ۔

خط ڈالنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بے کار بات کی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خط بانو کو نہیں ملے گا۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس خط کے مضمون سے واقف ہو جائے۔۔

بیگم مراد اسے پڑھے اور کہیں رکھ کر بھول جائے اور بانو کی نظر پڑ جائے یا کوئی اور ہی صورت نکل آئے اور بانو ماں سے بغاوت کر دے۔

اگلے دن وہ اپنے گھر واپس چلا گیا وہی گھر تھا کوئی تبدیلی اس کو نظر نہ آئی دن بھر وہ بانو کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ اس نے ایک اور خط لکھا۔ تین دن اور گزر گئے۔ پھر اس نے تیسرا خط لکھا مگر بے سود۔ تیسرا خط اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھا تھا۔ اس رات وہ بستر پر لیٹا تو معمول سے زیادہ افسردہ تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ وہ بانو کو بے حد چاہتا ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے راستے کے بڑے پتھر بیگم مراد کو یا تو ہٹانا پڑے گا۔۔۔۔۔ یا پھر اس کو زینہ بنانا پڑے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہمت سے کام لے گا اور اگر ضرورت پڑی تو عدالت میں جانے سے بھی گریز نہ کرے گا۔۔۔۔ اس فیصلے پر بھی وہ کئی ہفتے عمل نہ کر سکا اور اس ادھیڑ بن میں رہا کہ اپنے فیصلے کو عملی صورت دے یا نہ دے اور اگر دے تو کیوں کر؟

آخر ایک روز اس نے دل مضبوط کیا اور بیگم مراد کو خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ اسے اس کے گھر آ کر ملے کیونکہ وہ کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

نور احمد کو پورا یقین نہیں تھا کہ وہ آ جائے گی اگلی شام جب وہ آ گئی تو وہ زیادہ حیران نہ ہوا کیونکہ اسے اس عورت کے حوصلے کا تجربہ ہو چکا تھا۔

ہلکے سبز رنگ کے لباس میں وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ نور احمد نے سوچا اگر شجاعت اس عورت

پر مرتا تھا تو یہ پیدا کرتا تھا۔ وہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ بیگم مراد کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی عیاں نہ تھی، اسے یوں لگا جیسے یہ عورت کبھی بوڑھی نہ ہوگی۔ وہ دونوں کچھ دیر آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو یوں بار بار دیکھتے رہے جیسے دو پہلوان ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ کر رہے ہوں۔۔۔۔''

''میں [illegible] نے نام تمن لکھے۔''

''وہ [illegible] سے تھے''

''[illegible] تمہیں ہانو کے لئے تھے''

''میں [illegible] ہانو کو تمہیں۔۔۔ یہ تو مجھ سے ہے نہ کہ میں [illegible] ہوں۔''

پھر [illegible] وقفہ خاموشی کا آ گیا۔ یہ وقفہ طویل ہونے لگا۔''

نور احمد اپنی جگہ سے اٹھ کر بیگم مراد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بیگم مراد خاموش بیٹھی رہی۔ نور احمد نے ایک قدم اور بڑھایا اور اس کے بالکل قریب ہو گیا۔ بیگم مراد نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور غور سے نور احمد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر عجب طرح کی وحشت برس رہی تھی جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی اور منتظر رہی کہ وہ اگلا قدم اٹھائے۔''

ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ کیا یہ واقعی مجھے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کیا مجھے یہاں بلانے کا مقصد یہی تھا؟'' اور پہلی بار اس کے چہرے پر پریشانی کا ایک سایہ پھیل گیا۔

نور احمد کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھے لیکن گردن سے ایک انچ ادھر رک کر واپس آ گئے۔

''یہ واقعی مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے۔'' بیگم مراد نے سوچا اور اس کی نظریں اب نور احمد کے ہاتھوں پر رک گئیں۔ کتنے بے چین نظر آ رہے تھے وہ ہاتھ۔ انگلیوں میں کتنا خوفناک تناؤ تھا جیسے گردن دبوچتے ہی جان قبض کر لیں گے بیگم مراد کی گردن سے کمر تک ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔

نور احمد ایک دم اس کے سامنے فرش پر دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پھر آگے بڑھے اور گردن کے بالکل قریب ہو گئے۔ بیگم مراد کا جسم پسینے سے بھیگ گیا لیکن اس نے اپنے حواس قائم رکھے۔۔۔۔ پھر نور احمد نے چشم زدن میں اس کے دونو ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں یوں ملا دیا جیسے دیوداسیاں دیوتاؤں کے سامنے ملاتی ہیں اور انگلیوں کی پوروں کی حنا کو چومنے لگا۔ پھر اس نے اس کی کلائیوں پر اپنے رخسار ملے اور گردن اور کندھوں پر بوسوں کی بارش کر دی اور پھر اس نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور ان کے دماغ ریشمی لحافوں کی کئی تہوں کے نیچے دب کر سو گئے اور جسم جاگ اٹھے اور فرش پر ان جسموں نے اپنی داستان لکھی۔۔۔۔ اور نیم بے ہوشی کی سی حالت میں ایک جسم نے دوسرے سے کہا۔

''مراد میاں سے طلاق لے لو۔''

اور دوسرے جسم نے جواب دیا۔ ''نہیں۔۔۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

صراطِ مستقیم

عرفان علی شاد

روشی جو کچھ کر رہی تھی، ضرورت کے تحت کر رہی تھی اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اس لئے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کیلئے اس نے بہت سی محبتیں ایجاد کر لی تھیں۔ یہ کام اس جیسی جوان اور خوبصورت لڑکی کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شروع شروع میں اسے کچھ مشکلات ضرور ہوئیں، مگر رفتہ رفتہ وہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھ گئی اور سارے داؤ پیچ سیکھ گئی۔ اب وہ ایک کہنہ مشق کاریگر کی طرح محبتیں تراشتی تھی جبکہ اب وہ آگے آگے تھی اور پیچھے پیچھے اس کی محبتیں پالتو جانوروں کی طرح دم ہلاتی چل رہی تھیں۔ سب محبتوں کی ناک میں نکیل تھی۔ سب اس کی غلام تھیں اور سب کی ڈوری ایک ہی ہاتھ میں تھی اس کے اپنے ہاتھ میں۔ یہ ہاتھ جتنے مضبوط آج تھے اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ وہ مڑ کر ان محبتوں کی طرف دیکھتی تو فتح مندی کے احساس سے سرشار ہو جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ ایک تان بجائے گی کہ ساری کی ساری محبتیں ہاتھ باندھے اس کے سامنے آن کھڑی ہوں گی۔ پھر وہ کسی ملکہ کی طرح حکم چلائے گی اور جس محبت کو جس انجام تک پہنچانا چاہے گی، پہنچا دے گی۔ چاہے وہ پاتال کی آخری گہرائی ہی کیوں نہ ہو۔

دفتر میں اس کی میز بالکل کھڑکی کے برابر تھی۔ ٹائپ کرتے کرتے جب اس کی انگلیاں تھک جاتیں تو وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا لیتی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ آٹھویں فلور سے جب وہ نیچے سڑک پر چلتی ہوئی ٹریفک کو دیکھتی تو یہ سارے کا سارا ہجوم اسے کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھائی دیتا۔ وہ سوچتی خدا تو بہت اوپر ہے، ساتویں آسمان پر، وہ جب اتنی بلندی سے اس دھرتی کو دیکھتا ہوگا تو اسے ہم کیا نظر آتے ہوں گے؟ ... محض رینگتے ہوئے کیڑے۔ اپنا اپنا رزق تلاش کرتے ہوئے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے، بوکھلائے اور گھبرائے ہوئے کیڑے جو اپنی اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے طرح طرح کی ایجادات کے تعاقب میں ہیں اور ضرورتیں ہیں کہ اس ہوشربا مہنگائی میں پوری نہیں ہونے دیتیں۔ سب کی چادر چھوٹی ہے۔ سر ڈھانپتے ہیں تو پاؤں باہر نکل جاتے ہیں اور پاؤں ڈھانپتے ہیں تو سر ننگا

ہو جاتا ہے۔ کسی کی ضرورت نہیں آج کے انسان کی! ... کسی طرح در طوائف کی طرح کہ جو رات میں
نہیں آتی، ہاتھ میں آ آ کر پھسل جاتی ہے اور پھر دور کھڑی مسکراتی ہے۔

تین سال پہلے جب وہ اس شہر میں آئی تھی تو بالکل کوری تھی، سیدھی سادی، بے حد سیدھی سادی۔
اسی لئے جب وہ اس بڑے شہر کے طور طریقے، لوگوں کے رویے، ملمع کی ہوئی کاروباری مسکراہٹیں اور
جھوٹی خوشامدیں دیکھتی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جاتیں۔ کتنی باتیں تھیں، کتنے چہرے تھے مگر
ان میں کوئی چہرہ بھی ایسا نہیں تھا جس کا اعتبار کیا جا سکے، جسے اپنا کہا جا سکے، جس کے سامنے اپنے دل کے
سارے دکھ کھول کر رکھے جا سکیں اور جسے دل میں بسایا جا سکے۔ پھر وقت نے سمجھایا تو وہ اس راز کو پا گئی کہ
بڑے شہروں میں ایسے چہرے بہت کم ہوتے ہیں، اور ہوتے بھی ہیں تو گمنام ہوتے ہیں، گوشوں کھدروں
میں منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں اور اتفاق سے اگر وہ سامنے آ جائیں تو پبلک ڈنڈے لے کر ان کے پیچھے
دوڑ پڑتی ہے، اور وہ سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں۔ اس کی دنیا میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ... اس لئے
اے چھوٹے سے قصبے کی نادان لڑکی روشی! تجھے جینا ہے تو اپنی سوچ کے ڈھنگ بدلنے ہوں گے، تو ذرا
سانولی ہے تو کیا ہے تیرے نقش تو تیکھے ہیں۔ تجھے اس سیدھی سادی لمبی چوٹی کو کٹوا کر اپنی زلفوں کو شانوں
پر پھیلانا ہوگا۔ بلاؤز کو اونچا اور چست کرنا پڑے گا۔ بھنووں کی تھریڈنگ کروا کر ان کے خم کو خنجر کی
دھار کی طرح تیکھا اور تیز کرنا پڑے گا، پلکوں کو یوں جھکانا ہوگا، مسکراہٹ کو کرشمہ بنانا ہوگا، زندگی سے ہر
لطیف جذبے کو نکال کر باہر پھینکنا ہوگا اور ہاتھ میں صرف ایک ترازو پکڑنا ہوگی اور جب جب موقع ملے گا،
ڈنڈی مارنی ہوگی تاکہ تو ایک کامیاب تاجر بن سکے، کیونکہ دنیا انہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو تجارت کرنا
جانتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اسے جینے کے انداز آتے گئے اور آج وہ اس شہر کی ایک کامیاب تاجر تھی، آج
وہ کسی چھوٹے سے قصبے کی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی جس کے لئے یہ چمکتا دمکتا شہر کبھی اجنبی تھا،
خطرات سے پر تھا اور جہاں وہ ہر رات اکیلے میں ڈرا کرتی تھی۔ پرانی روشی کہیں کھو گئی تھی۔

اب نئی روشی تھی، نئی زندگی تھی، وہ اس شہر کا ایک پرزہ تھی اور شہر کی مشین میں بڑی کامیابی سے
چل رہی تھی۔

دفتر کا وقت بہت دیر پہلے ختم ہو چکا تھا۔ چند ایک کے سوا سب ہی لوگ جا چکے تھے۔ روشی نے خالی
میزوں کو دیکھا تو اسے سناٹے کا احساس ہوا، اسے ایسا لگا جیسے وہ بھی انہی خالی میزوں کی طرح اکیلی ہے،
ویران ہے۔ بہت دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑی نیچے دیکھتی رہی اور سگریٹ کے کش لیتی رہی، کھڑکی کے شیشے
سے ٹکرا کر دھواں اوپر اٹھتا رہا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، اندھیرا دھیرے دھیرے روشنی کو نگل رہا تھا۔
سڑک پر دودھیا ٹیوب لائٹس روشن ہو چکی تھیں اور ٹریفک اسی طرح رواں دواں تھی۔ سگریٹ کو ایش ٹرے
میں بجھا کر اس نے گھڑی دیکھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب اسے چلنا چاہئے۔ باتھ روم جا کر اس نے منہ

دھویا، بال ٹھیک کئے اور کندھے پر پرس لٹکائے وہ لفٹ سے نیچے آ گئی۔ دفتر سے باہر نکل آئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے پرس سے ڈائری نکالی اور آج کی Appointments کو دیکھنے لگی۔ ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کر کے گاڑی کو گیئر میں ڈالتے ہوئے پوچھا:

''کدھر جانے کا ہے میم صاحب؟''

''پارلے ہوٹل!''

اس نے ڈائری بند کر کے پرس میں ڈال دی

سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے سوچا آج پھر بور کرے گا کم بخت! چلو بہت اچھی ہی۔ کم از کم آج تو جھیلنا ہی پڑے گا کیونکہ کل ہی اس نے میرے بینک اکاؤنٹ میں موٹی رقم جمع کروائی ہے۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر گاڑی کی سیٹ سے ٹیک دیا۔ شیشے کھلے تھے، ٹھنڈی ہواؤں کے بھیگے بھیگے جھونکے اس کے چہرے پر تھپکیاں دینے لگے اور سگریٹ اس کی نازک انگلیوں میں سلگتا ہی رہ گیا!

پارلے ہوٹل کی مدھم روشنیوں میں نامدار کونے کی میز پر خالی جام کی طرف جھکا بیٹھا تھا۔ روشی شیشے کا دروازہ کھول کر تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ نامدار نے اسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، بالکل ایسا لگا جیسے مسیح کی ٹھوکر سے کوئی مردہ جی اٹھا ہو۔

روشی نے کہا: ''ہیلو!''

نامدار نے کچھ نہیں کہا۔ چہرہ اٹھا کر روشی کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ اس نے کہیں غلط نشانہ تو نہیں لگایا۔ چڑیا پھنسے گی یا دانہ کھا کر پھر سے اڑ جائے گی؟

روشی بولی ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''تم بہت بور کرتی ہو، ایک گھنٹے سے اکیلا بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں''

''ساری ڈارلنگ! دراصل آفس میں کام بہت ہے۔''

حالانکہ کوئی کام نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی، اور اس طرح بول رہی تھی کہ وہ بالکل سچ لگ رہا تھا۔ نامدار کو بھی اور خود اسے بھی!

اور یہی جھوٹ اب اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ بن چکا تھا۔ ضرورت پڑنے پر تو لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں، اس نے تو صرف جھوٹ کو سچ بنایا تھا۔ اس میں کون سا پاپ ہے۔ دنیا کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔ چار پیگ پینے کے بعد اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ آسمان میں اڑ رہی ہو۔ اس کا چہرہ سرخ

ہو رہا تھا اور سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی، ایک آگ سی اس کے پورے جسم میں رینگ رہی تھی، سر چکرا رہا تھا لیکن نادار کو دیکھ دیکھ کر وہ پھر بھی مسکرا رہی تھی۔ نادار سمجھا شراب اثر کر گئی۔ اس نے روشی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ''روشی! آج رات تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' لیکن وہ بھی اناڑی تو تھی نہیں، پکی کھلاڑی تھی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے طرح دے دی اور کچھ ایسی باتیں کیں کہ نادار نے ایک ہزار کے نوٹ روشی کے پرس میں ڈال دیئے۔ اونچی ایڑی کے سینڈل کے ساتھ وہ ہوٹل کے چکنے فرش پر مشکل سے چل رہی تھی لیکن ایک بار بھی اس کا پاؤں نہیں پھسلا۔ نادار نے سوچا کبھی نہ کبھی تو اس کا پاؤں ضرور پھسلے گا اور وہ میری بانہوں میں آ جائے گی ... ہر شکاری شکار کھیلتے ہوئے یہی سوچتا ہے کہ شکار ضرور پھنسے گا لیکن کبھی کبھی شکار اتنا ہوشیار اور چوکنا ہوتا ہے کہ دانہ و دام پڑے رہ جاتے ہیں اور شکار صاف نکل جاتا ہے۔ نادار کو ابھی تک ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ روشی کے معاملے میں بھی بہت پرامید تھا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر اس نے روشی کو ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ ٹیکسی چلی گئی تو اس نے سگریٹ سلگا لیا اور پھر کار میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں میں گم ہو گیا۔

روشی نے سبحانی سے کہا ''میں چار پیگ پہلے ہی پی چکی ہوں۔ اب پیوں گی تو چڑھ جائے گی۔ اس لئے تم پیو، اور میں تمہیں دیکھتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرنے لگی۔ سبحانی اسے دیکھ کر مسکرایا، وہ بھی مسکرائی اور سبحانی نے اپنی انگلیوں میں بلوریں پیالے کو نچاتے ہوئے کہا۔ ''آج کی شام اس کے جام کے نام!''

''کبھی کبھی جام کو اکیلے بھی چلنا پڑتا ہے۔''

''تم تو فلاسفر ہوتی جا رہی ہو۔''

''فلاسفر کوئی آسمان سے تو نہیں اترتے، ہر شخص جو زندگی اور اس کے تقاضوں کو سمجھتا ہے، فلاسفر ہے۔'' روشی نے ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو سلگاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم میرے تقاضوں کو کب سمجھو گی؟''

''جب وقت آئے گا تو تمہارا تقاضا بھی پورا کر دوں گی ڈارلنگ!''

''لیکن کب ... کب؟'' سبحانی چیخ پڑا۔

''بہت جلد!''

سبحانی بولا۔ ''ہمیشہ یہی کہتی ہو، ایک مدت گزر گئی ہے اسی طرح، روز ملتی ہو پھر بھی لگتا ہے جیسے کبھی

نہیں ملتی ہو، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم رہتی کہاں ہو!''

روشی نے زور سے ہنستے ہوئے کہا ''بڑی جلدی دل چھوڑ کر بیٹھتے ہو، سب باتوں کا پتہ ایک دم نہیں چلتا، اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے!''

''مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، ایک رات ہی تو مانگی ہے تم سے... [illegible] بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

''لگتا ہے تمہیں چڑھ رہی ہے۔''

سجانی روشی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ''ابھی میں نے پی [illegible] تو چڑھ جائے گی۔''

ایسے موقعوں کیلئے شرم وحیا کی جو دلربا قاتل ادا روشی کی اداؤں میں ماسٹر پیس تھی، وہی ادا اس نے آزمائی تو سجانی بالکل فلیٹ ہو گیا۔ دوسرا جام بھرتے ہوئے اس نے کہا

''تمہاری اداؤں کے نام!''

جام پر جام بھرتے رہے، تلی ہوئی مچھلی اور آلو کے چپس چلتے رہے اور سجانی کی آنکھیں سرخ ہوتی چلی گئیں۔ پھر اسے ہچکیاں آنے لگیں۔ اگلا جام بھرنے کیلئے جب اس نے اپنا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھایا تو روشی اسے سہارا دے کر ہوٹل سے باہر لائی مگر چند قدموں کے اس فاصلے میں سجانی نے اس کے گلے میں ایک قیمتی لاکٹ پہنا ہی دیا۔ روشی نے لاکٹ چھو کر اس کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا ''دل توڑنا میرا شیوہ نہیں ہے، اس لئے رکھ لیتی ہوں، جب چاہو واپس لے لینا۔''

سجانی بولا ''میں ایک بیوپاری ہوں قیمت وصول کرنا جانتا ہوں۔''

روشی نے کہا: ''پھر شرارت پر اتر آئے؟''

سجانی نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو شرارت شروع بھی نہیں ہوئی!''

''اور اس کی نوبت بھی کبھی نہیں آئے گی بے وقوف گدھے!'' روشی نے دل ہی دل میں کہا اور اسے الوداع کہہ کر فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی بھیڑ میں کھو گئی۔

پکچر شروع ہو چکی تھی اور گلزار بے قراری سے روشی کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ گلزار نے جھلا کر فلم کے ٹکٹ پھاڑ دیئے اور پاؤں پٹختا ہوا سنیما سے باہر نکل گیا۔

روشی سڑک پر اتر کر جب اپنی گلی میں مڑی تو اس نے سوچا گلزار انتظار کرتے کرتے ضرور چلا گیا ہوگا۔ اس نے محبتوں کو بالکل پالتو جانوروں کی طرح پالا تھا۔ کبھی جانور کو پچکارو، اسے پیار کرو،

اور کبھی کبھی سے دھتکار بھی رہوتا کہ وہ تڑپ تڑپ سے۔ جیسے میں پیچ و تاب کھائے اور اسے مالک کی اہمیت کا علم ہو جائے، پھر کچھ روز لاتعلق رہو اور تھوڑا وقفہ دینے کے بعد سے پھر پچکارو۔ اب وہ زیادہ گرم جوشی کے ساتھ دم ہلاتا آئے گا۔ یہ بھی محبت کا ایک حربہ ہے جو عورت کے ہاتھ میں ہو تو وہ ہر محبت میں کامیاب ہوتی ہے۔ روشی نے کہا گلزار جاؤ، دارو پی کر غم غلط کر لے، پھر گھر چلا جا اور اپنی بیوی کے پہلو میں سو جا، تھٹ یا ر اور بیوی سے پیار جتا۔ پھر ایک دن جب میں تجھے آواز دوں گی، تو دوڑ چلا آئے گا، جا اب چلا جا۔

اب وہ پنی گلی میں چل رہی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ اس گلی کے لوگوں سے بہت ڈرتی تھی کیونکہ ان کی نظر میں وہ ایک آوارہ اور بدچلن لڑکی تھی صبح آفس جانے کیلئے جب وہ گھر سے نکلتی تو بہت سی بھوکی نگاہیں اس کے تعاقب میں ہوتیں۔ کچھ منچلے اسے دیکھ کر سیٹیاں بجاتے، کچھ آوازے کستے، کسی کو بلاوجہ کھانسی آنے لگتی اور کوئی دل پر ہاتھ رکھ کے کہتا ''ہائے جانی!'' وہ سب خاموشی سے سہہ رہی تھی اور خوف کے گھونٹ پی رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کتنی کشمکش ہے آج کی زندگی میں۔ ہر چیز کاروباری اور کھوکھلی ہے۔ ہر نیا دن آدمی کی ذات سے کچھ نہ کچھ ضرور چرا لیتا ہے۔ لیکن اس سرعام چوری کے خلاف کسی تھانے میں رپٹ درج نہیں کروائی جا سکتی، کوئی عدالت ایسی نہیں جو ذات کے اس چور کو پکڑ سکے اور چوری کا مال برآمد کروا سکے!

روشی ہر رات کچھ ایسا ہی محسوس کرتی تھی جیسے اس کی ذات کا کوئی نہ کوئی حصہ کم ہو گیا ہو۔ شہر کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہو۔ وہ لائٹ بجھا کر جب اپنے بستر پر لیٹتی تو خیالات کا ایک ہجوم اسے گھیر لیتا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہتی لیکن نیند نہیں آتی تھی۔ ان دنوں وہ شراب نہیں پیتی تھی۔ اس لئے جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو وہ نیند کی گولی لینے پر مجبور ہو جاتی اور آخر کار سو جاتی۔ مگر اب وہ باہر ہی سے پی آئی تھی اس لئے بستر پر گرتے ہی اسے ہوش نہیں رہتا تھا، صبح ہی آنکھ کھلتی تھی لیکن وہ راتیں اس پر بہت بھاری ہو جاتی تھیں جب وہ شام کی ساری رنگینیوں کو چھوڑ کر دفتر سے سیدھی گھر آ جاتی۔ ان راتوں میں اسے نیند نہیں آتی تھی۔ پھر وہ ہار کر الماری سے بوتل نکالتی اور وسکی کے کڑوے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگتی۔ وسکی پیتے ہوئے اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے تھے۔ ماں کا خیال آتا تھا جو فالج کی ماری ایک دور دراز شہر کے ہسپتال میں زیر علاج تھی۔ چھوٹا بھائی یاد آ جاتا جو میڈیکل کے تیسرے سال میں پڑھ رہا تھا۔ ایک بیوہ بہن تھی جس کے دو بچے تھے اور جو ٹریفک کے ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھی تھی اور اب سکول میں معمولی نوکری کر کے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ وہ سوچتی اگر آج میرا باپ زندہ ہوتا تو مجھے یہ پاپڑ کیوں بیلنے پڑتے۔ ان لمحوں میں وہ بہت اداس ہو جاتی اور اس کی آنکھیں بھر آتیں، لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے، اور وہ بڑی بہادری کے ساتھ حالات کا

مقابلہ کر رہی تھی اگرچہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئی تھی لیکن اس کے باوجود اپنے گھر والوں کیلئے وہ کسی دیوی سے کم نہیں تھی۔

کتنی زندگیاں اس سے وابستہ تھیں۔ کتنے لوگ صرف اسی کے سہارے جی رہے تھے۔ اخراجات بہت زیادہ تھے۔ اور دفتر سے جو تنخواہ اسے ملتی تھی، وہ اتنی کم تھی کہ اس سے وہ ایک خرچ بھی ٹھیک سے پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لئے وہ سیدھی راہ سے تھوڑا سا ہٹ گئی تھی [illegible] اس راہ سے ہٹ کر جہاں اس نے کچھ پایا تھا، وہاں بہت کچھ کھو بھی دیا تھا۔ اسی لئے ہر رات اسے یوں لگتا تھا جیسے [illegible] کی ذات کا کوئی حصہ گم ہو گیا ہو۔

لیکن کچھ دن سے ایک خوشبو اس کے آس پاس لہرا رہی تھی۔ ایک [illegible] پھوار بن کر برس رہا تھا۔ اسے لگتا جیسے وہ چہرہ اس کی ذات کے ساتھ یوں جڑ گیا ہو جیسے [illegible] راتوں کے گھنے اندھیروں میں وہی چہرہ اس کے لئے روشنی کی ایک کرن بن [illegible] اپنے دل کے ویران طاق میں دیئے کی طرح سجا لیا تھا [illegible] وہ ایک غریب کہانی کار تھا۔ [illegible] دفتر میں بھی چلا آتا تھا یونہی، بس باہر کی گرمی سے ذرا بچنے کیلئے، تھوڑی دیر [illegible] بیٹھنے کے لئے، پل بھر کو دم لینے کے لئے، کرتا پاجامہ پہنے، کندھے پر تھیلا لٹکائے وہ پسینہ پونچھتا ہوا آتا اور سستانے کی خاطر روشی کے پاس بیٹھ جاتا۔ کبھی اپنی کوئی تازہ کہانی بھی اسے سنا دیتا، کوئی کوئی رسالہ بھی اسے دے دیتا، روشی اس سے روایتی انداز میں ملتی تھی، چائے پلا دیتی تھی، حال چال پوچھ لیتی تھی اور اس درمیان دفتر کا کام بھی نمٹاتی جاتی تھی مگر اس کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شرمیلا سا کہانی کار اس کی روح کو اپنے ساتھ ہی لے گیا ہو جبکہ وہ اس سے کچھ نہیں مانگتا تھا لیکن اس کی جھکی جھکی خاموش نگاہوں میں روشی کے لئے جو پسندیدگی تھی وہ روشی پر بھی ظاہر ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں جو چنگاری سلگ رہی تھی اس کی حرارت روشی کے دامن سے یوں لپٹ جاتی تھی کہ اسے اپنا پورا وجود دہکتا ہوا محسوس ہوتا تھا [illegible] اسی ادھیڑبن میں دن گزرتے چلے گئے، راتیں آتی رہیں، جاتی رہیں [illegible]!

کئی مہینے گزر چکے تھے اور اب روشی کی زندگی اس مقام پر آ گئی تھی کہ اسے شہر سے اپنا تبادلہ کروا لینا چاہئے تھا، ورنہ وہ نام نہاد عاشق جو اسے راتوں کے اندھیروں میں ملتے تھے اور پھر اندھیرے ہی کا حصہ بن کر غائب ہو جاتے تھے، کسی نہ کسی دن اپنی قیمت سود سمیت وصول کر لیں گے۔ اس ڈر سے اس نے تبادلے کی کوشش شروع کر دی اور کافی انتظار کے بعد ایک روز ہیڈ آفس سے اس کے تبادلے کے آرڈر آ ہی گئے [illegible] اس نے سوچا اب نیا شہر ہوگا، نئی زندگی ہوگی اور نئے عاشق ہوں گے۔ اس کھیل میں وہ ایک شاطر چالباز بن چکی تھی لہٰذا اس کی کامیابی یقینی تھی۔

انہی دنوں جب ایک روز وہ آفس پہنچی تو اس کی سہیلی نے بتایا کہ وہ تیرا رائٹر آیا تھا۔ تجھے پوچھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ تیرا تبادلہ ہو گیا ہے اور تو دو چار دن میں یہاں سے جانے والی ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بہت دیر تک اپنے ناخن کاٹتا رہا، بار بار پسینہ پونچھتا رہا۔ میں نے چائے دی تو پیالی لیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے ۔۔۔ سچ روشی! مجھے بڑا ترس آیا اس پر۔ روشی نے پوچھا "کچھ کہہ رہا تھا؟" "ہاں!" کہہ رہا تھا "میں تو ایک معمولی لکھنے والا ہوں، آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی میں نے روشی جیسی امیر لڑکی کو اپنے من میں بسا لیا، مجھے اتنا اونچا خواب نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

اس روز رات کو جب روشی اپنے بستر پر لیٹی تو اسے احساس ہوا جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو، جیسے اس نے کسی کہانی کار کی زندگی ہمیشہ کیلئے برباد کر دی ہو۔ پھر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔۔ ارے پگلے! تو نے مجھے امیر کیسے سمجھ لیا؟ میں تو تیری ہی طرح ایک غریب لڑکی ہوں، حالات کی ماری ہوئی، زندگی سے لڑتی ہوئی، تھکی ہاری، میں تو خود طوفانوں میں ہوں پگلے! ۔۔۔ تو نے طوفانوں کا خواب کیوں دیکھ لیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟

روشی کو رات دس بجے والی ایکسپریس ٹرین پکڑنا تھی، وہ جب پلیٹ فارم پر پہنچی، تو اس نے دیکھا، وہ ایک ستون کے سہارے کندھے پر تھیلا لٹکائے، غم میں ڈوبا کھڑا تھا، سر جھکائے، بالکل گم صم، بالکل خاموش، پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا، بال الجھے ہوئے تھے، آنکھیں بے خواب تھیں، کرتہ پاجامہ بالکل میلا ہو چکا تھا اور واسکٹ بھی ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی ۔۔۔ اسے دیکھ کر روشی کو محسوس ہوا جیسے اس وقت وہ اپنے خوابوں کی چتا میں آگ لگانے آیا ہو ۔۔۔ اور شمشان میں اکیلا کھڑا ہو۔۔۔ ۔۔۔ بالکل اکیلا، بے بس، بے یار و مددگار!

اسے یوں دیکھ کر روشی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور اسے گلے سے لگا لے۔ اسے سب کچھ بتا دے اور پھر اس کے کندھے سے لگ کر اتنا روئے کہ اس کے دل کا بوجھ ہمیشہ کیلئے آنسوؤں میں بہہ جائے اور پھر ایک نئی زندگی مسکرا کر اسے اپنے آغوش میں لے لے، اس کے تصور میں ایک چھوٹا سا گھر یوں پھیلنے لگا جیسے بھیگی آنکھوں میں کاجل پھیلتا ہے، اس کا اپنا گھر، اپنا شوہر، اپنی زندگی۔۔۔ ۔۔۔ یہ کمزور لمحے اس کی زندگی میں بالکل اسی طرح آئے جیسے ساحل پر سمندر کی کوئی لہر جھاگ اڑاتی آتی ہے اور چٹانوں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔ اس نے اپنی بھیگتی ہوئی آنکھوں کو فوراً پونچھ لیا، اپنے دل کو سمجھایا اور اپنے سب سے خوبصورت خواب کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اندھیری وادی میں لڑھکا دیا۔۔۔ ۔۔۔ کیونکہ ابھی اس کا سفر بہت لمبا تھا، بڑا کٹھن تھا اور منزل کہیں دھند میں گم تھی۔ وہ اس سے اسی روایتی انداز میں ملی جیسے ہمیشہ ملتی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

زریں تاج

عزیز احمد

جیپ ہوا سے باتیں کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جہاں کہیں ذرا سڑک رک جاتی ہمارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے، ہانپتے ہانپتے عاجز آ چکا تھا۔ ارشد نے حسین چاندنی کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک اس پر بکھری ہوئی چاندنی کناروں پر یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی اور آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ اور جیپ کی مسلسل حرکات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس سڑک سے ذرا بھی واسطہ تھا؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آدمی تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ڈرینج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی اور کنارے سے موٹر تو کیا آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا۔ "سرکار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں۔" آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پر ارشد کو ترس آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ دور کوئی ریل گاڑی کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتی۔ لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں۔ مذاق تو نہیں تھا۔ آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آؤٹ تھی۔ لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا۔ ورسوئی ہوئی زمین پر انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے، چاندنی کی روشنی جس سے دو طرح کے جنوں کی قندیلیں جلتی ہیں۔ جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے گھر گھراہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا ــــــ امجد بھائی نے آج دعوت کے لئے اچھا دن چنا تھا...... چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کیڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آ گیا تو ...... موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چھپ جانے کے لئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں، اور خود تیزی سے سڑک کے

کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا لقد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ ب
دور .... چشم زدن میں ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا' اور پھر ... بالکل قریب تقریباً پانچ سو
فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اُڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی گرتے گرتے بچی ... کی دھڑکن
ایک منٹ کے لئے رُک گئی۔ جسم نے تھرتھری سی لی ... جیپ کے قریب ہی ایک ... سرخ گولہ
زمین پر پھٹا "سرخ شعلہ" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو شاید ... تھا۔ اسے بعد
میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے کو شہر یا اس کے اطراف کی طرح کی بمباری ... ممانعت تھی۔ ب
ہوائی جہاز بہت دُور جا چکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا ... لئے پاؤں
وہ جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کر تھرتھر کانپ رہا تھا۔ ... کیا اور
اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر ارشد کو تعجب ہوا۔ "میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی ... چھوڑ دو۔ چپکے
چلو۔"

"آپ جائیے سرکار میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں، اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اُڑان کے بعد اب وہ
دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا۔ بہت دُور اور بہت اُوپر۔ نیلا ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہو اور پھر
غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گیبرڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں
کو گرم رکھنے کے ارادے سے گھسیڑ کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی
طرح اُمڈتے چلے آتے تھے۔ اس نے حسین رت کی طرف دیکھا۔ معشوقوں کی طرح' عجمی شاعروں کے
معشوقوں کی طرح دل ربا، اور خونریز معشوقوں کے رخ زیبا جیسا چاند ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ا
ن کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف
بستہ درخت ان کی حنائی انگلیوں اور سُرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ ___ اور اسے جنگ پھر یاد آ گئی اور
وہ ہوائی جہاز جو ابھی ابھی گزرا تھا ___ ایک سوز گذری۔ اس وقت اور اس رات اس کے سوا کسی اور
بیوقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے سوز گزری وہاں چوراہا ضرور ہوگا چوراہا ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلی اور سرخ ہونٹوں کی طرح سرخ خونریز کوئی بری چیز نہیں تھی۔
ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی' تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے
آ سکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز' خون کو منجمد کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد' ایک مسلسل
کراہ۔ وہ جو نعرے لگاتے ہیں اور' وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں' وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے
ہیں۔ ذرا دیکھ بھی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہوگا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے گا۔ ایک چوراہے پر

آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی اور ایک آدمی دوسری طرف سے تیزی سے موٹر سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پیشین گوئی کی "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا۔" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی ___ سائیکل سوار فوجی لاری کو جل دے کر نکل گیا۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نے آدم زاد اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل دور۔ جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی شہزادہ دن طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ___ حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی سائیں سائیں اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے بھی لپیٹے تھی۔

وہ چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی' خواب کی طرح' عشق حقیقی کی طرح' ذرا ذرا سے سلجھے ہوئے جنون' ذی فنون کی طرح اور اس سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے' جیسے وقت کی طنابیں کٹ گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں چل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے......

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گذرا تھا فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیپ شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں' فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے کہ اس زندگی اور اس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اسی کی یادوں کا سلسلہ ہے ....

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطب جنوبی کے سیاحوں کا زندہ ساتھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ والا۔ "یہ تیسرا کون ہے۔" یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے' وجود سے عدم' عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی اور حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں جیسے۔

یہ قدموں کی چاپ' یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے پیدل' کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بیچارہ شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش اور حسین اور یہ سڑک یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے' یہ کالی کالی زلفیں ....

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی' وہ دوسرا ساتھی' چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر' اس کی ہم سفر . . . . . اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زرّیں تاج ہوں۔"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا ہوس آرائی کی تھی' تفریح کی تھی' کشش محسوس کی تھ

کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پہ ہوتا۔ کبھی عشق کا ہوس پہ اور ہمیشہ [illegible] الکحل و منشیات کا استعمال
کرتے۔ "دوئی" فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی [illegible] کے راستے
میں سنگلاخ مزاحمتیں' کانٹوں کی جھاڑیاں' دیوہیکل چٹانیں حائل [illegible] عشق حاوی ہو کر
یہ مزاحمتیں غائب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا اور پھر ہوس [illegible]
دل...... اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت [illegible] صدیوں پہلے مر
چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن [illegible] پیدا ہوں گے۔
لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زریں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں [illegible]
کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین شمعیں [illegible] زریں تاج کو
مخاطب کر کے کہا۔ "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت [illegible] اگر کبھی حال
ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی [illegible] اور ان محفل
میں' مرورِ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو [illegible] ہوس سے
خواہش سے' ادراک سے' جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لپٹی ہوئی حسین' ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی ساحرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ
چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف...... صدیوں [illegible] اور پھر اس نے
زریں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب اُلٹ دیا تھا یوں اس کا لباس سیاہ تھا [illegible] عورتوں کی طرح۔ ایسا
لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی باب فروش کے ساتھ [illegible] میں پہنا ہو گا اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگمگ
جگمگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی' کافور کی چمک تھی۔ ایک حسین آسیب الفت کے چہرے کی چمک۔ جیسے ملکہ کوکا
چین کی مہکی ہوئی لاش کا مارکو پولو کے نام یہ پیغام۔

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبت کی اور مر گئی۔ اب میں محبت ہوں اور زندہ ہوں اور [illegible] زندہ ہوں
بھول گئی اور چونکہ محبت کرتی ہوں معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی مسلسل خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے
بیدار ہوتا ہے' جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا۔ "تم ملکہ کوکا چین ہو۔ تم زریں تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی۔ "کوکا چین نہیں وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف تم پیدا کر آئی تھی۔ میں تمہاری
نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے' اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ
پہلے مجھے دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ پھر محبت کرتے ہیں' جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی

قیمت دے کر وہ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں اور مزدور مجھے لئے بغیر پسینے سے گذر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں' پھر رقیب مجھ پر وار اور جب میں مر جاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا۔

پھر ساری ہی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی' چاندنی کانپ گئی سب ستارے [illegible] اور ان سے سایوں کو قائے مار گیا۔ دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر ایک نیا ستارہ [illegible] چمکتے ہوئے جگنوؤں کے گانے میں خلل نہیں آیا اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ زریں تاج [illegible] اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پر پل صراط پر چاندنی [illegible]

دور ہوائی جہاز نے پھر "سرخ پھول" پھینکے' زمین سے ٹکرا کے پھر سرخ شعلے اٹھے۔ پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی' چاندنی سے زیادہ حسین' ایرانی شاعری کی روح کی طرح جمیل' اس کے لب لعلیں چاندنی رات میں چمک رہے تھے۔ سینکڑوں میل دور نیکوں سے سچ مچ کا خون بہہ رہا ہوگا' اور سچ مچ کے پناہ گزیں غنڈوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور سچ مچ کی عورتیں اپنی عزت [illegible] امن کا تصور [illegible] کو بچانے کے لئے کنوؤں اور باولیوں میں کود رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پل صراط کے اس پار تک' جس پر سے گذرتے ہوئے زریں تاج نے پوچھا۔ "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرم راز کتے' سحاب اور جھینگر باقی رہ گئے تھے اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زریں تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زریں تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں اور وہ مسکرائی۔ چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زریں تاج کا' کالا' طلسمی حوروں کا سا لباس چاندنی رات میں یک لخت چمکا۔ جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا ___ اور اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام میرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون نے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی شہزادی تھی، عیسائی تھی، مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی، لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھوگئی کہ نہ مجھے اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانۂ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار عورتیں چھینیں، ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس سے پہلے رومیوں نے ایرانیوں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے جڑی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے افسانوی ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے، شکار کھیلنا آتا ہے۔ داستان گویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے، میں مکالمات عشق میں ماہر ہوں اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو، جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں، میرے حسن و جمال کی تعریف سنتا ہے، مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے اور مجھے ڈھونڈنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں اور اپنے تیر مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں، جنہیں مہین بانو نے میری دلجوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر، خسرو کا چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے، میں مبہوت ہو جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں۔ "شیریں۔ شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے، یہ طلسمات کا جنگل ہے" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی۔ "اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈاریں نئے بسملوں، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے، پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے سوفار، ابروؤں کی کمانیں۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے، اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تصویر بناتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ مجھے فارسی کی ایک روایت کو جنم دینا ہے۔

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہریار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے۔ جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ جل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کر

نکل پڑتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے چشمہ آب حیواں چشمہ نرگس چشمہ آب حیات، چشمہ تسلسل حیات۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اتر پڑتی ہوں۔ میں کپڑے اتارتی ہوں۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور ناگنوں کا رنگ ہے' اور یہ زلف مشک ختن بنی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں میری پیشانی چاند میرے ہونٹ عقیق و لعل میرے دانت موتی' میرے شانے آئینہ اور یہ ناز پستان ہیں سروکے ساق سیمیں میں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت' یہ کیا غضب ہے کہ تم سب شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پر آ نکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے زمانے میں کوئی مقام نہیں' کوئی موسم نہیں' کوئی دیار نہیں' زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو وحشت میں پیٹ میرا لباس دیکھتا ہے' پھر میری جان سوز عریانی دیکھتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔ میں اپنا تن ڈھانک کے' اپنے شبدیز پر سوار ہو کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں۔ مگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اس کی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل ہو' آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا نہیں ہوا' عشق ہے اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا کبھی فنا نہیں ہو گا عرفان ہے اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں' یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو' مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیرویہ آتا ہے اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مر چکی ہے۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں خسرو پرویز دیار عشق کا شہریار ہے میں دیار حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری' زر' زور کی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکہ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بجھا دی جاتی ہوں۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدبخت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سراپا والی بات اور بالآخر شکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ عجمی نسوانیت کی روح اس سے اب بھی دور ہوں۔ بہت دور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی

ملکہ اور زاری' زر' زور کسی کی مجھ تک رسائی نہیں۔ زاری حتیٰ کہ بھی میرے [illegible] سے ٹکرا جاتی ہے۔ میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ شیریں کی [illegible] کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ [illegible] شاعری سے [illegible] فرہاد کا قصہ سچ کا نہیں بعد کا ہے' میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے [illegible] جال میں۔ اس کی سپاہ' میرے دار السلطنت میرے قلعے کے اطراف [illegible] کھڑا ہے' منت و زاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں [illegible] اجازت چاہتا ہے اور میری اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجت کرتا ہے اور میں اس کو ہر حجت کا جواب [illegible] ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے۔ میں اسے [illegible] سمجھاتی ہوں اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے [illegible] اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کر [illegible] بار یہی کی زبانی سنواتا ہے' میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جو [illegible] ہیں' جس میں اس کا اندر آنا ہو' شکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ [illegible] پگھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ میرا جوہر لیا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا' میری جنس خرید لی' میرا حسن خرید لیا' میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام لیا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے انتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی' حالانکہ اس کی محبت' اس کا جسم' اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں اور جس شخص کے پاس یہ کنجی گئی۔ اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا ___ اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجینئر نہ کرنا ___ اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مروک کا مظہر جمالی تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا۔ اپنے آپ میں نہ

گیا " کہتے ہیں میری یاد اشہزادے کے دل میں کھب گئی اور مجھ پر دل وجاں سے عاشق ہو گیا۔ مجھے دوان سے پہلے دل وجاں سے انار کلی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے پہلے ....

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری پرورش بھی ہوا یہ تھی شہنشاہ اکبر البتہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انار کلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کر دے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی زن زریں تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا گیا اور اپنے شوہر کے آغوش میں میں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھی۔

وہ بہادر تھا، جری تھا، اس کے قویٰ مضبوط تھے، اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا، اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں اور اپنے انتقام لیتے ہیں۔ مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا۔ اس لئے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کرا دیا گیا۔ وہی فرہاد والی بات۔ وہ جو شیر افگن تھا۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا شاہانہ روباہی کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی۔ مگر شہنشاہ کو تو بھولے پن سے مہر النساء کا دوسرے کبوتر کو اڑا دینا یاد تھا۔ اس لئے جوں جوں انکار بڑھتا گیا میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے، اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوت رادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے۔ اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو تمہارے بر اعظم میں آجکل اغوا کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں۔ کچھ اسی طرح کمزوری مجھ پر بھی حاوی ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا اور میں کئی میں سے ایک۔ کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی اور مجھے "نور محل" کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ ایسی محلات کئی تھیں

محبت، یعنی اس قسم کی محبت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی، اب میرے دل میں مر چکی تھی۔ بالکل مٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک عجیب طرز کی محبت تھی۔ مقید طائر کی محبت صیاد کے ساتھ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ اور اس طرح کی محبت میں میں نے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں تیغ کرزدے دیا گیا ہو اور جس نے ہزار ہا شیر افگنوں اور ابوالفضلوں کے قتل کی تلافی مافات کے طور پر انصاف کی زنجیر کھولنے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیر عدل کا خوش نما نام دیا تھا۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں نے کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں۔ عرق گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کیے، خوشبوؤں، پیشوازوں، زیوروں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں۔ میں نے شہنشاہ سے کہا اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر تو انھیں قتل کر دے تو دنیا قیامت تک تجھ پر نفرین بھیجتی رہے گی اور ان کو شہید تصور کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ۔ تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے؟

لیکن ایک پیالے کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خاں کو قتل کرا دیا تھا۔ اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں اور جو سر خدا کے آگے جھکتا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا۔

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کھلی ہوئی فضا میں، آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور پر پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے جو چنار جہاں پناہ نے نصب کیے تھے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے، لیکن بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے

قدموں پر لوٹ رہا تھا اور جو بنگال سے برف پوش پہاڑوں سے اس پر مہابت خاں [illegible]
تیاری کر رہا تھا۔

اور اس تاجور نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا تھا [illegible] بڑے
ادب سے شاہ شطرنج کو پیٹتا ہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی روحانی آنچ [illegible] مہابت
خاں کو بہت سمجھایا۔ مگر جہاں پناہ [illegible] کے چنگل میں [illegible] پا [illegible]
اور مہابت خاں اگرچہ سپاہی تھا اس کی جوان [illegible] تھی [illegible]
جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ [illegible] سے [illegible]
بالآخر بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لئے [illegible] ۔ میں
ابھی تک اسی طرح ان کے دل پر ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ [illegible]
جاتی تھی کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا اور بڑی بچی پور [illegible] ۔ جہاں پناہ [illegible] وقت سے
خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انھوں نے شراب کا جام پھر لیا [illegible] تھا۔
مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا۔ [illegible] جس نے زندہ عورتوں کی
کھالیں کھچوا دیں، جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا۔ [illegible] وقت ایک [illegible] سے قدرتی [illegible] سے
اتنا متاثر تھی۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی۔ اس کے ساتھ میرے اقبال کا
سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹے کے ہاتھ آ گئی۔ مہرالنساء تو کبھی کی مر چکی تھی۔ [illegible] نور جہاں بیوہ ہو کر جیتے
جی مر گئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی، جس نے مہابت خاں کا غرور توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی
کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آ گیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زریں تاج خاموش ہو گئی

پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام زریں تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرا باپ
میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہو گئی اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو
دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، الہیات، میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں
مناظرہ کر سکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد ملا محمد سے کر دی گئی۔ عربوں میں ابن عم سے عشق

مشہور ہے: مجھے اپنے بن عم سے ہمیشہ چڑ تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا۔ مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔ میں خود ... میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی رہبری کر سکے۔

چنانچہ میں نے سید علی باب سے خط و کتابت کے واسطے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت کم سن رسیدہ تھا اور میں جوان تھی۔ ... اس کے جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے ... تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بن دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ پھر ... میں نے ... بیعت پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی ... جو عورت مجھ میں تھی، وہ کہتی مجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں ... باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوش بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھہر نہ سکیں ... انہوں نے مجھے مکلم خط تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتاب بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آ جاتے۔ انھوں نے باب سے میری شکایت لکھ بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا خاص بنا لیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بیعت کے تور سے منور کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغِ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہو گئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں بیعت کے لئے دل سے چاہتی وہ حسرو پرویز تھا۔ دعوئ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے میں اسے سونپ دی گئی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا اور اس کی موجودگی سے اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انھوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی ایک کی نہ سنی اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے۔ میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے اور اس لئے وہ خبیث اور مردود ہو گیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں۔ مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے انھیں رسول اللہؐ نے بلا طلاق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی روبرو اس کا عملاً کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔

سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا۔ قہار اور جبار۔ کامل مرد۔ مجھ وہ در میں ... سے ... ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کر دے ... قہار اور جبار ہی نہیں تھا۔ اس میں مرد و وصف شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

گسے او نہ کردا طاعتم نہ گرفت حبلِ ولائیتم

کمش بعید زساعتم وہمش بہ قہر بلادلا

منم آں ظہور حسینی منم آں صفت بے کی

منم آں سفینۂ ایمنی و لقد ظہرت تجلیا

شہدائے طلعتِ نازمن بدوید سوئے دیارمن

سروجاں کنید نثارمن کہ منم شہنشہ کربلا

اور یہ شوکت، یہ عظمت، گرجدار آبشار تھی کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فلک۔ جلال سے جمال تک۔ اس کی ہمہ گیر ہستی سے میرے حساس ذہن تک

طیر السماء تلفلفت، ورق البہاء تصفصفت

دیک الضیاء و رقت متجملا متجلا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر ملا محمد قزوینی خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔ میں بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی۔ جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریروں میں جوش اور سرور کے عالم میں میں اکثر چہرے سے نقاب الٹ دیتی اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوئے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد ... اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنانِ مصر والی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی عورت کا آخری حربہ ... استعمال کرتی۔

بدرالنساء کی مصیبت کے مصنف نے اتنا نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ براؤن نے صبح ازل سے محض میری مروت میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ فرہاد کی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیقِ جمال کی پابندیاں اور موضوعِ جمال کی پابندیاں۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ باغی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال

الدین افغانی کا نام ذرد کے بیٹے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کافر بانی تھا۔ دونوں نے احمد الدین شاہ قاچار کو للکار تھی اور دونوں کا کام بادشاہوں پر وزیروں جاگیرداروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا، میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں حزوک کی خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنادی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد ملا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تا کہ عورت کی صورت...... اور اس کے دماغ اچھی طرح پہچانے جاسکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آگئی۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتویٰ دے دیا کہ وہ میرے شوہر ملا محمد اور اس کے باپ ملا تقی کو قتل کر دیں۔

ور اسی طرح جیسے تمھارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انھوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کر اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا لوگ مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے میں نے چھپ چھپ کے خراسان کا رُخ کیا۔ جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بارفروشی ملا محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بارفروشی مرد کا ذہن اور جسم اور تم نے بہت سے قصے تو سنے ہوں گے کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی میں شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبز درختوں کے گہرے سائے میں زریں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جارہی تھی۔ اپنی داستان سناتی ہوئی نقاب اٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ چاندنی کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشد نے اس سے پوچھا۔ "تمھارے اور محمد علی بارفروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمھارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد باب کی روح کی شیدا رہیں۔

وہ مسکرائی چاندنی کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کے چہرے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں اور کہنے لگی "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں کی۔ باب میرے لئے محض روح تھا۔ ملا محمد

محض جسم، محض ہوس۔ محمد علی بار فروشی ان دونوں کے درمیان تھا، نئی روح جسم، جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے تو قرار دے لے۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری فکر کا ہو، جس سے مل کے میں اپنے آپ کو اس سے برتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت بھی۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ آقاؤں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کر طہران آئی۔ جہاں میں الف لیلہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح نور جہاں کی طرح۔ لوگوں نے مجھ اسیر زندان کو طہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سن کے ناصر الدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے روحانیت کا دعویٰ، دوزخی نور جہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نور جہاں تھی نور جہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بار فروشی مجھ سے چھن چکا تھا مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصر الدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ، اپنی نور جہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لئے لکھا تھا، اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو و ملک و جاہ سکندری، من و رسم و راہ قلندری

اگر آں خوش است تو درخوری، وگر ایں بد است مرا سزا

اور ظاہر ہے کہ اس جرات انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ میں گانٹ سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا یا مجھے کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنویں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو خچر کی دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دار القضا لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

پھر زور سے سائرن بجا اور دفعتہً رک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دردناک چیخ سنائی دی، اور سکرات کی طرح اکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ دو ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور دور سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آئی۔ سڑک پر۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زرّیں تاج مسکرائی۔ چاندنی جیسی مدھم مسکراہٹ۔ چاندنی اپنی نہیں ہوتی [illegible] ن کے زندگی نہیں ہوتی۔ زرّیں تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی۔ اور وہ [illegible] سے آگے آ رہی [illegible] اب اس جیسوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی۔ اب [illegible] ایک کا [illegible] پ رہی تھی۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ۔ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ دور [illegible] آ چکا تھا۔

وہ تو ماضی کی طرف چلی گئی۔ چاندنی میں غائب ہو گئی اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لئے مستقبل ابھی بہت بہت دور تھا۔

چوتھی کا جوڑا

عصمت چغتائی

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو، اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا، ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلّے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھونا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو"۔ اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی

ماں کے پُراستقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی۔ چپ چاپ وہ زری کے ٹکڑے سے دو ٹکڑوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول .... ان سے چھنتی زرد چھاؤں سے شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں، اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں، جیسے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھا لی۔

محلے والوں کے حلقے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ لو ہے بیچے بھی مخمسے دیے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپ لپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا .... صندلوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے شبنمی دوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے، گنگاجمنی کرنیں ماند پڑ گئیں طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی، محلے کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

”چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی، پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا“۔

”لو بوا، سو اور سنو، کیا کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟“ اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی،

بے ہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں، اللہ، یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے!

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی، کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا، یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو مہر پہ بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہو گا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو یکدم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑاتے۔ پھر بی اماں آ کر انہیں سہارا دیتیں، پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا"۔ ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو، اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر؟"

اور تب ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی، کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں، نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں میں مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ کام نہ آ سکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر رستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ:

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ"۔

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشے کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشے سلمہ ستارہ، پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا"۔ حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں"۔ وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی"۔ وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی۔ "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تا کہ موٹی سی ملائی پڑے، اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے، اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایکدن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور

اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چیچپاتے تکیے کے غلاف پر سویٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے"۔

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے"۔ بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے"۔ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو، یہ میں کب کہوں ہوں، یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکریہ کو کام آئے گی"؟ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔

"اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی"

"اے تو میں کیا کروں خالہ"؟

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی"؟

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے"۔

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا"۔ بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو مگر۔۔۔" میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں:

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا"۔

"نہیں ہنسوں گی"۔ میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجیے"۔ میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔

"چنگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سچ، مزا کرکرا ہو جائے گا"۔

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، لٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموشی سے کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہئے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہے لگاؤں کہ:

"واہ جی واہ دولہا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو"۔ مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے"؟ بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

"بتائیے نا"؟

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ"۔ بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے، مزیدار ہی ہوں گے"۔

"ارے واہ رے جنگلی"۔ بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے"۔

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا"۔

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر شام کو میں کمرے میں چائے لے کر گئی تو بولے:

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے"۔

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا"؟ میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری"۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں، گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں، میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملے بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ... نہیں... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بیچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اونہہ"! میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں"؟ راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے"؟ بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں، پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں... اوہ نہیں... کھا نہیں لوں بلکہ چوم لوں"۔ میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا، ہلدی دھنیا کی سوندھ میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ" میں نے سوچا، جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے"؟ بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور

بیٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو۔۔۔ مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پی کریں"۔

"چل جھوٹی"۔

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ۔۔۔۔"

"اری چپ مردار"۔ انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ، سویٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو"۔

"نہیں بی آپا انہیں نہ دو وہ سویٹر، تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سویٹر کی کتنی ضرورت ہے"" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی! تم خود کیا پہنو گی"؟

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے"۔

سویٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا

"کیا یہ سویٹر آپ نے بنا ہے"؟

"نہیں تو"۔

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے"۔

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تھودے، یہ سویٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے، اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرا نہ دکھا سکیں گے، انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا، انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولھے کی آنچ سہتے ہیں، تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو، محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں، ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھوک اور کال کی

باتیں، دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے، دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے"!

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے"؟ ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔ میں نے سوچا تھا ان سے بچھ بتا دوں گی۔

"کیوں"؟ وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے۔۔۔ دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں"۔ انہوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا۔

"بی آپا۔۔۔ سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں" میں نے سلگ کر کہا "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی"۔

"کیا ہوا"؟ بی اماں نے جاء نماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں"

"راحت نے توڑ ڈالیں"۔ بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں"۔

"خوب کیا، تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا، بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں"۔ پھر چمکار کر بولیں، "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجو، وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی"۔ یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ ارے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے"۔

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے

سارے موتی ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بے چارے لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجیے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی کلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں، کبھی سویوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو، وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ ’’بھئی کس سے؟‘‘ تو کہا؟ ’’کسی سے بھی کرا دو‘‘۔ اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے‘‘؟ بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا

’’یہ بات نہیں ہے بہن، آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا‘‘۔

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

’’کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے، اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہو گا‘‘۔

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی، دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھڑی میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے، آج مشکل کشائی ہو گی، بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکل جائیں گی، آج ان کی

جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ ان کی بکی بکی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے"۔ ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بج اٹھے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے۔۔۔

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں۔۔۔ چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے، بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔۔۔ بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے"۔ بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔۔۔ حمیدہ کا گلا بھر آیا۔۔۔

"جاؤ نہ میری بہو"، بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ۔۔۔ یہ ملیدہ"۔ اس نے اچھلتے ہوئے، دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پھر پہاڑ کھسکا۔۔۔ اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھایا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔ نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر

گر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گُل ہو گئی۔ باہر صحن میں محلّے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے رہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں کفن کا سفید سفید لٹھا، موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا، بائیں ابرو پھڑک رہی تھی، گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر --- سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

چینی کی انگوٹھی

عظیم بیگ چغتائی

انگوٹھیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ ان سب میں سونے اور چاندی کی زیادہ مشہور ہیں۔ پھر بعض انگوٹھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا انگلی میں ڈالنا وہاں جانا ہو کر "جی کی مصیبت" ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں میرا مطلب ایک عجیب و غریب "چینی کی انگوٹھی" سے ہے۔

ایک بڑے ضروری کام سے میں لکھنؤ سے بھی آگے جا رہا تھا۔ ایک دن لکھنؤ ٹھہرنا تھا۔ گویا یہ کہیے کہ فی الحال لکھنؤ جا رہا تھا۔ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر اپنا اسباب کانپور والی گاڑی میں رکھ کر اسٹیشن پر ٹہلنے لگا، کیونکہ ابھی گاڑی میں کافی وقت تھا، ٹہلتے ٹہلتے ریفرشمنٹ روم کو سونگھنے لگا، جالی میں سے اندر جھانکا۔ کچھ شبہ سا ہوا، غور سے جو جھانک کر دیکھا تو بھائی شنذری! واللہ کس شان سے پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ سامنے میز پر "لبالب" نہیں بلکہ "لدالدا" بھری ہوئی ایک کشتی رکھی تھی۔ جس میں کیک، پیسٹریاں، چاکلیٹ، توس، مکھن، انڈے وغیرہ اور نہ معلوم کیا کیا بلائیں درج تھیں۔ علاوہ چائے کے۔ بس کھانے کو بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ بیٹھتے بیٹھتے کچھ پیروی سنت رسولؐ کا پاس یا پھر یہ کہ ابھی ابھی ٹی ناک مروڑی تھی، کچھ بھی ہو لپک کر ہاتھ دھونے کے لئے برابر والے کمرے میں نل پر پہنچے۔ اور ادھر لپک کر میں ان کی جگہ۔۔۔ بھائی شنذری کے آنے کی آہٹ سن کر میں نے گردن نیچی کر لی۔ میں نے کیک کھانا شروع کیا تھا اور لمحہ بھر میں ہی آدھے پر پہنچ گیا تھا۔ ویسے تو "شارٹ ہینڈ" تو میں نے نہیں سیکھا لیکن کھانے میں بحمداللہ کافی سے زیادہ "زودنویس" ہوں۔ بھائی شنذری ادھر سے بھوک پہ دھار رکھے ہوئے آئے اور مجھے گردن جھکائے "محو خدمت" دیکھ کر بولے "ارے تم کہاں؟"

میں منہ چلا رہا تھا تیزی سے۔ اور چونکہ بہ نسبت پلیٹ میں کیک رکھا رہنے کے ضروری

خیال کرتا تھا کہ میرے پیٹ میں پہنچے۔ جدا اپنے رخساروں کے لحاظ سے کچھ کچھ حضرت ڈارون کے مسئلہ ارتقاء کی جیتی جاگتی تصویر ورنہ تفسیر بنا بیٹھا تھا، لہذا، بولتا کیا خاک۔

''کہاں جا رہے ہو'' کہہ کر بھائی شنذری بھی کھانے پر پل پڑے، کیونکہ یہ موقع ٹیک سینک کا بالکل نہ تھا۔ اور پھر علاوہ اس کے بھائی شنذری ویسے بھی ایک برف کی قلفی والے کا مٹکا لوٹنے میں نمایاں حصہ کالج میں لے چکے تھے۔ جس نے شکایت کرنے کے لئے ادھر ادھر بھاگتے یا غل مچانے کی بجائے یہ کہا کہ مجھے لڑکوں نے لوٹ لیا، یہ کیا تھا کہ خود ہی بنی ہی قلفیاں لوٹنے لگا۔ وہ جیتا اور لڑکے ہارے، کیونکہ اس نے اپنے ماہر ہاتھوں سے قلفیاں کھول کھول کر چابک دستی سے ہتھیلیوں میں پلٹ پلٹ کر تیزی سے برف کھانا شروع کر دی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے پیٹ میں پہنچ جائے بہتر ہے۔

جب کیک اور عمدہ قسم کی مٹھائیاں ختم ہو چکیں اور گویا گھوڑ دوڑ ختم ہو لی اور محض روکھی سوکھی چیزیں رہ گئیں تب کہیں جا کر تبادلۂ خیال ممکن ہوا۔ اب مجھے بھی اطمینان تھا اور انہیں بھی۔

''کہاں جا رہے ہو یار''؟ بھائی شنذری نے پوچھا۔

''اور تم کہاں جا رہے ہو''؟ میں نے جواب دیا۔

''پہلے تم بتاؤ''۔ بھائی شنذری نے چائے کی پیالی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

میں نے بھائی شنذری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوکھے منہ سے کہا۔

''ذرا ٹونڈلے تک آیا تھا''۔

''جھوٹے ہو'' بھائی شنذری نے چائے کی پیالی کو منہ پر سے ہٹا کر کہا ''میں خود ٹونڈلہ تک آیا تھا''۔ پھر اپنا منہ چائے کی پیالی سے ڈھک دیا۔

ہم دونوں جھوٹ بولے، کیوں؟ شاید اس لئے کہ دوسرا کہے کہ میں کرایہ دوں گا۔ میرے ساتھ چلو، پھر لطف یہ کہ دونوں کو معلوم تھا کہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔

''کہاں بیٹھے ہو''؟ میں نے برجستگی سے پوچھا۔

''سیکنڈ کلاس میں''۔ بھائی شنذری کے منہ سے نکل گیا۔ اور پھر اپنی غلطی محسوس کر کے اسی چائے کی پیالی سے، جس سے کھیل رہے تھے جھنک کر کہا ''بے ایمان کہیں کا''۔

یہ کہہ کر اپنی حماقت پر ہنسنے ہی والے تھے کہ زور سے سیٹی بجی۔ گاڑی چھوٹنے کی اس نامعقول سیٹی کو سن کر ہم دونوں گویا ایک دم سے جاگ اٹھے اور بھاگے۔ مگر بھائی شنذری مع چائے کی پیالی کے۔ جس کا کنڈہ کھیلتے کھیلتے اب انہیں پتہ چلا کہ انگلی میں پھنسا ہوا ہے۔

ادھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر پیالی پر کٹے جاتا ہے تو انگ لگا کہ "لینا"

ایک وقت میں بھائی شندری کے ذمے اب دو کام تھے۔ ایک تو اپنی انگلی دیکھ کر چائے کی پیالی کا پھنسا ہوا کنڈا نکالنا اور دوسرے بے تحاشا سر پر پیر رکھ کر بھاگنا کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ نتیجہ اس کا ناظرین خود معلوم کر سکتے ہیں سوائے اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب و غریب طریقے سے انگلی میں چائے کی پیالی کا صرف کنڈہ ہی کنڈہ رہ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ قبل اس کے کہ میں عرض کروں کہ کس طرح ایسا ہوا ضروری ہے کہ یہ بھی عرض کر دوں کہ نہ تو کوئی ریلوے ریگولیشن ایسا ہے کہ دو بدحواس یک وقت پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے پائیں اور نہ پھر یہ کسی قاعدے یا بائی لاز کی رو سے ممنوع ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر کوئی بدحواس خوانچہ پھاندنے کی کامیاب یا ناکام کوشش نہ کرے۔ پھر ویسے بھی یہ کوئی جرم تو نہیں۔ چنانچہ ادھر سے میرا شیر پیشۂ حماقت شندری چلا ہے اور ادھر سے ایک اور صاحب دور سے ایک خوانچہ پھاند کر ریل چھوٹنے کی گھبراہٹ میں چلے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان دونوں کا ریلوے کی اصطلاح میں "میل" ہوا۔ جیسے دو گاڑیوں کا ہوتا ہے۔ اس طرح کہ تحقیق کے ساتھ نہیں عرض کر سکتا کہ انہوں نے تاک کر اپنی ناک بھائی شندری کے ہاتھ میں پھنسی ہوئی پیالی پر ماری تھی یا پھر بھائی شندری ہی نے ایک انداز قادرانہ کے ساتھ خود ان کی ناک پر پیالی کا وار کیا تھا۔ کچھ بھی ہو دونوں گر کر اٹھے۔ "اندھا ہے"۔ بھائی شندری کے منہ سے نکلا۔ چشم زدن میں دونوں اٹھ کر سامنے والے ہی انٹرکلاس میں چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ان دونوں حضرات سے دو سیکنڈ پہلے پہنچا تھا اور مجھے دیکھ کر ہی بھائی شندری اپنا سیکنڈ کلاس چھوڑ کر جلدی میں اوپر آ گئے۔ ہوٹل کے خانساماں کو مبلغ ایک روپیہ کلدار چائے کی پیالی کی قیمت یا جرمانہ پیش کیا۔ اب بھائی شندری نے اپنے کلمہ کی انگلی کو دیکھا۔ جس میں چائے کی پیالی کا کنڈہ ہی کنڈہ پھنسا رہ گیا تھا۔ کھڑکی میں ہاتھ مار کر وہ توڑنے لگے کہ میں نے یونہی بغیر کسی وجہ کے ہاتھ روک کر کہا "یار اسے مت توڑو، ایک روپے کا ہے مجھے نکال دو"۔

(۲)

قبل اس کے کہ میں اپنا قصہ بیان کروں، ضروری ہے کہ کچھ "چانٹے" یا "تھپڑ" کی اقسام و ماہیت پر بحث کروں پنجاب سے لے کر دکن تک اگر ہاتھ کو کسی کے گال پر مارا جائے یا گال کسی کے ہاتھ پر مارا جائے تو کہا جاتا ہے کہ چانٹا مارا یا چانٹا پڑا۔ لفظ "چانٹا" بہت عام ہے۔ تھپڑ بھی عام ہے لیکن ان دو الفاظ کے ہم معنی جتنے لفظ یوپی اور نیز دوسرے مقامات پر

رائج ہیں ان کی "تلفظی" سائیکالوجی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں چانٹے کے لاتعداد اقسام ہو سکتے ہیں وہاں عوام نے مناسبت سے علیحدہ علیحدہ نام بھی رکھ دیئے ہیں۔ چانٹا وہ ہے جو غصہ میں کسی کے گال پر "عرض" کیا جائے۔ اس کے تلفظ ہی میں انگریزی اصطلاح آنوموٹوپیا مضمر ہے۔ یعنی لازمی ہے کہ چانٹا آواز کے ساتھ سرزد ہو۔ ایک چانٹے کی آواز کا مفہوم سمجھتے ہوئے آپ تھپڑ اس کا ہم معنی اور ہم مطلب لفظ کسی طرح نہیں۔ کیونکہ تھپڑ میں لازمی طور پر چٹاخ کی آواز مفقود ہے، وہ آواز جس کا تعلق محض انگلیوں ہی سے ممکن ہے۔ تھپڑ میں بدقسمت گال پر علاوہ پانچ کی انگلیوں کے کچھ حصہ ہتھیلی کا بھی پڑتا ہے جو آواز کی لطافت کھو دیتا ہے۔ مگر ضرب البتہ بھاری پڑتی ہے۔ انگلیوں کے نشان گال پر ایک تھپڑ میں پڑنا لازمی نہیں۔ لہذا آپ نے دیکھا کہ تھپڑ اور چانٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چانٹے کا ہم معنی لفظ طمانچہ ہے مگر اس میں بھی وہ تیزی نہیں جو چانٹے میں ہے۔ پھر طمانچہ برابر والوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لئے مخصوص ہے۔ تھپڑ کو بعض لوگوں نے لپڑ بھی کہا ہے۔ یہ لفظ غیر فصیح ہے۔ مگر کیا کیا جائے جہاں مجبوری یہ ہو کہ ایک طرف گال کسی موٹے آدمی کا ہو تو ہاتھ بھی مولانا شوکت علی کا۔ چربی کے وجود نے اس میں سستی پیدا کر دی ہے۔ غرض اسی قسم کے اور بہت سے الفاظ ہیں۔ چنانچہ انہی الفاظ میں سے ایک نہایت عامیانہ لفظ "زناٹا" ہے۔ یوپی سے اتر کر شاید بھوپال کی طرف بولا جاتا ہے۔ اس بھوپالی زناٹے میں برق رفتاری اور انتہائی تیزی و تندی اس قدر زیادہ موجود ہے کہ بیان سے باہر۔ دراصل یہ چانٹا ہے ایک بے حد تیز قسم کا۔ بوجہ اپنی رفتار کی تیزی اور زناٹے کے، چانٹے اور طمانچے کی مخصوص چٹخدار آواز پر اس کی تیزی کا زناٹا غالب آ جاتا ہے۔ گو ویسے چانٹا ہونے کیوجہ سے اس میں چانٹے کی مخصوص آواز ضرور موجود ہوں اور وہ بھی بدرجۂ اتم۔ لہذا "زناٹا" وہ چانٹا ہے جس میں ایک چانٹے کی تمام خطرناک طاقتیں موجود ہیں اور برق رفتاری اس کے علاوہ۔ اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں۔

عموماً مسافروں کا قاعدہ ہے کہ سفر کی گڑبڑ سڑبڑ میں ضروری چیزیں ساتھ لینا بھول جاتے ہیں۔ جیسے ناشتہ دان، لوٹا، عقل، اخلاق، تہذیب وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ قصداً بھی اسباب کے بکھیڑوں کی وجہ سے سامانِ ضروریات لے کر ہی نہیں چلتے۔ چنانچہ یہی بھائی شنذری کا اصول ہے کہ عموماً عقل، اخلاق اور تہذیب وغیرہ قسم کی تمام چیزیں قصداً سفر کی طوالت کی وجہ سے گھر پر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ مضبوط الاعضاء حضرت جن سے بھائی شنذری کی ٹکر ہوئی تھی ایک پوری کی پوری سیٹ

پہ دراز تھے اور منہ پہ اخبار تھا۔ چھوٹا ڈبہ تھا، جگہ بالکل نہ تھی اور دوسرے مسافروں کے آرام سے یہ بے نیازی اور غفلت بھائی شندری کو بے حد ناگوار گزری۔ چنانچہ بھائی شندری نے کہا

"اخبار پھر پڑھیے گا ذرا اٹھ کر بیٹھیے"۔

انہوں نے اخبار کو منہ سے ہٹایا اور خواب میں اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں تاکہ ہم لوگ وہاں بیٹھ جائیں اور اخبار منہ پر۔ بھائی شندری کو بھلا یہ رعونت کب گوارا تھی۔ ہاتھ سے جھٹ اخبار چھین کر ڈانٹا۔

"آپ آدمی ہیں۔۔؟"

وہ تڑپ کر اٹھے۔ اخبار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے"؟ اور بھائی شندری نے اخبار اونچا کر کے کہا "یا وحشت"!

"ادھر لاؤ اخبار"۔ بڑھ کر انہوں نے ڈپٹ کر کہا "بدتمیز کہیں کے"۔ غضب ناک ہو کر انہوں نے پھر کہا۔ اس کے جواب میں بھائی شندری نے ان کا بچہ آنے کا ٹائمز آف انڈیا ریل کے باہر پھینک دیا۔

ادھر بھائی شندری نے اخبار پھینکا اور ادھر انہوں نے جل بھن کر کباب ہو کر ایک ہی نمبر کا زناٹا اس زور سے بھائی شندری کے گال پر عرض کیا ہے کہ باوجود ریل کی گھڑگھڑاہٹ اور زنزناہٹ کے رپانے کے زناٹے اور تڑخے سے ڈبہ گونج گیا۔ بھائی شندری کا منہ چرخے کی طرح گھوم گیا اور بانکا ٹیلٹ ہیٹ وہ گرا۔ بھائی شندری نے سنبھلتے ہی یک دو تین ہاتھ تابڑتوڑ ان کے دیئے۔ انہوں نے حملہ کو روک کر بقول کے "الجھاوے" سے ہاتھ نکال کر ایک زناٹا بھائی شندری کے اور دیا۔ کوئی پچھتر نمبر کا۔ مگر اب میں بھی اپنے عزیز دوست کی امداد پر آ چکا تھا۔ مگر تین گھونسوں میں سے ایک تو اوپر والی بنچ پر پڑا تھا۔ دو غنیم کے لگے تھے۔ اس دوران عدد ان دو زناٹوں کے طرفین سے دس بیس ہاتھ چل چکے تھے۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ اور ہم دونوں قطعی دشمن پر بھاری پڑتے کہ "ہیں ہیں" کر کے دو تین مسافروں نے قابو میں کیا۔ اس کے بعد سخت کلامی کے مدارج طے ہونے لگے۔ اور کس مشکل سے لوگوں نے شیروں کو قابو میں کیا ہے کہ بیان سے باہر۔ ہم دونوں دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ کیونکہ دراصل میں ایسے موقع پر تھا کہ جدل میں اچھی طرح شرکت ہی نہ کر سکا تھا۔ اب اس جنگ کے نتیجہ پر غور کیجئے۔ چائے کی پیالی کے کنڈے کی دھاردار گر سے دشمن کے بائیں ہاتھ کی پشت پر زخم کاری لگا تھا۔ علاوہ اس زخم کے دشمن پر کوئی وار ہی سالم نہ اترا۔ یا تو کلائی پر رک گئے یا اوچھے پڑے مگر ادھر بھائی شندری کے گال پر زناٹوں کے نشان کس صفائی سے موجود تھے کہ کان تک گوبک

دے رہا تھا۔ اصطلاحاً یہ ماربیٹ تھی مگر دراصل "پیٹ" کیونکہ غور جو کیا تو اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ بھائی شذری پٹ رہے ہیں۔ کیا میرے شیر نے بھائی شذری کے چانٹے دیے ہیں کہ ہنسی روکنا مشکل تھا۔ ہم دونوں سے دوسری بنچ پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنا شروع کیں۔ اس شان سے بھائی شذری نے کمال کر سانجھا ہے کہ جیسے ان کو پٹنے سے نہ کبھی علاقہ رہا اور نہ ہے۔ "اس کو آگے چل کر دیکھیں گے"۔ بھائی شذری نے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں چپکے سے کہا

"مطلق" میں نے کہا اور غور کرنے لگا کہ اس کو آگے چل کر دیکھیں گے۔ اس جملہ کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں ہے کہ اس سے آگے چل کر بھی پٹیں گے کیونکہ یہ نالائق شخص نہ صرف تگڑا تھا بلکہ تنہا طور پر ہم دونوں سے بھی طرح نمٹ لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ مگر سوچتا میں بھی یہی تھا کہ اس موذی کو کسی طرح آگے چل کر موقع دیکھ کر ماریں۔

اب ہم دونوں میں باتیں شروع ہوئیں بھائی شذری کو میں ان کے سیکنڈ کلاس میں بھلا کیوں جانے دیتا، اور پھر شاید وہ خود بھی نہ گئے۔ غرض اب باتیں شروع ہوئیں اور سچ سچ حال ایک دوسرے کو بتانا پڑا۔ بھائی شذری لکھنؤ جا رہے تھے اور وہاں سے ایک دوسری جگہ اپنے ایک بڑے گہرے دوست سے ملنے۔

"یہ کون دوست ہیں تمہارے"۔

"ایک ہیں"۔ بھائی شذری نے جواب دیا۔

"کون ہیں آخر؟ کیا نام ہے ان کا، کچھ تو بتاؤ"۔

"دوست تو کیا ہیں"۔ بھائی شذری بولے۔ "ایک الو پھنسا ہے عجیب احمق ہے"۔

"کون ہیں"؟ میں نے پوچھا۔

"محض ذرا سی ملاقات پر یا تعارف پر خط پہ خط، ملاقات کا شوق، تقاضے پہ تقاضا، ناک میں دم کر دیا ہے یار میرے نے، مجبوراً وعدہ کرنا پڑا کہ بھئی لکھنؤ آئے تو تم سے بھی ملیں گے۔ چلو نا یار تم بھی چلو"۔ مجھ سے بھائی شذری نے زور دے کر کہا "چلو نا تم بھی"

(وہ حضرت جن کی ہم سے جنگ ہوئی تھی غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے اور گھورتے ہوئے پاخانہ گئے)۔

میں نے کہا: "یار پہلے یہ بتاؤ کہ وہ ہے کون، کیا نام ہے، کیا کرتے ہیں، تم سے کب ملاقات ہوئی"؟

بھائی شذری نے سارا حال بتایا، نام بتایا، زمیندار ہیں۔ شکار کے بے حد شوقین ہیں، ملاقات کبھی نہیں ہوئی، غائبانہ تعارف ہے اور وہ بھی ایک بندوق کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں۔ اور

پھر ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست ہیں"۔

"پھر تم نے اسے بیوقوف اور احمق کیوں کہا؟" میں نے بھائی شندری سے پوچھا۔ اور وہ
وہ حضرت بیت الخلا سے واپس آ کر بھائی شندری کے مضطرب گال پر اپنی انگلیوں کے نشان غور سے
دیکھنے لگے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں اور اپنی کارگزاری کو دیکھ کر مسکرائے۔ واقعی بھائی شندری
کے سخت زناٹے انہوں نے رسید کیے تھے۔ شندری بھائی نے ان کی مسکراہٹ اور میری مسکراہٹ کو
معلوم کر لیا اور جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کی طرف دیکھ
کر کچھ کہا جیسے کہ کھا جائیں گے ان کو۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے اور بھائی شندری نے
اس سلسلہ میں کہا:

"مجھے دراصل ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے کہ خواہ مخواہ دق کرنے لگ جاتے ہیں"۔

میں نے کہا: "یار پہلی مرتبہ ملے گا تو خاطر بے حد کرے گا"۔

"جب ہی تو کہتے ہیں نا کہ چلو تم بھی۔ ایسا الو کم پھنستا ہے۔ خوب چٹخ چٹخ کر
کھائیں گے کہ یاد ہی کرے کہ آیا تھا کوئی"۔

"کرایہ داخل کرو"، میں نے کہا۔

بھائی شندری راضی ہو گئے اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ساتھ چلیں گے اور اس احمق
کے یہاں نہایت بے تکلفی سے ڈٹ ڈٹ کر کھائیں گے۔

(۳)

آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض کاریگر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اور کیل لیے اسٹیشنوں پر
گھومتے پھرتے ہیں اور دو آنے کے پیسے لے کر آپ کا نام وہیں کا وہیں برتن پر کھود دیتے
ہیں۔ ایسا ہی ایک کاریگر ہمارے ڈبے میں آیا۔ ریل رکنے پر ایک اسٹیشن پر لگا ایک صاحب کے
لوٹے پر نام کھودنے یہاں بھیڑ لگ گئی۔ کس صفائی سے خط نستعلیق میں نام کھودتا تھا۔ بے حد
پسند آیا۔ خصوصاً بھائی شندری کو۔ ان کے پاس لوٹا نہ تھا۔ میرا لوٹا لے کر کہنے لگے اس پر نام
کھدوائیں گے۔ میں اس بدذوقی کا سخت مخالف مگر بھائی شندری نہ مانے اور نام کھدوانے لگے۔
نام کھدوا کر لوٹا تو ایک کنارے رکھا اور لگے ہم اسٹیشن پر ٹہلنے۔

قبل اس کے کہ میں بیان کروں کہ پھر کیا ہوا۔ ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنے اور
بھائی شندری کے بارے میں ایک بات عرض کر دوں۔ ہم دونوں علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ،
بھائی شندری تعلیم ختم کر چکے تھے اور مجھے ابھی ایک سال اور پڑھنا تھا۔ ہم دونوں کے خیالات

صنفِ نازک کے بارے میں بے حد بلند واقع ہوئے تھے، اور ہیں۔ چنانچہ کس بے کلی سے ہم دونوں نے دیکھا ہے کہ تیسرے درجہ کے زنانہ ڈبے سے ایک کم عمر خاتون نے اپنی گردن ایک طرف کو نکال کر جھکا رکھی ہے اور ایک ہاتھ میں لوٹا لئے پانی والے کو پکار رہی ہے۔ ہم کو تسلیم ہے کہ ہم اس کو دیکھنے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ نہ کسی اور وجہ سے بلکہ شاید اس کے معصوم اور بھولے چہرے پر مظلومیت اور افسردگی دیکھ کر، وہ پانی مانگ رہی تھی اور کوئی نہ سنتا تھا۔ ہم دونوں چونکہ بالکل قریب سے گذرے اور بھائی شذری تو بالکل ہی قریب سے، لہٰذا اس نے اپنا ہاتھ اور سر ڈبے کے اندر کر لیا۔ واپس تیزی سے لوٹنے میں ہم دونوں نے ایک دبی ہوئی آواز میں سنا۔ "چینی کی انگوٹھی" مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی ایک اور چھوٹی سی لڑکی سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے جو بھائی شذری کی طرف انگلی اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید اس کے جواب میں یہ کہا ہو گا۔ "یہ چینی کی انگوٹھی" یا پاجامہ کی پیوں کا گنڈہ بدستور بھائی شذری کے دائیں ہاتھ کی کلمہ کی انگلی میں پڑا ہوا تھا جس سے وہ برابر باتیں کرتے میں کھیلتے جاتے تھے۔

گرمی کی تپش سے ہر جاندار کو پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور خصوصاً سفر میں متواتر تین اسٹیشنوں پر ہم دونوں نے اس غریب لڑکی کو پانی کے لئے لوٹے کو ھنڈی کی طرح ہلاتے دیکھا۔ اور اگر اس ہندوستان میں بدچلنی کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا کہ کسی غیر جنس کی طرف دیکھنا بھی مذہباً کفر ہو تو ہم کبھی کا اس کو پانی دے چکے ہوتے۔ دو ایک سٹیشن بعد ہمیں اس کا خیال بھی نہ رہا کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

بھائی شذری سیکنڈ کلاس کے مسافر کی حیثیت رکھتے تھے اور لیمن سوڈا برف پینا چاہتے تھے، مگر لطف تو دیکھئے میرے خرچ پر، میں نے تجویز کی کہ برف خرید کر شربت بنا لیا جائے۔ چنانچہ گاڑی میں سے برف لیا اور پانی لوٹے میں لے کر واپس آ ہی رہا تھا کہ پھر اسی اداس اور غمگین مگر خوبصورت چہرے والی لڑکی کو اسی طرح لوٹا لٹکائے پانی کے لئے پکارتے سنا۔ میں بالکل ہی قریب آ گیا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ ریل نے سیٹی دی اور حرکت کی ہی تھی کہ میں نے لڑکی کے ہاتھ سے اس کا لوٹا لے کر اس برجستگی سے اپنا لوٹا دے دیا کہ اسے لیتے ہی بن پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ ہوشیار ہو اور معلوم کر سکے کہ کیا ہو گیا، دوڑ کر خالی لوٹا لئے میں اپنے ڈبے میں چڑھ گیا۔ بھائی شذری نے مجھے یہ کرتے دیکھ ہی لیا تھا۔ میرے اخلاقی جرات کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں مجھے بھی تو یہ کسی سوزی سے کہیں پٹوائیں گے۔

میں نے غلطی کی جو اگلے اسٹیشن پر ہی اپنا لوٹا واپس نہ لے لیا کیونکہ اس کے بعد کے

اسٹیشن پر گاڑی بہت دیر تک نہ رکی اور تیسرے اسٹیشن پر زنانے ڈبے کی طرف جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو زنانہ درجے میں کوئی نظر نہ آئی، نہ معلوم کب نکل گئی، کہاں، کب اور کدھر اتر گئی۔ مگر میرا لوٹا اس کے پاس تھا اور اس کا لوٹا میرے پاس۔

(۴)

کانپور کے اسٹیشن پر ہم لوگوں کو اس کی فکر ہوئی کہ اپنے دشمن کو ... مزہ چکھا دیں، مگر کوئی صورت ممکن نہ ہو سکی۔ وہ بھی لکھنؤ جا رہا تھا۔ لہٰذا طے کیا کہ لکھنؤ پر دیکھا جائے گا۔

لکھنؤ بھی دور نہ تھا۔ زیادہ حصہ سفر بھائی شندری نے میرے ہی ساتھ طے کیا تھا۔ ویسے میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھتا تھا۔ لکھنؤ کا اسٹیشن جب قریب آیا تو بھائی شندری نے مشورہ کیا کہ اسے مارو۔ چنانچہ موقع مل گیا۔ میں اس کا اسباب لیے ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر تیزی سے آگے نکل گیا اور بھائی شندری ادھر دشمن کی طرف اس لوٹے سے مسلح ہو کر پہنچے۔ موقع بھی خوب ملا۔ وہ لگا اپنے ٹرنک کا کنڈہ پکڑ کر قلی سے سر پر ٹرنک لدوانے اور پیچھے سے اس کے کولھے پر بھائی شندری نے لوٹے کی ٹونٹی پکڑ کر ... کس کر لوٹا، بالکل ''گرز لندھور'' کی طرح مارا اور پھر جو سرپٹ بھاگے ہیں تو تیزی تو دیکھئے کہ میرے پاس سے نکل گئے اور مجھے بدحواسی میں دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے آواز دی تو گھبرا کر کہا کہ ''جلدی بھاگو'' کیونکہ خوب جانتے تھے کہ اگر کہیں پکڑ پایا اس نے تو بے طرح کندی کرے گا، مگر پھر اس موذی کا پتہ نہ چلا۔

لکھنؤ میں ہم دونوں دو دن ساتھ رہے۔ پھر بھائی شندری اور ہم دونوں بارہ بنکی چلے۔ اس دوست سے ملنے۔ گاڑی جو بارہ بنکی کے پلیٹ فارم پر داخل ہوئی ہے تو ہم دونوں سر نکالے ہی ہوئے تھے۔ وہ موذی کھڑا نظر پڑا۔ اور ہم دونوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بھائی شندری نے عذاب سے گردن نیچی کر لی اور میں نے بھی۔ ''اب یہ تمہیں قطعی ٹھونکے گا'' میں نے بھائی شندری سے کہا۔

''اس کی ایسی تیسی''۔ بھائی شندری نے کہا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

ادھر میں نے کہا ''قلی'' اور ادھر وہ موذی آ پہنچا۔ بھائی شندری نے لوٹے کا گرز بنا کر اپنے کو مسلح دکھایا۔

''سر پھوڑ دوں گا''۔ بھائی شندری نے لوٹا چمکا کر کہا۔

مگر وہ نامعلوم کس گڑبڑ میں تھا گھونسہ دکھا کر تیزی سے چلتا بنا۔ اسباب اتروا کر ہم

دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کیونکہ بھائی شنذری نے اپنی آمد کا تار دے دیا تھا اور امید یقینی تھی کہ ان کے دوست لینے آئیں گے۔ انتظار کر رہے تھے کہ پھر آیا وہ موذی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں"؟ اس نے اب گویا بھائی شنذری کو ٹھونکنے کی تمہید اٹھائی۔

"جہنم سے"۔ بھائی شنذری نے لوٹا تان کر کہا۔ "سر پھوڑ دوں گا"۔

"جاتے ہو یا نہیں موذی" اس نے کہا۔ "ریل کے دھوکے میں نہ رہنا۔ یہ بارہ بنکی ہے، ساری صاحب بہادری نکال دوں گا"۔

یہ کہئے کہ شکر ہے کہ وہ چلتا بنا اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک الفاظ ہم دونوں نے اس کے لئے سنتھیں سے تھے۔

"تار ملا نہ ہو گا" بھائی شنذری نے کہا۔ قلی سے اسباب اٹھواکر باہر نکلے تانگہ کیا۔ اپنے دوست کا نام اور مفصل پتہ بتایا کہ لے چلو وہاں۔ تانگہ ایک گلی کے کنارے پر آ کر رکا اور ہم دونوں اس خیال سے کہ مکان کا پتہ لگالیں تو تانگہ ادھر لائیں، اتر کر اندازے سے ایک مکان پر پہنچے۔ وہاں کھٹکھٹایا ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ دو مکان چھوڑ کر تیسرے پر دریافت کیجئے۔ وہاں پہنچے، ایک بڑا سا عالی شان پھاٹک تھا۔ اندر پہنچے، ملازم سے پوچھا، معلوم ہوا کہ اندر ہیں ملازم نے بلوایا اور کہا بیٹھئے۔

آپ یقین مانیے کہ اندر سے وہی موذی چلا آتا ہے اور نکلتے ہی وہ سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

وہ روشنی میں تھا اور ہم اندھیرے میں تھے۔

"یہ تو وہی ہے" گھبرا کر بھائی شنذری نے کہا اور نوکر سے اتنا پوچھا "کیا یہی ہیں" اور جیسے ہی اس نے کہا "ہاں" بھائی شنذری نے کہا "یار بھاگو"۔

ہم دونوں سر پر پیر دھر کر جو بھاگے تو تانگہ پر آ کر دم لیا اور سیدھے وہاں سے اسٹیشن۔ ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے واپس لکھنؤ اور قبل اس کے کہ گھر واپس پہنچیں بھائی شنذری نے لکھنؤ ہی سے معذرت کا خط لکھ دیا کہ افسوس میں حسب وعدہ حاضر نہیں ہو سکا۔

الحمدللہ! کہ اب تک ان نادیدہ دوست سے بھائی شنذری کے تعلقات دوستی اسی طرح قائم ہیں اور واقعی بڑی گہری دوستی دونوں میں چلی آ رہی ہے۔

جل پری

علی عباس حسینی

اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

میں ڈاک بنگلے میں بالکل اکیلا تھا۔ میرا اردلی بہاری قریب کے ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔ سرکاری خانساماں جو چوکیداری کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ مجھے کھانا کھلا کر کچھ دیر کے لئے قصبہ چلا گیا تھا۔ قصبہ ڈاک بنگلے سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ انگریز کالے آدمیوں میں مل جل کر رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ محکمہ نہر کے انگریز انجینئر نے اسی لئے یہ بنگلہ آبادی سے فاصلے پر بنایا تھا۔ بنگلے کے تین طرف ارہر اور اکھ کے کھیت تھے، چوتھی طرف نہر تھی۔ نہر کے اس پار ایک فرلانگ کے فاصلے پر ڈھاک اور جھاؤ کا جنگل تھا۔ یہاں لومڑوں، گیدڑوں، لکڑبھگوں اور بھیڑیوں کے بھٹ تھے۔ نہر بیچ میں نہ ہوتی تو شاید یہ بنگلہ ان کا رمنہ بن جاتا۔

رات بچپنے سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ دھندلکے کی چلبلاہٹوں پر گہری تاریکی کی متانت غالب آتی جا رہی تھی۔ بنگلے پر ایک سناٹا سا چھایا تھا۔ اردگرد کی فضا پر بھی وہ سکوت طاری تھا جو دس بجے شب کے قریب دیہاتوں، جنگلوں اور غیر آباد مقامات کو بھیانک بنا دیتا ہے۔ اس سناٹے اور خاموشی کے پردے کو کبھی کبھی لکڑبھگوں کی قہقہہ نما چیخ چاک کر دیتی تھی یا کبھی کبھی کسی الو کی آواز

میں نو وارد تھا۔ ضلع کی خصوصیات سے ناواقف۔ میرے لئے احوال بھی نیا تھا اور مقام بھی۔ نہر کے ماتحت انجینئر کی حیثیت سے تین میل کے دورے سے پلٹا تھا۔ یکے کی سواری نے پختہ اور نیم پختہ سڑکوں کے ہچکولوں نے چور چور کر دیا تھا۔ جسمانی تھکاوٹ کا تقاضا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں لیکن یہ عجیب بات تھی کہ نیند کی دیوی آتی تو ضرور مگر خراماں خراماں اور دل و دماغ میں اپنا نشیمن بنانے کی جگہ صرف پلکوں کو چھو کر چلی جاتی۔ میں الف لیلہ کا ''سوتا جاگتا ہارون الرشید'' بن گیا تھا۔ جو رام چندر جی کی طرح رعایا کا دکھ سکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے راتوں کو بھیس بدل بدل کر نکلتا تھا۔ اور جس کی راتیں بہت چھوٹی اور دن

بہت بڑے ہوتے تھے، اور میرے دل میں بھی ہارون الرشید جیسا ڈر بھی تھا۔ اس لئے کہ جس طرح وہ اپنے معمولی لبادے کے نیچے کمر میں مرصع تلوار لٹکا لیتا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی پٹی پٹی سے دونالی بندوق لگا رکھی تھی۔ اسے انسانوں کا خوف مسلح نکلنے پر مجبور کرتا تھا۔ میرے دل میں جانوروں کا ڈر تھا۔ اودھ کے بعض اضلاع میں لکڑبھگوں اور بھیڑیوں نے ان دنوں آفت مچا رکھی تھی۔ نہ جانے کتنی جانیں ان کی بدولت تلف ہو چکی تھیں۔ ایسے میں بندوق پاس ہوتے ہوئے قریب نہ رکھنا بے وقوفی ہی تو ہوتی۔

میں نے بستر کے قریب چھوٹی میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی تیز کی اور اپنی کتابیں اٹھا لیں۔ اس دورے میں تین کتابیں ساتھ لایا تھا۔ پریم چند کی پریم پچیسی، سمرسٹ مام کی ایز رس اج اور اناطول فرانس کی پنگوئن آئیلینڈس۔ یہ کتابیں بار بار کی پڑھی ہوئی تھیں، لیکن مجھے پریم چند کی جرات، غیرت، حمیت، شرافت اور محبت کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ ان سے کردار بنتے تھے۔ ان سے سیرتیں درست ہوتی تھیں۔ ان سے طبیعتوں میں توازن و اعتدال پیدا ہوتا تھا۔ وہ آج کل کی کہانیوں کی طرح بے نتیجہ نہ تھیں۔ ان سے کردار بنتے تھے۔ اناطول فرانس کی ساری تصنیفوں میں مجھے اس کی یہ تمثیلی ناول حد درجہ پسند تھی۔ طنز کا یہ شاہکار موجودہ تہذیب کے ارتقاء کی مکمل تاریخ ہے۔ حال ہی میں پریذیڈنٹ ٹرومین نے جو بجٹ کے سلسلے میں کانگریس کو سفارشات کی تھیں اور جس طرح اکیلے امریکہ کے بجٹ کو سارے عالم کا بجٹ بنا دیا ہے اس کا خاکہ اسی ناول کے آخری ابواب میں بڑی خوبی سے موجود ہے۔ میں بار بار اس حصے کو پڑھتا تھا اور ادیب کی حیرت انگیز سیاسی سوجھ بوجھ پر انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ ایز رس اج میں ہیرو کا استغناء عجیب و غریب ہے۔ وہ نہ صرف دولت و ثروت کی جانب سے بے پرواہ ہے بلکہ وہ حسن و جنس کے معاملے میں بھی مستغنی ہے محبوبہ اگر ایثار سے کام لے کر اس سے شادی کر سکتی ہے تو وہ خوش، اگر وہ دولت کے حرص میں کسی اور رشتے کی تلاش میں بھٹک جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں۔ سزا یافتہ چور اور بدمعاش اس کی ہمدردی کے مستحق اور جانی بوجھی بدکردار عورتیں اس کے تحفظ کی حقدار۔ اگر ان میں سے کوئی اس کے احسان کا بدلہ جسمانی لذتوں کے ذریعے چکانا چاہتی ہے تو اسے معاوضہ کے قبول کرنے میں ضد نہیں۔ اگر کوئی خود ہی اصرار کرنے کے بعد وعدہ فراموشی سے کام لیتی ہے تو وہ اس سے ناخوش نہیں ہوتا۔

میں ایز رس اج کی جلد پر ہاتھ رکھے مام کے اس عجیب کردار پر اور اس کی نوکھی تکنیک پر غور کر رہا تھا جو اس نے اس سوانحی ناول میں اختیار کی ہے کہ دفعتاً مجھے شاد عظیم آبادی کا مشہور شعر یاد آ گیا

سنی حکایت ہستی تو درمیان سے سنی　　　ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور دماغ جسم و روح کے مابعد الطبیعیاتی مسائل میں الجھ گیا۔ یہ "میں" کون سی چیز ہے؟ گوشت و پوست کا مجموعہ یا کچھ اور؟ روح محض حرارت جسمی ہے یا اس سے الگ کوئی دوسری چیز؟ اگر محض حرارت ہے تو انسانی دماغ اس کے پیدا کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتا؟ اگر جسم سے علیحدہ کوئی شے ہے تو اسے قفس

عنصری میں کون بند کرتا ہے، کون نکال لیتا ہے؟ پھر یہ پیدائش سے پہلے کہاں تھی، مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے؟ کیا روحانیین کا ادعا صحیح ہے کہ وہ روحوں کو بلا سکتے ہیں، ان سے گفتگو کر سکتے ہیں؟۔۔۔ اور مجھے وحدت تصوف کی باتیں یاد آئیں۔ کچھ ویدانت کی، کچھ تھیوسیفی کی، کچھ سائنس کی۔۔۔ اور میں نے اٹھ کر لیمپ کی روشنی کم کی، آنکھیں بند کیں اور نیند بلانے کے لئے شاد کا مصرعہ دہرانے لگا "ہے نہ حقیقت کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"۔۔۔ دفعتاً کمرے کے دروازے سے ایک شخص نے جھانکا، بڑے بڑے الجھے بال، لمبی کھچڑی داڑھی، اور دھنسی دھنسی چمکتی آنکھیں۔

میں نے ڈر کو دل میں چھپاتے ہوئے کہا "کون"؟

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ بھیانک چہرہ، ننگا بدن، ننگے پاؤں، سارے جسم اور کپڑوں پر گرد کی ایک تہ جمی ہوئی، اس پر اس قدر لاغر کہ معلوم ہوتا تھا ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے یہ کوئی مصری موسیائی، میرا دل سہم گیا۔ حلق سوکھنے لگا اور پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں نے بڑے ہی اکھڑ اندازِ لہجہ میں پوچھا،

"تو کون ہے"؟ بولتا کیوں نہیں"؟

"پانچ پیسے" وہ پہلی بار بولا۔

بھیک مانگنے والے میری چڑ ہیں۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے دست سوال پھیلانا، انسانیت کی سخت ترین توہین ہے۔ اور بے حیائی اور بے عزتی کی آخری حد

میں نے اسی لئے جھڑک کر کہا "تو اندر کیوں گھس آ رہا ہے؟ دروازے پر کھڑا ہو کر صدا لگا"۔

اس کی آنکھوں کی چمک اور بھی بڑھ گئی۔ جیسے دہکتے ہوئے کوئلوں پر سے پھونک کر راکھ اڑا دی گئی ہو۔ مگر وہ عاجزی سے بولا "جی مجھے کام بھی تو کرنا ہے"۔

فقیر کی زبان پر کام کا لفظ۔ میں بھونچکا سا ہو گیا۔

"کیسا کام"؟ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی! پانچ پیسے کے عوض کام" اس نے کہا۔

"یہاں کوئی کام نہیں ہے"۔ میں نے ترش روئی سے جواب دیا۔

وہ اطمینان کے ساتھ میری مسہری کی پٹی کے پاس فرش پر بیٹھ کر بولا "جی، آپ بہت تھک گئے ہوں گے، لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں"۔۔۔ اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لئے اپنا سوکھا ہاتھ بڑھایا۔۔۔

میرے دماغ میں اچکوں، چوروں، ڈاکوؤں کی ساری کہانیاں فلم کی بدلتی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ

روز کی جھنکار کر دہ چوہے سے کھیلتے وقت بلی کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کہا ''ڈریے نہیں بابو جی، میں کوئی چور، چکا نہیں ہوں، میں۔۔۔ میں ایک والیٔ ملک کا بھائی ہوں''۔ اس کی آواز میں غرور کی جھنکار پیدا ہوگئی تھی۔

میں نے کہا ''تم!۔۔۔'' اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ یہ صورت، یہ حالت، پانچ پیسے کا سوال، پاؤں دبانے کی مزدوری اور والیٔ ملک کا بھائی! مختلف جذبات کے ردعمل نے اس ہنسی کو ایک دیرپا قہقہہ میں تبدیل کر دیا۔۔۔ اس طرف آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میرے ہاں ہنسی کی افراط کی وجہ سے اور اس کے ہاں جھنجھلاہٹ سے غم و غصہ سے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پہلے جلتی شمعیں لہرائیں، پھر دو آنسو خشک چہرے پر ڈھلکتے ہوئے فرش پر گرے۔ اس کی تکلیف کی شدت کے احساس سے میرے قہقہے کی آواز اس طرح یکایک بند ہو گئی جس طرح ''چلو'' کارخانے کا شور بجلی کا سوئچ دبانے سے دفعتاً رک جاتا ہے اور مجھے اس طرح کا ایک جھٹکا لگا جیسا تیز چلتے ہوئے موٹر میں اچانک بریک لگانے سے محسوس ہوتا ہے۔

میں نے کہا ''میرا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی بات پر شک کرتا ہوں''۔

اس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں، آپ کی ہنسی بجا تھی۔ میری صورت شکل، میری حالت دیکھ کر ہر شخص کو ہنسی آتی ہی ہے۔ کوئی مجھے دیوانہ کہتا ہے، کوئی مجنوں، لیکن میں نے آج تک کسی کو نہ تو یہ بتایا کہ میں کون ہوں اور نہ کسی کو اپنا قصہ سنایا۔ ایک عجیب داستان ہے۔۔

میں نے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو سے محسوس کیا کہ وہ ضرور ایک پڑھا لکھا شریف زادہ ضرور ہے اور میں نے دلجوئی کرتے ہوئے کہا، ''نہیں نہیں، میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مگر۔۔۔مگر۔۔۔ اچھا آپ مجھے اپنی کہانی سنایئے'' اور میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر جھکا کر کہا، ''جیسے میں نے کہا میں ایک والیٔ ریاست کا بھائی ہوں۔ ریاست کا نام اگر نہ بتاؤں تو آپ برا نہ مانیں گے۔ ریاست بہت بڑی نہیں مگر اس کے نواب کو اپنے حدود کے اندر بڑی سے بڑی سزا دینے کا حق ہے اور اس کے اشارے پر اب بھی ریاست کا بڑے سے بڑا آدمی موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا وزیر اعظم تک کا عہدہ پاتا ہے۔ والد مرحوم نے ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت پر لاکھوں روپے صرف کیے۔ ہم عربی، فارسی، انگریزی، فرنچ ہی نہ پڑھائے گئے بلکہ ہمیں نشانہ لگانا، سواری کرنا اور جملہ سپاہیانہ فنون سکھائے گئے۔ بھائی صاحب کو اسپورٹس کا زیادہ شوق تھا اور مجھے مطالعہ کا۔۔۔ میری فرمائش پر اسٹیٹ کی لائبریری میں ہزار ہا نئی کتابوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ میری خاص پسند کا موضوع فلسفہ تھا۔ میں شروع ہی سے مابعدالطبیعیات کی باریکیوں میں الجھنے میں ایک خاص لذت پاتا تھا۔ میرا محبوب ترین مشغلہ یہ تھا کہ میں اپنے استادوں سے کسی فلسفیانہ موضوع پر بحث کرتا رہوں یا پھر کسی شعر یا کسی نظم کی انوکھی تشریحیں کیا کروں۔۔۔ مجھے زیبائش و آرائش، رقص و سرود سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میں نے بدھ کی زندگی اور

اس کا فلسفہ بہت غور سے پڑھا تھا اور میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کم سنی کی حالت میں یہ طے کر لیا تھا کہ میں دوسرا بدھ بن کر رہوں گا۔ انہوں نے چونکہ تاہل کی زندگی بسر نہیں کی، میں وہ بھی نہ کروں گا۔ میں عیسیٰ کی طرح بن بیاہا رہوں گا۔ اس لئے جب کسی نے میری شادی کی بات چیت چھیڑی تو میں نے ان کے پاس کہلا بھیجا کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اس سے گھر کی بیبیاں حیران تھیں، یہ بات بالکل عجیب تھی۔ ڈاکٹر حکیم بلوا بھیجے گئے۔ سرکاری حکم تھا۔ معائنہ کرایا گیا۔ سب نے بالاتفاق فیصلہ کیا کوئی بیماری نہیں۔ ایک فرنٹ نے منجھا ہوا نسخہ بتایا۔ میری خدمت کے لئے ماہ رخ نازنینوں کی حلقہ کنیزیں رکھ دی گئیں۔ ایک سے ایک ہوش ربا، ایک سے ایک شریر، میں نے ان کے اطوار و حرکات، جذبات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور پورے محل کو جیسے کہ ایک تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیا۔ کئی مہینوں کی روزانہ رپورٹوں میں انہیں میرے رویہ میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا تو وہ بھی ہار بیٹھے اور انہوں نے حکم دے دیا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے سب چھوٹے بھائی بہنوں کی شادی ہو گئی اور میں اپنے مشاغل میں لگا رہا۔

ایک دن صبح کے کوئی سات بجے تھے، میں نماز سے فراغت پا کر پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ روش کی دونوں جانب گلاب کھلے ہوئے تھے، سرخ، زرد، سیاہ، سفید اور ان پر ہندوستانی بلبل اور مختلف چھوٹی چھوٹی گل دار چڑیاں گر رہی تھیں، شہد کی مکھیاں اور بھونرے بھی اپنے اپنے طور پر طواف میں لگے تھے۔ میں دور سے اس حسین منظر کو دیکھ رہا تھا اور غالب کا یہ مطلع میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اس پر غور کر رہا تھا کہ کیا واقعی تناسخ صحیح ہے، کیا ہم چولے بدل بدل کر آتے رہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پیدا ہی کیوں ہوئے؟ مرتے کیوں ہیں؟ بار بار پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے۔ پھر دفعتاً دماغ اس طرف مڑ گیا کہ ہمارے بوس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی طرح نباتات میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ خوشی بھی محسوس کرتے ہیں، درد و تکلیف بھی۔ پھر جس تحقیق تک سائنس اتنی دیر میں اتنی جستجو کے بعد پہنچی۔ شاعر کے تخیل نے اسے کیونکر اتنی مدت پہلے، محض معمولی مشاہدے کے ذریعہ معلوم کر لیا تھا۔ کیا ایک بڑے شاعر کو الہام ہوتا ہے؟ کیا موجودہ سائنس کی نظر میں الہام بھی کوئی چیز ہے۔

پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا، ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ مجھے چھوتی گذرتی جاتی اور میرے خیالات ایک جگہ جمنے کی بجائے نئی نئی پٹریاں بدلتے بھاگے چلے جاتے اور لاینحل سوالات کا ایک ہار گوندھتے جاتے تھے۔ دفعتاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھائی، حضور ولی عہد بہادر، اپنے مشکی پر سوار چلے آ رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے سائیس میرے عرب نقرہ کی لگام پکڑے لا رہا ہے۔

میں نے سلام کیا تو بولے ''ارے میاں راہب'' انہوں نے مجھے راہب کا خطاب دے رکھا تھا۔ ''آؤ چلیں تفریح کر آئیں''۔

مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا بہت شوق تھا۔ ایک مہینہ سے زائد ہوا تھا کہ محل کی چار دیواری کے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ آج جو اپنا گھوڑا دکھائی دیا تو دل بے ساختہ چاہا کہ اُچک کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤں۔ پھر بھی میں اس وقت صرف کرتہ پاجامہ پہنے تھا۔ اپنے محل کے اندر تو اس لباس میں گھوم سکتا تھا، باہر اس طرح جانے کے خلاف احکام تھے۔ ریاست کے والی کے لئے تو ہر موقع و محل کے لئے مناسب لباس ضروری ہے۔ میں نے بھائی صاحب سے اجازت لے کر جلدی جلدی لباس بدلا اور اپنے عربی پر سوار محل سے نکل گیا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا، برسات ختم ہو چکی تھی۔ زمین نے ہر جگہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے لعل و جواہر سبزے اور ہریالی کی صورت میں اگل دیئے تھے۔ ہوا میں بہت ہی دل پذیر خنکی تھی۔ طائر درختوں پر چہچہا رہے تھے، مشکی اور نقرہ و سیاہ اور عربی، سیاہی و سپیدی، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے فراٹے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں کچھ بنجاروں کے خیمے دکھائی دیئے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریوں میں پورے پورے خاندان۔ ان کے کالے کالے لونڈے رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ ان کی عورتیں میلی میلی پھٹی شلواریں، ساریاں یا پانجامے اور شلوکے پہنے بال گرد سے اَٹے ہوئے کوئی پتیلی مانجھ رہی ہے، کوئی چولھے میں آگ روشن کر رہی ہے۔ کوئی کھڑی دونوں ہاتھوں سے جوئیں پڑے بال کھجا رہی ہے۔ مرد یا تو بیٹھے حقہ پی رہے ہیں یا اپنے چھوٹے چھوٹے ٹٹو ل رہے ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نظیر کا مصرعہ نکل گیا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

بھائی صاحب نے کہا ''جلدی نکل چلو، یہ ٹھہرنے کی جا نہیں''۔

ہم نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور چند منٹ میں اپنی مشہور جھیل ''رام ساگر'' کے کنارے پہنچ گئے۔ کوسوں لمبی جھیل پر ریاست نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے قابل دید بنا دیا ہے۔ اس میں گھاٹ ہیں۔ سنگِ سرخ و سنگِ موسیٰ کے کنارے ہیں۔ اس میں جنگل میں بہنے والے چشموں کے مناظر ہیں۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی ندیوں کے مناظر ہیں۔ اس کے کنارے پر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی کشتی گاہیں ہیں۔ اس میں تیرنے کے وہ تمام سامان ہیں جو اس ورزش کا جوانوں کو حریص بنا سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کا پانی صاف ہے، شیریں ہے اور اس میں کسی قسم کی گندگی کی آمیزش کی اجازت نہیں۔

ہم جھیل کی اس عمارت کی طرف مڑے جو شاہی خاندان کے غسل کے لئے مخصوص تھی اور جہاں کسی دوسرے کو نہانے کی اجازت نہ تھی۔ اور ہم نے دیکھا۔۔۔ ہم نے دیکھا۔۔۔''

بھکاری شہزادے نے بے تکلف جھپٹ کر میرے سرہانے سے سگریٹ اور دیا سلائی اٹھالی اور ایک سگریٹ جلا کر کئی لمبے لمبے کش لئے۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ اسے یہ دنیاوی من و سلویٰ مدتوں کے بعد ملا ہے۔

لیکن وہ اس سے لذت یاب ہونے کی بجائے اسے کسی دوا کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے بیان کرے۔ اس نے آدھی بجھی ہوئی سگریٹ زمین پر رگڑ کر بجھا دی اور بجھے ہوئے ٹکڑے کو کان کے پیچھے ٹھونس لیا۔ پھر وہ اسے کان سے نکال کر چٹکیوں سے مسلتا ہوا بولا۔

''وہ شہزادیوں کے گھاٹ پر ننگی مادر زاد کھڑی تھی۔ اس کے متناسب جسم پر ڈھلان سے آتے ہوئے آفتاب کی کرنیں ملمع چڑھا رہی تھیں۔ اس کے لمبے کالے بال ہوا میں اڑتے اور ہم سے سانپ کی طرح بل کھاتے تھے۔ وہ خود پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ ایک پیتے ہوئے جگنو کی طرح اس کا چہرہ ایک بار پھر روشن ہوا۔ ایک چھپکے کی آواز آئی اور وہ پانی میں غوطہ لگا گئی۔ میں بے ساختہ گھوڑے سے کود کر ادھر لپکا۔ مجھے نہ ولی عہد بہادر کا خیال تھا، نہ اپنی شہزادگی کا، نہ ماحول کا خیال تھا نہ حالات و واقعات کا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے آج جل پری اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور وہ نظروں سے غائب ہوا چاہتی ہے۔ میرا دل پکار رہا تھا کہ اس عجوبہ روزگار کی اگر پھر جھلک دیکھنی ہے تو جلدی کرو۔

بھائی حضور مجھے آواز دے رہے تھے ''کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے کچھ نہ سنا۔ میں دوڑ کر کنارے پر پہنچ گیا۔ جھک کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ جھیل کی سطح بالوں میں چھپا ہوا ایک آفتابی چہرہ ابھرا۔ نرگس جیسے نازک اور سفید ہاتھوں نے ان کو جھٹک کر پیچھے پھینک دیا اور ایک آن واحد کے لیے دو غمخوار آنکھوں سے میری آنکھیں لڑیں اور اس نے ایک ہلکی چیخ کے ساتھ پھر غوطہ لگا دیا۔

بھائی صاحب نے اتنی دیر میں عمارت کی نگران ملاحنوں کو آواز دے دی تھی۔ ان میں سے تین دوڑتی ہوئی ساحل تک پہنچیں۔ بھائی حضور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکانے کی کوشش کی۔ میرے منہ سے بدحواسی میں نکلا ''جل پری'' ''وہ ہنس دیئے ''ابھی آتی ہے تمہاری پری گرفتار ہو کے''۔ انہوں نے کہا اور ملاحنوں کو اشارہ کر دیا۔ ان میں سے دو فوراً جھیل میں پھاند پڑیں۔ معلوم ہوا دو مگرمچھ ایک روہو کے تعاقب میں چلے۔

بھائی حضور میرا ہاتھ پکڑ کر ادھر لائے جہاں ہمارے گھوڑے کھڑے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں بالکل انہیں کے سہارے چل رہا ہوں۔ مجھ سے قوت عمل بالکل سلب کر لی گئی ہے۔ میں رہ رہ کر کانپتا تھا جیسے میں کسی بھیانک خواب سے چونک اٹھا ہوں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ لرزش وہ فطری جھٹکے تھے جو ان بندھنوں کے ٹوٹنے سے ہو رہے تھے، جو میں نے اپنے جنسی میلانات کے گرد باندھ رکھے تھے۔ میں نے اپنے عرب کی زین سے پیٹھ لگا لی اور کھڑے کھڑے سگریٹ جلائی۔ جلدی جلدی دو تین کش لگائے جب جا کر میری یہ کیفیت کم ہوئی۔

ملاحوں نے اسے پکڑ کر رکھا تھا۔ جیسے جسم پر میلی خشک ساری، کمر سے نیچے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوا۔ ان دونوں کے درمیان وہ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مشک کے دو نافوں کے درمیان کافوری ایک ڈلی۔

بھائی حضور نے کڑک کر پوچھا "کون ہے ری تو؟"

اس نے بے خوفی سے جواب دیا "شہزادی"۔

وہ مسکرا دیئے "اچھا، جب ہی آپ شہزادیوں کے گھاٹ پر نہا رہی تھیں"۔

ملاحوں میں سے ایک بولا، "سرکار، یہ بنجارن بڑی نٹ کھٹ پاجی ہے، نہ جانے کیسے گھس آئی سرکاری دریا میں"۔

بھائی حضور نے کہا "اچھا! اسے شام کے دربار میں پیش کرنا"

تب تک اور بھی کئی سرکاری ملاح بھی آ گئے تھے۔ سب نے سلام کیا اور "شہزادی" کو گھیرے ہوئے حوالات کی عمارت کی طرف لے گئے۔ میں خاموش تھا۔ بھائی حضور ولی عہد تھے۔ سرکار کے بعد انہیں کا ساری ریاست میں حکم چلتا تھا۔ میں اگر کچھ کہتا تو نہ جانے ملاح اور ملاحنیں مانتے بھی یا نہیں۔ لیکن دل میں پچھتا رہے تھے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور منہ کا ذائقہ کڑوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے بخار کا مریض ہوں۔

بھائی حضور نے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا "لا تبھی ری جل پری تو بنجارن لگی"۔

میں نے کہا "آپ نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا ہوتا۔ دربار میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولے "شاہی گھاٹ پر نہانے کا جرم چھوٹا نہیں، اس کی سزا سات برس کی قید سے لے کر موت تک ہے۔ اس کے سرکار ہی فیصلہ فرمائیں گے۔ میں نے کہا "مگر۔۔۔ مگر!"۔۔۔

ان کے چہرے پر دفعتاً وہ سختی اور بے رحمی جھلکنے لگی جو مطلق العنان والیوں کے چہرے پر نادر کی حکامات صادر کرتے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہی جوان جو اس ان کی جگہ دردوں سے مشابہ بنا دیتی ہے۔ اور وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ میرا فقرہ عرب بھی خود بخود سا تجھ ہولیا۔ جیسے وہ بھی منشی کے قدم بقدم چلنے میں اپنی فلاح سمجھتا ہو۔

محل میں واپسی پر میں اپنے بستر پر جا کر گر پڑا۔ کنیزیں میرے جوتے اور کپڑے اتارنے دوڑیں تو میں نے جھڑک دیا۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو میں نے ایک کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا سن سترہ برس سے زیادہ نہ تھا اور وہ سب میں حسین تھی۔ وہ اس وقت کچھ سہمی سہمی سی پلٹی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ہر عورت کے اعضاء میں وہی تناسب ہوتا ہے جو "شہزادی" کے نیم عریاں بدن سے جھلکتا تھا۔ کنیز تھوڑی دور پر آ کر دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ میں نے اشارہ سے اور قریب بلایا۔ وہ آئی مگر ڈرتی ہوئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے اچانک التفات سے گھبرا گئی ہے۔

میں نے کہا ”ڈرو نہیں، میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں“۔

میرے لب و لہجہ سے وہ ذرا مطمئن ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

میں نے پوچھا ”تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے؟“

اس نے سر جھکا کر کہا ”آپ کی خدمت کے لئے“۔

”کس طرح کی خدمت؟“

اس نے کہا ”ہر طرح کی“۔

میں نے کہا ”میرے سامنے ننگی ہو کر ناچو گی؟“

اس نے کہا ”کنیز ہوں جیسا حکم“

مجھے غصہ آ گیا ”نہیں چاہیئے مجھے تمہاری کنیزی۔۔۔ پیسوں پر بکنے والا جسم! چلی جاؤ میرے سامنے سے، دور ہو جاؤ“۔ میں چیخا اور وہ ایک پٹے ہوئے کتے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔

میں پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ دونوں تصویریں بار بار میری آنکھوں میں ابھرتی تھیں، غوطہ لگاتی ہوئی جل پری اور ملاحنوں کے درمیان گلاب کی کلی۔۔۔ مجھ سے عاقبت اندیشی کی صلاحیت دفعتاً سلب ہو گئی۔ میں جھپٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ پھر ”شیر دل“ پر بیٹھا اور سرپٹ بھگاتا ہوا جھیل کے کنارے شہزادیوں کے گھاٹ پر پہنچا۔ ملاحنیں اب کے باقاعدہ پہرہ دیتی ہوئی ملیں۔ انہوں نے شہزادی کو ایک کمرہ میں بند کر رکھا تھا۔ وہ اس کے دروازے پیٹ پیٹ کر ان کو کوس رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوا تو اس کی ساری کا آنچل کمر میں لپٹا تھا۔ اور اس کے بال کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ اور اس کے گال بالکل لال ہو رہے تھے۔ یہ تیسری تصویر پہلی دو تصویروں سے بھی زیادہ دلربا تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں پڑے ہوئے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

”آپ چھوٹے شہزادے ہیں“؟ اس نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر حامی بھری، مجھے دفعتاً یہ یاد آیا کہ میں ایک شہزادہ ہوں۔ میں ایک سرکاری مجرم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ حضور عالی کے احکام بڑے سخت ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بن کھلی کلی ہمیشہ کے لئے ہی نہ مرجھا جائے، بلکہ مجھے بھی نظر بندی یا قید تنہائی کی سزا بھگتنا پڑے۔ میں جلدی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شہزادی میرے قریب کھسک آئی۔ اتنی ہی دیر میں اس کی نسوانی فطرت نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کا والہ و شیدا اس کا غلام بن چکا ہوں وہ مجھے موم کی طرح جدھر بھی چاہے موڑ سکتی ہے۔ اس نے دفعتاً میرے کندھے سے سر لگا کر کہا۔

”میرے شہزادے! مجھے چھوڑ دیجئے“۔

میں حضور عالی کی خفگی کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے پلنگ سے اتر کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہا ''میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، چھوڑ دیجئے''۔

''میں بے بس ہوں شہزادی، مجھے چھوڑنے کا اختیار نہیں''۔

وہ طعن سے ہنسی ''اچھے شہزادے ہیں؟! ایک مجرم بھی چھوڑ نہیں سکتے''؟

میں نے کہا ''اگر چھوڑ بھی دوں تو ابھی تجھے پھر پکڑ لیں گے، شام کے دربار میں حاضری ضروری ہے''۔

وہ بولی ''ہونہہ! بس اس گھاٹ سے نکل جانے دیجئے پھر دیکھوں کی کون پکڑ لیتا ہے''۔

میں نے کہا ''اچھا تو چلی جا! مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ میں کیسے ۔۔۔''

اس نے جھک کر میرے پاؤں چھو لئے ''میں پھر آؤں گی شہزادے''۔ اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ ملازموں نے روکنا چاہا، میں نے کہا ''جانے دو'' اور وہ تیز بھاگتی ہوئی اس طرف چلی گئی جدھر بنجاروں کا قافلہ پڑا تھا۔

شام کے دربار میں وہ تو نہیں پیش ہوئی۔ البتہ سارے بنجارے بدھے کھڑے تھے۔ لیکن حضور عالی کے بار بار پوچھنے پر بھی کسی نے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں گئی۔ دھمکیاں دی گئیں، پیٹا گیا لیکن کوئی بھی اس کے سوا نہ بولا کہ وہ بھاگ گئی۔ مجھ پر بھی عتاب شاہی نازل ہوا۔ قانون شکنی کیوں کی گئی۔ مجرم کو فرار میں کیوں مدد دی گئی۔ میں خاموش سر جھکائے سب سنتا رہا۔ حضور عالی نے ڈانٹا۔ بھائی حضور نے مذاق اڑایا۔ وزراء نے نصیحت کی مگر میرا سکوت نہ ٹوٹا۔ ہاں آخر شہزادی کہاں گئی۔ اور میں اسے پھر کیسے دیکھوں گا۔ پھر یہ بھی الجھن کہ میں اس بنجارن کے پیچھے کیوں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ والئی ملک کا بیٹا اور نیچ ذات کی عورت کا عشق۔ لوگ کیا کہیں گے؟ بھائی حضور نے تو آج بھرے دربار میں رسوا کیا، کل سارے ملک میں تشہیر ہو گی۔ حضور عالی کے غصہ کا پارہ کس ڈگری پر پہنچے گا۔ سرکار عالیہ کے سامنے اگر پیشی ہوئی تو ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ کیا اسی کو عشق کہتے ہیں؟ میں تو اس سے کوئی غرض بھی نہیں رکھتا۔ میں تو شہزادی کو صرف خوش، چہلیں کرتے دیکھنا چاہتا ہوں پھر اس قدر فکر کیوں؟ ممکن ہے کہ اسکا بھی کوئی بنجارہ ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم بھر میں کسی نے ایک ساتھ بہت سی سوئیاں چبھا دیں۔ میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں۔ وہ میرے ہی ساتھ رہے گی۔ میں، سے سب کچھ کھو کر جیت لوں گا۔ میں نے ٹہلنا شروع کیا۔ پورے کمرے کی سینکڑوں بار پیمائش کر ڈالی، فرش کچل ڈالا، لیکن الجھن بڑھتی ہی جاتی تھی۔ میری خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہے کیا کہ کبھی سارے جسم میں چنگاریاں سی بھر جاتی ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رگوں میں برف اتاری جا رہی ہے۔ میں نے کمرے کے باہر روش پر ٹہلنا شروع کیا۔ مختلف طرح کے ہندوستانی اور انگریزی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا ان کی خوشبو سے معطر تھی۔ لیکن مجھے سوائے اس کے کسی بات کا احساس نہ

تھا کہ میرے دماغ میں کوئی کیل سی ٹھونکی جاتی ہے ٹھک، ٹھک، ٹھک!

اور اس نے دفعتاً اپنی لمبی لمبی انگلیاں بڑھا کر میری کھوپڑی پر اس طرح ماریں کہ معلوم ہوتا تھا، تھوڑی سے کیل ٹھونکی جا رہی ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ قصہ بیان کرتے کرتے اس کی وحشت بڑھتی جاتی ہے اور کہانی کی ابتدا میں جو رحم اور ہمدردی کا جذبہ مجھ میں پیدا ہوا تھا اس پر ایک عجیب سی [illegible] ایک خفیف سی سراسیمگی غالب آتی جاتی ہے۔ رات کا سناٹا، تاریکی، اور دور تک [illegible] کسی انسان کا موجود نہ ہونا۔ ان چیزوں نے پھر تحت الشعور میں دبا ہوا خوف ابھارنا شروع کیا تھا۔ اور [illegible] ڈرنے کا سبب قصہ کا موضوع نہ تھا، وہ تو کافی شیریں، دلچسپ اور دلپذیر تھا، بلکہ وہ پورا ماحول تھا اور [illegible] انداز اور اس کا حلیہ۔

میں نے اسی لئے قصہ کو تاہ کرنے کی غرض سے سوال کیا ''تو شہزادی سے آپ کی ملاقات ہوئی یا نہیں''؟

وہ بولا ''نہ ہوتی تو آج یہ گت کیوں بنتی'' اسی رات ہوئی۔ تقریباً دو بجے جب میں بیٹھ کمرے میں پڑا نیند کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے خیال کیا نگاہ کا دھوکا ہے۔ آنکھیں مل ڈالیں۔ وہ اتنی دیر میں اُچک کر اندر آ چکی تھی۔ میں نے کہا ''تم! تم!''

وہ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑا کر بولی ''میں نے وعدہ کیا تھا شہزادے''۔

میں نے شرع و آئین سب کو پس پشت ڈال کر اسے اپنی گود میں سمیٹنا چاہا اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا ''میں اس لئے نہیں آئی شہزادے''۔

''پھر کیوں آئیں''؟

وہ بولی ''مجھے آپ کی مدد کی اب بھی ضرورت ہے۔ مجھے ایک تیز اور مضبوط گھوڑا چاہئے تاکہ میں آج ہی رات ریاست کی سرحد سے نکل جاؤں''۔ میں نے کہا ''اور میں''؟

وہ بولی ''آپ شہزادے ہیں، آپ میرے جیسی عورت کو بیوی نہیں بنا سکتے''۔

''مگر میں تو بغیر تمہارے زندہ ہی نہیں رہ سکتا''۔

''تو پھر آپ کو بھی بنجارہ بننا پڑے گا''۔

میں نے کہا ''منظور''۔

اور ہم اسی رات اپنے نقرہ اور مشکی پر سوار ہو کر سرحد سے نکل گئے اور میں چھ ماہ تک اس کے ساتھ بنجاروں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہمارے پاس کبھی ایک کمبل کا سائبان ہوتا، کبھی وہ بھی نہیں۔ مگر ہر وقت جنت ہوتا۔ شہزادی کے ہر فعل میں ایک خاص ادا ہوتی۔ دلفریب، دلپذیر، فرحت انگیز، اور میرا جی چاہتا تھا بس اسے دیکھے جاؤں۔ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، کام کرتے، سوتے، اٹھتے، بیٹھتے، اور میں جی بھر کر دیکھتا۔ پھر

بھی دل سیر نہ ہوتا۔ طبیعت نہ بھرتی۔ میں کبھی کبھی سوچتا، کیا جنت میں اس سے زیادہ خوشی ممکن ہے اور ہماری
اس جنت میں ایک دن ایک سانپ آ ہی گیا۔

میری مفروری اور گم شدگی کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ اشتہارات دیئے گئے تھے۔ حلیہ شائع کیا گیا تھا۔ انعامات کا اعلان ہوا تھا۔ آدمی چھوڑے گئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کمبخت اتفاقاً بنجاروں کے ہر قافلے کو دیکھتا، ٹوہ لیتا ہم تک پہنچ ہی گیا۔ وہ مجھ سے ملا۔ حضور عالی کی بیماری کی اطلاع دی۔ سرکار عالیہ بستر مرگ پر پہنچ چکی تھیں۔ میں نے کہا۔ "سوائے شہزادی کے اب میرا کوئی نہیں"۔ اس وقت تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا مگر شب میں جب ہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے، دس بارہ آدمیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شہزادی اور مجھے رسیوں سے باندھ کر ایک بگھی میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہا گیا "حضور والا حاضر ہے، آپ کا تعاقب بے سود ہے۔ ساتھ چلئے ورنہ ہم اٹھا کے لئے جا رہے ہیں"۔ چارہ کار ہی کیا تھا۔ ہم دو دن سفر کر کے دربار میں حاضر کئے گئے۔ حضور عالی نے حکم دیا "اس بدچلن عورت کو سپاہیوں میں سے کسی ایک کو دے دو کہ اپنا گھر بسائے اور صاحبزادے کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا کر میرے سامنے حاضر کرو"۔ میں اس ذلت کا متحمل نہ ہو سکا۔ میں نے بھرے دربار میں کہہ دیا کہ شہزادی میری بیوی ہے۔ اگر کسی سپاہی نے ہاتھ لگایا تو میں اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلاؤں گا"۔

حضور عالی نے طنز سے پوچھا "بیوی ہے؟ کس نے نکاح پڑھا تھا"؟

میں نے کہا "میں نے خود"۔

وہ جانتے تھے، مذہباً میں ایسا کر سکتا ہوں۔ ان کے لئے یہ جواب تو ساکت ضرور تھا مگر اس سے ان کا غصہ بھڑک اٹھا۔ انہوں نے حکم دیا "ان دونوں کو جیل میں ڈال دو۔ مگر الگ الگ کمروں میں"

ہم دونوں قید کئے گئے مگر اتفاق کی بات کہ اسی شب میں حضور عالی کو قلبی دورہ پڑا اور صبح ہوتے ہوتے وہ اپنے سے بھی زیادہ سخت مگر عادل جج کی عدالت میں طلب کر لئے گئے۔ آٹھ بجے دن کو جب میں قیدیوں کا لباس پہنے اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تھا یہ خبر ملی۔ مجھے اس حادثہ پر کوئی رنج نہ ہوا۔ اس لئے کہ میں انہیں باپ کی جگہ اپنی شہزادی پر ظلم کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لئے نہ میں نے اظہار افسوس کیا اور نہ ہی میں نے آنسو بہائے۔ ہاں اس کی خوشی ضرور تھی کہ بھائی حضور کو تخت ملا۔ وہ نسبتاً رحم دل تھے چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں اسکا ثبوت ملا۔ وزیر اعظم خود میری رہائی کا پروانہ لے کر قید خانہ آئے۔ میں نے کہا "میں بغیر شہزادی کے نہ جاؤں گا"۔ اس کی رہائی کا بھی حکم آ گیا اور ہم دونوں بند موٹر میں بٹھا کر محل میں پہنچائے گئے۔

میں نے اپنے خاص محل میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدلے اور شہزادی کے بارے میں خواصوں کو ہدایت دے کر میں بھائی حضور کی خدمت میں نذر گزارنے حاضر ہوا۔ انہوں نے گلے لگایا۔ ولی عہدی اور حضور عالی کے دفن و کفن کے سارے فرائض میرے سپرد کئے۔ میں نے انہیں بحسن و خوبی انجام دیا اور یہ

اطمینان اپنے محل میں رہنے لگا۔

شہزادی کو سارے ممکن آرام مہیا تھے۔ ماما، دائیاں، خواصیں، کنیزیں ہر وقت خدمت میں لگی رہتیں۔ میں اب بھی بھونرے کی طرح اس کے گرد پھرا کرتا۔ تفریح کے نئے موقعے تھیں [illegible] خرچ کے لئے روپے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ سست رہنے لگی۔ [illegible] پر محل میں قیام کا [illegible] ایک آزاد چڑیا پر ایک سونے کے پنجرے میں بند کر دیے جانے کا ہوتا ہے۔ اسکے شبابی رنگ پر ملال رنگ غالب آنے لگا۔ اس کی سیمابیت نے جمتی برف کی نجمادیت اختیار کرنا شروع کی۔ میرے خوشی کے ذہن میں فکر کی کانٹے دار جھاڑیاں نکلنے لگیں۔ میں اسکو خوش رکھنے کی صورتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک شب [illegible] میں بارہ بجے کے بعد دربار سے پلٹا تو میں نے محل کو اس سے خالی پایا۔ گھر کا کونا کونا ڈھونڈ [illegible] تھی [illegible] کمرے میں بدحواس پھر پلٹا تو تکیہ کے نیچے ایک پرزہ ملا ''شہزادے! میں جاتی ہوں، مجھے تم سے [illegible] محبت ہے لیکن بنجاروں کی زندگی سے اس سے بھی زیادہ''۔ میں نے اس شب پہلی دفعہ شراب پی اور [illegible] پی کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

صبح کی اعصاب شکنی اور درد سر نے مجھے پہلی دفعہ اپنی ظاہری حالت کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے دیکھا، کرتے کے سارے بٹن کھلے ہیں۔ دامن اور آستین پر بدبودار دھبے ہیں اور کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی سے پڑی ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے شب میں شراب پی۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شرمندگی اور خجالت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ منہ کا ذائقہ تھا کہ جیسے میں نے رات بھر خاک پھانکی ہے۔ کچھ ترش، کچھ کڑوا ساتھ ہی حد درجہ پھیکا۔ حلق میں کانٹے سے پڑے تھے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور حمام میں گھس گیا اور محل میں میں نے پہلے دن آبدار خانے کے سربمہر گلاس کی جگہ پائپ کا پانی چلو لگا کر پیا۔ پھر جلدی جلدی کپڑے اتار کر نیم گرم پانی سے خوب نہایا۔ جب میں تولیہ لپیٹے باہر نکلا تو میں نے دیکھا، زہرہ میرے بستر کی چادر بدل رہی ہے اور خود بخود اس بلی کی طرح مسکرا رہی ہے جس نے تھوڑی دیر قبل گھر کا پالتو سفید چوہا کھا ڈالا ہو۔ اس کے چھلکے ہوئے بھیگے بال اس کے شاہد تھے کہ وہ بھی ابھی غسل کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نیم سپردگی، نیم فاتحانہ جھلک تھی۔ مجھے یقین آ گیا کہ رات کی مدہوشی میں میں نے اسے شہزادی کی جگہ دے دی۔۔۔۔ اور مجھے خود اپنے سے نفرت ہو گئی۔ میں ڈاکو تھا، بے زبانوں اور کمزوروں کی پونجی لوٹنے والا ڈاکو۔ میں نے ایک کنیز کو اپنایا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی بلکہ اس لئے کہ اس کا جسم میرے لئے خریدا گیا تھا۔ میں نے اس سے اس کی پسند کا حق زبردستی چھین لیا تھا۔ پھر میں بے وفا بھی تھا۔ میں نے شہزادی کی ملکیت پر دوسرے کو قبضہ کر لینے کا موقع دیا۔ میں نے چند گھنٹوں میں اپنی تمام روایات کو بھلا دیا جو وامق و مجنوں و فرہاد و رانجھا نے اپنا سب کچھ کھو کر محبت کرنے والوں کے لئے چھوڑی تھیں۔

میں اسی پیچ و تاب میں گرفتار تھا کہ بھائی حضور کا حکم نامہ آیا ''سرکار عالیہ نے یاد فرمایا ہے، فوراً

حاضر ہوا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مخبروں نے سارے واقعات کی خبر پہنچا دی ورنہ میں یوں نہ یاد کیا جاتا۔ سرکار عالیہ نے جس دن سے شہزادی کے متعلق یہ معلوم کیا تھا کہ وہ بنجارن ہے، مجھے عاق کر دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ جب تک یہ ناہموار اور ذلیل تعلق قائم رہے گا، وہ میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ شاید اس دیوانگی سے پہلے اس طرح کا حکم میرے لئے موت کے برابر ہوتا۔ اس لئے کہ میں ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور مجھے بھی وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ لیکن شہزادی کی محبت نے میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کیا تھا کہ میں اس کے علاوہ کچھ سوچ سکتا تھا اور نہ مجھے کسی اور کی دنیا میں پرواہ رہ گئی تھی۔ اسی لئے مجھ پر نہ تو حضور عالی کی خفگی اور موت کا کوئی اثر ہوا تھا اور نہ سرکار عالیہ کی ناراضگی کا۔۔۔ میں نے دنیا اسی ایک کے پیچھے تج دی تھی

اس دن جبکہ میری محبت نفرت میں تبدیل ہو رہی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی کس حد کا خود غرض، کمینہ خصائل اور ذلیل طبیعت ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک بنجارن کی محبت میں باپ کی شفقتوں کو اور ماں کی محبتوں کو بھلا دیا۔ مجھ میں نہ تو خاندان کا لحاظ و پاس باقی رہ گیا تھا اور نہ اس کا احساس کہ میں ریاست بھر میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہوں گا۔ دنیا مجھے کیا کہتی ہو گی۔ اور میرے فعل سے ریاست اور اس کے والی کی کتنی سبکی ہوتی ہو گی۔

میں نادم و ہراساں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کے لئے جھکا ہی تھا کہ ان کے اشاروں پر کنیزوں، مغلانیوں نے صدقہ اتارنا شروع کیا۔ غلہ، کپڑا، روپے، میں نے اجازت لے کر بیٹھنا چاہا اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے چھاتی سے لگا لیا اور مامتا سے بے چین ہو کر رونے لگیں۔ میری آنکھوں سے بھی ندامت کے آنسو گرے۔ ایک لفظ شکایت یا نصیحت کا زبان پر نہ لائیں۔ بس بار بار چہرہ دیکھتیں اور باغ باغ ہو جاتیں۔ میں دل میں کہتا رہا کہ ایسی چاہنے والی ماں کے ساتھ میں نے اس طرح کا سلوک کیا۔ انہیں اس حد کی اذیت پہنچائی۔

غرض وہاں سے دل میں طے کر کے اٹھا کہ شہزادی کا خیال دل سے نکال کر رہوں گا اور اب اسی طرح کی زندگی بسر کروں گا جو ایک والی ریاست کے بھائی کے شایانِ شان ہے۔

ان سے رخصت ہو کر نکلا ہی تھا کہ اطلاع ملی، بھابھی حضور منتظر ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے خوب لتے لئے۔ ان کو بھی اس کا دکھ تھا کہ میں نے کسی ایسی عورت کا، اپنے لئے انتخاب نہیں کیا۔ جو ان کے ہم پلہ ہوتی، جس سے وہ بہنوں کا سا سلوک کر سکتیں۔ میں نے ہنس کر کہہ دیا ''یہ تو آپ بزرگوں کا کام ہے، آپ نے کیوں تلاش نہ کی''، وہ خوش ہو گئیں، بولیں ''آج ہی لو، میں سرکار عالیہ کا عندیہ لے لوں پھر دیکھو اس کی بجائے ایک چاند سی دلہن نہ لے آئی تو تم ہی کہنا''۔ انہوں نے اسی دن سے کچھ اس طرح کی جوڑ توڑ لگائی کہ ہمسایہ ریاست کے والی کی صاحبزادی سے جس کا بقول مشاطہ ''ایک گال

چاند تھا تو ایک گال سورج" ایک ہی ہفتہ کے اندر رشتہ طے پایا اور یہ بھی طے ہو گیا کہ سرکار عالی کا سوگ اترتے ہی یہ چج کی شہزادی میری دلہن بنا دی جائے گی۔ میں نے اس دوران اپنے آپ کو اتنا مشغول بنا رکھا تھا کہ مجھے اپنی شہزادی کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ صبح کو میں مسلسل [illegible] بعد فوجی بارکوں میں چلا جاتا۔ وہاں ایک گھنٹہ تک معائنہ کرتا۔ کچھ مقدمات سنتا۔ بارہ بجے کے قریب واپس آتا، کھانا کھاتا اور فوراً لائبریری میں چلا آتا۔ وہاں مطالعہ کرتا یا لکھتا۔ چار بجے کے قریب چائے پی [illegible] سیر و تفریح کو نکل جاتا اور اسی سلسلہ میں فوجی بارکوں سے ہوتا ہوا آٹھ بجے شب کو پلٹتا۔ کھانے [illegible] بھائی حضور کے پاس بیٹھتا۔ اکثر ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ کبھی ان ہی کے ساتھ مے نوشی میں مشغول ہو جاتا، کبھی گھر آ جاتا اور زہرہ ساقی کے فرائض ادا کرتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب تک میں اپنے حواس میں رہتا میں اپنے کو اور زہرہ کو حد درجہ تنفر کی نگاہ سے دیکھتا، لیکن جہاں مدہوش ہوتا تو پھر جسم کی پکار دل کی پکار پر غالب آ جاتی۔

اسی طرح تقریباً دو سال گذر گئے اور وہ دن بھی آ گیا جب میں نئی دلہن کو رخصت کرا کے گھر لایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بلا کی آندھی آئی تھی۔ ہر طرف سے بادل امڈے چلے آ رہے تھے۔ زہرہ و مشتری تو کہاں، ایک ننھا سا تارا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ پھر اس پر وہ گرج کہ الامان۔ ہر جاندار اپنی اپنی جگہ پر سہما خائف بیٹھا تھا مگر ہمارے ہاں محل میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ پھاٹک پر شہنائی بج رہی تھی۔ محل میں بجلی کے رنگین بلبوں اور چکر کاٹتے ہوئے فواروں سے قوس قزح کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ ریاست کے سارے امراء و رؤسا دعوتِ ولیمہ کھانے میں مصروف تھے اور میں دولہا کی مصنوعی متانت سے اپنے ہم سنوں کے مجمع میں کچھ شغل کر رہا تھا کہ اندر سے حکم آیا، میں بلایا جا رہا ہوں۔

میں کچھ جھومتا کچھ جھجکتا اس مقام پر پہنچا جہاں بھابی صاحبہ سہیلیوں کے جمگھٹ میں ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں، مجھے دیکھتے ہی بولیں، "کیا آج کی رات بھی اس موئی شراب کی مدد کی ضرورت تھی"؟

اور قبل اس کے کہ میں اپنی نجات منانے کے لئے کوئی جواب دوں انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا اور قہقہوں کے پھول بکھیرتی چلی گئیں۔

حسن ذاتی کو صنعت گری و فنکاری جس قدر دلآویز و دیدہ زیب بنا سکتی ہے اس کا نمونہ اطلس و حریر میں لپٹا پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر ساکت و ساکن پڑا تھا۔ مستی و مدہوشی پیدا کرنے والے بخورات فضا میں عطر بیزی کر رہے تھے۔ کمرے کی ہر شے قیمتی و رنگین ہونے کی وجہ سے اپنی جگمگاہٹ سے آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور پھاٹک پر بجتی ہوئی سریلی بانسری کی ہلکی ہلکی سحر کن آواز پاؤں کو ایک خاص تال و سم پر اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نیم وا آنکھیں مسہری پر جمائے، کچھ جھومتا، کچھ لڑکھڑاتا وارفتگی اور سرخوشی کی حالت میں کام و دہن میں ایک خاص طرح کا ذائقہ محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھتا جا رہا تھا دفعتاً کمرے کی ساری

روشنیاں گل ہو گئیں۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرم ریشمی دھاگا جو مجھے مسہری کی جانب کھینچ رہا تھا دفعتاً ٹوٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی شریر نے خاص طور پر اس کمرے کی روشنیاں گل کر کے مجھے اندھیرے میں اپنی منزل اور اپنا مرکزِ کشش ٹٹولنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں پورے محل کے شور و غل نے بتا دیا کہ یہ تاریکی عام ہے۔ میں نے مسہری پر ایک سرسراہٹ محسوس کی اور دروازے کی طرف پلٹا۔ غالباً نئی دلہن بڑی حیرت سے میرا اضطراب دیکھ رہی تھی اور اب اندھیرے نے مجھے ایک تاریک سایہ بنا کر اس کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ حرکت منزل تک پہنچنے کے لئے میرا سہارا بن جاتی لیکن دفعتاً ایک جانا پہچانا نرم نرم ہاتھ مجھے دروازے کی جانب کھینچ لے گیا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا ''شہزادی؟''

کان کے قریب سرگوشی کر کے جواب دیا گیا ''ہاں! باہر چلئے''۔۔۔ اور میں خاموش ساتھ ساتھ ہو لیا۔ لان پر دو گھوڑے تیار کھڑے تھے، بھائی حضور کا مشکی اور میرا ابلق۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چور دروازے سے ہو کر جہاں آج اس ہنگامے میں کوئی پہرہ نہ تھا محل سے باہر نکل گئے۔ میں نے شکایتوں کا باب جب کھولا تو شہزادی کے جواب نے مجھ میں باز پرس کا یارا باقی نہ رکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے سر کو جھٹکا دے کر بولی ''میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارا معصوم پہلی سانس کھلی فضا کی جگہ کہیں اور لے''۔

اب حرف و حکایت تھی تو اس کی کہ وہ کیسا ہے، کہاں ہے، کب پیدا ہوا اور اس وقت اس کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟ اس حکایتِ شیریں کو اس نے دراز سے دراز تر کر کے بیان کیا۔ میرا دل ہی نہ بھرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ اس افسانہ کی جلدیں بڑھتی ہی چلی جائیں۔ ہم ساری رات چلتے رہے، کبھی تیز کبھی آہستہ، مگر اس پورے طویل سفر میں مجھے ایک سیکنڈ کے لئے نہ تو بھائی حضور کے غم و غصہ کا خیال آیا اور نہ وہ غریب قمر چہرہ دلہن یاد آئی جو میرے اس طرح غائب ہو جانے سے مختلف طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنی ہوئی۔ دو سال سے بچھڑی ہوئی شہزادی میرے ساتھ تھی، مجھے کسی اور سے کیا مطلب؟

صبح کے قریب ہم ریاست کی حدود سے باہر بنجاروں کے ایک ڈیرے میں پہنچے۔ وہاں پہلی دفعہ اپنے نورِ نظر کو شمع جلا کر دیکھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے پالنے میں سو رہا تھا۔ پہلی نظر میں ہی وہ بھولی صورت میرے دل میں اتر گئی۔ ہو بہو شہزادی کی تصویر تھی۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ، وہی غزالی آنکھیں اور سوتے میں وہی ہلکی مسکراہٹ جو میں نے بارہا شہزادی کے چہرے پر دیکھی تھی اور جس نے اکثر راتوں میں مجھ سے میری نیند چھین لی تھی۔ ہم دونوں اس پر جھک پڑے۔ کبھی جگر پارے کو دیکھتے، کبھی ایک دوسرے کو۔ شہزادی کی نظر میں غرور تھا، افتخار تھا، تفخر تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھاتے وقت ایک کامل صناع کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہ کہتی تھیں ''دیکھی تم نے میری تخلیق؟ بھلا یہ پھول تمہیں شیش محل میں کہاں نصیب ہوتا؟ یہ تو بہاروں کا نچوڑ ہے۔ کھلی ہوا، آزاد فضا اور شبنم و یاسمن، لالہ و گلاب، سنبل و بنفشہ کی آمیزش و خمیر وہاں کہاں نصیب؟

میری آنکھیں بار بار اس تفریق میں منہمک تھیں کہ ان دونوں میں سے دلربائیت کس میں زیادہ ہے۔ ہلال میں یا بدر میں، غنچۂ ناشگفتہ میں یا گلاب تازہ میں۔

بچہ نے ماں کی خوشبو پائی، سوتے میں کلبلایا، اس کے پنکھڑیوں جیسے لب ہلے اور اس نے ''امی امی!'' کہہ کر ادھر کروٹ لی جدھر شہزادی کا چہرہ تھا۔ اور میں نے شہزادی کی وہ تصویر دیکھی جو پچھلی تینوں تصویروں سے بھی زیادہ دلکش تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سنہری ہر روز سی۔ اس کی آنکھوں میں ایک برق سی کوندی۔ اس کی کنپٹی کی سبز سبز رگیں تنیں اور پھیلیں، اور اس نے جھک کر بچے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں کے گرد ایک سفید ہالہ بن گیا۔

اس نے پھر مڑ کر سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے سگریٹ پیش کی۔ وہ دو تین لمبے لمبے کش لگا کر بولا ''میں نے بہت دنوں سے کوئی اچھی سگریٹ نہیں پی تھی۔ آج آپ نے پلائی تو شہزادگی کے دن یاد آ گئے''۔ پھر اس نے سگریٹ کو فرش پر رگڑ رگڑ کر چور چور کر دیا۔ جیسے وہ اپنی ان ساری یادوں کو خاک میں ملا رہا ہے جو شہزادی سے ملاقات کے قبل والی زندگی سے متعلق تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

''ہم نے دو برس عجیب طرح کی خوشی میں گذار دیے۔ کبھی ہم جھونپڑیوں میں سوئے، کبھی اپنی چھوٹی سی راوٹی میں، کبھی ہم نے درختوں کے نیچے بستر جمایا، کبھی ہم نے جنگلوں میں شاخوں پر بسیرا کیا۔ مگر ہر لمحہ مسرت سے لبریز تھا۔ ہر وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہا ہوں جس کے لئے میری تخلیق ہوئی تھی۔ مجھے کبھی بھی بنجاروں کے مجمع میں بیٹھ کر اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔ میں نے کبھی ان کی سادہ و جفاکش زندگی میں کوئی غیریت نہیں پائی۔ انہوں نے مجھ کو اپنا لیا تھا اور میں نے ان کو۔۔۔

جب ریاست کا کوئی جاسوس یا پولیس کا کوئی سپاہی ہمیں ڈھونڈتا ہوا ان کی جانب آ نکلتا تو ہمیں بہت پہلے سے اطلاع ہو جاتی اور ہم کسی قریب کے جنگل میں کچھ دنوں کے لئے روپوش ہو جاتے۔ پھر ہم نے کسی ایک ٹولی کے ساتھ ایک ماہ سے زیادہ بسر نہ کیا۔ ہم ان خانہ بدوشوں کے جس گروہ میں پہنچ جاتے، شہزادی ان کی لڑکی ہوتی اور میں داماد۔ ہر ایک ہماری آؤ بھگت کرتا اور دل و جان سے ہماری خدمت پر مستعد دکھائی دیتا۔ ہم نے ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ لیکن شہروں کے قریب پہنچتے ہی ہم ہمیشہ ان میزبانوں کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ہم جانتے تھے شہروں میں پولیس کے اڈے ہیں اور ان کے پاس ہمارے حلیے۔ پہلے ایک ریاست کو میری گرفتاری کی فکر تھی اب دو ریاستیں میری تلاش میں ہیں۔ اس لئے آزادی کی زندگی دیہاتوں میں تھی، پہاڑوں میں تھی، جنگلوں میں تھی۔۔۔ شہزادی اور میں نے فرار کے وقت اتنا کچھ اپنے ساتھ رکھ لیا تھا کہ وہ ہماری عمر بھر کے لئے بہت کافی تھا''۔

وہ رک کر کچھ سوچتا رہا۔ اس کی نظریں فضا میں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے لمبی سانس

لے کر کہا'' ہمالیہ کی وادی میں میری پہلی بار نمو سے ملاقات ہوئی۔ نمو اپنی ٹولی کا سردار تھا۔ چھ فٹ لمبا، گورا چٹا، خاصا وجیہہ، بن بھی پچیس سے زائد نہ تھا۔ کالے کالے بالوں پر اس کی چھوٹی گلابی پگڑی اور اس کے کانوں میں سونے کے موٹے گول چھلے بڑے اچھے لگتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں کپلائی ہوئی آگ بھی تھی۔ اس کا انداز بھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ خلوص اور وہ تپاک جو عام طور پر میرے معاملے میں ہر ایک نے ظاہر کیا تھا اس کی بھی نمو کے ہاں کمی محسوس ہوئی۔ وہ بے موقع ہنس پڑتا تھا اور باتیں کرتے کرتے دفعتاً چپ ہو جاتا تھا۔ اس میں ایک اضطرار تھا۔ ایک بے چینی تھی۔ مجھے تعجب ہوا اور میں نے تنہائی ہوتے ہی شہزادی سے اس کا ذکر کیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے بتایا کہ کسی زمانے میں نمو سے اس کا رشتہ تھا۔ بس شادی ہونے والی تھی کہ بیچ میں میں پھاندا اور شہزادی کی زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

میری محبت میں پہلی دفعہ رقابت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ناگ پھنی کے انبار میں ڈال دیا۔ میں اس تکلیف سے بے چین ہو کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں مسلموں دور نکل گیا میرے دماغ میں بس ایک چرخی سی چل رہی تھی۔ میری شہزادی اور نمو یعنی میرے ناموس پر دوسرا بھی نظر ہوس ڈال سکتا تھا۔ میں شہزادہ تھا۔ دسیوں پشتوں سے ہماری بیویاں محلوں میں رہتی تھیں، وہی جو فخر یہ کہتی تھیں کہ برہنہ نہ دیدہ تم آفتاب۔ اور آج ایک بنجارے کی یہ ہمت! مجھے یہ یاد نہ تھا کہ میں خود بھی اب بنجارہ ہوں۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ شہزادی بنجارن ہے جسے میرے ساتھ بھالی حصور بھی غوطہ لگاتے دیکھ چکے ہیں۔ میں یہ بھی فراموش کر گیا کہ میں نے واقعی شہزادی سے نکاح نہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی نہ رہی کہ نمو سے اور اس سے صرف سگائی ہوئی تھی، معشوقہ اور محبوبہ تو وہ میری ہی تھی!

دل میں اٹھنے والے اس طوفان کے شور میں نہ تو مجھے اس کا خیال رہا کہ میں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہا ہوں اور نہ اس کا دھیان رہا کہ شام قریب ہے، میں ایک چٹان پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر تو میں اپنے خیالات میں اتنا محو رہا کہ میں نے کسی طرف نظر ہی نہ ڈالی۔ دفعتاً کچھ دور پر ایک مکڑ بھگا چیخا اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکرائی اور اس کی بازگشت سے ساری وادی گونج اٹھی۔ میں نے چونک کر چہار جانب نظر ڈالی، سامنے بہت دور ہمالیہ کی برف کی ڈھکی چوٹی پر ڈھلتے آفتاب نے سنہری ملمع چڑھا دیا تھا اور بلند درختوں کے اونچے سر سبز سروں پر ایک زرتار گوٹ ٹانک دی تھی۔ نشیب میں لمبی گھاس والے میدان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی نے انہیں بھلوئی کھال سے ڈھک دیا ہے۔ چٹان کے نیچے جو گہرا غار تھا وہاں روشنی کی جگہ دھندلکا تھا اور اس میں بہنے والے چشمہ کے پانی کو تاریکی نے کاہی بنا دیا تھا۔ ہوا مرطوب تھی اور ٹھنڈی بھی، منظر دلفریب تھا اور فرحت بخش، لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ ڈر سا لگنے لگا جیسے ہر چٹان کے پیچھے کوئی دشمن بیٹھا ہے اور ہر تاریک گوشے میں کوئی حملہ آور۔۔۔ اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کا گھوڑا چڑھا لیا۔ میری سانس کچھ تیز چلنے لگی اور میں چٹان سے جلدی جلدی اترنے لگا۔ میرے پاؤں ابھی

زمین پر پہنچے نہ تھے کہ دفعتاً بن سے ایک تیر آیا اور میرے دوش کی آستین کو چھیدتا ہوا گزر گیا۔ میں نے اپنے پ[illegible] کو زمین پر گرا دیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مگر [illegible] فاصلے پر ایک جھاڑی [illegible] ہل رہی تھی جیسے کوئی اس میں چھپا ہے۔ میں نے بے سمجھے بوجھے اس کو نشانہ بنا کر دو فائر کر دیے۔ تھوڑی [illegible] میں تقریباً دو منٹ تک اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ تاریکی سرعت سے بڑھتی جا رہی تھی۔ خیمہ تک راستہ میں شیب و فراز تھے۔ دشمن [illegible] مقابلہ نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ کمین گاہ سے چھپ کر میرے لئے ہر منٹ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ [illegible] بیٹھے لیٹے جھاڑی کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ ہر لحہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب جھاڑی کے پیچھے سے [illegible] مجھے [illegible] تیر کا نشانہ بنانے ہی والا ہے، پھر بھی جی یہی چاہتا تھا کہ حملہ آور کی ایک جھلک دیکھ لوں [illegible] ہے تو میں بھی اس پر وار کروں۔۔۔ اسی طرح جھاڑی جب کوئی دس قدم رہ گئی تو میں نے اپنی ٹانگیں [illegible] جھاڑی [illegible] گیا۔ اس جانب کوئی بھی نہ تھا، ہاں اس سے آگے ایک ٹیلے پر ایک سیاہ سایہ سا بھاگتا نظر [illegible] نے پھر فاصلہ کا خیال کئے بغیر فائر کر دیا اور اس کے تعاقب میں دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ حملہ آور بھاگ رہا ہے [illegible] اپنے حواس درست کر کے پھر کوئی کمین گاہ ڈھونڈ سکے۔ اسی لئے میں بھی تیزی سے [illegible] ٹیلے [illegible] دوسری جانب پھر کوئی نہ دکھائی دیا۔ راستے میں اب بھی کئی چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کے پیچھے چھپ [illegible] لے سکتا تھا۔ اس لئے میں نے قریب ترین چٹان کی طرف رخ کر کے پھر فائر کر دیا اور ٹیلے سے [illegible] اس طرف [illegible] جلدی اور تاریکی میں چھوٹا پاؤں پڑا اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ چوٹ زیادہ نہ آئی۔ لیکن دم پھول گیا اور میں کئی منٹ تک پڑا پڑا اپنی سانس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا اور میں نے سنا، کوئی مجھے پکار رہا ہے "شہزادے، شہزادے" اور ساتھ ہی تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

میں چیخا "یہاں، یہاں" اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد شہزادی اپنے مشکی پر سوار وہاں آ پہنچی۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا؟ کس پر فائر کیا"؟

میں نے کہا "گھر چلو، پھر بتاؤں گا"۔ اور ہم دونوں ایک ہی گھوڑے کی پیٹھ پر خیمہ تک آئے۔ راستے میں میں نے شہزادی کے اصرار پر اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ مگر جب میں گھوڑے سے اترا تو وہ اسی طرح اس پر بیٹھی رہی۔ میں نے سمجھا وہ گھوڑوں کے لئے گھاس اور دانے کا انتظام کر کے آئے گی۔ میں خیمے میں چلا آیا۔ مجھے تھکن محسوس ہوئی جیسے میں بڑی منزل مار کر آ رہا ہوں، جیسے میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور تھوڑی دیر کے لئے اسی طرح مسہری پلنگ پر لیٹ گیا، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ اسی ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ یہ کس نے تیر مارا۔ اس جنگل میں آبادی سے دور کون دشمن پیدا ہو گیا۔ کیا بھائی حضور کے جاسوس یا میری سسرال کے آدمی یہاں بھی پہنچ گئے۔ مگر نہیں میری گرفتاری کی فکر ہوتی نہ کہ قتل کی۔۔۔

میں اسی طرح الجھ رہا تھا کہ دفعتاً خیموں میں ایک شور سا ہوا۔ جیسے بہت سے لوگ جوش میں باتیں کر

رہے ہیں۔ کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

سارے خیموں کی بتیاں ایک دائرے میں بانس گاڑ کر لٹکا دی گئی تھیں۔ لکڑی کے ایک بڑے ڈھیر کا الاؤ سلگ رہا تھا اور سارے بنجارے اس روشن مقام پر جمع ہو رہے تھے۔ بیچ میں کچھ بوڑھے شمو کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہزادی بپھری کھڑی تھی۔ وہ شمو کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں ادھر لپکا، میں نے سنا

"ہاں شمو نے ہی میرے دولہا شہزادے سے شادی کی۔" میں اپنا ذکر سنتے ہی ایک درخت کے پیچھے جہاں اندھیرا تھا لپک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی آج اپنے پنچوں کے سامنے کوئی مقدمہ پیش کر رہی ہے۔ میں بھی چپ سادھے دیکھوں میری شہزادی کو اس کی قوم والے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ تھا، وہ غصہ سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کی بوٹی بوٹی میں ایک بجلی سی کوند رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صاعقہ بن کر کسی نہ کسی پر گرے گی اور اسے خاکستر بنا دے گی۔ وہ کہہ رہی تھی "آپ ہی سے انصاف چاہتی ہوں، شمو کا اور شہزادہ کا کوئی مقابلہ ہے؟ صورت میں، شکل میں، ذات میں، لیاقت میں، عزت میں، ہنر میں، علم میں یہ کس چیز میں ان کی برابری کر سکتا ہے"؟

مجمع میں سے ایک بولا "ہم خود شہزادے ہیں، ہزاروں برس ہم نے بادشاہت کی ہے"۔

شہزادی پلٹ پڑی "ضرور، مگر آج تو ہم اچکے ہیں، چور ہیں، بدمعاش ہیں، شہروں میں جاتے ہیں تو پولیس ہماری نگرانی کرتی ہے، نہ ہمارے مکان ہیں، نہ ایک بالشت زمین، ہم چھکڑے لگائے پھرتے ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی اپنے کو ہم سے اچھا سمجھتا ہے"۔

ایک نوجوان خفا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "اگر کوئی ہمیں ذلیل سمجھتا ہے تو وہ خود ذلیل ہے۔ ہم جنگلوں کے بادشاہ ہیں ہم کسی کا دیا نہیں کھاتے۔ ہم اپنا قانون خود بناتے ہیں...." ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر ڈانٹا "تم بیٹھ جاؤ شمو! شہزادی نے ہمارے سامنے مقدمہ دائر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے شمو نے آج ہمارے مہمان شہزادے پر تیر چلایا۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہم کیا فیصلہ دیں۔ . "

شمو کھڑا ہو گیا۔ سب خاموش ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ نصف منٹ تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجمع پر نظر ڈالی، اور بولا:

"شہزادی کا الزام صحیح ہے، میں نے تیر مارا" اور مجھے بڑا تعجب ہے کہ وہ کیونکر بچ گیا۔ تم جانتے ہو میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔.. خیر!... میں تم لوگوں کا سردار ہوں۔ میں تمہارے فیصلے سے پہلے اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں میں شہزادی کے چہیتے سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تلوار سے، تیر سے، پیاتو سے۔ جو ہتھیار اس کو پسند ہو اس سے"۔

مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی، ایک شور سا اٹھا "ہم سب کو منظور! منظور!"

شہزادی جھپٹ کر سامنے آ گئی "مجھے ہرگز منظور نہیں۔ وہ شہزادہ ہے، وہ پستول، بندوق چلانا جانتا ہے۔ وہ چاقو اور تیر کیا جانے؟
نمو سے مقابلہ میں کروں گی! میں"۔

"چھپالو شہزادے کو اپنے گھاگرے میں"! ایک نوجوان نے طنز کیا

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں لپک کر مجمع کو چیرتا ہوا نمو کے پاس پہنچ گیا۔ سب حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں ساری تعلیم، سارا فلسفہ، ساری تہذیب، ساری ثقافت بالکل بھول گیا۔ میں اس وقت بالکل وحشی تھا۔ میں نے کہا۔

"بھائیو! نمو نے مجھ پر چھپ کر حملہ کیا، میں بچ گیا۔ میں اس کا کوئی قصاص نہیں چاہتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا"۔۔۔

اور تو چپ رہے مگر ایک بوڑھا بول اٹھا "بھئی بڑے کی بڑی بات"۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ میں نے کہا "مگر نمو نے ابھی مجھ سے مقابلہ کی خواہش ظاہر کی ہے۔ میں اسے قبول کرتا ہوں۔ چھرے سے، تلوار سے یا پستول سے، ان میں سے جس حربے میں وہ اپنے کو ماہر سمجھتا ہو، میں مقابلے کے لئے تیار ہوں"۔

شہزادی چیخی "نہیں! نہیں!"

میں نے اسے ڈانٹا "تم چپ رہو، عورتوں کے مجمع میں جا کر بیٹھو"۔

جب وہ گردن جھکائے عورتوں کے مجمع کی طرف چلی تو میں نے نمو سے پلٹ کر کہا "تم کس حربے سے لڑو گے"؟

نمو نے مسکرا کر کہا "چاقو"۔ اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس نے ایک سگریٹ جلا لی۔ شہزادی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا "نہیں! نہیں! شہزادہ چاقو سے لڑنا کیا جانے"؟

ایک نوجوان غرا کے بولا، "شہزادی بنجارن ہے، وہ اسے جیتنا چاہتا ہے تو ہمارے ہی حربوں سے لڑنا پڑے گا"۔

"نہیں، نہیں" اور "ہاں، ہاں" کا شور اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ نمو اس فن کا ماہر ہے۔ سارے مجمع کا اندازہ بتاتا تھا کہ اسے نمو کی جیت اور میری ہار کا یقین ہے۔ مگر مجھے مطلقاً خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بچپن میں ہر حربے کا استعمال سکھایا گیا تھا، لیکن جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں مجھے کھیل کود، جنگ و جدل سے زیادہ مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا۔ میں نے سوائے پستول کے کسی دوسرے حربے کے استعمال میں مہارت نہیں حاصل کی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جیتوں گا میں ہی۔ نمو منہ کے ایک کونے میں سگریٹ

دبائے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی زردی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتھنے پھیلنے سمٹنے لگے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکا دل بڑے زور سے دھڑک رہا ہے۔ غالباً اس کی یہ گھبراہٹ ہی میری خود اعتمادی کو مضبوط و مستحکم بنا رہی تھی۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نمو کے طرفدار نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''میرے دوست نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی کے لئے اسی حربے سے لڑنا پڑے گا جو آپ کا قومی حربہ ہے''۔ معاً خیال آیا کہ نمو کی گھبراہٹ میں کیوں نہ اضافہ کر دیا جائے۔ جیب میں پڑے ہوئے پستول کو میری انگلیاں بار بار چھو رہی تھیں۔ خود بینی نے بھی مجھے اپنی مہارت کی نمائش کی طرف اکسایا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور نمو کی طرف مڑ کر کہا ''میری پسند کا حربہ تو یہ ہے'' اور ساتھ ہی ایک فائر کر دیا۔ نمو کے منہ میں لگی ہوئی سگریٹ آدھی کٹ کر اڑ گئی اور پورا مجمع چیخ اٹھا۔ ''ارے مار ڈالا''۔ نمو لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا ''ڈرو نہیں نمو، میں نے سگریٹ کو نشانہ بنایا تھا، تمہیں نہیں'' وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر دیکھی۔ پھر اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کا داہنا ہاتھ تیزی سے کمر تک گیا اور اس نے وہیں سے چاقو نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں اپنی حرکت کے ردعمل کے لئے تیار تھا۔ میں نے صدری سے پیشتر اپنا ہاتھ بڑھایا مگر میرے قریب ہی بغل سے ایک دوسرا چاقو سن سے گذرا۔ ہوا میں دونوں چاقو ٹکرائے اور دونوں زمین پر گر گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہزادی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے نمو کو غصے سے ہانپتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر بولی، ''شہزادے کے منہ میں کہاں سگریٹ تھی کہ تم نے نشانہ لگایا تھا نمو''؟

مجمع کو ان جلد جلد ہونے والے واقعات کی سرعت نے بولنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اب شہزادی کے سوال پر پھر ایک شور سا اٹھا۔ ''شہزادے نے بھی اس پر فائر کیا تھا''۔۔۔ ''شہزادے نے اس پر نہیں سگریٹ پر فائر کیا تھا'' ''جھوٹ ہے'' ''سچ ہے''۔ میں نے خاموشی کے لئے پھر ہاتھ اٹھایا۔ وہ چپ ہوئے تو میں نے پہلے شہزادی کو ڈانٹا ''ایسے موقعوں پر مردوں کے بیچ میں عورتوں کا دخل دینا میں اچھا نہیں سمجھتا، تم بیٹھ جاؤ''۔ اس کا منہ تمتما اٹھا مگر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے مجمع سے کہا ''آپ لوگوں کو میرے نشانے پر شک ہے۔ اچھا تو میرے خیمے سے تین موم بتیاں لے آیئے''۔۔۔ ایک ان میں سے دوڑ کر تین موم بتیاں لے آیا۔ میں نے نمو کو اس کی جگہ سے ہٹا کر ایک تپائی رکھوا دی اور تینوں موم بتیاں جلوا دیں۔ پھر ہر ایک کو اس جانب سے ہٹا کر میں نے اپنے مقام سے کھڑے کھڑے تین متواتر فائر کئے۔ جب تینوں موم بتیاں بجھ گئیں تو میں نے کہا ''اب بتیوں کو دیکھئے، کوئی بتی کٹی یا ٹوٹی تو نہیں''۔ شہزادی سب سے پہلے لپکی ہوئی دوڑی۔ اس نے تینوں بتیاں اٹھا کر دکھائیں۔ سوائے فتیلہ کے کوئی حصہ نہ کٹا نہ ٹوٹا تھا۔ مجمع واہ واہ کرنے لگا۔

میں نے کہا ''آؤ نمو، اب ہمارا تمہارا انجام دل سے حرب میں طے ہو جائے۔'' اور میں نے کوٹ اتار ڈالا، قمیص اتار ڈالی، صرف شلوار پہنے رہا۔ نمو نے اپنا کرتا اتارا، تہبند کو خوب پھینٹ دی۔ وہ پہلے ہی سے چست جانگھیا پہنے تیار تھا۔ دو بوڑھوں نے اپنی اپنی کمر سے دو خنجر نکالے۔ ان کے وزن اور قد و طول کا مقابلہ کیا، دونوں یکساں تھے۔ ایک ہاتھ انہوں نے مجھے دے دیا اور ایک نمو کو، اور سب تماشائی دور حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ عورتیں اور بچے پیچھے کر دیئے گئے۔ چست جانگھئے میں نمو مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ اس کے ہاں تناسب اعضا بلا کا تھا اور خنجر کی گرفت یہ بتاتی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں قدرت تامہ رکھتا ہے۔ سچ عرض کرتا ہوں، میرے دل میں پہلی دفعہ ڈر پیدا ہو گیا۔ میں خنجر کے استعمال سے پوری طرح واقف تھا۔ پھر مشق چھوٹی ہوئی تھی۔ بس اتنی امید تھی کہ میں ''جوجتسو'' سے واقف ہوں، نمو مجھے آسانی سے زیر نہیں کر سکتا۔ اس وقت نمو کا کسرتی پھرتیلا جسم دیکھ کر مجھے اس مقابلہ کے نتیجہ کی طرف سے شبہ ہو گیا۔ ممکن تھا کہ یہ جذبہ بڑھتا مگر نمو نے بڑھ کر وار کر دیا اور میں نے پینترا بدل کر اسے خالی دے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھلا اور ہم دونوں وار کرنے اور بچنے کے لئے پینترا بدلنے لگے۔ میں نے چند ہی منٹ میں محسوس کیا کہ نمو جس پھرتی سے وار کرتا ہے یا جھکائی دیتا ہے وہ میرے ہاں مفقود ہے۔ اگر آنکھ جھپکی تو خنجر سینے سے پار ہو گا۔ مجھے استاد کا قول بھی یاد آ گیا: ''دست بدست لڑائی میں دشمن کے جسم کی حرکت نہ دیکھو، صرف آنکھوں کو دیکھتے رہو، وہیں سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کیا قصد ہے''۔ اسی لئے میں نمو کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے تھا اور اس کے ہر وار کو روکنے یا خالی دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ مجھے خود وار کرنے کا اب تک موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک امر البتہ میرے لئے باعث مسرت تھا کہ میرا جسم خشک تھا، میری سانس نہ پھولی تھی، اور نمو پسینے میں نہا گیا تھا اور وہ تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ غالباً نمو نے بھی اس فرق کو محسوس کیا، اس لئے کہ وہ وار کرتے کرتے ایک دم پیچھے ہٹا اور بجائے اس کے کہ وہ پینترا بدل کر میرے وار سے بچے اس نے اچھل کر پوری قوت سے میرے سینے پر لات ماری۔ میرے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا اور میں زمین پر چت گر پڑا۔ وہ اچھل کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے بھرپور ہاتھ مارنے کے لئے خنجر اٹھایا۔ میں اتنی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس کا جسم میرے جسم سے مس ہو جائے اور میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچ جائے۔ نمو نے یہ موقع مجھے اپنی حماقت سے دے دیا۔ اس کا خنجر میرے سینے میں پیوست ہونے کے لئے حملہ آور سانپ کی طرح تیزی کے ساتھ چلا۔ میں نے بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر جھٹکی دی۔ خنجر تو چھن سے جا کر دور گرا اور میں جوجتسو کا پیچ کر کے نمو کی پیٹھ پر تھا اور اس کی دونوں کلائیاں میرے ایک ہاتھ میں تھیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ کر میں نمو کو ہمیشہ کے لئے لولا کر دوں مگر میں نے غصہ کو ضبط کیا۔ جاہل تھا، وحشی تھا، میری فتح اس کو ذلیل کرنے میں ہی تھی۔ میں نے اسی لئے وہیں سے جیتے

جیتے بوڑھوں سے کہا ''اس سمو نے مجھے دوبار مار ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ آخری حملہ بھی اسی نیت سے تھا۔ میں بدلہ لے سکتا ہوں۔ ایک ذرا سی حرکت میں اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن میں اپنے کو اس کی سطح پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اسکی پھر جان بخشی کرتا ہوں''۔

میں نے اپنی پیٹی، بوٹ کندھے پر ڈالا۔ سمو کو اس کے دو ساتھیوں نے سنبھال کر اٹھایا۔ وہ اس کا منہ دھلا کر پانی پلانے کے لئے ایک طرف لے گئے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور مجمع پر نظر ڈال کر کہا ''میں نے بنجارہ بننے کی کوشش کی۔ آپ لوگوں نے بننے نہ دیا۔ شہزادی یقیناً آپ کی ہے وہ میری نہیں ہو سکتی۔ ایک بار وہ مجھے چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ آج میں اسے چھوڑ کر جاتا ہوں''۔

شہزادی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میں نے اسے ڈانٹا ''تم محض نام کی شہزادی ہو۔ تم ان بنجاروں کی بہو ہو، میری نہیں۔ میں نے اپنے کو بہت گرایا۔ اب اس سے زیادہ نیچے نہیں گر سکتا''۔

اور میں نے جلدی جلدی اپنے گھوڑے پر زین کسی اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شہزادی خوشامدیں کرتی رہی، بنجارے بنجارنیں روکتی رہیں مگر میں نے ایک نہ سنی۔ شاید کئی پشتوں کی روحیں اپنے غرور، تمکنت، جلال و جبروت کے ساتھ میرے دل و دماغ پر اس وقت مسلط تھیں۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ میں حد درجہ رسوا ہوا۔ میری بے انتہا ذلت کی گئی۔ مجھے اس شہزادی سے نفرت تھی۔ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے سے نفرت تھی اور اس پوری زندگی سے نفرت تھی جو میں نے اس کے عشق میں کاٹی تھی، اور میری دماغی حالت ایسی تھی کہ اگر کوئی اس وقت میرا تعاقب کرتا تو شاید میں اسے مار ڈالتا۔

میں سات روز رات دن سفر کرتا رہا۔ بس کچھ گھنٹوں کے لئے کسی چشمے، کسی دریا، کسی کنوئیں کے کنارے یا کسی ہرے بھرے میدان میں سو رہتا۔ میں نے اس دوران میں کیا کھایا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ دو ایک دن تو جنگلی میووں پر بسر ہوئی۔ ایک دن پستول سے ایک تیتر شکار کیا تھا۔ اسے آگ پر بھون کر بغیر نمک کے کھایا۔ ایک دن ایک مچھلی چشمے میں پانی پیتے وقت بہت آسانی سے ہاتھ آ گئی، وہ بھوبھل میں بھون کر کھائی۔ ایک دن ایک دیہاتی مسجد میں شب بسر کی، وہاں نمازیوں نے اپنے گھروں سے لا کر کچھ کھلایا پلایا تھا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے اتنی مدت تک شکم سیر ہو کر کبھی نہ کھایا اور نہ میں نیند بھر سویا۔

آٹھویں دن میں ریاست کی حدود میں داخل ہوا اور اسی شام کو اپنے محل میں۔۔۔ میں نے حمام کیا کپڑے بدلے اور بھائی حضور کے سلام کو حاضر ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ فرماتے، میں نے دست بستہ عرض کی ''میرا جنونی دورہ ختم ہو گیا۔۔۔ میں سزا کے لئے حاضر ہوں''۔

ان کی غصہ بھری نگاہیں محبت بھری نگاہوں میں بدل گئیں اور انہوں نے مجھے سینہ سے لگا لیا اور مجھے ساتھ لئے ہوئے اندر آئے۔ وہاں بھابھی صاحبہ سے بھی میں نے معافی مانگی اور سرکار عالیہ سے بھی۔۔۔

اس نے رک کر پھر میری سگریٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، میں نے جلدی سے ڈبیا بڑھا دی۔

ں نے حسب معمول ایک سگریٹ جلا کر چند لمبے لمبے کش لئے اور [illegible] میں پھینک دیا۔ پھر وہ بولا

''میں نے تقریباً ایک سال ایسی جو زندگی بسر کی تو آپ کے معمولات میں دو فرق ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ زہرہ کی جگہ اس دلہن نے لے لی تھی جو دو برس سے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کا حسن یقینی چاند [illegible] تا تھا لیکن اس کی محبت چاندنی کی طرح ہلکی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ اس میں شہزادی جیسی تندی تھی نہ [illegible] نہ مدہوشی، اسی لئے پھر وہی شراب نوشی شروع ہو گئی تھی سرخوشی اور بے خودی لے کے لئے [illegible] تھا۔ دوسری بات جو اس شراب کی بالکل ضد تھی اس کی بھی میں نے عادت ڈال دی تھی۔ صبح میں [illegible] ورزش کرنا اپنے اوپر فرض کی طرح عائد کر لیا تھا۔ اس سے فارغ ہوتے ہی میں تقریباً [illegible] میں صرف کرتا تھا۔ میں نے ریاست کے سب سے بڑے بانک اور بنوٹ جاننے والے کو ملازم رکھ لیا تھا اور اس کی زیر ہدایت قدیم ہندوستانی حربوں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لینا طے کر لیا تھا۔ اس ورزش سے میری صحت بھی درست رہی اور مجھ پر مے نوشی کا زیادہ برا اثر نہ پڑا۔ غرض زندگی ایک ڈھرے پر لگ گئی تھی اور ظاہر بیں نظریں اس کا یقین کرنے لگی تھیں کہ میں شہزادی کو بھول چکا ہوں اور اس بے کیف ہموار طرز حیات کا عادی ہو چلا ہوں کہ دفعتاً ایک رات جب میں گیارہ بجے قصرِ معلیٰ سے اپنے محل واپس آ رہا تھا۔ ایک شخص میری موٹر کی روشنی میں دونوں ہاتھ پھیلائے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے موٹر روک کر پوچھا

''کون ہے۔۔۔''؟

وہ بولا ''نمو''۔

میں نے اندر کی روشنی جلا کر جب دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ نمو کے دونوں ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہیں اور اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے۔۔۔

میں نے گھبرا کر پوچھا ''کیا بات ہے نمو، کیسے آئے''؟

وہ ہانپتا ہوا بولا ''سرکار، شہزادی یہاں سے بیس میل پر مر رہی ہے۔ اس نے بلایا ہے''

میں نے نمو کو اندر کھینچ لیا اور ڈرائیور سے کہا ''موٹر پھاٹک تک لے چلو''۔

وہاں پہنچتے ہی میں نے سنتری سے اس کی بندوق اور کارتوس کی پیٹی لی، اور ڈرائیور کو موٹر چلانے کا حکم دیا۔

جب ہم شہر کی حدود سے باہر نکل گئے تو میں نے نمو سے پوچھا۔

''کیا بیمار تھی شہزادی''؟

وہ عجیب طرح ہنسا ''بیماری۔۔۔؟ بیماری، آپ کی محبت۔۔۔'' پھر وہ رک کر بولا ''اسے کل بھیڑیے نے کاٹ لیا ہے۔ وہ مر رہی ہے''۔

میں نے جھلا کر نمو کو گھورا۔ اس پاگل نے شہزادی کی موت ہنسی کی بات ہے۔

پھر میں نے ذرا زور سے کہا

''اور تیز چلو۔''

ہم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے نصف گھنٹہ میں وہاں پہنچ گئے جہاں شہزادی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ صرف اس کا چہرہ کھلا تھا۔ اس کے چہرے کو حسن کی خوبصورتی کا مقابلہ وہ تصویریں بھی نہیں کر سکتی تھیں جو فنکار کے دلوں کو جمالیات کا سرچشمہ بناتی ہیں۔ اس وقت بھیڑیئے کے پنجوں نے بھیانک بنا دیا تھا۔ ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ ایک گال اس طرح کھایا تھا کہ جبڑے کی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں ... گردن کے پاس کا گوشت نچا ہوا تھا اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو مجروح نہ ہو ... مگر وہ اب تک زندہ تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ ڈولی پڑی رہتی پھر بھی جب آنکھ کھولتی تو ''شہزادہ! شہزادہ!'' کی رٹ لگاتی۔

میں نے کسی نہ کسی طرح پتھر کا دل بنا کر اس تک پہنچایا۔ اس سے باتیں کیں، مجھے معلوم نہیں، میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ ہاں اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ لگاتار کوئی میرے جسم میں چھرے مارتا چلا جا رہا ہے۔ میرا گوشت کھرچ کھرچ کر کاٹ رہا ہے اور میں بار بار کانپتا، بار بار مٹھیاں کس لیتا، بار بار دانت بھینچ لیتا اور شہزادی پر جھکا ہوا اس کی دکھ بھری کہانی سنتا۔ وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔

''تم آ گئے شہزادے! میں نے تمہیں دیکھ لیا، میں تمہیں ہر دوسرے تیسرے روز گل کی جھاڑی کے پیچھے آدھی آدھی رات تک دیکھنے کے لئے بیٹھتی رہتی تھی۔ تم بھول سکتے تھے شہزادی کو، وہ اپنے شہزادے کو نہیں بھول سکتی تھی۔ کل میں جاوید کو بھی ساتھ لے جا رہی تھی۔ وہ ڈیڈی ڈیڈی کی بہت دنوں سے رٹ لگائے تھا۔ میں نے کہا، اس کا منہ دھلا دوں، اچھے کپڑے پہنا دوں، تب لے چلوں۔ اسی لئے پاس والے جنگل میں چشمے پر لے گئی۔ بھیڑیا نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا جھاڑی میں۔ اس نے جاوید کو منہ میں دبا کر بھاگنا چاہا، میں پٹ گئی، اس نے مجھ کو خوب خوب کاٹا، شمو آ گیا اور اس نے مجھے بچا لیا مگر میرا۔۔۔ میرا جاوید۔۔۔''

وہ ایک بار چیخی ''ہائے میرا لال، کہاں ہے میرا چاند''؟ اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ایک بوڑھی بنجارن نے خون سے رنگین ایک تھیلا بڑھا دیا۔۔۔ مجھے چکر سا آ گیا اور میں وہیں بے جان ہو کر گر پڑا۔

اس نے پھر ایک سگریٹ پی اور مسلی، وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا جھوما کیا، پھر وہ بولا

''میں اسی دن سے ان دونوں کی قبر کی مجاوری کرتا ہوں اور پانچ پیسے روزانہ روشنی اور ہار پر صرف کرتا ہوں۔ پانچ پیسے سے زیادہ نہیں! لائیے بابو جی آپ کے پاؤں دبا دوں''۔

اور اس نے اپنے سوکھے ہاتھ میری پنڈلیوں پر رکھ کر انہیں دبایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے برف کی قاش میں

زور زور سے میرے پنڈلیوں میں ملی جانے لگیں، اور میں چیخ مار کر جاگا اور میں نے بے ساختہ اپنی ٹانگیں زور سے جھٹک دیں۔ ایک سانپ پلنگ سے ملی ہوئی کھڑکی پر گیا اور تیزی سے نیچے اتر کر کھیت میں جانے لگا۔ میں نے جھپٹ کر بندوق اٹھائی اور دو فائر کیے مگر وہ ایکھ کے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔

بنگلے کا چوکیدار دوڑا ہوا آیا ''کیا ہوا بابو جی! کیا ہوا''؟

میں نے کہا ''کچھ نہیں جی، سانپ تھا''۔

وہ بولا ''ارے صاحب وہی ناگ بابا ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے ہیں۔ بہت پہلے یہاں کسی کی قبر تھی۔ انھیں نے سانپ کا روپ دھارن کیا ہے''

وہ توہمات کی ایک پوری داستان سنانے کو تیار تھا مگر میں حیات و ممات [illegible] کے سلسلہ لامتناہی پر غور کرنے لگا اور میری زبان پر شاد کا یہ شعر آ ہی گیا۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی　　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

بند گلی

غلام الثقلین نقوی

بند گلی کے انتہائی سرے پر اس کا مکان تھا

اس کونے پر گلی کا ایک لیمپ تھا جس کی روشنی چند گھڑیوں تک اندھیرے سے مصروفِ پیکار رہ کر آخر دم توڑ دیتی۔ یہ گھر تاریک اور سرد تھا۔ اس میں سیلن تھی اور اس سیلن میں صدیوں سے رچی ہوئی سڑاند تھی۔ اینٹیں بھربھری ہو چکی تھیں۔ انہیں کلر، دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ چھت سے مٹی اور دیواروں سے پھپھوندی لگا چونا گرتا رہتا تھا۔ دیواروں کی سفیدی کجلا کر اپنا اصلی رنگ کھو چکی تھی۔ یہ گھر بہت تنگ تھا۔ صرف ایک کمرہ رہائش کے قابل تھا۔ باورچی خانے کی چھت کے ساتھ دھوئیں اور راکھ سے اٹے ہوئے جالوں کے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔

اس گلی میں دھوپ کبھی کبھار چند مریل ٹھٹھری ہوئی کرنوں کا دان دینے کے لئے آیا کرتی تھی۔ صبح سے لے کر شام تک صرف دو چار گھڑیاں ایسی آتیں جب اس گلی کا ابدی اور ازلی اندھیرا دور ہوتا لیکن اس گھر میں روشنی کو بہت کم دخل تھا۔ نجانے سورج کب نکلتا اور کب ڈوبتا لیکن اس کی کوئی بھولی بھٹکی کرن اس گھر میں در آتی تو گھبرا کر یوں لوٹ جاتی جیسے وہ اس تاریکی اور ٹھنڈک سے ڈر گئی ہو۔

یہ مکان اسے بڑی تگ و دو کے بعد ملا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس مکان کو حاصل کرنے کے لئے بہت زبردست مقابلہ تھا بلکہ اس لئے کہ یہ مکان پیچ در پیچ گلیوں میں کھو کر بند گلی کے انجام پر واقع تھا اور ظلمات کی بھول بھلیوں میں سے اسے تلاش کر لینا بھی جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ مدت سے کسی کرایہ دار نے اس طرف رُخ نہ کیا تھا۔ آج تک اس کے عین سامنے کا مکان خالی تھا۔ اس کے بھدے کواڑوں پر تالا لگا ہوا تھا اور یہ تالا زنگ آلود تھا۔

وہ صبح صبح چائے تیار کرتا۔ آگ جلتی تو باورچی خانے کی چھت کے فانوس لہراتے۔ چائے کی دو پیالیاں پی کر اور دو سوکھے رس کھا کر وہ اپنے کام پر چلا جاتا۔ گلیوں کے پیچ و خم سے نکل کر جب وہ سڑک پر آتا تو سورج کھلکھلا کر قہقہہ لگاتا۔ روشنی اور اُجالے کی اس فراوانی پر اُس کی آنکھیں چندھیا جاتیں اور اُس کی کنپٹیاں دھوپ اور روشنی کے اس اچانک لمس سے تھرتھرا اٹھتیں۔ بجھی ہوئی زندگی شعلے کی طرح بھڑکتی تو اُسے کرب اور لذت کی ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوتا!

سہ پہر کو جب اسے چھٹی ملتی تو وہ روشنی اور اُجالوں کی دُنیا کو چھوڑ کر ظلمت کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اُسے

چپچپاہٹ محسوس ہوتی۔ پاؤں بار بار ان میں سے چپکتے۔ گلی سے [illegible] سے چند سیے کچیلے بچے ملتے جو کیچڑ سے کھیل رہے ہوتے اور ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے [illegible] منظر سے اُبھرنے والے نغموں کی طرح تھرتھرا رہی ہوتیں۔ اس میں کبھی [illegible] اختتام قریب آتا گلی کا ہر لمحہ بھی موت کی وادیوں سے آنے والی [illegible] معلوم ہوتا

وہ تین مہینوں سے اِسی گلی میں رہ رہا تھا!

ابھی تک وہ اس گلی کی تاریک اور بدبودار یکسانیت میں رچ نہیں سکا تھا۔ [illegible] عجیب لوگ تھے کہ اُس کے پاس سے سائے کی طرح گزر جاتے۔ [illegible] اندھیروں اور سایوں کے اِس خلا میں ہر شخص اکیلا ہو [illegible] ہر ایک کی انفرادیت اس [illegible] میں گم ہو چکی تھی۔ [illegible] ہڑپ کر رہا تھا۔

زندگی کے آغاز میں موت سے سابقہ پڑ گیا تھا!

وہ نوجوان تھا اور اس گلی میں آنے سے پہلے وہ ایک پُرفضا گاؤں کا زندہ اور [illegible] دل سے بے پناہ محبت تھی۔ اُسے دھوپ، روشنی، تازہ ہوا اور ہری بھری دنیا سے پیار تھا۔ اس گلی میں اُس نے [illegible] زندگی کا تاریک رُخ دیکھا تھا۔

گاؤں چھوڑنے سے پہلے اُس نے بڑے سنہری خواب دیکھے تھے!

شہر کا تصور اِن خوابوں کی دُنیا میں لپٹا ہوا بڑا دلکش معلوم ہوتا تھا۔ صاف اور شفاف سڑکیں۔ ہجوم اور قہقہے۔ سینما اور تھیٹر۔ یاروں کی محفلیں۔ رنگین اور دلنواز چہرے۔ ترچھی نظریں اور دل میں اُتر جانے والی ادائیں اور جب اُسے شہر میں ملازمت ملی تو وہ اپنے گاؤں کی گلیوں کو چھوڑ کر یوں سرپٹ بھاگا جیسے قفس میں بند پنچھی کو مدتوں بعد آزاد اُڑان کی اجازت ملی ہو۔ وہ اُس کے گاؤں کی گلی جب اِس بند گلی کے اینچ پیچ میں گم ہوئی تو اُس کے سنہرے خواب کے پر ٹوٹ کر رہ گئے۔ اب صبح اور شام کے درمیان اِس سنہری خواب کا کوئی پُرزہ حائل ہو جاتا تو وہ حیران ہو کر اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا۔ کیا یہی وہ خوابوں کی دُنیا ہے جس کے لئے وہ اتنا بے قرار تھا؟

گاؤں میں وہ خاصا مقبول اور ہردلعزیز تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ اُس کی شکل و صورت بھی خاصی تھی۔ گٹھا ہوا بدن۔ نکلتا ہوا قد۔ روشن آنکھیں جن میں شبنم کی نمی اور پھولوں کی تازگی تھی۔ گاؤں کی مٹیاریں بھی اُس کے پیار کا دم بھرتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو گاؤں کی لاڈلی تھی کہ ہرے بھرے کھیتوں کی رانی لگتی تھی۔ سارے گاؤں کی آنکھ کا تارا تھی۔ نسیمِ صبح کا بھیگا ہوا جھونکا بن کر گزرتی تو گاؤں کی گلیوں میں کچی کلیوں کی خوشبو بکھر جاتی اور نغموں کا طوفان اُمڈ آتا۔

اِس نغمے نے گلی کے ایک نکڑ پر اُس کے کان میں سرگوشی کی تھی!

اور وہ ایک لے پر اُڑا۔ ایک طوفان نے اُسے شہر میں لا پھینکا تھا۔ اب وہ حیران تھا کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ شہر تو طلسم سیف الملوک سے بھی زیادہ گمبھیر اور پُراسرار تھا کہ گلی بکاؤلی کی تلاش بے سُود ثابت ہو رہی تھی۔ تین ماہ کے بعد اُسے وہ

تھی دل کی بجھی بجھی سی۔ وہ گاؤں کو صرف ہاتھ لگا کر چلا آیا تھا۔ گاؤں کی رانی کی صرف ایک جھلک نصیب ہوئی تھی۔ اُڑتے ہوئے نغمے کو روح میں رچانے کا موقع بھی نہ ملا تھا اور اس اُڑتے ہوئے نغمے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ آسمان کی تلاش میں پھر شہر چلا آئے۔ کارخانے کے منیجر نے کہا تھا ''مسٹر رحیم محنت سے کام کرو گے تو ترقی پاؤ گے۔ چھٹیوں کے پیچھے بھاگو گے تو محنتی لوگ تم سے آگے نکل جائیں گے۔ کام کرو کام''۔

اس شام پھر اس نے اوشا تنہائی میں پناہ لی تو سیلن اور سڑاند نے لپک کر اس کا استقبال کیا۔ گاؤں کی رانی فانوسِ خیال سے آزاد ہوتے ہوئے دھوئیں کے جالوں میں الجھ گئی اور پھر دھوئیں اور اندھیرے نے اس کی نزاکت خیال کو ہڑپ کر لیا۔ دوسری صبح وہ پھر گلی میں سے گزر رہا تھا جو حسبِ معمول سونی اور اداس تھی۔ ابھی سورج کی دزدیدہ کرن اس گلی میں نہ آئی تھی۔

اس طرح کئی صبحیں، کئی شامیں گزر گئیں۔ سامنے مکان پر تالا پڑا رہا۔ زنگ آلود تالا۔

پھر ایک شام جب وہ اپنے گھر کا تالا کھول رہا تھا تو اس کی نگاہ اچانک سامنے کے دروازے پر جا پڑی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دروازے بند نہ تھے لیکن ان پر ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ چابی گھمانے والی انگلیاں رک گئیں۔ کیا یہ گھر آباد ہو چکا تھا؟ ٹاٹ کا پردہ جامد اور ساکن تھا۔ بند گلی کا یہ بند مکان آباد نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صدیوں سے خالی تھا۔ اس کا زنگ آلود تالا تو کسی چابی سے نہ کھل سکتا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ رکی ہوئی چابی نے گردش کی اور اس کے مکان کا تالا کھٹ سے کھل گیا۔ اس نے کنڈی کو کھولا تو کواڑ چرچرائے اور پھر ٹاٹ کا پردہ ذرا سا ہلا۔ ایک لہر ابھری۔ ایک کونہ لٹکا ہوا اور جھری میں سے کسی نے جھانک کر اسے دیکھا۔ وہ جھانکنے والے کو نہ دیکھ سکا۔ وہ لہر جو کھردرے ٹاٹ پر ابھری تھی تھوڑے سے ارتعاش کے بعد ساکن ہو گئی۔

''یہ گھر آباد ہو چکا ہے۔'' اس کے یقین نے بڑی جرأت سے کہا۔

''پھر مجھے کیا؟'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔

''اب تو بند گلی کے آخری کونے پر تنہا اور اداس نہیں۔ ویرانوں میں بستی کے پہلے آثار ابھرے ہیں۔''

کیا یہ ویرانہ آباد ہو چکا ہے؟ سہ پہر سے لے کر اگلی صبح تک کیلئے ویرانی کے تصور میں گل و گلزار ابھرے جیسے یکدم بہار آ گئی ہو۔ ویرانے میں بہار! ابھی ساتھ کے گھر سے دھوئیں کی ایک نیلی لہر آسمان کا رخ کرے گی۔ کوئی قہقہہ ابھرے گا۔ اس کا ماحول زندگی سے لبریز ہو جائے گا۔

اور آج اس کا جی نہ چاہا کہ گھر کی سیلن اور سڑاند کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے!

اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ نیچی چھت سے جالوں کے گندے فانوس جھاڑ دیئے۔ فرش کو صاف کیا اور ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر پھر ٹاٹ کے پردے کو دیکھا۔ ٹاٹ کا پردہ کھسکا۔ ایک چھوٹے سے بچے نے سر باہر نکالا اور گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑائی پھر اس کی نگاہ اس پر آ کے ٹھہر گئی۔ بچے کی عمر تین چار سال سے زائد نہ تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا لیکن اس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ چمکدار پتلیوں میں حیرت کی شبنم تھی۔ یہ آنکھیں کبوتر کی آنکھوں کی طرح معصوم ور

اپنے آپ میں کھوئی کھوئی سی تھیں۔ بڑی سرعت ایک زندگی کی [illegible] ہوئے تھی اُن [illegible] میں اتر رہے ہوئے تھے۔ رحیم نے [illegible] ایک زندگی کے [illegible] محسوس کیا [illegible] ہو۔

اس نے زندگی سے [illegible]

بچے پھر رات سے [illegible] چھپ [illegible]

صبح کے اُجالے میں گلی جاگ اُٹھی!

گلی کے ہونٹوں پر ڈھلی ڈھلی سوئی سوئی مسکراہٹ تھی۔ [illegible]

تھا اس نے مکان کو تالا لگایا گلی میں قدم رکھا تو [illegible] اور ایک دھان پان سا [illegible] آدمی [illegible] "[illegible]"

"وعلیکم السلام۔" رحیم نے جواب دیا۔

"میں نے کہا آپ میرے ہمسائے ہیں۔ سب سے پہلے آپ سے ملوں۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی۔"

"بزرگ کہا کرتے تھے ہمسائے ماں جائے۔"

"جی بزرگ سچ کہتے تھے۔"

"میں کپڑے کی پھیری کا کام کرتا ہوں۔ اکثر دیہات کو نکل جاتا ہوں ——— سنا تھا اس گلی کے لوگ بہت شریف ہیں۔"

"میں تو تین ماہ سے اس گلی میں رہ رہا ہوں۔ آج تک کسی شریف آدمی سے واسطہ نہیں پڑا۔" رحیم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جی!" اس نے حیرت بھری آواز میں کہا "میں نے سنا تھا ———"

"یہ گلی اتنی سونی اور سنسان ہے کہ تین ماہ میں میں نے کسی انسان کو نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ کچھ سائے پاس سے گزر جاتے رہے۔ اس لئے میں کیا جانوں اس گلی کے لوگ کتنے شریف ہیں۔" ہمسایہ مسکرایا۔ اُس کے دانت زرد تھے اور ناہموار۔ رحیم نے ہمسائے کے خدوخال ذہن میں محفوظ کرنے کے لئے اُس کے چہرے کو دراغور سے دیکھا۔ اُس کی داڑھی دو تین دن سے منڈی ہی نہیں تھی۔ گالوں پر چیونٹیاں سی چپکی معلوم ہوتی تھیں اور اُن کے نیچے جلد کا رنگ سبزی مائل زرد تھا۔ اوپر کے ہونٹ پر مونچھیں بھی تھیں جنھیں مروڑ کر نوکدار بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہونٹ زرد تھے اور اُن پر پیپڑی جمی تھی۔ ٹھوڑی تو محض برائے نام تھی اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور اُس سے اخفاس بھی برت رہی تھیں۔ پھر ان میں چمک بھی نہیں تھی۔ ایک عجیب سا دھندلکا چھایا تھا۔ رحیم نے ایک لمحے کے لئے اُن گدلی گدلی آنکھوں میں جھانکا تو وہ خلا میں گھورنے لگیں۔

"آپ اس مکان میں اکیلے ہیں؟" ہمسائے نے بے رنگ سی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں!" رحیم نے جواب دیا۔

"میں تو بال بچوں والا آدمی ہوں اور ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ میں نے سنا تھا اس گلی میں شریف لوگ بستے ہیں۔ بال بچے دار۔"

"جی میں بال بچے دار تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ شریف ضرور ہوں۔"

نیا ہمسایہ مسکرایا۔ ۔۔۔۔ بڑی پراگندہ سی مسکراہٹ ۔۔۔۔۔۔ اور اس ایک مسکراہٹ کے بعد تعارف ختم ہو گیا۔

ہمسایہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے گم ہو گیا اور رحیم مکان کو تالا لگا کر اپنے کام پر چلا گیا۔ کام کے دوران ہمسایہ سائے کی طرح اُس کے تصور پر چھایا رہا اور چہرہ اس کے تصور میں رتی بھر بھی نہ بن سکا۔ سائے کی طرح گریزاں کہ روشنی میں آتے ہی غائب ہو جاتا۔ اتنی بند گلی نے اُس کی اس نیت سے خلوص نہیں برتا تھا۔

بند گلی کے تعفن ... تپتی تپتی سہ پہر شام میں بدل چکی تھی!

اُس نے تالے ... پھر ... اس کو جھٹکا سا لگا۔ اُس نے گھوم کے دیکھا تو ہمسائے کا ننھا بچہ اُس کے دامن کو کھینچ رہا تھا۔ رحیم نے ... لی۔ "بھا" بچے نے کہا اور رحیم نے بند گلی کے ہونٹوں کا پہلا قہقہہ سنا۔ اُس کی روح نے کانپ کر پوچھا "کیا ... نے مجھے پکارا!"

"بھا" ننھے نے دراصل اسے پکارا تھا۔ رحیم حیران ہو گیا۔ بند گلی کے ہونٹ کھلے تھے یا اُس کے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔ ننھے نے مکئی کی بنی ہوئی خطائی کا ایک ٹکڑا اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بھا!" رحیم نے ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا۔ یہ رال سے بھیگا ہوا تھا۔ اس پر مٹی کی ایک تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے ننھے کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میں کھاؤں اسے؟"

"ہاں"

"نہیں بھائی مجھے بھوک نہیں۔ تم کھاؤ۔" ننھے نے ٹکڑا واپس لے لیا اور منہ میں ڈال لیا۔ ٹاٹ کے پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "شوکی!" شوکی نے اُس کا دامن چھوڑ دیا اور لپک کر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے گم ہو گیا۔

پھر نہ جانے بند گلی کی شام سہ پہر میں کیوں بدل گئی!

ایک کرن نے روشنی کا ایک تیر پھینکا جو اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ آج نو تین ماہ بعد اُس سے ہمکلام ہوئی تھی۔ بند گلی کی مہر بلب خاموشی ایک نغمے میں ڈھل گئی تھی "بھا"

"شوکی!"

"بھا!" شوکی نے زمین پر سے اُٹھ کر کہا جہاں وہ گندی مٹی سے مکان بنا رہا تھا۔ اُس کے کپڑے مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے پر مٹی ملی ہوئی تھی۔

"دوست! دیکھ تو سہی تیرے لئے کیا لایا ہوں؟"

شوکی نے اشتیاق بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ ان میں کبوتر کی آنکھوں کی معصومیت تھی۔ "پہلے اپنے ہاتھ صاف کرلو" شوکی نے کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھ لئے۔ رحیم نے برفی کی ایک ڈلی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ شوکی نے ایک لمحے کے لئے برفی کو دیکھا اور پھر ڈلی کو منہ میں رکھ لیا۔

"میٹھی ہے نا؟" رحیم نے پوچھا تو شوکی نے محض سر ہلا دیا۔ رحیم نے لفافہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شوکی لفافہ ہاتھ میں لے کر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے پوچھا "یہ میرا ہے؟"

"ہاں بھئی!" رحیم نے مسکرا کر کہا اور شوکی لفافہ لے کر اندر بھاگ گیا۔

"دیکھو دوست! مٹی سے نہ کھیلا کرو۔"

"بھا!" شوکی کی کالی کالی آنکھیں حیران تھیں

"مٹی سے مت کھیلا کرو۔"

"مٹی سے!" شوکی نے اور بھی حیران ہو کر پوچھا۔

"مٹی سے کھیلو گے تو کپڑے میلے ہوں گے۔ اچھے بچے مٹی سے نہیں کھیلتے۔"

شوکی اُٹھ کھڑا ہوا پر وہ حیران تھا۔ رحیم نے سوچا یہ بچہ حیران کیوں ہے اور پھر اُسے یاد آیا کہ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی مٹی سے کھیلتے تھے۔ مٹی سے گھوڑے گدھے اور بیل بناتے تھے۔ چھکڑے بنا کر تنکوں سے بیلوں کے گلے میں جوا ڈالتے تھے۔ بچوں کو مٹی سے پیار ہوتا ہے۔ یہ اُن کی فطرت ہے۔ یہ تو جذبہ تخلیق کا اظہار ہے کہ مٹی سے یہ وان چڑھتا ہے اور مرمریں مجسموں میں ڈھل جاتا ہے۔ اُسے کیا حق حاصل ہے کہ ارتقاء کے راستے میں چٹان بن کر کھڑا ہو جائے۔ اُس نے بالآخر کہا "دیکھو دوست! مٹی سے کھیلو لیکن نالی سے مٹی مت لینا۔ وہ بہت گندی ہے۔"

لیکن دوسری شام شوکی مٹی سے نہیں کھیل رہا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس کے ساتھ کوئی گز بھر ڈور بندھی تھی۔ شوکی پتنگ اڑانے کی مشق کر رہا تھا لیکن گز بھر ڈور سے پتنگ کیا خاک اُڑتی؟ شوکی اُسے دیکھ کر ہمہ تن انتظار بن گیا۔ اُس نے اشتیاق بھری آواز میں کہا 'بھا!'"

"ہاں بھئی!"

"دیکھو تو۔" شوکی نے پتنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"واہ! بڑی اچھی پتنگ ہے" رحیم نے شوکی کی مسرت میں شریک ہونے کی کوشش کی لیکن دوسرے لمحے اُسے ایک عجیب بے بسی کا احساس ہوا۔ ردی کاغذ کے ٹکڑے اور گز بھر لمبی ڈور نے گویا اُس کا منہ چڑا دیا۔ اُس کے گلے میں پھندے سے لگ گئے تاہم اُس نے ڈور کا ایک سرا شوکی کے ہاتھ میں تھما کر پتنگ اُڑانے کی کوشش کی۔ بند گلی کی ہوا بے حس و حرکت تھی پتنگ پھڑ پھڑا بھی نہ سکی۔ رحیم نے کہا "شوکی دوست کل ہم تمھیں نئی پتنگ لا دیں گے۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا تو اُڑنے سے رہا۔"

اگلی سہ پہر کو شوکی اُس کے انتظار میں بند گلی میں بہت آگے نکل آیا تھا!

رحیم نے دُور ہی سے اُسے پتنگ دکھائی۔ سُرخ رنگ کی چھوٹی سی پتنگ بڑی خوبصورت تھی۔ شوکی بے تحاشا دوڑ کر آگے بڑھا۔ وہ رحیم سے ٹکرا گیا تو اُس نے کہا "لے شوکی! تیرے لئے پتنگ لے آیا ہوں۔"

"یہ میری ہے؟" شوکی کی کبوتر ایسی آنکھوں میں مسرت کی روشنی بھی تھی اور شک و شبہے کا ہلکا سا غبار بھی۔

"ہاں بھئی یہ تیری ہے۔" رحیم نے پتنگ شوکی کے ہاتھ میں تھمادی۔ دو پیسے کی پتنگ پا کر شوکی نے دُنیا کی ساری خوشیاں سمیٹ لیں۔

بند گلی کی ہوا میں سکت نہیں تھی۔ پھر بھی رحیم نے ڈور کا ایک سرا شوکی کے ہاتھ میں تھمایا۔ پتنگ اپنے ہاتھ میں لی ذرا دُور جا کر اُس نے پتنگ ہوا میں اُچھالی۔ بند ہوا پتنگ کا بوجھ نہ سہار سکی۔ پتنگ زمین پر گر گئی اور اُس پر مٹی لگ گئی۔ شوکی مایوس ہو گیا تو رحیم نے سوچا یہ بند گلی تو کنجوس کا ہاتھ ہے کہ کسی کو مسرت کی ایک جھلک بھی نہیں دکھا سکتا۔ اور اُس نے دُعا کی کہ بند گلی کا کوئی دریچہ کھل جائے اور ہوا کا وہ جھونکا جسے وہ پیچھے کھلی سڑک پر چھوڑ آیا تھا گلی میں در آئے اور پتنگ ایک بار صرف ایک بار پھڑ پھڑا کر اُڑے تو وہ شوکی کی آنکھوں میں مسرت کی ایک جھلک ہی دیکھ لے۔

اور معجزانہ طور پر اُس کی دُعا قبول ہو گئی۔

بند گلی نے ایک سانس لیا۔ ایک جھونکا رینگتا کانپتا آیا۔ رحیم نے پتنگ کو اُڑایا۔ پتنگ پھڑ پھڑائی۔ دو چار لمحوں کے لئے ہوا میں معلق رہی۔ تھوڑا سا اُوپر اُٹھی اور جھونکا گزر گیا تو نیچے گر پڑی۔ شوکی کھلکھلا کر ہنسا "بھا! پتنگ اُڑی؟"

"ہاں دوست!" رحیم کی آواز پتنگ کی طرح لرز رہی تھی۔ اور پھر اُس کے پیچھے سے ایک منحنی سی آواز نے کہا "شوکی! تم ہر وقت کھیلتے رہتے ہو۔" رحیم نے مڑ کر دیکھا۔ شوکی کا باپ سائیکل لئے کھڑا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے سائیکل کا انجر پنجر ڈھیلا تھا۔ کیریر پر کپڑوں کا ایک گٹھڑ بندھا ہوا تھا۔ وہ دیہات میں سے پھیری کر کے آیا تھا۔ اُس کی مونچھیں مہین دھول سے اٹی ہوئی تھیں۔

"شوکی! چلو اندر۔" اُس نے تھکی تھکی مضمحل آواز میں کہا۔

شوکی سہم گیا۔ ڈور کا سرا اُس کے ہاتھ میں سے پھسل کر گلی میں جا پڑا۔ وہ گھر جانے کے لئے مڑا تو رحیم نے کہا "شوکی بھئی! یہ پتنگ تو لے جاؤ۔"

"نہیں جی!" شوکی کے باپ نے چڑی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں صاحب؟" رحیم نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ بچہ ہے۔ اسے ہر وقت کھیلتے رہنے کا خبط ہو جائے گا۔"

"یہی عمر تو اس کے کھیلنے کی ہے۔" رحیم نے کہا۔

"یہ پتنگ آپ نے اسے لا کر دی؟" شوکی کے باپ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟" رحیم نے حیران ہو کر شوکی کے باپ کا سوال دہرایا۔ پھر اُس نے شوکی کے باپ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اُس نے نظریں چرا لیں۔ رحیم نے ان نگاہوں کا پیچھا کیا لیکن یہ چھپتی بھاگتی نظریں اُس کے قابو میں نہ آسکیں البتہ ان آنکھوں سے جو کسی نقطے پر مرکوز نہ ہو سکتی تھیں اُس نے ایک ہلکا سا [illegible] کی ایک لرزش اُس معصوم خوشی کی ایک کرن کو گرہن بن کر چاٹ گئی۔ [illegible] دوسرے لمحے اُس نے جرأت سے شوکی کے باپ کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا [illegible] جیسے اجنبی [illegible] سے گھبرا گئی ہو "آپ نے پہلے دن کہا تھا کہ ہمسائے ماں جائے ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"تو پھر میرے دوست شوکی کو پتنگ لے جانے دیجئے" رحیم نے مسکرا کر کہا

شوکی کے باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ رحیم نے ڈور لپیٹ کر پتنگ شوکی کے ہاتھ میں دے دی۔ شوکی نے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ خلا میں گھورتی ہوئی آنکھوں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن [illegible] سے نکلنے والی ٹھٹھری ہوئی سرد آواز نے کہا "لے لو۔"

اگلی سہ پہر کو گلی پھر سونی اور اُداس تھی!

ایک دریچہ کھلا تھا۔ پھر کسی ظالم ہاتھ نے بند کر دیا تھا۔

شوکی آج اُس کا انتظار نہیں کر رہا تھا!

اُس نے چپکے سے مکان کا دروازہ کھولا۔ اندھیرے گھر کی سیلن اور سڑاند نے لپک کر اُس کا استقبال کیا۔ اُس نے چولہے میں آگ سلگائی۔ دروازے میں کھڑے ہو کر شوکی کے گھر کی طرف دیکھا۔ ٹاٹ کا پردہ بے جان تھا۔ شوکی کے گھر سے کالا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ پھر باورچی خانے میں چلا گیا۔ پر اُسے چین نہ آیا۔ وہ بار بار دروازے سے باہر جھانکتا لیکن اُس کی نظر ٹاٹ کے ساتھ ٹکرا کر کند ہو جاتی۔

آہستہ آہستہ گلی کا ازلی اور ابدی اندھیرا گہرا ہو گیا۔

اُس کا سینہ پھر ویران اور سنسان ہو گیا۔

یہ گلی! بند گلی!

علی الصبح رحیم کارخانے جانے کے لئے گھر سے باہر نکلا تو ٹاٹ کا پردہ ہلا اور دو کبوتر جیسی معصوم آنکھوں نے جن میں ابھی تک نیند کا خمار تھا اس پر بڑی محبت بھری نظریں ڈالیں۔ رحیم نے پیچھے سے پکار کر کہا "شوکی!" شوکی پہلے ہچکچایا پھر چوروں کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا۔ رحیم نے اُسے گود میں اُٹھا لیا "شوکی دوست تم کل کہاں تھے؟"

"بھا پتنگ جل گئی۔"

"وہ کیسے؟" رحیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہائے ۔۔۔۔۔۔" شوکی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر پڑے۔

"ہائے ۔۔۔۔۔۔" رحیم نے کرب سے نچلا ہونٹ کاٹ لیا۔ غصہ پھنکار کر ہونٹوں پر آیا۔ اُس کا تن بدن کانپا لیکن اُس نے غصے کو ۔۔ ہونٹ پی کر کہا "ہم اپنے دوست شوکی کو اور پتنگ لا دیں گے۔"

اُس سے پیچھا چھڑاتے وقت اُس کی نظریں ایک دکان پر پڑ گئیں۔ ایک شیشے کی الماری میں رنگا رنگ کے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چند سکے کھنکنائے۔ مہینے کے آخری دن تھے۔ پھر بھی اُس نے الماری کا پٹ کھلوایا ۔۔۔۔۔۔ دو کھلونے چنے۔ ٹین کی بنی ہوئی ننھی سی کار جو چابی دینے سے ٹھوں ٹھوں چلتی۔ اُون کا بنا ہوا ریچھ جو چابی دینے سے جھوم جھوم کر چلتا اور اُس کا سر ہلتا رہتا "بھالو میاں!" رحیم نے مسکرا کر کہا۔

ان دونوں کھلونوں کو خرید کر کے اُسے عجیب سا اطمینان نصیب ہوا حالانکہ اُس کی جیب کافی ہلکی ہو چکی تھی۔

بند گلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑائی۔ اُسے شوکی نظر نہ آیا۔ اُس کا جی بیٹھ گیا۔ وہ جی کڑا کر کے گلی میں داخل ہوا۔ گلی کا فاصلہ بے خیالی کے عالم میں ہی طے ہو گیا۔ اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو چپکے سے شوکی اپنے گھر سے نکل آیا۔ شوکی نے پیچھے سے اُس کا دامن کھینچ کر کہا "بھا!"

"شوکی تم آ گئے؟ اندر آؤ۔ آج ہم اندر بیٹھ کر کھیلیں گے۔ دیکھو تو ۔۔۔۔۔"

شوکی اس کے ساتھ اندر آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ٹوٹا ہوا فرش کہیں کہیں سے سلامت تھا۔ رحیم نے کار کو چابی دی اور ٹوٹے ہوئے فرش پر چھوڑ دی۔ ٹھوں، ٹھوں کار دوڑی ۔۔۔۔۔ شوکی کی آنکھیں حیران ہو کر پھیلیں۔ پھر کار فرش کی ایک درز کے ساتھ ٹکرا کر اُلٹ گئی۔ اُلٹی کار کے پہیے گھومتے رہے۔ رحیم کار کے اُلٹنے اور پہیوں کے گھومنے پر کھلکھلا کر ہنسا۔ بند مکان گونجا۔ یہ گونج گلی میں بکھر گئی۔ شوکی بھی اُس کے ساتھ قہقہے لگاتا رہا۔ ننھے ننھے قہقہے جن سے زندگی اور معصومیت کا رس بکھر رہا تھا۔ رحیم نے ان قہقہوں میں اپنی زندگی کا رنگ ڈھلتے دیکھا

کار کے بعد ریچھ کی باری آئی۔ ریچھ جھوم جھوم کر سر ہلا ہلا کر چلا۔ شوکی کی حیرت بھالو میاں کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ عجب منظر تھا۔ پھر بھالو میاں ایک درز میں پھنس گئے۔ اُن کا سر بدستور ہلتا رہا جیسے وہ بے بس ہو کر اپنی بے بسی پر حیران ہو گئے ہوں "بھالو میاں! خوب پھنسے" رحیم نے کہا۔ اور شوکی کی حیرت پھر قہقہوں کی صورت میں اُبل پڑی۔ اِن معصوم قہقہوں میں گانے والی چڑیوں کی موسیقی تھی اور نقرئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ نجانے سہ پہر نے کب آخری کرن کا دان دیا۔ اندھیرے کب لپکے؟ اور کب بند گلی کے آخری کونے کا گدلا سا بلب روشن ہوا۔ وقت چٹکیوں میں گزر گیا۔ کار اور بھالو میاں کی دوڑ میں لمحے یوں بیت گئے جیسے کبھی زندگی کے ڈائل پر آئے ہی نہ تھے۔

پھر یکایک اندھیرے میں ایک تاریک سرد سایہ لرزا "شوکی!"

کنویں سے نکلی ہوئی آواز میں غصے کی تھرتھراہٹ تھی۔ شوکی کا رواں رواں کانپ گیا۔

"شوکی میرے ساتھ کھیل رہا ہے۔" رحیم نے کہا۔

"اتنی دیر ہو گئی اُسے گھر سے نکلے ہوئے۔ واہ! آپ بھی حد کرتے ہیں۔"

"جی!" رحیم نے فرش پر سے اُٹھتے ہوئے کہا "شوکی میرا دوست ہے۔ وہ گھر کی ہی بیٹھک میں آ جاتا ہے۔ کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی ہے۔"

"نہیں جی!" شوکی کے باپ نے خشونت سے کہا "مجھے یہ بات پسند نہیں۔"

"میرا گھر شوکی کے گھر سے کون سا کالے کوسوں دور ہے۔ آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ ہمسائے مال جائے......"

"ہمسائے جائیں بھاڑ میں!" شوکی کے باپ نے نفرت کا زہر اُگلا "میں نے تو ان ہمسایوں کو ماں جائے کہا تھا جو شریف اور خاندانی ہوں۔"

رحیم ایک لمحے کے لئے بجھ کر رہ گیا۔ دوسرے لمحے اُس نے قہقہہ لگا کر کہا "تو بھائی جان میرے شریف ہونے میں آپ کو شک ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں میں شوکی میاں کو آپ سے چھین کر لے جاؤں گا۔ ارے شوکی تو آپ کا بیٹا ہے اور میرا جانی دوست۔"

"مجھے میٹھی میٹھی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میں ان کا مطلب خوب جانتا ہوں۔"

"مطلب؟" رحیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بابو! شوکی سے دوستی تو ایک بہانہ ہے۔ میں تم لوگوں کو خوب جانتا ہوں۔"

"بہانہ!" رحیم نے لرز کر پوچھا "کس بات کا بہانہ؟"

ہمسائے نے کوئی جواب نہ دیا تو رحیم نے ہمسائے کو بازو سے پکڑ لیا۔ اب اُس کی گرفت میں شفقت اور ہمدردی جتنے کی ادائے پُرخلوص نہیں تھی بلکہ غصہ تھا۔ ہمسائے کا دُبلا پتلا بازو سوکھی لکڑی کی طرح کڑکڑایا۔ اُس نے اچانک خوف سے چیخ کر کہا

"چھوڑ دے مجھے۔ بدمعاش، لُچّے، لفنگا۔"

رحیم نے کہا "دیکھو! کسی کی شرافت پر شک کرنا آسان بات نہیں۔ میں بچوں کو چراتا ہوں کیا؟ تو نے مجھے بردہ فروش سمجھا؟"

بند گلی میں کچھ اور سائے لپکے۔ یہ سائے اُس کے پاس سے چپکے سے گزر جایا کرتے تھے۔ آج یکایک کایا پلٹ کر انسان بن گئے۔ "بابو! جوانی کا خون جوش مار رہا ہے۔ تو نے ایک کمزور آدمی پر ہاتھ اُٹھایا۔ ہم تو شروع ہی سے جانتے تھے کہ تو منہ زور گھوڑے کی طرح کسی کو ضرور کچل ڈالے گا۔" "اُس نے مجھ پر خوامخواہ الزام لگایا۔ میں بچوں کا چور ہوں کیا؟ شوکی تو میرا دوست ہے۔" شور و غل میں اُس کی بات کسی نے نہ سُنی۔ اُس نے ہمسائے کا بازو چھوڑ دیا۔ ہمسائے نے شوکی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا تو رحیم نے کہا "شوکی! یہ کھلونے تو لے جاؤ۔" اُس نے اندھیرے میں فرش کو ٹٹولا اور کھلونے ڈھونڈ کر شوکی کی طرف بڑھائے مگر اُس کا ہاتھ اندھیرے خلا میں معلق ہو گیا۔ لوگ چلے گئے اور اندھیرا ایک کروڑ ویرانوں کا سکوت بن گیا!

پھر اُس نے ہمسائے کے گھر سے شوکی کی چیخنے کی آواز سُنی۔ اُس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ زخمی شیر کی طرح دہشت چیخی۔ جوں خون کھول اُٹھا۔ کئی بار وہ گلی میں گیا اور لوٹ آیا۔ آخر اُس نے تالا لگایا اور شہر کی سڑکوں پر پھرنے لگا۔ اُس کا۔ اُس کا جی نہ چاہا کہ وہ بند گلی کی طرف لوٹ کر جائے۔ وہ اپنے کارخانے کی طرف چل گیا۔ گیٹ سے باہر چوکیدار اونگھ رہا تھا۔ رحیم نے کہا۔

"آج رات میں تیرے پاس رہوں گا۔"

"بابو رحیم! کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"

صبح اُس نے کارخانے کے چند دوستوں کے ساتھ بند گلی کی تنہائی کا ذکر کیا۔ اُن میں سے دو کو حال ہی میں کورٹ مل چکا تھا۔ طے یہی پایا کہ تیسرا کسی کونے میں سگریٹ کر گزارا کر سکتا ہے لیکن جب وہ اپنی گلی میں گیا تو کچھ لوگوں نے اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے اُسے لال آنکھوں سے گھورا۔ ایک نے مونچھوں کو مروڑ کر بڑی نخوت سے کندھے جھٹکائے اور اُسے غصہ آ گیا۔ اگر وہ اب گلی چھوڑ کر چلا گیا تو لوگ سمجھیں گے یک ہی دھمکی میں مر گیا بزدل۔ اُس کی جوانی نے شکست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن اُس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ مہینہ ختم ہونے کے بعد مکان چھوڑے گا۔

مہینے کے ختم ہونے میں چند دن باقی تھے پر گلی کا ازلی اور ابدی اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

بند مکان کی سیلن اور سڑاند اُس کا گلا گھونٹنے لگیں

کمیٹی کا گدلا سا لیمپ اندھیروں کی آنکھ کا آنسو لگتا تھا کہ ٹپک نہ سکتا اور گلی کی تنہائی نے شوکی کو بھی نگل لیا تھا۔ متواتر تین دنوں سے وہ شوکی کی شکل تو کیا اُس کی آواز بھی نہ سُن سکا تھا۔

ایک سہ پہر اُس نے شوکی کے باپ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں حسبِ معمول کسی نقطے پر مرکوز تھیں گویا وہ ہر چیز کو دیکھ بھی رہی تھیں اور اُن سے اغماض بھی برت رہی تھیں۔ اُس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی جس میں گدلے رنگ کی دوائی بھری ہوئی تھی۔ رحیم کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ نجانے کیوں؟

صبح جب وہ کارخانے جانے کے لئے اپنے گھر سے نکل رہا تھا تو اُس نے شوکی کے باپ کو دیکھا کہ سائیکل کے کیریر پر کپڑوں کا گٹھڑ باندھے گلی سے نکل رہا ہے۔ اُس نے مکان کو تالا لگایا۔ شوکی کا باپ گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا "شوکی میاں!" اُس کی آواز ٹاٹ کے پردے کے ساتھ ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔ اُس نے دوبارہ شوکی کو پکارا۔ سہ بارہ۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ پھر ٹاٹ کے پردے سے ایک غم زدہ آواز نے کہا "بھائی جاں! شوکی تو بیمار ہے۔"

"بیمار ہے!" رحیم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اُس کے سینے میں ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ درد کی ایک ٹیس اُبھری۔ اُس نے گھبرا کر کہا "مجھے اجازت دیجئے۔ میں ذرا شوکی سے مل لوں۔"

''نہیں جی!'' آنسوؤں میں اُلجھی ہوئی آواز نے کہا۔

''بہن آپ جانتی ہیں۔ مجھے شوکی سے پیار ہے۔ وہ مجھے 'بھا' کہہ کر پکارتا ہے۔''

''لوگ کیا کہیں گے۔ شوکی کا ابا بڑا شکی ہے۔ نہیں جی'' رحیم کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ اُس کے کانوں میں دلدوز چیخوں کا شور اُٹھا شوکی کے باپ نے اُس پر کتنا بڑا اتہام لگایا تھا۔ اُس کی جوانی کی کتنی بڑی تذلیل کی تھی۔ اب اسے پتہ لگا کہ شوکی کا باپ اُس کی اور شوکی کی محبت کے بیچ کیوں حائل ہو گیا تھا گویا شوکی کی محبت ایک پل تھی جس پر سے گزر کر وہ شوکی کی ماں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

شوکی کی ماں۔۔۔۔۔۔ماں!۔۔۔۔۔بہن!

اُس کی جوانی کو اُبکائی سی آئی جیسے کسی نے گلی کی ساری غلاظت اُس کے منہ میں ٹھونس دی ہو۔

ماں!۔۔۔۔۔بہن!

بند گلی نے اُسے شکست دے دی تھی!

آنندی

غلام عباس

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیرحاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہربدر کر دیا جائے، کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیرخواہ سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے

"...... اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چاروناچار اس بازار سے گذرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں قوم کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غاروں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"...... اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ نونہالان قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہ رو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر برساتی اور اسے دعوت حسن پرستی دیتی ہیں، کیا انہیں دیکھ کر

ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا یہ حسنِ زہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے یک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہو گا۔۔۔۔"؟

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے اور مدرسہ و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے۔

"صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے"۔

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: حضرات! ہمارے شہر سے غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں"۔

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر سستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔۔۔ بولے۔

"صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگامشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا ہا ہو ہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں، ضیق میں جان آ گئی ہے رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر

صاحب اولاد خود کر سکتا ہے۔۔۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گذرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے"۔

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعث صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا رذیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے"؟

ایک صاحب بولے اٹھے: "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں"؟

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے "حضرت! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے، اور مفلس اور ادنی طبقہ کے لوگوں جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی"۔

اس پر ایک صاحب بولے: "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں"۔

صدر نے کہا: "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں، ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سوں کے ذاتی مکانات ہیں"۔

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے

سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھی بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور چار و ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصے تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دی گئی تا کہ اس عرصے میں وہ نئے علاقے میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دھاڑے الو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے، یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادل ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں، ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقے میں نئی زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے، چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے

اور باقاعدہ نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے، معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے، مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے، مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج، مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا کر پیسے کے دو دو گڑ کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے، کی صدائیں لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا

نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں سے ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے، وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک جزدان میں قرآن شریف، پنجسورہ اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچے والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے کے تکے بنا کر بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں، اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اورانہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کر، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس بستی کی سن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گردا گرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے، اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہُو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اورچہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست لنگوٹ باندھے چارابرو کا

سفید کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ نیا گھڑا لے کر کنویں پر آیا اور پانی بھر بھر کے مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو یہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے"۔ اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے سات ایک طرف اور سات دوسری طرف، بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی، جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکئے لگا دیئے گئے، پاندان، پیک دان، پیچوان اور گلاب داں رکھ دیے گئے اور رقص و سرود کی محفل برپا کی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں نشست کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادہر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قد آدم آئنے نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گذارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے ادھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو بیلوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں۔۔۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص

کبھی کبھی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور انہیں قرینے سے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تا کہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگرٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیرفروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں رکھ کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جب رات زیادہ گذر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے، سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔

اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے بھڑکیلے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا، یہ خبر پا کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، طرح طرح کے سنو، پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے اچاٹ ہو تو وہ اپنے شاگرد کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد ٹین کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی، اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابا دین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے خاص الخاص تجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور فرحت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرۂ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک ستار سنتے رہتے۔ اس ستارنواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک

تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا، جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستارنواز کے آنے سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاں، جب تک یہ بستی زیرِتعمیر رہی، رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے، مگر اب انہیں دونوں وقت کا کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملاجی کو پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھتے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کوئی جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تمبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے شہر کے مزدور ہی نہیں کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غرباء جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور وغل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے، پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تمبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیاسوز حرکتیں کرتا، جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے۔ ''آؤ کوئی نئی بستی کو'' شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا

طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پُر اسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تا کہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچے میں بیٹھ سکیں۔ انکے ساتھ بستی کے لوگ یونہی سستانے یا سیر کرنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس

بجنے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے درد سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں آرام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، لانڈری والا، دو بجاز ی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈے والی زنجیریں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر پتھر کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری، جیل خانہ بھی آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو اسکول، ایک لڑکوں کے لئے، ایک لڑکیوں کے لئے، دو پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی معاشرتی و مذہبی، ایک علمی، ایک زنانہ اور بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے، پانچ ناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے ''حسن آباد'' کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے ''حُسن آباد'' کے ''حَسن آباد'' کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام تلاش کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں

برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی، اور وہ نام ہے "آنندی"۔

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا وہی بازار ہے جس میں زنان بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچاکھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیرحاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیربحث موضوع یہ ہے کہ زنان بازاری [illegible] شہربدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیراثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیم تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی ۔۔۔"

اس مرتبہ عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

———

آپا

غلام علی چودھری

بدقسمتی نہیں . . . قسمتی . . . ے دنوں کی بات ہے لاہور کے شہریوں کو گلی کوچوں، مکانوں، گھروں کی خاص صفائی کا عام حکم ہوا تھا۔ مالکان مکانات جنہوں نے کبھی کرائے داروں کی بات پر کان نہ دھرا تھا مکانوں کی مرمت اور صفائی کے سلسلے میں نفسی نفسی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میرے مکان کی لپائی بھی ازسرنو شروع ہوئی . . . سیڑھی کے اوپر . . . کے نیچے اندھیرے کونے کو صاف کیا جا رہا تھا کہ ایک گرد سے اٹا ہوا لمبا دفتری لفافہ ایک صندوقچے سے برآمد ہوا۔ میں نے لفافے کو جھاڑ کر کھولا تو اس میں سے چھوٹے بڑے کئی ٹکڑے کاغذ کے نکلے۔ کاغذ بھورا ہو گیا تھا اور تحریر دھندلی لیکن پھر بھی آسانی سے پڑھی جا سکتی تھی۔ انتہائی غور کے بعد معلوم ہوا کہ ان کاغذوں پر خطوں کا ایک سلسلہ مرقوم تھا جو لکھنے والوں نے ایک ہی شخص کو ایک ہی معاملے کے متعلق بھیجے تھے۔

خطوں کی تاریخیں چودہ سال پہلے کی تھیں اور یہ کوئی دیر کی بات نہ تھی۔ میں نے مالک مکان سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ بارہ تیرہ سال ہوئے رشیدہ نام کی ایک عورت لائل پور سے یہاں آئی تھی لیکن بیچاری مشکل ایک سال یہاں رہی ہوگی کہ اس کا دماغ چل گیا۔ اس کے شوہر نے اسے یہیں پاگل خانے میں داخل کرا دیا اور خود اپنے دو بچوں کے ساتھ منٹگمری چلا گیا جہاں اس کی تبدیلی ہو گئی تھی۔

قیاس کہتا ہے کہ رشیدہ یہ خطوط لائل پور سے اپنے ساتھ لائی ہوگی اور اس نے خود ہی انہیں صندوقچے میں محفوظ کر دیا ہوگا اور اس وقت شاید اس کے ہوش و حواس قائم ہوں گے۔

قارئین کے مطالعے کے لیے میں نے ان خطوں کی نقلیں درج کی ہیں اور ان کی سہولت کے خیال سے میں نے انہیں تاریخوں اور واقعات کے اعتبار سے ترتیب دے دیا ہے۔

دونوں لکھنے والے "رشیدہ" سے "آپا" کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں اس لیے میں نے اس سلسلہ

خطوط ''کو آپا'' ہی کا عنوان دے دیا ہے۔

ٹی۔ بی وارڈ میو ہسپتال لاہور

7 فروری 1939ء

--- ------

اچھی آپا!

تم نے لکھا ہے یوسف کی دوسری شادی ہو گئی تمہیں مبارک ہو!

میں تمہارے شوہر کی خالہ زاد بہن' یوسف ایک اجنبی' وہ مجھے بیاہ کر لے جاتا ہے اور طلاق دے دے لیکن تم اسے اسی طرح بھائی بنائے رکھو اور آفرین ہے تم پر!

تمہاری۔ صبوحی

آپا!

خط کا جواب کب لکھوں۔ دفتر تو خیر ہے ہی دفتر گھر میں دفتر سے بھی زیادہ مصروفیت ہے۔

آپا! خدا کی قسم بے حد میٹھی لڑکی ہے۔ پرسوں میں نے کہا ''شائستہ! تم میں اتنی مٹھاس کیوں ہے؟'' کہنے لگی ''مٹھاس آپ کے ہونٹوں میں ہے مجھ میں نہیں'' میں نے کہا ''مجھی میں سہی لیکن ہے تمہاری دی ہوئی۔ تم آج سے 'شیریں' ہو اور میں؟ ہاں میں ''کوہکن؟''

کبھی لاہور آؤ تو تمہیں دکھلاؤں گر یجوایٹ بیوی کیا ہوتی ہے!

آج کل خیالات کہاں جذبات ہی جذبات ہیں اور کیا لکھوں؟

تمہارا بھائی ——— ''کوہکن''

ٹی۔ بی وارڈ میو ہسپتال

لاہور 11 مارچ 1939ء

اچھی آپا!

تمہارا خیال غلط ہے مجھے یوسف سے نفرت نہیں شکایت ہے۔ میرے دل میں صرف ایک بات کھٹکتی ہے۔ میرے ہاں مردہ بچی ہوئی۔ میری طبیعت مہینوں خراب رہی لیکن یوسف نے میری طرف توجہ نہ دی کیونکہ وہ ان دنوں شیریں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے میں مصروف تھا۔

یہ تو ڈاکٹروں نے بھی کہا کہ اگر علاج بہت پہلے شروع ہو جاتا تو شاید میں دق میں مبتلا نہ ہوتی۔ میری قسمت تو جو تھی سو تھی میں یوسف کو تو الزام نہ دے سکتی۔ اور پھر بھائی جان ناراض' میں ناخوش' لیکن تمہارا ملنا اور خط و کتابت یوسف سے اب تک جاری ہے!

میں تمہاری بات بخوبی سمجھتی ہوں۔ میں نے کبھی یہ نہ کہا کہ ایک نوجوان اپنی زندگی ایک دق زدہ بیوی کی بھینٹ چڑھا دے۔ میں تم سے اس لیے ناراض نہ تھی کہ تم یوسف کو مجھ سے بچانا چاہتی تھیں۔ مجھے رنج صرف اس بات کا تھا کہ تم نے یوسف کو کبھی میری زندگی بچانے پر مجبور نہ کیا۔

یوسف نے مجھے صبوحی' کہا اور صبوحی ہی سمجھا یعنی میں صرف اس کی جوانی کی صبح کے کام آئی۔ اب جوانی کی دوپہر کاٹنے کے لیے اس نے ایک بہت میٹھی لڑکی ڈھونڈ لی ہے' بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں زیادہ مٹھاس کڑواہٹ تک جا پہنچتی ہے۔

خدا کی شان، کل تک مجھے 'صبوحی' اور اپنے آپ کو 'میکش' کہنے والا آج کسی اور کو 'شیریں' کہتا ہے اور اپنے آپ کو 'کوہکن' اور کل جانے کیا ہو!

تمہاری ۔ صبوحی

لاہور 3 اپریل 1939ء

آپا!

صبوحی مدتوں تمہارے پاس رہی ہو اور تم اسے اپنی سگی بہن سے بھی زیادہ عزیز جانو۔ میں تم سے اور صبوحی سے پہلی بار ایک اجنبی کی طرح مل رہا ہے ملوں میری اور صبوحی کی محبت تمہارے سامنے بنے اور

بگڑ جائے۔ میں اور صبوحی تمہارے سامنے ملیں اور بچھڑ جائیں۔ اور تم مجھے نہ چھوڑ سکو!

اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکی تو میری سمجھ میں کس طرح آ سکتی ہے۔ لیکن آپا آخر تم نے یہ سوال ہی کیوں کھڑا کیا ہے؟ اور اس سے پہلے یہ تمہیں کیوں نہ سوجھا تھا؟"

شیریں نے کل اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن یہ اور بھی الجھ گیا۔ شادی کے بعد پہلی دفعہ میرے اور اس کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور نہایت شدید۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے، تعلیم یافتہ ہے، خوبصورت ہے، خوش سلیقہ ہے۔ لیکن نہ جانے اس نے اتنی بھدی بات کیوں کی۔

اس نے مجھ سے کہا "اصل میں آپا تمہیں چاہتی ہے۔ تم اس سے اس وقت ملے جب اس کا شوہر تھا، اس کے بچے تھے، اس کا گھر بار تھا۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر تمہیں نہیں لے سکتی تھی اس کی یہ خواہش تھی کہ تم اس کے قریب رہو۔ اسی لیے اس نے تمہاری اور صبوحی کی محبت خود پروان چڑھائی۔"

میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ آپا کی عزت میری نظر میں اتنی ہی رہی ہے جتنی میری اپنی بہن کی اور صبوحی کے لیے میرے دل میں محبت تھی۔ جنون کی حد تک محبت لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔۔ نتیجہ سوائے جھگڑے کے اور کیا ہو سکتا تھا؟

آپا! آج کے دن تک تم مجھ سے میری بہن رہیں اور اپنی مجھ سے کہتی رہیں اور یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے تمہاری عزت پر حرف آنے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا اپنی اور صبوحی کی محبت کی توہین کا۔ تم کہو گی کہ وہ محبت تو اب ایک پرانی یاد سے زیادہ نہیں۔ لیکن خدا کی قسم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ایک مرحوم عزیز کو گالی دے دی ہو اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ایک زندہ عزیز کی بہ نسبت ایک مرحوم عزیز کی توہین کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہ رات کے کھانے کے بعد کا قصہ ہے۔ شیریں اپنے کیے پر ذرہ بھر پشیمان نہ تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی "یہ تو ایک خالص نفسیاتی بحث ہے۔ بھلا اس میں جذبات کو کیا دخل؟" لیکن میں بہت رنجیدہ تھا۔

صبح اٹھ کر تو طبیعت میں تکدر باقی تھا۔ ناشتے کے بغیر ہی دفتر چلا آیا۔ سوچا کہ تم سے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔

بچوں کو دعا — تمہارا بھائی — "کوہکن"

پس نوشت — ذرا ذہن کا مطلع صاف ہو جائے تو ایک بار پھر اس مسئلے کو شیریں کے سامنے رکھوں گا۔ امید ہے کہ اس کی خرافات سے تمہارے دل پر میل نہیں آئے گا۔ جانے آج جی کیوں چاہتا ہے کہ تم سے صبوحی کا حال پوچھوں!" ک ک"

ٹی۔ بی وارڈ میو ہسپتال

لاہور 14 اپریل 1939ء

اچھی آپا!

"کوہکن" سے بے چارگی کا حال نہ پوچھئے۔ شیریں کے ہونٹوں کی مٹھاس پوچھئے۔ میں ہی تو وہ پہاڑ تھی جسے کاٹ کر وہ شیریں تک پہنچا ہے

آہ! آپ کی صحبتیں مجھے یاد آ رہی ہیں! وہ صبح جب ہم کشمیر روڈ پر سیر کر رہی تھیں اور ایک اجنبی کے پاؤں کی آہٹ ہمیں اپنے پیچھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ صبح جب وہ اجنبی سامنے سے آ رہا تھا اور ہمیں دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ صبح جب تم نے خود ہی سورج مکھی کا پھول ہاتھ سے گرا دیا تھا اور پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد اسے اٹھا لانے کے لیے مجھے بھیجا تھا اور میرے وہاں پہنچنے تک وہ اجنبی اسے اپنے سینے سے لگا چکا تھا۔ جب میں پھول لینے گئی تو شرم سے نہ بول سکی تھی اور اس نے مسکرا کر کہا تھا "آپ نے گرا دیا ہم نے اٹھا لیا" اور میں مسکراتی ہوئی واپس تمہارے پاس آ گئی تھی۔ وہ صبح جب اس نے شملہ پہاڑی پر ہمیں سورج مکھی کے پھول پیش کئے تھے اور ہم باہم متعارف ہوئے تھے جب اس نے کہا تھا "میرا نام یوسف ہے" اور میں نے کہا تھا "میرا نام ہے طاہرہ اور یہ ہیں میری آپا رشی" تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا تھا "ہاں آپا۔ بس آپا" اور تم اچانک منہ پھیر کے اٹھ بیٹھی تھیں۔ وہ اگلی صبح جب تم سیر کو نہیں گئی تھیں اور میں بھی نہیں گئی تھی اور اس سے اگلی صبح جب ہم پھر شملہ پہاڑی پر ملے تھے اور یوسف نے کہا تھا "یہ لیجئے۔ یہ ہیں کل کے مرجھائے ہوئے پھول اور یہ آج کے تازہ پھول۔ کل کے مرجھائے ہوئے پھول تو ویسے ہی مرجھائے ہوئے ہیں۔ لیکن کل والا مرجھایا ہوا دل کیسے دکھلاؤں۔ وہ تو ابھی تمہیں دیکھ کے کھل اٹھا۔ آج کے ان تازہ پھولوں کی طرح۔ کل تم نہ آئیں تو دن بھر میرا وہی حال رہا جو شرابی کا نشہ ٹوٹنے پر ہوتا ہے" پھر جب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا "طاہرہ آؤ ہم اپنے نام بدل لیں۔ جانتی ہو صبوحی وہ شراب ہے جو صبح کے وقت پیتے ہیں۔ میں شرابی ہوں اور تم شراب اور ہم صبح کے وقت ملتے ہیں اس لیے تم 'صبوحی' ہو اور میں 'میکش'" اور پھر وہ صبح جب اس نے تم سے پوچھا تھا "آپا تم خود تو سرخ و سپید گلاب ہو لیکن تمہیں پسند ہیں زرد پھول؟" اور تم نے کہا تھا "ہاں میں شروع ہی سے ایسی ہوں مجھے اپنے چہرے کے سوا کسی اور جگہ سرخی اچھی نہیں لگتی نہ کسی انسان کے چہرے پر نہ کسی پھول کے چہرے پر" اور پھر ہم تینوں ہنس پڑے تھے۔

اف میرے اللہ! کس جھنجھٹ میں پڑ گئی! کتنی صحبتیں کتنی شامیں کتنے دن کتنی راتیں گنوں گی! کتنی باتیں کتنی ملاقاتیں یاد کروں گی!

آپا! میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے بخار تیز ہو رہا ہے اور کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ نرس

کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے لکھتے دیکھ لیا تو ناراض ہوگی!

وہ 'میکش' سے 'کوبکن' بن گیا تو کیا میں اب بھی وہی صوفی ہوں اور ہمیشہ وہی صوفی رہوں گی!

امید ہے بھائی جان اچھے ہوں گے اور عادت کے مطابق فائلوں کا پلندہ اٹھائے آتے ہوں گے اور گھر کو بھی دفتر بنائے رکھتے ہوں گے فوزی اور جاوید کو پیار!

صوفی تمہاری

لاہور 31 اپریل 1939ء

آپا!

یہ کیا؟ پورے دو ہفتوں کے بعد خط کا جواب تم نے دیا میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اب آپا صوفی کی نگی بہن بن گئی۔

پھر یہ کیا کہ خط لکھا تو دفتر کے پتے پر اور یہ اعلان کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوا کرے گا اور یہ حکم کہ خط شیریں کو ہرگز نہ دکھلائے جائیں۔

تمہارا خط نہ آتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ اپنا دکھڑا کسے سناتا۔ جو بات پہلے علمی بحث تھی اب خانگی نزاع کی صورت پکڑ گئی ہے۔ تم نے خواہ مخواہ مجھ سے پوچھا اور میں نے بیکار اس کا ذکر شریں سے کر دیا۔

میں نے آپ ہی پھر اس مسئلے کو چھیڑا تو اس نے مجھے فوراً روکا۔ کہنے لگی۔ ''آخری رات کی تلخی کے بعد آج پھر آپ اس بکھیڑے میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں؟ مجھ سے بیوقوفی ہوئی میں تے سوچا دب رہی ہے اب اسے اس طرح میدان سے بھگاؤ کہ آئندہ کبھی سامنے نہ آئے۔ میں نے کہا ''تم نے مجھ پر ایک سنگین الزام لگایا ہے۔ یا تم الزام واپس لو یا مجھے اپنی بریت ثابت کرنے دو'' وہ ہنس کے بولی ''اجی حضرت، الزام آپا پر ہے آپ پر نہیں۔ اپنی صفائی تو آپ خود ہی پیش کر سکتی ہے' آپ صرف ایک صورت میں' کہ آپ اس کے وکیل ہوں'' مجھے پتہ نہیں کیوں غصہ آ گیا میں نے چلا کے کہا'' میں تم مجھ پر شک کرتی ہو'' اس نے کہا جی ہاں پہلے نہیں تھا اب اس وقت' اس لمحے سے ہے آخر ایک انسان بے وجہ اتنا مشتعل کیوں ہو؟''

میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ بولی' برہم ہونا بے ضرورت ہی نہیں بے فائدہ بھی ہے اس بے نہایت سکون سے میرے چند سوالوں کا جواب دیجئے'' میں اس کا منہ تک رہا تھا

''آپا کا شوہر کیا کام کرتا ہے؟'' اس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔

"تمہیں پتہ ہے میری طرح گزیٹڈ" آفیسر ہے" میں نے جواب دیا

"آپ سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے یا کم؟" اس نے کچھ سوچ کر کہا

"مجھ سے ڈیوڑھی!"

"عمر بھی آپ سے ڈیوڑھی ہے اس کی؟" اس نے مسکرا کر کہا

"ہاں تقریباً چالیس سال" میں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپا کے ساتھ اس کی دوسری شادی ہے کہ پہلی؟" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا

"دوسری!" میری حیرت ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"اور آپا کی تو قاعدے کے مطابق پہلی ہی ہونی چاہیے" پتہ نہیں وہ کس قاعدے قانون کی بات کر رہی تھی

"آپا کے بچے تو دو ہی ہیں' ایک لڑکا ایک لڑکی؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی

"مجھے پتہ نہیں" کہتا ہوا میں کرسی سے اٹھ بیٹھا "تم تفتیش کرنے والی ہو کون؟ آخر یہ کیا تماشا ہے؟ تم جج نہیں ہو اور میں کوئی مجرم نہیں ہوں" جانے مجھے کیا ہوا۔ خون میرے اندر کھولنے لگا تھا اور میں غصے سے کانپ رہا تھا۔

وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھی مسکراتی رہی اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

لیکن ایک بار پھر میں اندر گیا ور میں نے کڑک کر کہا "اچھی طرح سن لو۔ آپا ہی نے میری اور صبوحی کی محبت کی داغ بیل ڈالی۔ آپا ہی کی مدد سے ہماری شادی کے مراحل طے ہوئے۔ جب بھی ہمارا جھگڑا ہوتا آپا فوراً بیچ میں آجاتی۔ مجھ سے الگ بات کرتی صبوحی سے الگ۔ ہمیں کسی معاملے پر بحث تک بھی نہ کرنے دیتی یہ ہماری قسمت تھی کہ بالآخر ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے"

وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی سے اٹھی اور بولی "اس ژالہ باری سے فائدہ؟ دیکھئے' میری دانست میں آپا اپنی وضع کی پکی عورت ہے وہ کبھی غلط بات نہ کہے گی میرا اس رات والا الزام اس پر ابھی تک قائم ہے اس سے کہو ایک تردیدی جملہ لکھ بھیجے میری تسکین ہو جائے گی۔ اور جو کچھ آپ نے اب فرمایا ہے اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ آپ کی صبوحی کی ناچاقی اور علیحدگی کی ساری ذمہ داری آپا پر ہے۔ اگر وہ آپ کو اپنے اختلافات خود دور کرنے دیتی تو شاید نہ آج صبوحی ہسپتال میں ہوتی نہ میں یہاں!"

آپا کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اپنی طرف سے بڑی سخت تردید شیریں کے بے بنیاد الزامات کی کر دیتیں اور میں تمہاری تحریر پیش کر کے اس کی تسلی کر دیتا۔ لیکن تم نے اس موضوع پر صرف یہ کہا ہے کہ شیریں شکی

مزاج لڑکی معلوم ہوتی ہے اس کو اس قسم کی باتوں میں [illegible] مناسب نہیں تھا [illegible] تم نے اس خط و
کتابت کو بھی صیغہ راز میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ بہت اچھا۔ تمہیں [illegible] تم [illegible]
تو گھر کا رونا کس کے پاس روؤں گا۔ ماں باپ بھائی بہن [illegible]

تمہارا بھائی [illegible]

- - - - - - - - - - - - - -

لاہور' 21 مئی 1939ء

آپا!

عجیب باتیں کرتی ہو تم بھی۔ میرا خیال تھا کہ تم [illegible] بند [illegible] کی اور بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن تم نے یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیا کہ ''شیریں بد تمیز سہی [illegible] مزا آتا ہے مجھے ایسے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں'' میں تو یہ بات بخوبی سمجھتا ہوں [illegible] مستعد [illegible] شیریں کو خاموش کرنا ہے پھر بیٹھ پر بس نہیں تم نے تو مجھے بھی ہدایت کی ہے کہ اس موضوع پر شیریں سے پھر بحث نہ کروں۔ خود بدو کو نہیں آئیں اور مجھے بھی بیست کر رہی ہو حالانکہ چاہا کہ دشمن کیل کانٹے سے بس سامنے کھڑا ہے۔

میں نے اسے کہا ''دیکھو تمہاری یہ وہ کوئی سے آپا کا دل اتنا کھٹا ہوئے کہ اس نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ کیا ابھی تمہارے الزام کی تردید نہیں ہے۔'' وہ بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولی ''مجھے اپنی تحقیق پر اور آپا کی مستقل پر پورا بھروسہ ہے۔ الزام ٹھیک ہے اور آپا جھوٹ نہیں بولتی۔ آخر کار لکھے تو کیا لکھے؟''

میری جان عذاب میں ہے۔ میں تو تمہارے کہنے کے مطابق کسی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوں لیکن کمبل بھی تو مجھے چھوڑے۔

آپا! حیران ہوتا ہوں کہ صبوحی کو میں نے کیوں چھوڑ دیا۔ الامان! یہ ذہنی پریشانی! اس کا تو ایک شائبہ بھی اس وقت نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن وہ کس گھر میں نہیں ہوتیں۔ پتہ نہیں تمہارے جیسی سمجھدار عورت کے گھر میں ہوتے ہوئے بات کیوں بگڑ گئی۔

آپا! خدا کے لیے اصلاح احوال کی کوئی راہ نکالو ورنہ اس ڈرامے کا انجام نہایت حسرت ناک ہوگا۔ پہلے سے کہیں زیادہ حسرت ناک۔ بھائی جان دورے سے کب واپس آرہے ہیں؟ بچوں کو دعا

تمہارا بھائی — ''کوبکن''

ٹی۔بی۔وارڈ: میو ہسپتال

لاہور 30 مئی 1939ء

اچھی آپا!

تم نے "کوہن" [illegible] کی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اس کے معاملے سے کیا غرض؟ لیکن میں اسکے لیے برا نہیں چاہتی۔ وہ [illegible] نہیں دے سکا تو کیا ہوا۔ خدا کرے کہ شیریں کے ساتھ اس کی بنی رہے۔ جانے کیوں میرے [illegible] یوسف کے بددعا نہیں نکلتی تم اس کی خیر خواہ ہو اس کی مدد کرو لیکن اگر بات زیادہ پیچیدہ نہیں [illegible] دونوں کے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ یہ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہی ہوں تم ہماری ذرا ذرا [illegible] بات میں دخل دیتی تھیں اور اکثر اوقات نتیجہ سوائے ایک بڑی الجھن کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔

کل [illegible] ٹمپریچر میں ہوا ابھری گئی تھی۔ اس وقت بخار ہلکا ہے لیکن دوپہر تک وہی بھی گرم ہو جائے گی۔

بچوں کو دعا......... بھائی جان کو آداب

تمہاری [illegible] صبوحی

لاہور 2 جون 1939ء

آپا!

سمجھ میں نہیں آتا تم کیا کر رہی ہو اور کیا کرنا چاہتی ہو۔ تم نے شیریں کے اطمینان کے لیے کچھ نہ لکھا۔ مجھ اس کے ساتھ بحث میں الجھنے سے روکا۔ یہ ایک بات تھی۔ لیکن یہ کیا کہ تم مجھے خط لکھو اور اس میں ایک لفظ بھی اس سلسلے میں بطور مشورے کے نہ ہو! کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے پر میں شیریں کے سامنے خاموش رہوں اور تم میرے سامنے؟

ظاہر ہے کہ یوں نہیں ہو سکتا۔ ادھر میں اس حد تک آگے چلا گیا ہوں کہ میرا لوٹ کے آنا ناممکن ہے۔ شیریں مجھے قدم قدم پر ضرب لگا رہی ہے' ہزار چاہوں ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ اُدھر تم اس معاملے سے یوں لاتعلق ہو گئی ہو جیسے یہ تمہارا نہیں کسی اور کا ہے۔ یعنی جو پھندا تم نے لگایا ایک تو اکیلا میں ہی اس میں پھنسا رہوں اور دوسرے تم مجھ سے یہ پوچھنا بھی گوارا نہ کرو کہ میں اس پر الٹا ٹنگا ہوں یا سیدھا۔ حالانکہ تم اس

پھندے کو دم میں توڑ کر گرا دینے پر قادر ہو۔

آپا! تم کہو گی میرا لہجہ بے حد گستاخانہ ہے لیکن میں مجبور ہوں' بہت ہی مجبور۔ شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہوں۔ بیٹھا بیٹھا جھنجھلا اٹھتا ہوں جی میں آتا ہے کہ دیوار سے سر پھوڑ دوں

آپا! خدا کے لیے مجھ پر ترس کھاؤ اور مجھے برباد ہونے سے بچالو۔

میں تمہارے جواب کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں۔

تمہارا بھائی ''کوہکن''

پس نوشت: میں نے شائستہ کو ''شیریں'' کہا تھا تو اپنا نام ''کوہکن'' رکھا تھا۔ شیریں نے میری زندگی اتنی تلخ کر دی ہے کہ یہ نام چھوڑ دینے کو جی چاہتا ہے لیکن کیوں چھوڑوں۔ آج کل یہ میرے حال پر بہت صادق آتا ہے میرا دن بھی پہاڑ ہے' میری رات بھی پہاڑ!

''ک''

لاہور' 13 جون 1939ء

آپا!

مجھے نظر آرہا ہے تم مجھے لے ڈوبو گی۔ دس دن کے بعد خط کا جواب آیا اور اس میں میری مزید پریشانی کا ساماں۔ اگر بھائی جان کی طبیعت ناساز ہے اور بچے بھی علیل ہیں تو ہمارے آنے میں کیا حرج تھا۔ دس منٹ تخلیے میں بات چیت ہو جاتی اور عقدہ حل ہو جاتا۔

میں ایسے سلوک کا مستحق نہ تھا۔ مجھے تمہاری سرد مہری سے سخت صدمہ ہوا۔ شیریں کا رویہ بجا طور پر درست ہے لیکن تمہاری روگردانی سراسر ناجائز ہے مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں ساری شکایت تم سے ہے۔

لیکن تم خوش ہو یا ناخوش میں یہ قصہ چکا کے رہوں گا۔ کسی روز اکیلا چلا آؤں گا کیونکہ ان حالات میں شیریں کا ساتھ آنا ٹھیک نہیں۔

خدایا' بہن اتنی سنگدل بھی ہو سکتی ہے؟

تمہارا بھائی ''کوہکن''

آفیسرز وارڈ' میو ہسپتال

لاہور' 23 جون 1939ء

آپا!

میں کتنا بدنصیب ہوں کہ بچتے بچتے مر گیا۔ ہاں جس کی زندگی ہی موت ہو اس کا مرتے مرتے بچ جانا' بچتے بچتے مر جانا نہیں تو اور کیا ہے؟

کاش وہ تانگہ میرے آگے نہ جا رہا ہوتا سامنے سے آ رہا ہوتا! کاش میری موٹر سائیکل کی رفتار زیادہ تیز ہوتی اور وہ پہیے کی بجائے گھوڑے سے ٹکر کھاتی!

یہ پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے جب میں تمہیں ملنے کی غرض سے لائل پور آ رہا تھا۔ حادثہ شاہدرے کے قریب ہوا۔ دائیں کولہے کی ہڈی اور دائیں پنڈلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔

تمہارا بھائی "کوہکن"

ٹی۔ بی وارڈ' میو ہسپتال

لاہور' 31 جون 1939ء

اچھی آپا!

آخر "کوہکن" نے اپنا سر پھوڑ لیا لیکن کیا 'شیریں' تو اس سے نہ چھن جائے گی؟ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو! جب سے حادثے کا سنا ہے جو تھوڑی بہت نیند پہلے آ جاتی تھی وہ بھی اڑ گئی ہے۔ ہائے اللہ! اپنے دل پر بھی اپنا بس نہیں!

آپا! تم کہو گی کہ یا تو یوسف کے ساتھ میل جول اور خط و کتابت رکھنے پر مجھ سے ناراض تھی یا اب اس کے لیے اتنی بے چین ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے اس کی حالت کے متعلق باقاعدہ اطلاع ملتی رہے؟ لیکن خبردار اسے ہرگز اس کا پتہ نہ چلے۔

اُف یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ وہ اسی ہسپتال کے ایک کونے میں ایک چارپائی پر درد سے کراہ رہا ہو اور میں محض دنیا کے ڈر سے اپنے پاؤں کی بیڑیاں نہ کاٹ سکوں۔ حالانکہ میرا جی چاہتا ہے کہ ابھی اس کے پاس پہنچ جاؤں۔

تمہاری   صبوحی

- - - - - - - - - - - - - -

آفیسرز وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، 11 جولائی 1939ء

آپا!

میں تمہارا منتظر رہا لیکن معلوم نہیں تم مجھے دیکھنے کیوں نہ آسکیں۔ اگر معذوری ہے تو بے قصور ہو، اگر بے نیاز ہو تو عجیب بہن ہو!

اس حادثے نے کئی گل کھلائے۔ میں نے شیریں سے کہہ رکھا تھا کہ آپا نے تم سے ناراض ہو کر مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا جھوٹ اس پر ظاہر ہو گیا ہے۔ میری غیر حاضری میں اس نے میرے وہ کاغذات ضرور دیکھے ہیں جن میں تمہارے کچھ خط پڑے تھے لیکن غالباً میری تکلیف کے خیال سے اس نے مجھے نہیں جتایا۔

پھر چند ہی روز ہوئے مجھے خیال آیا کہ دفتر والوں کو کہلا بھیجوں کہ میرے خط گھر کی بجائے ہسپتال کے پتے پر پہنچا کریں لیکن اس عرصے میں تمہارا خط دفتر سے گھر پہنچ گیا جو تم نے میرے زخمی ہونے سے دو روز پہلے لکھا تھا۔ شیریں کے کہنے کے مطابق اس میں دو مرجھائے ہوئے سورج مکھی کے پھول تھے اور ایک پرزہ جس پر لکھا تھا ''آپا'' لیکن اس نے مجھے وہ پرزہ دکھایا نہ وہ پھول۔

اس نے کوئی ناگوار بات نہ کی لیکن وہ پریشان تھی اور میں بھی کچھ کم حیران نہ تھا۔ آخر ایسا تحفہ بھیجنے کا کیا موقع تھا؟ لیکن میں نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اسے بتایا کہ آپا کو زرد پھول بہت پسند ہیں۔ پھر وہ شملہ پہاڑی والا لطیفہ سنایا جب میں نے صبوحی کے سامنے تم سے کہا تھا ''آپا تم تو بالکل گلاب کی طرح سرخ و سپید ہو اور تمہیں اچھے لگتے ہیں زرد پھول؟'' اور تم نے کہا تھا ''بس میں کچھ ایسی ہی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ سرخی میرے ہی چہرے پر ہو کہیں اور نہ ہو نہ کسی انسان کے چہرے پر نہ کسی پھول کے چہرے پر!''

مجھے درد ہو رہا تھا لیکن میں پھر بھی ہنسا مگر پتہ نہیں کیوں شیریں کے چہرے کی لالی اڑ گئی۔

شیریں آج کل بہت اداس اور خاموش ہے شاید کوئی بہت بڑا فیصلہ کرنے والی ہے۔ میں کوئی ایک مہینے سے ہسپتال کی آہنی چارپائی پر پڑا ہوں اور پتہ نہیں کب تک پڑا رہوں اور پھر خدا جانے کس صورت میں یہاں سے اٹھوں۔ ہاں شیریں کو سوچ بچار کرنے کا پورا حق ہے۔

سرخ والے حادثے سے کہیں بڑا حادثہ کل صبح یہاں ہوا۔ میں اخبار دیکھ رہا تھا اور شیریں میرے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی میں نے کہا ''ذرا پاکٹی پڑا پاٹ (POT) مجھے دینا'' اس نے جھک کر نیچے دیکھا اور بولی ''یہاں نہیں ہے' میں بھنگی سے منگواتی ہوں۔'' اس نے اٹھ کر بھنگی کو بلایا اور پھر باہر برآمدے میں کچھ کھسر پھسر سنائی دی۔ میں نے اخبار ذرا ایک طرف ہٹا کر دیکھا بھنگی خالی ہاتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا میری پاکٹی تک آیا اور ہولے سے پاٹ اٹھا کر بولا ''لو بابو جی میں اسے باہر صاف کر رہا تھا''

کچھ نہ پوچھو میرے دل پر کیا گزری۔ شیریں مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہے اور صبوحی کس طرح میری ذرا ذرا سی تکلیف کا خیال رکھا کرتی تھی۔

صبوحی یاد آئی ہے تو ایک واقعہ بھی یاد آ گیا ہے۔ شادی کے بعد ایک صبح میں اور صبوحی شملہ پہاڑی کی طرف سیر کو جا رہے تھے۔ پہاڑی کے سامنے والے چوک میں ایک کتا خون میں لت پت پڑا تھا جو چند منٹ پہلے ایک ٹرک کے نیچے آ کے مر گیا تھا۔ کتے کی لاش کے پاس ایک ہرنی بیٹھی تھی۔ اس کا مالک اسے بار بار کھینچ کے پرے لے جاتا تھا اور وہ بار بار اسے کھینچ کے چوک میں لے آتی تھی۔ غمزدہ مالک نے ہمیں بتایا کہ کتا اور ہرنی اس کے پاس ایک سال سے اکٹھے چلے آ رہے تھے اور ان میں بے حد پیار تھا۔ ہرنی کی بے چینی دیکھ کر صبوحی بہت آزردہ ہو گئی۔ میں نے اسے کہا ''صبوحی! کیا تم بھی میرے دکھ میں اسی طرح بے چین ہو گی؟'' اس کی زبان الفاظ ٹٹولتی رہی مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور آخر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

آہ! آج میں زخموں سے نڈھال پڑا ہوں اور میرے لیے کوئی بے قرار نہیں۔ لیکن جب مجھ میں کتے کی سی وفا نہیں تو ہرنی کی سی محبت کیسے مل سکتی ہے میں تو اسی محبت کا مستحق ہوں جو مجھے شیریں سے مل رہی ہے۔

آفیسرز وارڈ سے ٹی۔ بی وارڈ چند گزوں کے فاصلے پر ہے لیکن صبوحی کو کیا معلوم؟

آپا! خط لمبا ہو گیا ہے لیکن مجھے آج کل ناول پڑھنے اور تمہیں خط لکھنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے!

امید ہے بھائی جان کی طبیعت اب ٹھیک ہو گی اور بچے بھی اچھے ہوں گے۔

تمہارا بھائی ... ''کوہکن''

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، 21 جولائی 1939ء

اچھی آپا!

شیریں اسے چھوڑ جائے گی؟ ہائے اللہ! اس کا کیا بنے گا!

آپا! کیا وہ بھی میری طرح مہینوں ہسپتال میں پڑا رہے گا؟ وہ گھر کیوں نہیں چلا جاتا؟ وہ میرے قریب کیوں پڑا ہے؟

آپا.... مجھے اپنے دل پر قابو نہیں رہا۔ میں اپنے پاؤں کی بیڑیاں کاٹنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ کہہ نہیں سکتی کب اٹھوں اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوں۔

بھائی جان سے کچھ نہ کہنا۔

تمہاری.........صبوحی!

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، 23 جولائی 1939ء

اچھی آپا!

کل صبح میں اس کے پاس چلی گئی!

دروازہ بند تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی تو ایک نوجوان لڑکی باہر آئی۔ ظاہر ہے وہ شیریں تھی۔ اس کا چہرہ اداس تھا اور وہ بہت آزردہ دکھائی دیتی تھی۔ بولی ''آپ صبوحی ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ تھی کیونکہ ہم نے پہلے ایک دوسرے کو نہ دیکھا تھا۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی ''حیران نہ ہوں آپ کا زرد چہرہ وہ زرد پھول ہے جو آپا کو بہت پسند ہے'' پھر دروازہ کھولتے ہوئے بولی ''آیئے تشریف لایئے ایک اور پھول یہاں زرد ہو رہا ہے۔''

''صبوحی ....'' وہ مجھے دیکھ کر چلایا اور اٹھنے لگا لیکن شیریں نے جھٹ اسے پکڑ لیا ''دیکھئے خدا کے لیے! پلستر ٹوٹ جائے گا''

شیریں نے ... سے مضبوطی سے دبایا ہوا تھا اور وہ بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔

میں نے ہزار ضبط کیا لیکن میرے آنسو نہ رک سکے۔

آپا! کیا کہوں آنکھوں نے کیا دیکھا۔ پیلا ہلدی کا سا رنگ اور بہت کمزور۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو۔

تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھی رہی۔ آتے وقت شیریں نے کہا "کیا حرج ہے اگر آپ ہر روز انہیں دیکھ جایا کریں؟"

"ہاں ہاں ضرور۔ بے وقت" اس نے کہا اور اس کی للچائی ہوئی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو جھلملانے لگے۔ شاید میری طرح سے بھی وہ صحبتیں ابھی تک یاد ہیں۔

شیریں میرے ... روڈ تک میرے ساتھ آئی۔ بہت اچھی ملنسار لڑکی ہے۔ یوسف کا اس سے کیا اختلاف ہوسکتا ہے؟ ... کرے کہ ان کے تعلقات ٹھیک ہو جائیں۔

کل سارا دن بڑی بے چینی میں گزرا۔ بخار معمول سے زیادہ رہا۔

لیکن آپا تم یوسف کو دیکھنے کیوں نہیں آئیں؟ آخر تمہیں کونسی ایسی مصروفیت ہے؟ اسے تم سے بہت گلہ ہے اور بجا طور پر ہے۔

تمہاری ... صبوحی!

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، 29 جولائی 1939ء

اچھی آپا!

بھائی جان کو پتہ چل گیا کہ میں یوسف سے ملتی ہوں اور انہوں نے کہہ دیا کہ وہ کبھی میری صورت نہ دیکھیں گے؟ ... نہ سہی! لیکن کیا میں تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہوا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں میرا اور شیریں کا ملنا پسند نہیں آیا۔ تم بچی ہو کیونکہ شیریں کہتی ہے آپا صرف میرے ڈر سے یوسف کو دیکھنے نہیں آئی۔ یہ تم جانتی ہو یا وہ جانتی ہے کہ تم اس سے کیوں ڈرتی ہو

بہر حال تم نے یہ بہت بری بات کی۔ تم چاہتیں تو بھائی جان کو ہرگز میرے یوسف سے ملنے کا علم نہ ہوسکتا۔

تمہاری ... صبوحی!

آفیسرز وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، 17 اگست 1939ء

آپا!

شیریں چلی گئی۔ تمہیں مبارک ہو!

اس کا آخری خط تمہیں بھیج رہا ہوں۔ یہ خط وہ آئینہ ہے جس میں تمہاری اصل شکل ہم نے پہلی بار دیکھی۔

صبوحی کہتی ہے اگر جرأت ہے تو یہ خط بھی بھائی جان کو دکھا دو۔

تم کیا ہو، اب تک کیا کرتی رہی ہو شیریں سب کچھ بتا گئی ہے اور میرا اور صبوحی کا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ حرف بہ حرف صحیح ہے لیکن ہم دونوں کی دعا ہے کہ تمہارا انجام ہرگز وہ نہ ہو جو شیریں کا نظر آتا ہے۔

صبوحی ہر صبح مجھے ملنے آتی ہے اور اس ملاقات کا نشہ اس ملاقات سے کہیں زیادہ ہے جو شملہ پہاڑی پر ہوا کرتی تھی۔

شیریں کے خط طرح تمہارے نام میرا یہ آخری خط ہے۔

تمہارا بھائی ’منیکش‘

آپ کو کیا کہوں؟ کس نام سے مخاطب کروں؟ میں ’شیریں‘ نہیں رہی آپ ’کوبلن‘ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ’منیکش‘ کہہ سکتی تھی لیکن اس کے لیے صبوحی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔

میں جا رہی ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پھر آپ کو بیوی کی حیثیت سے نہ ملوں۔

آپ وہ زرد پھولوں والی بات نہ سناتے تو میں کبھی آپا کو پورے طور پر نہ سمجھ سکتی اور صبوحی مجھ سے نہ ملتی تو شاید میں وہ کچھ نہ کرتی جو اب کر رہی ہوں۔

اجازت ہو تو آپ کی چہیتی آپا کا چہرہ اتار جاؤں ...

آپا نے پہلے پہل آپ کو دیکھا تو اس کا جی للچایا۔ آپ نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ لیکن صبوحی آپ کی نظر میں کھب گئی۔ اس نے صبوحی کا سہارا لیا اور بالآخر آپ کو اس کے ساتھ ٹانک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آپ کسی روز اس کے ڈھب پر آ جائیں گے۔ لیکن اس میں قدم بڑھانے کی جرأت نہ تھی اور

آپ کو اس سے رغبت نہ تھی۔ آخر وہ او چھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ اس نے آپ کے معاملات کو الجھایا اور آپ کی مشیر بن کر ایک کو دوسرے سے بدگمان کیا۔ آپ کے درمیان اس طرح حائل ہو گئی کہ آپ الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر شادی کے بعد آپ آپا کے ساتھ نہ رہتے بلکہ کہیں اور جا رہتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ آپ صبوحی سے اور اسے آپ سے اس قدر محبت ہو اور آپ میں جدائی ہو جائے! یہ کیسے ممکن ہے؟ اصل میں جو تسکین آپا کو حاصل نہ ہو سکی تھی، اس نے صبوحی کو اس سے محروم کر دیا۔

پھر باوجود صبوحی کی اور اپنے شوہر کی مخالفت کے وہ آپ سے ملتی رہی اور خط و کتابت کرتی رہی۔ نہ وہ اتنی فیاض طبیعت رکھتی تھی کہ اپنا کام محبت کی سلگتی آگ کو خود ہی بجھا لیتی نہ اس میں اتنی دلیری تھی کہ اسے ہوا دے کے بھڑکا لیتی۔ وہ اس آگ کو دبائے رہی۔ حتیٰ کہ اس کا دل اس کے دھوئیں سے سیاہ ہو گیا اب وہ ایک ڈرپوک ڈائن کی طرح اندھیرے میں زندگی کا خون پینے لگی اور چہروں کی سرخی چوسنے لگی۔

اس نے پہلا سوال اپنے اور آپ کے تعلقات کا اٹھایا اور ہمارے درمیان تلخی پیدا کی۔ آپ بیحد سادہ دل ہیں اس لیے وہ آپ پر سوار رہی۔ میں نے اس کی چوری پکڑ لی اس لیے وہ میرے سامنے نہیں آ سکی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا وہ اپنی دھن کی پکی ہے وہ نہ تو اپنی ہٹ چھوڑے گی اور نہ جھوٹ ہی بولے گی کیونکہ وہ کس طرح اپنے اس جذبے کی تحقیر کر سکتی ہے جس کی پرورش کرتے کرتے اس نے اپنے دل اور جگر کا خون جلا لیا ہے۔

آپا نے پہلے صبوحی کا خون پیا پھر میرا پینا چاہا۔ میں اس کے چنگل میں نہ آئی تو اس نے آپ کا شکار کر لیا۔ میں حیران ہوں کہ میں کیوں تو ہم پرست ہو گئی ہوں۔ میرے دل میں رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ اگر آپا آپ کو زرد پھولوں کا تحفہ نہ بھیجتی تو آپ کو کبھی حادثہ پیش نہ آتا۔ اور سچ پوچھیے تو ایک طرح کا خوف مجھے آپا سے آنے لگا ہے۔

جو محبت صبوحی کو آپ سے ہے وہ مجھے آپ سے نہیں۔ باوجود مجھے آپا کے بارے میں اب آپ پر کوئی شک نہیں۔ اصل میں میں کسی سے بھی اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی صبوحی آپ سے کرتی ہے۔ صبوحی آپ سے کرتی ہے۔ صبوحی کی محبت نے مجھ سے کہا "شائستہ! راستے سے ہٹ جاؤ" اور میں ہٹ گئی۔ میں نہیں جانتی آپ ایک دوسرے سے مل سکیں گے یا نہیں لیکن آپ کے ملنے کی راہ میں نے ضرور نکال دی ہے۔

آپ کی آپا کہے گی کہ آپ کے جسم تو کھنڈر ہیں آپ کا ملنا کیا؟ لیکن میں کہتی ہوں جن کھنڈروں میں محبت کے چراغ جلتے ہیں وہ ان محلوں سے کہیں زیادہ اچھے ہیں جن میں کینے کے اندھیرے چھائے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ اب میں خستہ و شکستہ ہوں تو تم مجھ سے پیچھا چھڑا رہی ہو یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر

میں صرف صبوحی کا بدلہ آپ سے لے رہی ہوں اس کا کہنا ہے کہ آپ اسے تندرستی کی حالت میں چھوڑ جاتے تو اسے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ لیکن ادھر وہ دق میں مبتلا ہوئی اُدھر آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا آپ نے یہ خیال ہی نہ کیا کہ وہ فوری علاج سے ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔ میرے گھر والوں کو آپ نے یہی بتایا کہ وہ دق کے آخری درجے کی مریضہ ہے۔

جس طرح آپ نے صبوحی کا ہاتھ بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا اسی طرح میں نے آپ کا!

آپا کا انجام دردناک ہوگا۔ وہ خودکشی کرنے کی [illegible] اس میں ہمت نہیں۔

میں اسی خط میں آپا کے بھیجے ہوئے پھول بھی بند کر رہی ہوں۔ ان دو مرجھائے ہوئے زرد پھولوں سے دو مرجھائے ہوئے زرد چہروں کو اکٹھا کرنا مقصود تھا سو وہ ہو گئے۔

میں صرف وہی چیزیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں جو میرے ماں باپ نے مجھے شادی کے موقعے پر دی تھیں۔ آپ جتنی جلدی مجھے فارغ کر دیں میں اتنی ہی زیادہ آپ کی ممنونِ احسان ہوں گی۔

"شائستہ!"

- - - - - - - - - - -

تصویرِ شبِ غم

فاروق خالد

میں صبح کی سیر کو جا رہا تھا کہ ایک نسبتاً الگ تھلگ کوٹھی کے لان میں ایک ننھی منی پیاری بچی کو کھیلتے پایا۔ اس کے بال سنہری اور ملائم تھے اور پیچھے سے بندھے ہوئے تھے۔ فراک ہلکا پیازی تھا' اور سفید براق دودھ تک جاتے ہوئے موزوں کے اوپر جوتے گہرے سرخ رنگ کے تھے۔ وہ اطراف میں کھلکھلاتے ہوئے پھولوں کو اور زیادہ ہنسنے پر مجبور کر رہی تھی اور ان کے پاس کھڑی نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ وہ مسحور کن حد تک واضح اور خوب صورت تھی۔ میں قریب پہنچتے ہوئے بولا۔

"ہیلو بے بی' آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کھیل رہی ہوں" اس نے مترنم نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کھیل' کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔" میں اس کے ساتھ باتوں میں شریک ہو گیا۔ اور پھولوں کی ہنسی بھول گیا۔

"جی ابھی ابھی یہاں ایک تتلی تھی' نہ جانے کہاں غائب ہو گئی!"

"وہ تو اب بھی یہاں ہے۔"

"کہاں ہے؟" جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"میرے بالکل پاس ہی۔" اور میں مسکرا دیا۔

"مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں ہے بتایئے نا؟"

"یہیں ہے!"

"یہیں کہاں؟"

"یہیں ہے لیکن آپ کو نظر نہیں آ سکتی۔"

"مجھے نظر نہیں آ سکتی۔" وہ بچی گول مٹول آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ "کیا میری آنکھیں نہیں ہیں۔" اس کی نگاہیں اجلی تھیں، اور پورا چہرہ فتح کار۔

"وہ تو ہیں، لیکن آپ اس تتلی کو نہیں دیکھ سکتیں۔"

"اچھا آپ ہی اسے پکڑ دیں۔" وہ اس ساری بحث سے بیزار ہوتے ہوئے بولی اس بچی نے کچھ اس لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں بہت کچھ چھوڑ چھاڑ کر جو بھی وہ چاہتی کرنے کو تیار ہو جاتا، لیکن میں شرارت کرنے کے موڈ میں تھا چنانچہ اس کی گول مٹول اور بڑی بڑی آنکھوں میں ظاہر ہوتے ہوئے بولا۔

"میرا کیا ہے، میں تو اسے جب جی چاہے پکڑ سکتا ہوں۔"

"پکڑ سکتے ہیں؟" اس نے تعجب زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل پکڑ سکتا ہوں۔"

"تو پکڑ دیجئے نا۔" وہ میری طرف سر اٹھاتے ہوئے بولی اور ترم پھولوں نے بھی اس ایک لمحے میری جانب یوں دیکھا، گویا سفارش کر رہے ہوں۔

"تو کیا واقعی پکڑ دوں۔"

"ہاں، ہاں لیکن ذرا جلدی کیجئے۔"

"اچھا پکڑتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن وہ فوراً ہی میرے ہاتھ کو جھٹلاتے ہوئے بولی۔ "بتایئے نا کہاں ہے تتلی؟"

"معلوم نہیں ہے۔" میں نے پوری طرح شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ تو اسے پکڑ رہے تھے۔"

میرا متحرک ذہن بالکل ساکن تھا اور میں اس کے ہلکے گلابی فراک کو دیکھ رہا تھا اور چاہ رہا تھا کہ مجھے کوئی آواز نہ دے مگر اسی لمحے ایک سرگوشی سنائی دی "لیکن آپ تو اسے پکڑنے جا رہے تھے۔" اس کی نگاہوں میں اشتیاق تھا اور لہجے میں اک سوال، اچانک اس نے میرے بالوں کی سمت ہاتھ لہرایا اور چلائی "وہی رہی، وہی رہی۔"

"کہاں، کہاں۔" میں نے پلٹ کر پوچھا۔

"یہ دیکھئے یہ دیکھئے!"

اور یہ دیکھتے ہوئے میں پیچھے کی سمت بھاگا' جہاں ایک زرد' خوش رنگ تتلی اڑی جا رہی تھی۔ اس خوش رفتار تتلی کی پرواز میں جھلاہٹ تھی اور ایک پسند آنے والی سیمابی کیفیت۔ میں بھاگا' دور اور اس کے پیچھے بہت دور تک دوڑتا چلا گیا' آگے کھیت تھے اور چند ایک مکانات۔ یہ مضافات کا علاقہ تھا اور شہر سے بہت دور اس لیے مکانات اور تعمیرات جلد ہی غائب ہو گئیں اور چند درخت قریب آتے دکھائی دیے' یہ بھی جلد ہی میرے قریب سے بھاگ گئے اور پھر وسیع تر میدان اور کھیت شروع ہو گئے' میں پوری قوت سے بھاگ رہا تھا اور تتلی کو پانے کی کوشش بے قرار میں بے کل تھا۔ تتلی گہرے نیلے پانیوں پر سے ہوتی ہوئی کہیں چلی گئی اور میں اس بارش کے جمع شدہ ذخیرے کے کنارے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ اور دور تک صاف [illegible] میں روپہلی کیفیت دبے پاؤں چلی آ رہی تھی' لحظہ بعد ہی سورج کی زرفشاں آفتابی کرنیں راستے سے [illegible] کچھ خم کشیدہ دھویں کو جیسے کاٹتی ہوئی نمودار ہوئیں اور سماں صاف ہو گیا۔ آگے خودرو پودوں اور [illegible] ہوئے درختوں کی جھاڑیاں تھیں اور علاقہ صحرا پر خیز تھا۔ میں پیچھے مڑنے کو تھا کہ ایک مختصر سی عمارت سے ملحق باڑے میں ایک چھوٹی سی بچی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اس کا قد تین مرغیوں کے برابر ہوگا۔ اس کے بالوں میں ایک سرخ ربن بندھا ہوا تھا اور کپڑے بے حد نفیس اور عمدہ تراش کے تھے۔ اس کی رنگت ریتلی تھی اور آنکھوں میں جو چمک تھی وہ قدرتی رنگوں کے ملاپ سے جنم لینے والی جزئیات سے مشابہ تھی۔ اس بچی کے دائیں ہاتھ میں گیہوں کے دانے تھے اور وہ کک' کک' کک کرتے ہوئے مرغیوں کو پاس بلا رہی تھی میں پاس چلا گیا اور فضا میں پھیلی ہوئی نیم گرم پھوار تلے اس لڑکی کو دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا تو اس لمحے مجھے صرف اس کے دانت دکھائی دیے' میں بھی مسکرا دیا۔ اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور بولی۔

''ہماری مرغیاں ہیں۔''

''کتنی ہیں؟'' میرے لبوں پر مسکراہٹ ابھی قائم تھی۔

''کتنی ہیں! ابھی بتاتی ہوں۔'' وہ ایک سمت میں گھوم گئی اور ننھے سے ہاتھ کو ہلکے سے اٹھاتے ہوئے گننے لگی۔ ایک دو......دو' تین اور' چار۔''

''چار ہیں۔'' میں نے یوں پوچھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

''ہاں چار ہیں' آپ خود گن لیجیے۔'' لیکن اس نے مجھے گننے کا موقع نہ دیا اور آخری فیصلہ دے دیا۔ ''چار ہیں' پوری چار۔''

''لیکن آپ نے کہاں سے لی ہیں؟''

''کہاں سے لینی ہیں' ہماری اپنی ہیں۔'' اسے جیسے میری باتوں کی سمجھ نہ آ رہی ہو' وہ میری طرف

ایک سیدھ میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''ہم نے بازار سے خریدی ہیں، میرے ابو، سے تھے۔

''اچھا'' میں نے ہنستے ہوئے ایک اور سوال کیا۔ ''کیا آپ اسکول جاتی ہیں۔''

''نہیں! ابھی نہیں ۔۔ ابھی میں صرف کھیلتی ہوں۔''

'' ور کیا کرتی ہیں۔''

''اور میں نے کیا کرنا ہے' کچھ بھی نہیں۔'' اس کا لہجہ بڑا کاٹ دار تھا۔ '' میں ... ہوتی ہوں' سوتی ہوں کھیلتی ہوں اور اپنی مرغیوں کے ساتھ کھیلتی ہوں ' اور ... ایک ... ہے' چھوٹا سا' تیز بھاگنے والا۔''

''اچھا..... اور کیا کرتی ہو۔''

''اور کچھ بھی نہیں!''

''کیا مطلب؟''

''پہلے آپ مطلب بتائیں۔'' وہ بھول پن سے بولی۔ ''آپ کیا کہتے ہیں۔'' ...ں نے یہ پوچھا اور میں قتل ہو گیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک وہ الگ جاتے ہوئے بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں' مجھے پھول لانے ہیں۔''

''کیسے پھول۔'' میں نے سے ذرا روکتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے باغ میں سے۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے باغ میں بڑے اچھے اچھے پھول کھلتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ باغ میں چلی گئی اور سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار میں گھس اٹھی۔ میں اس کے قریب پہنچا اور ضد کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی چلتا ہوں۔''

'کہاں!'' اس نے میری طرف چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کہاں جائیں گے' مجھے تو بہت سے پھول لانے ہیں۔''

''تو کیا ہوا میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم باغ میں نکل آئے۔ یہ ایک عام سا چلڈرن پارک تھا جو یہاں پر رہائش پذیر لوگوں نے اپنے بچوں کی سہولت اور مصروفیات کے لیے خود ہی ترتیب دے رکھا تھا۔ باغ میں ایک طرف ایک بہت بڑا لکڑی کا بنچ تھا لیکن یہ ٹھیک طرح سے زمین میں گاڑا نہیں گیا تھا کیونکہ اس کا ایک

حصہ بہت نیچا تھا اور دوسرا حصہ بری طرح سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ زمین پر جو گھاس بچھی تھی وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی۔ پودے بھی تازہ تازہ لگائے گئے تھے جن پر کوئی قابل ذکر پھول نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے یہ سب دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں تو پھول تلاش کر رہا ہوں ؟''

''تو پہلے آپ یہاں کبھی نہیں آئے۔''

''اوں ہوں، کبھی نہیں۔'' میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر آپ یہ پھول تلاش کرلیں گے۔''

''کروں گا۔'' میں ذرا خفا ہوتے ہوئے بولا۔

''کیسے، نہیں ہے۔''

وہ بہت ضدی تھی لیکن میں نے بھی بالکل ایسا ہی جواب دیا۔ ''بس کرلوں گا' آپ بتائیے آپ کو کل کتنے پھول چاہئیں۔'' میں نے اس کا بایاں بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔'' کس قسم کے پھول ہونے چاہئیں اور کتنے رنگوں میں۔''

اس نے چپکے سے اپنے لبوں پر انگلی رکھ لی' جیسے کچھ سوچ رہی ہو اور بولی ''چار یا شاید چار ہونے چاہئیں' نہیں پانچ وہ ہنستے ہوئے بولی' پانچ اچھے اچھے اور خوبصورت رنگوں والے پھول۔''

''پانچ ؟''

میرے اس غیر ضروری حد تک پھیلے ہوئے سوال کے جواب میں اس نے سر ہلا دیا جو کہ ایک مکمل جواب تھا اور ہلکے سے ہنس دی۔ مجھے یہ ہنسی بڑی بھلی لگی اور میں نے اس کے کھلکھلاتے ہوئے بالوں کو ایک طرف کر دیا۔

''ایک تو میں ابھی آپ کو دے سکتا ہوں۔''

''دے سکتے ہیں؟ کیسے' کس رنگ میں۔'' اس کی آواز میں گہری حدت تھی اور لہجے میں جیسے کسی خوش کن جذبے کی مٹھاس شامل تھی۔

''رنگ! ...... رنگ اس کا عنابی ہے اور چیتا سا گہری سیاہ۔'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے اس کے کالے مہین بالوں کو اوپر سے کر دیا اور میرا ہاتھ اس کے چھونے سے معصوم سر پر کافی دیر سلامت رہا' میری آنکھوں میں نمی تھی اور دل میں ایک الاؤ۔

''کہاں ہے وہ!'' وہ ایک دم سے چلائی۔'' آپ مجھے وہ پھول لا کر دیں۔''

''لیکن میں تمہیں وہ پھول نہیں دے سکتا کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے ضرورت ہے' مجھے پانچوں پھول چاہئیں۔ وہ ضد کرتے ہوئے بولی ''آپ مجھے وہ پھول لاکر دیں لیکن فوراً ہی اس نے جیسے مجھے میرا ان میں رکھ دیا ہو اور ایک لہجے میں بولی ''نہیں! مجھے کوئی پھول نہیں چاہیے' میں خود تلاش کر لاؤں گی' آپ''

میں از حد پریشان ہو گیا اور جلدی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور اسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے بولا ''نہیں' نہیں ... نہیں میں جاتا ہوں میرا انتظار کرو۔'' پھر اس کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ آگے کالی سی پگڈنڈی تھی اور یہ ہوا ایک عجیب سناٹا طاری تھا جیسے کان لگائے کچھ سن رہا ہوں۔ کبھی کوئی پرندہ خوش الحان آواز میں گاتا ہوا ... سے ادھر جاتا اور پھر وہی تاثر انگیز خاموشی چھا جاتی۔ فضا میں خوشگوار تمازت تھی اور بے قرار ... ہی کہیں درختوں کے بیچوں بیچ بادلوں کے سادہ اور بے پیچ صفحات ورق در ورق اڑتے چلے جا رہے تھے ... مجھے پھول درکار تھے اور خوشنما رنگوں سے مزین پروں والی تتلیاں آگے ایک شاہ ... تھی جس کے دو رویہ شیشم کے گھنے پیڑ تھے میں ان درختوں تلے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا کہ ایک سمت اسکول جاتی ہوئی بچیاں دکھائی دیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں گلے میں کتابوں کے بیگ لٹکائے ننھے ننھے قدم اٹھائے چلی جا رہی تھیں۔ ان کے لباس اجلے اور کلف لگے کپڑوں میں ایک انجانا مستقبل سمٹا ہوا تھا۔ ہر بچی کی جیتے جاگتے خوش رنگ کھلونے کی مانند متحرک تھی اور چہرے پر خوشی اور فراغت سے عبارت آشنائی لئے ہوئے تھی۔ پہلو بہ پہلو دو بچیاں ہاتھوں میں ایک تصویروں والی کتاب تھامے گزرتی دکھائی دیں۔ یہ دونوں محویت کے عالم میں رنگین تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

''یہ دیکھو۔ یہ دیکھو اس تصویر میں اس انگریز لڑکی کا فراک کتنا خوب صورت ہے۔''

''اور جوتے کتنے شاندار ہیں۔'' ساتھ چلتی ہوئی بچی نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ تصویریں بہت اچھی لگتی ہیں۔

''اور مجھے بھی!''

''سچ'..... کیا واقعی''

''ہاں' ہاں کیوں نہیں' دیکھو تو سہی کتنی پیاری لڑکی ہے۔'' وہ ایک لحظہ ٹھہرتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ دیکھی ہے۔ ہائے کیسا خوب صورت باغ ہے اور فوارے میں سے پانی بالکل نکلتا ہوا لگ رہا ہے۔''

''اور ادھر دیکھو' یہ گانے والی چڑیا کی تصویر۔''

''ہاں سچی ... لیکن یہ بتاؤ کیا واقعی گانے والی چڑیا ہوتی ہے۔''

''ہولی کیوں نہیں ہے۔''

''اور ناچنے والی بلبل۔''

''وہ بھی ہوتی ہے لیکن یہ........''

''اور جال کی لوڑی؟''

''وہ بھی [illegible] ہے لیکن یہ دیکھو اس تصویر میں پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ کیوں ہے نا۔''

''دیکھو [illegible] نہلی اور آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔ ''اچھا' لیکن سلمٰی ایک بات مانو گی یہ کتاب ایک دن [illegible] میں خوب اچھی طرح سے دیکھ کر کل لوٹا دوں گی۔''

''نا بھئی [illegible] سکتی اور پھر اگر اور دیکھنے کے لیے آ گئیں تو؟'' سلمٰی نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ پاس سے گزرتی ہوئی ان کی ہم عمر لڑکیاں دفعتاً قریب کھسکتی چلی آئیں اور چند ایک جھلاہٹ میں بولیں۔ ''ہمیں بھی دکھاؤ' ہمیں بھی دکھاؤ نا۔''

''بس اب ختم' اور میں کسی کو نہیں دکھاؤں گی۔'' سلمٰی نے یہ کہتے ہوئے کتاب بند کر دی اور سکول کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اب سب کچھ واقعی ختم ہو گیا تھا میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور قریب آتی ہوئی ایک بس میں بیٹھ کر شہر چلا گیا۔ شہر پہنچ کر میں نے دلکش رنگوں والی تصویریں خریدیں جو انواع اقسام کی تھیں اور جن میں رنگوں کا ایک طوفان موجزن تھا۔ تصویریں میں نے ایک لفافے میں رکھ لیں اور وہاں سے ہوتا ہوا ایک بہت ہی مشہور اور قابل دید باغ میں چلا گیا۔ یہاں ایک دوست کی وساطت سے میں نے چند ایک اچھے اچھے دیدہ زیب پھول جمع کیے' ان پھولوں میں رنگ قوسوں اور دائروں میں چکر کاٹتے ہوئے اپنا راستہ بھول رہے تھے۔ یہ پھول جو بھول رہے تھے میں انھیں تنہائی کی سرحد سے نکال کر دفاؤں کے عرض وطول میں ڈالنے لے چلا۔ اب دوپہر کا سورج میرے سر پر تھا اور ہواؤں میں جو خنکی تھی وہ مجھے راس نہیں آ رہی تھی۔ مجھے تتلی کے پروں کی بھی ضرورت تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے سوچا اگر میں یہ پرندے کر گیا تو وہ بچی ناراض ہو جائے گی لیکن میں کہاں جاؤں اور کس جگہ تلاش کروں یہ سوچ سوچ کر میں تھک گیا۔ تھکاوٹ رچ کر رہی تھی اور میں بے بسی کے ہاتھوں نڈھال تھا میں نے تتلی کو رہنے دیا' اگر نہیں ملتی تو کیا کروں' اسے کوئی اچھی سی تصویر دے دوں گا اور وہ بچی جو مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی اسے ملنے چل دیا لیکن راستے میں اس کا گھر زیادہ نزدیک تھا جس نے مجھ سے تتلی کے پروں کی فرمائش کی تھی لیکن فوراً ہی ایک دوسرے خیال نے مجھے دبوچ لیا کہ یہ تصویریں جن کی ہیں انھیں ملنا بھی تو ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ مبادا اسکول بند ہو جائے' چنانچہ میں نے سب سے پہلے ایسے ہی

کیا اور اس پرائمری اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے ان بچیوں کی شکلیں اچھی طرح سے یاد تھیں جنہوں نے تصویروں کی آرزو کی تھی اور اس بچی کا نام بھی ابھی تک ذہن میں تازہ تھا جس کے پاس وہ کتاب تھی' سلمٰی، ہاں۔ میں مطمئن ہو گیا اور چل دیا مگر اس جگہ جہاں وہ اسکول واقع تھا کے برآمدوں میں زمین چٹیل اور صاف تھی اور چار دیواری کے اندر بھی کوئی چہل پہل دکھائی نہ دے رہی تھی۔ میں افسردہ دل لئے بوجھل قدموں واپس لوٹ آیا اور اس راستے پر ہولیا جہاں میں صبح سیر کو جایا کرتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بچی اس وقت بھی پودوں کے پاس کھڑی پھولوں سے باتیں کر رہی ہو۔ میرے ذہن سے جیسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ لیکن دیکھ لینے میں کیا حرج ہے' یہ عجیب پاگل طبیعت تھی۔ میں چلتا رہا ۔ ۔ ۔ پہنچ گیا۔ اس کا گریبان کھلا تھا اور کوئی دربان وہاں موجود نہ تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور وہاں جتنے پھول تھے سب افسردہ تھے اور دردناک خاموشی کے بوجھ تلے دبے چپ چاپ کھڑے تھے اور ان پر ۔ ۔ ۔ تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ تصویریں اب میرے ہاتھ میں یوں تھیں جیسے جلاوطن لاشیں اور پھول میں اپنے ہاتھ میں یوں پکڑے ہوئے تھا جیسے بے گناہوں کے گریبان۔ وقت ایک بجتے ہوئے آئینے کی مانند میرے سامنے سے گزر رہا تھا اور میں اس میں ایہام و خواب کے الجھتے ہوئے تودوں کو گرتا دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے اس کوٹھی کے طویل رہگزر میں چار بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی' میں لپک کر سامنے پہنچا تو دیکھا' وہ لڑکی اور اس سے ذرا دور ایک اور لڑکی باہر کی طرف دوڑی چلی آ رہی ہے۔ مین گیٹ کے قریب وہ ایک پھل بیچنے والے کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کے سفید موزوں کے ساتھ براؤن جوتوں کی دوستی پر بہت خوش ہوا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور زیادہ وضاحت سے مسکرایا شاید کہ وہ میری مسکراہٹ جان لے لیکن اس نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد مجھے فوراً فراموش کر دیا تھا۔

''بے بی' یہ تصویریں دیکھیں بھلا کیسی ہیں۔'' میرے چہرے پر ایک بے معنی ہنسی تھی۔ ''دیکھئے اچھی ہیں کیا؟'' لیکن ان دونوں لڑکیوں نے اپنی نگاہیں مجھے صرف چند سیکنڈ کے لیے دے کر جلد ہی واپس لے لیں اور تب ان میں خوف اور حیرت کی چنگاریوں کو بھر لیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے موہوم ارادے کے ساتھ ایک اور کوشش کر ڈالی لیکن اسی دوران اندر سے ایک چندھائی ہوئی آنکھوں والا عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا' بچیاں بھاگ کر اس کے پاس پہنچیں اور میری طرف بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔ اس شخص کے سر پر عمر کا تاج تھا اور پاؤں میں فراغت کی زنجیریں۔ اس فارغ الاوقات شخص نے مجھے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور میں اسے قریب آتا پا کر بتدریج اپنی مسکراہٹ کو سکڑتا پا رہا تھا کہ وہ دور ہی سے دھاڑا۔ ''کیا بات ہے' کیا چاہیے۔''

یہ مجھ سے ایک سوال کیا گیا تھا' میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں' اس ضمن میں اگر مجھے کئی سال بھی

ودیعت کیے جائیں تو صحیح جواب نہ دے سکوں گا۔ میں ان چل آیا ور خود کو نقشوں میں تلاش کرنے لگا۔ ابھی میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ وہ آواز پھر سنائی دی' وہ شخص چلایا۔

''ارے! کون ہو تم؟''

''چار آنے پاؤ! چار آنے پاؤ۔'' فروٹ فروش نے مجھے قریب آتے ہوئے دیکھ کر آواز لگائی۔ میں اجنبی سایوں کو ساتھ لیے چل رہا تھا تھوڑی دیر بعد میں اسی جگہ پہنچ گیا جہاں وہ چلڈرن پارک تھا۔ اب سہ پہر ہونے کو تھی اور دھوپ میں جو تمازت تھی وہ خنکی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ باغ میں نہ مرغیاں تھیں اور نہ وہ بچی۔ چند سپاہی [illegible] جھوم رہے تھے اور بعض پودوں کی جڑوں میں رینگتا ہوا پانی محویت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ چپل [illegible] ہاتھوں غفلت کی نیند سو گئے تھے اور تصویریں الگ سہمی ہوئی تھیں۔ میں اسی باغ میں بچوں کے جھنڈ سے پاس گیا' ان بچوں کو کپڑے پہنانے اور سنوارنے میں ان کے والدین نے خاصا اہتمام کیا تھا اور یہ واضح کرنے کی پوری کوشش کی تھی کہ یہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' ان کی اہلیت کیا ہے۔ یہ بچے ایسے تمام خاندانوں کی مالی حیثیت کی واضح گواہی تھے۔ ان بچوں کے کپڑے ایسے صاف تھے کہ یہ خیال خواہ مخواہ زمین کی نچلی سطحوں کو تنگ کرتا تھا کہ یہ روز ہی ایسے صاف و نفیس کپڑے پہنتے ہوں گے۔ ان میں دو لڑکے ایسے بھی تھے جن کی عمر زیادہ نہ رہی ہوگی مگر ان کے پاس ریسٹ واچ موجود تھی اور ایک چھوٹی عمر کی بچی نے کانوں میں بندے اور کلائی میں چوڑیاں پہن رکھی تھیں' تھوڑی دیر بعد وہ بچی بھی آ نکلی جو صبح مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی' اس کے کپڑے بھی کافی اچھے تھے۔ میں نے اسے پاس بلایا اور کہا۔ ''میں تمہارے لیے پھول لے آیا ہوں۔''

''تو دے دیجیے۔'' اس نے صحیح جواب دیا۔ میں نے پھول اسے دینے چاہے تو اس نے میرے دینے سے پہلے ہی انھیں جھپٹ لیا اور پرے پھینکتے ہوئے بولی۔ ''یہ کوئی پھول ہیں' مرے ہوئے اور دو سال پرانے۔'' وہ ان مرے ہوئے پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ اچھے اچھے خوبصورت پھول کیوں نہیں لائے۔''

میں نے ان لاشوں کو دوبارہ اٹھا لیا اور سانس لیتے ہوئے دشواری محسوس کرنے لگا۔ ''میرے پاس بہت اچھی تصویریں بھی ہیں' آپ انھیں رکھ لیجیے۔'' اس وقت میرے ذہن میں تصویروں کا اور کوئی مصرف نہیں تھا چنانچہ میں نے یہ سب تصویریں انھیں پیش کر دیں۔ تمام بچے لپکتے ہوئے انھیں لینے کے لیے بڑھے۔ جس بچے کے ہاتھ پر ریسٹ واچ تھی وہ تصویر کو الٹ کر دیکھتا ہوا بولا۔ ''یہ کیسی تصویر ہے' اس میں نہ کوئی بلڈنگ ہے اور نہ کوئی محل۔'' اس تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹانگوں والا گھوڑا آپ نے کہاں سے حاصل کیا ہے' اسی قسم کے گھوڑے پر کوچوان ہمیں اسکول لے جاتا ہے۔''

باقی دو بچے میری دی گئی تصویروں کو موڑ توڑ کر کاغذ کی کشتی بنانے میں مشغول تھے اور سامنے
پودوں میں پھیلتے ہوئے پانی میں ڈال رہے تھے۔ میں نے ان بچوں سے سب تصویریں واپس لے لیں اور
نیچے زخم لئے واپس آ گیا۔ جب میں اس خودساختہ بارش سے نکلا تو معلوم ہوا کہ سب تصویریں میں نہیں لا سکا
ہوں کو ان سب کا خیال میرے ساتھ تھا۔ شام اپنے پاؤں پھیلا رہی تھی [illegible] لمبے ہو رہے
تھے۔ جہاں سے اب میں گزر رہا تھا وہاں سے قدموں کے دونوں طرف کچے مکانات تھے اور بائیں
طرف بھی اسی قسم کی رہائش گاہیں تعمیر تھیں۔ گندے پانی کے جوہڑ جا بجا قائم تھے اور عجیب عجیب طرح کی
بو چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ دور سے قہقہوں کے چھپاکے آ رہے تھے مگر قریب [illegible] ہوا یا آوارہ
کتوں کے رونے کی آوازیں تھیں۔ فضا مکروہ دھوئیں سے لیس دار تھی اور عجیب خلقت کی مخلوق
ادھر ادھر بکھری پڑی دکھائی دے رہی تھی۔ عورتیں کمزور اور نحیف تھیں اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں
کپڑوں اور اچھی خوراک کی اشد ضرورت ہے۔ یہ عورتیں اپنے مکانوں کے کچے [illegible] سے بے
نیاز صحنوں میں گھریلو کام کر رہی تھیں۔ نل سے پانی نکالتے ہوئے ان کے جسم ایک طے شدہ ردھم کے تحت
جنبش کرتے دکھائی دیتے تھے اور چہروں پر مسکراہٹ تھی اور نہ رنج بلکہ ایک مستقل قسم کی خوفناک رضامندی
گہرائی تک کھدی ہوئی تھی۔ جو مرد تھے وہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے' اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے سنائی
دیتے اور یا پھر وحشت کے عالم میں اپنے بچوں کو بے دردی سے پیٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لوگ اس
قدر بے کار اور عام تھے جیسے دھوپ کی کرنوں میں جھلسے ہوئے خالی ذرات۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنے
کو بے تاب تھا کہ اس صحرائے وحشت کے آخری سرے پر دھول میں لپٹی ہوئی ایک کم سن بچی آہ و زاری
کرتی دکھائی پڑی۔ وہ وقفوں سے رو رہی تھی اور اس کے غلیظ اور میل سے پر ہول رخساروں پر آنسوؤں
کی بہتی ہوئی لکیریں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے یہ قدرت کی صناعی بے کار پر خط تنسیخ کھینچ رہی ہوں۔ شا
م کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں اس کا ناتواں وجود ایک مظلوم ہیولے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ یہی
تماشا اگر کسی اسٹیج پر یا کسی کلچرڈ سوسائٹی کے ترتیب کردہ پروگرام کے ذیل میں آتا تو یقیناً تفریح بن جاتا مگر
اس جگہ زندگی کے دم گھونٹنے والے گھم گھما ماحول میں' مردار خود پرستیوں کے بیچوں بیچ ایک دوسرے سے
متصادم اور نچلی سطح پر پھیلی ہوئی بیہودہ سازشوں کے درمیان یہ روتا ہوا بے مایہ جسم مجھے ایک گالی کی طرح لگا
۔ میں قریب پہنچا' بچی کی عمر بھی کوئی آٹھ نو سال رہی ہو گی مگر اس کے رونے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ یوں
لگتا تھا جیسے اسے مسلسل کئی سال تک اذیت دی جاتی رہی ہو۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے' جنھوں نے
خوبصورت اور چمک دار دانتوں کو بھی بہت حد تک بدوضع بنا دیا تھا۔ اس کے سر کے بال آپس میں الجھ کر رہ
گئے تھے جیسے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے ہوں۔ پورے چہرے پر ایک ناقابل بیان تلخی چھائی
ہوئی تھی جیسے آنسو دھونے میں ناکام رہے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر اسے دلاسا اور پیار سے اٹھانا چاہا مگر

وہ اسی حالت میں پڑی رہی اور میرا ہاتھ فضا میں سے ہوتا ہوا خاک سے جا لگا' اس کا دایاں بازو کہنی کے اوپر سے غائب۔ اس نے ایک پھٹے رنگ کا میل خوردہ فراک پہنا ہوا تھا جو اس مفلوک الحال بچی سے زیادہ خاک دھول اور وقت کی ماری ہوئی ایک بہت پرانی حقیقت کی ملکیت معلوم ہوتا تھا۔ اس اپاہج او معدوم ہوتی ہوئی بچی کے پورے وجود میں ایک ایسا کرب سمٹا ہوا تھا جسے اگر میں بیان بھی کرنا چاہوں تو نہیں کرسکتا۔ میں قریب ہی بیٹھ گیا اور اس کے بدرنگ چہرے پر لرزاں و ترساں ہونٹوں کو بمشکل خشک کرتے ہوئے بولا۔

''منی تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا بات ہے۔'' میری آواز میں گہری شدت تھی'' شاباش چپ ہو جاؤ' تم روتیں نہیں۔'' میں کوشش کے باوجود اسے بچے آپ سے مخاطب نہ کر سکا' یہ خوف لئے جیسے یہ میرا جملہ نہیں سمجھ پائے گی اور مجھے بعد میں تغیر و تبدل کے احساس تلے ہلاک ہونا پڑے گا۔ وہ اب خاموش تھی مگر ہچکیوں پر سوار ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں تھی اور جب میں نے اسے دیکھنے کے لیے تصویریں دیں تو وہ یک لخت رک سی گئی اور ایک مدہم سی بے جان مسکراہٹ اس کے لبوں پر طلوع ہوتی دکھائی دی یہ بعینہ وہی مسکراہٹ تھی جیسے مرنے کے بعد لاش کے چہرے پر ابدی طور پر ثبت ہو جاتی ہے۔

''کیا بات ہے' تم کیوں رو رہی تھی۔'' میں نے اور قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔'' کیا ہوا' بولو کیا بات ہوئی ہے۔'' رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور وقت گھٹنے کے ساتھ ساتھ اس بچی کے چہرے کے نقوش دم بدم غیر واضح ہوتے جا رہے تھے اور یہ پھیلتی ہوئی سیاہی انھیں پوری طرح سے مٹانے میں مصروف بہ عمل تھی۔ آسمان بتدریج سیاہ ہوتا جا رہا تھا اور زمین کے اس خطے کے عین اوپر اپنا وجود مٹا دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمام تصویریں اسے دے دیں اور پھول بھی اور بولا۔

''یہ اچھی اچھی خوبصورت تصویریں' انھیں تم رکھ لو اور یہ سارے پھول بھی تمہارے ہیں۔'' میں ایک تصویر اسے دیتا ہوا بولا۔'' دیکھو کتنے خوبصورت درخت ہیں اور پیچھے ایک ہرن بھی کھڑا ہے''

وہ اچانک کھڑی ہو گئی اس کی حرکت میں ایک اضطرابی کیفیت پنہاں تھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ایک طرف کو چل دی۔ پھول زمین پر پڑے رو رہے تھے اور تصویریں حس و خبر سے عاری اس جدا ہوتے ہوئے ماحول میں سے نکلنے کو بے تاب تھیں اور وہ لڑکی اپنی آنکھوں کو لئے' اپنے نازک رخساروں اور سیاہ بالوں کی ویران لٹوں کو لئے دور اور دور لحظہ بہ لحظہ ایک گناہ گار روح کی مانند تاریک تر ہوتی جا رہی تھی۔ واپس آ کر میں نے کچھ بھی نہ کھایا اور بستر پر لیٹ گیا' جوتے ویسے ہی پاؤں میں تھے اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اندازاً کوئی بیس پچیس منٹ بعد کا عمل ہوگا کہ وہی لڑکی مجھے ملنے آئی' اس نے وہی بوسیدہ فراک پہنا ہوا تھا اور چہرے پر وہی آنکھیں لئے ہوئے تھی میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے جیسے اسے

پکڑ کر قریب کر لینا چاہتا ہوں لیکن مجھے اس کا صرف دایاں بازو آگے کی طرف پھیلتا دکھائی دیا اور یہ وضاحت جانتے ہوئے نامعلوم کس سوچ نے میرے شعور پر دستک دی کہ میں بھی اپنا دایاں بازو اتار پھینکوں وہ میرے ہاتھ کے سہارے پاس آتے ہوئے بولی۔

"یہ سب پھول آپ وہاں بھول آئے تھے اور تصویریں بھی وہیں چھوڑ آئے تھے یہ آپ کی ہیں انھیں رکھ لیں۔" اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "جب پیٹ بھوکا ہو تو حسن کوئی معنی نہیں رکھتا اور تب خوبصورتی کی تعریف ممکن نہیں رہتی۔"

میں نے تصویریں لے کر ایک طرف رکھ لیں اور کوشش کرتا ہوا بولا۔ "آپ آپ کیسے آ گئی ہیں یہاں اتنی۔ ۔ ۔ ۔"

"میں آپ کو ملنے آئی ہوں' آپ میرے لیے پھول لائے تھے اور اچھی اچھی خوبصورت تصویریں اور میرے پاس آنسو تھے اور خاک کی ذرات' آنسوؤں نے ان تصویروں کا رنگ بگاڑ دینا تھا اور دھول نے پھولوں سے روشنائی چھین لینی تھی چنانچہ سوچا آپ کو واپس کر آؤں۔" اس کی آواز میں لرزتے پتوں کی سی سرسراہٹ تھی۔ "میں ایک ہی طرح کی لڑکی ہوں اور ہم سب کے آنسو بھی ایک سے ہیں' جیسے ہمارے خون کا رنگ ایک جیسا ہے۔ یہ مختلف تصویریں جو مختلف خوب صورتیاں لیے ہوئے ہیں آپ انھیں دیں جن کے پاس کئی طرح کے اور کئی رنگوں میں موزے ہیں۔ جن کی نازک اور کم عمر کلائیوں میں جھنکتی چوڑیاں ہیں یہ تصویریں ان ہاتھوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپ اگر مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں تو کھانا لا کر دیں جس کا ہر لقمہ ہمشکل اور روٹی کی ہر صورت بعینہٖ وہی صورت ہوتی ہے ایسی تصویریں لا کر دیں تو اچھا ہے' ان کاغذی تصویروں اور خوشنما پھولوں کو میں کیا کروں۔" اس کے لبوں پر میں نے پہلی مرتبہ ایک غیر فانی مسکراہٹ پھیلتے دیکھی۔

"میں آج رات تمہارے پاس آئی ہوں لیکن میں سب کے پاس جانے کو تیار ہوں' میں ہر ایک کے پاس جانے کو تیار ہوں صرف امید کی اس بجھتی ہوئی شمع کو سہارا لیے کہ کبھی تو کوئی محسن اور ہمدرد دکھائی دے گا۔"

"سو تمہیں کیا چاہیے۔" میں نے چپکے سے پوچھا بھلا کتنا کچھ تمہارے لیے کھانے کو لاؤں۔"

وہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ آواز کے اس بہاؤ میں بلا کا شور تھا' جب تلاطم ختم ہوا تو وہ بڑی مشکل سے ہنسی جذب کرتے ہوئے بولی۔

"میں جاتی ہوں' آج کی رات بھی بیکار گئی۔" وہ جاتے جاتے مڑی اور یک لہجہ گویا ہوئی۔ "پہلے میرے باپ نے میری ممی کو مارا اور وہ برتن توڑ دیا جس میں ہم سب پانی پیتے تھے' اس نے سب کو

گالیاں دیں اور پھر خود کو گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ بعد میں ماں نے مجھے بہت پیٹا اور وہاں اس چکی مٹی پر زور سے پھینکتے ہوئے واپس چلی گئی ہمیں کھانے کے لیے بہت کچھ چاہیے اور پھر کل رات شمو بھی تو رو رہی تھی' اسے بھی تو بھوک لگتی ہے' اس کا چھوٹا بھائی بیمار ہے اسے بھی روٹی چاہیے اور وہاں بھی کچھ ضرورت ہے اور وہاں اور وہاں بھی تو کچھ ضرورت ہے اور وہاں اور وہاں اور وہاں بھی ضرورت ہے۔''

صبح چار بجے میری آنکھ کھل گئی' جوتے ابھی تک پاؤں میں بندھے تھے اور میں آدھا بستر پر اور آدھا بستر کے نیچے پڑا سوتا رہا تھا۔

گندی مچھلی

فرخندہ لودھی

"بڑے صاب۔ میں بد نہیں ہوں جس طرح نیکی کسی کی میراث نہیں اسی طرح بدی پر بھی کسی کی اجارہ داری نہیں۔ جس دن میں پیدا ہوئی مجھے معلوم نہیں تھا۔ نیکی کیا ہے بدی کیا ہے۔ مجھے کیا کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا۔ میں جو کچھ ہوں، وہ نہیں ہوں پر میں ثابت نہیں کر سکتی کیونکہ میں ثابت نہیں ہوں۔ نہ میرا کوئی آگا ہے نہ کوئی پیچھا اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میں اس دنیا میں کیسے آگئی۔ یہ طے ہے کہ میں کسی کھیت میں نہیں اُگی، کسی مشین نے مجھے نہیں بنایا۔ کسی مرد نے کسی عورت کے بدن سے ہی مجھے بنوایا ہوگا۔ دنیا کا یہی چلن ہے۔ پھر دنیا میرے لیے سمندر بن گئی۔ بڑے صاب! میں ان باتوں کو بہت جان گئی ہوں، اتنا تو شاید جناب جی نے بھی نہیں جانا ہوگا، کیونکہ آپ ساحل پر ہیں اور میں سمندر میں۔ میں نے گر کر دنیا دیکھی ہے، کون بنے گا میرا ضامن؟ کاغذی کارروائیاں نہ کرو، فیصلہ کرو جیل جاؤں دعائیں دیا کروں گی۔ ہاہا۔"

جھیمو حوالاتن کے ہنسنے سے حاضرین میں بھنبھناہٹ سی ہونے لگی۔ بعض کے ماتھوں پر گہری شکنیں تن گئیں۔ ہونٹ بھنچ گئے، نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ مجسٹریٹ نے ایک تشویش ناک نگاہ حاضرین پر ڈالی اور پیش کار کو کمرہ خالی کرنے کے لیے کہہ کر خود فائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کچھ لوگ چلے گئے۔ کچھ دروازے تک رینگ کر رک گئے۔ کچھ نے صرف پہلو بدلا۔ ایسے زندہ ڈرامے روز روز دیکھنے کو نہیں ملتے۔ کارروائی جاری رہی۔

"تمہیں پتا ہے تم حوالات میں کیوں لائی گئی۔؟"

پاس کھڑے ہیڈ کانسٹیبل نے دبے لہجے میں جھیمو سے پوچھا۔

"تم نہیں۔ بڑا صاب مجھ سے پوچھے۔ کتے کمینے!

"بکو مت۔" مجسٹریٹ نے جھڑک دیا۔

'یہ کتا کمینہ نہیں تو کیا ہے؟ ہزار بار کتا کمینہ۔ اس سے پوچھو۔ اس نے کتنی بار ادھر بھیجا۔ ہر بار کہتا تھا تم آزاد ہو جاؤ گی۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی آزادی جس میں بدن گنے کی طرح پل جائے۔ مجھے جیل بھیجو۔ سنا ہے جیل حوالات سے بہتر ہے۔ لچے لفنگوں کی دنیا سے پرے کال کوٹھڑی میرے لیے اچھی رہے گی۔ دیکھو نا جی! میرا ناک نقشہ اچھا ہے۔ رنگ بھی گورا ہے۔ کہتے ہیں گورا رنگ نہ کسے نوں رب دیوے تے سارا پنڈ ویری ہو وے۔ ویسے میں تو ہوں گوری۔ یہ دیکھو' وہ اک دم شوخی پر اتر آئی۔ سچ مچ وہ بہت گوری تھی۔ مجسٹریٹ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ارد گرد کھڑے لوگ گڑبڑاہٹ اور نیم مسکراہٹ میں مبتلا ہو گئے۔

مجسٹریٹ نے رک کر کہا

''تم بڑی منہ پھٹ ہو اور ہوشیار بھی۔''

''سب ہی کہتے ہیں۔ ہوشیار نہ ہوتی' تو لوگ اب تک کھا چکے۔''

پھر اس نے کولہوں پر دونوں ہاتھ ٹکا کر حاضرین پر طائرانہ نظر ڈالی جیسے کچھ کہہ دینے کی شہ پا چکی ہو۔

''بڑے صاحب! ایک بات پوچھوں؟۔ جب میں سچ مچ برے کام کرتی تھی تب' پولیسیے' مجھے پکڑتے تے چھوڑ دیتے تھے' اب میں نے اپنے حساب سے نیک کام کرنے کی ٹھانی' یہ لوگ پرانے روگ کی طرح جان کو لگ گئے۔ کیوں؟۔ آخر کیوں؟''

''سوال مت کرو۔ بیان لکھ دو۔'' مجسٹریٹ نے نخوت سے کہا۔ ''عدالت کا وقت ضائع نہ کرو۔''

چھیمو نے اپنی تیکھی ناک پر انگلی رکھ کر پوچھا

''ہائے۔ ہائے۔ کیسے مرد ہو۔؟ ایسے ایک تم ملے یا وہ۔ میں خود اس پر عاشق ہو گئی اس کا نام سن کر ہی دل دے بیٹھی۔ بن دیکھے تو سسی پنوں پر عاشق ہوئی تھی۔ میں شاید سسی ہوں پر وہ پنوں نہیں تھا۔'

''آپ نرمی سے کام لے رہے ہیں سر! اور وہ اوٹ پٹانگ بکے جا رہی ہے۔''

عدالت میں موجود ایک وکیل نے مجسٹریٹ کو متوجہ کیا لیکن مجسٹریٹ نے وکیل کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ چھیمو مزید تن کر کھڑی ہو گئی۔ اب وہ وکیل سے مخاطب تھی۔

''دفع ہو۔ تو بیچ میں مت بول۔ اس وقت سرکار میرے ساتھ ہے''

چھیمو نے لگاوٹ بھری نگاہ نوجوان مجسٹریٹ پر ڈالی وہ شرما کے رہ گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا پیشانی صاف کی۔ قمیص کے کالر کو پیچھے ہٹایا۔ سر پر چلتے برقی پنکھے کو دیکھا جیسے گرمی کا شاکی ہو۔ پھر گلا

صاف کر کے بولا۔

''سن بی بی! اس وقت تک تم نے ایک بھی کام کی بات نہیں بتائی' پتا ہے اس بک بک کا نقصان کسے ہوگا؟ تمہیں تمہیں۔''

''صاب! کیا نفع' کیا نقصان۔ میرا کھاتہ شراکت داری کا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ نقصان میرا ہی ہوتا ہے۔ اس شراکت داری میں سنتری سے لے کر وزیر تک کس کس کا نام لوں۔ بابا۔ میرے لیے تو سب اوپر والے ہیں۔ اب دیکھو نا! پہلے جب میرے پیٹ میں ہمارا پہلا پاپ پلنے لگا' تو میرے شراکت دار نے مجھے ایک دائی کے حوالے کر دیا۔ میں' وہ موئی ہوئی۔ وہ بیگم کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔

جمیلہ بیگم۔ جمیلہ بیگم۔!

مرد کا وقت ایک عورت سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے بھی چار کی اجازت دی ہے۔ کنیز کے ساتھ تعلقات بھی جائز ہیں جمیلہ میری جان!

مگر چھیمو آپ کی کنیز نہیں نوکرانی ہے ہمارے ہاتھوں میں پلی۔

جمیلہ بیگم یہ سب باتیں رو رو کر کہہ رہی تھی۔ کیونکہ میں انہیں سوتن کے روپ میں دکھائی دیتی تھی۔ پھر جناب جی! جب میری صحت کچھ اچھی ہوئی' تو میری عقل بھی پہلے سے اچھی ہو گئی۔ نظر نظر کا فرق میری سمجھ میں آ گیا۔ مجھے اپنے مقام اور مصرف کا پتا چل گیا۔ پھر گلی میں آنے والا ایک بنجارہ دل کو بھا گیا۔ نہ جانے کیوں جوان لڑکیوں کو پردیسی اور بنجارے پیارے لگتے ہیں۔ بنجارے کے گیت تو آپ نے بھی سنے ہوں گے صاب!

''گلی گلی بنجارہ پھردا ونگاں لو اج ھا۔ میں وبجارہ۔''

وہ مجھے چوڑیاں' کلپ' کانٹے ایسے ہی دے دیتا بغیر پیسوں کے۔ وہ مہربانی تھا۔ آپ کو پتا ہے مان کو مان پیارا ہوتا ہے میں نے اس مان کو اپنی جان جانا اور ایک دن چپکے سے اس کے ساتھ ہو لی۔ میں نے جمیلہ بیگم اور اس کے تھانیدار آدمی کو ایک دن بھی ماں باپ جیسا نہیں پایا۔ میرا ان کا رشتہ بس نوکر مالک کا تھا۔ پھر بھی میں اس گھر سے نکلتے ہوئے بہت روئی' جیسے وہ میرے بابل کا گھر ہو اور میں گڈیاں پٹولے چھوڑ کر نیا گھر بسانے جا رہی ہوں۔ اب بھی یاد آتا ہے مجھے۔

خیر صاب! بنجارے کی ماں بہنیں بھی پوری پوری بنجارنیں تھیں۔ انہوں نے مجھے نہ قبولا۔ ایک ہی بات کہتی تھیں۔ کہاں سے اٹھا لایا اٹھائی گیرے؟ یہ چھوکری بسنے کی نہیں ہائے ہائے کیسے کیسے ارمان تھے سہرے کے پھولوں کے۔ لاگ کے۔ رسموں کے۔ بنجارے نے ماں بہن سے ڈر کے مجھے ایک بڈھے بس طلی کے حوالے کر دیا اور وعدہ کیا میں جلد ہی ماں بہن کو مناؤں تو تجھے دو بول پڑھا کر ساتھ لے جاؤں گا۔

دو بولوں کے انتظار میں میرا کڑا کا بول گا۔ بڈھے بساطی نے دکان کے چوبارے میں مجھے ایسے رکھا کہ آس پاس والوں کو بھنک نہ پڑے۔ باہر آتا جاتا تو چوبارے کو تالا لگا کر جاتا۔ بالکنی کی کھڑکیوں پر پترے جڑوا دیے۔ یہ بساطی والا میرے لیے رت کو پوڈر، عطر پھلیل اور نہ جانے کیا کیا لا لا کے آتا تھا۔ پر صاب میرا جی خوش نہیں تھا۔ ہر وقت آہیں بھرنے کو چاہتا۔ بڈھا شکل شان کا بھی ایسا ہی تھا۔ ایک آنکھ سے ٹیرا۔ چھیمو نے وہیں کھڑے کھڑے دائیں آنکھ کا ڈھیلا گھما دیا۔ ایسے۔ میں تو اسے دو دو نظر آتی ہوں گی تبھی تو اتنی چیزیں اٹھا اٹھا لاتا تھا میرے لیے۔ پر اندے، پنیں، کلپ، سرخی لگاؤ۔ میں نے ایک روز چڑ کر اپنے لمبے بال کاٹ لیے۔ بڈھا بہت ناراض ہوا۔ میں نے اسے سمجھا کر روز روز دھونے مشکل تھے خوش ہو گیا۔ کچھ جھینپ کے ساتھ۔ یہ بال اسی دن سے کٹے ہوئے ہیں اور میں آرام سے ہوں۔ ایک دن کیا ہوا وہ کھلکھلا کر اور تالی بجا کر ہنسی۔ بڈھا بساطی جانے کیوں صبح کو اٹھ نہ سکا۔ بولا میرے لیے پانی گرم کرو میں نے کہا میں تمہاری بیوی نہیں بڈھے۔ اٹھو اور بازار سے ناشتا لے کر آؤ مجھے بھوک لگی ہے لیکن اس نے مجھے دھکیل کر پلنگ سے نیچے گرا دیا اور چلایا۔

ذلیل۔ حرافہ۔ تو عورت نہیں۔ انسان نہیں۔ تو۔ تو۔

وہ بکتا جھکتا میرے پیچھے لپکا اور میں نے اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا میں سیڑھیوں کی کنڈی کھولنے میں سدھاب ہو گئی اور دھڑا دھڑ سیڑھیاں اتر کر بازار میں آ گئی۔ وہ میرے پیچھے نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں؟ بازار سنسان تھا صرف دودھ دہی کی دکان پر چار چھ مرد کھڑے تھے۔ میں تیز تیز چلتی ان کے پاس سے گزر گئی۔ جانے کس سمت کو۔ بڑے صاب! میرے جیسی لڑکیوں کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔'' یہاں تک کہتے کہتے حوالاتن کی آواز بھرا گئی۔ اب وہ آنکھیں پٹ پٹا رہی تھی۔

''پانی۔''

اس نے بغیر کسی کی طرف دیکھے پانی مانگا۔ مگر کمرۂ عدالت میں پانی اگر تھا بھی تو ملزموں کے لیے نہیں تھا۔

عدالت برخاست ہو گئی۔ اس چھوکری نے مجسٹریٹ کو اپنی مسلسل بکواس سے تھکا دیا تھا، وہ سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر ریٹائرنگ روم میں چلا گیا۔

مقدمات اس کے سامنے ہر روز آتے تھے مگر آج کی حوالاتن چھیمو جیسا کڑکا اور جرأت اس کے تجربے میں نہ آئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی بعض مرد ملزم اپنے خلاف فیصلہ سننے کے بعد جوش میں آ کر بولا کرتے تھے۔ احتجاجاً چیختے، دھاڑتے، ہتھکڑیاں بجاتے، مغلظات بکتے۔ سنتریوں سپاہیوں کے ساتھ بندھے باہر کو کھینچے جاتے مگر قانون کے کان بند ہوتے ہیں، اور آنکھیں اندھی اس کی بالادستی ہے اور یہی اس کی حرمت۔ پر

آج یہ بے حد حسین' بے حیا' عورت ایسے بک رہی ہے۔ جیسے اپنا فیصد من بھی دل کا غبار نکالنے پر تلی ہے نوجوان مجسٹریٹ نے چپڑاسی کو اپنے لیے ٹھنڈی بوتل لانے کا حکم دیا [illegible] کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس عورت کا کیس ٹیپ تھا۔ [illegible] بار بار ادارہ پار رہا تھا۔ مگر اس کا ضامن کوئی نہ تھا۔ تاہم اسے عورت سے [illegible] وہ خود کو ان پڑھ کہتی تھی۔ لیکن ان پڑھ لگتی نہ تھی۔ لباس اور فیشن کے لحاظ سے [illegible] تراشیدہ گھنگھریالے سیاہ بالوں کی پی کیپ پیشانی پر' رخساروں پر [illegible] آنکھوں کے بھاری پپوٹوں پر قمیص کے پرنٹ کا ہم رنگ ہلکا آئی شیڈو۔ [illegible] رنگ کی لپ سٹک۔ کمر پر چھپی ہوئی قمیص کے اوپر سیاہ ویلویٹ کی جیکٹ [illegible] رکھا تھا۔ اس کی موجودگی کی لطیف خوشبو سے تمام کمرہ مہک رہا تھا۔ شاید اس سے کوئی بہت [illegible] تھا۔

مجسٹریٹ سوچ رہا تھا یہ کہاں بیٹھ کر اتنا بنتی سنورتی رہی۔ حوالات [illegible] انسان کے حواس گم کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اصل میں مجھے یہ سوال کرنا چاہیے تھا۔ [illegible] اور سختی سے پوچھنا چاہیے تھا مگر میں دیکھ رہا ہوں۔ میرا رویہ اس کے ساتھ بہت نرم ہے جیسے میں اس کی خوشامد کر رہا ہوں۔ خیر' اب ایسا نہیں کروں گا۔ ویسے میں عورتوں کی قدر کرنے سے زیادہ ان سے ڈرتا ہوں۔ یہ فیشن ایبل عورتیں ایک طرح سے ہر وقت ہتھیار بند رہتی ہیں۔ یہ لمبے لمبے ناخن' چبھیں تو آنکھیں نکال لیں پاؤں میں ایڑی والا جوتا۔ آج کل کی 'ہیل' بے حد خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے پتھر سے پتھر ٹکرا رہا ہے۔ نہ جی نہ۔ ان کے زیادہ منہ لگنا اچھا نہیں اور یہ کم بخت چھاتی کھولتی کھولتی دوسرے کا سر کھول دے' کچھ بعید نہیں حوالات ہر لحاظ سے خطرناک ہے۔ اس کا پیشہ جرم ہے کوئی بھی کروا لے۔ پلاسٹک کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ آگ دکھا کر جو چاہو شکل بنا لو۔

کوکا کولا کی ٹھنڈی بوتل اس کے حلق اور پیٹ کو ٹھنڈا کر چکی تو اس نے کمرۂ عدالت میں جھانکا۔ چھیمو وہیں کھڑی تھی۔ دور کہیں مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اللہ اکبر' اللہ اکبر کے ساتھ نمازِ ظہر کا اعلان ہوا۔ چھیمو نے دوپٹہ سر پر لے لیا۔ اس کے پاس کھڑی لیڈی کانسٹیبل نے سگریٹ کے تین چار لمبے لمبے کش لے کر چھیمو کو گھورا۔ ناک بھوں چڑھائی پر چھیمو کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ شانت تھا جیسے دعا کے وقت ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ تازہ دم ہو کر واپس آ گیا۔ ریڈر نے اپنے سامنے پڑے کاغذات اور فائلوں کو الٹ پلٹ کارروائی شروع ہوئی۔ استغاثہ نے سوالات والا پرچہ سامنے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"چھابی بی۔ اب ذرا ٹھیک سے جواب دینا۔"

چھیمو نے فوراً کہا

''مطلب۔ تیری مرضی کا۔'' مرتو چاہتا ہے کیا ہے مجھ سے۔ دیکھ میں اپنی مرضی کی آدمی ہوں۔''

''تو یہ بتا تو طارق وسیم کے ساتھ کتنے دن رہی اور کہاں کہاں رہی؟''

''طارق وسیم۔؟ کون؟''

''وہی جس کے باپ کا تو سر پھوڑ کر دوڑی ہے۔''

''کیا کہا۔ کیا کہا۔'' اس کا باپ۔ وہ کمینہ ریاکار بڈھا۔ وہ اس فرشتے کا باپ ہو ہی نہیں ہوسکتا۔ کیا نام تھا۔ طارق وسیم۔ عشق نام اور ذات سے واقف نہیں ہوتا۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا نا' جہاں تک میرا خیال ہے اس کا نام طارق وسیم نہیں تھا۔ حسن اور خوبی کو کوئی نام بھی دے دو لیکن وہ طارق وسیم نہیں تھا۔''

''تم جھوٹ بولتی ہو۔''

''نہیں۔

''میں پوچھتا ہوں وہ کون تھا؟''

''شیر تھا'۔ بیٹوں نہیں تھا۔ میں سسی ہوں۔ وہ فرہاد تھا۔'' چھیمو نے سینہ کوبی شروع کر دی۔

''میرا فرہاد۔'' وہ چلائی۔ ''فرہاد! سسی پیاسی ہے۔''

اور اس نے اپنی دونوں باہیں فضا میں پھیلا دیں۔

''ذرا مدمت کرو۔'' مجسٹریٹ نے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے دھاڑ کر حکم دیا۔

چند ثانیے کے لیے سکوت چھا گیا۔

چھیمو نے اپنے بکھرے ہوئے حواس سمیٹتے ہوئے کہنا شروع کر دیا۔

''وہ مجھے دیر سویر ساتھ لیے لیے پھرتا رہتا تھا۔ کبھی کہیں کبھی کہیں۔ ہم کام کرتے تھے۔ میں۔ میں مٹی کی بنی چھیما طلب گار رہتی تھی کہ وہ مجھے چھوئے' چھیڑے۔ پر وہ میری سوالیہ نظروں بھری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔

''اُنھوں۔ اچھے بچے ایسے نہیں کرتے۔ چلو بہت کام باقی ہے۔''

''ہاں۔ اب آئی نا راستے پر۔'' کمرۂ عدالت میں کھڑے لوگوں میں کسی نے بلند آواز میں کہا۔ دوسرے نے دھیمے رہ کر جواب دیا۔

''جی ہاں۔ جی ہاں۔ سیاسی چھوکرے اس قسم کی بیریوں سے کام لیتے ہیں جی۔ ایسے ایسے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ یہ تھلکے کی چھوکریاں 'سسیاں' 'سوہنیاں' تیریوں اور بیریوں جیسے نیول سے استعمال ہوتی ہیں۔ سازشوں میں شریک ہوتی ہیں۔ خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتی ہیں۔'' بڑے وکیل نے آنکھیں جھیمو پر گاڑ رکھی تھیں۔ لگتا تھا کہ استغاثہ پارٹی سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ استغاثہ کے بڑے وکیل کے گرد لوگ میمنہ میسرہ کی شکل میں جمع تھے۔ منڈھی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے سفید پوش جنہیں اپنی پوزیشن پر ناز تھا، کھڑے، کاروبار کرنے والے گرگے جن کی آنکھیں آنکھیں نہیں گدھ تھے، بڑی داڑھی والے ملا جوانی مرد و آنکھوں میں کاجل بھر کر کھڑے مسلسل پان چباتے بالکل بکرے لگتے تھے۔ ہر دو رالیہ سے لوگ کوئی چودھری صاحب، کوئی بٹ صاحب، کوئی شیخ صاحب، جانے کون کون صاحب ان صاحبوں کے چہروں پر خوش حالی کی لالیاں نکھری تھیں۔ وہ گفتگو کرتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ خفیہ انداز سے دباتے اور پھر آنکھیں میچ میچ کر مسکراتے ہونٹ کاٹتے۔ ان میں جوان بھی تھے، ادھیڑ بھی اور ادھیڑ عمر سے گزرے ہوئے۔ شاید جھیمو ان سب کی ملزم تھی۔ ان سب کی دین دار تھی۔

جھیمو نے جب اپنے حالات پر روشنی ڈالی جو عدالت اور اس میں کھڑے لوگوں کو درکار تھے تو یہ معزز شہری خوشی سے بھن بھن کرنے لگے۔

''ہاں جی ہاں۔ عدالت کے کٹہرے میں بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ بھلا کوئی اس سے پوچھے' اس رنگ روپ اور جوانی کو طارق وسیم جیسے زیرِ زمین چھوکروں کے حوالے کرنے سے کیا حاصل! ہیروں سے تلنے والا جثہ مٹی میں رول دیا۔''

''چپ رہ یار۔ انسانی انجن کو پٹڑی سے اترتے دیر نہیں لگتی۔'' مجمع میں سے کسی نے کہا۔

''تم لکھ پڑھ سکتی ہو۔'' وکیل نے پوچھا

''بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ ویسے ان پڑھ ہوں۔''

''اگر تم ان پڑھ ہو' تو طارق وسیم کے ساتھ کیسے وابستہ ہوئیں اور خفیہ خطوط تقسیم کرنے میں کس طرح ملوث ہوئیں۔''

''میں نے کہا کہ میں ملوث نہیں ہوئی اور نہ میں اس کے بارے میں زیادہ جانتی ہوں۔ وہ مجھے ایک محفل میں ملا۔ تم جانتے ہو اچھی صورت کھینچتی ہے۔ حسینوں کے اپنے ہی داؤ پیچ ہوتے ہیں۔''

''تمہیں پتا ہے تم تخریب کاری میں ملوث ہو گئی ہو۔''

''حرام کاری تو میرا پیشہ رہا ہے۔ یہ تخریب کاری کہاں سے آ گئی۔ تم جو بھی کاری کاری کہو۔ کالے کوٹ جی ہمارے نزدیک حرام کاری سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔ اور میں حیران ہوں کہ حرامکاری

کرتے ہوئے عمر گزر گئی۔ پکڑی بھی گئی تو چھوڑ دی گئی اس نے بیان جاری رکھا۔

''اور وہ بڈھا جسے تم اس فرشتے کا باپ کہتے ہو جانے کیسے میرے کمرے میں آ گیا اور لگا مجھ سے دست درازی کرنے۔ میں نے بہت کہا۔ ہٹ ہٹ۔ پر وہ باز نہ آیا۔ میں نے اس کے سر پہ مالا گوری کا لیمپ توڑ دیا اور بھاگ آئی۔ کھلی سڑک سے تمہارے سپاہی مجھے پکڑ لائے۔ اب تم کہتے ہو میں تخریب کاری کرتی ہوں' تو ٹھیک ہے۔ کام کر کے کماتی ہوں تو کھاتی ہوں۔''

''تم نے وہ پمفلٹ کس کس ایریا میں تقسیم کیے؟''

''کیا مطلب۔''

''وہ رسالے اور خط۔ مطلب ہے وہ چھپے ہوئے کاغذ۔ جن میں حکومت کے خلاف مواد تھا۔' وکیل استغاثہ نے ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔ چھیمو پسینے میں ڈوبی تھی۔ قطعی لاتعلق ہے۔ استغاثہ نے دوبارہ سوال کیا۔

''اس کے ساتھی کون کون ہیں؟ تمہارے علاوہ؟''

''پھر وہی۔'' چھیمو چڑ گئی۔ ''جو بھی فرد لگاتا ہے لگاؤ بڑے صاب! مجھے حوالات سے نکالو۔ جیل میں ڈالو۔ جہنم میں ڈالو۔ پر اس عالم برزخ سے نجات دلاؤ۔ میرے لیے اندر باہر ایک سی قید ہے پر حوالات نے مجھے بوند سا بنا دیا ہے۔ اب گری کہ اب گری۔ بے یقینی' بے چینی۔ رہا کوئی حوالاتی نہ بنے۔

''ہم سب حوالاتی ہیں بی بی! حاضرین میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا'

''کون ہے یہ؟۔'' پیشکار چوکنا ہو گیا۔ مجسٹریٹ نے گردن گھما کر جائزہ لیا۔ مجمع کی بھنبھناہٹ سنسناہٹ میں بدل گئی جیسے سانپ شوک کر رہ گیا ہو۔

''یہاں تمہارا کوئی ساتھی ہے؟''

''تم خود کہتے ہو میں بری عورت ہوں پھر بھرے مجمع میں میرے ساتھ کا اعتراف کون کرے گا؟ میں ہی میں ہوں۔ یا میرا خدا کیا تمہیں خدا کی ضامنی کا اعتبار ہے۔'' وہ ہاتھ ہوا میں لہرا کر ہنسی۔ ''نہیں نہیں۔ ویسے وہ کہتا ہے' میں ڈھیل دیتا ہوں۔ بس کی تھوڑی ڈھیل میں اچھے اچھوں کی چنکیں کٹ جاتی ہیں۔ بس جی اتنی سی بات ہے۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا''

کچھ دیر بعد مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے چھیمو کو ایک ہفتے کے ریمانڈ پر سپیشل پولیس کے حوالے کر دیا۔

جب چھیمو کو لیڈی کانسٹیبل حوالات کی لاری میں بٹھا کر اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیے میت

ہو کر بیٹھ چکی تو جھیمو نے باقی گرفتاروں پر ایک نظر دوڑائی اور کڑک کر پوچھی ''ب مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟''

''میری ملکہ! حوالات سچ مچ تیرے لائق نہیں۔ تجھے شاہی قلعہ میں ہونا چاہیے اور اب تو وہیں جا رہی ہے۔''

جھیمو کی نگاہیں لاری کی بالشت بھر تنگ جالیوں کو پار کر گئیں۔ میلا چپ چاپ آسمان، چیلیں، گدھ، کوّے اور اک ننھی چڑیا۔ پرواز کی کوشش میں ڈولتی پڑتی۔

چوکھٹا

سیّد فضل حسین

جب تک وہ رات کی باسی روٹی اور ٹھنڈی دال کا ناشتہ کرتا رہا اس کی ماں پڑھائی کے لیے اسے تاکید کرتی رہی اور باپ کام پر جانے کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس کی پچھلے دنوں سکول سے غیر حاضری اور خراب نتیجے پر تنبیہ کرتے ہوئے اسے برا بھلا کہتا رہا۔ اس نے ان باتوں سے بے نیاز رہ کر اپنا ناشتہ مکمل کیا۔ آدھی پھٹی ہوئی کتابوں کو بوسیدہ بستے میں بے ترتیبی سے ڈالا۔ بستہ کندھے پر لٹکایا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل کر سیدھا شہر کی نہر پر نہانے چلا گیا۔ وہاں اس مزاج کے سکولوں سے بھاگے بہت سے لڑکے نہر میں چھلانگیں لگا کر نہا رہے تھے۔ یہ اس کا تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔ دوپہر تک نہر میں غوطے لگا کر نہاتا رہتا۔ تیرنے میں دوسروں سے مقابلہ کرتا، پھر تھک کر دم لینے کچھ دیر کے لیے نہر کے پل پر بیٹھ جاتا۔ وہاں بیٹھ کر وہ گزرتی کاروں میں بیٹھے اچھے اچھے کپڑوں میں ملبوس اپنے ہم عمر بچوں کو دیکھتا۔ کچھ بچے سکول کی خوبصورت یونیفارم پہنے اس کے سامنے سے گزرتے تو ایک وقت کے لیے وہ سوچتا کہ کتنا ہی اچھا ہو کہ وہ بھی ایسی چمکیلی کاروں میں خوبصورت صاف ستھری یونیفارم پہن کر کسی اچھے سکول میں جائے۔ لیکن سکول جا کر پڑھنے کے خیال سے اسے جھرجھری سی آجاتی۔ اسے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ پڑھائی میں پیچھے ہوتا گیا۔ مضامین اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتے گئے، یہاں تک کہ وہ ہر مضمون سے اچاٹ ہو کر ان سے نفرت کرنے لگا۔ اگر کسی دن گھر سے مار کھا کر سکول چلا بھی جاتا تو اس کا دھیان پڑھائی میں کبھی نہ جمتا تھا۔ ایک تو کلاس اس کی غیر حاضری میں سبق میں اس سے بہت آگے نکل جاتی دوسرے کلاس میں پہنچ کر ماسٹر سے غیر حاضری کا حساب چکاتے اتنا پٹ چکا ہوتا کہ پھر پڑھنے کی گنجائش نہ رہتی تھی۔ اسی لیے وہ سکول میں رہ کر گھٹن اور خوف محسوس کرتا تھا۔ کلاس میں بیٹھے ہوئے ذہنی طور پر وہ کلاس سے غیر حاضر رہتا۔ لہٰذا کلاس میں با آواز بلند پڑھنے کے باوجود اسے پہاڑے یاد نہ ہوتے۔ حساب کے سوال اس کی دماغی الجھن کا باعث بنتے۔ لہٰذا اسے خیریت اس بات میں نظر آتی کہ کسی نہ کسی بہانے

سکول سے بھاگ نکلے۔ اسے گلی میں گولیاں کھیلنے، پھر گلی ڈنڈے، بیٹ اور بال سے کرکٹ کھیلنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ بڑا کھلاڑی بننا چاہتا تھا۔ لیکن کھیلنے بھی اس سے نہیں آتے تھے (ایک تو اس کے والدین اسے کھیلتا دیکھ کر آتے جاتے پڑھائی میں بے دلچسپی کے واسطے دے کر ملامت کرتے یہاں تک کہ وہ سوچتا کہ کھیلتے ہوئے نہ معلوم وہ کونسا جرم کر رہا ہے) دوسرے ہار بھی بالکل برداشت نہ تھی۔ اکثر اس کی باؤلنگ پر آؤٹ نہ ہونے والے یا پھر اسے آؤٹ کرنے والے سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی خواہش کے باوجود پڑھائی یا کسی کھیل میں آگے نہ نکل سکا تھا۔ اس احساس محرومی نے اسے چڑچڑا اور حاسد بنا دیا۔ البتہ اسے ایک اطمینان ضرور تھا کہ وہ نہر میں تیرنے والے لڑکوں میں سب سے تیز پیراک بن گیا تھا، اور کم از کم نہر کے کنارے اس کی چھوٹی چھوٹی شناخت تھی۔ اس کے دوست جیسے جیسے کئی سال گزر گئے نہر پر آنے والے لڑکے بھی ایک دو سال کے بعد یہ شوق چھوڑ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو کر نہر پر آنا جانا چھوڑ گئے۔ نئے آنے والے لڑکے نہر میں اس سے اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ بلا تخصیص ان کے ساتھ نہر میں پیراکی کا مقابلہ کرنے میں اسے خود شرم محسوس ہونے لگی۔ اس طرح نہر پر بدستور معمول رونق کے باوجود وہ خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگا۔ اس کے لیے ماحول بدل چکا تھا۔ اس لیے وہ اب اکثر نہر پہ پہنچ کر اداس ہو جاتا۔ اور وہ مایوسی کے عالم میں گھنٹوں نہر کے پل پر سوچتا رہتا۔ اور اس سوچ نے اس کے ذہن میں عجیب قسم کا ردعمل پیدا کر دیا تھا۔ اسے پڑھنے والے لڑکوں سے پہلے ہی نفرت تھی۔ خاص طور پر اس کے محلے کے پڑھنے والے لڑکے تو بہت ہی برے لگتے تھے، کچھ اس لیے بھی کہ اکثر وقت اس کے والدین ان لڑکوں سے اس کا تقابل کرتے ہوئے اسے ملامت کرتے تھے۔ اب اسے کاروں میں بیٹھے اچھے کپڑوں میں ملبوس سکول جاتے بچے نظر آتے تو اس کو کوفت ہوتی، وہ چاہتا کہ ان گزرتی گاڑیوں پر پتھر مار کر شیشے توڑ دے۔ لیکن اس کا ان میں سے کسی بات پر بھی بس نہ تھا۔ لہٰذا وہ اکثر خود سے الجھ جاتا۔ خاص طور پر طارق کو دیکھ کر وہ عجیب الجھن کا شکار ہو جاتا۔۔۔ فخرو کو طارق سکول آتے جاتے ضرور ملتا۔ پھر وہ باقاعدگی سے شام کو سکول میں فٹ بال کھیلنے جاتا اور مغرب سے پہلے آ کر پڑھائی میں مصروف ہو جاتا۔

طارق ایک اچھا پیراک بھی تھا، لیکن وہ نہر کی بجائے سکول کے تالاب کے صاف ستھرے پانی میں تیرتا تھا اور اس نے مقابلوں میں انعامات بھی حاصل کیے تھے۔ فخرو کو طارق کی عادتوں اور کامیابیوں سے چڑ ہو گئی تھی جو وقت کے ساتھ حسد میں تبدیل ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ طارق یا تو اس جیسا ہو جائے یا اسے کچھ بھی ہو جائے کہ اس کی موجودہ پوزیشن نہ رہے۔ فخرو اپنے ذہن میں طارق کے لیے حسد اور احساس کمتری کا امتزاج لیے جوانی میں قدم رکھنے لگا۔ عمر کے ساتھ ساتھ فخرو کا احساس محرومی اور بڑھتا گیا۔ اس کے ہم عمر کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو کر مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ وہ اب بچہ نہ رہا تھا بلکہ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا۔ پھر وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا اس کا حصول ظاہراً اس کے بس میں نہ تھا

کیونکہ اس کے حصول کی سمت میں کام کرنے کا وقت اب گزر چکا تھا۔

طارق نے ایف۔ اے میں پاس ہو کر وظیفہ حاصل کیا۔ اس خوشی میں طارق کے والدین نے مٹھائی تقسیم کی جو اس کے گھر بھی آئی۔ جب وہ مٹھائی کھا رہا تھا تو اس کے والدین اسے نہ پڑھنے پر برا بھلا کہہ رہے تھے۔ حالانکہ اسے پڑھائی چھوڑے بھی کئی سال ہو گئے تھے۔ اسے طارق کی کامیابی اور مٹھائی اچھی نہ لگی۔ اس کا بس چلتا تو وہ مٹھائی طارق کے گھر پھینک آتا۔ اپنے والدین کی ملامت سن کر وہ رنج، غصہ اور مایوسی کے عالم میں گھر سے نکل کر غیر ارادی طور پر نہر کے پل پر آ کر بیٹھ گیا اور بے ربط سوچ میں گم ہو گیا۔ ابھی وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اس کے سامنے سے ایک جلوس گزرنے لگا۔

اس جلوس کے آتے ہی سڑک پر چلنے والی کاریں اپنا راستہ بدل کر ادھر اُدھر جانے لگیں۔ شیشے کے شوکیس والی دکانوں کے دکان داروں نے اپنی دکانوں کے شٹر بند کرنے شروع کر دیے۔ چوک پر کھڑا ٹریفک کا سپاہی اپنی جگہ چھوڑ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ سڑک پر جلد ہی جلوس کا راج ہو گیا۔ کچھ لوگ نعرے بلند کر رہے تھے۔ کچھ دکان داروں کو ڈنڈے اور پتھر دکھا کر ہراساں کر رہے تھے۔ چند نے دکانوں کے شیشے پتھر مار کر توڑ دیے۔ ایک گروہ نے چوک میں ٹائر رکھ کر آگ لگا دی جس سے گہرے دھوئیں کے بادل امڈنے لگے۔ فخرو نہر کے پل پر بیٹھے بیٹھے جلوس کی حرکات دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ جلوس کے شرکاء بہت سے وہ کام کر رہے تھے جنہیں وہ بچپن سے سرانجام دینے کی سوچتا تھا لیکن خوف اور کم ہمتی سے کر نہیں پا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہم عمر لڑکے کو ڈنڈا سنبھالے پاس سے گزرتے دیکھ کر اس سے پوچھا۔ ''او یار۔ یہ سب کیا ہے۔ جلوس کس بات کا ہے اور کس کے خلاف ہے؟''

لڑکے نے چلتے چلتے فخرو سے کہا۔ ''بس یار تو بھی آ جا۔ مجھے بھی صحیح معلوم نہیں' بس دنگا فساد ہے مزہ آئے گا۔'' دنگا فساد کا سن کر فخرو پل سے اترا اور مجمع میں شامل ہو کر جلدی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں بس جل رہی تھی۔ جلوس میں شمولیت کے بعد اس نے چاہا کہ وہ ان پولیس والوں کی وردی پھاڑ دے اور گھسیٹ کر نہر میں ڈبو دے۔ دوکانوں کے تمام شیشے توڑ دے۔ گاڑیاں جلا دے اور اس وقت اسے طارق مل جائے تو اسے پتھر مار مار کر برا حال کر دے۔ کچھ دیر بعد موقع پر پولیس پہنچی جس نے آتے ہی لاٹھی اور آنسو گیس کا استعمال شروع کر دیا۔ اس دوران آنسو گیس کا ایک شیل فخرو کے پاؤں کے پنجے پر پڑا اور وہ ٹھہر کر ابھی پاؤں کو سہلانے لگا ہی تھا کہ دو پولیس والوں نے اسے دونوں ٹانگوں اور ایک ہاتھ سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے لے جا کر پولیس کی گاڑی میں کسی چارے سے بھری بوری کی طرح پھینک دیا۔ پولیس گاڑی میں گرتے ہوئے اس کی کہنی اور کمر میں کافی چوٹ آئی۔ فخرو یکدم گھبرا گیا۔ ابھی بمشکل گاڑی میں کھڑا ہوا تھا کہ یکے بعد دیگرے اسی طرح کافی لوگ گاڑی میں پھینک دیے گئے۔ آہستہ آہستہ گاڑی اتنی بھر گئی کہ وہاں پھنس کر کھڑا ہونا بھی مشکل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کا عقبی آہنی دروازہ بند کر دیا گیا اور گاڑی ایک دھچکے

کے ساتھ چل پڑے۔ گاڑی میں زیادہ ہجوم سے فخرو کا دم گھٹنے لگا لیکن وہاں سب کا حال یہی تھا اور ایک دوسرے کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ آخرکار ایک تھانے کے صحن میں جا کر گاڑی ٹھہری۔ وہاں وہ سب اترے۔ تھانے کے سپاہیوں نے کھینچ کھینچ کر ان سب کو نیچے اتارا اور دھکیلتے ہوئے سب کو تھانے کے اندرونی برآمدے میں لے گئے۔ جہاں ان سب کو مرغا بننے سے پہلے ہی کان پکڑنے کا حکم بلند آواز میں صادر ہوا کہ اکثریت نے آواز کی کرختگی سے مرعوب ہو کر فوراً بلا چوں چراں سب نے کان پکڑ لیے۔ البتہ کچھ لوگ جو باتوں اور حرکتوں میں اس قسم کے حالات کا تجربہ رکھتے تھے کان پکڑنے سے پہلے پولیس والوں کی خوشامد اس انداز میں کرنے لگے کہ وہ پولیس کے اصرار کے باوجود اپنی ماہرانہ چرب زبانی سے باتوں میں الجھا کر کان پکڑنے کی زحمت سے بچے ہوئے تھے۔ فخرو کچھ دیر بعد کان پکڑنے کی تکلیف اور پاؤں کے درد سے بے چین ہو گیا لیکن تکلیف کے باوجود اس میں کان چھوڑنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ خود کو کوسنے لگا کہ بلاوجہ جھنجھٹ میں پھنس گیا۔ اسے یہاں سے چھٹکارا پانے کی کوئی راہ نظر نہ آ رہی تھی۔ اس کی اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ پولیس سے اپنی بے گناہی کے بارے بات کر سکے۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد دو پولیس کے افسران آئے اور آتے ہی کہا ''شاباش بھئی شاباش کیا خوبصورت منظر بنایا ہے''

''جناب ان بدمعاشوں کو ذرا ''پارپرس'' کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ یہ سب اول درجے کے بدمعاش ہیں اور آج جلوس میں ہمارے ساتھ بدتمیزی بھی کی ہے اور دوکانوں اور دیگر چیزوں کو نقصان بھی پہنچایا۔'' وہاں کھڑے پولیس ملازمین نے سلوٹ کرنے کے بعد جواب دیا۔

''کیوں وئے۔ بدمعاشو!'' نئے آنے والے پولیس افسر نے نزدیک ہی کان پکڑے ہوئے کی کمر پر چھڑی مارتے ہوئے پوچھا۔ ''بدمعاشی تو اب تمہاری نکل جائے گی۔'' جس کی کمر میں چھڑی ماری تھی وہ تکلیف سے بلبلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ ''جناب میں تو گھر سے سودا لینے نکلا تھا کہ جلوس میں پکڑا گیا' اصل لوگ تو بھاگ گئے۔ میں تو ــــ۔

''یہاں آ کر تم سب بے گناہ اور شریف بنتے ہو۔ ہاں سڑکوں پر پانے خاں کے سالوں کی طرح اتراتے ہو۔ میدان میں تم آزاد تھے جو تمہارے دل میں آیا کیا۔ یہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق تم سے سلوک کریں گے۔''

کافی دیر تک فخرو کان پکڑے رہا۔ شام ہونے تک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پکڑے جانے والوں کو کوئی نہ کوئی سفارشی انہیں اپنی ضمانت پر چھڑا لے گیا۔ فخرو تھانے میں اکیلا رہ گیا۔ اب اسے اپنے گھر اور ماں باپ کی یاد آنے لگی۔ ابھی وہ فرش پر بیٹھا اپنے پاؤں کی چوٹ کو سہلا رہا تھا کہ ایک پولیس افسر تھانے میں داخل ہوا۔ جب اس کی نظر فخرو پر پڑی تو وہ دور سے ہی کڑک دار آواز میں سپاہی سے

مخاطب ہو۔ "یہ کون ہے اوئے"

فخرو دور ہونے کی وجہ سے صرف آواز کی لرزش سن سکا جس سے اس نے اندازہ کیا کہ نیا افسر کو ان پکڑنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ لہٰذا اس نے بغیر سوچے سمجھے فوراً سہم کر کان پکڑ لیے۔ "اوئے کسی مرنے کی اولاد اگر اتنا ہی معصوم ہے تو ذرا ادھر آ"

یہ آواز سن کر فخرو کان چھوڑ کر ڈرتا ڈرتا افسر کی جانب بڑھنے لگا۔ افسر نے اپنی ٹوپی اور چھڑی میز پر رکھی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔ پھر فخرو کو ٹھیک طرح ٹانگیں دبانے کو کہا۔ فخرو ڈر سے تیز تیز ہاتھ ہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی افسر بولا۔

"ویسے تو کسی ماں کا بیٹا ہو کر یاست لگاتا ہے۔"

فخرو کچھ نہ سمجھا خاموش ٹانگیں دباتا رہا

"اس کی ضمانت دینے آئے گا۔ یا پھر پرچہ کاٹ دیں جناب۔" داروغہ نے پاس ہی سے کہا۔ "اوئے تو نے دیکھ اسے بدمعاش تو چھوڑ دیے اس بچے کو۔ پرکار وائی نہ کی جائے تو اسے میں دن اپنے پاس رکھوں گا، ٹانگیں اچھی دباتا ہے۔"

کچھ دیر فخرو ٹانگیں دباتا رہا۔ پھر پولیس افسر نے خود ہی اسے روک دیا اور کہا

"تیرا تو کوئی ضمانتی نظر نہیں آتا۔ جب تک تجھے ضمانتی ملے تو میرے گھر کام کر۔ اگر اچھا کام کیا تو تجھے چھٹی مل جائے گی، اور وہاں بھاگنے کی کوشش نہ کرنا، تجھے قبر سے بھی نکال لوں گا۔"

فخرو کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے سپاہی کو آواز دی اور فخرو کو اپنے کوارٹر میں لے جانے کے لیے کہا۔ اس افسر کی پہلی بیوی گاؤں اور دوسری بیوی کوارٹر میں رہتی تھی۔ یہ مشہور تھا کہ دنیا اس پولیس افسر سے اور یہ پولیس افسر اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔ اس کی بیگم بہت چڑچڑے مزاج کی تھی، اسی وجہ سے کوئی نوکر گھر میں نہیں ٹکتا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں گھر کا نوکر بھاگا ہوا تھا جس کی وجہ سے بیگم کا پارہ چڑھا تھا

فخرو گھر میں سہما سہما داخل ہوا تو بیگم نے اسے دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔ "کس مریل کو چوہدری نے بھیجا ہے۔" پھر کچھ توقف کے بعد چیخی۔ "کم بختو تم سب قیدیوں کی طرح آتے ہو اور ذرا ڈھنگ کی روٹی پیٹ میں پڑ جائے تو افلاطون کی طرح نخرے کرتے ہو۔ دیکھ ٹھیک ٹھیک کام کرے گا تو آرام سے رہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے فخرو کو برتن دھونے پر لگا دیا۔ فخرو نے زندگی میں برتن کبھی نہ دھوئے تھے۔ لیکن پٹائی کے خوف سے اس نے احتیاط سے برتن اس طرح صاف کیے کہ بیگم کو پسند آ گئے۔ اسی طرح دوسرے گھریلو کام بھی اس نے بیگم کی حسب پسند کر دیے۔ وہ اب تک تھک کر چور ہو چکا تھا اور بھوک بھی لگی تھی لیکن وہ سہما سہما کام کرتا رہا۔ اسے بیگم سے کھانا مانگنے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ فخرو کے کام سے کچھ خوش ہوئی تو بیگم

کا مزاج کچھ دھیما ہوا اور فخرو کو کھانا دے دیا۔ فخرو کھانا کھا چکا تو بیگم نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا

''دیکھ اب تو کام سیکھ گیا ہے' اگر بھاگا تو حلال کر دوں گی۔''

فخرو کئی دن پولیس افسر کے گھر کام کرتا رہا۔ اس دوران وہ تھانے بھی آتا جاتا رہا۔ مار کھانے کے بعد تھانے کی مار کا خوف تو جاتا رہا تھا۔ اس طرح کی آمد و رفت وہ اس تھانے کے ماحول سے مانوس ہو کر پر اعتماد ہو گیا تھا۔ وہاں کے بہت سے معاملات نپٹانے کے طریقوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ پھر بیگم کی پسندیدگی کا اثر افسر پر بھی ہوا۔ وہ [illegible] کا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ تین چار [illegible] تک فخرو کا باپ اسے پریشانی کے عالم میں ڈھونڈتا رہا۔ بالآخر تھانے آ کر منت سماجت سے فخرو [illegible] فخرو کو رخصت کرتے وقت بیگم نے اس کے کام کی تعریف کی اور اسے آتے جاتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔ چوہدری تو اپنے مزاج کا آدمی ہے میں تیرا کام کراؤں گی۔'' بیگم کی یقین دہانی پر فخرو کو مزید حوصلہ ملا۔

گھر واپس آ کر اس نے محلے والوں سے پولیس افسر کے پاس رہ کر مزے کرنے اور واقفیت پیدا کرنے کے قصے بیان کئے اور کچھ اس قسم کا تاثر دیا جیسے اب وہ پولیس میں کافی اثر و رسوخ حاصل کر چکا ہے۔ وہ اکثر بیگم کے پاس سلام کرنے جاتا جس سے اس کے دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی۔ بیگم کے چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے آنے جانے سے فوری فائدہ یہ ہوا کہ فخرو کے باپ نے بلا خوف ایک چوک میں ریڑھی لگانی شروع کر دی اور پولیس کی بے جا پکڑ دھکڑ سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ اس طرح اس کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اب وہ فخرو کو کارآمد سمجھنے لگا۔ اہل محلہ بھی اس بات سے متاثر ہوئے کچھ غریب چھابہ فروش بھی فخرو کی سفارش پر پولیس کی بے جا پوچھ گچھ سے بچ کر فخرو کی معتبری کے قائل ہو گئے۔ پھر ایک دن فخرو کے محلے میں پولیس کا چھاپہ پڑا۔ فخرو شور سن کر باہر آیا تو وہی پولیس افسر پکڑے ہوئے لوگوں پر بری طرح برس رہا تھا۔ وہ سب نیچی نظریں کئے زمین پر بیٹھے تھے۔ فخرو کچھ دیر مجمع میں کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ پھر ہمت کر کے آگے بڑھا اور پولیس افسر کو سلام کیا۔ جس پر افسر نے کہا۔

''اوئے تو بھی اسی محلے میں ان بدمعاشوں کے ساتھ رہتا ہے اور اتنے عرصہ آنے جانے کے باوجود کبھی ان کے دھندوں کا نہیں بتایا۔''

تھانے اور محلے کے ان لوگوں کے لیے فخرو کی تھانے میں واقفیت اور رابطہ بہت کام آیا۔ بالآخر یہ لوگ تھانے سے چھوٹ گئے۔ اب فخرو کی معتبری' افادیت اور حیثیت ان بدمعاشوں میں بھی تسلیم کی جانے لگی۔ فخرو محلے میں داخل ہوتا تو اس کی چال بدل جاتی' کیونکہ فخرو کی وساطت سے تھانے میں لوگوں کے بہت سے کام ہونے لگے۔ وہ اب بے دھڑک پولیس افسر سے کام نکلوا لیتا اور جہاں کچھ پس و پیش کرتا تو

فخرو اس کی بیوی کی چاپلوسی کر کے کام نکلوانے میں کامیاب ہو جاتا۔

فخرو نے تھانے اور عزیزوں کے معاملات طے کرنے میں کامیاب حصہ لے کر اپنا اور سب کا بھلا کرا دیا تھا۔ اس نے فخرو کو مالی خوشحالی سے دوچار کیا۔ خوشحالی کا یہ آسان نسخہ اسے بہت پسند اور راس آیا۔ جب تعلقات میں زیادہ اعتماد اور استحکام آیا تو پولیس نے فخرو کو برآمدگیوں، چھاپوں اور مختلف کارروائیوں میں ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ وقت کی مناسبت سے پولیس کی خواہش کے مطابق گواہی دینے میں بھی فخرو نے مہارت حاصل کر لی۔ اس طرح اس کا کچہری کے اہلکاروں میں آنا جانا ہو گیا اور راہ و رسم بڑھتے بڑھتے اس کا افسران میں بھی آنا جانا ہو گیا۔ طبیعتاً فخرو واقفیت پیدا کرنے کے لیے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا تھا۔ چند تبادلے کے وقت کسی افسر کا سامان اپنی زیر نگرانی ٹرک وغیرہ میں لاد کر احتیاط سے منزل مقصود تک پہنچانے میں اسے بہت فائدہ ہوا۔ اب افسران کے تبادلے یا چھوٹی موٹی تقریبات میں فخرو انتظام سنبھال لیتا۔ اس رابطہ کے کچھ عرصہ بعد اس کی افسران سے جھجک جاتی رہی۔ اس نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ افسران سے واقفیت کا آسان ترین طریقہ انہیں کسی ہوٹل میں دعوت پر مدعو کرنا ہے۔ پہلی بار تو کسی ایک افسر کو کھانے کے لیے راضی کرنا مشکل رہا۔ اس کے بعد ایک دوسرے افسر کی دعوت اور اس میں ان کے دوستوں کی شمولیت نے اسے ایک خاص حلقہ میں متعارف کروا دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کو اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ کسی افسر سے کون حربہ استعمال کر کے کام نکلوایا جا سکتا ہے۔

اب فخرو کی ساکھ محلے کے مکینوں سے بڑھ کر سیاسی شخصیات تک پہنچ گئی۔ انہوں نے اندازہ کیا کہ فخرو اب بے دھڑک جلوس میں شامل ہو کر پتھر بازی کر لیتا ہے اور آگے بڑھ چڑھ کر نعرے بازی سے جلوس اور جلسوں کی رونق دوبالا کرتا ہے۔ اس میدان میں اب اس کا تجربہ کافی ہو گیا تھا۔ کبھی محلے کے کسی تھڑے پر بیٹھے ہوئے فخرو کی باتیں سننے کے قابل ہوتی تھیں۔ وہ بہت سے موضوعات پر اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار کرتا اور سننے والے اس کی پولیس اور دیگر بڑے لوگوں سے واقفیت سے مرعوب ہو کر اس کی باتیں خاموشی سے سن سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے۔

ایک دن وہ کچہری میں اہلکار کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ مقامی تحصیلدار پریشانی کے عالم میں وہاں آیا اور اہلکار سے کہنے لگا۔

”یار چوہدری فرید نے بھی کمال کیا۔ ڈی سی سے دس بسوں میں آدم لانے کا وعدہ کیا لیکن اب مکر گیا۔ میری شامت آ رہی ہے۔ اتنے آدمی کہاں سے لاؤں؟“

”آدمی کس لیے چاہئیں۔“ فخرو نے پوچھا۔

”سرکاری جلسے کے لیے چاہئیں۔“

اس کے بعد تحصیلدار نے بسوں کے کرایہ کی ادائیگی اور لوگوں کے لیے کھانے کی فراہمی کی تفصیل فخرو کو بتائی تو فخرو نے پانچ بسیں اپنے محلے سے بھر کر بھیجنے کی حامی بھر لی۔ اس قسم کے انتظامات میں فخرو کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ پانچ بسیں لے کر فخرو محلے میں اس انداز سے داخل ہوا جیسے اسے کسی سلطنت کی سربراہی مل گئی ہو۔ بسیں دیکھ کر محلے کے لوگ جمع ہو گئے۔ فخرو نے جب کھانے کے بندوبست اور یومیہ نقدی کی ادائیگی کا لوگوں سے ذکر کیا تو بہت سے تماشبین اور بیکار جوان اس کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئے۔ جن جن لوگوں کے تھانے میں پھنسے ہوئے کام کرائے تھے وہ تقریباً شامل ہو گئے۔ جب فخرو بسیں بھر چکا تو اس نے پہلی بس کی چھت پر مائیکروفون سنبھال لیا۔ مختلف جھنڈوں سے سجی بس کی چھت پر بیٹھ کر مائیک پر فخرو نے جب پہلی بار نعرہ لگایا تو اسے بہت اچھا لگا۔ اور اس کے پیچھے چار بسوں میں سوار لوگوں نے جواب میں نعرے لگائے تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک بہت بڑے لشکر کی کمان سنبھالے کوئی بہت بڑی مہم سر کرنے جا رہا ہے۔ یہ اس کی عملی سیاسی زندگی کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد بڑے بڑے جلسوں میں آدمی لے جانے کے سلسلے میں اس کا بہت سے سیاسی سرکردہ شخصیات سے رابطہ ہو گیا۔ جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ وہ ان لوگوں کی باقاعدہ میٹنگوں میں شریک ہو کر مشورے دینے لگا۔ اس دوران اسے احساس ہوا کہ بغیر پڑھے اور محنت کیے شہرت اور دولت حاصل کرنے کا راستہ اسی وادی سے ہو کر جاتا ہے۔ اب تک وہ اپنی سرگرمیوں کے باعث لوگوں کی اچھی خاصی تعداد اپنے گرد جمع کر چکا تھا۔ سیاسی اور سرکاری سطح پر موثر لوگوں سے واقفیت اور ان کے تعاون نے اسے مزید حوصلہ دیا۔ اسی بنیاد پر اس نے اپنے وارڈ سے اپنے حریفوں کو ہرا کر وارڈ کا الیکشن جیت لیا۔ اس دن وہ جلوس کی شکل میں شرکاء کے کندھے پر سوار نعروں کی گونج میں اپنے محلے میں داخل ہو کر سیدھا طارق کے گھر کی طرف گیا اور مجمع کے ساتھ دیر تک نعرے لگاتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ طارق سے وہ اس مرتبہ بازی لے گیا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ طارق اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کی حیثیت تسلیم کرے۔ نعروں کی آواز سن کر طارق گھر سے باہر آیا اور فخرو سے مخاطب ہوا۔

''آپ کو کامیابی مبارک ہو' ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا اپنا آدمی جیت گیا۔''

طارق کی بات سن کر فخرو کی انا کی بہت تسکین ہوئی۔ اس نے محسوس کیا الیکشن جیت کر اس نے علاقے کے معاملات پر کچھ اس طرح دسترس حاصل کر لی ہے کہ اب طارق بھی بہت سے کاموں میں اس کا محتاج ہو گیا۔ لہذا اس کی انتہائی خواہش ہوئی کہ طارق ہارے ہوئے پورس کی طرح جیتے ہوئے سکندر سے بادشاہوں جیسا سلوک کرنے کی درخواست کرے۔ ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ مجمع میں سے کسی نے کہا۔

''فخرو صاحب آج طارق صاحب کو بھی مبارک باد دیں۔''

''کیوں نہیں' کیوں نہیں۔ آخر میری کامیابی پر طارق کو بھی مبارک باد دینی چاہیے۔'' فخرو نے

کہا۔

''نہیں جناب! نہیں ان کی اپنی کامیابی پر مبارک باد دیں۔ انہوں نے بھی مقابلے کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ بس ڈی سی' کمشنر بنیں گے۔''

فخرو کو محسوس ہوا جیسے وہ بہت اونچے مچان سے شکار مارتا مارتا شکار کے سامنے نیچے آن گرا ہے۔ یا اس کا محنت سے بنایا شاہکار ہاتھ سے چھوٹ کر چکنا چور ہو جائے۔ اسے بچپن میں طارق کے حوالے سے دیئے گئے طعنوں اور مار کی تلخی دوبارہ محسوس ہونے لگی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور ایک بار پھر سوچنے لگا کہ اگر موقع ملے تو طارق کو اسی مجمع سے پتھر مارے پھر تھانے میں مرغا بنا کر اس کے اوپر بیٹھ جائے۔

طارق کی ملازمت کی حقیقت کی تلخی سے قطع نظر' فخرو اب سیاست کے میدان کا کامیاب اور تجربہ کار کھلاڑی بن چکا تھا۔ سیٹھ وارث کی لیڈری میں اسے بہت سے ترقیاتی کاموں کے لیے رقم ملی اور ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ لوگوں کے کام کرانے میں بھی منافع رہا۔ لہٰذا کچھ دنوں میں وہ مزید دولت اور اثر و رسوخ حاصل کرتے جنرل الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لیے ملک کے بڑے لیڈر سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ الیکشن کی مہم میں اس کے ساتھ پھرتا رہا۔ اسی دوران ایک جلسہ کا انتظام اس نے اپنے علاقے میں بھی کیا جس کے لیے ایک خطیر رقم بھی فخرو کو ملی۔ فخرو نے جلسہ کی ترتیب کچھ اس طرح سے کی کہ لیڈر کی آمد پر نعرہ لگانے والوں کی ٹولیوں نے مختلف کونوں سے وقفے وقفے میں اس کے حق میں نعرے لگائے۔ ایک طرف آتش بازی چلی اور کچھ لوگ ڈھول کی تھاپ پر دھمال اور اسی طرح کے ناچ کرتے رہے۔ کرسیوں کو اس ترتیب سے رکھا گیا کہ کم تعداد کے باوجود پنڈال بھرا بھرا دکھائی دینے لگا۔ ادھر لیڈر نے علاقے کے لیے بجلی گیس' پانی اور دیگر سہولتوں کے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ جلسہ کے اختتام پر لیڈر تو جلسہ کے کامیاب ہونے اور حاضرین اپنے دیرینہ مسائل حل ہونے کی امید میں اپنی اپنی جگہ خوش خوش رخصت ہوئے۔

الیکشن میں حاجی کرم دین کو شاندار کامیابی ہوئی۔ اس نے اقتدار حاصل کر لیا۔ فخرو نے اس کے بہت قریب ہو کر کام کیا تھا۔ لہٰذا فخرو نے محسوس کیا جیسے اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ وہ کرم دین کے بہت قریب تھا۔ لہٰذا اکثر لوگ لیڈر کی کامیابی پر فخرو کو بھی مبارک باد دے رہے تھے۔ الیکشن کی کامیابی کے فوراً بعد فخرو نے حاجی کرم دین کو اپنے علاقے میں مدعو کیا۔ اس نے اپنے چند قریبی ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ حاجی کرم دین کو محلے میں بلا کر کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا

''چوہدری صاحب کو محلے کے مسائل حل کرنے کا وعدہ یاد کرایا جائے۔''

''ارے وہ تو حل ہوتے رہیں گے' تمہیں کچھ اپنے ذاتی مسائل پر غور کرنا چاہیے۔''

''پھر کچھ بھاری رقم مانگ لی جائے۔'' دوسرے نے فخرو کو رائے دی۔

''ایسے رقم لے کر اس کا حساب کس کس کو دیتے پھریں گے''؟ فخرو نے سمجھایا۔ لہٰذا جب جلسے کی کامیابی سے خوش ہو کر حاجی کرم دین فخرو سے کوئی خدمت پوچھی تو فخرو نے کہا

''جناب! ہمیں رقم وغیرہ کا کوئی لالچ نہیں' ہمیں تو عوام کی خدمت کرنی ہے جن کے لیے پولیس اور اس سے متعلقہ محکموں سے واسطہ پڑتا ہے۔ میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ اس علاقے کے تھانے کا پولیس آفیسر میری درخواست پر رکھا جائے اور موجودہ افسران کو ہدایت کی جائے کہ وہ میرا خیال رکھیں''

چوہدری کرم دین کو امید تھی کہ فخرو کوئی بڑی رقم طلب کرے گا۔ لیکن سیدھے اور آسانی سے پورے ہو جانے والا مطالبہ سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور جملہ افسران کو فخرو کا دھیان رکھنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ فخرو کا مطالبہ اس کے ساتھیوں کو عجیب سا لگا لیکن اس کی دوراندیشی کا پتہ اس وقت ہوا جب ان ہدایات کے زیر اثر اس نے لوگوں کے جائز اور ناجائز کام افسروں سے کروانے شروع کیے۔ آہستہ آہستہ فخرو کی گرفت معاملات پر مزید مضبوط ہو گئی۔ اس نے حاجی کرم دین پر زور دے کر اپنی مرضی کے مطابق عوام کی خدمت کرنے میں تعاون نہ کرنے والے افسران کے اوپر تلے تبادلے کرا دیے جس سے ملازمین میں اس کے اثر و رسوخ کی دھاک بیٹھ گئی۔ کچھ موقع شناس اور مطلب پرست افسران نے اپنی مرضی کی تعیناتی کے لیے فخرو کی خوشامد کر کے اس کا مزاج عرش پر پہنچا دیا۔ فخرو کو بھی ان افسران کو اپنے مفاد میں بروئے کار لانے کا ڈھنگ آ گیا۔ اس نے ایسے ملازمین کا گروہ اپنے گرد بنا لیا جو اپنے اور فخرو کے مفاد کو مدنظر رکھنے پر یقین رکھتے تھے۔ اس سے فخرو کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس نے سکوٹر بیچ کر کار خرید لی تھی اور شہر کے اچھے علاقے میں ایک مکان بھی خرید لیا۔

مالی طور پر مستحکم ہونے کے باوجود وہ ابھی اپنی معاشرتی پہچان سے مطمئن نہ تھا۔ لہٰذا اس نے حج پر جانے کا فیصلہ کیا۔ واپس آ کر خود کو حاجی کہلوانا اسے کافی معتبر لگتا تھا۔ لہٰذا حج سے واپس آ کر اس نے اپنا پورا نام حاجی فخر الدین شیخ لکھنا شروع کیا اور لوگ بھی اسے شیخ صاحب کے نام سے پکارنے لگے۔ لیکن اس عروج کے باوجود اسے طارق کا خیال اکثر آتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اب تک طارق اس کے پاس کسی کام کی سفارش کے لیے نہ آیا تھا اور اس کا پرانا احساس کمتری اور اس کے نتیجے میں Sub-concious میں نفرت اور اس کی سبکی کی خوابیدہ خواہش فخرو کو اندر ہی اندر کافی بے چین اور پریشان کرتی تھی۔ اب اس مقام پر پہنچ کر وہ طارق سے اپنا پرانا حساب چکانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے ایک طریقہ نکالا۔ حاجی کرم دین سے کہہ کر طارق کا تبادلہ ڈائریکٹ حاجی کرم دین کے سیکرٹریٹ میں کرا لیا۔ یہ فخر کی پہلی فتح تھی۔ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے حاجی کرم دین کے

کمرے میں اس وقت جاتا جب طارق حاجی کرم دین سے ہدایات لیتے وقت ''سر سر'' کہتا اور برتاؤ میں ادب اور احترام کا خیال رکھتا۔ فخرو اس قسم کا برتاؤ اپنے لیے بھی چاہتا تھا لیکن طارق ظاہراً اس سے متاثر نظر نہ آتا تھا۔ اکثر فخرو اندر ہی اندر چڑ تا رہتا۔ پھر ایک دن فخرو نے حاجی کرم دین سے کہا۔

''جناب! یہ طارق صاحب ہیں نا' انہیں کہہ دیں کہ عوامی بہتری کے کام کرنے میں مجھ سے تعاون کریں۔''

''کیا بات ہوئی' تمہاری سفارش پر تو میں اسے یہاں لایا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن ذرا اس سے کہہ دیں کہ ہم کارکن لوگ ہیں جو عوام کی بھلائی اور خدمت کے لیے وقف ہیں۔ ہم عوام کی تکالیف اور مسائل کے حل کے لیے ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر دفتروں میں پھرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ہماری بات سن کر کام کر دینے چاہئیں۔'' فخرو نے کہا۔

کسی بھی لیڈر کے لیے سرکاری ملازم کو حکم دینا سب سے آسان کام لگتا ہے لہٰذا طارق کو حکم دیا گیا کہ وہ فخرو سے مل کر اس کی بات سنیں اور جہاں تک ہو سکے تعاون کریں اور عوام کے مسائل حل کرنے میں فخرو کی مدد کریں۔

اس ہدایت سے فخرو کی زندگی کی دبی دبی خواہش ایک بار پھر ابھر آئی بچپن میں طارق سے موازنے کے بعد اسے ہمیشہ اپنی کمتری کا احساس دلایا جاتا تھا جس نے اس کی انا اور شخصیت کو بہت چرکے دیے تھے۔ وہ ہمیشہ طارق کو زیر کرنے کے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ اب اسے وہ موقع مل گیا تھا۔ طارق فخرو سے ملنے اس کے پاس گیا۔

اپنے ان جذبات اور احساسات سے مغلوب فخرو طارق سے بات کرنے کے انداز اور طریقے کو فوری طور پر طے نہ کر سکا۔ یہ اس کی زندگی کی دیرینہ خواہش تھی کہ طارق سے کسی بہتر پوزیشن سے بات کر کے اپنا پرانا حساب چکا سکے۔ جب طارق کمرے میں داخل ہوا تو فخرو نے خود کو اتنا مصروف ظاہر کیا جیسے کہ اس کی آمد کا علم نہ ہو سکا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہا' طارق انتظار میں رہا کہ فخرو کچھ بات کرے۔ جب وہ نہ بولا تو طارق کے بات کرنے پر فخرو نے بہت سے کام طارق کو بتا دیے

طارق خاموشی سے فخرو کی باتیں سنتا رہا۔ ایک تجربہ کار ملازم کی حیثیت سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ فخرو ماضی کے تعلقات کی حدود پھلانگ کر نیا لبادہ پہن کر بالکل نئے انداز سے بات کر رہا تھا۔ لہٰذا اس نے بھی رسمی رکھ رکھاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے خالص پیشہ ورانہ انداز میں بات کرنی مناسب سمجھی۔ جب فخرو تفصیلات بیان کر چکا تو طارق نے کہا۔

''آپ کے سب کام کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن اس میں قانونی نقطہ نظر بھی سامنے رکھا جائے

گا۔"

قانونی نقطۂ نظر کی بات فخرو کو پسند نہ آئی لہٰذا اس نے کہا "جناب موجودہ دور میں قانون کو عوامی مفاد کے لیے حسبِ ضرورت ڈھالنا پڑتا ہے پھر اس صورت میں کہ فیصلہ قاعدے قانون کے مطابق کام ہو سکتا تو ہماری اس میٹنگ کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو خود بخود ہو ہی جاتا۔"

"آپ کی بات کسی حد تک درست ہے لیکن بالکل قاعدے قانون کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔" طارق نے کہا۔

"طارق صاحب کمال کرتے ہیں ہم ہی تو قانون بناتے ہیں لہٰذا عوامی مفاد میں جب چاہیں حسبِ ضرورت تبدیل کر سکتے ہیں۔ آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" فخرو نے تیکھے لہجے میں کہا

"اعتراض نہیں بلکہ اعتراف ہے کہ آپ قانون بدل سکتے ہیں۔ لیکن قانون بدلنے سے ہی اصول اور طریقے ہیں۔ ہر جگہ انسان کے لیے موقع کی مناسبت سے قانون نہیں بدلا جا سکتا۔" فخرو اس بات کو نہ تو پوری طرح سمجھ سکا اور نہ برداشت کر سکا۔ لہٰذا درشت تلخ لہجے میں بولا "جناب آپ کی اس Rigidity سے قوم کو بہت نقصان ہوا ہے۔ مسائل اپنی جگہ بڑھتے جا رہے ہیں اور آپ قاعدہ قانون کی بات کیے فائلوں پر بکھیرے مسائل کو ادھر سے ادھر پھینکتے رہتے ہیں۔ آپ سن لیں کہ اب یہ عدم تعاون کا برتاؤ برداشت نہ ہوگا۔ اب کام ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔"

"ہمارا تعاون آپ کے لیے رہے گا۔" طارق نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تعاون نہیں جناب ہمیں تعمیل چاہیے۔" فخرو نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ طارق اس بحث اور برتاؤ کے لیے تیار نہ تھا' لہٰذا اس نے معاملہ سلجھانے اور بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا جہاں تک ہو سکے گا۔ قاعدہ کے مطابق آپ کے بتائے ہوئے کام ہو جائیں گے۔"

فخرو کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ آج وہ طارق کو مغلوب کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اگرچہ سرکاری ملازمین کے تبادلوں کے سلسلوں میں فخرو اپنی حیثیت منوا چکا تھا لیکن اس وقت طارق پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس برتاؤ نے فخرو کو مزید ذہنی الجھاؤ میں ڈال دیا۔ اس کا اپنا مقصد اور خواہش پوری نہ ہو سکی۔ وہ زخم خوردہ' ناکامی کا احساس لیے دیر تک سوچتا رہا۔ اقتدار' اختیار اور مفادات کی نئی بچھائی جانے والی بساط پر طارق کا وجود اور حیثیت ایک ایسے مہرے کی تھی جس کا موقع سے پرے رکھنا بہت ضروری تھا۔ یہ سوچ کر وہ سیدھا حاجی کرم دین کے پاس گیا۔ فخرو جب واپس لوٹا تو طارق بغیر کسی دوسری تعیناتی کے تبدیل ہو کر اپنی نئی تعیناتی کے انتظار کے لیے گھر جا چکا تھا۔ لیکن اس تمام کشمکش کے انجام میں

دونوں فریقین یعنی اپنی جگہ خوش اور مطمئن تھے۔ جہاں فخرو سمجھتا تھا کہ طارق کا تبادلہ اس کی فتح ہے وہاں طارق سمجھتا تھا کہ اصولوں کی خاطر اس قسم کے نتائج اس کے لیے قابل فخر ہیں۔

طارق کے بعد آنے والے افسران نے فخرو کے ساتھ پورا پورا ''تعاون'' کیا اور ذاتی فائدہ بھی اٹھایا۔ اس سے جہاں ادروں کا بھلا ہوا وہاں یہ ماحول اور طریقہ کار فخرو کے لیے بھی بہت سازگار اور سودمند رہا۔ وہ ترقی کی منازل طے کرتا رہا شہر کے بہترین علاقے میں بہت بڑے ''بنگلے'' کاروں اور بہت بزنس کا مالک ہو گیا۔ وہ اپنی رہائش پر ممتاز صاحب اقتدار و اختیار شخصیات کی دعوتوں کا اہتمام کر کے اپنے حلقہ احباب میں اضافہ کرتا گیا۔ وہ بھی فخرو سے وابستہ مفادات کے پیش نظر ان ضیافتوں میں شمولیت کرتے کیونکہ یہ مراسم باہمی بقا کے اصول پر قائم کیے گئے تھے۔

پھر ملک کا سیاسی موسم بدلا اور سیاسی شخصی ٹکراؤ میں شدت آ گئی۔ یہ کسی پالیسی یا اقتصادی پروگرام کا اختلاف نہ تھا بلکہ ایک دوسرے کو پچھاڑ کر اقتدار تک پہنچنے کی نئی نئی ترکیبوں اور کوششوں کا نیا آغاز تھا۔ شہروں میں ہنگامے اور جلسہ جلوس کا سلسلہ شروع ہوا جس میں حاجی کرم دین کی پوزیشن توڑ جوڑ میں کمزور ہوتی گئی۔ فخرو جاہل ضرور تھا لیکن خطرات کو بھانپ کر اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی حس اور اہلیت بہت زیادہ تھی۔ ابھی تک ہر بحث میں وہ حاجی کرم دین کی تعریف ہی کرتا اور اس پر تنقید کرنے والوں سے جھگڑے مول لیتا رہا تھا اور لیکن بدلتے حالات کے تحت وہ اب کرم دین کی برائیاں اور کمزوریوں کا تذکرہ سن کر خاموش رہنے لگا۔ جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو اس نے کہنا شروع کیا

''او جی کرم دین صاحب بھی بادشاہ بندے اپنی مرضی کے مالک ہیں کبھی کسی کی بات نہیں سنتے لیکن ہم تو جی انہیں سمجھاتے ہی رہتے ہیں۔''

پھر کچھ مزید دن گزرے تو اس نے کہنا شروع کیا ''کیا پوچھتے ہو جناب! میرا تو ان سے بہت سی باتوں میں اختلاف ہے وہ تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔ اپنے خوشامدیوں اور مطلبی ٹولے کے زیر اثر آ کر بے بس ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہم نے تو اب آنا جانا کم کر دیا ہے۔'' فخرو نے واقعی کرم دین کے پاس اپنی بیماری یا دوسرے بہانے بنا کر آمد و رفت کم کر دی تھی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد جب کرم دین کے سیاسی حالات مزید خراب ہوئے تو فخرو نے دبی زبان میں مخالفت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ کرم دین کے مخالف کے ساتھیوں سے خفیہ رابطے کے بعد اپنے سیاسی اثر و رسوخ اور افادیت کا ان سے تذکرہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ سیاست کے میدان میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ پھر انہی کے ذریعہ یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ اب وہ حاجی کرم دین سے تنگ آ چکا ہے اور چوہدری عمر دراز کی سیاسی بصیرت، قابلیت اور عوام کے لیے ہمدردی کے جذبے سے

متاثر ہو گیا ہے لہٰذا عوامی بھلائی کے کاموں میں ان سے مل کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے زیر اثر محلے میں ایک شاندار کارنر میٹنگ کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ چوہدری عمر دراز کو اس موقع پر اصول اور پرانی باتوں کو بھول کر خود کو سیاسی طور پر مضبوط کرنا تھا۔

اس نے فخرو کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا۔ حمایت کے لیے شکریہ اور میٹنگ کے خرچ کے لیے رقم بھی ادا کر دی۔ فخرو نے کارنر میٹنگ کی حامی تو بھر لی لیکن وہ محلے میں جا کر چوہدری عمر دراز کی حمایت میں لوگوں کے سامنے بات کرنے میں ہچکچا رہا تھا کیونکہ ان ہی لوگوں کے سامنے کرم دین کی تعریفیں کرتا رہا تھا اور ان ہی کی بدولت وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ مگر اس نے ایک سکیم کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ پہلے اس نے محلے کے چیدہ چیدہ اشخاص کو بلا کر بات کی اور کچھ مالی امداد بھی کر دی۔ وہ لوگ محلے کے مختلف مقام پر عمر دراز کی تعریف کر کے لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنے اور فخرو کے خیالات کا اظہار کر کے ان کا رد عمل دیکھتے رہے۔ آخر جب فخرو کی آمد کے لیے حالات سازگار ہو گئے تو فخرو محلے میں گیا اور لوگوں کو بتایا:

”مجھے اپنی ذات اور مفادات سے زیادہ آپ لوگوں کی بھلائی پیش نظر ہے۔ حاجی کرم دین میرے دوست سہی لیکن میری کوشش کے باوجود وہ ہمارے مسائل حل نہ کر سکے۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ اب میں نے عمر دراز صاحب کو دیکھا ہے وہ آپ لوگوں کے لیے بہت درد رکھتے ہیں اور محنت کر رہے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ وہ خدا ترس، ایماندار اور صاف ستھری سیاست پر یقین رکھتے ہوئے آپ کی بھلائی کے لیے ضرور مثبت قدم اٹھائیں گے۔“

فخرو کی بات سن کر لوگوں کی آنکھوں میں ان کی محرومیوں کے ازالہ اور مسائل کے حل اور فلاح و بہبود کی امید کے دیے پھر سے جلنے لگے۔ وہ نئے لیڈر کے استقبال کی تیاری پرانے ولولے، جوش اور خلوص کے ساتھ کرنے لگے۔ ان کے بس میں اتنا ہی کچھ تھا کہ ہر نئے آنے والوں کے وعدوں پر اپنی سادہ لوحی سے یقین کر لیں۔ آخر کار فخرو علاقے کے لوگوں کو جمع کر کے میٹنگ کے انتظام مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ نعرے جو کوئی سال تک حاجی کرم دین کے حق میں اس کے نام سے منسوب کر کے ان لوگوں نے لگائے تھے اب وہ صرف نام بدل کر عمر دراز کے حق میں لگانے کی مشق اور تیاری کرنے لگے۔ کچھ لوگ پرانے نعروں کے کچھ اتنے عادی تھے کہ پریکٹس کے دوران بار بار کرم دین کے نام کا نعرہ لگا دیتے تھے۔ فخرو فوراً اچھل ”اور کیا کرتا ہے۔ ذرا دھیان سے نعرہ لگا۔“

کارنر میٹنگ بہت کامیاب رہی لوگوں نے ڈھول بجا کر پٹاخے چلا کر بھنگڑا ڈال کر عمر دراز کا استقبال کیا اپنے حق میں نعرے بازی سن کر عمر دراز بہت خوش ہوئے اور اپنی تقریر میں محلے کے لوگوں کی قسمت بدلنے کا وعدہ کیا۔ میٹنگ کے بعد محلے کے لوگ اور عمر دراز اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ محلے کے لوگ

مختلف ٹولیوں میں جمع ہو کر عمر دراز کے دورِ اقتدار میں اپنی تکالیف کے ازالے کی امید میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ فخرو تمام انتظامات کی وجہ سے تھک گیا تھا لہٰذا وہ شوکت علی کی بیٹھک میں آرام کے لیے کچھ دیر کے لیے بیٹھ گیا۔ وہاں آپس میں سیاست کی باتیں ہونے لگیں۔ سب نے اپنی بساط کے مطابق بات کی۔ ان میں سے ایک نے فخرو سے پوچھا

''جناب! آپ نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے بروقت چوہدری عمر دراز کی حمایت کا ارادہ کرلیا۔ سچ ہے کہ مردم شناسی آپ پر ختم ہے۔ ہیرے کی پہچان تو جوہری ہی کو ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ سب تبدیلی آپ میں کیسے آئی۔''

فخرو اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول گیا۔ پھر زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''بس دیکھو دوستو ہمارے جیسے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔''

''اس میں اتنے بڑے جوہری ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہم صرف اپنا ذاتی مفاد مدنظر رکھتے ہیں جہاں یہ پورا ہوتا نظر آئے ادھر رخ کر لیتے ہیں۔ مجموعی مسائل اور بھلائی سے کوئی سروکار نہیں پھر اس ملک کے مسائل عوام اور لیڈر سب ایک جیسے ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیڈر لوگ بس اپنے مفاد کا کھیل کھیلتے اور آتے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم بھی وقت کے ساتھ ان کی تصویریں بدلتے ہیں۔ چوکھٹا وہی رہتا ہے ہم وہیں رہتے ہیں' مسائل بھی ابھی تک اسی طرح موجود ہیں مگر یہ سب کچھ زیادہ دیر نہ چلے گا۔ اس میں تبدیلی ناگزیر ہو چلی ہے۔''

نزدیک ہی بیٹھے بدر نے یہ بات کی تو فخرو تلملا اٹھا جیسے کسی نے اسے گالی دے دی ہو۔ جھنجھلاتے ہوئے اس نے کہا: ''اوئے تو کیا فلاسفروں کی باتیں کر رہا ہے۔ اگر بی اے کرلیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بڑوں کی باتوں میں دخل دینے لگے۔

دراصل فخرو بدر کی بات نہ سمجھ سکا تھا۔ تبدیلی کا لفظ سن کر اس کو فکر ہوئی کہ شاید وہ فخرو کی تبدیلی کی بات کر رہا ہے۔ فخرو کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا لہٰذا پھر چیخا:

''صادق اپنے بیٹے کو سمجھا۔ ایسی باتیں نہ کیا کرے۔'

''جناب خیال نہ کریں' بی اے کرنے کے بعد طویل بیکاری کی وجہ سے یہ الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگا ہے۔ کچھ دنوں بعد اس کا دماغ بھی ٹھکانے آ جائے گا۔''

''بی اے کا سن کر فخرو کو طارق یاد آ گیا اور اس کے جسم پر پھر چیونٹیاں کاٹنے لگیں۔

بالآخر الیکشن ہوا جس میں عمر دراز کامیاب ہوا۔ اسی دوران طارق کی نئی تعیناتی بھی ہو گئی

اپنی پوزیشن مزید مستحکم اور واضح کرنے کے لیے فخرو نے مرکزی مدیت میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ جلوس طارق کے دفتر کے سامنے سے گزرا تو طارق شور سن کر دیکھنے کے لیے بالکونی پر آ گیا۔ ٹرک پر سوار فخرو کی نظر بھی طارق پر پڑی۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے طارق کو دیکھتا رہا۔ اس نے ذہن میں پھر ماضی کی فلم چلنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ ابھی ایک مرحلہ طے کرنا باقی ہے پھر [illegible] گا۔

"کل ہی عمرو دراز سے کہہ کر طارق کو بلاؤں گا اور پھر عوامی مسائل حل کرنے میں اسے تعاون کے لیے زور دوں گا۔ آخر یہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اسے میری بات ماننی ہی پڑے گی۔"

ایک انسان کی موت

فکر تونسوی

شہر کے سب سے بڑے اور بارونق پل پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی ابھی دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اس نے دانائی یہ برتی کہ پل کے فٹ پاتھ پر مرا۔ اگر وہ پل کے عین درمیان مرتا تو ٹریفک رک جاتا اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی۔۔۔ مرنے والے زندہ رہنے والوں سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتے ہیں۔

"ارے! ۔۔۔ یہ تو شمبھو فقیر ہے"۔۔۔۔ شمبھو فقیر کے ایک کامریڈ نندو فقیر نے آ کر اعلان کیا۔۔۔ نندو فقیر شمبھو فقیر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا ہے، اس لئے پڑوسی ہونے کے ناطے سے اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اٹھ کر آئے اور لوگوں کو بتائے کہ میرے مرحوم پڑوسی کا نام کیا ہے۔۔۔ چنانچہ وہ لنگڑاتا ہوا آیا۔ لاش پر جھکا اور چور سی فاتحانہ نگاہ شمبھو پر ڈالی، جیسے وہ نگاہ کہہ رہی ہو۔۔۔ میں نہ کہتا تھا شمبھو! آخر تم مر جاؤ گے اور تمہاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر بھیک مانگنا پڑے گی؟"

شمبھو۔۔۔ قسمت کا دھنی تھا کیونکہ وہ عین اس نادر موقع پر بیٹھا کرتا تھا جہاں سے پل کے پہلو سے اترنے چڑھنے والی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں اور اسکے کامریڈ نندو فقیر نے اس نادر جگہ کو حاصل کرنے کے لئے نجانے لاکھوں بار دعا کی تھی، جب کہیں جا کر شمبھو مرا ہے۔۔۔

نندو نے اپنے کان پر سے ادھ جلی بیڑی اتاری ہے اور شمبھو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی اور بیڑی سلگا کر، ماچس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے۔۔۔ "میرا اور شمبھو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم بالکل جگری دوستوں کی طرح بھیک مانگا کرتے تھے۔ آہ، بھگوان نے اسے مجھ سے پہلے بلا لیا۔۔۔"

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بڑی حد تک وہ رونے لگا ہے۔ اور روتے روتے قریب سے

گزرتی ہوئی ایک اَپ ٹو ڈیٹ اور خوشحال حسینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا ہے۔۔۔ "بی بی بھگوان کے نام پر ایک پیسہ، بھگوان تجھے امیر بنائے رکھے"۔

شمبھو کا منہ کھلا ہوا ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں بھیک مانگنے کا انداز نہیں ہے۔ کیونکہ موت کے بعد اس کے لئے بھیک مانگنا غیرضروری ہے۔ اس کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے ہیں، اس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیکا پھیکا سا ہو گیا ہے، کلائی کی ہڈیاں اور نیلی نیلی رگیں پوری آب و تاب سے ابھر آئی ہیں۔۔۔ غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر لاش کو خوبصورت کہا جا سکے۔ لباس دریدہ اور میلا پرانا ہے۔ دو تین جگہوں پر جو پیوند لگے ہوئے ہیں وہ اصلی لباس سے زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یہ مسرت ہوتی ہے کہ شمبھو کا پیوند لگانے کا طریقہ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شمبھو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر پرانے بوٹوں کا سوداگر بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے پرانے بوٹوں کو فٹ پاتھ پر نہایت نفاست اور تنظیم سے سجائے بیٹھا ہے۔ اپنے ایک گاہک کے ساتھ سودا پٹانے میں مصروف ہے۔ وہ شمبھو فقیر کی گداگری سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے کیونکہ شمبھو نے کبھی اس سے پرانا بوٹ نہیں خریدا تھا، اسی لئے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شمبھو فقیر مر گیا ہے وہ اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے۔۔۔ "جناب میں نے یہ بوٹ امریکہ کے ایک خاص فوجی آفیسر سے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے پہن کر فوجی آفیسر معلوم ہوں گے"۔

شمبھو مرا پڑا ہے اور ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر جو شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بنانے میں مصروف ہے۔۔۔ اس سے پرے ایک جوتشی پانسے پھینک رہا ہے اور غیب کے خزانے ڈھونڈنے میں جتا ہوا ہے۔ ایک بھدی سی بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کی عورت اپنے میلے دانت کھول کر ہنس رہی ہے اور مردوں کے ہاتھ سانڈے کا تیل بیچ رہی ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شوخ و شنگ کنواری لڑکی اپنے ایک کنوارے عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے اور کنوارا عاشق کہہ رہا ہے کہ یہ آئس کریم تمہارے ہونٹوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے۔ ایک ریفیوجی چھوکرا گلے سڑے کیلوں کی ٹوکری اٹھائے اس حسین کنواری کی منت خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آئس کریم سے زیادہ میٹھے اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ساری ٹوکری صرف دو آنے میں دینے کو تیار ہے۔۔۔ سارا فٹ پاتھ زندہ رہنے میں مصروف ہے۔۔۔ شمبھو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مر گیا ہے، یہی اطلاع کافی ہے۔ اس سے زیادہ اطلاع کے لئے ان کے ذہن میں جگہ نہیں ہے، کیونکہ ان کے ذہن کی بیشتر جگہ پرانے بوٹوں، آئس کریموں، غیب

کے فرغلوں، ساتھے کے تیل اور گلے سڑے کیلوں سے گھری ہوئی ہے۔

''اسے کیا ہو گیا ہے''؟ لاش کے قریب سے گزرتے ہوئے یک معزز سے آدمی نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے یہ مر گیا ہے''۔ دوسرے معزز آدمی نے نہایت ایمانداری سے جواب دیا ہے۔

''مر کیوں گیا ہے؟''

''سالا گھٹیا اور زیادہ بیڑیاں پیتا ہو گا۔ اس لئے اسے دمہ ہو گیا ہو گا''۔

''آپ بجا فرماتے ہیں، مجھے بھی دمہ کا ہی کیس دکھائی دیتا ہے''۔ پہلے معزز آدمی نے نہایت مہذب لہجہ میں تائید کی ہے، اور پھر یوں ہلکا پھلکا ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اگر اسے یہ نہ بتایا جاتا کہ شمبھو دمہ سے مرا ہے تو اسے سخت جسمانی کرب رہتا۔ چنانچہ اپنے جسمانی کرب کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کر چلا گیا ہے۔

''میرے خیال میں کسی سپاہی کو بلانا چاہیے''۔ ایک اور آدمی نے رائے دی ہے۔۔۔ ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے۔

''میر خیال ہے، سپاہی کو نہیں بلانا چاہیے'' دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔

پہلا آدمی ناراض ہو گیا ہے اور غصہ میں آ کر جیب سے چلغوزے نکال کر چبانے لگا ہے۔ اس کی رائے کی رتی بھر قدر نہیں کی گئی ہے، لہذا وہ شمبھو کی لاش سے سخت ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بلا کر لاش اس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ لوگ نجانے پولیس سے اتنا کیوں بدکتے ہیں۔ اپنے مردے بھی اس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

سڑک کا ٹریفک نہایت زور و شور سے جاری ہے، بسیں، لاریاں، کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک، سائیکلیں۔۔۔ سبھی مشینیں نہایت تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہر مشین کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے۔ اور اپنے مقررہ نشان پر ڈٹی ہوئی ہے۔ کسی کا پٹرول ختم نہیں ہو رہا، کسی کے ٹائر میں نقص پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی بہانہ ایسا پیدا نہیں ہو رہا جس کی وجہ سے کہ پل بھر کو رُک جائیں اور شمبھو کی لاش پر ایک نظر ڈال لیں۔ شاید شمبھو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ شمبھو انسان تھا اور انسان اور مشین میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ایک کتا موڑ گشت کرتا ہوا شمبھو کی لاش کے قریب سے گزرتا ہے۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے شمبھو کی لاش کے پاس ٹھٹکتا ہے۔ وہ لاش کو پہچاننے لگا ہے، وہ لاش کو پہچان لیا ہے کیونکہ شمبھو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں کتے نے لاش کو پہچان کر پیار سے دم ہلائی ہے۔ مگر شمبھو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے مزید توجہ دلانے کے لئے اور شمبھو کو چھیڑنے کے لئے اس کے ساتھ رکھی ہوئی گٹھڑی کو سونگھا ہے۔ مگر شمبھو کی لاش جوں کی توں پڑی ہوئی ہے کتا مایوس ہو گیا ہے۔ اس نے ایک آخری کوشش کی ہے ... کھڑے ہوئے آدمیوں پر بھونکا ہے شاید اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ شمبھو کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ شمبھو کے دشمن ہیں۔ شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ شمبھو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شمبھو کی موجودہ پوزیشن کیا ہے۔

لاش کے قریب آدمی آتے ہیں، ایک دو منٹ ٹھہرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ ہر آدمی یہ تصدیق کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان ہی مرا ہے۔ یہ لاش ایک سپیڈ بریکر کی طرح دکھائی دے رہی ہے جہاں سے لوگ ایک دو منٹ میں کراس کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں شمبھو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے اسے کراس لیا ہے۔ ورنہ زندگی بھر وہ بھیک کے لئے لوگوں کو بلاتا رہتا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر پکارتا رہتا، مگر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا ــ موت نے اسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔

"اس کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا چاہیے، لاش کا کھلا رہنا دھرم نہیں ہے" ــ ایک کھدر پوش نے انسانیت کی بلندیوں سے پکارا ہے۔

"ہاں، ضرور ڈال دینا چاہیے، آخر انسان کی لاش ہے، لوگ تو جانوروں کی لاش پر بھی بوری ڈال دیتے ہیں" ــ دوسرے نے انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔

معاملہ دھرم کا ہے۔ اس لئے کوئی آدمی بھی ننگی بات منہ سے کہنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میلا کچیلا کھیس شمبھو پر ڈال بھی دیا ہے ــ یہ کھیس خود شمبھو کا ہے۔ اور اس کی گٹھڑی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھیس نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا ہے اور موت کے وقت بھی دے رہا ہے ــ میلے کچیلے کھیس سے میلی کچیلی لاش ڈھانپ دی گئی ہے۔ رنگ سے رنگ میچ کر گیا ہے۔

"اس کے منہ پر کھیس مت ڈالو"۔ کسی نے سختی سے پروٹسٹ کیا ہے۔

"نہیں نہیں، ڈال دو"۔ کسی نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا ہے۔

"نہیں نہیں، مت ڈالو، پتہ کیسے چلے گا کہ کھیس کے نیچے مردہ پڑا ہے"۔ اس آدمی نے

خطرہ کی گھنٹی بجائی ہے۔

"یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے"؟

"ضرورت ہے"۔

"نہیں ہے"۔

"ہے"

"نہیں ہے"۔

اس آدمی نے پنجابی میں آ کر لاش کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے غصہ میں آ کر دوبارہ کھیس منہ پر ڈال دیا ہے، پہلے نے پھر ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے، اور پھر دونوں نے کھیس کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے منہ پر گھونسہ مارا ہے اور حق اور صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو دوچار آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا ہے اور دونوں صداقت کی تلاش میں دو مختلف سمتوں کو چلے گئے ہیں۔۔۔ یک گھٹیا موضوع پر لڑنا بیکار ہے۔ جب زندہ شمبھو پر کوئی آپس میں نہیں لڑا تھا تو اب مردہ شمبھو پر لڑنے کا کیا فائدہ ہے۔۔۔ اور پھر دھرم اور دیا کا زمانہ تو ویسے بھی ختم ہو گیا ہے۔

اب لاش اپنا منہ چھپائے ہوئے پڑی ہے، اس کے قریب کوئی آدمی نہیں ہے، جتنے آدمی آئے تھے، وہ اپنا اپنا فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو یہ پتہ نہیں چل رہا کہ کھیس کے پیچھے شمبھو سو رہا ہے یا مر گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے چند منٹ پہلے شمبھو کو جو موت آئی تھی وہ کھیس ڈالتے ہی بھاگ گئی ہے۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان کھیس آ گیا ہے۔ جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

تین چار منٹ سے لاش کھیس کی اوٹ میں ہے۔ اور پھر بارہ تیرہ سال کا ایک غلیظ سا بھک منگا لونڈا، گنگناتا ہوا آیا ہے، اس نے پہلے شمبھو کا کندھا جھنجھوڑا ہے اور پھر منہ سے کپڑا ہٹا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سورج کی روشنی میں چمک اٹھی ہے۔ روشنی کی اس حرکت سے لونڈا ڈر گیا ہے اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ میں کہا ہے:

"بابا۔۔۔ بابا، تمھیں کیا ہو گیا ہے"؟

"ابے سالے، مر گیا ہے تیرا بابا"۔۔۔ قریب کھڑے ہوئے ایک کنڈیری فروش نے جیسے اسے شرم دلاتے ہوئے کہا ہے۔

"کیسے مرا"؟

"موت سے"۔

"ابھی ابھی تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا"۔

"ابے، تمہارا نوکر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کر مرتا۔ اس کا جی چاہا اور مر گیا۔ ہا ہا ہا ہا۔۔۔ گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ۔ ارے بھائیو، ایک آنے کی پاؤ"۔

لونڈے کی خوف زدہ آنکھیں یکدم سنجیدہ ہو گئی ہیں۔ اس نے قمیص کے اندر اپنا ہاتھ لے جا کر شبھو کی ڈبیک کھولی ہے۔ اس میں سے کچھ ریزگاری نکلی ہے۔ جسے اس نے احتیاط سے جیب میں ڈال لیا ہے۔ اسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس نے اس نے اپنے پھٹے پرانے کوٹ کی جیب میں سے دو روٹیاں نکالی ہیں۔ گٹھڑی کھول کر اس میں سے سبزی کا سالن نکالا ہے اور لاش کے قریب بیٹھ کر کھانے لگا ہے۔۔۔ روٹی کے دو لقموں نے ہی اس کے رخساروں پر لہو دوڑا دیا ہے۔ اس لہو میں ایک طمانیت ہے جو بھیک میں مانگی ہوئی روٹیوں میں سے نچوڑی گئی ہے اور شبھو کا لونڈا چونکہ شبھو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے اس لئے وہ طمانیت نچوڑ سکتا ہے۔

لونڈے نے کھانا ختم کیا ہے، بیڑی سلگائی ہے، شبھو کی گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں، ایک گڑوا، ایک گلاس اور ایک پرانی چپل نکالی ہے اور باقی گٹھڑی وہیں باندھ کر رکھ دی ہے۔ اور اپنی اشیاء کی ایک نئی گٹھڑی بنا کر گنگناتا ہوا چلا گیا ہے:

جیون کے دن چار ۔۔۔۔ اے گوری
جیون کے دن چار
لوٹ لے موج بہار ۔۔۔۔ اے گوری
جیون کے دن چار

اب لاش پھر ایک بار ننگے منہ پڑی ہے۔ نئے نئے راہگیر آ جا رہے ہیں مگر وہ دہرائی ہوئی باتیں دہرا رہے ہیں یوں لگتا ہے جیسے شبھو کی لاش پر کوئی اچھوتی بات نہیں کی جا سکتی، اور اب لاش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے جہاں سال میں ایک انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

"یہ لاش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی"؟ قریب کھڑے ہوئے گنڈیری فروش نے ایک جمائی لے کر کہا۔

"میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو"؟

"میرے خیال میں لاش کو یہاں سے اٹھوا دینا چاہیے بری لگ رہی ہے" گنڈیری والے نے ایک تجویز اٹھائی۔

"ہاں بری تو لگ رہی ہے۔ زندہ انسانوں کے درمیان ایک مردے کا پڑا رہنا؟؟؟۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔'' بوٹا رام نے ایک میلے سے بوٹ کو میلے سے کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا

"مگر اٹھوایا کیسے جائے۔ اس سالے کا کوئی ساکھ سمبند ہی تھوڑا ہو گا"۔

"تو پھر؟۔۔۔ میرا خیال ہے، پٹری والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سب مل کر اس کے کفن دفن کے لئے چندہ اکٹھا کریں"۔

"تجویز بری نہیں، مگر پٹری والے مانیں گے نہیں۔ سب حرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کرنا کیا جانیں۔۔۔ اپنا ذرا خیال رکھنا بھیا! میرے بوٹوں کا۔ میں ذرا سامنے دکان سے چائے پی آؤں"۔

بوٹا رام چ۔۔۔ بیٹھے چلا گیا ہے۔۔۔ سارے پٹری والے حرامی ہیں۔ چائے کے بہت پیاسے ہیں گنڈیری فروش شاید سوچ رہا ہے کہ بوٹا رام سچ کہتا ہے۔ پٹری والے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی آدھی گنڈیریاں بیچنا باقی ہیں۔ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں بیچنا بہت برا لگتا ہے۔ گاہک لوگ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں خریدنے سے ہچکچاتے ہیں۔ گزشتہ آدھے گھنٹہ سے ایک بھی گاہک قریب نہیں پھٹکا ہے۔

وہ اپنا خوانچہ اٹھا کر چل دیا ہے اور سامنے والے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔۔۔ پٹری والے سب حرامی ہیں۔ انسان کی قدر نہیں کرتے گنڈیریوں کی زیادہ کرتے ہیں۔

لاش پر جو مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں وہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ مکھیاں بھی شمبھو کو چھوڑ کر گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دوسرے فٹ پاتھ پر جا رہی ہیں۔۔۔ ہر چیز شمبھو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ اور گزر گئے ہیں۔

نندو فقیر پھر لنگڑاتا ہوا آیا ہے، وہ لاش کے گرد گدھ کی طرح منڈلانے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے جس کا چہرہ نیک نیت قسم کا ہے۔ اس نے بازو پر ایک بلا لگا رکھا ہے جس پر "جماعت خادمانِ قوم" کے لفظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس نے جیسے لاش کو سونگھ کر پوچھا ہے:

"اچھا تو یہ لاش ہے؟"

"جی ہاں"۔ نندو فقیر نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا ہے۔ "بھیک مانگا کرتا تھا، کئی دنوں سے بیمار تھا، آج مر گیا ہے بیچارا"۔

"کوئی ہرج نہیں، ہماری جماعت اس کے کریا کرم کا بندوبست کر دے گی۔ آؤ ملک

میں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے"

تندو فقیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ اس لئے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے۔ "اسے آپ کیسے اٹھوا کر لے جائیں گے"

"مزدوروں کے ذریعے رسے سے باندھ کر"۔

وہ شخص مردے اٹھوانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اس نے دو مزدوروں کو اشارہ سے بلا لیا ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ لاش کو رسے سے باندھ کندھے پر اٹھا کر ہمارے دفتر تک لے چلو"۔

تندو فقیر نے رسہ بندھوانے میں نہایت پھرتی سے امداد دینا شروع کر دی ہے۔ راہگیر ایک لاش کو رسہ بندھتے دیکھ کر پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ رسہ باندھنا ایک تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر تماشہ ہر راہگیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کشش ثقل کا اصول ہے۔

"یہ بہت بے رحمی ہے۔ انسانی لاش کو رسہ نہیں باندھنا چاہیے"۔ ایک راہگیر نے حقارت سے کہا ہے۔

"تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا کر دے دیجئے"۔

"میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی چارپائی کوئی نہیں ہے"۔

ہوٹل والا لطیفہ خوبصورت ہے، سب کو مزہ دے گیا ہے اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے ہیں۔

مجمع دیکھ کر ایک کانسٹیبل نٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ڈنڈا لہرا کر دور سے ہی للکارا ہے۔ "ایک طرف ہٹ جاؤ، کیوں اکٹھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے"؟

"یہ شبھو فقیر ہے جو مر گیا ہے"۔ خادم قوم نے جیسے کو تیسا جواب دیا ہے۔

"کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے؟ کس نے مارا ہے"؟ کانسٹیبل نے آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ہے اور لاش کے سرہانے اٹن شن ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے رسہ باندھنا بند کر دیا ہے۔ انہیں قانونی آرڈر کا انتظار ہے۔

"یہ لاوارث لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے شمشان لے جا رہی ہے"۔ خادم قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے

"کون ہے ہماری جماعت؟ ہوں! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی بدمعاشیاں۔ تم اسے مار کر اب لاش چھپانا چاہتے ہو"؟

ڈنڈے کی آواز پھر ابھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں، کئی کئی کترا کر نکل

گئے ہیں۔ خادمِ قوم جوش و خروش سے ابل رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

"اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے، ہماری سرکار ہے۔ انسان، سڑکوں پر یوں بھوکے پیاسے مر رہے ہیں۔ اور تم ہتھکڑی ہاتھ میں لئے مردوں کو گرفتار کرنے کے لئے پھر رہے ہو۔ شیم، شیم"۔

"اپنا لیکچر جیب میں رکھو"۔ کانسٹیبل اپنے وقار کو مٹی میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ "میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں، کیونکہ تم قانونی کارروائی میں رکاوٹ ڈال رہے ہو"۔

سبھی لوگ، کانسٹیبل کی مدلل بات سے متاثر ہوئے ہیں--- "شیم! شیم"۔

نندو فقیر کی حالت دِگرگوں ہے--- اسے قانون کے باریک نکتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اس لئے وہ گرفتاری کے ڈر سے کھسک کر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں خادمِ قوم ہوں"۔ خادمِ قوم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہے۔

"چلو چلو، بکواس بند کرو اور تھانے چلو"۔

"یہ لاوارث لاش ہے اس لئے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا"۔

"تم اس لاش کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے"۔

"میں اسے لے جائے بغیر ٹلوں گا نہیں"۔

کانسٹیبل نے اس کی کلائی میں ہتھکڑی ڈال دی ہے۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ پولیس کے یا خادمِ قوم کے۔

"مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو"۔ کانسٹیبل نے خادمِ قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ "اس لئے اب تمہارے خلاف مقدمہ چلے گا"۔

شمبھو کو کس نے مارا ہے؟ اس سلسلہ میں شمبھو خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے، اپنے دفنانے کے بارے میں اس کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟ اسکا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ شمبھو اپنی لاش کے مستقبل سے بے نیاز ہو کر مر پڑا ہے۔ خادمِ قوم ہتھکڑی پہن کر سپاہی کے ساتھ تھانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے--- "میں عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار کون ہے--- میں حق اور صداقت---"

وہ چلے گئے ہیں، لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ شمبھو کی لاش پر سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شمبھو کی لاش پھر لوگوں سے کٹ گئی ہے۔

تین چار منٹ اور گزر گئے ہیں۔

تین چار منٹ اور۔

--- دس پندرہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوتی ہے اس کے منہ سے ایک خفیف سی کراہ لرزی ہے جیسے کوئی رک رک کر سانس لے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیت کے ساتھ ہولے ہولے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اور پھر بند کر لی ہیں، پھر کھولی ہیں اور پھر بند کر لی ہیں۔ اور پھر جیسے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی ہے مگر نقاہت کے باعث اس سے اٹھا نہیں جا سکا۔ اس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اس نے چلتی ہوئی سڑک کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

نندو فقیر بھاگ کر لنگڑاتا ہوا اس کے پاس آ گیا ہے

"شمبھو! --- تم --- تمہیں ... اچھا! تم تو اٹھ بیٹھے ہو۔" شمبھو نے اٹھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کا سر اٹھ نہیں رہا ہے۔ نندو چونکہ اس کا مرید ہے اس لیے وہ شمبھو کے سر کو سہارا دے کر اسے اٹھا رہا ہے۔ "تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لاؤ"۔

نندو فقیر پانی لینے چلا گیا ہے۔ اس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے ہیں۔

"کنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ" سامنے کے فٹ پاتھ سے آواز ابھری ہے۔

"سانڈے کا تیل، سانڈے کا تیل"۔ ایک اور آواز جاگی ہے۔

"صاحب! بالکل امریکن بوٹ ہیں، خالص فوجی---" ایک اور مانوس آواز شمبھو کے کان میں پڑی ہے۔

شمبھو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے اور دوسرا ہاتھ ایک حسین راہگیر جوڑے کی طرف پھیلا دیا ہے۔

"جوڑی بنی رہے بابو جی! بھگوان کے نام پر ایک پیسہ"۔

ریاکار

فلک پیما

ریاکار کو موٹے موٹے دل، جگر چیر دینے والے لفظوں میں برا بھلا کہہ دینا آسان ہے۔ ظہیر فاریابی نے لکھا ہے کہ جس زاہد سے ریا کی بو آئے اسے بوریے کا کفن پہنا کر آگ میں ڈال دو۔

آج کل پاکیزہ زندگی کے زبانی شیدائی پاکستان میں بکثرت ہیں اس لیے ہر محفل میں ریاکار کی مٹی پلید ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مسجدوں کی رونق ریاکاروں کے طفیل سے ہے اسی طرح مجلسوں میں ریاکار کے ذکرِ خیر سے چہل پہل رہتی ہے۔ ریاکار کے اس احسان کا اعتراف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

بزرگانِ دین انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں سے آگاہ تھے۔ ریا کے معاملے میں اولیاؤں نے ہمیشہ قابلِ تعریف تحمل اور فراخدلی کو مدنظر رکھا ہے۔ ایک صوفی نے تو انتہا کر دی۔ لکھا ہے کہ اللہ میاں نے ایک بزرگ سے کہا کہ اگر تمہارا پردہ فاش کر دیا جائے تو تم بتاؤ کہ تمہارا دنیا میں کیا حال ہو؟! اس بزرگ نے بلا تامل جواب دیا کہ اللہ میاں اگر تمہاری بخشش و عفوِ گناہ کا صحیح حال ظاہر کر دوں تو آپ فرمایئے پھر عبادت کون کرے گا؟! اس پر بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ ہم بھی خاموش رہیں گے تم بھی خاموش رہو۔

یہ اس لیے گوش گذار ہے کہ پاکیزگی کے مدعی خلوص کی حمایت میں شور مچاتا چاہے مچا لیں مگر یہ شور بھی اشتہاری ہے اور ریا سے خالی نہیں۔

ریاکار کے متعلق یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ ریاکار کے سجدے سے زمین چلا اٹھتی ہے کہ مجھے خراب کر دیا۔ یہ بھی سب کو علم ہے کہ حافظ شیرازی میٹھے میٹھے لفظوں میں ہدایت کر گئے کہ شراب پیو، رندی کرو مگر ریاکار کی طرح قرآن کو دام تزویر نہ بناؤ۔ ملا عراقی اور حافظ شیرازی کا مطلب یہ تھا کہ دکھلاوے کی عبادت کی مذمت کریں مگر صوفیائے کرام ہمیشہ یہی تلقین فرماتے رہے کہ چشم پوشی اختیار کرو۔ عیب جوئی کے کنوئیں میں مت گرو۔ مگر دنیا ہے کہ عیب جوئی سے باز نہیں آتی اور ریاکار ہے کہ دکھلاوے کے سجدوں سے

نہیں چوکتا۔ صرف سجدے نہیں بلکہ جبہ و عمامہ کی ترتیب سے اپنے آپ کو پارسائی کا سالارِ اعظم ظاہر کرتا ہے۔ اس حج و حج کے شوق کی وجہ یہ ہے کہ زاہد ریاکار کو علم ہے کہ عوام ظاہر پرست ہیں یہ جانتے ہوئے کہ اصلی عبادت صرف خدمتِ خلق ہے۔ وہ مخلوقِ خدا سے اپنی خدمت کروانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی ذاتی منفعت کے لیے وقف ہے۔

ریاکار یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے گرد و پیش والے مر کر تو اس کے کام ہرگز نہ آئیں گے اسی زندگی میں پارسائی کا جال پھیلا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ اس زندگی میں عزت، آرام، آسائش کا خواہاں ہے اور اس کا ہر عمل اس امر کا گواہ ہے کہ

عاقبت کی خبر خدا جانے　　　　اب تو آرام سے گذرتی ہے

کیا یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ دھوکا کھاتے ہیں تو قصور لوگوں کا ہے؟ کیوں؟ ان میں اتنی عقل نہیں، اتنی تمیز نہیں کہ نمود کی نمازوں، رسمی عبادتوں سے متاثر ہو کر ریاکار کو پیش پیش نہ ہونے دیں۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ ریاکار بھولے پن سے ریاکاری کرتا ہے تو یہ خیال غلط ہے۔

شروع شروع میں ریاکار دانستہ ریاکاری کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ خود احمق بناتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جوں جوں ریاکاری کامیاب ہوتی ہے یہ خصلت عادت بن جاتی ہے۔ اور اگر عوام بھانپ جائیں تو بھی ریاکار اپنی چالوں سے باز نہیں آتا۔ اور کیوں باز آئے؟ نفع کا سودا اور وہ بھی عبادت کے روپ میں۔ چپڑی اور دو دو۔ ریاکار اتنا زیاں کار نہیں کہ آرام، عزت، دولت کو ٹھکرا دے۔

ایک ریاکار حضرت کسی موقع پر بے تکلف صاف گو دوستوں کے قابو چڑھ گئے۔ دوستوں نے صلواتیں سنائیں۔ ریا کی کمائی میں سے حصہ بخرا طلب کیا۔ پتے کی باتیں کہیں۔ افغانستان سے جو رقم آئی اس کا ذکر چھیڑا۔ ریاستوں سے امداد کی تفصیل اور وجہ پوچھی۔ ریاکار صاحب کب دبنے والے تھے۔ جواب میں فرمانے لگے تم بے وقوف سب حاسد ہو مجھے مولا کریم اپنے خزانہ غیب سے وظیفے عطا کرتا ہے۔ میرا روزانہ ورد ہے۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب　　　　گبر و ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم　　　　تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ ورد کرتا ہوں۔ دعا کی برکت سے دعوت نامے آتے ہیں، دولت آتی ہے، عزت میں ترقی ہوتی ہے۔ تم یونہی جلتے ہو۔ میری طرح ورد کرو، تعریفی خط لکھو، مناسب موقع پر بڑے آدمیوں کی کامیابی کی دعا بعد نماز جمعہ ہزاروں آدمیوں سے کراؤ۔ اور اس دعا کرانے سے پہلے اور بعد میں اپنے ممدوح کو باخبر رکھو۔ دیکھو پھر کس طرح شہرت اور دولت کی بارش ہوتی ہے۔ ریاکار حضرت اپنے فن کی کچھ اور باریکیاں بیان

کرنے کو تھے کہ ایک منہ پھٹ بولا ''اے ابلہ فریب! لوگوں کو دھوکا دے کر موٹا ہو جائے گا تو خدا کو کیا جواب دے گا؟''

اس پر ریاکار حضرت بہت بگڑے۔ جوش میں آ کر کہنے لگے کہ ''تم سب کے سب ملحد ہو۔ نامسلمان ہو۔ تمہارا خدا پر ایمان نہیں ہے۔ کیا تمہاری یہ مرضی ہے کہ میں حق جل شانہ' کے ایک فرشتے کو معطل کر دوں۔ کارساز حقیقی نے میرے دونوں کندھوں پر ایک ایک فرشتہ معین کر رکھا ہے۔ داہنے کندھے والا نیکیاں لکھتا ہے۔ بائیں کندھے والا لغو حرکتوں کا محرر ہے۔ اگر میں لغو حرکتیں' ابلہ فریبی اور نمائشی عبادت نہ کروں تو بائیں کندھے والا فرشتہ بے کار ہو جائے۔ تم میرے عیب دیکھتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ کماتا ہوں اس سے دس غریب کنبے پالتا ہوں۔ تم تو بتاؤ کہ تمہارے ہاں کتنے غریب نوکر ہیں؟ تم جیسے مسلمانوں نے زکوٰۃ جیسے فریضے کو متروک کر رکھا ہے۔ میں محنت سے زکوٰۃ اور صدقۂ عید الفطر جمع کرتا ہوں' جو جمع کرتا ہوں اس سے آدھی رقم یتیم خانوں میں بھجواتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ یتیم خانے کے انتظام میں اپنے آدمی رکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ تم نے عملی کام کیا کیا؟ نہ کسی یتیم خانے میں تم مدد دو نہ کسی دینی کتاب کے چھپوانے اور فروخت میں دلچسپی لو' تم مجھ سے کہیں زیادہ معلون ہو۔ میں تو صرف ریاکار ہوں۔ تم بے کار ہو اور بے کار' ریاکار سے کہیں بدتر ہے!''

اب آپ ایک اور منکسر مزاج ریاکار کی داستان سنیئے! یہ حضرت اپنے آپ کو عاجز' گنہگار' کمترین خلائق بیان کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ بات پیچھے ہوتی تھی اور یہ پہلے فرما دیتے تھے کہ مجھ نالائق سے کیا ہو گا۔ جب ان کی بہت خوشامد کی جاتی تو فرماتے اچھا آپ کا ارشاد ہے تو بسر و چشم حاضر ہوں۔ چنانچہ یہ جملے دہراتے ہوئے وہ بصد شوق ہر ایسے کام میں شامل ہو جاتے جس میں چندے کی ضرورت ہو۔ ہوتے ہوتے کچھ متمول ہو گئے مگر انکسار پہلے سے دگنا تگنا۔ عام چرچا ہوا کہ یہ شخص اپنے کام میں محنت کرتا ہے۔ قومی کاموں میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ نہایت ہمدرد مفید انسان ہے۔ ان حضرت کے جو دو ایک رازدان تھے انھوں نے ایک دن ذرا سخت گوشمالی کی اور کہہ دیا کہ اب تو اس فریب سے توبہ کرو۔ فرمانے لگے کہ مجھے تم ریاکار کہتے ہو۔ مجھ سا بدکار دنیا میں کوئی نہیں مگر تم لوگ بے سمجھ ہو۔ یہ دنیا میں نے نہیں بنائی۔ اس کے طریقے میرے ایجاد کردہ نہیں۔ مجھے صرف یہ علم ہے اور صحیح علم ہے جیسا کہ حضرت امیر خسروؒ فرما گئے کہ:

''عشق' افلاس اور مسلمانی کافری سے سو درجہ بدتر ہیں۔ اس کافری سے ڈرتا ہوا افلاس سے بچنا چاہتا تھا۔ سو خدا کے بزرگ کی بخشش سے افلاس دور ہوا' عشق حاصل ہوا۔ ایک مسکین خاتون کی دلجوئی کرتا ہوں۔ اب جو تمہارا جی چاہے کہو اور کرو۔ مجھ عاجز کا خدا والی ہے!''

زہد فروشی کی ان دو مثالوں سے سننے والوں کو ریاکار کا نقطۂ نگاہ واضح ہو گیا ہو گا۔ مگر جو اصحاب اپنے خصوصی حلقوں میں اقبال کر لیتے ہیں کہ وہ ریا کی کمائی کھاتے ہیں وہ دو باتوں کا جواب چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ کونسا خدائی فوجدار ہے جسے علم ہے کہ ہمارے سب سجدے، سب نمازیں، سب دعائیں ہمیشہ محض ریا ہیں؟ کیا ہم بھولے سے بعض دفعہ خلوص کے سجدے نہیں کرتے۔ وہ کون ہے جس کی ہر نماز میں حضورِ قلب کا نور ہے؟ ایک خلوص کا سجدہ، ایک سچے دل کی توبہ ہفت سالہ گناہوں کو دور کرنے پر قادر ہے۔ سوائے ذاتِ باری کے کسے معلوم ہے کہ ہم مردود ہیں۔ ہم برے سہی مگر ہمیں یہ تو علم نہیں کہ ہم ہر وقت ریاکار ہیں۔ بہت لوگ ہیں جو ہماری مثال سے نیک تو ہو جاتے ہیں ریاکار نہیں بن سکتے۔ کیا اس مثال کا قائم کرنا قابلِ قدر نہیں؟ زاہد ریاکار کو اسفل السافلین شوق سے بھیجئے مگر ریاکار اور دنیادار میں فرق کیا ہے؟" صرف یہی کہ دنیادار دکانوں، بنکوں، کارخانوں کے ذریعے سے لوٹتے ہیں اور ہم زہد و عبادت کو تجارت بناتے ہیں۔ ان کا راس المال روپیہ ہے ہمارا راس المال عبادت۔ ہر دنیادار کامیاب نہیں ہوتا ہر ریاکار کی دکان بھی نہیں چلتی۔ ہم میں اور ان میں فرق کیوں کیا جاتا ہے؟ روپیہ کی ہیرا پھیری کو عبادت کے زینے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ کیوں لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ریاکاری معاشی پیداوار ہے؟ تجسس تحقیق نہیں۔ اگر ریاکار مردود ہے تو وہ جماعت جس کے وہ جزو ہیں مردود تر ہے۔

ریاکار کا دوسرا سوال بہت تیز سا ہے۔ پوچھتا ہے۔ ایمان سے کہو

"کون ہے جو ریاکار نہیں؟"

عیب کا علم تو خدا کو ہے مگر جہاں تک دیکھنے میں آیا ہے شہروں میں ایک سے ایک بڑھ کر ریاکار ہے!

خواجہ کی چڑیا

سید فیاض محمود

یہ دسمبر 1943ء کا واقعہ ہے۔ احمد مغل سرائے کے اسٹیشن پر اترا۔ کلکتہ سے باڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر وہ لاہور جا رہا تھا۔ مگر بہار کے صوبے میں ان دنوں سیلاب آیا ہوا تھا اور ریلوے لائن کی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ باڑہ ایکسپریس مغل سرائے آ کر رک جاتی تھی اور ریلوے والے کچھ دیر کے بعد یہاں سے پنجاب کے لیے ایک اور گاڑی تیار کیا کرتے تھے۔ احمد کے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا مگر جگہ اسے تھرڈ یعنی تیسرے درجے ہی میں مل سکی تھی۔ نئی گاڑی میں جو جگہ تلاش کی تو وہ بھی تیسرے درجے ہی میں ملتی نظر آئی۔ وہ گارڈ سے ملا، ٹکٹ انسپکٹر کے پیچھے بھاگا، اسٹیشن ماسٹر سے بھی جا کر ملا مگر مدعا بر نہ آیا۔ ناچار لوٹا۔

قلی پیچھے پیچھے اور احمد آگے ایک پلیٹ فارم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر گھوما کیا جگہ ہی نہ تھی۔ سب نشستیں بہت پہلے مخصوص کی جا چکی تھیں۔ لڑائی کا زمانہ تھا، آمد و رفت زیادہ تھی گاڑیاں کم۔ اور ریل کی پٹڑی بیٹھ جانے کی وجہ سے تو لوگوں کو کہیں جگہ ہی نہ ملتی تھی، اور پھر نئی گاڑی بھی پوری طرح تیار نہ تھی۔ ابھی تین ایک گھنٹے باقی تھے۔ احمد نے یہی فیصلہ کیا کہ انٹر کلاس میں جگہ لے لیں تو بہتر ہوگا، کہیں اس سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ بیٹھ تو جائیں گے۔ رات کو سوئے نہ سوئے، آخر قیامت تو نہ آ جائے گی۔ کلکتہ سے مغل سرائے تک بھی دائیں بائیں ساتھیوں پر گرتے پڑتے ہی رات کاٹی تھی۔

چنانچہ اس نے پھر اپنا مختصر سا سامان اٹھوایا اور نئی گاڑی کی تلاش میں قلی کو لے کر چلا۔ اسے پھر کئی ایک پلیٹ فارموں پر سے گزرنا پڑا۔ کبھی قلی اِدھر لے جاتا، کبھی اُدھر۔ راستے میں وہ دیکھتا کہ مسافر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے بیٹھے ہیں، اور کئی ہیں کہ پڑے سو رہے ہیں۔ گرمی کا موسم تھا اور آموں کے دن، گٹھلیاں ہر طرف بھن بھنا رہی تھیں۔ کچھ لوگ اِدھر بیٹھے آم چوپے کھا رہے تھے اور چاٹ سے لتھڑے ہوئے پتے، بے تکلفی سے ساتھ ہی پھینکے جا رہے تھے۔ میلی، ملگجی، ستھری اور صاف، اسے سب ہی قسم کی پوشاک نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ یہ بے انتہا مخلوق کسی نہ کسی مقصد کے لیے گھر سے نکلی ہے، اور پھر اپنے کاموں سے فارغ ہو کر،

اسی طرح گھر واپس لوٹ جائے گی .... بے ضرورت .... بیکار!

پھر خیال آیا کہ میں بھی اسی طرح سفر کر رہا ہوں، میری تگ و دو میں آخر کار اور کونسا راز ہے؟ سیکنڈ کلاس میں ایک نشست کی تلاش میں جو پھر رہا ہوں تو ریلوے کے ملازمین کی نظر میں میرا اصرار بھی اسی طرح بے معنی معلوم ہوتا ہوگا، جس طرح ان بے شمار لوگوں کا یوں پڑے رہنا مجھے نا گوار ... اچھا نا گوار نہ سہی ... بے مصرف دکھائی دے رہا ہے ... پھر سوچا کیا دنیا میں کوئی کسی کی بات بھی سمجھتا ہے؟ یا کیا کالے کو گورے سے اور گورے کو پیلے سے اسی طرح بلا وجہ اور ... تکلیف ہوتی رہتی ہے ... کیا غریب کو امیر سے اسی طرح نفرت ہوتی ہے جس طرح امیر کے دل میں غریب کی طرف حقارت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ... غالباً تندرست کو بیمار برا ہی لگتا ہے اور بیمار کو تندرست کھائے جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا ہم واقعی اسی طرح ایک دوسرے سے الگ، اپنی اپنی چھوٹی دنیا میں لپٹے، بغیر کسی کی بات کو سمجھے، نیند میں چلنے والوں کی طرح، یونہی گھومتے رہتے ہیں،

وہ یہی سوچتا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک چار برس کا بچہ آیا۔ چھوٹا سا میلا کرتہ پہنے اپنے پھولے ہوئے پیٹ کو پتلی پتلی بیمار ٹانگوں پر اٹھائے وہ بچہ ایک پتوں کے دونے پر لپکا۔ جو کسی مہاجر نے ابھی ابھی آلو چنے کھا کر پھینکا تھا۔ بچے نے وہ دونا اٹھایا اور جلد جلد اپنی میلی اور گندی انگلیوں سے اس میں سے بچے کھچے چنوں کے دانے اور چاٹ کو کھانے میں مشغول ہو گیا۔ دو ہی قدم پر احمد کو ویسا ہی ایک اور پیٹ نظر آیا، جو اس سے قدرے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک کتا منہ ڈالے شکم پری کر رہا تھا۔ ادھر ادھر اور کئی پتے چاٹ سے لتھڑے، بکھرے ہوئے تھے آموں کی گٹھلیاں اور چھلکے تو گویا ڈھیروں میں پڑے تھے، جن پر مکھیوں اور تتلیوں نے یورش کر رکھی تھی ....

احمد نلکے کے پاس سے گذرا، تو اس نے دیکھا کہ دس بارہ لوگ ایک دوسرے پر گرے ہوئے اپنی اپنی گڑویوں اور ڈونگوں کو بھرنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں حالانکہ کوئی گاڑی، کسی مقام کے لیے ابھی تیار نہ تھی۔ دس قدم پر ایک آدمی، دنیا سے بے خبر اطمینان سے پڑا سو رہا تھا۔ اس کے گندے منہ پر مکھیاں ٹوٹ ٹوٹ کر پڑ رہی تھیں۔ اس کے اوپر کے ہونٹ اور ٹھوڑی پر کھچڑی داڑھی تھی۔ جس سے اس کا کھلا ہوا منہ اور بھی بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ مکھیاں اس کے منہ میں داخل ہوتیں اور سانس کے زور سے باہر نکل جاتیں! ....

پاس ہی وہ سوڈا واٹر کا سٹال تھا۔ یہاں بھی کافی بھیڑ تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ اپنے باپ سے اصرار کر رہا تھا کہ میں بوتل ضرور پیوں گا۔ اس کا باپ اس سے کہہ رہا تھا کہ تم نے ایک بوتل ابھی پی ہے، دوسری کیسے پی سکو گے، مگر بچہ ضد کیے جا رہا تھا۔ اس کا ناک بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ...

سوڈا واٹر کے سٹال کی پشت پر کچھ اوٹ تھی' وہاں ایک عورت' غالباً جوان عورت' کیونکہ اس کا شباب اس کے عمل کے کرتے سے نہیں چھپتا تھا' لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاس بیٹھا ہوا شخص (غالباً اس کا خاوند) اس کے سینہ پر ہاتھ رکھے اسے کسی بات پر رضامند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورت ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور دری طور پر اس مرد کا ہاتھ اپنے سینے پر ہٹانے کی نیم ارادہ کوشش کر رہی تھی۔ ان سے چار قدم ہٹ کر ایک اور عورت اپنے دودھ بے تکلف طور پر' قمیض کے گریبان سے نکالے اپنے ننھی سے بچے کو دودھ پلا رہی تھی ... تھوڑی دور' دولڑکے نیشے کا ناپھوسی کر رہے تھے' پاس ہی پانچ چھ عورتیں ایک ٹولی بنائے کسی خاندانی جھگڑے پر نظرثانی کر رہی تھیں

کتنے ... ... کتنیاں' انسان' سبھی ان پلیٹ فارموں پر موجود تھے' اور سبھی زندگی کے بیچ میں پھنسے ہوئے' اپنی اپنی افتاد کے مطابق گوشت اور پوست سے متحرک جذبات کو وقت کی گھڑیوں میں ناپ رہے تھے۔ احمد کو ایسا معلوم ہوا' جیسے کوئی شخص منٹوں اور سیکنڈوں کی میزان لیے ان سب کیڑوں مکوڑوں کی حرکات کو تول تول کر کسی نہ کسی ضمن میں علیحدہ علیحدہ خانوں میں درج کرتا جا رہا ہے۔ بھوک' ہوس' رفاقت' تھکن' بے بسی' جوش' غصہ' نفرت' سبھی جذبات کسی نہ کسی شکل میں یہاں موجود تھے

اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''یہ زندگی کا ایک سین نہیں ہے یہ تو حیاتِ ابدی کا پورا نقشہ ہے۔ تخلیق آدم کے وقت' فرشتوں نے جو نے نوازی کی تھی۔ یہ اسی سرود ازل کی بازگشت ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو یہ منظر جوشِ نمو کی کافی دلکش تصویر ہے۔ یہ کسی بھگدڑ کا نقشہ نہیں یہ لوگ کسی قحط زدہ سیلاب کا نمونہ بھی نہیں' یہ تو ہر روز کے سفر کرنے والے لوگ' پلیٹ فارموں پر راتیں کاٹنے والے' ویٹنگ روموں سے بے پروا' چٹائی' بچھ پہ دری سے بے نیاز' فرشِ خاک پر سونے والے لوگ' خاک سے پیدا ہو کر' خاک میں مل جانے والے بنی نوعِ انسان ہیں۔'' احمد نے سوچا' یہ میرے بھائی ہیں۔ یہ پوپلی منہ والی بڑھیا جس کی کمر خمیدہ' جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی' جس کے چہرہ پر جھریاں مکڑی کے جالے کی طرح بکھری ہوئی ہیں' یہ میری ماں ہے' یہ کسی اور کی ماں بھی ہے۔ یہ کسی کی دادی بھی ہے۔ مگر اس کا بیٹا کہاں ہے' اس کا لاڈلا پوتا کس جگہ ٹھہر گیا' اس کی نازبردار بہو اسے سہارا کیوں نہیں دے رہی؟''

اور یہ بچہ کس کا ہے' یہاں کس لیے رو رہا ہے؟۔ یہ اپنے ماں باپ سے کیسے بچھڑ گیا' اس کا منہ ہفتہ سے کیوں نہیں دھلا' اس کے بالوں میں یہ میل ہے یا پھوڑے؟ یہ کرتہ جو اس نے پہنا ہوا ہے کرتہ ہے' نہیں ہے؟ کوٹ ہے یا صدری؟ اس کی آنکھوں میں یہ سوجن کیوں ہے؟ یہ کتا اس کے کپڑے سونگھ کر یہاں سے آگے چلا۔ بچے کو رونے سے فرصت نہیں کہ کتے سے ڈرے۔ اور یہ کون ہیں؟ جو ان سیڑھیوں کے سائے میں' اس گرمی میں چادر تانے لیٹے ہیں؟ دو شخص معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں نے چادر تان رکھی ہے اور اندر پڑے پڑے سرک رہے ہیں' کیا یہ ہنسی کی آواز تھی؟ رک کیوں گئی؟ ......

احمد نے سوچا "میں غلطی پر ہوں، یہ چودہ کی تنات نہیں [illegible] ہے [illegible] دن ہے [illegible] نہیں، جتنا میرا خیال تھا۔ ان دونوں [illegible] دنیا [illegible] [illegible] وقت لا زوال نہیں خوشی دائمی نہیں، جو وقت بھی مل جائے غنیمت ہے۔ [illegible] سال بھی [illegible] نہیں۔ محبت [illegible] مستقل یہ دوام نہیں۔ اگر یہ دونوں، یہ چار گھڑیاں ایک دوسرے سے قریب [illegible] تو دنیا انہیں اس صبر کا کیا انعام دے گی؟۔ اور اب اگر وہ اس موقع [illegible] خوشی [illegible] اپنے قبضے میں کر رہے ہیں، تو میں انہیں کیوں برا کہوں؟"

اور یہ کون ہے جو مردہ کی طرح پڑا ہے؟ اس [illegible] تو کہیں [illegible] میرا بھائی۔ اس کے پاس شاید فون کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ شاید یہ زندگی [illegible] ہی کاٹ رہا ہے۔" [illegible] احمد نے سوچا [illegible] "آخر زندگی سے نپٹ لینا [illegible] زندگی پر قابو پا لینا تو ایک آدھ کے بس کی بات ہی ہوگی۔ ہم اور تم تو زندگی سے سمجھوتہ کر بیٹھتے ہیں، [illegible] قربان کر دی اور زندگی سے اس کے عوض یہ چیز لے لی۔ آرام دے دیا، سکھ چین دے دیا، ذاتی لذتیں بخش دیں، محبت کو تج دیا، دل کا خون کر دیا، شاید سماج کی نظروں میں اچھے بن گئے، کسی کے سامنے آنکھ نیچی نہ کی، اپنے آپ سے بھی شرمندہ نہ ہوئے۔ ماں باپ کی پوجا کر دی، یہ سمجھوتہ کر دیا"

"یا پھر دل کی دنیا آباد کر لی، دنیا سے بے نیاز ہو گئے، آوارہ و مجنونے، رسوا سر بازار کے مصداق بن گئے، محبت کی دنیا میں ایک لمحہ کی جیت حاصل کر لی ——"

"یا پھر افیون کھانا شروع کر دی، شراب پیتے رہے، تاش اور برج کی محفل کلب کے طواف کئے یا گھوڑ دوڑ میں بازی لگاتے رہے، کوئی لمحہ اپنے لئے نہ رکھا کہ اس وقت اپنے آپ سے شرمندہ ہونا پڑے۔" بھائی کیا کروں، بہت مصروف ہوں، کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا ہے۔ بخدا آج دسواں دن ہے گھر پر کھانا نہیں کھایا۔ بچوں کی شکل تک نہیں دیکھی اور کل پھر کاک ٹیل پارٹی ہے۔" کیا یہ سب زندگی سے فرار کی صورتیں ہیں؟ [illegible] تو پھر یہ جوڑا چادر تانے دنیا اور اس کی بندشوں سے بے خبر، اگر محبت کا آب حیات چکھ رہا ہے، تو اس فرار سے مجھے کیوں الجھن ہو، یہ بھی تو زندگی سے ایک قسم کا سودا ہے۔ لوگ دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں مگر وہ پروا نہیں کرتے۔

"اور اس مسافر کو ہی دیکھ لو۔ یہ جو زندگی سے منہ موڑ کر پڑا یہاں اپنی گٹھری پر سر رکھے سو رہا ہے۔ مکھیاں، کیڑے مکوڑے، بھنگے سب اس کے جسم کے مختلف حصوں کو چمٹے ہوئے ہیں، مگر وہ سونے سے ہی دل بہلا رہا ہے۔ مکھیاں بیٹھ گئیں تو کیا ہوا، مچھروں نے کاٹ لیا تو کیا ہو گیا، آخر مکھی مچھر بھی تو اللہ میاں کی مخلوق ہیں، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان پیدا ہی اس لیے ہو کہ مچھروں کو اپنا خون پلائے اور مکھیوں کے لیے تفریح کا

سامان پیدا کرے

اس نے سوچا۔ "اگر کسی شہر کے مکانوں کی تمام چھتیں یکلخت شفاف ہو جائیں اور ہم ان گھروں اور گھر والوں کو دیکھ سکیں تو ہمیں کیا کچھ ہوتا نظر نہ آئے گا؟ یہ پلیٹ فارم اسی قسم کی تصویر کا ایک میلا سا خاکہ ہے۔ کچھ دھندلا، قدرے نامکمل، شاید کسی حد تک نامکمل، مگر ہے اسی قسم کا نقشہ۔"

"چیونٹیاں صاحب، زمین کے اندر بہت اچھے نظام کے ماتحت رہتی ہیں، مگر فرش پر دس پندرہ چینی کے دانے، دس پندرہ ڈبل روٹی کے ریزے، ایک آدھ سڑے ہوئے پھل کی پتلی سی قاش پڑی ہو تو کس انہماک اور دلچسپی سے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، سرگوشیوں میں، مشوروں میں، جھگڑے فساد میں، کام میں، ٹھیلنے اور دھکیلنے میں مصروف ہوتی ہیں۔ بس بالکل مہذب انسانوں کا سا نقشہ ہے۔"

"انسان بڑے سے بڑے منصوبے باندھتا ہے اعلیٰ دماغی شاہکاروں سے دنیا کو حیران کرتا، ذہن انسانی کو صیقل، معاشرت کو بہتر، معصومیت کو رنگین بناتا ہے، اگر اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے اپنے مقام پر سے ہٹا کر ادھر ادھر بکھیر دیا جائے تو اس کے رویہ میں اصولی تبدیلی تو نہیں واقع ہوتی، مگر جو بھرم اس نے دوسرے کے سامنے بنایا ہوتا ہے اس کی ضرورت بھی وہ محسوس نہیں کرتا۔ زندگی بنیادی ضروریات تک محدود رہ جاتی ہے۔ انسانی وظائف سماجی رویہ پر جابرانہ قبضہ کر لیتے ہیں۔ ریلوے کا پلیٹ فارم تو یہ حیات انسانی کا بلو پرنٹ بن جاتا ہے۔ مکھیوں، مچھروں، کتوں، چیونٹیوں اور انسانوں میں جو بنیادی یگانگت ہے وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ جبلی رجحانات، مدنی تصنعات پر غالب آ جاتے ہیں، تہذیب کا غازہ منہ سے دھل جاتا ہے، اور زندگی، مذہب، تمدن، قانون، حکومت، سب بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی پوری تجلیات کے ساتھ دنیا کے پلیٹ فارموں، باغوں، کھیتوں، وادیوں میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔"

اس نے سوچا مجھے ان لوگوں کی طرف حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس چادر تلے کوئی اور جوان نہیں میں ہوں۔ اس عورت کے سربلند شباب پر اس دوسرے جوان کا ہاتھ نہیں تھا، میرا ہاتھ تھا مگر وہ بھیانک شخص بھی جس کے منہ سے مکھیاں سانس کے بھبکے کے ساتھ نکل رہی تھیں میں ہی تھا۔ بلکہ وہ بچہ جو چاٹ کے دونے پر بے طرح لپکا تھا وہ بھی میرا ہی بھائی تھا

احمد ان باتوں پر غور کرتا، انٹر کلاس کے ڈبے میں جا بیٹھا۔ اس نے کہا آخر میں کیوں اتنا پریشان ہو رہا تھا۔ انٹر کلاس بھی بری نہیں۔ اور اگر پیسے ہی خرچنے ہیں تو کسی اور بڑے اسٹیشن پر شاید جگہ مل جائے۔ اور یہاں بھی تو میرے جیسے لوگ ہی بیٹھے ہیں۔ یہ بھی تو میرے ہی بھائی ہیں"

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک مسافر پر پڑی جو بڑی شد و مد سے آم چوس رہا تھا، اور آم کا رس اس کے منہ سے ٹپک ٹپک کر اس کے کرتے اور پاجامے کو زعفرانی رنگ دیتا

جا رہا تھا۔ اسے کافی کا ایک مصرع یاد آیا:

خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا

اس کے ذہن میں یہی الفاظ گونجنے لگے ''رنگ دے چنریا موری رنگ دے چنریا'' رنگ دے چنریا ''ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا'' ''رنگ دے چنریا'' ..... اس نے سوچا واقعی خواجہ نے ہمیں کیسی اچھی چنریا رنگ کر دی ہے۔ اس چنریا کے نقش و نگار مغل سرائے کے پلیٹ فارموں پر کس فراوانی سے بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ بات مغل سرائے کے سٹیشن پر ہی کیا موقوف ہے۔ ایسے نقش و نگار اور حیاتِ انسانی کی یہ رنگین تصاویر تو پیارے خواجہ نے ہر جگہ اور ہر گلی کوچے میں مہیا کر رکھی ہیں دیکھنے والی آنکھیں ہی نہیں!

نومی

قاضی عبدالستار

وہ عجیب نئی جسم دیکھیے تو لڑکی سی معلوم ہوتی۔ چہرے پر نظر ڈالیے تو بالکل بچی سی دکھائی دیتی اور اگر آنکھوں میں اتر جائیے تو ساری سوچی عورت انگڑائیاں لیتی ملتی۔ وہ سرخ اونچا سا فراک اور سیاہ سلیکس پہنے جگمگا رہی تھی۔ سیاہ گھونگھرالے بالوں کا ڈھیر جھٹک جھٹک کر جیپ میں اپنے سامان کا شمار کر رہی تھی اور میرے سامنے ایک دوپہر کھلی پڑی تھی۔

اس نے آنگن میں قدم رکھتے ہی اپنی ممی سے بھیا کے لئے پوچھا تھا۔ اونچے بغیر آستین کے بلاؤز اور بجی بچھی ہوئی ساری میں کسی بندھی آنٹی نے جنھیں اپنے چشم و ابرو پر آج بھی ناز تھا جھک کر بھیا کو مخاطب کیا۔ ”نومی پوچھ رہی ہے کہ تم کون ہو؟“

بھیا نے اداس چہرے پر سلیقے سے رکھی ہوئی رنجور آنکھیں چشمے کے اندر گھمائیں۔ روکھے سوکھے بہت سے بالوں پر دبلا پتلا گندمی سا ہاتھ پھیرا۔ انکل نے بڑے سے ایر بیگ کو تخت پر ٹکا پیک تھوکنے کے لئے اگالدان پر جھکے اور بھیا بھاری آواز میں بولے، بھیا کی آواز ان کی شخصیت کو اور منفرد بنا دیتی ہے۔ غم میں بسی ہوئی گرجدار آواز سے ہلکا ہلکا دھواں سا اٹھتا رہتا ہے اور جسے سن کر اجنبیت احساس کمتری بن جاتی ہے اور خواہ مخواہ متعارف ہونے کو جی چاہتا ہے۔

بہت چھوٹی سی تھی جب دیکھا تھا اس نے۔“

اور نومی کو اس طرح دیکھا جیسے کیلنڈر کو دیکھ رہے ہوں۔ جواب اس طرح دیا جیسے آنٹی سے کہہ رہے ہوں اسے بکس میں رکھ لیجئے ورنہ دیہات میں خراب ہو جائے گا اور نومی بے چاری بھیا کی آواز کے سحر میں شرابور کھڑی تھی اس کی نظریں بھیا کے چہرے میں پیوست ہو گئی تھیں۔ انکل پکا گانا گانے والوں کی طرح کھنکار کر بولے۔

بیٹی۔۔۔ میں نے تمہیں بتلایا تھا کہ وہاں گاؤں میں جہاں تم شادی میں جا رہی ہو تمہارے ایک

"کزن" ہیں جو بہت سی کتابوں کے "اقرا" ہیں۔ وہی تو ہیں۔۔

بھابھی جو نند کی شادی میں بھیا سے زیادہ اپنا آپا کھوئے بیٹھی تھیں، ایک طرف سے بڑبڑاتی نکلیں اور بھیا کو تکتے ہوئے دوسری طرف چلی گئیں اور بھیا بے خیالی میں نوری کی نگاہیں اپنے ساتھ لئے چلے گئے اور وہ بے چاری اپنی جان خالی آنکھیں لیے سہم کر کھڑی رہی۔۔

"جلدی کیجئے۔۔۔۔ پانی لدا کھڑا ہے۔۔"

پھاٹک سے کسی نے ہانک لگائی۔ میں نے آسمان کو دیکھا سارے میں سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جیسے سورج کی بتی گل ہوئی ہو اس دن بھی بیاہ کی دھوم ڈالنے والا موسم تھا۔ ابھی بارات آنے میں کئی دن تھے۔ لیکن مکان کا کونا کونا مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ نہ کہیں تل دھرنے کو جگہ تھی اور نہ کسی کو دم مارنے کی مہلت۔ ایک تو بڑی بات کی شادی دوسرے دیہات میں۔ اور دیہات بھی ایسا کہ جہاں سڑک پر جیپ دھنسی کھڑی ہے اور بیلوں کی جوڑیاں جتی جا رہی ہیں۔ کام تو جیسے آسمان سے پانی کی طرح برس رہا تھا اور سب کا یہ حال کہ بس چلے تو اپنے بدن کی کھال تک بہن کو جہیز میں دے ڈالیں۔ ابھی جوڑے نہار رہے ہیں، ابھی "تخت وار" دیکھ رہے ہیں۔ ابھی تاملیانے قاقوں کے انجام پر سوچ رہے ہیں۔ میں پیڈ اور قلم لئے موجود رہی۔ خطوط اور یادداشتیں لکھنے کو حاضر رہی۔ دالان میں وہاں تک چوکا لگا تھا۔ نوری چھوٹی بی بیاں سالخوردہ کپڑوں کے نیچے رنگوں میں اپنا بھرم بنائے خاموشی سے کھانا کھا رہی تھیں چمچے قابوں سے ٹکراتے تو خاموشی کھنک جاتی اور بڑا سا تکا بھیا باہر سے آ گئے۔

"ارے ہماری نوری جی کھڑی کیوں ہے۔۔"

نوری ایک ستون کے پہلو میں کھڑی پلیٹ میں چمچ گھما رہی تھی اس نے مڑ کر بھیا کو دیکھا۔ بھیا بالکل اس کے پیچھے آ کر اس کی پلیٹ میں جھانکنے لگے اور نوری جاگ اٹھی۔ کھل گئی۔ لو دینے لگی۔ گردن پیچھے جھکا کر اپنے ڈھیروں بال بھیا کے سینے پر انڈیل دئے اور آنکھوں میں آنکھیں رکھ دیں۔ بھیا بچوں کی طرح پلکیں جھپکانے لگے اور نوری کی آنکھوں کو اپنی کھوئی ہوئی نظریں مل گئیں۔ کسی نے بھیا سے کھانے کو پوچھا تو کہیں دور سے آواز آئی۔

نہیں باہر تو نہیں کھایا میں نے۔

اور نوری بیبیوں کی صف چیر کر ایک پلیٹ میں الم غلم بھر لائی اور ایک چمچہ ان کے منہ کی طرف بڑھایا۔ بیبیوں کے وجود پر منڈھی ہوئی نیستی کی چادریں سسک گئیں۔ سوکھے ہونٹوں کو بھولی بسری مسکراہٹیں یاد آنے لگیں بھابھی نے یہ تماشہ دیکھا تو ایک کرسی لا کر رکھ دی۔ نوری نے ٹھنک کر کہا۔

نہیں نہیں۔۔۔۔ میں اپنے بھیا کو "بوٹے" کھلاؤں گی۔

اور بھیا سچ مچ سعید بچوں کی طرح کھاتے رہے۔ دکھوں کے دلدل میں گردن گردن تک دھنسی

ہوئی زندگیاں جو خوشی سے بھرے ہوں ۔۔ انتظار میں بوڑھی ہوگئیں تھیں اس معمولی مذاق پر بھی خوب جی کھول کر ہنسیں آنٹی نے تو پھندا لگ گیا۔ بھیا قہقہوں میں بھیگ گئے......

اب رخصت کرنے والوں اور رخصت ہونے والوں کی بھیڑ چھوٹے سے جلوس کے مانند ڈیوڑھی سے نکل رہی تھی۔ گوری چٹی گول مٹول آنٹی جیسے پھولی پڑ رہی تھیں۔ بھیا ان کو پہلو میں لئے آ رہے تھے۔ پچھلے جا رہے تھے اور نوری بے بسی مصروفیت کے مصروف لگ رہی تھی۔ دور سے آتی ہوئی باتوں کی بچھوار سے اپنا آپ بچائے پھر رہی تھی، اور اس کی آنکھیں جن میں بڑے بڑے ہاتھی ڈوب جاتے اور گہری ہوگئی تھیں اور میری یادوں کی فلم میں نئی ریل لگ گئی تھی

رات چڑھ چکی تھی۔ اوپر سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں لڑکوں کے قہقہے سارے میں پھیلے ہوئے تھے گاؤں کی عورتیں شوخ رنگوں کے کڑھے ہوئے چھپی کوٹ اور سینتھٹک ساریاں پہنے گھیرا ڈالے اور بے حد میک اپ کئے ہوئے پاؤڈر زیوروں اور خوش جسموں کی پریڈ کرا رہی تھیں۔ ان کی آواز سیلز مین کی مصنوعی مسکراہٹ کی طرح شوخیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ مایوں بیٹھی ہوئی آپا کی چچی کے سامنے ان کا ایک گروہ تھمیں آواز میں گت گا رہا تھا اور میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں صحن میں پلنگوں کی قطاریں بچھی تھیں کونے کے تخت پر پچیسی ہو رہی تھی اور اودھم مچا ہوا تھا نوری کے قہقہے دھنک میں سرخی کی طرح نمایاں تھے۔ بھابھی اپنے بچوں کو تھپکتے تھپکتے خود سو گئی تھیں۔ آنٹی اپنے بچوں کو سلانے کے لئے لاکھ جتن کر رہی تھیں کہ بھیا اٹھے۔ سر جھکائے ہوئے زینے کی طرف جانے لگے کہ آنٹی نے آواز دی۔

"رشی۔۔۔۔ شطرنج کھیلو گے؟"

بھیا جہاں تھے وہیں جم گئے۔ آنٹی کے اٹھتے ہی شور ہوا۔ لڑکیاں بھرا مار کر زینے کی طرف دوڑیں جیسے شطرنج نہیں مجرا ہونے جا رہا ہو۔ بھیا کے کمرے میں جہاں بغیر اجازت اور ضرورت کے بھابھی داخل نہ ہوتی تھیں طوفان مچ گیا تخت پر بھیا اور آنٹی شطرنج بچھا کر بیٹھ گئے اور لڑکیاں جہاں تہاں سما گئیں بھیا کی پشت پر دیوار تھی۔ داہنی طرف گاؤ۔ بائیں طرف نوری۔ دیوار میں لگے لیمپ کی گلابی روشنی میں سب کچھ بڑا پراسرار سا لگ رہا تھا۔ ہر مہرے کے پٹنے پر بات کی طرح شور مچتا۔ نوری۔ چونچال نوری آہستہ آہستہ جگہ بنا رہی تھی اور پاؤں پھیلا رہی تھیں۔ بھیا نے چونک کر دیکھا ان کے زانو پر نوری کے بال ڈھیر تھے۔ پھر بھیا کا ہاتھ بالوں پر لرزنے لگا۔ جیسے وہ نوری کے نہیں خود انہیں کے بال ہوں، پھر اچانک بھیا نے ہاتھ کھینچ لی اور جگہ ڈھونڈھ کر تخت پر رکھ دیا۔ نوری نے پھر کروٹ لی۔ نوکیلے سرخ ناخنوں سے سجی ہوئی انگلیاں بھیا کے ہاتھ کی ابھری رگوں پر لرزنے لگیں جیسے تھکے ہوئے سرخاب جھیل میں تیر رہے ہوں پھر لیمپ بھک کر گل ہوگیا۔ سب ہڑبڑا گئے۔ جب روشنی ہوئی تو وہ گھٹنوں پر کھڑی بھیا کے بائیں شانے سے لگی ہوئی تھی، اور بھیا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں بساط پر لیکن نگاہیں کہیں دور تھیں۔ آنٹی نے تالی بجا کر شور مچایا۔ بھیا وہ بازی بھی

ہار گئے تھے۔

''تم آج بھی میری ہار پر اس طرح خوش ہو سکتی ہو۔ یہ معلوم نہ تھا۔ ورنہ بہت پہلے ہار چکا ہوتا۔''

بھیا نے پہلی بار آنٹی کو تم کہا تھا۔ آنٹی بجھ گئی تھیں۔ اور ان کی نظریں معافی مانگ رہی تھیں۔ اور بھیا کے ہونٹوں نے جلدی سے اپنی پرانی مصنوعی مسکراہٹ پہن لی تھی۔

جلوس جیپ کے ارد گرد آ کر منتشر ہو گیا تھا۔ میں سب سے الگ کھڑی سب کے چہروں سے دلوں کے مضمون پڑھ رہی تھی۔ انکل نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ انجن غرانے لگا۔ آنٹی بھیا کے پہلو سے پھسل کر انکل کے پاس بیٹھ گئیں۔ بھیا نے جھک کر ان کی ساری کا فل بک سے چھڑا دیا۔ آنٹی دو ہری ہو گئیں اور پرس سے گاگلز نکال کر جلدی سے آنکھیں چھپا لیں۔ نوری بیتی رات کے باسی آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھیں سب کے چہروں میں چھپاتی گھوم رہی تھی لیکن بھیا کے پاس سے اس طرح گزر جاتی جیسے وہ بھیا نہیں کوئی اجنبی ہوں اور بھیا تو اس کے لئے اجنبیوں سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔

اس رات پانی آفت مچائے تھا اور میرا شیں قیامت ڈھائے تھیں پرنالوں اور کھیتوں کے شور میں نہ کچھ سنتے بنتا تھا اور نہ سوچتے۔ میری نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ بھیا کے کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس وقت باہر سے آ گئے تھے۔ میں بھیگتی جاگتی اوپر پہنچی تو دیکھا کہ نوری بھیا کی مسہری پر دونوں تکیے پشت سے لگائے کتابیں اور رسالے پھیلائے بھیا ہی کی طرح نیم دراز ہے۔ مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ بھیا کا البم پھینک کر کھڑی ہو گئی۔

''آیئے۔۔۔۔ آپا۔''

میں نے اسے مسہری پر بٹھا دیا۔ اور خود ایک نیچی سی کرسی پر بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی جو شفق کی طرح شوخ اور شاداب تھی۔ سرمے کی لکیریں لپ اسٹک کی تازگی روز کا غبار، بغیر شمیز کے مہین کلف لگے کرتے کی استری جلد بدن بنا ہوا پائجامہ، گلے میں سرخ دوپٹے کا مفلر، بالوں میں پھول کی طرح کھلی ہوئی سرخ ربن کی گرہ۔ وہ سر سے پاؤں تک بے پناہ تھی۔

''آپا۔۔۔۔ میں بھیا کی کتابیں پڑھتی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتیں۔''

اتنے میں بھیا آ گئے۔ بھیگے ہوئے۔

انہوں نے کھونٹی سے سلیپنگ سوٹ اتار لیا۔

آپ کو نیند آ رہی ہے۔''

بھیا نے جواب میں مڑ کر نوری کو دیکھا اور میں نے انہیں۔ آنکھیں اسی طرح رنجور اور معصوم اور نگاہ اسی طرح بے نیاز۔

''نہیں تو لیکن کیوں؟''

اور وہ پردے کے پیچھے کپڑے بدلنے چلے گئے۔

''میں آپ سے پڑھوں گی۔''

''کیا پڑھو گی بھئی۔''

''آپ ہی کو پڑھوں گی۔''

وہ اس طرح جواب دے رہی تھی جیسے وہ بھیا سے نہیں اپنی ہجولی سے مخاطب ہو

''اور جو نیند آئی تو''

''تو اسی تخت پر سو جاؤں گی۔''

اور بھیا پردے سے باہر نکل آئے تھے۔ ہونٹوں پر اسی غمناک مسکراہٹ کی مہر لگی تھی

اور آنٹی کہیں گی میری بیٹی کو تخت پر لٹا کر اکڑا دیا۔

''میں صرف آپ کی آنٹی کی بیٹی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ میں نوی بھی ہوں۔''

میں سن ہو کر رہ گئی۔ پھر میں نے سنا نیچے سے کوئی مجھے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ میں اٹھی تو بھیا نے حکم دیا۔

''بی بی تم بھی یہیں لیٹنا آ کر۔''

جب میں واپس آئی تو لیمپ جل رہا تھا۔ شیڈ بھیا کی طرف تھا۔ تخت پر نوی سو رہی تھی اور اس کے بدن کی قیامت جاگ رہی تھی۔ میں نے اس کا کرتا کھینچ دیا اور کرسی کا گدا سرہانے رکھ کر اسی کے پاس لیٹ رہی آنکھیں بند کیے مردوں کی طرح پڑی رہی۔ پھر نہ جانے کیوں خراٹے لینے لگی جن کی شکایت آج بھی نوی نے کی تھی۔ میں آپ ہی آپ مسکرا دی۔ پھر چہرے پر بازو موڑ لیا۔

ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ بھیا اسی طرح دیوار کی طرف منہ کیے پڑے تھے پھر اچانک نوی نے مجھے جھنجھوڑا۔

''آپا۔۔۔۔ اے آپا۔''

میں اسی طرح خراٹے لیتی رہی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور بھیا کی مسہری پر۔ بھیا اٹھے چشمہ لگایا اور اب نوی ان کے گلے میں باہیں ڈال چکی تھی۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

وہ بھیا کے گریبان سے بولی۔ اس کے گھونگھرالے بالوں پر بھیا کا ہاتھ آہستہ سے لرز۔ میں اتنی دور سے بھی ان کے ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کر رہی تھی پھر بھیا نے مجھے پکارا۔ میں سوتی بنی رہی۔

نوی بی بی اٹھ کر بیٹھو۔ مجھ سے باتیں کرو۔ وہ تھوڑی دیر مچلتی رہی پھر ان کی گود میں پھیل گئی۔ بھیا

نے اسے بستر پر رکھ دیا لیمپ کا شیڈ گھمایا۔

''نومی بی بی۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں جیسے کہہ رہی ہو۔جی۔۔''

اور میں حیرتوں میں ڈوب گئی۔ وہ آنسوؤں سے تر بتر تھیں۔

''تمہارے ڈیڈی مجھ سے چند سال بڑے ہیں۔ لیکن تمہاری ممی مجھ سے کئی سال چھوٹی ہیں۔''

اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے کہہ رہی ہو۔شٹ اپ۔''

''تم نومی ہو۔جس نے کلکتہ کے مشہور کانونٹ سے کیمبرج پاس کیا ہے۔ جو سپنے میگزین میں کہانیاں لکھتی ہے۔جو راک اینڈ رول جانتی ہے۔لیکن میں اس نومی کو نہیں جانتا میں تو ایک ہی نومی کو جانتا ہوں جو میری بہت ہی پیاری آنٹی کی بیٹی ہے۔سب سے بڑی اور سب سے لاڈلی بیٹی ہے۔یہ جو بھی بی لگتی ہے۔ یہ بھی مجھے تمہاری طرح عزیز ہے اور یہ بالکل سو رہی ہے تم باتیں کرو۔''

''کچھ بولو۔۔۔۔۔نومی بیٹی۔''

وہ آندھی کی طرح اٹھی اور دھم سے تخت پر گر پڑی۔

نومی۔تم بھیا سے رخصت نہیں ہوئیں؟''

آنٹی کی دور سے چل کر آتی ہوئی آواز کوندگئی۔وہ ایک طرف سے شعلے کی طرح چمکتی رہی

آپ کو۔۔۔۔آپ کی بہت پیاری بہت پیاری آنٹی نے رخصت کر دیا نا۔''

وہ اس ایک جملے کی گولی داغ کر مڑ گئی کہ اگر کھڑی رہتی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور پھر جیپ پر۔اس طرح سوار ہوئی جیسے جنگلی گھوڑے پر چڑھتے ہیں۔گرد کا ایک بادل اڑا کر جیپ چلی گئی۔ بھیا اسی طرح کھڑے رہے۔رنجور خاموش کھوئے ہوئے۔میں اس بادل کے متعلق سوچتی رہی جو بھابھی کی بھری پری زندگی پر منڈلا گیا تھا۔ور جسے بھیا نے سگریٹ کے دھوئیں کی طرح اڑا دیا جس کا علم تک بھابھی کو نہ تھا ۔میرے علاوہ کسی کو بھی نہ تھا۔میں راز کے اس بوجھ کے نیچے کانپ سی گئی اور پھر میں بھیا کے متعلق سوچنے ہوئے وہ کس کے لئے کیا سوچ رہے ہوں گے۔

تین پیسے کی چھوکری

قاضی عبدالغفار

(۱)

آج سے پندرہ سو برس پہلے!

بائی زنطہ کے شاہی سرکس میں، بادشاہ کے وحشی جانوروں کا داروغہ ایک بوڑھا شخص تھا، بہت بوڑھا، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار، اس نے اپنے بڑھاپے کا سہارا ایک بارہ سالہ چھوکری کو بنا لیا تھا، جس کو نہ معلوم وہ کہاں سے لایا تھا۔ وہ اس کی بیٹی تھی نہ پوتی نہ رشتہ دار، نہ اس کی ہم وطن، لیکن اس نے منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور بیٹی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس چھوکری کی قوم کیا ہے، اس کا مذہب کیا ہے اور وہ کس طرح بڈھے کے پاس پہنچی۔

بائی زنطہ کے عظیم الشان دارالسلطنت میں شہنشاہ جسٹنین کا پرچم اقبال بلند تھا۔ اس زمانہ کی تہذیب اور بائی زنطی مخلوق کا تمدن، خصوصاً امراء اور عمائدین کی معاشرت یونان و روما کی قدیم تہذیب سے بھی دس پانچ قدم آگے تھی۔

شہنشاہ اور اس کے امراء و اراکین سلطنت کے اسباب تفریح و تعیش میں سے ایک یہ سرکس بھی تھا، جس میں ہزاروں قسم کے وحشی اور جنگلی جانور پالے جاتے تھے۔ بارہ برس کی چھوکری کو دنیا میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ سرکس کے درندوں میں صبح سے شام تک کھیلتی رہتی۔ وہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی اور دل اس کا ایسا ہی بے خوف تھا جیسا کہ وحشی درندوں کا، اسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوف کس چیز کا نام ہے۔ وہ شیروں کی ایال پکڑ کر لٹک جاتی تھی اور دوپہر کو کھیلتے کھیلتے اکثر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اس کی دنیا میں اس کے رفیق اور دوست ہاتھی اور ریچھ ہی تھے۔

دن بھر بڈھا سرکس کے جانوروں کی خدمت میں مصروف رہتا اور چھوکری اپنے کھیل میں، ایک شام کو چھوکری سرکس سے تو چلی گئی لیکن گھر نہ پہنچی۔ رات بھر بڈھا اس کا انتظار کرتا رہا۔

رات بھر وہ غائب رہی صبح کو وہ ہنستی ہوئی گھر آئی اور بڈھے کے ہاتھ پر تین چمکتی ہوئی اشرفیاں رکھ دیں۔ یہ اس کے حسن کا پہلا سودا تھا۔ یہ اس کی جوانی کا پہلا منافع تھا۔ گزری ہوئی شام اور موجودہ صبح کے درمیان، گذشتہ شب کی تاریکی میں بڈھے کی چھوکری عورت بن گئی۔

راتوں کو غائب رہنے کا سلسلہ جاری رہا اور سرکس کے درندوں کے ساتھ جو کھیل کود ہوا کرتا تھا وہ اب دوسری قسم کے حیوانوں کے ساتھ کھیلا جانے لگا۔ یہ آغاز تھا ملکۂ بازنطہ کی حکومت کا۔

تھوڈورا کی جوانی اب ہر طرف سے آنکھوں، نظروں اور دلوں کو کھینچ رہی تھی۔ وہ شاہی سرکس میں ناچا کرتی تھی اور بائی زنطہ کے ہزاروں نظرباز شام کو اس کے حسن کی خاطر سرکس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ شاہی دربار کے رکن رنگین بشپ وجیس نے تو ایک دن تھوڈورا کو ناچتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا

''گھانس کا یہ پھدکتا ہوا کیڑا کسی دن سارے بائی زنطہ میں اچھلے گا دیکھنا''۔

لیکن اس وقت بشپ کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ستم ظریف قدرت اس ناچنے والی کو نہ معلوم کہاں سے کہاں تک اچھالنے والی تھی۔

تھوڈورا سرکس کے نظربازوں سے تھک گئی ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی نہ بھاتا تھا۔ اب وہ منظر عام پر تھرکنے کے بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی۔ حسن فروشی اس عہد کی تہذیب میں کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی بلکہ حسن و ہوس کے ہی کھیل تماشے تو بائی زنطی تہذیب کے جزو لازمی تھے امراء طوائفوں کی نگہ التفات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اور عوام کی زندگی ان رنگین تتلیوں کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی۔ حسین تھوڈورا اپنی دوکان حسن کھولتے ہی دلوں کی مالک، آنکھوں کا تارا، کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی۔ امراء اس کے اشارۂ ابرو کا انتظار کرتے۔ ان کی خوں آشام تلواریں اس کے قدموں میں پڑی ٹھوکریں کھایا کرتیں! اہل علم اور اہل مذہب بھی اس دیوی کے استھان پر سر جھکاتے تھے اور سرکس کی ناچنے والی چھوکری بائی زنطہ کی حسن پرست دنیا میں ایک ''ملکۂ عالم'' تھی کہ اس کا سکہ ہر طرف جاری تھا۔

نوجوان شہنشاہ جسٹینین بارہا اس کو تھیٹر میں ناچتے، باغوں میں اٹھکیلیاں کرتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجوم عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے دل میں خلش تھی۔ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔

ایک شب شہنشاہ نے اپنے محافظ دستہ کے کپتان کو موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار دے کر

تھوڈورا کے گھر بھیجا اور پیام دیا کہ وہ شاہی خلوت میں آئے۔ آدھی رات کے قریب شاہی کپتان تھوڈورا کے دروازے پر آیا۔ اس وقت تھوڈورا کی خلوت میں اس کا کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ اس نے کپتان کو گھر کے اندر نہ بلایا بلکہ خود دروازے پر آ گئی۔ شہنشاہ کا پیام سن کر اس نے کہا

''شہنشاہ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ، مگر یہ ہار واپس لے جائیے۔ میں بکاؤ نہیں ہوں، شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ اس ہار سے کسی دوسری حسین چھوکری کا حسن خرید لیں۔۔۔ میری قیمت اس ہار سے بہت زیادہ ہے''۔

اب وہ سرکس کی بجائے ایک عظیم الشان سلطنت کے شیر اور ہاتھی سے بے خوف ہو کر کھیل رہی تھی۔

اسی شب پھر ایک شاہی مصاحب، شہنشاہ کا پیام، بہت سے تحائف اور کرام و اطاف کے بہت سے وعدے لے کر آیا۔ تھوڈورا نے دوسرا پانسہ پھینکا۔

''شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ وہ اس کنیز کے طالب ہیں تو اس کے سیہ خانہ پر تکلیف فرمائیں''۔

بائی زنطہ کے شہنشاہ سے، جس کی خاکِ پا بادشاہوں اور گردن کشوں کی سجدہ گاہ تھی، یہ گستاخانہ سوال و جواب، موت سے کھیلنا تھا، مگر تھوڈورا نے بہت بڑی بازی لگائی تھی۔۔۔

شب کی آخری ساعتوں میں بالآخر شہنشاہ خود اس کے دروازے پر آیا۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ تھوڈورا ایک صلیب کے سامنے جھکی ہوئی عبادت میں مشغول ہے۔ بہت دیر بعد اس نے اس طرح کہ وہ گویا کسی دوسرے عالم میں ہے، نظر اٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا۔ ''تم ہی تھوڈورا ہو''؟ شہنشاہ نے سوال کیا۔

''ہاں حضور! میرا نام تھوڈورا ہے، میں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی''۔

''تم وہی ہو جس کو ہر ملاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے''؟ شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

''جی ہاں! میں وہی ہوں''۔ تھوڈورا نے کہا۔

''پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو''؟ اب جسٹینین کا غصہ تیز ہوتا جاتا تھا۔

''حضور! تھوڈورا نے دست بستہ عرض کیا۔ ''ملاح کے پاس میں اس لئے جاتی ہوں کہ اس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں اور وہ سب میں لے لیتی ہوں۔ وہ تین پیسہ دے کر اپنا

سارا سرمایہ مجھے دے ڈالتا ہے"۔

"تو کیا تم پنے چابنے والوں سے جو کچھ ان کے پاس ہو سب ہی لے لیتی ہو"؟

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری قیمت ہے"۔

"تو پھر تم مجھ سے کیا مانگتی ہو"۔

"آپ کا تاج و تخت ! اے بائی زنطہ کے شہنشاہ"!

اس طرح چند روز بعد یہ "تین پیسے کی چھوکری" شہنشاہ بائی زنطہ کی مشہور عالم ملکۂ تھوڈورا بن کر اس زمانہ کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک بنی۔

وہ اپنا حسن بیچتے بیچتے ملکہ عالم بنی اور ملکہ عالم بن کر جب اس کو حسن فروشی کی ضرورت نہ رہی تو اس نے بائی زنطہ کے خوبرو جوانوں کی جوانی خریدنا شروع کر دی۔ اس کی ہوس پرستی کی داستانیں اسی قدر مشہور ہیں جس قدر اس کا حسن۔

(۲)

مسیح کی پیدائش کے پانچ سو برس بعد۔۔۔

بائی زنطہ کے دارالسلطنت میں۔۔۔

شہنشاہ جسٹینین اور اس کی عیش پرست ملکہ تھوڈورا کا زمانہ۔۔۔

بائی زنطہ کی شاہراہ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شہنشاہ اور ملکۂ عالم کی رعایا سڑک کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جمع ہے۔ یہ وہ سڑک ہے جو شاہی محل سے ایا صوفیہ کو جاتی ہے۔ دو رویہ سپاہی کھڑے ہیں۔ سپاہیوں کے عقب میں اہل شہر، امراء و رؤساء سب ملکہ عالم کی سواری کے منتظر ہیں۔۔۔

ہفتہ میں ایک دفعہ ملکہ تھوڈورا، ایاصوفیہ میں عبادت کرنے جایا کرتی ہیں۔ یہ جلوس قابل دید ہوتا ہے۔ ملکہ عالم کے شاندار جلوس کو دیکھنے والے گھنٹوں پہلے سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں اور دارالسلطنت میں ہفتہ کا یہ ایک دن گویا ایک عام یومِ تعطیل ہوتا ہے۔۔۔ وہ ملکہ عالم کی عبادت کا دن ہے۔۔۔

دیگریا کے محافظ دستہ کا ہراول، سرخ وردیاں پہنے، شاندار گھوڑوں پر سوار، آہستہ آہستہ چلا آتا ہے۔۔۔ اس دستہ کے پیچھے ایک مرصع تخت رواں ہے اور اس تختِ رواں پر ایک مطلا شامیانہ کے نیچے ملکہ عالم تشریف رکھتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے امراء و ارکین سلطنت کی نوجوان اور حسین لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لئے ہوئے اور آٹھ چھوکریاں ہاتھوں میں چاندی کی

گھنٹیاں لئے ہوئے چل رہی ہیں۔ چاندی کی گھنٹیاں تھوڑے وقفہ کے بعد بجائی جاتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے شاہی منصب دار قرمزی رنگ کا لمبا کپڑا بچھاتے ہوئے آتے ہیں اور ملکہ کی سواری جب اس کپڑے پر سے گزر جاتی ہے تو اس کو پیٹ لیتے ہیں۔ منصب داروں کی جماعتیں یہ خدمت انجام دیتی آتی ہیں تا کہ ملکہ عالم کے تخت رواں کا سایہ ناپاک زمین پر نہ پڑنے پائے۔

تخت رواں، جواہر اور سونے چاندی کی ضیاکاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس کی چمک میں سورج کی شعاعوں نے گویا آگ لگا دی ہے۔۔۔ اس طرح باقی زنده کی ملکہ، دو رویہ خلائق کے سلاموں کا جواب سر کے اشارے سے دیتی ہوئی مسیح کی درگاہ میں جا رہی ہیں۔۔۔

سلطنت کے دیہاتی علاقوں کا رہنے والا ایک خوبصورت نوجوان استیف جو چند روز ہوئے دارالسلطنت کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس وقت ایک کنوئیں کی دیوار پر کھڑا ہوا شاہی جلوس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے قریب اس کا ایک شہری دوست کھڑا ہے۔ سواری قریب آ گئی۔ دفعتاً ملکہ عالم کی نظر اس دیہاتی نوجوان پر پڑی مگر وہ نہ سمجھا۔ وہ سمجھا کہ یہ غلط انداز نظر برسر راہ تھی۔ مگر وہ خوش تھا کہ آج اس نے ملکہ عالم کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بادشاہوں کا دیدار عقیدت مند رعایا کے دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتا ہے۔

استیف بے چارے نے اپنی عمر میں پہلے کبھی شاہانہ طنطنہ کا یہ مظاہرہ کب دیکھا تھا وہ اس نظارہ میں محو تھا کہ ملکہ کی سواری بالکل اس کے سامنے آ گئی۔۔۔ ایک لمحہ کے ہزارویں حصہ میں اس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اس کی نظر ملکہ عالم کی نظر سے ملی۔ گھبرا کر اس نے نظریں نیچی کر لیں۔۔۔ اتنی ہی دیر میں سواری آگے نکل گئی۔ استیف کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کو پسینہ آ گیا تھا۔

شاہی سواری کے پیچھے پیچھے ایک منصب دار چاندی کے پھول لٹاتا ہوا جا رہا تھا۔ غریب اور امیر بڑھ بڑھ کر ان پھولوں کو لوٹ رہے تھے۔ جس کے ہاتھ ایک پھول آ گیا، اس کو گویا بڑی سعادت نصیب ہوئی۔ منصب دار جب بڑھتے بڑھتے استیف کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا ہاتھ لوگوں کے اوپر سے استیف کی طرف بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا پھول اور ایک تازہ گلاب تھا۔ استیف نے۔۔۔ جیسے کوئی مخمور ہو یا عالم خواب میں۔۔۔ ہاتھ بڑھا کر گلاب لے لیا، وہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے، شکریہ ادا کرے۔۔۔ لیکن اتنی ہی دیر میں منصب دار بہت آگے نکل چکا تھا۔

سواری بادبہاری گزر گئی۔ مجمع منتشر ہو رہا ہے۔ استیف گلاب کا سرخ پھول ہاتھ میں

لئے جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاہی منصب دار خاص طور پر اس کی طرف کیوں مائل ہوا۔ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں گلاب کا پھول تنہا اسی کو کیوں دیا گیا۔۔۔؟

گلاب بہت بڑا اور بہت خوبصورت تھا۔ وہ اس قسم کا پھول تھا جس کے چند ہی درخت شاہی باغیچے میں تھے اور شاہی باغیچہ کے علاوہ کہیں نہ تھے۔ یہ گلاب بانی رنظہ میں شاہی محل کے علاوہ کہیں میسر نہ آ سکتا تھا۔ مجمع سے باہر نکل کر استیف نے بغور اس پھول کو دیکھا۔ اس کی پتیوں کے نیچے ایک پرزہ بندھا ہوا تھا۔ اس پرزہ پر سرخ رنگ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے

"شاہی محل کے جنوبی دروازے پر آج دس بجے یہ پھول لے کر آؤ۔۔۔ اس پھول سے تمہاری قسمت کا دروازہ کھلے گا"۔

استیف ششدر تھا۔ وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس واقعہ کے معنی کیا ہیں وہ کیوں محل کے دروازے پر جائے۔ اس کی قسمت کا دروازہ کیونکر کھل سکے گا۔ اس کا دل کہتا تھا:

"جانا چاہیے، اگر یہ شاہی اکرام و الطاف کا اشارہ ہے تو تیری قسمت جاگ جائے گی، کیا معلوم تو شاہی دربار میں منصب دار بنا دیا جائے۔ کیا معلوم تو کیا جائے ۔۔۔ جانا چاہیے"۔

عقل کہتی تھی:

"کوئی دھوکا، کوئی فریب تو نہیں، بھلا کہاں ملکہ عالم، کہاں تو غریب دہقانی، منصب دار نے تیرے گنوارپن کا مذاق نہ اڑایا ہو یا کسی دشمن نے تجھے دھوکہ دیا ہو۔ عقل اور دل کا جھگڑا ختم نہ ہوتا تھا۔ لیکن قدم دل کے فرمانبردار تھے۔ عقل کا زور ان پر نہ چل سکا۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے استیف کے قدم بلا ارادہ شاہی محل کی طرف بڑھنے لگے۔ کبھی اپنے دل سے کبھی اپنی عقل سے الجھتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔۔۔۔

دل کہتا

"تیرا انتظار کیا جا رہا ہے، قدم بڑھا"

عقل کہتی:

"تو بیوقوف ہے، تیرا اور انتظار۔۔۔ دیوانے۔۔۔ سپاہیوں اور دربانوں کی ٹھوکریں کھائے گا"۔

جوانی کا خون گرم تھا۔ دل کی حرکت تیز تھی۔ چہرہ پر سرخی جھلک رہی تھی۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرات تھے۔ اس طرح استیف شاہی محل کے دروازہ پر پہنچا۔ اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دروازہ مغربی ہے یا مشرقی ۔۔۔ وہ بڑھتا چلا گیا۔۔۔

شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ بڑے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز اور تلواروں کی چمک استیف کو اپنے ساتھ کھینچے ہوئے اندر لے گئی۔ وہ محل کے پہلے برآمدہ میں داخل ہوا جہاں شاہی دربان مسلح کھڑے تھے۔ ایک قوی الجثہ حبشی بارگاہ کے سراپردے کے پاس ایک برہنہ تیغ ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا تھا۔ استیف نے آگے بڑھ کر سرخ گلاب اس کے سامنے پیش کیا۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیے کیا؟

دربان مسکرایا ''بیوقوف آدمی! مجھے کوئی حسین چھوکری سمجھا ہے تو نے؟ گدھا''!

استیف کے ذہن میں ان تحقیر آمیز الفاظ نے آگ لگا دی۔ وہ بے اختیار ہو گیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کس طرح اس نے دربان کے سیاہ تاب گال پر ایک چانٹا مارا۔۔۔ سارے برآمدہ میں شور مچ گیا۔ محافظ دستہ کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کے قبضوں سے مار مار کر استیف کو فرش پر گرا دیا۔ چند منٹ میں اس کا خاتمہ ہو جاتا، مگر ہنگامہ کی آواز سن کر دربانوں کا داروغہ کمرہ سے نکل آیا۔ اس کو دیکھ کر سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

''ارے تو کون ہے دہقانی''؟ داروغہ نے کہا۔

استیف جھنجھلایا ہو اٹھا۔ اس کا گلاب زمین پر گر گیا تھا۔ اس کی چند پتیاں منتشر ہو چکی تھیں، جھک کر اس نے گلاب کو زمین سے اٹھا لیا اور اٹھا کر داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔

''ہاں''! سرخ گلاب کو دیکھ کر داروغہ مسکرایا۔ ''بے وقوف آدمی! اس پھول کو لے کر یہاں کیوں آئے''؟

پھر اس نے مجمع کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو جھڑکا:

''جاؤ اپنا کام کرو، کیا کچھ تماشا بنایا ہے''؟ جب سپاہی ہٹ گئے تو اس نے استیف کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبی زبان سے کہا:

''یہ حماقت کی تم نے، اس پھول کو لے کر یہاں گھس پڑے۔ تمہیں جہاں یہ پھول لے کر جانا چاہیے یہ وہ جگہ نہیں''۔

یہ کہہ کر استیف کو وہ اپنے ساتھ ایک دوسرے دروازے پر لے گیا اور وہاں کے چوبدار کو آواز دے کر کہا:

''لو یہ ایک بے وقوف پھول والا آیا ہے اس کو اندر پہنچاؤ۔ یہ آدمی ہماری طرف کا نہیں ہے، تمہاری طرف کا ہے''۔

ملکہ کے چوبدار نے پھول پر نظر کی اور استیف کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ملکہ کے

محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

آراستہ اور خوبصورت برآمدوں اور کمروں سے گزرتے ہوئے۔ آگے آگے چوبدار اور اس کے پیچھے استیف۔۔۔ دونوں ایک پُرفضا باغیچے میں داخل ہوئے، جس کے وسط میں ایک فوارہ جاری تھا۔ اس کے پانی کی سطح پر سینکڑوں رنگین پھول تیر رہے تھے۔ باغیچے سے آگے ملکہ عالم کی خاص محلسرا تھی۔ محلسرا کے برآمدوں میں نوعمر اور خوبصورت ترک، زرق برق لباس پہنے ہوئے، حسین مامائیں اور باندیاں، خوفناک شکل کے خواجہ سرا اور حبشی غلام جن کے سروں پر زرد پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں، کچھ بیٹھے، کچھ لیٹے، کچھ ٹہل رہے تھے۔ کچھ جلدی جلدی قدم بڑھائے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ استیف کی دیہاتی وضع اور پھر اس کے ہاتھ میں سرخ گلاب کے پھول کو جس نے دیکھا، وہ منہ پھیر کر مسکرا دیا۔ شاہی خواصیں اپنے ہاتھ کے پنکھوں کی آڑ میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں اور کم عمر لڑکے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روک رہے تھے۔

استیف کو اپنے گرد و پیش ان حرکات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ چوبدار کے پیچھے پیچھے پردہ اٹھا کر شاہی محلسرا کے خاص کمروں میں داخل ہوا۔

ایک مزین کمرہ کے ایک گوشے میں ریشم کے قرمزی پردوں کی آڑ میں، بڑے بڑے گدوں اور تکیوں پر ملکہ تھوڈورا آرام فرما رہی تھی۔ ایک رنگین فوارہ کمرے کے وسط میں جاری تھا، چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں جن کی مہک سے تمام کمرہ معطر تھا۔

کچھ ایسی ہلکی روشنی، ریشمیں پردوں میں سے چھن چھن کر کمرہ میں آ رہی تھی جیسی کہ رات کے ختم ہونے اور دن کے شروع ہونے کے وقت ہوتی ہے۔۔۔ وہ سب جنت کا ایک تخیل تھا جس کو استیف نے آج اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۔۔ ریشم کے پردوں کی آڑ سے اس دھندلی روشنی میں ملکہ نے اشارہ کیا، کمرہ کے سکون کامل میں، رومی قالینوں پر استیف کے قدموں کی آواز گم تھی۔ وہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے ملکہ تھوڈورا کا آغوش محبت اپنے لئے کھلا ہوا پایا۔

"تمہارے جانے کا وقت آ گیا"۔ نظریں نیچی کئے ہوئے ملکہ نے فرمایا۔

استیف کے جسم میں ایک عجیب لرزش، ایک عجیب سنسناہٹ تھی جو آج سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

وہ ابھی تک ملکہ کے آغوش کی مستیوں سے مخمور تھا۔۔۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب اس نے کہا

"کیا پھر کبھی ملاقات نصیب ہو گی؟"

ملکہ مسکرائی۔ استیف اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا کہ یکایک وہی خواجہ سرا جو اس کو اندر لایا تھا۔ کمرہ میں داخل ہوا۔ استیف چونکا۔ اس کو محبت کی خلوت میں خواجہ سرا کی یہ دراندازی ناگوار گذری۔ گویا یہ سیاہ فام حبشی اس کی اس نئی محبت کے راز کو فاش کئے دیتا ہے۔ لیکن ملکہ سے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وہ یک گونہ مایوس ہوا اور سر جھکائے دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔ ملکہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر وہ پھر ذرا رکا۔

"استیف۔ کل پھر آؤ"۔

ملکہ کے ہونٹوں سے یہ شیریں پیام الفت کس قدر روح پرور اور دلنواز معلوم ہوا۔

اس مدھم روشنی میں ملکہ۔۔۔ نہ جانے کس طرح۔۔۔ اس کمرے سے جا چکی تھی استیف نے اس کو جاتے نہ دیکھا، لیکن اس کی جگہ خالی تھی اور استیف "وعدۂ فردا" کی مسرتوں سے جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم باقی تھے کہ ایک حبشی غلام کی نوکدار چھری اس کی پشت پر چمکی اور چشم زدن میں سینہ کے پار ہو گئی۔ وہ صرف ایک ہچکی لے کر دروازے کے سامنے فرش پر اوندھا گر گیا۔

غلام نے چند لمحے اپنی چھری کو اس کے گرم جسم میں آرام لینے دیا۔ اس کے بعد اس کے خون آلود پھل کو باہر کھینچ لیا۔ استیف کے سر کے لمبے بالوں سے اس حبشی نے اپنی چھری کا خون صاف کیا۔ پھر لاش کی ٹانگ پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا کمرہ کے باہر لے گیا۔

اس کمرے کے فرش پر جہاں استیف نے ایک لمحہ کے لئے تھوڑوں کے آغوش محبت کی ایک بازی لگائی تھی۔ سرخ گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور ان پتیوں میں سے ایک پر استیف کی جوانی کے گرم خون کا صرف ایک قطرہ جما ہوا رہ گیا۔

اسی شام کو جب چند ملاح اپنی کشتیاں ساحل کی طرف لا رہے تھے، شاہی محل کے چور دروازے سے باسفورس کے پانی میں ایک سربند تھیلا جو خون آلود بھی تھا پھینکا گیا۔

ملاحوں نے دیکھا اور اپنے چپوار تیزی سے چلانے لگے۔ ان کے لئے اس قسم کے تھیلے کوئی نئی چیز نہ تھے۔ ہر روز صبح و شام وہ دیکھا کرتے تھے کہ شاہی محل سے باسفورس کی بھوکی مچھلیوں کے لیے یہ مخصوص غذا پانی میں پھینکی جاتی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا اور باقی زمانہ میں کس کو معلوم نہ تھا۔ کہ رحمدل ملکہ عالم حسن کی دعوت کے بعد باسفورس کی مچھلیوں کے لئے اپنے حسن کے دسترخوان سے تازہ غذا پہنچایا کرتی ہیں۔

———

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائلپور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے مفلوک الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائلپور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائلپور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی، اس لیے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں

لیپ دیتیں۔ لائلپور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں، جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقرعید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچ لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ دن بھر میں ایک آدھ روٹی نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ میسر آ جائے تو مزید نقدی کس کام آتی ہے؟ یہ فلسفہ ساری عمر ماں جی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالے سے رخصت ہو رہی تھیں، ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو وہ اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ بھی جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن، دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے، تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ

سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انہوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی لمحوں میں زندگی کے سب سے آخری اور سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہتی تھیں اسی خاموشی سے عقبےٰ سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقعہ کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ ان کے ہاتھ پاؤں چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔۔۔

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں سب کا بھلا، سب کے بعد ہمارا بھی بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روئی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال ہی کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتیں تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائلپور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انہیں کس

مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سرِ راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائلپور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا لیکن کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھوس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بری طرح پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تا کہ پیاس لگنے پر بچے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح چلتے چلتے وہ چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چارنے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے، کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توڑیے اور کلتھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھیں، ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا، جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو الن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین بھی مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور دو تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر ملیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے سارے عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس زنانہ ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں وہ بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ایرکنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

ملیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیئے۔ دعوتیں ہوئیں۔ اور پھر ماں جی کے لیے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائلپور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی اور ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سج کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ''ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزرتی جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا''۔

''ماں جی، آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھ کرتے۔

''توبہ توبہ پتر''۔ ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں۔ ''میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا

تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی"۔

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں بھی پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادتمندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں"۔ عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور پھر کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ ”اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں“۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادتمند بیٹے تھے اتنے ہی سعادتمند شاگرد بھی تھے۔ نقشہ دیکھ کر انہیں سب سے دور افتادہ اور دشوارگزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ میں گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تا کہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کیے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ جب اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

”اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی“؟ عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

”اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی“۔ ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو ان کو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر ایک خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثرانداز نہ ہوتا تھا بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خوداعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سرمالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں

انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی بیلی سے کہا۔ "تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی ویسے گزر ہی گئی ہے۔ اب بچی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انہوں نے مس بیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا "مسز گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں۔ براہ مہربانی میری طرف سے آپ اس کے ہاتھ چوم لیں"۔

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک بیٹھے لارڈ کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا: "اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں"؟

"میں"، ماں جی تنک کر بولیں: "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے"؟

"میں"، عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا۔ "میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں دور بھاگ جاتا، جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا"۔

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا لیکن ایک بار، صرف ایک بار۔ ماں جی بھی رشک و حسد کی آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورزی" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورزی گورزی کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ"۔

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا: بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورزی تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے"۔

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن ماں جی کے دل

میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا دکھ سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی۔ "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں"۔

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو"، مہارانی نے کہا "کبھی ہمارے لیے بھی دعا کرنا"۔

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی"؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر

نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا''؟

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال امڈ آئے۔ ''ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نبھاہ کیا ہے اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لیے گاؤ تکیے پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا، پکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی ''بچو، رونا مت، تمہارے ابا جس آرام سے رہے تھے اسی آرام سے چلے گئے، اب رونا مت، ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی''۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں روئی نہ ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے ''گورزی کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔۔۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے آگے ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے، لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں تو پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے، لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔۔۔

جلاوطن

قرۃ العین حیدر

سندر لالہ۔ سجے دلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے۔

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے کمو والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھین صاحب۔۔۔" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

"بندگی۔۔۔ بندگی۔۔۔" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راجی کھسی بھین صاحب۔۔۔" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا۔۔۔ مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا، یہ سوپ ہٹا بیچ میں سے"۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھین صاحب ناج پھٹک رہی تھی"۔

"تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہئے، چل ہٹا سب چیز۔۔۔"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر پیر ٹکا کر انہوں نے اپنی بہن کو آواز دی۔۔۔ جیجی۔۔۔ جی ای ای۔۔۔ جی ای ای۔۔۔ (چھورا ہے اب تلک مورا بھین۔۔۔ ہم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی

چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر ہوا میں سرسرا رہی تھیں شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوا کے باغ میں شہد مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ اور ہر چیز پر خنودگی سی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے، ''ٹھکرائن کی بگیا'' میں صبح سے لے رات گئے تک رونق رواں دواں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

''آمت ہیں بھیں صاحب۔۔۔'' نیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے سٹے کے گودام میں سے جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلو میں باندھ کر چھن سے پشت پر ٹینگتی ہوئی کنجی میں آ گئیں۔

''جے رام جی کی بھین صاحب۔۔۔'' رمیئے نے چوکے میں سے آواز لگائی۔۔۔ ''کٹہل کی ترکاری کھیئو بھین صاحب۔۔۔''

''ہاں، ہاں ضرور کھیںیابھالی۔۔۔'' ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آ گئے۔ کمرے میں رنگ برنگی مورتیاں الگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سیندور سے لپی پتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ نیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن ہاتی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آ جائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے۔ ابھی سرین راما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے آٹھ بجے کھیم کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا داس کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا۔ (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالاخر امن تھا اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔ (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کروندے اور کمرکھیں ۔۔۔۔۔۔۔ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکر دادھی ناکت تا۔۔۔ دھاکردا۔۔۔ ارے باپ رے۔۔۔ اس نے منڈیر پر سے جھانک کر ڈیلتی سے کہا۔۔۔ ماما آئے ہیں، بھاگ جا ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے۔۔۔ ڈیلتی بھاگ گئی۔

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے، اور بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھناچھن چوڑیاں بجاتی کھیم دتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

''نمستے ماما۔۔۔ ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔۔۔''

''چل چڑیل۔۔۔ بہانے باز۔۔۔ سبق سنا پہلے۔۔۔ ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا۔

(لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)۔

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا۔۔۔" (انہوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)۔

"ارے باپ رے۔۔۔" کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں ری۔۔۔"

"ہی ہی ہی۔۔۔ ماما۔۔۔" کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساری بھی تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی ۔۔۔ بڑی ہو گئی۔۔۔" (انہوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)

"جی ماما۔۔۔" کھیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں، جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو دل سے چاہتی تھی کہ کل کی پہنتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے۔ مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس دقیانوسی سریواستوا گھرانے کی بیٹیا۔۔۔ پر ان کا بیاہ ہوا تھا، الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے اور جوتے پہنے کھانا کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پانی پیتے تھے۔ اور گودھوا ہوئے ان کو اب بہت برس ہونے کو آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں، لیکن محلے پر ان کا رعب تھا کیونکہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں، دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے اور ہسپتالوں میں ان کے پیلے رنگ کے اجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے ان کی بی بی سرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ افوہ، کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کھیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً مونڈیرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کھیم اور مونڈیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیے کیے ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے "نل دمینتی" اور "شکنتلا ہرلیش چندر" اور "راج رانی میرا۔۔۔" اور اوپر سے ڈانس الگ۔۔۔ "گرہ بھی ہو رہا ہے کہ آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ناچے تیرا

منڈل ـــــ اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی۔۔۔ جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیوری ری چلو پنگھٹ بھروا پانی۔۔۔ اور ساتھ ساتھ سودیرا سین گپتا ہے کہ فرّاٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہوے۔ کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا انجمن اسلام گرلز اسکول ـــــ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاص بے سُری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخرِ انبیاء ہو۔ یا نبی سلام علیک۔۔ چلئے قصہ ختم۔۔۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈمسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی۔۔ اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا:

ملتِ اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ
گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہو گا۔۔۔ بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم۔۔۔ اسکول کو بند کرو۔۔۔ یہ سب قصے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔ صدرِ اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، سرین اور رماکانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ صغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں ری۔۔۔ ایف اے کرنے کہاں جائے گی، جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ"؟ ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لئے کھیم وتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دوٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود مہیلا ودیالہ تھا۔ جہاں اسے بھیجنے کا تذکرہ شیلا نے کیا تھا۔ پردہ غالباً ـــ سے بہرصورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں، اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پر موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلّے نہ پڑے۔ ولایت سے ان [illegible] ڈگریاں لے آئے تھے یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر [illegible] [illegible]۔ [illegible] [illegible] کا [illegible]۔ تھے کہیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین، تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جا کر دوغزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی [illegible] [illegible] جاتا۔ سرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا، اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینئرنگ [illegible] [illegible] جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بس بھائی یونہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں [illegible] [illegible] [illegible] کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بے شمار رشتے کے بھائی تھے [illegible] سب ایک سے ایک سورما۔۔۔ یہاں کسی کے سورما بننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی [illegible] آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کہیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا لاویں۔۔۔ (نوٹنکی کے دھن میں [illegible] تک لہک لہک کر گاتا۔۔۔ سب یہی ہے میں نے ٹھانی۔۔۔ لاؤں گا دلہن کی رانی۔۔۔) کہاں کشوری کے واجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں، اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپاجھپ پُل اوور بن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کہیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پُل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھا۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آ کر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھین صاحب جونپور ہی کے تھے۔ پر یہاں ان کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ ضلع کے ''روسا'' اور مقامی معززین شہر'' میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے ان معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے ان کی کبھی نہ بنی۔ انٹلیکچوئل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے، اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئیں وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی لیکن کہیم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا، گھر پہ ترنگا لگاتا تھا اور ہر مسلمان کے اپنے دھیول مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی، شیعہ کانفرنس تھی، ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان

بھرے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھیے تو کچھ بھی نہ تھے یا تو شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ یہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ تری پورہ کانگریس کے موقع پر انہوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی انہیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور میر مجلس بھی ان ہی کی زیرسرپرستی میں منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار، میلے ٹھیلے، بالے میاں کی برات، پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیں، موکل، گواہ، پیشکار، سمن، عدالتیں، صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ کی عمارتیں، کچے احاطے، نیم کے درختوں کی چھاؤں میں ''آؤٹ ڈور'' مریضوں کے ہجوم گرد آلود یکوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے--- حکیم مارکہ دھاگہ خریدیے۔ پری برانڈ بیڑی پیئو۔ ایک پیسہ باپ سے لو--- جاؤ جا کر ماں کو دو--- آ گیا، آ گیا، آ گیا--- سال رواں کا سنسنی خیز فلم ''لہری راجہ'' آ گیا جس میں مس مادھوری کام کرتی ہے-----

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ شراب ہوتی چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شائستہ ''بیرے'' انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اور سول لائنز کی اس دنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی

ایس کی بالوں کی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی۔۔۔ تتی کی کل تین تو تینیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس میک کنزی دو، اور اے پی مشن گرلز ہائی سکول کی بڑی استانی مس ماتھرز جو چنیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹر میک کنزی کی چھوٹی بہن مس اولیوک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی۔ اور جس کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا چسکا لگا ہوا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وہ ہے مسٹر سکسینہ اور وہ ہے مسٹر فرحت علی، اور وہ ہے مسٹر پانڈے، کبھی تو اس کے چاروں طرف ہنستے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک میانے بھائی لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقی ماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے جونپور ایسی ذلیل جگہ پر مس میک کنزی کا دم، وہی غنیمت جانو۔۔۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بیچاری بڑی اسپورٹنگ خاتون تھیں۔ برابر کی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بددماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے، صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھئے، گائے، جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں اس دردسر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو ان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی اور تھرتھر کانپا تھا اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی۔۔۔ آداب عرض، آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں شکریہ، آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر مسلک" خاتون محترم سے

سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے ایکنوٹی ہو گئی۔

تو غرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا ہے)۔

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور رنجن داس رئیس اعظم جونپور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں۔ تو مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دیتی آنا ری رم رکھی جھاڑو پیٹی)۔

کھیم کی تو بہرحال، آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علیحدہ کندن کا چمپکا، اور نگر کشوری بھی بہن آئی تھی۔ لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بائیں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کھیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہیں۔ کتنی سندر ہے اور پھر ایم اے پاس، ایم اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری بیچ سارے مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضرات محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگو سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے رانی بٹیا ہے بالکل)۔

دالان کے گملوں کی آڑ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو اور اوپر سے کنور رنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش رائے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے ——— "اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں"، تو ان کے حلق میں ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی، کنول کماری ایسی اور کنول کماری ویسی، ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

(۳)

کھیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ باغ پر سناٹا چھایا تھا، گرمیوں کا موسم نکلا جا رہا تھا اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہولے ہولے بہہ رہی تھی، ٹھکرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا جو ... تھا، جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے، اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی، جس پر یونین جیک چپ چاپ کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کو آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی اور اداسی اور ذلت تھی، اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے، لیکن دنیا موجود تھی وہ کام بھی کرتے، کھانا بھی کھاتے، سال میں چار دفعہ جون پور آ کر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے، مولسری کے جھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری......؟ لاحول ولاقوۃ۔

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے ان سے کہا تھا، ”آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی“۔

”تم کہاں چلی جاؤ گی“؟

''تو ۔۔۔ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں۔۔۔''؟

''گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لو گی''؟

''میں خود تھوڑی ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس، میرا بیاہ کر دیا جائے گا''۔ اس نے جھنجلا کر جواب دیا تھا۔

''ارے جاؤ'' آفتاب رائے خوب ہنسے تھے۔۔۔'' میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے۔۔۔''

''ہاں ۔۔۔ بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر۔۔۔'' وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے، یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ یک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے تا کہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے، اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اسپر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا تھا، منڈیر پہ کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا) عزت نے عسکری سے کہا: استاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔۔۔

''بی اے کے بعد تم کیا کرو گی۔۔۔''؟ ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔۔۔'' کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل گئے۔ کیونکہ غالباً ان کی زندگی ان کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی، پھر ان کی آئیڈیالوجی تھی۔ (یار کیا بکواس لگا رکھی ہے، عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)۔

پر ایک روز، سدن میں، جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انہیں مہیپل نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی۔۔۔ "چچا، چیٹے چلو تو ایک واقعہ تاثیر گوش گزار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن پینتیس کے بیچ کا ہے۔۔۔"

لڑکیوں کی عجب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے۔ اس کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی انٹلیکچوئل کی ساس بنی پھرتی تھی، ہو گئی ہو گی اب گلیڈ۔۔۔ جگن ناتھ جین مائی فٹ۔۔۔کون تھا یہ اُلّو۔۔۔ میں نے کبھی دیکھا ہے اسے"؟ مہیپل کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

مہیپل رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا، جہاں تیپے والے کوئی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے بچے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا زندگی بڑی اداس ہے اس نے خیال کیا تھا، ہاں، اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے، عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بے وقوف بھی ہے۔۔۔"؟ آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بیوقوف ہے۔۔۔ مہیپل رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"۔۔۔ پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی"؟ آفتاب رائے نے مہیپل سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر۔۔۔" مہیپل نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا۔۔۔" یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا۔۔۔ جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوف کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمہاری۔۔۔"؟

"کیا بکواس ہے۔۔۔" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مہیپل رائے زادہ کو صریحاً غصہ آ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا۔۔۔ "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں۔۔۔؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آ جاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوا، کیا مارتی وہ تم کو جھاڑو لے کر۔۔۔ کیا کرتی۔۔۔؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھا خیر چلو۔ خیریت گذر گئی، اچھا ہی ہوا، کہاں کا جھگڑا مول لیتے بیکار میں، کیونکہ میرا مقولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ

انداز میں کہا) کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں۔۔۔ تم کو تو جگل ناتھ جین کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ کہ اس نے تم کو ایک فرض عظیم سے سبکدوش کیا، بلکہ وہ تمہارے حق میں [illegible] فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔۔۔"

"[illegible] آپ تنہا سے زیادہ۔۔۔" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ [illegible] ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اے پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ [illegible] کی بڑی سی کوٹھی تھی جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں [illegible] میں [illegible] چہ۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ [illegible] باجا، [illegible] جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی، ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر [illegible]۔ موہے مندر اب لوں نہیں آئے۔۔۔ کیسی چوک بھئی مو سے [illegible] اور کنول اپنی آواز میں گاتی۔۔۔ آئی پو ہوڑی جھور ماکر ملکر ہوئے۔۔۔ [illegible] دن بھر بیدمشق ہوتا رہتا تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی تو بنک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انہوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اور جا رہی تھی اور سرخ ساری میں ملبوس تھی۔ اور آلتا اس کے پیروں میں تھا۔ (آلی ری سانیں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ سنگار۔۔۔ وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا)۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سجائے ہوئے تھے ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے، ٹینس کھیلتے اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں، میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں۔۔۔ اوپر س ارجنا۔۔۔ (ارے حد۔۔ "عسکری ذات بتاتا۔ "اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو ڈاکٹر آفتاب رائے، تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے۔۔۔" مہمل اضافہ کرتا)۔

جونپور آ کر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے، جل بھرنے چلی ری گوئیاں آل سن گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

”اری او باؤلی۔۔۔ بتا تو کیا کرنے والی ہے۔۔۔“ وہ سوال کرتے۔

”پتہ نہیں ماما۔۔۔“ وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

”پتہ نہیں کی بچی۔۔۔“ وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں سے پرے دیکھتے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی عام مسلمانوں کی بستی میں بتیوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاند رات تھی۔ اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے نقاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آ گیا۔۔۔ آفتاب رائے کو خیال آیا۔۔۔ شاید اب کے محرم پر جھگڑے ہوں۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی کثرت تھی۔ وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فیصدی حصہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور، لکھنؤ، علیگڑھ، بریلی، مرادآباد، شاہجہان پور، وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہی ہوئی تھی، لیکن باقی کے سارے ضلعوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی، محلے محلے، گاؤں گاؤں سینکڑوں مندر، مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں، چپے چپے سے مسلمان کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔ لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے فراق پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کی بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے ”اجار“ کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولیس کا عملہ سو فی صدی مسلمان تھا، محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص کر مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع کاریگر تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس پہنچتا تھا اس

میں قرضے چکانے تھے۔ بیٹی کا جہیز بنانا تھا اور ہزار قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ بنا بیلا کے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے۔ ہندو چلاتے ہر سو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا۔۔۔ ہاتھی گھوڑا پالکی۔۔۔ جے کنہیا لال کی پالکی۔۔۔ اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا، لہٰذا غیر شعوری طور پر Imagery بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور چھوٹی بیویوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی، رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔۔۔ بھری گگری موری ڈھلکائی شیام۔۔۔ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں جنہیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلاویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ ماحول جس کا دائرہ مرزاپور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلّی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھی جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کے خلاف ایک پروگریسو ردعمل ثابت ہو سکتا تھا، کس طرح انیسویں صدی کی وہابی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ کے بجائے اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے سامنے آئیں، لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا، پہلے یہ کنول کماری کود پڑی، پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں۔ اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچررشپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی اتھوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے اور مالویہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اتاری جاتی۔۔۔ یہ میں تم سے کہتا ہوں۔۔۔ کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے انہوں نے ایک دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا۔۔۔ بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ ان سے کہا گیا۔۔۔ ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مریں گے۔ تمہاری طرح سے تھوڑا ہی ہیں، ڈھلمل یقین۔۔۔

آفتاب رائے کے ساتھ مذاق میں اپنی جونپور کا قاضی کہا [illegible] یہ جو کتاب تم مت ولے ہو اس کا نام رکھو... "جونپور کا قاضی"...

"شہر کے اندیشے سے دبلا کیوں ہو..."

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے برسے پڑ رہے [illegible] سے [illegible] کر رہے تھے، ہاں زندگی میں بے پناہ اداسی تھی... ویرانی اور تاریکی

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ [illegible] سے مکان سے [illegible] آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈہ نصب تھا، اس کی روشنی [illegible] ویرانے کی بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہوے کے جنگل میں آیا بیتال [illegible] بیٹھے روتے ہوں

جلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں [illegible] وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنور [illegible] کی تحریم [illegible] کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

"عاشورے شب [illegible] شمع [illegible]..." بی مدن نے تخت پر [illegible] خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا...

"... اسے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا..." حسن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"[illegible] دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں [illegible] بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں...؟" بڑی اماں نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ کمبخت ایسی سٹرتی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا... اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ دکھائی تھوڑی دے رہا تھا... میں نے تو انکل سے پڑھنا شروع کر دیا... اے بہن... اے نیازی بیگم... ذری اپنی عینک تو دینا"... بوا مدن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کے دی جو بوا مدن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بوا مدن نجم الملت کی بیاض بھی لائی ہو کہ...؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھیے--- بڑی بھاوج--- نجم الملت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھت تھیں۔" بچن نے جواب دیا

"ہاں بیٹا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں، اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں---" بوا مدن نے قدرے بے زاری سے کہا۔

یہ لڑکیاں پیشہ ور تھیں۔ بوا مدن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی نظرِ استحسان نہ دیکھا تھا

گلی محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوا مدن کے اس جملے کا انہوں نے ہرگز نوٹس نہ لیا

ڈولی اترواؤ--- باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

پردہ کر لو لوگو کہار اندر آتے ہیں"۔

ڈیوڑھی کی سیڑھی سے کھڑونچی پر ٹکا کر ممولہ تیز آواز میں چلائی--- "چھمو بیگم آ گئیں"۔

چھمو بیگم ڈولی میں سے اتریں اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے بھرے نالی کو اولانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ "اللہ رکھے بڑی ممولہ کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے"۔ انہوں نے ذرا بیزاری سے کہا:

کہیں ممولہ نے یہ سن لیا "اے چھمو بیگم--- ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجیے، بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیا آوے کان بہرے--- اب تو میں نے آنگن کا سراپا لی سوتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کو لیکے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اتنا اتنا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے ہاں"--- اس نے منہ در منہ جواب دیا

"اے بی ممولہ--- ذری آپے میں رہنا--- میں خود سے نہیں آ گئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آ کر مجلس پڑھ جاؤ--- مجلس پڑھ جاؤ--- میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں اور محلے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں--- ہاں--- لو بھائی ڈولی---" چھمو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اٹھ کر باہر آئیں--- "اے ہے--- یہ کیا کوا نوچن مچی ہے۔ اماموں پر مصیبت کی گھڑی، اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو--- چل نکل ممولہ یہاں سے--- ڈولی جب دیکھو جب ہی فضیحتا شروع کرتی ہے--- آؤ--- جم جم آؤ---"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوائیے بیگم صاحب---

(ارے دیارے--- ساری دیہہ دشمن الٹت ہے.... [illegible] نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے خیال کیا ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ [illegible] تک آنے جانے کے تو وہ دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی [illegible] اور ان کی برادری کی۔ اور بھوجن جو چل رہے تھے وہ الگ--- ریڑوہ ایک [illegible] کری تماشہ ہوتا تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا [illegible] بیٹھ جاتی تھیں۔ اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے [illegible] ریڑوہ گلیوں کے کچے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا [illegible] بہت [illegible] آنے کی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی چوپہلہ صدر اعلیٰ کے یہاں تھی۔

چھمو بیگم اس معرکے کے بعد تھک تھک چلتی آن کر چاندنی [illegible] اور ٹیک لگاکر بڑے ٹھسے سے چاروں طرف نظر ڈالی، وہ خود بڑی باں بر سوز خواں تھیں۔ انہوں نے کبھی چھمو بیگم کی پرواہ نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پھٹکے لگاتی بوادن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چنڈپٹی کی گوٹ کا اودا پائجامہ اور پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ کس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہاں یہ [illegible] میریاثن ہیں، مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں، دوسرے یہ کہ نجن سلمہا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بوا مدن کو ہرگز نہ مانتیں۔ بوادن کو گو یہ زعم تھا کہ مالکوں اور سوتی بھاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے تو چھمو بیگم کو بھی ماننا ہے جانا تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میرانیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کے دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر در چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ پر رکھ کر جنھیں پر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ اور چھمو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمو بیگم کے وعظ بہت ماڈرن ہوتے تھے، کیا جناب کہیں صاحب بلکہ خود قبلہ جارجوی

صاحب سے ایسے رموز و نکات، انگریزی فلسفے کے ساتھ شہادت میں سے نہ نکال سکتے جو چھوبیگم پل کی پل دریا کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس!۔۔۔ جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کیے۔۔۔ والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو!۔۔۔ جناب عباسؑ نے رو کر کہا بالی سکینہ اٹھو۔" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاء اللہ سے چھوبیگم نے سماں باندھ دیا ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے، ابھی یزید ملعون کے مذمن کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں، ساتھ ساتھ اس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں بیبیو۔۔۔ میں کوئی مورخ، کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی اور ایک طرف جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے، مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اول پر اتر آئے تھے اور نور کی جھاڑو سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں۔۔۔ اے بیبیو۔۔۔ انگریزی دان دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو۔ اور کان کھول کر سنو۔۔ کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں، بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومن بیبیو۔۔۔ کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال قُل ھُوَ اللہُ احد، اللہُ الصّمد لم یلِد وَلم یُو لد وَلم یَکُن لَّہ کُفواً اَحَد۔۔۔ یہ ون کیا ہے۔۔۔ ون انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں۔۔۔ مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادت علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔۔۔ یہ چھوبیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھوبیگم خاصی فرڈ ہیں۔ لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزگی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا جس میں شادی بیاہ تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے جوگی ریوڑے کی سالانہ زیارت، غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ ڈپٹی جعفر عباس سے

بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں [illegible] زمانے تھا۔ وہ میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں [illegible] تھے اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں کھیتوں پیسے [illegible] تھی۔ ان کا میکہ و سسرال دونوں طرف سے ماشاء اللہ سے بھرا پُرا کنبہ تھا۔ [illegible] ان کی نہ بنی۔ دیورانی جٹھانی کا پیار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں [illegible] مقدمہ کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ [illegible] کے گھروں میں بول چال تک بند ہو گئی۔ سچ کہا ہے بڑا کہ زر، زمین، زن، تینوں [illegible] کا گھر وا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب تینوں [illegible] نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی [illegible] بھول کر کہا سنا معاف کروالیا اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی [illegible] جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں، اولاد کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ [illegible] لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا بلکہ یہ مدن تو یتیں محکم سے ساتھ [illegible] تھیں [illegible] اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ جھمو بیگم کا ہے۔ حرف ادھر کی ادھر لگاتی تھی۔ اور پھر سال کے سال پرسولن بن کر چڑھ بیٹھتی ہے جڑیل۔

رونا بہرحال فرض تھا۔ خواہ جھمو بیگم جیسے کتنی ہی بین کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بوا مدن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور ان کی باری آئے

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ آئے تھے کیا کیا گلِ زہرا کو فدائی۔۔۔ نواسوں نے دیکھی دور سے لڑائی۔۔۔ [illegible] لڑتے ہوئے مرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا۔۔۔ اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے۔۔۔ جی ہاں بڑی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ حکیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا، جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھائی بری بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رت کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ، مگر کشوری کس کی سنتی تھی، ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ خاتون تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی اے بھی کر بیٹھیں مگر چھوٹی اماں

جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر تی گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم ہوسٹل پلچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے مختلف کے نمونے اس [illegible] ہیں۔ جہاں مردہ، کوئی نیا نمونہ سویٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے، گھر آ کر ذرا تیار [illegible] وہ شوقین، ریاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن کی "نظارے" اور [illegible] علی کی "ظالم محبت" تک اس کی اماری میں موجود۔۔۔ سینما جب موقع ملا ضرور دیکھ [illegible] حاصے مولوی آدمی تھے۔ بی سی ایس میں آ گئے تھے۔ کینگ کالج سے ایم اے ایل ایل بی [illegible] رکھا تھا لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں [illegible] خود بڑی داد لی لیتے تھے کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی [illegible] پانے پر کیا لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں [illegible] باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا، کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ کے روز جب دولہا جانی نذر لایا جاتا تو اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈیاں دعا مانگتیں کہ یامولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال کھلے۔

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہیتھڑی یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔۔۔

(۵)

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی حکومت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوتری پر بیٹھے آس لگائے سوچ کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے، لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس اب لفٹیننٹ تھا۔

مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔ [illegible] مظاہر کے موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا۔ --- کہاں گئی موٹر سرکاری جپا کر سبزی ترکاری، یہ بھی دیکھا، وہ بھی دیکھا۔ کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ کر اور سن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پرانے [illegible] کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند، کیا مجال جو لڑکیاں بغیر [illegible] سے قدم نکالیں۔ (صوبے کے وسطی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا۔" باعزت متوسط طبقے کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو [illegible] کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں، لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا معیوب خیال کیا جاتا تھا)۔

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب): کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبلپور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج): اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د): کشوری کو ایف اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہو گا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج اور مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن ان کا تعلق مسلم اسکول سے ہے۔

بعینہ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی سپتریاں اس وش ودیالے کی ودیارتھی رہ چکی تھیں اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جونپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کھیم کو اتروانے کے لئے آ گئے اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بیچارے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کھیم اور کشوری

نے ایک دوسرے کو خداحافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

(۲)

نسیم علی رضا زیدی سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد سنیٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی۔۔۔ وہ چودھری سلطان کے سیمینار سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیٹر سے اتر رہی تھی۔ کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ اور وہ خاموش ہو گئی۔۔۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے۔۔۔

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے"۔۔۔ اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔۔۔ "کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دوسرے کے سائے میں رہے، ایک سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترک کلچر پر ناز تھا۔ اور ایک قسم کا احساس برتری تھوڑی دیر بعد جب اس وقت نسیم نے مجھے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہیلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے، میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ میلا دودیال کی لڑکی ہے کانگریس پر یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر نسیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقاء نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتا رام کا فلم ہو گئی۔ جو اچھے پڑوسی کرو بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے۔ یہی ایک مثال میری اور نسیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے پلید۔ اور چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں خوب دھو کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے۔۔۔ وہ چپ ہو گئی۔

آتشداں میں آگ دہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گذر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چائے پر گئی تھی"۔ رما نے کہا۔ "وہاں بہت سے لوگ

آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے جلسے کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں"۔

"کنول کماری"... ؟ کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں، ہمارے نئے فرسٹ سیکرٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے کیوں نہ اس میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر ان کے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروا دیں ... سفیر حضرات وغیرہ بھی ہوں گے، بچاری نے وعدہ کر لیا..."

سورج است ہو گیا... سورج است ہو گیا... دوسرے کمرے میں ... سے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے بربند جنوپ دھیپ کا کورس یک لخت زور ... سے اپنا شروع کر دیا۔

"... میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں ... لڑکوں سے ملتی ہوں... ملک کے لوگ ہیں، برازیل کے، عراق اور مصر کے، میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں، ہمعصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انہوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ .... ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں..." کشوری نے کہا

چاروں اور آگ لگی... بل میں بھوک پیاس لگی... جگ جگ ہم گاتے... ہم گاتے ہم گاتے... لڑکیاں چلا رہی تھیں "میرا جی چاہتا ہے میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں" اس نے ساتھیوں کی ریت میں مخاطب کیا... تا کہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اس کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے"۔ روز ماری نے اظہار خیال کیا۔

ہاں، جونپور میں، میرے محلے میں، شاید تین چار بجے کچھ سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں کالج کا زمانہ گزر گیا ہو گا۔ پرانے کیلنڈر بیکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں... کشوری نے دل میں کہا۔

برفباری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں..." روز ماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں ۔ کشوری نے کہا۔

پگ پگ ہم گاتے چلیں۔۔۔ لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چار باغ اسٹیشن پر کلیم کو آخری بار خداحافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول، پھر چاند باغ گرلز کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیاں ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا مہاسبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جس میں کبھی کبھی شمیم رائے زیادہ دور سے نظر آتی۔ طالب علموں کی دنیا ابھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش، مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہو گی، نہیں ہو گی، ہو گی، نہیں ہو گی۔

یونین میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شوڈاون" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا۔ آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنہوں نے باہر سے آ کر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ بعد خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا۔۔۔ "کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمتہ کے متعلق اظہار خیال کیا، اس کے لئے معافی مانگئے ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے بلکہ کر دیا ہے، اسٹرائیک ہم نے۔۔۔ آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے"۔

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے۔۔۔ ارے تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بیٹی ہے نا، ارے باؤلی سی۔۔۔ وہ بے ساختہ کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے۔ "بات یہ ہے مس عباس۔۔۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "سیاست اور حصول تعلیم کے درمیان جو۔۔۔"۔

"اجی ڈاکٹر صاحب! بس اب رہنے دیجئے..." کسی نے آہستہ سے کہا... ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں -------- قبلہ..."

"ڈاکٹر صاحب میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ...؟" دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحبزادے..." آفتاب رائے نے ... سے کہا... معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند اصول ہیں۔ میں اور تمہارے دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو...؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے..." انہوں نے شور مچایا... "معافی مانگئے، ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے"۔

"ضرور منائیے..." آفتاب رائے نے یک لخت بے حد ...

"اور مکمل اسٹرائیک کریں گے"۔

"ضرور کرو... خدا مبارک کرے..." انہوں نے آہستہ سے کہا، اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہاسبھائی نکلا یہ بھی..." لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رت آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے ان کو یونہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی، مگر ڈاکٹر آفتاب رائے اب ملتے ہیں نہ تب۔ لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہو گا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کا خیال کرتا، اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ تہمینہ وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جونپور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے ناد علی کا ورد کیا کرتے، اور تنہائی ہر سے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا

تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ انت سے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی، جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی، اور اب وقت نے یہ پانا پلٹا تھا کہ وہ جونپور کے گھر کی چاردیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم اے میں پڑھتی تھی۔ اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے بیسیوں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھایئے، نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیئے، اخباروں میں مضمون لکھئے۔ ریڈیو پر بولیئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑ پہنچے ہو۔۔۔ لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آ جاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے بھلا کچھ بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا، چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ میں۔ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوزخوانی کون کرے گا۔ میرے لئے آملیٹ ڈبل روٹی کون بنائے گا۔ پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے پلٹ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں۔۔۔ دیوانے ہوئے ہو، بٹیا کو کب تک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ کل گئی، جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔۔۔ یہاں کس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے اکیو ایک پاکستان چلے گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبادھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی، اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں اب کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے۔خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں۔۔۔ اور یہ بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ ساراجونپور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔۔۔ سارے حکام اور پولس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر

سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دوبارہ دوڑ شروع کر دی تلاش کی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے جیسے ہم پر نظر رکھا جا رہا ہے۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا تھا جو ان کے علاج پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو بڑا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے شمو بیٹی کے رکھے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد، ان گنت مسلمان گھرانے بیتے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں۔ اور ابھی ان کے اچھے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی تو ہنسی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال بالکل ترک کر دیا اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیرا ہے کہ اچھے سیکنڈ ڈویژن والی اکنامکس کی ایم اے کو کہیں جونیئر لیکچررشپ بھی نہ ملے گی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں، اور ویسے ایمان کی یہ بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفاداری کا کیا ثبوت ہے ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائیے گا۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں

قدم قدم پر اس کو یہی سننے کو ملتا اور وہ گھوم پھر کے جونپور لوٹ آتی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا۔ وہ تمہاری گوئیاں نسیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے، ان کو ہی جا کر پکڑو، وہ تو بڑے بااثر آدمی ہیں اور بڑے شریف، ضرور مدد کریں گے اور کشوری کو خیال آیا کہ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے--- اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے، اڑتی اڑتی سنی تھی کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو مرارجی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب سنا ہے وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر صاحب آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک آف ڈومنیکا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال، ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "زیر زمین" تھے۔

بیچارے ... رہے

آج ... رات تھی، محلے میں تعزیہ رکھا جا چکا تھا، مجلسیں اب بھی ہوتیں، لیکن وہ چہل پہل، رونق، اور ... تو اب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں ... باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھ رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں اب وہ اگلے تلگے کہاں ساری مہریاں اور کہاریں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس نگوڑی مولہ رہ گئی تھی۔ سو اس کی آواز کو بھی پالا مار گیا تھا لیکن چھمو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری--- آ گئیں چھمو بیگم--- آؤ جم جم آؤ---

چھمو بیگم چپ چاپ آن کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انہوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا--- "مولا یہ میرا آخری محرم ہے ارے اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی---؟" اور یہ کہہ کر انہوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا مدن اپنی پرانی "دشمناگی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں--- "لو بوا غم حسینؑ کو یاد کرو۔ یہ غم ہلکا ہو جاتا ہے---مولا تو ہر جگہ ہیں، کیا پاکستان میں نہیں ہیں---؟"

"ہاں --- ہاں---" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی---مولاؑ کیا پاکستان میں نہیں--- تم وہاں جا کر بھی مجلسیں قائم کرنا۔

"لو بوا... ہم بھی چل دیے پاکستان..." جب [illegible] رقت [illegible]
بیگم چاند رات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدن نے [illegible]

"سچ کہو بوا مدن..." بڑی بھاوج نے [illegible] پوچھا
"ہاں بیوی، ہم بھی چل دیے..." بوا مدن نے [illegible]
"کیسے چل دیں..." بڑی بھاوج [illegible]
نکلے چلے جا رہے ہیں۔ سب نصیحتوں سے [illegible]"
"بس بڑی بھاوج لوگا نہیں مانتا... [illegible]
جاؤ... کوئی گھوڑی جگہ سکھر ہے، وہاں [illegible]
"اچھا... شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں..." [illegible]
"عاشور کی شب کی پہلی"... بوا مدن نے جو حسب [illegible] آتی تھیں
دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایک [illegible] طاری تھی کہ [illegible] ان کی تصحیح کرنے
کی ضرورت نہ سمجھی۔ کسی نے آواز ملائی... چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم [illegible] جالا بکھیرتی
رہی، آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کستوری سیہ دوپٹے سے [illegible] اپنی جگہ پر [illegible] ساتویں رات
کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

(٨)

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آ کر
دریچوں کے پردے گرائے اور چائے کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی
جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری ایڈوائزر بریگیڈیئر کھنہ
کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلہ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو
اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ جا کر کوریوگرافی سیکھتی تھی۔ [illegible] اور
اور لیڈی [illegible] ولیوس، اینتھنی ڈیسلوتھ، کرسٹوفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب
مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب
بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا اور
وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئل ونٹلکچوئل نہیں ہوں، سیدھا سیدھا آدمی ہوں اور
جس دھرے پر ان بینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے۔ انگریز کے زمانے میں وہ

ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سرکاری ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم [illegible] تھی جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ وہ واہ، مثلاً آج ہی کی پارٹی میں [illegible] سٹیفکیشن [illegible] ایڈمنسٹریشن [illegible] [illegible] سب [illegible] قائل ہونا پڑا۔ چاند ہاتھ سے اچھے [illegible] اسٹیبلشمنٹ میں [illegible] بن گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک [illegible] تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان [illegible] ہستیوں سے یوں بھولی پن سے ہاتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

سورج اسٹ ہو گیا۔۔۔ سورج اسٹ ہو گیا۔۔۔ ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

کنول دیدی۔۔۔ جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس سیلے میں آنا ہے۔۔۔"

"ہاں ہاں بھئی۔۔۔" کنول نے جواب دیا۔ "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ۔۔۔"

"ارے ہائے۔۔۔" ارملا نے رک کر کہا۔ "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے، چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے۔۔۔"

"ڈاکٹر۔۔۔ آفتاب۔۔۔ رائے۔۔۔؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں۔۔۔ کنول دیدی۔۔۔" ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی۔ "وہ تو دن بھر یونہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے، لیکن کل وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں، وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی"۔۔۔

"گڈ نائٹ ارملا"۔۔۔

"ارے ہاں"۔ اس نے جاتے جاتے رک کر پھر کہا۔ "کل آپ رائل کمانڈ پرفارمینس میں جا رہی ہیں۔۔۔؟ آپ کو تو سر رالف رچرڈ نے خود ہی بلایا ہو گا۔۔۔"

"ارے نہیں بھئی۔۔۔" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

("یہ بھی اس کا ایک پوز ہے"۔ ایک دل جلی مسز اوبرائے نے جو سیکنڈ سیکرٹری کی بیوی تھی۔

مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اور بھی اچھے لگتے ہیں، چڑیل کہیں کی") نہیں بھی ارملا۔ مجھے یہ پرندوں اور ساری مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں۔۔۔"

"اچھا گڈ نائٹ۔"

"اچھی طرح سوؤ۔۔۔" کنول نے کہا۔ ارملا ہریندرناتھ چٹوپادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔۔۔ ڈاکٹر آفتاب رائے ... ابھی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ تچھین کر لے گئے۔۔۔ تب ... وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔۔۔ واسلتھی۔۔۔ اس نے چلا کر آواز دی۔ کھانا ... اس نے ٹیلی ویژن کھولا، بکواس ہے، بند کر دیا، پھر اس نے ریڈیو لگایا، بکواس تھا، اسے بھی بند کر دیا، کیا پتہ اس سے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا گاتی ہو یا ہوزی جھورنا۔۔۔ ... اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لنٹیرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی۔۔

میں نے کیا کیا تھا۔۔۔؟ اس نے سوال کیا، کچھ نہیں، میں اب دس سال سے کنول کماری چین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے، کیوں نہیں بنتی۔۔۔ سال گزرتے جا رہے ہیں، میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی اور تب بہت اچھا ہو گا۔

ایسا نہ ہونا چاہئے تھا، پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ۔۔۔ ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا ۔ جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ۔۔۔

۔۔۔ میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ۔۔۔؟ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا بھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ملتا ہے؟

باہر اندھیرا تھا اور سردی اور بیکراں خاموشی، میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی آفتاب بہادر۔۔۔ اس نے غصے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا۔۔۔ تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کونے میں آ کر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریل بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب

بہادر۔۔۔"

نیچے کیرل گانے والے چپ ہو گئے تھے اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر، اب جو میں ہوں اور جو تم ہو۔۔۔ کیا یہی بہت ٹھیک ہے۔۔۔؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جانے آفتاب کی بیوی کیسی ہو گی؟ (ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بڑی سے آدمی کی تصویر سامنے لا کر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھو۔۔۔ اور سوال یہ کہ عین مین اسی طرح کا آدمی جین نکلا۔۔۔) آفتاب کی بیوی۔۔۔ یہ فقرہ بڑا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہو گی چڑیل۔ آخر میں یہ سب ۔۔۔ کھاتے ہیں۔۔۔ ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہو گی اور ٹینس کھیلتی ہو گی جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے، لیکن فیشن ایبل، پھرنے والی اور ہوا میں اڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا، جس کو وہ پسند کرے گا وہ بہت ہی عمدہ ہو گی، بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، جی ہاں، اور مجھ میں کیا برائی تھی؟ اس نے طے کرنا چاہا کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی نازل ہو جانی چاہیئے تھی کہ یہ مہارش، آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے، لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے روزانہ آ کر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور ستار بجوائے وقت بے وقت سنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ۔۔۔ ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔۔۔ جمیل کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کی باقی افراد سے کہا بھئی نمبر ۲۹ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر بھائی آفتاب چائے پیتے پیتے رک کے دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں، بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پروپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا جمیل کو فون کر دو کہ آم خریدتا لائے یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمکس۔۔۔ ثروت اس قدر کمینی تھی۔۔۔ وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا، لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔۔۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ وہی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفارمینس ہیں۔ ور جین کے صبح کے

ناشتے کی دیکھ بھال اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم [illegible] سوچو ہے؟ (اس نے کہا تھا، ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک [illegible] [illegible] [illegible] منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس [illegible] شادی [illegible] [illegible] دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ واہ، چغد [illegible] ہے)۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور [illegible] [illegible] و مانع انتصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصہ گویں [illegible] [illegible] کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ [illegible] [illegible] رہیں اور مارے بددماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لائیں، [illegible] [illegible] صدق دل سے پسند فرمایا وہ خود ہی بڑی پھسڈی [illegible] [illegible] [illegible] گاڑی نکل چکی تھی، بیڑی چمک رہی تھی --- جی ہاں۔

اری ثروت --- کروک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا [illegible] کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو، ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ختم ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ یا --- Vice Versa)۔

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی پی [illegible] کی طرح مہاگرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہو گی۔ یہاں پہنچ کر [illegible] عجیب و غریب اور شدید تکلیف کا احساس ہوا --- (وہ کون ہو گی --- کیسی ہو گی۔ آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہو گی؟ آفتاب اس سے کہاں ملا ہو گا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہو گا۔ (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا) --- کیا بات ہے صاحب --- ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ [illegible] اپنی نہایت شخصی دنیا، اچھے مشغلے، کتابیں، موسیقی، ڈھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے چنے چنے دوست --- اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے اور ٹینس کھیلا ادھر ادھر خواتین سے بھی مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے رحم کی نگاہوں سے دیکھا کہ بے چاریاں --- لہٰذا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا --- یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر --- تم تو لکھتے رہو میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی۔ راستہ

اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی۔۔۔ زندگی تمام ہوئی۔۔۔ زندگی تمام ہوئی۔۔۔ پچھلی منزل میں ارملا نندوناتھ چٹوپادھیائے کی دھن کورس آہستہ آہستہ الاپ رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کہرہ اب کم ہو گیا تھا، اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد بہت نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

[illegible] مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے

صبح ہوئی شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

(۹)

جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، وہاں بھی وہی نقشہ تھا، سیلن انگریز پھر آڑے آئے اور برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے ابھی میں راستے ہی میں تھی جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے۔۔۔"

کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتشدان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

آج مڈنائٹ ماس منانے چلیں گے، روزمیری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا، چلو ہم برومپٹن اوریٹری چلیں، جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہنگرین لڑکی کو دیکھا تھا، وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے دیر سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا، لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کے "آزادی کا شکرانہ" کر دیا۔۔۔ آج کی رات میں وہاں امید اور ناامیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنہیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا، جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے۔ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے گئی پر کنول نے محسوس کی تھی، لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا)۔

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہنے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں؟ کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو جنے دوبارہ ملتے ہیں تو ان کی پرانی یگانگت یاد آ جاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر سبھی کو خوشی ہوتی ہے۔ اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی..... "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی--- ایک دن بالکل اتفاقیہ کھیم وتی پھر سے نظر آ گئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی۔

"ارے کھیم--- کھیما"--- میں چلا کر اس کی اور دوڑی--- اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا "کھیم رانی تم نے مجھے پہچانا نہیں"؟ میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی--- ہلو کشوری--- اس نے مطلق کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے، اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا، یہ میرے پتی ہیں، کھیم نے اسی سرد مہری کے انداز میں بات کی، نمستے بھائی صاحب--- میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو، تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے"۔ کھیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا، اس کے شوہر نے جو بہت سمجھ دار معلوم ہوتا تھا، فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا--- "اچھا بہن جی--- اس سے تو ہم بہت جلدی میں ہیں، آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے، ہم یہیں ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں---

"اچھا، ضرور آؤں گی، بائی بائی کھیم"--- میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چلی گئی، میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی، میں یہ نہ کہوں گی کہ رفیقو! انسان نے خودکشی کر لی، پرانی اقدار تباہ ہو گئیں۔ اپنے پرائے ہو گئے، یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتارام کا فلم ہو گئی۔ میں نے اور کھیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو۔

سمجھیں؟

''اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھنا چاہا، لیکن چلو روزماری، اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے۔'' اس نے روزماری کو مخاطب کیا۔ ''تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے نئے کون سے عنوان منتخب کرے گی۔

ہم اپنے قدامت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کی دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک ''سرد لڑائی'' کے ... پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

''ہم ... یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ... مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں، لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہو گا؟''

''تم ... بھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی---؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے---؟''

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں ''وائٹ کرسمس'' گائی جا رہی تھی۔

''شاید میں نے تمہیں بتایا تھا---'' ارملا نے نیچی آواز میں کہا، ''کہ آج دفتر سے واپسی پر ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا ڈاکٹر صاحب، میں نے تو سنا تھا کہ آپ ری پبلک کسی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سنا تھا--- انہوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا تو کیا آپ بھی--- میں نے سوال کرنا چاہا، ہاں --- میں بھی--- پھر وہ جلدی سے خداحافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراؤنڈ نے ان کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھ میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے--- نجانے وہ کہاں رہتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ اتنا عرصہ انہوں نے کیسے گذارا؟ واپس جانے کی اجازت انہیں کب ملے گی-- کیا ہو گا---؟''

دور، گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے، وہ سب باہر سڑک پر آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انہوں نے سوچا--- لیکن ہم رات کی تاریکی تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم، یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں، لیکن دیکھو، یہ راستے، یہ جھیل، یہ باغات، ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آ گئی۔ لیکن ہم اسے چھوتے ہوئے ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو، ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اتحاد نے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے پکاری جاتی ہے یہ غداری مختلف پیشوں سے ہوتی ہوئی آ رہی ہے، وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک اجنبی وضع سے میزبانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سیکرٹری کا مکان تھا۔ ان کے آگے اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انہوں نے سوال کیا اس سے پوچھو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیمپوں کے نیچے۔ گھاس کے ان راستوں پر، روشن پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بکھیڑے.....!

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا..... آؤ۔ آج کی رات تمہارے وجود سے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خدا کی آواز ہوں۔ اور تمہاری بربادی میں شریک ہوں۔ اور موت کا محافظ ہوں۔ اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس سے خداوند کی تقدیس کرتے تھے اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے، لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاستدان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے کیونکہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں، چٹانوں کی بہن، سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہدنامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا

ہے۔ آ[illegible] کے [illegible] اور لرزہ خیز مردوں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے پر واپس آ گئے۔

"ننکو رانی"۔ [illegible] کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آ جاؤ۔ [illegible] تمام [illegible] کھڑے ہو کر اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے، کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے"۔ کستوری نے آہستہ سے دہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے [illegible] ہماری جلاوطنی ختم ہو گئی [illegible] ہمارے سامنے آج کی صبح ہے۔ مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے"۔

لیکن ننول کماری۔۔۔ تم اب بھی رو رہی ہو۔۔۔؟

مزار شریف

قیصر تمکین

جون کا تپتا ہوا دن تھا۔ بہت زوروں سے لو چل رہی تھی اور مسجد کے صحن میں بنے ہوئے کنویں کے پاس گرد و غبار کے ساتھ ہی املی اور نیم کے خشک پتوں کے ڈھیر جمع ہو رہے تھے۔

جمعہ کا دن تھا اس لئے لو اور دھوپ کی سختی کے باوجود عین اس وقت جب چیل انڈا چھوڑتی ہے میاں لوگ صاف ستھرے کرتے اور ٹھنگے پاجامے پہنے یا صرف تہمد اور کرتے میں ملبوس سروں کو عربوں کی طرح رنگین رومالوں سے ڈھکے ہوئے آ رہے تھے۔ سب کے پاس سے خس کے عطر کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور فرحناک لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

ان نمازیوں میں ماشاء اللہ بلڈنگ کے بہشتی زیور قسم کے میاں لوگ تھے اور پھاٹک کے آوارہ گرد، گمنام لڑکے بھی جو شہر کے پہلوانوں یا شاعروں کے منظور نظر تھے۔ یہ لوگ اسکولوں سے بھاگ کر اپنے چاہنے والوں کے ساتھ ہوٹلوں میں چائے پیتے یا سینما گھروں میں فلم دیکھنے جاتے اور رومی دروازے یا شہر کے دوسرے غیر آباد کھنڈروں میں ایرانی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے۔ انہی نمازیوں میں بڑوں کے کاٹے، چیچک رو، لنگڑے یا نالائق میاں پوت بھی تھے جو ماؤں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے۔ باپ کو گولی مارنے کی دھمکی دیتے اور پھر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ نمازیں پڑھتے۔ ان سب صالح اور نماز روزے کے پابند صاحبزادوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی عمو جان، ماموں میاں یا دادا جان قسم کا داڑھی یافتہ، خضاب آلودہ مومن اور پارسا بھی ہوتا جو مسجد میں قدم رکھتے ہی زور سے سلام علیک کہتا۔ ہر طرف سے بھن بھن کی آوازوں میں لوگ وعلیکم السلام کہتے۔

دلارے میاں کمیونسٹ تھے۔ چنانچہ جب سب لوگ اور "میاں لوگ" خاص طور پر جمعہ پڑھنے جا رہے تھے تو وہ مسجد ہی سے ملے ہوئے گھنے املی کے درخت پر چھپے بیٹھے تھے۔ لو تیز تھی اور بگولے اس طرح ناچ رہے تھے کہ کسی کی ہمت نہ تھی جو درخت کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکتا۔

مسجد کے دالانوں پر ٹاٹ کے موٹے پردے پڑے تھے۔ مسجد کے امام صاحب جن کو سب لوگ حافظ ماموں کہتے تھے بہت ہی خواب آور لے میں ''الوداع، الوداع یا شہر رمضان الوداع،،کی گردان کر رہے تھے اور سننے والوں کو تیز نیند کے جھونکے آرہے تھے۔

بھوری جس کی آنکھیں نیلی۔ رنگ پھیکے شلجم کی طرح سفید، بال بھورے اور ہاتھ پاؤں جلے کی شاخوں کی طرح نازک تھے اوڑھنی سے اپنا آدھا چہرہ چھپائے آئی اس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹی سی جھجری تھی اور دوسرے میں چھوٹی سی گھڑی۔ کنویں کے پیچھے ببول اور کیکر کی جھاڑیوں میں گھرا ہوا جنت بی کا ٹوٹا پھوٹا مزار تھا اس کے آس پاس طرح طرح کی جنگلی جھاڑیوں اور خودرو زرد زرد پھولوں کے پودوں کے درمیان بہت سی ٹوٹی پھوٹی قبریں بھی تھیں جن میں لگی ہوئی اینٹیں کچھ اس طرح شکستہ تھیں کہ دانت نکوستی لگتی تھیں۔ بھوری نے دوپٹہ سنبھالا جھاڑیوں میں رستہ بنایا اور ببول و کیکر کی جھاڑیوں اور بڑے بڑے درختوں میں چھپ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نکلی کنویں پر چڑھا ہوا ٹین کا ڈھکنا ہٹایا اور جھجری کو کنویں میں لٹکتی ہوئی رسی میں باندھ کر پانی بھرنے لگی۔ جب وہ چھوٹی سی جھجری کو ٹھنڈے پانی سے بھر کر واپس محل کی طرف جا رہی تھی تو اس کے ہاتھ میں گھڑی نہیں تھی۔

دلارے میاں کو حسد ہوا۔ بھوری کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ درخت سے اترے۔ ان کی ٹوپی میں کچی کچی املیوں کا کچومر بنا کر خوب ڈھیر سا نمک مرچ ملا کر ایسا چٹ پٹا مرکب بنائیں کہ سب لڑکیوں کے منہ میں پانی بھر آتا۔ سب کو ملکہ کی خوشامد کرنی پڑتی۔ دلارے بھیا کو درخت پر چڑھنے اور سب کی نظروں سے بچ کر میاں یا کچی کچی امیاں توڑنے میں خوب مہارت حاصل تھی مگر وہ یہ کام صرف ملکہ کے لئے کرتے تھے۔ دوسری لڑکیاں بھی خوشامد کرتیں ''اللہ دلارے بھیا، ہم کو بھی املیاں توڑ لا دیجئے،،۔ مگر دلارے بھیا منہ بنا کر انکار کر دیتے...... وہ تو صرف ملکہ کے ''میاں،، تھے۔

ایک اور بات بھی تھی کہ دلارے بھیا ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کچھ عجیب عجیب باتیں کرنے لگے تھے۔ بعض بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ ''دہریہ ہوگیا ہے،،۔ کیونکہ وہ نہ تو مسجد جاتے تھے، اور نہ املی کے درخت پر مقیم چڑیلوں اور چھلاوؤں سے ڈرتے تھے۔ دوسرے لڑکے دوپہر کے وقت درخت کے سائے سے بھی ڈرتے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ اس پر چڑیلوں کے علاوہ جنات کا بھی بسیرا تھا۔ گویا وہ املی کا درخت کوئی ایسا ہاؤسنگ کارپوریشن تھا جس میں مافوق الفطرت ہستیوں کے لئے الگ الگ ڈھال ''الاٹ،، تھی۔ اس بات میں کچھ تو سچائی ضرور ہوگی کیونکہ ایک بار ایک لڑکے نے بھی ڈھیلے مار کر املیاں توڑنے کی کوشش تو کوئی بدروح اس پر پڑ گئی اور ایسا بلبلا کر بخار آیا کہ پورے ہفتے طرح طرح کے تعویذ گھول کر پیتا رہا تب جاں بخشی ہوئی۔

محل میں جانے سے پہلے دلارے میاں نے ببول اور کیکر کی جھاڑیوں کے پاس جا کر دیکھا۔ بھوری

ے وہ گھڑی [illegible] کہیں چھپا دی تھی۔ انھوں نے [illegible] کی جانب اشارہ
دی۔ شاید کچھ لوگ کنویں پر آ رہے تھے یا مسجد سے نماز [illegible] واپس آ رہے تھے۔ [illegible]
چل دیے۔

لو کے جھکڑ اب بھی چل رہے تھے اور [illegible]
اور چڑیلیں ناچ رہی ہوں۔ وہ جب محل سے [illegible]
بچھڑ کر اندر پہنچے تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ '' [illegible]

بھوری کا نام عصمت آرا تھا [illegible]
اسی گھرانے کی تھی، مگر چونکہ اس کا بیاہ غیر کفو یعنی رام پور کے پٹھانوں میں [illegible]
والے اس کو ذات باہر سمجھتے تھے۔ بھوری کا باپ اسلامیہ اسکول [illegible]
برا وقت پڑا اور اسے ایک قتل کے مقدمے میں [illegible]
کے پاس سر چھپانے کا بھی ٹھکانہ نہ تھا اس لئے دونوں واپس [illegible] آ گئیں

بھوری کی ماں نے مفت کی روٹیاں توڑنے کے بجائے [illegible] خدمت [illegible]
اور اس طرح اس کی حیثیت اور بھی گھٹ کر گھی ''بوا'' کی طرح رہ گئی۔ کسی کے گھر میں ولادت ہوتی تو وہ زچہ
بچہ کی خبر گیری کرتی۔ بچوں کی دیکھ بھال کرتی۔ شادی بیاہ کے موقع پر کپڑے سیتی اور ادھر اُدھر کے
کاموں میں مصروف رہتی۔ پھر مرنے جینے کے موقعوں پر بھی وہی نہلانے، کفن پہنانے اور [illegible]
خدمت انجام دیتی۔ یوں تو سب لوگ اس کو ''ملانی آپا'' کہتے مگر در اصل اس کی حیثیت اب ''[illegible]'' کی
نوکرانی کی سی رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود اس کو اطمینان تھا کہ اپنوں میں بات سنبھالے بیٹھی تھی۔ صرف بھوری
ہی ایسا بھاری پہاڑ تھا جس کے نیچے وہ اپنے کو دبا اور کچلا ہوا محسوس کرتی تھی۔

جب گرمیوں کی چھٹیوں میں دور و قریب سے رشتہ دار یا عزیز آتے تو نازک آپا سے بھوری کی گہری
چھنتی۔ ناز وعمر میں تو بھوری سے چند مہینے چھوٹی ہی تھی مگر چونکہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر کی تھی اس لئے بھوری
اس کو خواہ مخواہ ہی نازک آپا کہنے لگی۔ بھوری اپنی سپیدی رنگت کی بنا پر اندر باہر سب کی للچائی نگاہوں کی زد
میں رہتی۔ چونکہ غریب تھی اس لئے سارے نماز روزے کے پابند صالح جوان اس کو لقمۂ تر سمجھتے تھے۔ لیکن وہ
تنک مزاج ایسی تھی کہ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کوئی بے ہودگی کرتے۔ حالانکہ آپس میں اس کے بارے میں
بھی فحش اور مبتذل مذاق کرتے۔ بھوری کی ماں کو خطرے کا پورا احساس تھا، اس لئے اس نے موقع پاتے ہی
گھر کے ایک اور ''خانہ زاد''، شہزادے نامی سے اس کو بیاہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادے اصل میں ڈپٹی
صاحب کا ہی چشم و چراغ تھا اور ان ہی کی طرح گورا چٹا بھی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اس کو بالکل نہیں تھا بس فلموں
اور اداکاراؤں کے پیچھے دیوانہ رہتا تھا۔ نکاح کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہی بھوری اور شہزادے میں ان بن

باورچی خانے میں کام کرنے یا پانی بھرنے والے بھی ان پر بیٹھ کر گھڑی دو گھڑی چلم یا "نریل" پی لیتے۔ ان کو کھاٹ کہا جاتا تھا۔

بڑے دالان کے پیچھے والا دالان اصل زنانہ خانے کا رہ رکھتا تھا۔ اس میں ایک طرف اونچی اور مراد آبادی نقشی پایوں کی مسہری تھی جو ڈپٹی صاحب کی بیگم کی تھی۔ وہ بیچاری ان کے انتقال کے بعد کوئی بھی ابھی تک اس کے استعمال کا اہل نہیں قرار پایا تھا۔ اس پر ستر چادر تکیہ تک بچھا رہتا۔ بیچ میں ایک بڑا سا پاندان دھرا رہتا تھا۔ اس کے برابر میں کوئی گیارہ بارہ پلنگ تک رہتے تھے۔ دیواروں پر بڑے بڑے طاق تھے جن پر طرح طرح کی کرم خوردہ پرانی مذہبی کتابیں یا "مولوی" اور "صوفی" کے پرچے پڑے رہتے تھے۔ ان سب پرچوں میں مذہب کی باتیں ہوتیں۔ دعائیں ہوتیں۔ ہونے والے اعراس و مذہبی میلوں کی تاریخوں کے علاوہ مذہبی رہنماؤں کی شان میں منقبت وغیرہ بھی ہوتیں۔ اس کے بعد کوئی نصف پرچہ مختلف دواخانوں کے اشتہارات سے بھرا ہوتا۔ ان اشتہارات میں شرمناک بیماریوں کے تذکرے اور ان کے علاج کے لئے تیر بہدف ادویات کے چرچے ہوتے۔ جو رسالہ جتنا ہی مذہبی ہوتا اس میں اتنی ہی شرمناک بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج کے لئے مستند اطباء کے نسخوں اور ان کے دواخانوں کی تفصیل ہوتی۔

سامنے کے دالان میں بھی دونوں بازوؤں پر اونچی اونچی مسہریاں تھیں جن پر عمر اور رتبے کے اعتبار سے خواتین قبضہ کر لیتیں۔ بیچ میں چوکیوں کا فرش تھا۔ جس پر دوپہر ہوتے وقت کوئی صاف چادر یا جاجم بچھا دی جاتی۔ تخت کے تینوں طرف اکبر کے نورتنوں کی طرح ڈپٹی صاحب کی بیٹیاں اور بہوئیں حسب مراتب بیٹھتیں۔ بیچ میں ڈپٹی صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ پان کھاتے یا موسم کے پھل چکھتے اور بیٹیوں سے دنیا جہان کے قصے اور جھگڑے سنتے۔ بہوئیں عام طور پر سر جھکائے ہوئے خاموشی سے بیٹھی رہتیں۔ اس موقع پر جان پہچان والوں اور دور قریب کے رشتے داروں کی غیبت ہوتی۔ اپنوں غیروں کی تھکا فضیحتی ہوتی۔ ڈپٹی صاحب بیچ بیچ میں سب کی زبان بھی درست کرنے جاتے۔ جب کسی بیٹی کے کسی محاورے یا ضرب المثل کی تصحیح کرتے تو ساتھ میں میر انیس اور میر حسن کے اشعار کا بھی حوالہ دیتے جاتے۔ ایسے موقعوں پر بھوری بھی سب کے ساتھ بیٹھتی وہ عمر میں تو سب سے کم تھی مگر بیت بازی کھیلنے اور چٹ پٹے طنزیہ خاکے لکھنے میں خوب ماہر تھے۔ اپنے رشتہ داروں ہی کے نہیں بلکہ آس پاس کے دوسرے لوگوں کے خاکے بھی اس بے باکی سے لکھتی کہ لوگ سلگ کر رہ جاتے اور دکھانے کو کھسیانی ہنسی ہنستے۔ ڈپٹی صاحب عام طور پر اسی کی زبان کو قابل قبول سمجھتے اور زیادہ تر اسی کی تائید کرتے مثلاً یہ کہ وہ یہ کہتے "ہنسی معلوم ہوتی ہے" بھی کہا جاتا ہے مگر جیسا کہ بھوری نے کہا "ہنسی آتی ہے" زیادہ صحیح اور فصیح ہے۔

اسی طرح ڈپٹی صاحب گویا پھر بھوری ہی کے حق میں فیصلہ دیتے۔

گھنٹے یا دو گھنٹے کے اجلاس کے بعد ڈپٹی صاحب ظہر کی نماز کے لئے اٹھ جاتے مگر اٹھنے سے پہلے ہر ایک مسئلے پر اپنی رائے اس طرح دیتے کہ تمام بیٹیوں اور بہوؤں کو پتہ چل جاتا کہ ''حکم حاکم'' یہی ہے۔ ان کے اٹھنے کے بعد ہی ساری تہذیب، ادب اور درجہ بندی ختم ہو جاتی اور سب خواتین صرف اپنے جاہ و حشم اور میاں کی مالی حالت کے اعتبار سے ننھے چھلے چھنکے بانٹنے لگتیں۔

شام کا اجلاس کوٹھی کے باہر وسیع و عریض لان پر ہوتا جہاں انگریزی طریقے سے کرسیاں رکھی رہتیں۔ حقہ تازہ ہوتا رہتا۔ شہر سے آئے ہوئے اخبارات پڑھے جاتے اور پاس پڑوس کے ملنے والے بھی سی پی کپتان اور رفیع احمد قدوائی کی سیاست پر تبادلہ خیال کرنے جمع ہو جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد حوض کے پاس بنے ہوئے چبوترے پر دستر خوان بچھتا اور جو بھی ہوتا کھانے میں شریک ہو جاتا۔ عام طور پر دس پندرہ افراد کھانے میں شریک ہوتے۔ زیادہ تر یہ ہوتا کہ نوکر، اور دوست وغیرہ بھی مٹھائی کی لالچ میں گھر میں کھا چکنے کے بعد پھر یہاں دوبارہ کھانے بیٹھ جاتے۔ کھانے کے بعد ڈپٹی صاحب لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے۔ وہ غیر معروف متقدمین کے کلام سے انتخاب یا صوفیاء و اولیاء کی سوانح لکھا کرتے۔ تہجد کی نماز کے بعد وہ مسجد میں چلے جاتے جہاں فجر کے وقت تک وہ جنات کو درس دیتے تھے۔

ملا چراغ حسین ڈپٹی صاحب کے عزیزوں میں تھے اور محب وطن بھی تھے۔ انگریزوں سے بھی ان کو پرخاش تھی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کے تو ازلی مخالف تھے اللہ رسول کے بعد ان کی ساری عقیدت گاندھی اور نہرو کے لئے وقف تھی۔ پھر بھی ذاتی لاگ ڈانٹ میں انہوں نے اصولوں کا کوئی خیال نہیں کیا اور انگریز کمشنر کو گمنام خط بھیج دیا کہ نئے کلکٹر صاحب اصل میں خود بھی انگریز دشمن ہیں۔ انہوں نے ایک باغی کی مدد کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کتب خانے کی بعض کتابوں کا بھی ذکر کیا۔ ڈپٹی صاحب کی کلکٹری کی گاڑی رک گئی اور عتاب نامہ ملا کہ اگلے کئی برسوں تک ان کی ترقی موقوف۔

بیوی کے انتقال، اپنے قریبی عزیز کی غداری اور اس پر سرکار کا عتاب، ڈپٹی صاحب کا جی اچاٹ گیا۔ ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی اور حج کے لئے چل دیے۔ واپس آئے تو دنیا بدل چکی تھی اس لئے قصبہ کی مسلم لیگ کی صدارت سے بھی مستعفی ہو گئے اور بالکل ہی خانہ نشیں ہو کر اولیاء و صوفیاء کی سوانح مرتب کرنے میں منہمک ہو گئے۔

ڈپٹی صاحب کے اخراجات کی نگرانی منشی عبدالکریم، خانساماں علی محمد اور ڈرائیور قدرت کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ لوگ جس طرح چاہتے خرچ کرتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ڈپٹی صاحب عام طور پر زیر بار رہتے۔ کبھی کوئی گاؤں بیچ دیتے۔ کبھی کوئی باغ۔ کوئی بندوق یا موٹر۔ جو بھی شے قابل فروخت ہوتی بک جاتی۔ اسی طرح ان کا کارخانہ سسٹم چل رہا تھا۔

وہاں زیادہ دھوم دھام گرمیوں کی چھٹی میں ہوتی تھی جب دور و قریب سے رشتے دار آتے۔ ملک

بٹ چکا تھا۔ سارا گھرانا بھی تقسیم ہو چکا تھا مگر پھر بھی گرمیوں کی تعطیلات میں اونچی اونچی حویلیوں اور خنک تہہ خانوں میں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے آئے ہوئے نوجوانوں اپنی رشتہ دار بہنوں کے ساتھ آم کھاتے، کیرم کھیلتے۔ عشقیہ شاعری کرتے۔ بیت بازی ہوتی، چھوٹی چھوٹی مرتوں اور رقابتوں کے باب بھی رقم ہوتے اور پھر سب لوگ بیل گاڑیوں اور راڈھوں پر بیتا ندی کے کنارے جاتے اور وہاں آم، فالسے اور جامن کے کنجوں میں غیر ضرر رساں قسم کی چوما چاٹی بھی کرتے۔ بہنیں اپنے بھائیوں کے بارے میں بڑے فخر سے کہتیں۔۔۔ "روحہ باجی افضال بھائی کی گیوٹ ہیں۔۔۔"

ان سب صالح، مومن اور نماز روزے کے پابند جوانوں اور ان جاتیوں کی "کیاں" ضرور ہوتی تھیں۔ یہ بھی سلمہ، فتو، روحہ باجی اقبال بھائی محسن احسان ورشان ورفاروق۔ یہ وا ایک دوسرے کی گیلن تھے اور ان کی عشق عاشقی کے بھونے بچے لسانے "زھی تازتلہ، بوولی اور چچھ تلہ" بکثرت کرتے اور ساتھ ہی رشتے دار اور بہنوں کے باہمی رقابتوں چاہتوں اور حسد، جلن اور غیبتوں کے زمرے بھی پوری ان کونبی کرتے ۔صالح جوانوں، نیک اور فرمانبردار طالب علم رشتے داروں کے نام خوشبوؤں میں بسے ہوئے خطوط جاتے اور "فارگٹ می ناٹ" کڑھے ہوئے رومال بھی بھیجے جاتے۔

یہ مزیدار محفلیں کبھی جاڑوں میں بھی جمتیں۔ ہوادار منزل، معین منزل نصیرو ولا اور ماشاءاللہ بلڈنگ کی شریف زادیاں اور ان کے مومن اور نماز روزے کے پابند نیک رشتے دار لحافوں کے اندر پیر ڈالے آپس میں خالص "شری کی لیپی" میں مصروف رہتے۔ اگر کبھی کوئی معاملہ سنگین صورت اختیار کر لیتا تو بڑے جان قسم کے داڑھی بردار بزرگ کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہوتے۔ چونکہ یہ سب ترقی پسند اور تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے۔ اس لئے فضول رسوم سے بھی کو نفرت تھی۔ بس خاموشی سے چائے کی پیالی پر نکاح پڑھا دیا جاتا۔ پرانے دنوں میں اس طرح کے جوڑے حیدر آباد چلے جاتے تھے۔ اب ادھر پاکستان جانے کی روایت قائم ہو گئی تھی۔

ملا چراغ حسن ملک کی تقسیم کے بعد اور بھی زیادہ سیکولر ہو گئے تھے اور اب ان کے گھر میں ہندو اور سکھ مہمانوں کی بھی خوب خاطر مدارت ہوتی تھی۔ اس طرح کے آنے والوں میں جگن بھیا بھی ساتھ تھے۔

جگن بھیا۔ یعنی راجہ جگن ناتھ تھے آف ٹکر جس سال تازہ تازہ ودیتیم ہوئے تھے اور انٹر میں تیسری بار فیل ہو کر چھٹیوں میں آئے تو زمینداری ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ راجہ کا لقب ہٹا دیا اور اب اگر کوئی ان کو راجہ صاحب کہتا بھی تو وہ بہت خفا ہوتے۔ ان کو مسلمان عورتوں کا شوق تھا اور اردو شاعری سے عشق تھا۔ چانک والوں میں ہمیشہ شعر و شاعری، بیت بازی، خاکہ نگاری اور مشاعروں کا ہنگامہ رہتا۔ اس لئے جگن ناتھ بھی شاعر ہو گئے اور بیتاب کا کورس تخلص فرمانے لگے۔ انہوں نے علامہ بوٹن کی شاگردی اختیار کی۔ وہ بالکل گھر والوں کی طرح سب جگہ آتے جاتے۔ لکھنؤ، ریئسہ اور متن آباد وغیرہ کے

''گیاں،، تھے مگر ان کی سب سے زیادہ گہری دوستی نازک آپا سے تھی۔

جگن بھیا اور نازک آپا کے بارے میں کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ یونس میاں نے ان کو کلمہ پڑھا رہا تھا۔ (اپنی جائداد وغیرہ کے خیال سے جگن بھیا نے یہ بات اپنے گھر والوں سے چھپائی)۔ بہرحال بڑے گھر کی بڑی باتیں۔ اس طرف زیادہ توجہ کرنے کی کسی کو فرصت بھی نہ تھی۔ کمسن لڑکیوں اور نئی نویلی دلہنوں میں تو یہ فسانہ رشک و حسد سے سنا جا رہا تھا کہ جگن نے باپ سے چھپا کر زمینداری بانڈز بلوا سیالکوٹ میں بیچ دیئے اور پانچ سو روپے کا ایک سونے کا دل بنوا کر شبیرو کو تحفے میں دیا جو اس نے غصے میں اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

بھوری نازک آپا کی عاشق تھی۔ دونوں ہی نازک اندام اور خوب صورتی و نزاکت میں اپنی اپنی جگہ پر قابل رشک تھیں۔ بھوری کو جگن بھیا کی صورت ہی سے نفرت تھی۔ صرف نازک آپا کی محبت میں ان کی ناز برداری کرتی تھی اور ہر طرح کی ذلت بھی برداشت کرتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں کا ناپردہ کرتی تھیں اور برقعہ اوڑھ کر ایک محلے سے دوسرے محلے تک جاتی تھیں۔ بھوری اس پردے سے بھی آزاد تھی، وہ بڑے سے مسجد کے کنویں پر جاتی اور کی کریانہ سٹور سے انجور، امرس اور دوسری چیزیں خرید لاتی۔ جب جگن بھیا نہ ہوتے تو بھوری اور نازک آپا دونوں کمرہ بند کر کے آپس میں بیٹ کر دیا جہان کی مزے مزے کی باتیں کرتیں۔ نازک آپا کے کپڑوں میں بسی ہوئی خوشبوئیں سونگھا کرتی۔ جس سال نازک آپا جون کے آخر میں واپس جانے کے بجائے اپنی دادی کی علالت کی وجہ سے ستمبر اکتوبر تک ٹھہریں تو جگن بھیا کی چاندی ہو گئی کیونکہ دوسرے لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے شہروں اور اسکولوں و کالجوں کو جا چکے تھے۔ بس وہ نازک آپا اور ان کی معیت میں بھوری بھی وقت ملتے ہی سیر سپاٹوں کے لئے نکل جاتے۔

دوسرے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں نازک آپا بہت دیر میں آئیں اور جلدی چلی گئیں۔ بھوری روتی رہ گئی۔ وہ اپنے دیوانے پن میں جنت بی بی کے روضے کے ویران حصے میں جاتی پھر نازک آپا کی نشانی پر ایک چراغ جلا کر رکھ آتی۔ کبھی کبھی وہ نازک آپا کی دی ہوئی کوئی پکا اوڑھنی بھی اس نشانی پر ڈال آتی۔

ملک کا بٹوارہ ہوئے کئی برس ہو چکے تھے اور نئے بچوں کو تو اس بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ پھر بھی ایک غیر یقینی فضا اب بھی قائم تھی، اور جو افراتفری کوئی دس گیارہ برس پہلے شروع ہوئی تھی اس میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی تھی۔ لوگ باگ گھر آنے، حویلیاں بسانے یا آموں، امرودوں، فالسے، کھرنی اور جامن کے باغوں کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے پاکستان جا رہے تھے۔ خود قصبے میں بھی بس یہی خبریں رہتیں کہ آج یہ چلا گیا۔ کل فلاں کی حویلی خالی ہو گئی۔ بدو میاں کا بیٹا بہنوں کے زیور لے کر کھوکھرا پار بھاگ گیا۔ شبو گوڑا میری چوتھی بار ہائی اسکول میں فیل ہو کر ڈھاکہ چلا گیا وغیرہ وغیرہ۔ قصبے میں دو چار ہی گھرانے ایسے رہ گئے تھے جہاں بوڑھیاں یا بوڑھی ہوتی ہوئی کنواریاں زمانے کا رونا رویا کرتیں۔ بازار میں سکھ آ گئے تھے بہت سی نئی نئی

دوکانیں شرنارتھیوں نے کھول لیں ۔ ف ایک تاشی شیخ الدین تی اپنے ... تھے، ہے۔ وہ خاندانی قوم پرست تھے۔ سہروردی ... سے ... تھے ... ملاچراغ حسن تھے جو اب بھی حافظ جی کے سفارشی خط لے کر دلی جاتے اور ... مکان پر ... انتظار کرتے اور شرف دیدار حاصل کر کے ہی واپس جاتے۔

ملاچراغ حسن مولوی، منشی، عالم فاضل قسم کے امتحانات پاس کرتے ہوئے ... خاصے فاضل سمجھے جانے لگے۔ پھر بھی مشہور یہی تھا کہ جب ان کے کسی امتحان کی کاپی ڈاکٹر اقبال ... پہنچی تو انہوں نے غصے میں اٹھا کر پھینک دی اور پورا جملہ "معراج جہالت" پر اظہار تاسف کرتے ہیں ... ملاچراغ حسن کو کشمیری چائے بنانے میں کمال حاصل تھا۔ حافظ جی اور بشیر محمد وغیرہ ... پر جا کر چائے بناتے اور کشمیری چائے کی خصوصیات "لب دوز، لب سوز، لب بند، لبریز اور لب ..." پوری طرح نبھاتے ۔ چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے کو عربی کے عالم کی حیثیت سے مصر جانے کا موقع ... مصر میں واقعی عربی پڑھنا اور بولنا پڑتی ہے۔ ملاچراغ حسن کے صاحبزادے ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی واپس بھیج دیے گئے۔ ان کے واپس چلے آنے کی اصل وجہ یہ بتائی گئی کہ ملا کے عالم فاضل صاحبزادے پر ان ... مصر نے جادو کروا دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی "بولتی" بند ہو گئی۔

ب ملاچراغ حسن کی یہ آرزو تھی کہ ان کے صاحبزادے کو کہیں پڑھانے کی نوکری مل جائے اس لئے وہ حافظ جی کے خطوط لے کر دلی جاتے رہتے تھے اسی لئے ان کے گھر میں ہندوؤں اور سکھوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی ... ان کی سیکولر دیانت داری بھی روز بروز مستند ہوتی جا رہی تھی جگن بھیا کی آمد پر کون انگلی اٹھا سکتا تھا۔ پھر جبکہ علامہ لونن نے ان کو کلمہ بھی پڑھا دیا تھا اور وہ دل سے مسلمان بھی ہو چلے تھے۔

ان سب باتوں کے باوجود اب کی بار نازک آپا ایسی گئیں کہ واپس ہی نہ آئیں۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ حیدرآباد سے ہی پاکستان چلی گئیں۔

حالات رفتہ رفتہ معمول پر آ رہے تھے مگر جانے والوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا ان حالات میں سب سے بڑا واقعہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب کی زندگی میں تو بھوری محل میں رہتی تھی اور سب سے اس کی جان پہچان تھی۔ جو دو چار گھرانے رہ گئے تھے وہاں اس کی آمد و رفت تھی۔ ڈپٹی صاحب کے مرنے کے بعد وہ بے سہارا ہو گئی اور جن گھروں میں اس کا آنا جانا تھا وہاں بھی اس پر گہری نظر رکھی جانے لگی اور خاص طور پر جوان لڑکیوں سے تو اس کو ملنے ہی نہ دیا جاتا۔

جگن بھیا میلے میں آئے تو محل میں بھی سب کو سلام کرنے پہنچے اور انہوں نے بھوری سے میٹھی میٹھی باتیں کیں بھوری کو نہیں معلوم کیا سوجھی کہ وہ ان کے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ کر شہر چل دی۔

جگن بھیا کونسل کے ممبر تھے۔ اردو کے لیڈر تھے۔ اقلیتی طبقوں کے لئے بولا کرتے تھے۔ عصب ... را

عرف بھوری گوری چٹی ناک نقشے کی تیکھی اور بول چال میں نستعلیق رکھیل تو گویا ان کے لئے ''کوہ نور'' تھی۔ انہوں نے بھوری کو کئی مہینوں تک اپنے ساتھ گھمایا۔ دلی بمبئی اور حیدرآباد کے مشاعروں میں لے گئے۔ بھوری اگر شاعری شروع نہ کرتی بلکہ پرانی بیاضوں سے غیر معروف اشعار نکال کر سنانے لگتی تو چشم زدن میں ''اردو میں قابل قدر اضافہ'' ہو جاتی۔ لیکن اس کی کمزوری موٹی سانولی عورتیں تھیں جب بھی موقع ملتا وہ اپنے ساتھ ایک نہ ایک موٹی تازی عورت ضرور رکھتی۔

مسلم لیگ کی ایک پرانی لیڈر اور چھوٹی مہارانی بھی کانگرس میں شامل ہو چکی تھیں۔ ان کی عمر پچپن چھپن برس کے لگ بھگ تھی اور تقریبا ہر قابل ذکر ہندو مہاسبھائی اور سکھ فرقہ پرست کی خوابگاہ کو جگمگا چکی تھیں پھر بھی ان کی عظمت کا چراغ ہر وقت آندھیوں کی زد پر ہی رہتا۔ ان کی تمام شاعرانہ صلاحیتوں اور سیاسی مہارت کی راہ میں نرنا پہاڑ اس طرح بڑھتا آ رہا تھا کہ ان کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔

ان ہی دنوں ایک اسلام دشمن کتاب کے خلاف جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور حسب معمول خوب مار دھاڑ ہوئی۔ رانی بنڈیا پور نے سیکولرازم کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک زبردست بیان پائنیر اور سوتنتر بھارت میں چھپوایا۔ نیشنل ہرالڈ میں یہ بیان ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اڈیٹر کو ایک طرف سیکولرازم سے کچھ زیادہ عقیدت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کو رانی صاحبہ کا گٹھا گٹھا بدن اور ''بڈھی گھوڑی لال لگام'' قسم کی اداؤں سے ہی ابکائی آتی تھی۔

جگن بھیا یعنی ٹھاکر جگن ناتھ سنگھ چیتاپ کا کوروی ایم ایل سی نے عصمت آرا کے نام سے دوسرا بیان شائع کروایا جس میں اقلیتی طبقے پر ہونے والے مظالم اس کے مسائل اور پھر بات بات پر مسلمانوں کو ہی برا ٹھہرانے اور ان کو پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام دیئے جانے کی عام روش کی مذمت کی گئی تھی۔ یہ بیان اردو کے دو ایک اخباروں میں چھپا اور نیشنل ہرالڈ نے اس کو بہت نمایاں طور پر شائع کیا۔ جگن بھیا اخبار کی بہت سی کاپیاں لے کر دلی گئے۔ نہرو سے ملے اور مولانا کو بھی یہ بیان دکھایا۔ عصمت آرا سیاست کی الف بے سے بھی نہیں واقف تھیں۔ وہ نئی دلی کے کناٹ پلیس میں دوکانیں چھان کر رہیں اور شام کو جب کیننگ اسٹریٹ پر ادبی و سیاسی محفل جمی اور لوگ ان سے مخاطب ہوئے تو وہ پہلے ذرا جھجکیں پھر تھوڑا بے تکلف ہوئیں تو لوگوں کی چائے پانی سے تواضع کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

''یہ سب جگن کا جعل فریب ہے۔ مجھے تو عورت بالکل ٹلّی۔ کوئی چپڑ قناتن سی لگتی ہے۔'' بیگم کرنل شبیر ہی نے یہ جملہ معلوم نہیں کس سے کہا۔ بھوری نے جو باہر جانے کے لئے بن سنور رہی تھی۔ یہ سن لیا۔ وہ تتی ہی غیر متعلق اور سیاست وغیرہ سے کتنی ہی بیزار کیوں نہ رہی ہو۔ بے وقوف تو کبھی بھی نہیں تھی۔ سمجھ گئی کہ بات اسی کے بارے میں ہو رہی تھی۔۔۔ اس نے آئینے کو ترچھا کر کے بڑے کمرے کی طرف دیکھا اور بیگم کرنل شبیر کا عکس دیکھ کر ہونٹوں کو دانتوں سے دبایا۔ پھر مسکرائی۔

دوسری شام جگن ناتھ بھیا ہوم منسٹر یعنی پنڈت پنت سے ملنے کی ترکیبیں کر رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح پانچ دس منٹ حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ وہاں بھوری کو ساتھ لے جانا مشکل تھا ان کو لاجواب ترکیب سوجھی۔ بھوری کو جامعہ میں چھوڑ گئے جہاں دلی اردو سبھا کا جلسہ تھا اور مقامی مسلمانوں نے اردو کے حق کی لڑائی کے لئے ایک اردو ملیشیا قائم کرنے کی دھمکی دی تھی۔

وہاں سوتا سنگھ، روپا سنگھ، اور سردار بہادر سنگھ وغیرہ اور شبلی کی ... بھی آئے تھے۔ بیگم کرنل شبیری بھی کچھ بولنے میں کوشاں تھیں۔ اس وقت ... آر ... داخل ہوئیں۔ اس نے اس طرح سب کو سلام کیا جیسے قصبے کی کسی مذہبی ... کی تربیت ... بزرگوں کو ادب سے بہو بیٹیوں کی طرح ''تسلیم'' کہہ رہی ہو۔

ساری محفل میں مرگھٹ کا سا سناٹا اور بیئر شیئر پی کر مر جانے والے سرداروں کے حلقے میں سنسنی پھیل گئی سب نے اصرار کیا کہ بھوری بھی کچھ کہے۔

بیگم کرنل شبیری، بیگم خاور حسین اور زاہدہ ... وغیرہ ... سب اپنی اپنی جگہ شمع انجمن تھیں۔ تقسیم ہند میں لٹنے اور اجڑنے کے بعد سے پھر جو دلی آباد ہو رہی تھی اس میں چند ہی مسلمان خانوادے بسے تھے جو پانچ کروڑ کی نمائندگی کرتے تھے اور اس پر ناز کرتے۔ انھوں نے ... پورا ''سیکولرازم'' لظم و نسق تھا۔ شیخ عبداللہ اور رفیع احمد قدوائی کی باہمی رقابتیں ... علی ظہیر اور مولانا آزاد کی اپنی اپنی نام اور عظمت کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ سیکولر بنیاد ... کے لئے ملک کے کونے کونے سے مسلمان ڈھونڈے جا رہے تھے۔ غیر ملکی دوروں میں ادبی و تہذیبی اور سماجی و سیاسی بساط پر ان مہروں کو خوب سوچ سمجھ کر احتیاط سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ جو دو چار بیگمات دستیاب ہو سکی تھیں وہی ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی نمائندگی کر رہی تھیں اور وہی عرب ملکوں اقوام متحدہ کے جلسوں اور غیر جانبدار محاذوں پر پاکستان کی ''مذہبی آمریت'' کے مقابلے میں پیش کی جاتی تھیں۔

بیگم کرنل شبیری پچھلی رات بھوری کو دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں کہ عورت بالکل ہی ''مسکین'' اور فاترالعقل سی ہے۔ اس سے کسی طرح کے مقابلے یا رقابت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بلکہ اب تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کو اپنی ٹولی میں ملا کر ''سیکولرازم'' کا رنگ اور گہرا کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر جبکہ وہ ایک ہندو شاعر اور ابھرتے ہوئے غیر فرقہ پرست لیڈر جگن ناتھ کی رکھیل بھی تھی۔

بھوری کاکوری میں میاں لوگوں کے ساتھ بہت باتیں سیکھ چکی تھی۔ اس کے جاننے والوں کے ''میاں'' لوگ بات چیت اور جملے بازی میں زیادہ تر اس سے مات کھا جاتے تھے۔ بڑے بڑے بی۔ اے، ایم۔ اے کے طالب علموں کو بھی ایسا قائل معقول کرتی تھی کہ وہ سب بغلیں جھانکنے لگتے تھے۔ اس کو کبھی کسی جلسہ عام میں بولنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ اس نے کوشش کی تھی۔ وہ جگن بھیا کو اونچ نیچ سمجھاتے اور ان کی جیب

سے نقد رقم نکلوانے میں ماہر تھی۔ یہ رقوم وہ اپنی موٹی موٹی سہیلیوں، گلشن تاجو اور ہرمیت کور وغیرہ پر خرچ کرتی۔ اس شام اردو میٹنگ کے سپہ سالاروں کے سامنے کسی نستعلیق بیگم کی طرح آکر بولنے میں اس کی ان بددماغی کا ہاتھ تھا جس سے وہ ہر متی بلا کرنے والے لونڈوں میں جھنکوا دیتی تھی۔ وہ جس ادا سے غرارہ پہنے دوپٹہ سنبھالتی گئی ان پر سرداروں کی رالیں ٹپکنے لگیں اور پھر اس کا سو فیصدی نمبر تو یہی بات تھی کہ وہ کسی میم کی طرح گوری گوری تھی۔

بھوری نے بڑے کرنل شیری کی طرف دیکھا اور تقریر کرنے کے بجائے عام گھریلو عورتوں کی طرح ٹھیٹ محاورے بولنے لگی ''اور پھر ہماری تو وہی مثل ہوئی کہ بیٹا نک کٹوا دو تو، نہ وہ نک کٹوا دو تو لا ن۔۔۔

ایک طرف تو جلسے کے مردوں کی ہنسی چھوٹی ہوئی تھی اور دوسری طرف متعدد سیکولر خواتین پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بھوری تھی کہ برابر بولے جا رہی تھی۔ اردو کے حق میں ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی حالت زار پر بھی۔۔۔ وہ ایک دیدے مٹکا کر، آنکھیں نچا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر جیسے چیکار رہی تھی کہ مسلم لیڈروں اور سیکولر نظام نے حامیوں کو پیچھے آ رہے تھے۔ سردار صاحب کن جیت سنگھ نے جس کی بیوی ایک مسلمان آرٹسٹ کے ساتھ بھاگ کا تک گئی تھی اپنی ران پر ہاتھ مار کر زیر لب کہا ''ستوں نے گھ نصیبوں ۔۔۔۔''

بات کو گھما کر وہ اردو ہندی وغیرہ کے مسئلے پر بہت ملک کر بولی۔ نگاہیں اب بھی اس کی بیگم کرنل شبیری پر تھیں یہ لیجیے صاحب ہمارا تو وہی حال ہے کہ۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

تمام غیر مسلم اردو پرستوں اور سرکاری شاعروں میں واہ واہ اور آہ آہ ہونے لگی۔

بھوری کے بال کھلے ہوئے تھے جو کمر تک لہرا رہے تھے۔ وہ غرارہ سنبھالتی۔ سلیم شاہی جوتا پہنے کسی شاہزادی کی طرح ڈائس سے اترنے لگی تو سب نے اصرار کر کے اس کو وہیں محفلیں کرسی پر ہی بٹھنے پر مجبور کر دیا۔

بیسویں صدی کے نصف، یعنی ۱۹۵۰ء کی دہائی کا آخر زمانہ وہ تھا جب سیکولر ہندوستان میں مسلمان عورت سے عشق کرنا ادب و سیاست میں کامیاں کے تمغے کے برابر تھا۔ مسلمان عورت سے عشق اور ہم بستری نئی ابھرتی ہوئی ہندوستانی قومیت کے تشخص کا ایسا حمام تھا جس میں ''ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے،، کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہ شریف اور سید گھرانے جو انگریزوں کے دور میں سر ہارٹ کورٹ بٹلر اور سر میلکم ہیلٹ وغیرہ کی خواب گاہوں میں بیگماتی حسن سے چراغاں کر کے سر خان بہادر اور شمس العلماء وغیرہ بنتے تھے۔ اب ٹھاکر جگن ناتھ سنگھ شری نیش جی ہودے، بلرام ٹنڈن اور گپتا، ورما اور استھانہ بھیا سے ہم زلفی کے رشتے قائم کر کے چھوٹی موٹی عظمتیں حاصل کر رہے تھے۔ راج اور سکندر بخت کی شادی کی خواہ پر ہندو مسلم فساد ہوئے

۔کئی برس ہو چکے تھے اور عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مسلمان عورتوں کے سلسلے میں یہ الزام یکطرفہ ہی رہے گا۔ ابھی دنوں ہند پاکستان خیر سگالی مشاعروں کی روایت قائم ہو رہی تھی اور طرحدار، چھیلے اور رنگین ظرف سکھوں کی امریکی موٹروں پر اردو شاعرات کے آنچل رات گئے تک صفدر جنگ اور حوض خاص کے علاقوں میں لہراتے دیکھے جاتے تھے۔

OOO

نکاح کے بعد جو لوگ عمر اور رشتے میں بڑے تھے وہ ایک ایک کر کے [illegible] اور لمبے سے ہال نما کمرے میں جہاں بڑھیا اور نفیس قالینوں کا فرش تھا صرف دولہا کے چند ساتھی [illegible] باہر محل سرا میں ماحضر کی دھوم دھام شروع ہو گئی۔

دولہا یعنی سجاد نے ہر طرح کی رسموں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے سب کے اصرار کے باوجود سہرا نہیں بندھوایا اور نہ عام رواج کے مطابق سر پر قیمتی صافہ باندھا۔ وہ صرف شیروانی اور ٹوپی میں بیٹھا رہا۔ قاضی صاحب کے کہنے پر مروت میں اس نے گلے میں ایک معمولی سا ہار ڈال لیا۔ نکاح کے بعد جب اس کے ہم عمر دوست ہی رہ گئے تو اس نے ٹوپی بھی اتار دی اور ہار اتار کر ایک کونے میں ڈال دیا اور گاؤ تکیے پر ٹیک لگا کر دلچسپی سے کسی تماشائی کی طرح مشاہدہ کرنے لگا۔ وہاں عام طور پر روایت یہ تھی کہ نکاح کے بعد فوراً ہی دو چار قوال اور مراثی کھڑے ہو کر گانے بجانے لگتے۔ سجاد نے پہلے ہی اپنے سسرال والوں سے کہلا بھیجا تھا کہ اگر قوالوں یا ہیجڑوں نے اس کے نکاح کے وقت "مبارک باشد" کہہ کر تالیاں بجانا شروع کیں تو وہ فوراً اٹھ کر چلا جائے گا۔ اس کے سسر نے اپنے ہونے والے داماد کا ساتھ دیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ جب سجاد کو تمام فضولیات سے نفرت ہے تو ان کو کیا پڑی ہے کہ مفت میں فضول خرچی کریں۔

بڑے دالان میں زمین پر چٹائیاں بچھی تھیں ان پر سوتی جاجم کا فرش تھا۔ اور اس کے اوپر دور تک زرد رنگ کا دسترخوان بچھا تھا جس پر جا بجا فارسی اشعار چھپے تھے۔ آس پاس کے ملنے والوں کے لڑکے اور محلے ٹولے کے ہم شاعر اور نیم بیکار جوان نئی نئی جرابیں پہنے دسترخوان پر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ کوئی قورمے قلیے کے ڈونگے لانے پر زور دے رہا تھا اور کوئی نٹ دونٹ کی دوری پر جگہ جگہ خمیری روٹیوں کے ڈھیر چُن رہا تھا احتیاط سے دور دور رکھی جا رہی تھیں۔ کھانے کا اعلان ہوتے ہی سب بظاہر اپنی محمود و ایاز قسم کے لوگوں میں تمباکو والوں کے سید ظہور میاں بھی شامل ہونے والے تھے کہ منتظمین میں سے ایک صاحب نے بڑی خصوصیت سے ان کا بازو پکڑ کر دبایا اور دھیرے سے بولے: "ادھر دولہا کے ساتھ بیٹھئے گا۔"

ظہور میاں اس اعزاز پر پھول کر کپا ہو گئے اور اپنی شارک اسکن کی شیروانی سنبھالتے ہوئے ذرا الگ ہٹ کر کسی اور مخصوص مہمان سے حالیہ شیعہ سنی فساد پر منصفانہ طور پر اظہار خیال کرنے لگے۔ جتنے لوگ سما سکتے تھے انہوں نے کھانے پر دھاوا بول دیا۔ باقی حضرات باہر ٹہلنے اور کرسیوں اور مونڈھوں پر بیٹھنے میں

مصروف ہو گئے۔ وہ لوگ بظاہر تو ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے لیکن دراصل دوسری پالی کا انتظار کر رہے تھے۔ لذیذ اور مرغن کھانوں کی خوشبو نے سب کو اس طرح بے چین کر رکھا تھا گویا کوئی دولہا حجلہ عروسی میں جانے کے اشتیاق میں پہلو بدل رہا ہو۔

کچھ جوان لڑکے کباب، شیرمال اور بریانی وغیرہ دینے میں مصروف تھے۔ دو چار نے مہمانوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری لی تھی۔ کچھ زیادہ ہی معتمد اور معتبر منتظمین تھے اور دسترخوان کے بیچ میں کھڑے ادھر ادھر نگرانی میں مصروف تھے اور بار بار ضروری جملے دہراتے ”ارے چھن میاں ادھر دیکھئے، قورمہ نہیں ہے، شفو یہ لو قاب... میں گرم بریانی لاؤ۔ وغیرہ۔

ایک ...... غریب رشتہ دار بیچ میں ایسا بھی تھا جس کی سماجی نابرابری یا عمر کے پیش نظر اس سے چھوٹا موٹا مذاق بھی ... باتیں گلی شاہ چھڑا کے خواجہ رفیق نے ایک صاحب کی طرف دیکھ کر اپنے حساب سے کوئی بڑا لطیف مذاق کیا ”ارے بڈھن بھائی، بیچ میں پانی بھی تو پیو۔ تم تو بالکل طوفان میل چل رہے ہو۔“

ایک بہت ہی خشونت آمیز مولوی نما اور بھاری بھرکم مہر موجل اور مہر معجل پر وعظ دینے کے ساتھ ہی ذوق وشوق سے ... کے ساتھ انصاف پر مائل تھے۔ انہوں نے شاہی ٹکڑوں کی قاب اپنے سامنے اس طرح رکھ لی تھی کہ کسی کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ اس میں سے حصہ بٹانے کی کوشش کرتا۔ ایک شیطان صفت قسم کے کمیونسٹ نما شخص نے ذرا بلند آواز سے ان کو مخاطب کیا ”اچھا مولانا ذرا شاہی ٹکڑوں کی تبلیغ بھی فرمایئے۔“

قریب بیٹھے ہوئے دو چار لوگوں نے نظر بچا کر ہنسنے کی کوشش کی مگر مسکرا کر رہ گئے۔ ایک صاحب کو زور سے ہنسی آئی تو گلے میں پھندہ پڑ گیا۔ ”ارے پانی لاؤ۔ جگ ادھر دو۔ سلطان میاں کو پھندہ لگ گیا ہے۔“ دو تین آدمی ایک ساتھ چلائے۔

سلطان میاں کی دس پانچ سیکنڈ کی پریشانی نے سب کی توجہ اس طرح اپنی طرف کھینچ لی کہ مولانا کو اپنی خفگی کے اظہار کا موقع ہی نہ مل سکا اور شاہی ٹکڑوں کی قاب ان کے سامنے سے اس طرح اٹھ گئی کہ چشم زدن میں اس میں سوا شیرے کے اور کچھ رہ ہی نہیں گیا۔

لوگ اب کھاتے کھاتے ذرا سست پڑ گئے تھے اور پانی میں بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ پانی پلانے والوں نے جھوٹے گلاسوں میں تھوڑا تھوڑا پانی دینا شروع کیا۔ ان گلاسوں کے کناروں پر پینے والوں کے ہونٹوں کی چکنائی باقی رہ جاتی۔ ساقی لوگ ایک گلاس میں دوسرے پیاسوں کو بھی پانی دے دیتے۔ اس وقت یہ لگ رہا تھا کہ مورچہ تقریباً فتح ہو چکا ہے کیونکہ کھانے والوں کے ہاتھ سست پڑ رہے تھے اور دو چار فراغت آمیز ڈکاریں بھی گونجنے لگی تھیں۔

دوسری طرف ڈیوڑھی کے سامنے جہاں کھیر کے پیالے چنے تھے تخت پر شاہی ٹکڑوں کی قابیں رکھی تھیں اور اونچی اونچی جہازی دیگیں اتاری اور چڑھائی جا رہی تھیں وہاں غدر کا سماں تھا کسی کی آواز گونجی

''ارے مصطفیٰ بھائی، یہ کیا بیر دھوں دھوں مچی ہوئی ہے۔ یہ منایا کیا، یہ سب یہاں جا رہے ہیں۔ کس نے منگائے ہیں۔...''

کوئی چمکیلی بھڑکیلی شیروانی میں ملبوس لڑکا ہاتھوں سے بھری ایک پلیٹ تھماتا ہوا زنانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ زنان خانے میں عورتوں کا دستر خوان مردوں کا کھانا ختم ہونے کے بعد ہی بچھنے کا دستور تھا۔ بیچ میں کسی خاتون نے اپنے بچوں کی بھوک کا خیال کرتے ہوئے باہر سے کچھ منگا بھیجا تھا۔

مطبخ کے منتظم اعلیٰ حافظ رجب علی بڑی مستعدی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے سب کی کمزوریوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ ایک آدھ پلیٹ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی بھیج دیتے۔

حافظ رجب علی بڑھیا سنہرے سٹ میں کھانا چنوا رہے تھے اور سب لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ ہر قاب پر چاندی سونے کے ورق جھلملا رہے تھے۔ ہر قاب پر بادام اور پستے کی ہوائیاں بھی تھیں۔ بہت سی مخصوص رکابیاں بھی تھیں جن میں پرندوں کا گوشت خاص دولہا کے دستر خوان کے لئے مہیا کیا گیا تھا۔ ایک ڈش ''خاص الخاص'' مخصوص طور پر تھی جو سالیوں نے دولہا کے لئے خاص طور پر تیار کی تھی، اور جس سے محتاط رہنا دولہا کی صوابدید پر ہی منحصر تھا، اور اگر کوئی ''سبق آموز کھانا'' دولہا کھا بھی لیتا تو اس کی سمجھداری کا تقاضا یہی تھا کہ بغیر منہ بنائے مسکرا کر کھاتا رہے اور اس طرح سالیوں کو شکست دے سکے۔

سجاد اپنے دوستوں کے ساتھ اس طرح بیٹھا تھا گویا اس کی نہیں کسی دوسرے کی شادی ہو رہی ہو اور وہ محض شرکت کے لئے آیا ہو۔

دستر خوان سجایا جا رہا تھا۔ پورا کمرہ پھولوں اور کھانوں کی خوشبو سے معطر تھا کہ سجاد کو ایک عجیب درد کا احساس ہونے لگا۔ پہلے وہ سمجھا کہ چونکہ دو تین دن سے بہت مصروف رہا ہے اور کھانے پینے میں بے احتیاطی ہوئی ہے اس لئے کوئی معمولی سا درد ہے۔ مگر یہ درد حیرت انگیز طریقے پر بڑھتا گیا۔ جب اس سے ضبط نہ ہو سکا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بتایا۔ وہ جلدی سے لپک کر اپنے رشتے کے ڈاکٹر بھائی کو بلانے دوڑا۔ سجاد کی تکلیف اس طرح بڑھ رہی تھی کہ اس کے چہرے سے شدید اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ گھبرا گئے۔ ڈاکٹر منصور نے دیکھتے ہی گردے کا درد تجویز کیا اور اس کو فوراً اپنے ساتھ لے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

کہاں تو کھانے کی دھوم دھام تھی اور کہاں سجاد کی تکلیف اور اس درد کے دورے سے سب لوگ گھبرا گئے اور طرح طرح کے شگون اور بدشگونی کی باتیں کرنے لگے۔ جب سب لوگ دولہا کو اسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے تو ایک چھوٹی سی لڑکی آئی۔ اس نے اشارے سے سجاد کے بھائی اعتماد کو بلا کر ایک پرچہ دیا اور کہا کہ فوراً دولہا کو دیدے۔ سجاد نے اپنی تکلیف کے باوجود پرچہ پڑھا جس میں لکھا تھا۔

"آپ کو ہماری جان کی قسم۔ سوا روپیہ شہید مرد کے فاتحے کے لئے دے دیجئے۔ عاصمہ۔"

عاصمہ اس سجاد کی منکوحہ تھی اور اس طرح کا پرچہ لکھنے کا اس کو ہر طرح حق حاصل تھا۔

ادھر کچھ مدت سے یہ رسم سی ہو گئی تھی کہ ہر دولہا شہید مرد کے مزار پر زردہ چڑھانے کے لئے سوا روپیہ ضرور دیتا تھا۔ سجاد نے کسی طرح اس رسم ورواج کی پابندی نہیں کی تھی۔ اس لئے اس نے شہید مرد کے فاتحے کے لئے سوا روپیہ دینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ عاصمہ کا خط دیکھ کر وہ جھنجھلا گیا۔ وہ یونہی درد سے تڑپ رہا تھا ممکن تھا۔ وہ غصے میں جھنجھلا کر یہ باتیں بھی کہہ دیتا مگر اعتماد نے پرچہ پڑھ کر جیب سے پیسے نکالے ان کو مٹھی میں بند کر کے اپنا ہاتھ بھائی کے سر پر پھیرا اس کے لئے گھمایا اور سوا روپیہ شہید مرد کے فاتحے کے لئے لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔

ایمبولینس پر ہسپتال جاتے وقت سجاد کا درد کم ہو گیا۔ اسپتال کے ہنگامی ڈیوٹی روم میں اس کا اچھی طرح معائنہ کیا گیا۔ ایکسرے بھی لیا گیا۔ پھر بھی میڈیکل کالج کے کئی ڈاکٹروں نے مل جل کر فیصلہ کیا کہ گردے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ تب تک سجاد کا درد بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ مغرب کے وقت تک وہ واپس گھر بھیج دیا گیا۔ جہاں زیادہ تر مہمان کھاپی کر رخصت ہو چکے تھے۔ تب تک شہید مرد کے مزار پر سوا روپیہ زردے کے لئے چڑھایا جا چکا تھا۔

شہید مرد کے فاتحے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سوا روپیہ کا زردہ ہی چڑھایا جائے۔

اس واقعے کی شہرت جلد ہی گھروالوں سے ہوتی ہوئی محلے ٹولے تک پہنچی اور شہید مرد کا مزار مرجع خلائق بن گیا۔ پہلے تو صرف شادی بیاہ کے موقع پر زردہ چڑھایا مگر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ ہر روز ہی مزار پر جشن رہنے لگا اور کچھ نہ کچھ چڑھاوا آنے لگا۔

مسجد کے حافظ جی جو عام طور پر حافظ ماموں کے نام سے مشہور تھے اس مزار سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ لیتے۔ وہ رات کو لالٹین ہاتھ میں پکڑے آس پاس کے گھروں میں جاتے۔ کسی کے لئے دعا کرتے کسی کو تعویذ دیتے۔ اگر کہیں کوئی خاص چیز پکی تو ان کو مجبور کر کے کھانے کے لئے روک لیا جاتا۔ وہ صرف گڑ کی چائے پیتے تھے۔ اور انہی گھروں میں چائے کی فرمائش کرتے جہاں ان کو یقین ہوتا کہ وہاں رزق حلال پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح گذر بسر کرتے۔ وہ ایک جمعہ کی نماز کے بعد ایک خالی قبر میں جا لیٹے۔ ان کے جاننے والوں نے نماز جنازہ پڑھ کر قبر بند کر دی۔

اس قصبے میں حکیم ابو نامی ایک بزرگ بھی تھے۔ ان کا رشتے دار کوئی نہیں رہ گیا تھا مگر قصبے کے بھی لوگ ان کو عزیزوں سے زیادہ سمجھتے۔ ان کی کتابوں، قلم، روشنائی اور سپاروں وغیرہ کی دوکان تھی۔ اسکولی کتابیں بیچنے کے علاوہ وہ چورن، بنفشہ اور کھانسی بخار کی گولیاں بھی بیچتے تھے۔ اسی لئے حکیم ابو کہے جاتے۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی کا بیٹا فخر کئی برس تک ہائی اسکول میں فیل ہوتا رہا۔ پھر اردو میں شاعری کرنے لگا۔

چونکہ بالکل ہی بیکار تھا اس لئے دماغ میں طرح طرح کے خبط تھے۔ ٹیپ ٹیپ اسٹیشن بنایا کرتا۔ حافظ ماموں کے انتقال کے وقت وہ قصبے ہی میں ہی تھا۔ اس نے حافظ ماموں کے انتقال پر ایک قطعہ تاریخ کہا اور پھر اس کو استعمال کرنے کے لئے اس نے اس قطعے کو سنگ مرمر کی ایک سل پر کندہ کرا کے حافظ ماموں کے مزار پر نصب کرا دیا۔ بعد میں اس کو خیال آیا کہ یہ تو بڑی بات ہے کہ شہید مرد کا مزار بغیر کتبے کے رہے اور حافظ ماموں کے مزار پر کتبہ تاریخ جگمگائے۔ چنانچہ اس نے ایک اور قطعہ کہہ کر کتبہ تیار کروایا۔ "یہ تربت ہے شہید باصفا کی۔ "اس کے اعداد نکلے ۱۵۵۵۔ اسی کو لوگوں نے سالِ وصال کہہ دیا۔

شہید مرد کے مزار پر کتبہ تاریخ نصب کئے جانے کے بعد عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ شہید مرد نے دورِ جہانگیری میں جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔

حکیم ابو حقہ پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اپ تک نہ مزید لہجے میں بولے "ارے میاں تم یہاں کیوں نہیں بیٹھ جاتے مزار پر۔ ذرا صفائی وغیرہ کی دیکھ بھال کرتے رہو۔۔۔ اور پھر ۔۔۔" انہوں نے مزید کچھ کہے بغیر ایک معنی خیز نظر فخرو پر ڈالی۔

مسجد کے آس پاس ٹوٹی پھوٹی قبروں کا خرابہ تھا جس سے ملتے جلتے میں دور تک ببول کا جنگل سا تھا۔ یہ حصہ اصل میں محلّہ اشراف کے قاضی صاحب کی ملکیت تھا۔ مگر ان کے پاکستان جانے کے بعد اس کے بارے میں اچھا خاصا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کچھ دعویداروں میں مقدمہ بازی کے آثار بھی تھے۔ فخرو نے جواب فخرو میاں بن گیا تھا۔ گیروے کپڑے پہننا شروع کر دیے۔ وہ مسجد میں نماز پڑھاتا اور قبروں کی دیکھ بھال کرتا۔ جمعرات کو کئی پکی قبروں پر چراغ جلانے اور پھول چڑھانے کا کام کرتا۔ لہٰذا جو کچھ بھی چڑھاوا آتا وہ اس کی ملکیت ہوتا۔ اس نے شہید مرد کے مزار کے چاروں طرف ڈھیر کا کٹہرا لگوا دیا۔ پھر مسجد سے لے کر مزار تک راستہ صاف کروا دیا۔ اس نے دو ہی تین مہینوں کے اندر مسجد کنویں املی کے تاریخی درخت اور مزار سب کو ایک چہار دیواری میں گھیر لیا اور اس طرح قاضی صاحب کا تمام متنازعہ علاقہ مزار کی ملکیت بن گیا۔

ایک ہی دو سال کے اندر فخرو۔ فخر میاں سے بڑھ کر فخرو پیر ہو گیا۔ وہ عورتوں کو اپنے خاص حجرے میں بلاتا۔ طرح طرح کے عملیات و تعویذ گنڈے کرتا۔ بانجھ عورتوں کی گود بھرتا اور کبھی کبھی ایک آدھ بے روزگار نوجوان کو نوکری وغیرہ بھی دلوا دیتا۔ شہید مرد کے مزار پر سجادہ نشین ہونے کے بعد اس نے حکیم ابو کی صاحبزادی کبریٰ بی بی سے عقد کر لیا۔

مزار پر بیٹھنے کا جو نیم مزاحیہ مشورہ حکیم ابو نے ایک بالکل ہی وقتی اور غیرارادی دماغی لہر کے تحت فخرو کو دیا تھا اس سے ان کا اپنا بڑا مسئلہ حل ہو گیا اور کبریٰ بی بی جو سچ مچ ۳۵ برس کی تھیں مگر ۳۰ برس سے کم ہی کہی جاتی تھیں اور جس کی شادی کے امکانات سے وہ مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ خیر سے اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔

دختر نیک اختر کے دلہن بنتے ہی حکیم ابو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حج کے لئے سدھار گئے۔

''آپ نازک آپا۔ آپ کہاں۔۔۔۔''

ایک بہت ہی عالی شان اور سراپا حسن و جمال عورت نے بیگم قادری کو دیکھ کر کہا۔

پیرس کی ایک مشہور کمپنی نے ایک نئی خوشبو ایجاد کی تھی۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا۔ شاہی گھرانوں اور کروڑپتی حلقوں میں آسمانی صحیفوں کی طرح پڑھے جانے والے فیشن کے رسالے ''لا لیون'' میں برابر اس کا ذکر اور اشتہار آ رہا تھا۔ کمپنی نے اعلان کیا تھا کہ جمعہ ۱۳ اکتوبر کو نائٹس برج کے مہنگے اور فیشن ایبل اسٹور ''بریڈ لے اینڈ بریڈ لے'' میں اس خوشبو کا افتتاح ہوا ہوگا، اور اس کے پورے ایک ہفتے کے بعد یورپ کے دوسرے شہروں میں یہ عطر باقاعدہ فروخت کے لئے پیش کیا جائے گا۔ اس ہفتے کی مدت میں انفرادیت پسند اور فیشن پرست خواتین یہ عطر حاصل کر کے دوسروں سے ممتاز بننے کا موقع کھونے پر تیار نہیں تھیں۔ بس صرف ایک ہفتے کی مدت کے لئے وہاں زبردست میلہ لگا ہوا تھا۔

تاریخ کا انتخاب بھی عجیب تھا۔ جمعہ کا دن اگر کسی مہینے کی تیرھویں تاریخ کو پڑے تو یورپ کے زیادہ تر حصوں میں اسے نحوست سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس خوشبو کے موجد نے جو مشرق وسطیٰ کے ایک قدیم شاہی خانوادے سے تعلق رکھتا تھا اس اعلان کے ساتھ تاریخ کا انتخاب کیا تھا کہ دنیا کی کسی نحوست کا اثر اس بے مثال عطر پر نہیں پڑ سکتا۔ یہ خوشبو نیک و بد ساعتیں خود اپنے ساتھ لے کر آئے گی۔ اس چیلنج نے لوگوں میں اور بھی اشتیاق کی آگ بھڑکا دی تھی۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر ''بریڈ لے اینڈ بریڈ لے'' کے لق و دق اسٹور میں خواتین و بیگمات کا وہ ہجوم تھا اور حسین و جمیل اور امیر ترین شہزادیاں اس طرح ماری ماری پھر رہی تھیں گویا کوہ قاف ویراں ہو گیا ہو۔ ان حسینوں اور کروڑپتیوں کے ہجوم میں ہندوستان کے ایک مرکزی نائب وزیر کی رکھیل عصمت آرا بھی تھی۔ جو بھوری کے نام سے قریبی حلقوں میں پہچانی جاتی تھی۔ بھوری کی یادداشت کچھ اس غضب کی تھی کہ اس نے سیکڑوں بلکہ تقریباً ہزاروں کے ہجوم میں ایک مدت بعد بھی نازک آپا۔ یعنی بیگم قادری کو پہچان لیا۔ بیگم قادری خاصی دیر تک استعجاب سے بھوری کو دیکھتی رہی۔

بیگم قادری اس وقت چالیس پینتالیس کے پیٹے میں تھیں۔ مگر چونکہ کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ابھی تک اچھی خاصی دبلی پتلی سی بنی سجائی اور بنی سنوری رہتی تھی اور غیر شعوری طور پر اب بھی اپنے کو جوانوں میں ہی گنتی تھیں۔ ان کی شادی چپ چپاتے ایک عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے سے کر دی گئی تھی۔ مگر وہی بے وقوف اور فاترالعقل قسم کا کلرک جو اشتہار سازوں کی ایک کمپنی میں بسکٹ پوڈر اور طرح طرح کے شربتوں کے زبان پر آسانی سے چڑھ جانے والے نعرے گھڑا کرتا تھا۔ ایک بار اپنے مالک سے جھگڑ بیٹھا۔ غصے میں آ کر اس نے مقابلے کی ٹھانی اور اپنے مالک کے مقابلے میں ایک نئی اشتہار ساز کمپنی کھول لی۔ نازک آپا کو یہ احساس تھا کہ ان کے ماں باپ نے اس کو کھوٹا مال سمجھ کر اونے پونے عبدالودود قادری کے سر موںڈھ دیا تھا۔ چنانچہ ایسے سماج میں جہاں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے انہوں نے دولت کے حصول اور کامرانی کی کوشش میں

شوہر کی ہر طرح مدد کی اور نئی کمپنی جمانے کے سلسلے میں انہوں نے اپنی آخری پونجی، یعنی سونے کی چوڑیاں اور بندے بھی آدھے داموں پر بیچ ڈالے۔

عبدالودود قادری نے اپنی بے عزتی اور بے التفاتی کا بدلہ [illegible] جس سے پرانے مالک کو ملیا میٹ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس کو اپنی پانچ چھ سال کی مدت ملازمت میں کمپنی کے سارے راز معلوم ہو چکے تھے اور اس کو وہ گر بھی معلوم تھے جن سے کام لے کر اشتہاری کمپنیاں اپنے [illegible] کرالیتی ہیں۔ اس نے جب دن رات ایک کر دئے اور دل و جان سے کام میں جت گیا تو اس کی کمپنی اس طرح بڑھنے لگی کہ پرانے مالک ہی کی نہیں بلکہ بہت سی دوسری کمپنیوں کی بنیادیں ہل گئیں۔

ان باتوں کو اب بارہ چودہ برس ہو چکے تھے۔ بیگم قادری اب اپنے ملک ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی جٹ سٹ میں بھی جانی پہچانی شخصیت بنتی جا رہی تھیں۔ مزاج تو ان کا ہمیشہ سے شاہانہ تھا جب پیسہ ہاتھ آیا، قسمت مہربان ہوئی تو ان کا ایک پیر نیویارک میں اور دوسرا ٹوکیو میں رہنے لگا۔ لندن اور پیرس کے اعلیٰ ترین بازاروں، فیشن ایبل دوکانوں اور زیور کپڑے کے نت نئے فیشن ایجاد کرنے والوں میں ان کا لین دین ایسا ہی تھا جیسے قصبے کے رئیسوں کا صدر بازار کی دوکانوں سے۔ وہ خرچ بھی اس احتیاط سے سنبھال کر اور با موقع کرتیں کہ لوگ ان کی نفاست طبع کے قائل ہو جاتے۔ ان کی بات چیت، چال ڈھال اور لب و لہجے سے ذرا بھی اظہار نہ ہوتا کہ یہ وہی نازک آپا ہیں جن کو ٹھکانے لگانے کے لئے ان کے ماں باپ کو مزاروں اور ولیوں کی درگاہوں پر منتیں ماننا پڑی تھیں اور سیکڑوں جھوٹی سچی کہانیاں گڑھنا پڑی تھیں۔

نازک آپا۔ یعنی بیگم قادری ویسے تو سخی بھی اچھی خاصی تھیں اور رحم دلی بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی لیکن اپنے رشتے داروں اور خاص طور پر ماں باپ کے نام پر تھوکنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ سب سے زیادہ نفرت ان کو اپنی ماں سے تھی جس نے ہر وقت طعن و تشنیع، ڈانٹ پھٹکار اور بددعاؤں اور گالیوں سے ان کی زندگی دوزخ بنادی تھی۔ خاص طور پر جب ان کی ماں جگن ناتھ بھیا کو ہیضہ ہونے، کینسر میں مرنے اور کھولتے تیل میں ابالے جانے کی بددعا دیتیں تو نازک آپا کے تن بدن میں آگ لگ جاتی وہ اپنی ماں کا منہ جھلس دینے یا اس پر تیل چھڑک کر آگ لگانے کی ترکیبیں سوچنے لگتی۔ نازک آپا کا کہنا تھا کہ اگر کسی جگہ میرے پیشاب کرنے سے باجی اماں یا ابو صاحب کو کوئی فائدہ پہنچنے کا شبہ ہو تو میں وہاں موتوں کی بھی نہیں۔

قادری کمپنی کی روزافزوں ترقی کے زمانے ہی میں نازک آپا نے کراچی کے جدید اور فیشن ایبل ساحلی علاقے میں ایک محل نما کوٹھی تعمیر کرلی۔ اس موقع پر انہوں نے ایک محفل میلاد کا انتظام بہت بڑے پیمانے پر کیا مگر اپنے رشتہ داروں کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ ان کے ابو صاحب تو کسی گورغریباں میں توپ دیے گئے تھے مگر باجی اماں حیات تھیں۔ وہ اہل حدیث کی مسجد کے پھاٹک پر المونیم کا ایک پیالہ لئے کھڑی رہتی تھیں جو دو چار روپے مل جاتے ان سے کچھ خرید کر کھا لیتیں اور پھر کسی دوسری مسجد کے احاطے میں ٹاٹ

کے ٹکڑے اوڑھ کر سو رہتیں۔ جس رات میاں دشریف کی تقریب کی دھوم دھام تھی اس رات ہلکی بارش ہوئی تھی جس سے سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ بھیگا ہوا ٹاٹ اوڑھے کانپتی اور کھانستی رہیں ان کے آخری الفاظ یہی تھے۔

۔مولا، میری بیٹی کو ہر آفت، ہر بلا سے محفوظ رکھیو۔

مجبوری نے جس ملک سے 'نازک آپا'۔ آپ کہاں؟ کہا اس سے بیگم قادری ششدر ہو کر رہ گئیں۔ کوئی بیس، پچیس برس بعد انہوں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ وہ کئی ثانیوں تک ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھتی رہیں اور پھر ایکدم مجبوری سے لپٹ گئیں۔ جو آنکھ ماں باپ کی بے کسی کی موت پر خشک رہی تھی وہ کسی ٹوٹے ہوئے بندھ کی طرح شکووں کا سیلاب بہانے لگی۔

وہ رات دونوں نے رسل الکوائر کے ایک پنج تارہ ہوٹل میں گذاری۔ دونوں نے احتیاط سے کچھ چھوڑ چھوڑ کر اپنی زندگی کے اہم واقعات کا ذکر کرتے ہوئے پچھلی ملاقات سے اب تک کے حالات سنائے۔ دونوں کی داستان میں جگن بھیا ایک مرکزی کردار تھے۔ نازک آپا کے لئے وہ کل کے رفیق، گل چیں اول اور ایک بے نام معشوق تھے مجبوری کے لئے وہ آج کے اوتار۔ ایک طوفان بلا خیز کے عالم میں پرسکون ساحل۔ جہاں مجبوری نے لنگر ڈال دیئے تھے۔

جگن بھیا نے پچھلی بار جب پارلیمنٹ کا الیکشن لڑا، تو مقابلہ سخت تھا۔ انہوں نے بھی لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ کئے بغیر شہید مرد کے مزار پر منت مانی اور جب جیت گئے تو چادر چڑھانے کے علاوہ سجادہ نشین فخرو میاں کے لئے ٹیلی فون، ٹیوب ویل اور بجلی کی روشنی کا بھی انتظام کرا آئے۔ بیگم قادری نے شہید مرد کے مزار کے بارے میں ادھر ادھر سے سن رکھا تھا۔ انہوں نے اس بارے میں بھی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ مجبوری نے بتایا کہ بڈھن میاں کا وہی نالائق لڑکا جو لوگوں کی شیروانی کی جیب سے پیسے چرایا کرتا تھا اور جس نے ماسٹر نثار کی بیوی کا سارا زیور چرا کر بیچ ڈالا تھا اب وہاں سجادہ نشین ہے تو بیگم قادری کو ہنسی آ گئی مگر پھر خود ہی دل میں ڈر بھی گئیں۔ ان کو خیال ہوا کہ کیا پتہ وہ واقعی کوئی بڑا بزرگ یا عامل بن گیا ہو۔ مذہب عالم کی تو پوری تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ عجیب عجیب بدکردار اور بداطوار لوگ قلب ماہیت ہونے کے بعد اولیاء و فقہا کے درجے تک پہنچ گئے۔

بیگم قادری ایک طرف تو بہت فیشن ایبل، ترقی پسند تھیں۔ نئے نئے فیشن اپنانے اور نئے نئے تقاضوں کے ساتھ چلنے میں ماہر تھیں۔ مگر دوسری طرف مزاروں سجادوں اور خانقاہوں سے بھی بہت عقیدت رکھتی تھیں ان کے ذہن کے ایک گوشے میں یہ بات بھی محفوظ تھی کہ ٹنڈو اللہ یار کے کسی بزرگ نے ان کی باجی اماں پر پھونک مار کر کہا تھا کہ "جا بی بی سائیں بھلا کرے گا۔ ،، اور اسی کے بعد نازک آپا کی عبدالودود قادری سے شادی ہو گئی تھی۔ مجبوری نے بتایا کہ جگن نے شہید مرد کے مزار پر منت مانی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس کو ٹکٹ بھی ملا اور الیکشن بھی جیت گیا اور اب وہ مرکزی حکومت میں نائب وزیر تھا۔ بیگم قادری کو مزار پر حاضری

دینے کی بے اختیار خواہش ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اب اگر وہ وہاں جائیں تو کون پہچانے گا۔ وہ ایک اجنبی کی طرح وہاں جاسکتی ہیں۔

"آپ کیا کریں گی جاکر۔۔۔ کیا پتہ فخرو میاں آپ کو جانتے ہوں دوسری بات یہ کہ۔۔۔۔" بھوری کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بیگم قادری دونوں ادھر ہی متوجہ ہوگئیں۔

بھوری کو اچھی طرح احساس تھا کہ جگن بھیا کی سیاسی ترقیوں اور منصبی مصلحتوں کے علاوہ ان کے گھر والوں کی مصلحت کے پیش نظر بھی بہتر یہی ہے کہ وہ ان سے دور اور الگ رہے۔ جگن بھیا کو بھی علم تھا کہ سیکولرازم کی مروت ختم ہونے کے ساتھ ہی اب بھوری ان کے لئے زیر دامنی بن رہی تھی۔ پھر بھی وہ پرانے شریف اور وضعدار قسم کے آدمی تھے اپنی طرف سے کسی طرح بھی بھوری کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتے تھے کہ اب وہ ان کی سیاسی پیش قدمی کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ کی حیثیت اختیار کرتی جارہی تھی۔ وہ اپنی طرف سے بھوری کا پورا خیال رکھتے اور اپنی صرور تیں روک کر بھوری کے بے تحاشہ خرچ کے اخراجات پورے کرتے۔ ان کو یہ خیال ہی کمینہ پن معلوم ہوتا کہ اپنی سیاسی ترقی کی راہ میں بھوری سے ہر طرح کا فائدہ اٹھانے کے بعد وہ اس سے کنارہ کش ہوجائیں۔ جب بھوری نے خود ہی ان کو یہ تجویز سُجھائی تو وہ اس بات پر رضامند ہوگئے کہ بھوری انگلستان میں رہا کرے اس کے اخراجات کا وہ انتظام کردیں گے اور سال میں دو تین مہینے کے لئے جب بھی وہ یورپ آئیں گے تو بھوری کے ساتھ ہی وقت گذاریں گے۔ انہوں نے اس کے لئے ہاؤنسلو میں ایک مکان بھی خرید دیا۔

گرمیوں کا زمانہ گذر چکا تھا اور اب جاڑے کی آمد آمد تھی۔ چنانچہ جب اس نے جگن بھیا کا فون سنا تو حیران رہ گئی۔ وہ بلا کسی ارادے اور منصوبے کے یورپ آگئے تھے اور شام تک لندن پہنچنے والے تھے۔ بھوری بہت خوش خوش نازک آپا کے لئے ٹھیہ ادھکی دال پکانے میں مصروف تھی۔ جگن بھیا کی آمد کے بارے میں وہ متعجب بھی ہوئی اور خوفزدہ بھی۔۔۔۔ اس کا ڈر صحیح ثابت ہوا۔ جگن بھیا برسوں بعد نازک آپا کو دیکھ کر ان سے لپٹ گئے اور پھر دونوں ایک دوسرے میں کچھ ایسے گم ہوئے کہ ان کو بھوری کی موجودگی کا احساس بھی نہ رہا۔ نازک آپا تو شاید ان سے پل بھر کو جدا نہ ہوتیں مگر خود جگن بھیا کو احساس ہوگیا اور باقی وقت وہ بار بار بھوری کو مخاطب کر کے باتیں کرنے لگے۔ جب بھی وہ ملک کے حالات کا ذکر کرتے یا اپنی مصروفیات وزارت کی دلچسپیوں اور سیکولرازم کے خاتمے پر لب کشا ہوتے تو بھوری کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے اس سے ان سب باتوں کی تصدیق کے خواہاں ہوں۔

بھوری اب کے بہت دنوں بعد غمگین ہوئی تھی۔ وہ ایک پجارن کی طرح نازک آپا۔ آج کی بیگم قادری کو دیکھ رہی تھی۔ نازک آپا آج بھی سراپا دلکشی، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ بھوری بیلے کا کوئی ایسا پھول تھی بستر پر پڑے پڑے اپنی رنگت کھو چکا ہو اور جس کی مضمحل سی خوشبو میں رات ڈھلنے کی تمنا کی

فسردگی شامل ہو۔ برخلاف اس کے نازک آپا گلاب کا نیا کھلا ہوا پھول تھیں۔ جو دوپہر کی تمازت میں بھی شاخ پر اٹھلا رہا ہو۔ پہلے نازک آپا بھی جوہی کے پھول کی طرح شبنم افشاں رہتی تھیں لیکن آج وہ شباب افزا سورج مکھی کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ان کی سفید سفید کلائیاں اب بھی بیلے کی شاخوں کی طرح لچکیلی اور نازک تھیں۔ ان کے شانے کھلے ہوئے تھے۔ بازو پر دو چار چمکتے ہوئے نشان تھے جو غالباً بچپن میں بیماریوں سے بچنے کے لئے لگائے جانے والے ٹیکوں کے تھے۔ مگر ان کی چمک اس وقت ان کے شانوں اور بازوؤں کو بھی شدید جنسی کشش کا سبب بنا رہی تھیں۔ ان کا بلاؤز ہلکا آسمانی تھا جس میں سے ان کے خطوط فلمی ستاروں کے اشتہاروں کی طرح چیخ چیخ کر ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ان کی ساڑی ہاتھ سے بنے ہوئے ریشم کی تھی۔ اس پر جب بھی روشنی پڑتی تو ہیرے کی کنی کی طرح رنگ برنگی کرنیں پھوٹتی معلوم ہوتیں۔

بھوری نے کسی غم پسند شاعر کی طرح پہلی بار نازک آپا سے اپنا مقابلہ کیا۔ وہ آج کی بیگم قادری کو دیکھ رہی تھی جو اپنے پرخلوص حسن کی بنا پر کوئی ایسا بھاری بھرکم صحیفہ لگ رہی تھیں جس کی حقیقت ابدی ہو، جس کے فرمان ناقابل تردید ہوں اور وہ خود ------ وہ تو ایک داستان غم تھی یا ایک مسلسل نوحہ ------ کیا یہ سب واقعی مقدر کے کھیل ہوتے ہیں ------؟

بھوری اور اس کی ماں نے ہمیشہ دوسروں کی آن اور عزت بچانے کے لئے دوسروں کا دکھ درد سمیٹنے کے لئے اور دوسروں کی خدمت کرنے میں اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا۔ جگن بھیا سے اس کو اتنا فائدہ تھا کہ اس کو کھانے پہننے کی کوئی تکلیف نہیں تھی جبکہ دوسری طرف خود جگن بھیا محض اس کی وجہ سے ایک ملک گیر لیڈر بن چکے تھے۔ کیسے اس کی ماں نے اور خود اس نے نازک آپا کو ایک خوف ناک بھنور سے نکال کر پرسکون بلکہ پرآسائش کناروں پر پہنچا دیا تھا ------ اور نازک آپا ------ وہ تو اپنی ماں ------ بھوری کچھ عجیب طرح سراسیمہ ہو گئی۔ اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا۔

"تمہاری طبیعت تو اچھی ہے نا ------؟" جگن بھیا نے اس کو دیکھ کر کہا۔ نازک آپا بھی بولیں۔ "تم کیوں خواہ مخواہ یہ سب محنت کر رہی ہو۔ فضول اپنے کو ہلکان کر رہی ہو۔ چلو چھوڑو ------ یہ کھانا وانا ------ باہر چل کر کہیں ------ یا پھر چلو سنٹرل لندن میں چل کر کہیں کھائیں گے ------"

بھوری بالکل ہی بے حال ہو کر لیٹ گئی اور اس نے نازک آپا سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہیں جا سکتی ------ "ہاں آپ دونوں جا کر کہیں باہر کھانا کھا لیجئے۔ میں نیند کی گولی میں پناہ ڈھونڈھ لوں گی ------"

جگن بھیا اور نازک بھیا آپا اس کے کہنے پر چلے گئے۔ جگن بھیا نے ڈاکٹر سدھو کو فون کر دیا کہ وہ وقت ملتے ہی آ کر بھوری کو دیکھ لیں۔

اس بار جگن بھیا جتنے دن لندن میں رہے، زیادہ وقت نازک آپا ہی کی معیت میں رہے۔ وہ دونوں کرائے کی سیلف لے کر لیک ڈسٹرکٹ گئے۔ انہوں نے اسٹریٹفورڈ اپان ایون میں شیکسپیر کے ڈرامے دیکھے۔

گلائنڈبورن کے جشن موسیقی میں شرکت کی اور ابرامیگانہ کے تہواری ناٹکوں کا بھی مزہ لیا۔ اسکاٹ لینڈ کے غیر
آباد جزیروں میں انہوں نے سیمن مچھلی کے شکار کا لطف اٹھایا اور جنوبی آئرلینڈ کے تہذیبی میلوں میں شرکت کی

جگن بھیا بھوری پر بھی ساتھ چلنے کے لئے زور دیتے مگر وہ تو جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا جی
چاہتا کہ مذہب وغیرہ میں دلچسپی لے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ [illegible] کو سکون کیسے ملتا ہے
اور دنیا میں رہتے ہوئے بھی لوگوں کو کیسے قرار آجاتا ہے۔ جگن بھیا بیچ میں اپنے کل [illegible] سے بھوری کو اطلاع
دے دیتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور پھر بھوری سے پوچھتے کہ اس کو چلنے میں [illegible] تو نہیں ہے۔ بھوری اس
سوال کے معنی اچھی طرح سمجھتی تھی اور حسب معمول تو تبع معذرت سے کام لیتی [illegible] مکان اصل میں بیگم
قادری کا تھا مگر بھیا اب وہاں اس طرح ٹھہرتے تھے گویا وہ مکان انہی کا ہو۔ [illegible] ہوتے ہوئے توند
پر جب کشمیرے کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر بیگم قادری کے ساتھ [illegible] اور بین الاقوامی جٹ
سٹ کی برادری میں جاتے تو زمانہ بدل جاتے [illegible] باوجود [illegible] کوئی [illegible] جچتے رہتے۔ بیگم قادری
تو ان کو تو اللہ میاں نے شروع دن سے ہی ایسا جامہ زیب بنایا تھا کہ جو لباس پہنتیں [illegible] میں فیشن کا ماڈل
لگتیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو سوچتے ہیں کہ [illegible] رحمت ہوئی [illegible] ہمارا کام تو نکل گیا
۔ مگر نازک آپا یہ سوچتی تھیں کہ انہوں نے اپنے شوہر کی ہر طرح مدد کی تھی مگر اس کا ان کو ایسا میٹھا پھل ملا تھا کہ
لگتا تھا جیسے انہوں نے بے خیالی میں سونے کی کان خرید لی ہو۔

اپنے شوہر کا ہر طرح خیال رکھنے اور ان کی ہر خواہش کا احترام کرنے کے باوجود وہ جگن بھیا کے
بارے میں بالکل بے بس تھیں جگن بھیا ان کے رفیق اول تھے اور ان سے لگاؤ بیگم قادری کی [illegible] کمزوری بن
گیا تھا کہ اب وہ شوہر کی طرف سے بھی قدرے لاپرواہ ہوتی جا رہی تھیں۔ پہلے ان کا معمول تھا کہ وہ دنیا میں
کہیں بھی کیوں نہ ہوں دن میں دو ایک بار شوہر کو ضرور ٹیلی فون کرتی تھیں۔ لیکن ان کے معمول میں کچھ خلل
پڑ رہا تھا۔

جگن بھیا بیگم قادری سے ملنے میں خاصی احتیاط بھی ملحوظ رکھتے ان کو معلوم تھا کہ اگر فرقہ پرستوں کو خبر
لگ گئی کہ وہ ایک دشمن ملک کی عورت سے بہت قریب ہیں تو وہ اس میں کوئی نہ کوئی فتنے فساد کا پہلو ڈھونڈھ لیں
گے۔ بھوری کی موجودگی میں اس کو تنہا چھوڑنے کی بات بھی ان کے ضمیر پر بوجھ تھی۔ بیگم قادری کے ساتھ سیر
سپاٹے کے وقت وہ بھوری کے بارے میں بھی سوچنے لگتے۔ بیگم قادری کو اندازہ ہو گیا کہ جگن بھیا کے ذہن پر
بھوری کا تصور ہمیشہ کسی ان دیکھے ابر کی مانند چھایا رہتا ہے تو انہوں نے بھوری کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستے
سے ہٹانے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔

نازک آپا کو اپنے شوہر کی خواہش کے احترام کے لئے ہارلے اسٹریٹ کے ڈاکٹروں سے بھی ملنا پڑتا
تھا۔ وہ مہنگی مہنگی فیسیں لے کر ان کو یقین دلاتے کہ ان میں کوئی خرابی نہیں ہے اور جلد یا بدیر ان کے اولاد

ضرور ہوگی۔

انہی دنوں شہید مرد کے مزار کے سجادہ نشین فخرو میاں کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ فخرو میاں کاؤنٹی کے ایک بنگلے مکان میں ٹھہرے۔ وہاں ان کی وجہ سے آنے والوں کی بھیڑ بھاڑ نے کچھ اس طرح کا سماں پیدا کر دیا کہ مقامی شہریوں نے کونسل سے شکایت کر دی کہ یہ رہائشی علاقہ اچھا خاصا مینا بازار بن گیا۔ فخرو میاں کے عزیز مٹرو میاں ، جگن بھیا سے ذکر کیا۔ انہوں نے لکھنو کے ڈاکٹر شیرازی کے محل نما مکان میں فخرو میاں کے رہنے کا انتظام کروا دیا۔ ڈاکٹر شیرازی نے یہ مکان پی سی آئی کی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری کے دنوں میں ہتھیایا تھا۔ اس مکان کے ایک حصے میں قادری صاحب آکر ٹھہرتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے اس وسیع و کشادہ مکان کا بیشتر حصہ نازک آپ نے تصرف میں رہتا تھا۔ جگن بھیا نے اسی کے ایک حصے میں "فخرو میاں کے عارضی سجادے" کا انتظام بھی کرا دیا۔

لندن میں گرمیوں کا سیزن شروع ہو چکا تھا۔ خزاں اپنی بہار پر تھی اور درختوں پر ایسی سنہری اور شہر بدوش غمگینی جاری رہتی تھی کہ چاروں طرف آگ سی لگی معلوم ہوتی تھی۔ جگہ جگہ سے کروڑپتی سیاح، علمی طبقے کی طوائفیں ناجائز دولت سے آلودہ خوش قسمت رشتے داروں، شاعروں، پیروں اور آپاؤں اور بجیاؤں کی گرم بازاری تھی۔ پاکستان کے نظام اسلامی سے نالاں پناہ گزیں ادیب و شاعرات اور ہندوستان سے ان کی قدر و قیمت متعین کرنے والے ناقدین پی سی آئی ٹکٹوں پر دھڑا دھڑ لندن آ رہے تھے۔ ڈاکٹر شیرازی اپنے اسپتال کی طرف سے مفید اور فیض رساں رشتے داروں کو طبی معائنے کے لئے بلواتے اور حضرت گنگر گینڈوی اپنی پسند کے شعراء، ادباء کو بلاتے۔ اس طرح لندن میں باؤلی، بچا ٹنک، جھوائی ٹولہ اور تارا تلے کی محفلیں پھر جم گئیں۔ یہ محفلیں پہلے بھی کئی بار اجڑی تھیں مگر تھوڑے وقفے کے بعد کسی نئے ماحول میں نئی بساط بچھ جاتی۔ یہ سب لوگ کاکوری، لکھنو، حیدر آباد سے اجڑے تو پاکستان میں ان کی "کھاؤ پیو" جم گئی۔ وہاں حالات سازگار نہ رہے تو خلیجی ریاستوں کا دستر خوان بچھ گیا، اور جب تیل کے چشمے خشک ہونے لگے تو پی سی آئی کی سبیل جاری ہو گئی۔

باؤلی کی محفل اور بچا ٹنک والوں کی شب بیداریاں فخرو میاں کے دم سے ہو گئیں اس میں اب بھی وہ بہت سے خضاب آلودہ لوگ شامل تھے جنہوں نے اس محفل کے مختلف رنگ دیکھے تھے۔ چنانچہ رات کو جب سب بچے سو جاتے تو یہ لوگ نما کرے میں جمع ہوتے۔ کالی سکٹ اور بیئر وغیرہ کا شغف رہتا اور پینتیس چالیس سال پرانے جھگڑے قصے بھی دہرائے جاتے۔ کچھ اس طرح جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔

فخرو میاں بھی اس غیبتوں میں خوب ذوق شوق سے حصہ لیتے۔ پہلے تو وہ عہد نامہ عتیق کے کسی ملہم غیبی کی طرح نیم وا آنکھوں سے دوسروں کو مسکرا کر دیکھتے رہتے اور ہاتھ میں تسبیح ہلاتے رہتے۔ کبھی کبھی بیچ میں صدر اعلیٰ کی طرح ایک آدھ جملہ بھی ارشاد فرماتے لیکن جب مولوی چراغ حسن کے ہونہار سپوتوں مولوی

وضعدار میاں چلدار حضرت طرحدار اور بعد واغد رکا ذکر آیا تو خاصی شرارت آمیز اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے معصومانہ استفسار کیا ہاں تو پھر کیا ہوا۔ مولوی وضعدار پوچھا، کیا گیا تھا اس کا جھوٹ بھی ہوا کہ نہیں۔؟۔۔

یہ بات اب بھی بعض لوگوں کو یاد تھی کہ مولوی وضعدار کے سسر نے ان پر جادو کر دیا تھا جس سے وہ بول نہیں پاتے تھے اس کا کچھ اثر ان کے ذہنی توازن پر بھی پڑا تھا۔ مولوی وضعدار اور واغد ربھی ایسے ہی عالم فاضل تھے اور بالآخر کینڈا اور امریکہ میں جا کر پرچون کی دکان کھول کر گزر رہے ہیں۔

کڑہ ابوتراب کے مسیح اللہ جو آج کل انگلستان میں خاصے متمول ہیں (کاؤنٹ) تھے مولوی چراغ حسن سے ہمیشہ خار کھاتے تھے کیونکہ عربی میں ان کا فرسٹ ڈویژن مولوی چراغ حسن کی کوششوں سے ہی مارا گیا تھا اس لئے جھلا کر بولے۔ مولوی وضعدار کیا خود ان کے بھی، کون بڑے قابل تھے ان کی عربی کی کاپی جب علامہ اقبال کے پاس گئی تو۔۔۔

ارے صاحب یہی نہیں بلکہ مجھ کو تو ایک صاحب نے قسم کھا کھا کر یقین دلایا۔۔۔ کوئی دوسرا بولنے لگا۔

فخرو میاں کو یہ سب سن کر اطمینان ہوا اس لئے تسبیح پڑھتے ہوئے بولے مگر بھئی ملک کی تقسیم سے بہت سے فائدے بھی ہوئے۔ اب یہی عالم فاضل لوگ۔۔۔ استغفر اللہ استغفر اللہ ''فخرو میاں کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ان کو اپنی مقدس حیثیت یاد آئی اس لئے سیدھے ہاتھ سے اپنے دونوں باریش گالوں پر ہلکی چپت لگا کر وظیفے میں کھو گئے۔

محفل اپنے رنگ پر آ رہی تھی، بہت ہی روح پرور اور روح افزا غیبتیں ہو رہی تھیں اور باہر رات گہری ہو رہی تھی۔۔۔ اسی وقت وہاں بھوری آ پہنچی۔۔۔ اس کا شام سے ہی جی الجھ رہا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور کسی فلسفی کی طرح اپنی زندگی، اپنے مقصد، زمانے کے تغیرات اور نازک آپا کی قابل رشک صحت، حسن اور دولت و معقولیت کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ پوری زندگی بے مقصد اور دنیا کے نظام کے بارے میں ہی سوچنے لگی۔ لوگ کیسے خوش رہتے ہیں، کیسے ختم ہو جاتے ہیں۔ مر کر وہ سب کہاں جاتے ہیں۔ کیا گناہ و ثواب اور سزا و جزا سب محض اعتبارات ہیں دل بہلانے کے سفر دھندے ہیں یا واقعی ان کی حیثیت بھی ہے۔۔۔ اس کی ان سوچوں میں فخرو میاں کے تقدس اور نازک آپا کی ہمہ گیری کے نئے پہلو بھی تھے اور اب وہ ہر چیز پر سے اعتماد کھوتی جا رہی تھی۔ اس تذبذب اور غیر یقینی کی فضا میں وہ فخرو میاں کی قدم بوسی کے لئے جا پہنچی۔

برسوں بعد محلسر کی جو مجلس لندن میں جمی تھی، اس کے مختلف ابواب و حکایات کو اگر تسبیح کے دانوں کی طرح جمع کرنے اور ایک سلسلے میں پرونے یا اس خانوادے کی تاریخ کو اسکے اصل سیاق و سباق میں پیش کرنے کی اہلیت کسی میں تھی تو وہ صرف بھوری تھی۔ بھوری یک ہی سانچے میں ڈھلنے ایک ہی ساخت ایک ہی مٹی یا ایک ہی دھات کی ہونے کے باوجود اچھوت تھی، الگ تھی ٹکسال باہر تھی۔

وہ لانبی قمیض اور شلوار میں ملبوس کسی بڑے گھرانے کی بہو بیٹی کی طرح وہاں پہنچی۔ سب لوگ محتاط ہو کر کچھ خاموش سے ہوئے۔ وہ سب غیرت ،، رتے مال دار تھے، اور اپنی اپنی جگہ پر پٹھ لکھوئے بغیر بہت پچھ پا چکے تھے اور یہی احساس حصول ان کی اپنی اپنی طمانیت تسکین کا ذریعہ تھا۔ اس فضا میں بھوری کا وجود تو۔۔۔ پھر بھی ان سب نے رسمی طور پر، لیکن بہت نمایاں خشک اور سرد لہجے میں اس کی آؤ بھگت کی اس کا حال احوال پوچھا۔ اس کو نظر انداز کرنے کی ہر کوشش کے باوجود وہ سب اس سے خائف تھے۔ اس کی گڑبڑ کی زبان کا خیال آتے ہی بڑی بڑی جنگجو خواتین اپنے کان پکڑتیں۔ کھری کھری باتیں سناتے وقت بھوری ہمیشہ یہی کہتی کہ کوئی اگر خفا ہوگا تو یہ اپنا بگاڑ لے گا یا اگر کوئی خوش ہوگا تو مجھے کون سے ہیرے موتیوں میں رول لے دے گا۔

یہ حقیقت بھی سورج کی روشنی کی طرح واضح تھی کہ واقعی کوئی اس سے مقابلے کی ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔

فخرو میاں کو اچھی طرح بھوری کی جھاڑ جھنکار قسم کی شخصیت کا علم تھا۔ پھر بھی وہ حسب دستور تھوڑی دیر بعد آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیتے۔ دم سادھ لیتے۔ اور ان کو جو چالیس ہزار دعائیں یاد تھیں ان میں سے یہی کل کا ورد کرنے لگتے۔ حاضرین عام طور پر اس مقدس منظر سے بہت متاثر ہوتے۔ اور گفتگو بالکل ہی دھیمی ہو کر سرگوشیوں کا رخ اختیار کر لیتی تاکہ فخرو میاں کے مراقبے اور وردو وظائف میں خلل نہ پڑے۔

بھوری کو دیکھ کر فخرو میاں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بھوری کو ان کی صورت دیکھ کر قدرے ہنسی آئی۔ وہ دل ہی دل میں محظوظ ہوتی ہوئی ان کی داڑھی، ٹوپی اور عبا کا مطالعہ کرتی رہی۔ دو ایک عورتوں نے اس سے رسمی طور پر چائے وغیرہ کے لئے بھی پوچھا۔ نازک آپا جیتی بیگم قاری اپنے سر پر ادب سے ساری کا پلو ڈالے ایک طرف بیٹھی تھیں۔ بھوری قیمتی قالینوں کے گل بوٹے دیکھتی رہی لیکن جب فخرو میاں نے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور اس کے سلام کا جواب بھی نہ دیا تو وہ اپنی اداسی بھول کو شرارت سے بولی ''میاں آپ بالکل شری مہیش یوگی لگ رہے ہیں۔۔۔''

شری رجنیش اور شری مہیش یوگی کے بارے میں انگریزی اخباروں میں ایسے ایسے سہادینے والے انکشافات ہو رہے تھے کہ لوگ ان ناموں کے ذکر کو ہی قابل دخل اندازی پولیس فعل سمجھنے لگے تھے۔ فخرو میاں پورے جملے میں حقیقت کو اس طرح سمجھ گئے کہ ان کی ایڑی سے چوٹی تک آگ سی لگ گئی۔ خاص طور سے اس مجلس میں جہاں مالدار اور ''ہری بھری،، خواتین کا ہجوم تھا ان کو بھوری کی صورت دیکھ کر ہی بخار آرہا تھا۔ اگر پرانی یادوں کی بیڑیاں سد راہ نہ ہوتیں تو وہ فوراً اس کو وہاں سے جوتے مار کر نکلوا دیتے۔ پھر بھی انہوں نے عالم جلال میں آنکھیں کھول کر بھوری پر شعلہ بار نگاہیں ڈالیں۔ فخرو میاں کی بڑی بہن کچھ بولنے ہی والی تھیں کہ بھوری نے پھر شرارت سے ایک جو تا رسید کیا ''میاں وہ ماسٹر نثار کے زیوروں کا پتہ نہ لگا۔ کوئی عمل کر دیجئے مل جائیں دونوں میاں بیوی بہت پریشان ہیں آج کل۔ ماسٹر صاحب کی پنشن کے بعد۔۔۔

سب لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ آخر میں شریف میاں ہی نے حسب معمول معاملے

کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی اور بولے۔ ''ارے۔ اللہ کی بندی تم یہاں [illegible] پہنچی ہو۔۔۔!''

اصل میں شریف میاں کو بھی مزہ آ رہا تھا کیونکہ وہ بھی فخرو میاں کی [illegible] اور لمحہ بعد کے مریدوں اور ان کی پیری مریدی کی تمام جھام سے جھنجلائے ہوئے تھے۔ [illegible] میاں سے [illegible] ذرا سی بھی دلچسپی نہ تھی صرف قرابت داری اور تعلقات کی وجہ سے [illegible] تھے

بھوری کے بے لاگ جملے سے فخرو میاں سناٹے میں آ [illegible] ہی نہیں پڑی تھی کہ کوئی براہ راست کسی مسئلے پر ان سے بات بھی کر سکتا۔ [illegible] ہماری بیوی کے زیوروں کا ذکر چھیڑ کر گویا میاں کی دُم پر پیر رکھ دیا تھا

بھوری کے انداز اور طریقے دیکھ کر بہت سے [illegible] فخرو میاں [illegible] صاحب خانہ کی خیر خواہی میں برہم ہو رہے تھے۔ شریف میاں کو مزہ آ رہا تھا۔ اگر بھوری [illegible] تو وہ بہت سی [illegible] میں اور ترقی پسند انداز و لہجے میں اس کی تائید کرتے مگر اسی اثنا میں [illegible] خاتون گھبرائی ہوئی آئیں اور فخرو میاں کی طرف دیکھ کر مگر دراصل حاضرین کو سنانے کے لئے بولیں [illegible] کا فون [illegible] ہے۔ شاید کہ وہاں آگ لگ گئی ہے۔ آپ کے گھر میں زور [illegible] آگ لگ گئی ہے۔

فخرو میاں بڑے اطمینان سے [illegible] اٹھے [illegible] اندر کی [illegible] وہاں ان کے پہنچنے سے پہلے ٹیلی فون کٹ چکا تھا وہ واپس تشریف لائے تو سب لوگ فکر و تشویش سے ان کو دیکھنے لگے۔ حاضرین میں جن کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ تھی کانا پھوسی سی شروع ہوئی۔ فخرو میاں نے [illegible] لڑکی کو پانی [illegible] کا اشارہ کیا۔ وہ دوڑ کر پانی لائی۔ فخرو میاں نے کوئی دعا پڑھ کر پھونکی اور گلاس لڑکی کو واپس کرتے ہوئے اشارہ کیا کہ پانی ہال کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے پودے میں ڈال دے۔

یہ عمل کرنے کے بعد فخرو میاں پھر اطمینان سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر تسبیح پڑھنے لگے۔ حاضرین پر ان کی قلندرانہ بے نیازی کا بڑا اثر ہوا۔ جو لوگ جتنی عقیدت و خصوصیت کے دعویدار تھے وہ [illegible] ہی شدت سے فکر و تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ بھوری نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا ''کچھ معلوم نہیں آگ کہاں لگی۔ گھر میں کہ مزار شریف میں۔۔۔'' مگر مزار شریف کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کچھ عجیب طرح سکڑ گئے اور ان پر فخرو میاں کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کو گھورا۔ یہ نگاہیں واقعی اتنی شرربار تھیں کہ ہندو دیو مالا کے [illegible] راج کپل کی آنکھوں کے تیج کی طرح ایک پورے جنگل کو جلا کر بھسم کر سکتی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ بھوری اس معاملے میں کچھ ڈھیٹ سی تھیں۔ لہٰذا ان خوفناک نظروں سے متاثر ہوئے بغیر کچھ کہنے والی تھی کہ خاتون خانہ پھر سر پہ ادب سے دوپٹہ اوڑھتی ہوئی آئیں اور خود عقیدت سے بولیں: ''فون آیا ہے۔ آگ بجھ گئی۔ اللہ کا شکر ہے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ فوراً ہی قابو پا لیا گیا۔۔۔

اب کی بار صاحب خانہ ٹیلی فون اپنے ساتھ فخرو میاں کے پاس ہی لے آئے۔ فخرو میاں پانچ ہزار

میل دور سے اپنے گھر کا آنکھوں دیکھا حال سنتے رہے۔ پھر تین چار منٹ بعد انہوں نے الحمدللہ کہہ کر فون بند کر دیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر مراقبے میں چلے گئے۔

سب لوگ عقیدت سے مسحور تھے۔ حاضرین سرگوشیوں میں مصروف تھے اور فخرو میاں کے نورانی چہرے کی طرف دیکھ دیکھ کر محبت وعقیدت سے گرویدہ ہوئے جا رہے تھے اور تو اور خود بھوری کو بھی خیال ہوا کہ فخرو میاں جو [illegible] مزار دماغ میں یاد ہیں شاید ان میں سے ولی واقعی موثر بھی ہو۔ ممکن اپنی پھونک سے سات سمندر پار کی [illegible] بھی دے دیں۔ تھوڑا بہت تو صاحب کرامت ہوگا ہی۔ اس خیال سے باوجود مسکراتی رہی اور [illegible] سے بولی ہاں میاں وہ ماسٹر نثار کے زیوروں کا قصہ تو رہ گیا۔۔۔

حاضرین [illegible] سناٹا چھا گیا۔ شریف میاں کی کوشش کے باوجود وہاں زبردست اشتعال پھیل گیا۔ اس وقت کسی منچلے نے ٹی وی سیٹ کھول دیا جس پر تباہی و بربادی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ سب کی نظر بیساختہ ادھر اٹھ گئی۔ فخرو میاں نے بیگم قادری کی طرف دیکھا وہ بھوری کو اپنے ساتھ اٹھا کر الگ لے گئیں۔ موقع کا احساس کرتے ہوئے شریف میاں بھی پیچھے چلے۔

"تم کو اگر یہی بھٹیار پن کرنا ہے تو یہاں اب کبھی قدم نہ رکھنا۔ تمہیں بالکل تمیز ہی نہیں رہ گئی ہے کہ کس سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔" بیگم قادری غصہ میں لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔ اگر شریف میاں سامنے نہ ہوتے تو وہ شاید بھوری سے باقاعدہ ہاتھا پائی پر اتر آتیں۔

بھوری نے حیرت سے نازک آپا کو دیکھا اور پھر زہرخند کے ساتھ بولی "اچھا تو آپ بھی ان کو کوئی سچ مچ کا پیر اور ولی وغیرہ سمجھتی ہیں۔۔۔؟"

"میں انہیں کیا سمجھتی ہوں اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں لیکن یہ بتا دوں کہ تم کو کیا سمجھتی ہوں۔ تم ہو اصل میں پیدائشی نمک حرام۔ اور چمارن۔ نکل جاؤ میرے سامنے سے ورنہ میں کچھ اور بھی کہوں گی۔۔۔"

"اب میں کچھ کہوں گی نہیں بلکہ کروں گی۔۔۔ نکل جا۔۔۔ یہاں سے۔ حرام زدی۔ چھنال۔ آوارہ کہیں کی۔۔۔"

بھوری سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔ اندر سے پھر باتوں کی گپ شپ کی آواز آنے لگی تھی اور دور سڑک سے موٹروں اور لاریوں کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی مگر بھوری کے دماغ پر بالکل ہی نئی کوئی آواز ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"چھنال۔۔۔ آوارہ۔۔۔؟"

شریف میاں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور باہر لے جانے لگے۔ بھوری ذرا چپٹی اور اپنی سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے بولی "شہید مرد کے مزار پر میرے حق میں بھی دعا کر دیجئے گا۔۔۔"

کہانی وہی ہے

کرتار سنگھ دگل

گاڑی آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا۔ مالتی کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا وہ پھر وقت سے اتنا پہلے اسٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔ جب اسے کہیں جانا ہوتا۔ گھر میں وہ ایڑی نہ لگنے دیتی۔ ہمیشہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ جاتی۔ اور یوں جب وہ بور ہونے لگتی ہمیشہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی کہ اگلی بار وہ وقت پر ہی آئے گی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ دس منٹ پہلے۔ لیکن پھر جب سفر کرنا ہوتا اسٹیشن پہنچ کر اسے پتہ چلتا کہ وہ تو پون گھنٹہ پہنچ گئی ہے۔

آج تو ستم ظریفی یہ تھی کہ گاڑی پر جانا اس کے گھر والے کو تھا، وہ دفتر سے ابھی پہنچا نہیں تھا۔ یہ گھر سے اس کا سامان لے کر پہلے آگئی تھی جسے گاڑی پر چڑھنا تھا وہ تو کہیں دور دور تک نہیں تھا اور پہنچانے والی آن موجود ہوئی تھی۔

یونہی کھڑے کھڑے تھک رہی مالتی کو یوں لگا جیسے پلیٹ فارم کی بھیڑ میں کوئی آنکھیں اس کی پہچانی پہچانی سی ہوں۔ نہیں اس شہر میں اس کی پہچان کا کوئی نہیں ہے اور مالتی قلی کے بازو پر بندھے نمبر کو پڑھنے لگی۔ لیکن یہ تو کوئی اس کا شناسا ہی لگتا تھا۔ بار بار اس کی طرف جھانک رہا تھا۔

شناسا ہوگا۔ کوئی ہوگا جس کے دل کے کسی تار کو اس نے چھیڑا ہوگا۔ اور مالتی نے اپنے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ تین بچوں کی ماں ہوگئی تھی۔ تو پھر کیا اب بھی جہاں وہ بیٹھ جاتی جدھر سے وہ گزر جاتی اس کی کہانیاں شروع ہو جاتیں۔

لیکن ایک حسرت تھی۔ ایک کسک اس کے دل کے کسی کونے میں چھپی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ چھل کیا تھا۔۔۔ پہلی محبت کا درد کیسا ہوتا ہے۔ ابھی تک یہ ٹیس اس نے سنبھال رکھی تھی۔۔۔ لیکن یہ کن خیالوں میں وہ بہے جا رہی تھی۔

اس کا خاوند ہے خوب صورت سجیلا۔ لاکھوں کا بیوپار ہے۔ تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک لاڈلی سی

بچی ۔ سب چاند سے پیارے ۔ خوش خوش ہنستا ہنستا اس کا گھر ہے ۔ اور آج یہ کون اسے یاد آ رہا ہے کون ؟ ۔۔

شاید وہی ہے ۔ بٹ بٹ اس کی طرف دیکھ رہا ہے ۔ کھمبے کیساتھ ٹیک کر کھڑا ہے ۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ کتنی بڑھ گئی ہے جس کسی کو بمبئی جانا ہوتا ہے ۔ فرنٹیر میل کی ہی سوچتا ہے ۔ اس لئے کہ یہ گاڑی وقت کم لیتی ہے سفر میں دو گھنٹے بچا لیں گے ور بمبئی پہنچ کر ٹیکسی کے لئے کیو que میں چاہے گھنٹے کھڑے رہیں ۔ مالتی سوچتے سوچتے مسکرانے لگی ۔ اس کا چہرہ کھل سا گیا چمپئی رنگ ۔

پھر اس کی نظریں ملیں ۔ کوئی جانا پہچانا سا تھا ۔ اس شہر میں کون ہو سکتا ہے ؟ اس شہر میں آئے ان کو کچھ مہینے ہی ہوئے تھے ۔ ٹھیکے داری کے جھمیلے ۔ ان کے میاں کو ابھی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ کلب کے ممبر بن سکیں ۔ ہر چوتھے روز تو اسے باہر مال لینے جانا ہوتا ہے ۔ اس شہر میں ان کی پہچان کا کوئی نہیں ہو سکتا ۔

۔۔۔ جسے اس نے اسے چھوڑا تھا اور پھر مالتی کی سہیلی کے ہوئے ۔ اپنی محبوبہ کی سہیلی سے محبت کرنے لگ گیا تھا ۔ ایک نظر اس نے اسے دیکھا اور اس کا دل بھر آیا ۔ مالتی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ اس کی آنکھیں تو اسے دھوکہ نہیں دے سکتی تھیں ۔ توبہ توبہ اتنی بدتمیزی اتنی بے وفائی ۔۔

وہی ہے شاید ۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں میں ایک امٹ بھوک ۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے ۔ جیسے نظروں سے کوئی کسی کو باندھ رہا ہو ۔ مالتی پسینہ پسینہ ہو گئی ۔ اسے ڈر سا محسوس ہوا ۔ اس نے پلکیں اٹھائیں تو ان کی نظریں آپس کی ٹکرا جائیں گی ۔ یہ کیسا اسے محسوس ہو رہا ہے ایسا لگا جیسے اس نے تو اس کی کل محبت کہیں سنبھال رکھی ہے ۔ دیوانی عورت مالتی کا انگ انگ مہک اٹھا ۔

نہیں ۔ وہ نہیں ۔ اب اس کی مالتی کی جانب پیٹھ تھی ۔ ریلوے کے کسی کارندے سے کچھ پوچھ رہا تھا ۔ اور مالتی نے اس کو دھیان سے دیکھا ۔ وہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ ہمیشہ کوٹ پتلون پہنتا تھا ۔ یہ آدمی تو شیروانی اور پاجامے میں ہے ۔ وہ نہیں ہو سکتا ۔ اس آدمی کا قد ذرا لمبا ہے ۔ لیکن ہاتھ اس جیسے ہیں ۔ نرم ۔ ملائم ، نازک لانبی لانبی ، کومل انگلیاں کسی کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ رہا ہے ۔ نہیں وہ نہیں ہو سکتا ۔ اس کے ہاتھ میں تو ہندی کا اخبار ہے ۔ اسے ہندی نہیں آتی تھی ۔ اس نے تو اردو پڑھی تھی ۔

اور ایک دم مالتی کی نظریں فرش پر گڑ گئیں ۔ ریلوے ملازم سے فارغ ہو کر اب وہ پھر اس کو گھور رہا تھا للچائی للچائی سی نظریں ۔ مالتی کو لگا جیسے کوئی اس کے انگ انگ کو سہلا رہا ہو ۔ اس کا روم روم سرشار ہوتا جا رہا تھا ۔ ایک جھنجھلاہٹ جیسے اس کی پور پور میں چھڑ گئی ہو ۔ یہ کیسی ٹھنڈی میٹھی ہلچل مچ اٹھی تھی ۔ مالتی کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کے منہ پر آ پڑتی ۔

اور مالتی کو یاد آیا کیسے ایک شام یونہی اس کے بالوں کی ایک لٹ اسکے منہ پر پڑ رہی تھی ۔ اور اس نے پہلی بار بالوں سمیت اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا ۔ بالوں کا دیوانہ کیسے اس کے منہ کو بالوں سے ڈھک کر اسے پیار کرنے لگتا ۔ توبہ کیسے دن تھے ۔ دیوانگی کے دن ۔۔۔۔۔۔

اور پھر اس کی ملاقات اس کی بچپن کی سہیلی سے ہوئی جب تم تھی اس کا ... ہو ... جیسے کی طرح اس
کے پیچھے پیچھے پھیرنے لگا۔ گنوار آدمی کی کوئی غیرت بھی ہوتی ہے ... بھی ... ہوتی ہے۔ شاید عنی
کے بال ہی اسے پسند آئے تھے کتنا بھاری جوڑا اس کا بنتا تھا۔ یوں اس کا رنگ ... تھا۔

اور اب کیسے اسے گھور رہا ہے۔ گوری چٹی مالتی ... بیٹی ... مالتی کو لگتا جیسے وہ ٹھگی
گئی ہو۔ ایک تو یہ عشق وہ نہیں ہوتے دیتے۔ آنکھ ... تو پیچھا خالی چھوڑ دیتی ہیں ... تو آنکھ ان ڈھکا ہوتا
یہ آج کل کی لڑکیاں کیوں، آج کل کی تو مالتی بھی ہے اس کا بیاہ ہو ... مالتی سوچتی ... کوئی اس کے لئے
نہر کھود سکتا ہے کوئی کان چھید سکتا ہے عورت کا کبھی کچھ نہیں بگڑتا ... زندگی سے۔

لیکن اگر وہ وہی ہے تو آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتا۔ جیسے ... تا تھا گھنٹوں اس
کی انگلیوں کے ساتھ کھیلتا رہتا جتنی دیر ان کے یہاں رہتا۔ مالتی کا ہاتھ اس کے ... رہتا۔ مالتی سوچتی
اگر وہی ہے تو آگے بڑھ کر کیوں نہیں کہتا۔ ہیلو مالتی! میری جان مالتی ... برس پہلے اس
کے بول گونج رہے تھے۔ اور پھر مالتی بے چین ہونے لگی۔ میاں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا کسی لمحے بھی وہ
آ سکتا ہے اور پھر مالتی سر سے پاؤں تک کانپ گئی کہیں یہ نہ سوچ رہا ہو کہ گاڑی میں سفر کرتے وقت ملاقات
ہوگی۔ گاڑی سے تو اس کا میاں جا رہا تھا۔ وہ تو اسے گاڑی پر بس چڑھانے آئی تھی۔

کتنی مہین ساڑھی آج شام اس نے پہن رکھی تھی لیکن اتنا بھی کیا جتنا وہ اپنے آپ کو لپیٹ لپیٹ کر
رکھتی۔ اتنا ہی اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ان ڈھکی ان ڈھکی ہو۔ اور مالتی نے دیکھا، آج اس نے پیازی رنگ
کی ساڑھی پہن رکھی ہے۔ پیازی رنگ اس کا پسندیدہ تھا اور پھر مالتی کا دل کہتا۔ وہ نہیں ہو سکتا وہ ہوتا
تو کبھی کا اس کے پاس آ گیا ہوتا۔ پیازی رنگ تو اس پر جادو کا اثر رکھتا تھا۔ وہ نہیں ہو سکتا۔

جوں جوں گاڑی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا پلیٹ فارم پر گہما گہمی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لوگ ایک
دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ پھر مالتی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اب اس کی ... کی جانب پیٹھ تھی
۔ اور مالتی دیکھتی رہ گئی۔ دور بنچ کے پاس کوئی کھڑی تھی' سوتا۔ بھاری جوڑا' رنگ اتنا صاف نہیں ورنہ
ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا دو منٹ چار منٹ دس منٹ کیسے وہ بنا پلک جھپکے اس کی طرف دیکھے جا رہا
تھا اس کو جیسے بھول ہی گیا ہو۔ ایک بار بھی اس نے اسے پلٹ کر نہیں دیکھا۔۔۔ وہی ہے مالتی کو یقین ہو چلا
۔۔۔ وہی ہے۔

اور پھر مالتی کا خاوند آ گیا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ مالتی کے خاوند کے ساتھ
ان کا منشی تھا۔ مالتی کا جی چاہا کہ منشی جی کو دریافت کرائے کہ اس کا نام مدھوسودن ۔۔۔۔ راولپنڈی والا۔
لیکن پھر مالتی کے دل نے کہا۔ کاہے کو؟! اسے یقین تھا کہ وہی ہے۔ مالتی کی جانب پیٹھ کئے دور بنچ
کے پاس کھڑا اب وہ نئی آئی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہی ہے وہی ہے مرد حضرات۔

زندگی کے موڑ پر

(مسافر)

کرشن چندر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ جارجٹ کی سبز ساڑھی ور زری کا فیتہ، نیون کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا نقرئی کنارہ۔ آنکھ سے لٹھے کی قمیص اور امرت ملتصن کی شلواریں، عجیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چائے دانی کو ڈھانپنے کے کام آ سکتے ہیں، لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہنتی ہیں تو گول گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں بچارہ پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت، لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لئے تھے اور سوشیلا نے بلی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لئے تھے اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی اور سوچتی کہ جب سری پور جائیں گے تو لیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا ہاں، اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے چپید چپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی، اری یہ کیا ہے؟ دیکھ تو بہن یہ لاہور کا نیا فیشن ہے، کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا ب کالج میں پڑھتی ہے، ہاں کالج میں، اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی، خوب لطف آئے گا ن کی باتیں سن کر، اور لیلا نے تو جب سے ''پریم کی پکار'' میں ہیروئین کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے اس کا دل للچا رہا تھا، اب پرکاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے لمبے لمبے سے، ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے یک اس سے ذرا بڑا طلائی

گنبد حتی کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید بلوریں گردن تک پہنچ جاتے تھے، یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مدورا کے مندر لٹکے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی تو اس کا ہنسنا اور طلائی گنبدوں کا جھومنا اور اس کے گالوں کا شہابی ہو جانا، یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں اور وہ سوچتی کیا سوشیلا اور اس کے ناخن، یہ اور بات تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی، بڑی بہن، لیکن جب پرکاش چند نے معصوم سے لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی تو لیلا نے جواب دیا "میں کیا کرتی بھائی جان! میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں تھے۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدے سے ہیں، کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاتی"؟

اور سوشیلا نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا "بھائی جان! آپ ہماری استانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں بالکل سپید، بے داغ، سچے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں، اور بھیا جی! پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر"؟

پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے پرکاش، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے۔ پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دیے۔ پرکاش وتی کے لئے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑھی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی۔ "دیکھو نا جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو تو اسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دے دینا، اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولھا کو، اور ـــــ بس کافی ہے"۔

جب پرکاش لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے تو پرکاش کی ماں نے کہا۔ "دیکھنا بیٹا، ڈولی کے وقت میرا خیال ہے کہ بس دولھا دلہن دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا، آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا تو پرکاش وتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیے تھے، بس ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا" اور کہا "بس کافی ہے، اچھا بیٹا جاؤ اب دیر نہ کرو"۔

لیکن جب تانگہ بالکل ہی چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرا لیا اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہے اور پھر انہیں نینون کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہیے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہو گی، اسی لئے کہتی ہوں، بیٹا یہ دوا بے

کے لوگ بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں، ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اٹھ دی، اور سر اٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور ۔۔۔"

پرکاش نے گھبرا کر کہا۔ "بہت اچھا ماں، بہت اچھا"۔

ریل جا چکی تھی اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا، دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچا دیا۔ بٹالہ پہنچ کر انہوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی اور آخر انہوں نے اسے رابرٹس پارک کے قریب پا لیا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پرکاش چند سو فی صدی خالص شہری تھا جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گذری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس کے نیچے تین بوسیدہ لاریاں، دائیں طرف رابرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا رابرٹس پارک کے درختوں پر پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اور آک پر اودے اودے پھول آئے ہوئے تھے۔ نیلے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آ رہا تھا اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے آسمان کی طرف تک رہے ہیں کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ پرکاش نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں لیٹے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔ "سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے"؟

ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔۔۔ "ہاں جناب، کیا کہا آپ نے"؟

"میں نے کہا سری پور۔۔۔"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں جناب، یہیں سے"۔ پھر فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھئے، ایک روپیہ کرایہ"۔

"کس وقت چلنا ہو گا"؟

"چار بجے، اب کیا وقت ہو گا جناب"؟

"اڑھائی"!

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب۔ ابھی تو بہت وقت باقی ہے"۔

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر ہیٹ اتار کر فرنٹ

سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

''آپ سری پور جا رہے ہیں''؟

''ہاں''!

''کس کے ہاں''؟

''لالہ کھودی رام کے ہاں''۔

''لالہ کھودی رام؟ وہ جن کا بڑی ڈھاب کے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے چین سے واپس آیا ہے، سنا ہے وہاں روئی کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آج کل ہونے والی ہے جو۔۔۔''

''ہاں، ہاں، وہی''۔

''میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے''؟

''نہیں''۔

''جی ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم کس کو نہیں جانتے۔ لالہ کھودی رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، بڑے نیک آدمی ہیں۔ ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں؟ کیا بتاؤں جی، ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا کیسا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھی، پہلوان تھا جی پہلوان، ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو ہرا دیا۔ اللہ بخش بھی بڑا تگڑا پہلوان ہے مگر ہار گیا جی۔ کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا، تحصیلداری کا امیدوار تھا، لیکن وہ بیٹھے ہوئے بیچارے کو کسی نے راتوں رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلع میں بہت قتل ہوتے ہیں، قتل اور چالان، ابھی پچھلے مہینے میں میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں بابوجی، سڑکیں بالکل کچی ہیں، گاڑیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے، یہ لاری میں نے دو سال ہوئے نئی لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان، پہیّے، بریکیں، مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بُری حالت میں ہے۔۔۔ او فضل، او فضل، ابے حرمی، اٹھ، دیکھتا کیا ہے، چل اسٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے سورج چھپا چاہتا ہے۔ آج رات کو میری شاہ جی کے گھر دعوت ہے۔ سواری ملے نہ ملے دعوت پر تو پہنچنا ہی ہے''۔

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا اور پرکاش چند کو بھونچکا سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا۔ پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''لالہ جی ہرنی پور کے بڑے ساہوکار ہیں، اور یوں بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بٹالے میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ جاؤں مجبوری ہے، اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے''۔

لاری واقعی بھر چکی تھی، درمیانے درجے میں جو عورتوں کے لیے تھا، سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی، ان سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا

''آؤ شاہ جی''۔

''کہاں بیٹھوں''؟ لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا۔ ''یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے''۔ لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند قطرے، دونوں ہاتھ کی چھنگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

''بھائی رجبے''! لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ ''میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا، امید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی''۔

رجب علی نے پھر انجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سوشیلا اور لیلا بولیں۔ ''بھاپا جی''!

''کیوں''؟ پرکاش نے پوچھا۔

''دم گھٹا جا رہا ہے''۔

رجب علی بولا ''بی بی جی! ابھی لاری زور سے چلے گی تو خوب ہوا آئے گی''۔

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پر ڈالی اور سوشیلا اور لیلا پر، پھر بولا: ''آپ لالہ خودی رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش وتی کی شادی ہے نا''؟

"جی"! پرکاش بولا۔

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ایک بولا۔ "میں نے موجو سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے"۔

دوسرا بولا: "موجو خود کہاں کا شریف ٹھہرا"؟

تیسرا کہنے لگا۔ "موجو پھر جاٹ بھائی ہے، لیکن وہ سب جن ہے، حضری بھی نہیں"۔

لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا۔ "زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے، بھائی بھائی کا دشمن، اب تو بنج بیوپار کا زمانہ نہیں رہا، ابھی میں راستے میں سیٹھ رنگ جی کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو، سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو قرضہ دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہو۔ ادھر دیا ادھر وصولی کے لئے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے"۔

رجب علی آہستہ سے بولا۔ "کم بخت پسٹن کام نہیں کرتا"۔

درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو دلائنیں باتیں کر رہی تھیں۔ "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی، تیرہ سال میں دوھوا، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی۔ بے چاری کے بھاگ۔ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دیے تھے لیکن کرسوں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروّت نکلی۔۔۔۔"

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ کی عورت تنگ آ کر بولی، "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں"؟

"میں تو چھاتی دیتی ہوں مگر یہ پیتا ہی نہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے، اور آ۔ آ۔ آ۔ اس۔ ای۔ سو جا میرے لال، سو جا، ہائے مر جا تو، جان کھائے جاتا ہے"۔

رجب علی گھسیٹا مل کی ایک طرف اٹھ کر بولا۔ "پسٹن کام نہیں کرتا شاید"۔ لیکن گھسیٹا مل پرکاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا۔ "مالیہ پچاس فیصد کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے، چوکیدارہ بند ہو جائے تو سرکار کا کام کیسے چلے"؟

جاٹ بولا۔ "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی"۔

"تم سکھا شاہی چاہتے ہو"؟

"نہیں جنتا شاہی"۔ ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک سالن عورت دوسری سے کہنے لگی۔ "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سنا؟"

"اب بچن کا باپ نکوا لئے ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ۔ دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پرلطف ہوتی ہے، سادہ اور معصوم، پرکاش نے سوچا کاش مجھے اردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے تو نکوے سے اس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور لیلا نے پکارا۔ "بھائی جان، پانی، دم گھٹا جا رہا ہے"۔

رجب علی بولا۔ "آگے نہر آئے گی، اس کے قریب ہی ایک کنواں ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی"؟

گھسیٹا رام چونک پڑا۔ "ہاں، جی، پکی چٹھی، کیا کہتے ہو، اوہ رجبے کیا میں سو گیا تھا"؟

"ہم کہاں آ پہنچے ہیں"؟

پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور لیلا کو دیے۔

رجب علی بولا۔ "شہر کے قریب لالہ جی"۔

گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "اوہ بہت پیاس لگی ہے، کنوئیں پر پانی پئیں گے"۔

رجب علی کہنے لگا۔ "میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ نہر کے کنوئیں کا پانی بہت ہی میٹھا اور ٹھنڈا ہے"۔

پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، حد نظر تک خشک سے کھیت، کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ، لاری آہستہ آہستہ نیم ریتلے میدان میں چل رہی تھی، کچی سڑک پر گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا، دھوپ بے حد تیز تھی اور آگ کے شراروں کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، آک کے پھول بالکل مصنوعی معلوم ہوتے تھے۔ پیپل کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں لیکن ان کا رکھوالا وہاں نہ تھا۔ یہ ایک گاؤں تھا۔ سڑک کے اس طرف لاری ایک گندے جوہڑ کے قریب سے گذر رہی تھی، ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی، ایک عورت سرخ رنگ کی قمیص اور کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی، ایک لڑکی، سڈول اور سانولی بانہوں والی نوجوان لڑکی، ڈنڈے سے چند بھیگے کپڑے کوٹ رہی تھی سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا بڑ نظر آ رہا تھا جس پر ڈاک کے لئے سرخ ڈبہ ٹنگا ہوا تھا، درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا، اس پر چار سکھ جاٹ ایک بے حد میلی تاش سے کھیل رہے تھے، پھر وہی

میدان تھا، وہی رتیلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا، زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض 'زندگی'۔ کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ننھا سا خوبصورت بچہ، اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا۔ اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی، وہ اس کا ایک رخ دیکھ سکتا تھا، ایک جوان جاٹ عورت، سنہری سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخساروں پر [illegible] رکھی تھی۔

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک [illegible] ہو گیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا: "اوتو ۔۔۔ تو ۔۔۔ لی"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا اور گنگنایا۔ "اوتو ۔۔۔ لو ۔۔۔ لی ۔۔۔ اؤ"۔

جاٹ عورت بیدار ہو گئی، اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ جب اس نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم متبسم لب پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے، اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی، ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی، بولی۔ "ہمیں سری پور جانا ہے"۔

رجب علی بولا۔ "اماں، جگہ تو بالکل نہیں"۔

بوڑھی عورت بولی۔ "بیٹا! میں سہارا لے کر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی، ہاں، مگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے"۔ رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انہوں نے گانا شروع کر دیا۔

او بنتو ۔۔۔

بنتو دا سر بن ورگا

بنتو دا منہ چن ورگا

بنتو دا لک چترا

او بنتو ۔۔۔

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی۔ جو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے، جس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل اس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی، جاٹ کی شاعری میں اس نے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا، بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پل پر سے گذر گئی، آگے جا کر ایک کنواں آیا، وہاں لاری ٹھہر گئی اور مسافر پانی پینے لگے، پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور سوشیلا اور لیلا کو پانی پلانے لگا، جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی، پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے، دیہاتی عورتوں میں، لیکن بچہ بڑا شریر تھا۔ اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا اور پھر محجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جا کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی، اسے سامنے کے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اترتے ہی اس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پہ رکھ لیا اور بچے کو کمر کے خم میں، اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی، گویا کہہ رہی تھی مجھے اچھی طرح دیکھ لو، ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے، میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں، جہاں میرا خاوند اپنی جتو کا انتظار کر رہا ہے، میں کماد کی فصل کاٹوں گی گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی، اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی ٹھلیا لے کر اپنے گھر والے کے کھیتوں میں جاؤں گی، یہی وہ پگڈنڈی ہے جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا، اپنے دل میں کہنے لگا، ٹھیک ہے جتو، اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں، یہ سماج کا قصور ہے۔ اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں، بھائی، بہن، خاوند، بیوی، بھانجا، بھتیجی، ماموں، پھوپھی اور خالہ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے کیسی عجیب بات ہے؟

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی، اس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل میں کہا خداحافظ، خداحافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں، لیکن اگر ہم انسان

نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا۔۔۔ تو ۔۔۔ اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے اور اپنے سفید پر پھیلاتے ہوئے اڑے جا رہے ہیں۔ نڈر، بے باک، خوش، نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے، ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑے جا رہے تھے۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کیکروں پر پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پر شفق کی سرخی تھی اور نیچے زمین پر ایک سنہری دھند، کیکر کی پتلی، گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک پرندے کا گھونسلا بنا دیا تھا۔

جو اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی، پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی: "چ ۔ چ ۔ چوں چوں" پرکاش نے اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا دی اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رجب علی بولا۔ "یہ سلسلہ کام نہیں کرتا"۔

مجور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے۔ یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا لیکن اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ دریا کی لہریں چھا گئیں، پھر گیہوں کی درآمد کم ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں، وقت، مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتداد زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں اکثر دکانوں پر حقہ گڑگڑایا جا رہا تھا یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور ادھ موئے سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے، بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو رویہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر جہاں لاری کا اڈہ تھا، لالہ خودی رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا۔ یہ جھیل اس زمانے میں ایک اونچا ٹیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کوئی کام نہیں زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح، یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے، چاہے چرخہ چلائے، بہرحال چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراست طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اسے گھور کر دیکھا، سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں۔

ان کے بھڑکیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین ور جاذب نظر تھے کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے رہے۔ ایک دکان پر ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اتار کر رکھ رہا تھا، وہ انہیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اتارنا بھول گیا، پھر اس کے لبوں پر یک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، اسے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور اس کا چہرہ جیسے کسی الجھن سے فوراً صاف ہو گیا۔ جب سوشیلا، لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گذرے تو گاڑی بان بڑے مزے سے گنگنایا۔

لے ... ہنہ بنے نیارا ۔۔۔

اور وہ بنولے کی بوریاں دکان میں پھینکنے لگا، سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہو گئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائیداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بیٹے کی ہوس نے ہمیں بزدل، غلام اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ بیوی، بچہ اور بنگلہ، لالہ خودی رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خودی رم کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے۔ لالہ خودی رام کا لڑکا بیر بھاگتا اندر سے آیا اور پرکاش چند کے گلے سے لگ گیا۔ وہ دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ بیر اب پہلے سے لمبا، مضبوط اور جوان ہو گیا تھا، چین کے دور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے۔ اس کے لہجے میں خودداری تھی اور بلند حوصلگی اور خوداعتمادی، جب وہ سری پور سے گیا تھا تو بالکل ایک لڑکا سا تھا، چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا اور اب ۔۔۔ اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصے تک لاہور کے کنوئیں کا مینڈک بنا رہا، ماحول کا اثر، تن آسانی یا ایک جبلی کمزوری، لالہ خودی رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھوپھیوں، بھابھیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا شمار نہ تھا۔ انہوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں سے سٹریم لائن Stream Line سینڈلوں سے لے کر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا۔ باتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور کی بسیں ہیں۔ سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ناخنوں پر سرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا جس کی یاقوتی چمک کے آگے حنا کی رنگت ماند ہو گئی تھی۔ اری ۔۔۔ بہن یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ، پتہ، لکھ دو پتہ، لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا۔ اس کے طلائی آویزوں کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں

میں آنسو بھر آئے مرداد ملیں کہیں کی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا۔۔۔ آنگن میں چوپالی پر پرکاش اور بیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیر کی ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی، اس نے ریشمیں اور پھولدار شلوار پہن رکھی تھی۔ زعفرانی قمیص اور سر پر سنہری کنارے والا سرخ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ بیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش وتی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ بیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی [illegible] بات بگڑنے نہ پائی۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر [illegible] تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لے کر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہو سکتا ہے وہاں منگل ہونے والے جنگل میں آگ بھی لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات [illegible] دروازے کے اندر ہو گی اور ایک باہر، اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات بھی یہی ہے کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی، لیکن بیر کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی، اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آخر گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا تو وہ [illegible] اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے بیر سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے اور بیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رُک گیا، کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوارپنے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی، ان کی طرف جھجکتے ہوئے قدموں سے بڑھی چلی آ رہی تھی اور جب وہ بالکل ہی قریب آ گئی تو بیر کے لب کانپنے لگے اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردوں میں چھپا لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے، وہ ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا ہو اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دے کر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آہ، یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا ”کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، رکے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آ جاتے ہیں۔ شاید ابھی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں“۔ دفتر کی میز نے ابھی اس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا

”یہ کون تھی؟“

بیر نے کہا: ”چین بہت اچھا ملک ہے“۔

پرکاش سے کہا۔ "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی"۔

ہیرے نے کہا "چین کے لوگ افیم کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی۔۔۔"

پرکاش چارپائی سے اٹھ بیٹھا، کہنے لگا۔ "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی، ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں کی دوائیں ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا یہ شنگھائی نہیں ۔۔۔ پور ہے۔ چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں۔ ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں"۔

ہیرے نے کہا۔ "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آ جانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا"۔

پرکاش وتی دوسری منزل پر ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہو گی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا، اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا، لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا "پگلی ہو بہن! تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو"۔

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا: "تو کہتی تھی کہ میں بی اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی، اب بتا یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تُو تو شاید فلم ایکٹرس بننا چاہتی تھی اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے مہاودیالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے، اب کہاں ہیں"؟

پرکاش وتی نے رو کر کہا "اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو، کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں"؟

پرکاش چپ ہو رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان دو ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اسے پرکاش وتی

سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی، شاید بہنوں سے بھی زیادہ۔ چونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو، اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ برا کہتے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت طرح دار نوجوان، جسے اچھے لباس کا شوق ہو، جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو، جو حسن کی قدر کر سکے، پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر بنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظر حقارت دیکھا جاتا ہو اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ ''بے حیا'' نہ تھے۔ انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل [illegible] نہیں لگایا تھا، نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں سکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ یوگ باششٹ اور ستی باجن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارھویں تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا، لیکن شادی کے معاملہ میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر کے اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ امرت سر کے مشہور ساہوکار تھے اور تھوک ہلدی بیچتے تھے۔ ہلدی بیچ بیچ کر انہوں نے امرت سر میں لاکھوں کی جائداد بنا لی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈا تھا، کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں، بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن صاف کرنے میں ہے، شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر پرکاش کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا ''لاکھوں کی جائداد کی مالکن بن رہی ہو اور اب یوں آنسو بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں''؟

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کہنے لگی ''مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ، ہٹو''۔

پرکاش نے کہا: ''ہم نہیں ہٹیں گے، کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے ہلدی بیچنے والے کی ہونے والی بیوی، ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں، جواب دو گی''؟

پرکاش وتی نے کہا ''تم لاکھ بار پوچھو، ہم تب بھی نہیں بتائیں گے''۔

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا ''دیکھو جب تک تم خود نہ اُڑو، اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ، یہ زمین تمہیں اُڑنے نہ دے گی''۔

پرکاش وتی نے کہا ''کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے''؟

اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا، لاجواب ہو گیا، ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی بھی تھی لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی، یا اپنے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی، لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن۔ اندھے سماج کے قفس میں پر پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے اور پرکاش وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گذر جاؤں۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے میری ہمت بندھ جائے گی۔

پرکاش نے کہا۔ ''تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے''۔ پھر ہنس کر کہنے لگا: ''آخر ایک دکاندار کی بیوی ہونا''؟

پرکاش وتی نے بھنویں اوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگا پرکاش جی کو سائیں جی کے پتا جی بلاتے ہیں۔

پرکاش نے پوچھا: ''سائیں جی کون ہیں''؟

پرکاش وتی بولی۔ ''یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے، پاگل ہے، اس کا باپ پٹواری ہے''۔

پرکاش نے پوچھا۔ ''سائیں جی کے پتا جی کہاں ہیں''؟

لڑکے نے کہا۔ ''باہر بیٹھک میں بیر کے پاس بیٹھے ہیں''۔

پرکاش نے کہا ''اچھا تو میں چلتا ہوں، اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو، کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمہاری''۔

پرکاش وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

***

باہر بیٹھک میں بہت سی آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور بیر نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور بیر کا بچپن کا دوست، لالہ سیتا رام پٹواری، لمبا، دبلا، پتلا، ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے وہ اداس سی آنکھیں ایسی آنکھیں جو اکثر کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو، حسین برجیندر، بیر کا بہنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا بوٹا سنگھ قصبے کے سیٹھ کا لڑکا، دھنی سیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا اور رام لال، منگت رائے، چھیرو، رمو، ذکیہ، دادو اور دوسرے وہ تمام آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی، جن کی صورتیں معمولی ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں الجھی ہوئی، لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط، یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں میں بھگتا دیتے ہیں اور جب گھی میں کچھ تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر حقے کی مدد کے تلتے ہی رہتے ہیں اور جب خرابیاں سلجھانے پر آ جائیں تو بڑے بڑے جغادری جمہوروں کو مات کر دیتے ہیں۔ یہ آدمی غریب ہوتے ہیں لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں وہ چاچا، ماموں، تایا جیسے معزز القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ شادی کے رسم و رواج سے یہ لوگ بہت واقف ہوتے ہیں اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑے کے بعد یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولھا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہیے یا زعفرانی گھی تو چاچا چھیرو ایکدم پانی کے گلاس میں اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو، نہ تیل کا نقصان اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

برجندر نے جس سے بیر کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا ''آپ بھاپا جی، لاہور میں کیا کام کرتے ہیں؟''

بھاپا جی؟ پرکاش نے سوچا، یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مصر ہیں اور ایک انہی پہ کیا موقوف ہے۔۔۔ اور پھر پرکاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آئیں جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی کیفیت کا جس سے ادھیڑپن ٹپکتا تھا۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے خیالات کی یاد بہت تلخ تھی جس نے اسے قبل از وقت معمر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے بکھیڑوں نے اس کی روح کو کچل دیا تھا اور اس کے ضمیر اور

اس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی خلش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل جائے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چاردیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفان ریت کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک لتھڑی ہوئی لاش، اس لئے اب جب کوئی اسے بھاپائی کہہ دیتا تو اسے چنداں حیرت نہ ہوتی اور وہ اپنے دل کی اداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا جس نے ایک لمحے میں اسے بڑا بھائی کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا ”میں کواپریٹو بنک میں کلرک ہوں“۔

”کیا تنخواہ ملتی ہے؟“

”پچھتر روپے؟“

”پچھتر روپے“ پٹواری نے کہا ”تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب“۔

”جی، آپ کی عنایت ہے“۔

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنسنا بہت بُرا لگا لیکن اس ہنسنے میں کوئی برائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا جس میں پرکاش کی برقانی نگاہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پٹواری جی! کوئی گیت سنائیے“۔

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں سے پوچھا ”کیا تمہیں گیت بھی یاد ہیں“؟

پٹواری نے بوٹا سنگھ سے کہا۔ ”بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا“۔

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں کی اداسی کو دیکھ کر کہا: ”بے شک تمہیں گانا آتا ہے۔ تمہیں کئی گیت یاد ہوں گے، کئی گیت، جو تمہاری اداسی نے خود بنائے، جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری روح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے، لیکن کیا ہوا تمہیں، یہ اداسی تم نے کہاں سے پائی“؟

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سن لی، کہنے لگا، ”بھئی آج جی نہیں چاہتا، سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟“

چاچا پھیرو نے حقہ آگے سرک کے کہا ”حقہ پیجیے لالہ جی، ذرا دیکھیے اس وقت تو خوب

چل رہا ہے"۔

پرکاش نے پوچھا "لالہ جی! سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب سا لڑکا ہے"۔

"عجیب"؟ پٹواری نے آہستہ سے کہا۔ "وہ تو پاگل ہے جی، میں بتاؤں، اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اول جلول بکنے لگتا ہے، ہمارے ہاں مسلمان تو اسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر، اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان جی سے بچی اٹھاکر دے دیتا ہے ایشور کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے"۔

"سچ مچ"؟

چونی لال نے کہا "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا، حکیم صاحب نے بتیری کوشش کی، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا میں نے بلا لیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا "بھائی اچھا ہو جائے گا بھائی ٹھیک ہو جائے گا، بھائی ٹھیک۔ ہو جائے گا، کوئی فکر نہیں، کوئی فکر نہیں"۔۔۔ اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا"۔

"کمال ہے"۔ پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا۔ "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ جب ڈپٹی صاحب کا لڑکا قتل ہونے کو تھا اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا"۔

"بڑے تعجب کی بات ہے"۔ پرکاش نے کہا۔

پٹواری بولا۔ "اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے، وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا، کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا، لیکن بھگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتایا تھا کہ میرا بھائی آئے گا۔ پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا اسے باہر لے کر نہ پھرنا اور نہ اسے کوٹھے پر لے جانا، اس کی ماں نے ایسا ہی کیا"۔

دھن سیال نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اسی دن دو چھوٹے بچے کوٹھوں سے گر کر مر گئے"۔

پٹواری نے کہا۔ "اور وہ چھوٹا بچہ بیمار ہوا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کم بخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات، وہ رات مجھے یاد ہے سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا

بچہ بھی اسکی گود میں لیٹا سو رہا تھا اور سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا

بزار وکیندا لاچیا
مٹی نہ پھول جو گیا
مٹی نہ نوں جو لیا
تیرا کھوا نیں لال گواچ
مٹی نہ بھروں جو گیا

یکا یک میں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا۔ "لے گئے، لے گئے میرے بھائی کو لے گئے" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا، دیکھا، ہائے میرا بچہ مردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیرے میں یم راج لے گئے تھے۔۔۔"

شام کے وقت بیر کا بہنوئی برجندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے گئے۔ ریتلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ نیچے اتر کر کھیت تھے لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی، اس لئے بالکل روکھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اُگے ہوئے تھے اور کہیں کہیں کڑوے کسیلے بیروں کی جھاڑیاں، مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوا رُکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اٹھتا اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حدنظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا منظر نہ تھا جسے وہ دلکش یا جاذب نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناکی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اسکا دل بیٹھا جاتا تھا۔ پرکاش نے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و نواح کے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے داتن کئے جاتا تھا۔ داتن کرتے کرتے کہنے لگا "بھائی صاحب آپ ذرا بیر کو سمجھائیں نا"۔

"کیوں، کیا بات ہے"؟

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھ دار ہے، کماؤ بھی ہے لیکن روپے کی قدر نہیں کرتا"۔

"وہ کس طرح، میرے خیال میں تو۔۔۔"

برجندر نے بات کاٹ کر کہا "آپ نہیں جانتے، ویسے تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے اخراجات چلتے ہیں اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے ہر وقت ہم دونوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ یہ بات اچھی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے وہ پچاس سو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے۔ آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ ان کا کہنا نہ مانے تو اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہو گا"؟

"بے شک بے شک"۔ پرکاش نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجئے، پرکاش وتی کی شادی نہیں ہوئی ابھی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے اور اس سال بیاہ بھی کر دے لیکن اسے دیکھو یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ بساکھا مل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے، گھر کے کام کاج سے واقف، سوشیل، سمجھ دار، سینا پرونا جانتی ہے، خط پڑھ سکتی ہے، ماں باپ، بھائی بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے۔ پرانا خاندان ہے، امیر آدمی ہیں"۔

"تو یہ مانتا کیوں نہیں"؟

"کہتا ہے لڑکی ٹھگنی ہے، سانولا رنگ ہے، آواز بھاری ہے، اور اپنی طرف نگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مَس رکھتی ہو۔ سینما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا، اسے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو، گیارھویں پاس کر کے بھی کیا بنا۔ تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح جانے۔ اب ہم اسے کسی بے کار گریجویٹ کے پلے باندھ دیتے تو بے چاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے، وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی لیکن اب بیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا بیر آپ کا کہا مانتا ہے آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہ راست پر لے آئیں تا کہ گھر برباد نہ ہو"۔

اور پرکاش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا، لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہو گی، کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے، اور پھر بیر تو شنگھائی کے کاربے Cobret بھی دیکھ

چکا ہے اور شاید اسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے۔ لیکن برجندر نے کہا ”نہیں، آپ ضرور کوشش کریں، میری خاطر سے“۔ اور پرکاش نے کہا ”اچھا میں آپ کی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا لیکن مجھے امید بہت کم ہے“۔ برجندر نے کہا ”جی نہیں، یہ آپ کیا کہتے ہیں! آپ اگر چاہیں تو اسے سمجھا سکتے ہیں“۔ بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجندر داتن کرتے کرتے کبھی کبھی زور سے تھوک دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آ گئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے، عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا یہ میرا خیال ہی ہے، میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں، عام کسانوں کے، ان کے دلوں میں طمانیت ہے، صبر ہے، یقین ہے، شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے، روح کا پرتو ہے، شام کے سناٹے، پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اونچی اونچی آواز میں گالیاں دینے لگے۔ پرکاش اور برجندر اٹھ کر اس گروہ کے قریب جا پہنچے۔ برجندر نے پوچھا ”کیوں جھگڑتے ہو بھئی؟ کیا بات ہے؟“

ایک ملاح نے کہا ”شاہ جی! بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔ یہ دوسرے کنارے پر صبح سے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اتارتا تھا، کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو، ہمیں بیاس پار کروا دو۔ ہم نے کہا اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمہیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آ کر یہ کل چودہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس——— آپ خود گن لیجیے“۔

کسانوں نے کہا ”ہم غریب ہیں، ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں، ہم پر دیا کرو“۔

بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے“۔

ایک ملاح نے کہا۔ ”اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گزارا ہوتا ہے میں نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ

دیے، اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے، یہ کہاں کا انصاف ہے''

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا ''بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں، آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان! میں نے ایک پیسہ کبھی نہ ... تھی ... اب در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ ... ---
ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن ... کی سزا ہے''

برجندر نے کہا ''تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں ... وہاں ان سب کچھ دیں گے''۔

بوڑھا کسان بولا: ''پرماتما تمہارا بھلا کرے''۔

ایک بوڑھی عورت بولی ''ری ثریا! جا سرکنڈے، گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری بنو! لحاف اور چٹائیاں چھوے سے اتار کر لے آ۔ ارے سادھوا کم بخت کدھر بھاگ گیا تو---''

ثریا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جواں عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی۔--

---

دریا سے واپس آ کر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا اور اب وہ ایک بڑی سی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا سا دیا، برات آئے گی، یہ بھی سب جانتے تھے، لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا، لیکن اب یہ واہمہ دور ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی نے لے لی۔ چاچا چھیرو جو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گذر جانے پر بھی مجرد تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے تا کہ کل کے لئے بٹالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں۔ یمنگت رائے اور برجندر کو برات گھر میں صفائی کروانے، برات گھر سجانے اور براتیوں کے لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور

ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ بیرا اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر ادھر گھومنے اور چھوکروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا۔ بیٹھک میں اب پرکاش، چونی لال اور بوٹا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آ رہی تھیں یا باہر جا رہی تھیں۔ ریشمیں لباس سرسراتی ہوئی قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے تھے چنریاں جن پر مقیش کے لہریے تھے، پھر کبھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حسن، جس میں رعنائی اور موہنی کی بجائے بھولپن اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور بوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ تینون کے ہوائی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں، ایک کی گردن میں خم میں مدورا کے مندر میں لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی بہنوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے پھر بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دونوں نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی جس نے بیر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔ پرکاش نے پوچھا ”وہ کون ہے“؟

”وہ کون“؟ چونی لال نے پوچھا۔

”وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور ———“

چونی لال نے کہا ”وہ ——— وہ مس اوورسیئر ہے“۔ اور یہ کہہ کر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

”مس اوورسیئر“؟

”ہاں، ہاں“! بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیئر ہے نا“۔

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا ”میں نے سنا ہے کہ اوورسیئر کی تبدیلی جالندھر ہو گئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے———“

”سچ مچ“؟

”ہاں! مجھے آج ہی پتہ لگا ہے، ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گذر جائے گی“۔

"نہیں، نہیں.... آہ بے چارہ"۔ اتنا کہہ کر بوٹا اٹھ بیٹھا۔ پولی ماں بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بے تربیت ہیں، بالکل دیہاتی، وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔ آنگن میں رلی بچھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لٹک گیا تھا اور کم سن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر رکھی تھی۔...

کتھے گیوں! پردیسیا وے

ٹک، ٹک، ٹک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس دیس کے گیت سنے تھے۔ بلوریں چشموں کے کنارے نیلی آنکھوں والی چرواہنوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنوں پر گیت، جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اداسی میں گائے گئے، جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے گیت.... لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سروں میں لرزنے لگتا اور کبھی اس کی گویائی کی حس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمے کے انجماد میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اٹھتا۔ لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنا دیا تھا، جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور بڑا ہونے پر اسے بے قرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا رازدار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا، یہ اچھا ہے۔ پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اٹھ گئی، انسانیت بھی فنا ہو جائے گی.... ٹک ٹک ٹک ٹک لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کر دیا تھا۔

اوہیوں لکھنا!

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حساس اور دردمند دل چاہیئے۔ جوانی کی بے قرار روح نسائیت اور شباب اور اس

کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی، جس کے سر پر سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا اور جس کی سبز قمیص پر نقرئی فیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

ٹک، ٹک، ٹک، پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے بیر اور مس اوورسیر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیر کا چہرہ سفید تھا اور مس اوورسیر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیر نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان! میں بھی اوپر آ رہا ہوں ابھی۔۔ دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولھا بھائی کی آمد کے قصے سنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تسکین کر رہی تھیں۔ پرکاش چند لو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرات سے کام لے کر اسے اپنے نسوانی مزاح کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیر آ گیا اور آ کر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا، اس کا چہرہ سپید اور اترا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیرمعمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش اور پرکاش وتی دونوں جلد جلد بیر کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ بیر کے ماتھے پر رکھا، کہنے لگی، ''ماتھا گرم ہے''۔

پرکاش نے پوچھا، ''کیا بات ہے بیر''؟

بیر نے رکتے رکتے کہا ''اُف۔۔۔ کوئی بات نہیں، بس دم گھٹا جا رہا ہے''۔

پرکاش نے کہا۔ ''پانی، پانی''۔

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا۔ ''پانی، پانی''۔

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا ''پانی، پانی''۔

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی۔ بیر کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ بیر نے تھوڑا سا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا، کسی نے ہاتھ پکڑ لئے، کسی نے پاؤں، کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو، ہوا لگ جائے گی، کسی نے کہا کھڑکی

کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ، پلایا گیا، دوسری پھوپھی جان بولیں: ''اے ہے، کہاں ہے بیر کی ماں؟ بیر کی ماں''!

بیر کی ماں بولیں: ''میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں''۔

''اچھا، اچھا، جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا''۔

بیر کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگوتی اس کے پیچھے دوڑیں۔ ''ارے ... ارے ... میں کہتی ہوں بیر کی ماں، اس کے تو ہاتھ پاؤں پھٹک رہے ہیں۔ بازار سے کانشی پھل منگواؤ تا کہ پیروں پہ اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔ اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں''۔ بیر نے لاکھ انکار کیا کہ اسے گرمی تھی محض دم گھٹا جا رہا تھا اور اب وہ جس نہیں گھٹتا تھا۔ اب اسے آرام تھا، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی و راسے آرام سے لیٹے رہنے دیا؟ ناچار بیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور و غل کرنے، بیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کانشی پھل کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی، اور وہ سے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً بیر نے آنکھیں کھول کر کہا

''ہائے بھابا جی''!

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا: ''چین کیسا ملک ہے''؟

بیر نے کہا ''ہائے مر جاؤں گا، اب کیا ہو گا، ان کی تبدیلی ہو گئی ہے''۔

پرکاش چند نے کہا: ''سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کابرے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں...''

بیر نے کہا: ''میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا''۔

پرکاش نے کہا: ''اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے''۔

بیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: ''ہائے بھاپا جی، ہائی بھاپاجی، اگر تمہیں پتہ ہوتا، اگر تمہیں پتہ ہوتا...''

پرکاش نے کہا: ''مجھے سب پتہ ہے''۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سرخ تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکا یک پرکاش نے سوچا، کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے بیر کی ماں سے کہہ سن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوا لی تھی تا کہ آرام سے سو سکے۔ بیر کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا تھا "کیا شادی نہیں دیکھو گے"؟ اور پرکاش نے بیر کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب پھیرے کی رسمیں ادا کی جائیں گی چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا، کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال، دھن سیال بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آ گئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا، "بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوا لی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھئے"۔

پرکاش نے برا سا منہ بنا کر کہا: "میں سونا چاہتا ہوں"۔

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا: "تو ... سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی"۔

دھن سیال نے کہا: "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے"۔

پرکاش نے پوچھا۔ "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی"۔

دھن سیال نے مسکرا کر کہا۔ "اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟ ... ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نووارد ٹھہرے، کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی"؟ ... لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہئے۔ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی، وہ ایک دن بیٹھک میں حقہ پی رہے تھے، نیلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی، رخساروں پر پرچھائیاں"۔

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں"؟ پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں اور تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بیچارے مجرد تھے ابھی تک۔ عمر چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے"۔

چونی لال، دمن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے: "ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارک دے کر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے اور ان کی مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں مڑتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا"

پرکاش نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا: "ہم دریا پر گئے تھے جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور و غل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ بھولی بھالی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا، میری جوان اور سندر لڑیا۔ بوڑھے کسان نے دو سو روپے کے عوض لڑیا کو چاچا پھیرو کے حوالے کر دیا تھا۔ پیٹ بڑی بلا ہے اور اب وہ بے وقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے۔ گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند تھا"۔

بوٹا سنگھ بولا: "چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے، انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے"۔

دمن سیال نے کہا "دیکھئے بھائی صاحب! اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے چاچا پھیرو نے کہا ہے، اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ ہم نے کسی کو یہ بات بتا دی ہے تو پھر وہ ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے۔ اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی لال نے کہا: "آؤ بھایا جی ذرا بارات گھر میں باراتیوں کے درشن کر لیں اور ان کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں۔ بیچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔۔۔ کہیں انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارت نہیں ہوئی"۔

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہو گیا، لیکن نیند کہاں، آج شادی کی رات تھی، ابھی ابھی ان لوگوں نے دلہا کا منہ دیکھا تھا اور بیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں۔ "سروارنا" کیا تھا اور چاندی

کی چوڑیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں۔ دولھا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تو بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا۔ دولھا کے بھائی کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے لے کر وہ ادھر ادھر یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی شخصیت بھی وہی جاپانی اور بنیا پن تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بہت سے رشتہ دار تھے جن کے حلیے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے، کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے، گانٹھیں چاہے کئی بنتی چلی جائیں۔۔۔ ''ملنی'' کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے ملے تھے۔ چاندی کے گلاب دانوں میں بھرا ہوا معطر پانی ایک دوسرے پر چھڑکا گیا تھا۔ جھیوروں، بھانڈوں اور خیراسیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گداگروں کے جم غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی تا کہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کئے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹوں پر پیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لوٹا جا سکے۔ پیسوں کے نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتیوں سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا اور میراسی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی اور اب بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا۔۔۔ کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ پرکاش وتی تھی۔ وہ چپ چاپ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لگائے گئے تھے۔ در آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ پرکاش نے پرکاش وتی سے کہا۔ ''آج تمہارا بیاہ ہے، دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آ جائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیوداسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچنا ہو گا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں؟''

پرکاش وتی نے غمناک لہجے میں کہا "نہیں، میں آج ذبح کی جاؤں گی۔۔۔ خیر میں، پڑھا کر سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر جیسے ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں؟ شاید یہ بھی ایک رسم ہو گی، لیکن میں سوچتی ہوں کیا مجھے اس سے بچا دیا۔ میں داخل ہوئی تھا؟۔۔۔ میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں۔۔۔ مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو"

پرکاش نے کہا: "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی"

"بھاڑ میں جائے شاعری"۔ پرکاش وتی نے جھلا کر کہا

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی"۔

پرکاش نے پرکاش وتی کا داہاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے دیکھو یہ لکیر طاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیو گی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے اور ایک موٹر کار۔ یہ لکیر تمہاری شاعری کی تھی لیکن یہاں آ کر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہو گی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے لیکن ان کے علاوہ وہ تمہیں ہر سال نئے بھدے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی اور۔۔۔"

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا "ہٹو بھی، ہر وقت بے ہودہ مذاق، شرم نہیں آتی تمہیں"؟

پرکاش نے چھیڑتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی"۔

یہ آخری رتجگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جانی تھیں اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین بباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے، نائیں شربت

چلائی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے پاس قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر رتجگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی بڑی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی، کیونکہ حس مر چکی تھی لیکن حرص تیز ہو گئی تھی اور حقہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ رہی تھی۔۔۔ شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر، جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا، اور اب سب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے، پرکاش نے سوچا کیسی بے انصافی ہے؟ ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دیئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے چہرے لے کر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا: ”لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے؟“ اور رتجگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت فحش، لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں باپ، بہنوں بھائیوں، بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔

یہ کرو، وہ نہ کرو، وہ کرو، یہ نہ کرو، اور اس طرح اندھی مانگ کا چکر زندگی کی منزل پر سے گذر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا:

ہائے رجندر وے تیری ماہی
اوہنوں لے گیا اک سنیاسی
ہائے اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی
ھب، ھب، ھب، ھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ پلائی، تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے۔ اگر گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے۔ اور پرکاش نے سوچا کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماہی کو لے جائے ایک سنیاسی، آخر ایک سنیاسی کیوں؟ ایک سُنار یا چمار کیوں نہیں؟ اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں عمل اور جوش سے ان کے مستقبل کو روشن اور دلکش بناتے ہیں، کایا کلپ کرتے ہیں، مکتی دلاتے ہیں اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں۔ اس لئے ماہی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی اصلی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا آج وہی گناہ اُبل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لَے میں ظاہر ہو رہا تھا اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سن رہے تھے جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ ہلدی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑکیاں باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی تھی۔ زندگی غیرمحدود تھی، عشق تازہ اور شباب زندہ تھا لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا

جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے، آنکھیں موند لے، اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنا لے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے۔ اب گیت ہلکے ہو رہے تھے۔۔۔ دولہا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے۔۔۔ پرکاش وتی اور دولہا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے شعلے گھی کا عرا چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے۔۔۔ پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا۔ پرکاش وتی اور دولہا خوش اور سبک بیدی کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔۔۔ پانچ۔۔۔ چھ۔۔۔ سات۔۔۔

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آ گئی تھی لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے اردگرد بہت سی عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے اردگرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے سوشیلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ ہیر کا چہرہ فسردہ تھا اور لب کھلے اور اس سے پرے پرکاش دلی ایک چیرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہوا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندی۔ اسے اس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے۔ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکڑی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گذرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے، کسی کی چھاتیاں، کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے کناروں پر، کسی کی ٹانگیں سکڑی ہوئیں، کسی کی پھیلی ہوئیں، کسی کی سانس میں خراٹے تھے۔ کسی کی آنکھیں نیم وا۔۔۔ ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سنہری تار ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی، شعلوں نے قربانی لے لی تھی اور اب خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں

نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا ور اب مدہوش ہے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازے کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرش زمیں پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ کم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے بجنے ابھی تک چیں چیں کئے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ ہو ہو، کوہو رٹ رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ٹڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدورا سے مدور لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر کی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولتے لگے۔ پھر دور کہیں سے رہٹ کے چلنے کی روں روں سنی اور پورب میں حد فق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا، اس کے پنجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی ور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پہلا پرتو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آ جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیرمرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا۔ اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے پر گذرنے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا، اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزہ چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی، لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر سے اور گلہریوں کی دُمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے۔ دور ایک اونچی مینڈھ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دل کش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی۔ اس دلکش، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں، اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید۔۔۔ مور کے چھتر پر مختلف رنگوں کی نازک

جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی۔۔۔ آسمانی۔۔۔ دھانی، خوشیاں۔۔۔ غم۔۔۔ زندگیاں۔۔۔ پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائے گی، یہاں تک کہ انسانی زندگی، اس کی تہذیب، تمدن، اس کے دعاوی باطل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغرور ہو جائے گی لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی۔۔ ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا، بیر کی پتیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح۔۔۔ یکایک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اُجالا سی اُبل پڑا گیا۔ زمین کا رقص رُک گیا۔۔۔ بیجنے کی پیں پیں بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رُک گیا اور کہنے لگا ہے۔ وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟ وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چھکاتی ہوئی آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہو گئی۔۔۔ ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر نہاتا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں۔۔ آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں اور ہرے بھرے ٹڈے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے۔ رؤں۔۔۔ رؤں۔۔۔ رؤم، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی ہے۔۔۔ رُوں۔۔۔ رُوں۔۔۔ رُوں۔۔۔ اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور اسے سنتا گیا۔۔۔ رُوں۔۔۔ رُوں۔۔۔ رُوں۔۔۔ بے مطلب، بے معنی۔۔۔ منبع نامعلوم۔۔۔ منزل ناپید۔۔۔ اب وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے رُوں رُوں رُوں رُوں

حواشی

ا۔ وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو ''بھاپاجی'' کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

ایک رات کا مہمان

کشمیری لال ذاکر

جنوری کی پہلی تاریخ تھی۔

نئے سال کا آغاز تھا ایک نیا زمانہ تشکیل پا رہا تھا ایک نئے یُگ کی روپ ریکھا بن رہی تھی۔ سال کے آغاز کا یہ پہلا دن سدا ہی مجھے ذہنی طور پر غیرمتوازن کر دیتا ہے۔ اس سے پہلی رات میں بڑا سنجیدہ اور خاموش ہوتا ہوں۔ کسی سے ملتا بھی نہیں۔ گھر میں پڑا رہتا ہوں اور ان سب کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں جو میں نے سال بھر پڑھی ہیں ہر ایک کتاب کی خط کشیدہ سطروں کو پڑھتا ہوں اور ان سے جو جذباتی لگاؤ رہ چکا ہے اسے تازہ کرتا ہوں اور یہ سلسلہ کافی رات گئے تک چلتا رہتا ہے کوئی مجھے ٹوکتا بھی نہیں۔ سب میری عادت کو جانتے ہیں۔ کوئی مجھے کھانے کی میز پر بھی نہیں بلاتا۔ جھانگی رام میرا بوڑھا ملازم، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چائے بنا کر رکھ جاتا ہے۔ لیکن اس آہستگی اور خاموشی سے جیسے لمحے گزرتے ہیں۔ بالکل غیرمحسوس طور پر، اور پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ میں صوفے سے اٹھتا ہوں ور کمرے میں لہراتے ہوئے دھوئیں کی سیاہی کو دیکھتا ہوں جیسے اس سیاہی نے گزرے ہوئے ایک سال کے ایک ایک لمحے کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہو اور اسے سہلا رہا ہو کہ وہ سو جائے اور اس کے سو جانے کے بعد ایک نیا سال جاگے۔ ایک نئی کونپل پھوٹے۔ ایک نیا پھول کھلے۔ ایک نئی جوت جلے اور ایک نیا سورج طلوع ہو اور دھرتی پر امن اور شانتی کا مدھ بھرا سنگیت بہرے۔

سیاہی کے اس پردے کو اور گہرا کرنے کے لئے نیا سگریٹ جلاتا ہوں اور پھر دھوئیں کے مرغولوں کو سیاہی کی تہوں میں تحلیل ہوتے دیکھتا ہوں اور پھر بستر میں لیٹ جاتا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد میری آنکھیں مند جاتی ہیں اور سال بھر کے واقعات اور حادثات اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آنے لگتے ہیں۔ کہاں میری ہار ہوئی ہے؟ کہاں میں جیتا ہوں؟ کون سا زخم

منتقل ہو چکا ہے اور کون سا ابھی تک ہرا ہے؟ کہاں میں نے ٹھوکر کھائی ہے، کہاں میری پگڈنڈی کسی شاہراہ سے ملی ہے اور کہاں کوئی شاہراہ جس پر میں بڑی دیر سے چل رہا تھا اچانک ٹوٹ گئی ہے؟ کس طوفان نے اسے بہا ڈالا ہے۔ سامنے ایک بہت بڑی کھائی ہے اور میں اس کے کنارے کھڑا ہوں اور یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ سال بھر کی بھرپور تگ و دو کے بعد میں نے پایا تو کچھ بھی نہیں، صرف اپنی محنت کھوئی ہے۔ اس کسان کی طرح جو دن رات جان کھپاتا ہے اور جب اس کی فصل پک کر تیار ہو جائے تو ساہوکار کے آدمی آ کر کھلیان بننے سے پہلے ہی اس پر قبضہ کر لیں۔ جب تمام واقعات کا مجموعی طور پر جائزہ لیتا ہوں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ بہت دوڑا ہوں۔ بہت سا راستہ طے کیا ہے۔ کئی سنگِ میل پیچھے چھوڑے ہیں۔ بہت سی پگڈنڈیاں پار کی ہیں۔ لیکن سال بھر کے بعد وہیں کھڑا ہوں جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ شکست کا یہ تیکھا احساس بڑا ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

میں آگے کیوں نہیں بڑھتا؟ میری کشمکش کیوں کامیاب نہیں ہوتی؟ میری کوششیں کیوں بار آور نہیں ہوتیں؟ میرا بھرپور عزم کیوں میرا ساتھ نہیں دیتا؟

یہ اور ایسے ہی کئی اور سوال میرے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگتے ہیں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہتھوڑے برس رہے ہیں اور میری شخصیت کی چٹان سے کچھ ٹوٹ کر گر رہا ہے۔ ان ٹوٹ کر گرتے ہوئے ٹکڑوں کے انبار لگتے جاتے ہیں اور میں ان کے نیچے دب جاتا ہوں اور پھر ایک ایسا لمحہ آ جاتا ہے جب میں ہتھوڑوں کی آواز بھی نہیں سن سکتا۔ چٹان سے ٹوٹتے ہوئے ریزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک بھاری بوجھ کے تلے دب کر بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ میرے ذہنی اور جسمانی قویٰ بری طرح مضمحل ہو جاتے ہیں۔

ہر برس کی آخری رات کو یہی ہوتا ہے۔ ہر سال کی آخری رات کو میں مرتا ہوں اور نئے سال کی صبح کو پھر جی اٹھتا ہوں۔ اب تک میں پندرہ بار مر چکا ہوں اور پندرہ بار دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ ان میں زندگی کے وہ برس شمار نہیں جب میں زندگی اور موت کے فرق کو سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ جب شعور کے تیکھے پن نے ایک تیز دھار والا خنجر میرے پہلو کے قریب نہ رکھا تھا۔ اب تو میں کروٹ بھی بدلوں تو اس کی نوک میرے دل میں اتر جاتی ہے۔

اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔

دوسری صبح میں پتھروں کے ڈھیر سے نکلا تو میرا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس سال میرے ذہن پر پہلے سے کہیں زیادہ ہتھوڑے چلے تھے اور میری شخصیت کی چٹان بہت ہی بری طرح ٹوٹی تھی۔ جیسے اس برس میں نے صرف کھویا تھا پایا کچھ بھی نہ تھا سفر بہت زیادہ طے کیا

تھا۔ لیکن کسی پگڈنڈی یا شاہراہ پر نہیں۔ ایک لق و دق صحرا میں جہاں نہ کوئی سنگ میل آیا تھا، نہ شاہراہ ملی تھی، نہ کوئی موڑ ہی نظر سے گزرا تھا۔ صرف سراب تھے اور بگولے تھے اور ریت کے عظیم پھیلاؤ تھے۔

جاگنے پر بھی کچھ دیر بستر میں پڑے رہنے کے بعد میں اٹھا۔ کھڑکی سے قریب آیا۔ شیشوں میں سے دیکھا باہر اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ پھر کھڑکی کھولی۔ اور یخ بستہ ہوا کے جھونکے نے ایک چانٹا سا میرے منہ پر دے مارا۔ نئے سال کی پہلی صبح میرا استقبال کر رہی تھی۔ باہر بڑی گہری دھند چھا رہی تھی اور ہوا اتنی سرد تھی جیسے برف گری ہو۔ یہ برف تو اونچی اونچی چوٹیوں پر گرتی ہے۔ کتنی پیاری لگتی ہیں۔ برف باری کے بعد برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں جیسے اپسرائیں نرت کرتے کرتے تھک کر آرام کر رہی ہوں۔ لیکن اپنی زندگی میں چوٹیاں ہیں ہی کہاں۔ چوٹیاں تو جب تھیں جب چیتنا میرے ساتھ تھی۔ کتنی پروقار تھیں وشواس کی وہ بلند چوٹیاں جن پر ہمارے پیار کی سنہری دھوپ چمکتی تھی اور ستاروں کے پھول کھلتے تھے۔ ان چوٹیوں پر برف بھی گرتی تھی۔، ان سے طوفان بھی ٹکراتے تھے اور پھر وہ برف پگھل جاتی تھی۔ طوفان بہار کے جھونکوں میں بدل جاتے تھے۔ اور جنگلی پھول کھلتے تھے اور فضا ان کی خوشبو سے مہکتی تھی۔ لیکن اب تو میری زندگی ایک صحرا ہے، چوٹیاں تو چیتنا کے ساتھ ہی چلی گئیں۔ اب نہ تو اس میں پھول ہی کھلتے ہیں اور نہ فضا ان کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ دن میں جھلس دینے والے بگولے جنگلی جانوروں کی طرح چنگھاڑتے ہیں اور رات کو اتنی شدت کی سردی پڑتی ہے کہ چٹانیں تڑخ جاتی ہیں۔

چیتنا کے پاس تو ایٹم کی شکتی ہے۔ اس نے اس طاقت سے دوبارہ چوٹیاں بنا لی ہیں۔ روس اور امریکہ تو مصنوعی سیارے جانے کب تک بنا سکیں گے لیکن چیتنا نے اپنے لئے ایک نئی دنیا تخلیق کر لی ہے۔ اور زندگی سے چھنی ہوئی روشنی، رنگینی اور مہک کو دوبارہ پا لیا ہے۔

لیکن میرے پاس ایٹم کی طاقت نہیں۔ اس لئے میری چوٹیاں دوبارہ نہیں بن سکتیں، ان پر اپسرائیں تھک کر آرام نہیں کر سکتیں اور ستاروں کے دیئے نہیں جل سکتے۔ میرے مقدر میں تو بس سامنے پھیلا ہوا یہ صحرا ہی ہے جس میں کوئی شاہراہ نہیں کوئی سنگ میل نہیں کہ سفر کی طوالت کو ماپ سکوں۔

چند لمحے کھڑکی میں کھڑا رہ کر میں نے یخ بستہ ہوا کے چانٹے کھائے اور محسوس کیا کہ نئے سال کا آغاز ہو چکا تھا اور میرا صحرا مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کئے، کپڑے پہنے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ بے پناہ دھند تھی اور اس میں ویسا ہی گیلا پن تھا جیسا برسات کے

موسم میں اونچی اونچی چوٹیوں پر چھائی ہوئی دھند کے ریوڑوں میں ہوتا ہے۔ میں اس راستے پر ہو لیا جو میرے گھر اور اس کے ساتھ ملحقہ دوسرے بہت سے گھروں کو سڑک سے ملاتا ہے۔ یہاں پہلے کوئی گھر نہیں تھا۔ ملک کے بٹوارے کے بعد ہی یہ تمام گھر بنے ہیں۔ یہ شہر کا بیرونی حصہ ہے جہاں کبھی اینٹوں کے بھٹے ہوتے تھے اور رات کو گیدڑ چیخا کرتے تھے۔ بٹوارے کے بعد بھٹوں کی آگ سے جلی ہوئی یہ زمین بھی آبادی کے قابل بن گئی ہے پہلے یہاں کچی اینٹیں پکتی تھیں اب لوگ بستے ہیں۔ پہلے یہاں سانچوں میں مٹی کو ڈال کر جلایا جاتا تھا اب لوگوں کے ذہنوں کو جلایا جاتا ہے۔ لوگوں کے آنگنوں میں لاکھ کوشش کے باوجود پھول نہیں کھلتے۔ جلی ہوئی مٹی میں پھول کھلیں بھی کیسے۔ بہت جتن کیے کہ مکان کے برآمدے کے باہر عشق پیچاں اور چنبیلی کی بیلیں لگاؤں، گلاب کے پھول اگاؤں، پٹیری اور سیوی پائس کے بیج ڈالوں۔ بہترین قسم کا کھاد بھی ڈالا۔ پودے اگے بھی، بڑھے بھی، لیکن جب پھول دینے کا وقت آیا تو ایکدم سوکھ گئے۔ جیسے کسی رشی کا شراپ ہو کہ اس دھرتی پر پھول نہ کھل سکیں گے۔ ایک ہی وضع کے بنے ہوئے یہ مکان دراصل مقبرے ہیں جن میں ایک ایک خاندان دفن ہے۔ اور ذاتی، معاشی، اقتصادی اور جنسی قیدی کی آگ میں جل رہا ہے، سلگ رہا ہے، چٹخ رہا ہے، لیکن دھواں باہر نہیں نکلتا۔ کوئی بیڑی نہیں چھنکتی، کوئی آہنی دروازہ نہیں چیختا۔

ایک خوفناک سناٹا۔

ایک مستقل خاموشی۔

جیسے کسی بڑے سے قبرستان کا کوئی کونہ اونگھ رہا ہو۔

قبرستان کے اس کونے کو سڑک سے ملانے والے راستے اور سڑک کے درمیان ایک گندہ نالا ہے جس میں سارے شہر کا گندہ پانی جمع ہو کر اس طرف جاتا ہے جہاں کم قیمت کے گھروں کی تعمیر کی سکیم عملی طور پر چالو ہونے والی ہے۔ اس نالے پر ایک چھوٹا سا پل ہے، بڑا نازک اور کمزور اس پر سے کوئی گاڑی، چھکڑا یا کار نہیں گزر سکتی۔ البتہ سائیکلوں پر کوئی روک نہیں اور ان کے گزرنے سے کوئی حرج بھی نہیں ہوتا صبح کے ان لمحوں میں راستہ گندہ نالا اس کا پل اور سڑک سب دھند میں گھرے ہوئے تھے۔ میں نے پل پار کر کے جب پہلا قدم سڑک پر رکھا تو مجھے یوں لگا جیسے پیچھے سے کسی نے پکارا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا واہمہ ہو گا۔ میں سڑک پر آگے چلنے ہی لگا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ایک پلّے کی سی چیخ میرے کانوں میں پڑی۔ شاید اپنی ماں سے بچھڑا ہوا کوئی پلا سردی کے کارن چیخ رہا تھا۔ میں پل بھر کو رکا اور ہوا کا ایک تیز جھونکا میرے کانوں کو چھوتا ہوا گزر گیا اور چیخ اور

بھی واضح ہو گئی۔ لیکن وہ چیخ کسی پلے کی نہیں کسی نوزائیدہ بچے کی معلوم ہوتی تھی۔ میں پل کی طرف چلا۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ آواز پل کے نیچے سے آ رہی تھی۔ واقعی وہ چیخ ایک بچے کی تھی۔ میں پل سے نیچے اتر کر نالے میں آ گیا۔ دھند بہت تھی، کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن دھند سے اس اندھیرے میں چیخیں آگ میں تپے ہوئے تیز بھالوں کی طرح چمک رہی تھیں اور میں اس چمک کا سہارا لے کر پل کے نیچے نالے کے متعفن ترین حصے میں پہنچ گیا۔ میں نے تعفن اور بدبو کے حملے سے بچنے کے لئے ناک پر رومال رکھا ہی تھا کہ میرے پاؤں تلے کسی شے سے بری طرح لتھڑ گئے، میں گھبرا کر واپس مڑنے لگا۔

بھرپور تنگ و دو ——— تک آ کر بھی واپس جا رہے ہو؟

پک کر تیار ہو جائے ——— تھی؟

——— میں ارے دیکھ لیا تو کیا؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے

تو کیا یہ میرا اپنا ضمیر چیخا تھا۔

شاید۔

میں نے ارادہ بدل دیا۔ واپس مڑنے کے بجائے میں نے جیب میں سے ماچس نکالی اور دیا سلائی جلائی۔ دیا سلائی کی اس ہلکی سی روشنی میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ گندہ نالہ تو اچھا خاصا جہنم تھا اور پل کے نیچے کا یہ حصہ اس کا کوئی آخری کونہ۔ مجھ سے دو ہاتھ کے فاصلے پر ٹھنڈے پانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا پڑا دھاڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور باقی کا دھڑ ننگا تھا۔ میں نے ایک اور دیا سلائی جلائی اور اس کے اور قریب ہو گیا۔ گورا چٹا رنگ ٹھنڈے پانی میں پڑے رہنے سے نیلا پڑنے لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں پہلا قدم رکھتے ہوئے انسان کتنا مضطرب، بے چین اور ناآسودہ ہوتا ہے۔ وہ احتجاج کرتا ہے کہ اسے زندگی کی یہ شکل قبول نہیں۔ مرغی انڈوں میں سے بچے نکالتی ہے تو چوزے ایک دم پھدکنے لگتے ہیں جیسے وہ اس لمحے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ بلی کے بچے پیدا ہوتے ہیں تو خاموشی سے ایک دوسرے پر تھوتھنیاں ٹکائے پڑے رہتے ہیں۔ یہ ایک انسان ہی کی میراث ہے کہ جب پیدا ہو تو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخے اور جب مرے تو دوسرے اس کے لئے چیخیں۔ جیسے رونا انسان کی تقدیر ہے اور اس پر ہنسنا ستاروں کا مقدر۔

آسمان کی نیلاہٹ میں دھند کے پردے کے پیچھے صبح کا تارہ ہنس رہا تھا اور ادھر گندے نالے کی دوزخ میں ایک نیا انسان چیخ رہا تھا اور نئے سال کا پہلا سویرا ہوا کے تند جھونکوں کے ساتھ اس کا سواگت کر رہا تھا۔

میں اس کے اور زیادہ قریب نہ جا سکا کیونکہ آگے بہت ہی گندی اور گہری دلدل تھی اور میں اس میں پھنسنا نہ چاہتا تھا۔ میں دلدل سے سدا ہی گھبراتا ہوں جہاں ایک پاؤں اٹھانے پر دوسرا اس سے بھی زیادہ گہرا دھنس جاتا ہے۔ یہ میری کمزوری ہے۔ شاید یہی کمزوری ان کی بھی تھی جنہوں نے رات کی رت اس معصوم جان کو ماں کی گرم اور نرم چھاتی سے نوچ کر یہاں کتے کی موت مرنے کو پھینک دیا تھا۔ سماج کی اس سڑاند بھری دلدل میں وہ ایک عصمت لٹی دوشیزہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ تو کیا اب اس کی لٹی ہوئی آبرو واپس آ گئی تھی؟ کیا اس بے گناہ کے خون سے اس کی ماں کی عصمت کا داغ دھل گیا تھا؟

میں واپس جا رہا تھا اس راستے پر جو ان مقبرہ نما مکانوں کو سڑک سے ملاتا ہے اور اس بچے کی چیخیں قدم قدم پر میرا راستہ روک رہی تھیں۔ فضا میں گونجتی ہوئی وہ چیخیں گندے نالے کی سطح پر اپنی تصویر مرتسم کر رہی تھیں۔

"میں نیا انسان ہوں، نئے یگ کا فرمان کرنے آیا ہوں، میں ایک نئے دور کی تشکیل کروں گا۔ انسان کے ارتقاء کو ایک موڑ اور طے کرنے دوں گا"۔

لیکن نالے کا یہ پانی بہت ہی ٹھنڈا ہے اور ہوا کے جھونکے بڑے تیز ہیں اور پل کے نیچے مردہ جانوروں کی ہڈیوں اور غلاظت کے ڈھیر میں سے نکلتی ہوئی بدبو ناقابل برداشت ہے۔ اور یہ دلدل جس میں میرا ایک بازو اور ایک ٹانگ بری طرح پھنسے ہیں بڑی گہری ہے۔

اور تم ان سے ڈر کر واپس جا رہے ہو، اپنے مقبرے کی طرف تمہارے ہی مقبرے کی طرح ایک اور مقبرہ بھی ہے جہاں میں نے اپنے ------ کب سب موڑ طے کئے ہیں اور جس کی آخری منزل یہ متعفن نالا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ماں کی طرف کوئی انگلی اٹھائے۔ وہ بڑی نیک عورت تھی، بڑی معصوم اور پیاری۔ اس نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا۔ اس لئے آخر میں اس کا اپنا دل ٹوٹ گیا۔ یہیں کہیں میرا باپ بھی رہتا ہے۔ اس کی تصویر میری ماں کے ٹرنک میں کپڑوں کے بہت نیچے رکھی ہے۔ تم اسے ضرور پہچانتے ہو گے۔ کئی بار تم نے اسے اس پل پر سے گزرتے دیکھا ہے۔ شاید اب بھی اس پل پر سے گزرا کرے گا جس کے نیچے اس کی دی ہوئی ایک زندگی موت کے جبڑوں میں پس رہی ہے۔

میں اپنے باپ کا نام تمہیں نہیں بتاؤں گا۔
میں تمہیں اپنی ماں کا نام بھی نہیں بتاؤں گا۔
میں تمہیں یہ بھی نہ بتاؤں گا کہ میری ماں نے کن مجبوریوں کی بنا پر ایسا کیا تھا۔
لیکن اگر تم اس پل پر سے گزرنے والے لوگوں کو کسی روز غور سے دیکھو گے، ان کے

چہروں کا جائزہ لو گے اور ان کے قدموں کی رفتار کو پرکھو گے تو تم میرے باپ کو پہچان جاؤ گے۔ تمہیں اس کی وحشتناک آنکھوں میں میری چیخوں کے نقش صاف نظر آئیں گے۔ تم اس کی پیشانی کو دیکھو گے تو اس پر میرا نام کندہ نظر آئے گا۔

اور اگر تم اپنے اپنے آنگنوں میں کھڑی چارپائیوں پر لیٹی نڈھال عورتوں کو دیکھو گے تو تم فوراً میری ماں کو پہچان لو گے۔ اس کے زرد چہرے پر میری ہی تصویر کا عکس ہے۔ اس کی نم آلودہ گہری آنکھوں میں میرا ہی کرب ہے۔ اس کی لرزتی ہوئی کمزور انگلیوں میں میرے ہاتھوں کا لمس ہے جنہیں پکڑ کر وہ مجھے شاہراہِ حیات پر کھڑا کرنا چاہتی تھی اور جس نے مجھے سفر کی ابتدائی منزلوں پر اپنے سے الگ نہ کیا۔ یہ احساس کہ مر کر وہ شخص کسی کی تصویر کے رنگ سے نکل کر اس کے دل میں جلوہ ریز ہے۔ اس کے ساتھ ہو گا اور سب ساتھ ہونے سے وہ سب کا مقابلہ کر سکے گی۔ کوئی اس کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکے گا۔ لیکن اب اس کی طرف بھالے اٹھ سکتے تھے کیونکہ وہ شخص کہیں بھاگ گیا تھا اور اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔

ان بھالوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت میری کمزور اور نڈھال ماں میں تو شاید تھی لیکن ان لوگوں میں نہیں جن کے رحم و کرم پر وہ اب تھی۔ وہ اس کے ماں باپ تھے اور جب میں پیدا ہوا تو اس کی ماں یعنی میری نانی نے مجھے اپنی چادر میں لپیٹا، میرے منہ میں روئی ٹھونسی اور رات کے سیاہ گھنے اندھیرے میں نالے میں پھینک دیا۔ پھینکتے وقت زور کا جھٹکا لگنے سے میرے منہ میں ٹھنسی ہوئی روئی باہر نکل گئی اور جب دلدل میں گرتے ہوئے میرے ہونٹوں سے پہلی چیخ نکلی تو وہ یوں بھاگی جیسے کسی بھوت نے اس کا دوپٹہ پکڑ لیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا رستے پر چل رہا تھا اور اس کی چیخیں دور ہونے کی وجہ سے مدھم ہوتی جا رہی تھیں

"میں یہاں پڑے ہوئے بھی اپنی ماں کی حالت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو نئی زندگی کی تخلیق کے چند ہی لمحے بعد ایک بند کمرے میں بالکل اکیلی پڑی تھی اور اس لمحے کو یاد کر رہی تھی جب اس نے پہلی بار اپنی عصمت کا گلا گھونٹا تھا۔

مجھے گھر سے نکال دیا گیا ہے، لیکن پھر بھی وہ میرا گھر ہے۔ میری ماں کا گھر۔ دیکھنا میرے گھر کی طرف کوئی آنکھ نہ اٹھائے۔ اس گھر کے آنگن میں وہ نرم اور گداز چھاتیاں ہیں جن میں وہ دودھ ہلکورے لے رہا ہے جنہیں میرے ہونٹ چھو بھی نہ سکے اور جو اب ہمیشہ جوالا مکھی کی طرح سلگتی رہیں گی۔

اور جب کبھی میرا باپ واپس آئے اور اس پل پر سے گزرے تو اسے روک لینا اور یہ

جگہ دفنانا جہاں میں اب پڑا تڑپ رہا ہوں۔ اسے بازو سے پکڑ کر اور گھسیٹ کر یہاں لے آتا اگر وہ چیخے اور چلائے تو وہ روئی کا گولہ جو میرے منہ سے نکل کر ادھر جھاڑی میں اٹک گیا ہے۔ اس کے منہ میں ٹھونس دیتا کہ وہ چیخ نہ سکے"۔

اور پھر چیخوں کی وہ گونج ایک دم بند ہو گئی۔

تب چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر پل کی طرف دیکھا جو گندے نالے کے تعفن کو ڈھانپنے کے لئے ایک ڈھکنے کا کام دے رہا تھا۔

ایک نیا یگ مر گیا تھا۔ ایک نیا دور فنا ہو گیا تھا۔ ایک نیا زمانہ اجڑ گیا تھا۔

صدیوں سے جلی ہوئی مٹی میں ایک کونپل پھوٹی تھی۔ ایک کلی چٹکی تھی، ایک پھول مہکا تھا لیکن صحرا کے بگولے اسے نگل گئے تھے۔

صبح کے آثار ہویدا ہو رہے تھے۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا تھا۔

اور گندہ نالا ایک بڑے اژدھے کی طرح پھن پھیلائے اسے گھور رہا تھا۔

ید بیضا

کوثر چاند پوری

بوڑھا خان کھپریل والے کچے اور نمناک مکان میں پڑا [illegible] رہا تھا [illegible] قوت تحلیل ہوتی محسوس ہو رہی تھی اور پورا جسم کھانسی کے شدید جھٹکوں سے زیر و زبر ہو رہا تھا، چت پڑے لیٹے سے وہ پلنگ پر پڑا اسی طرح کھانس رہا تھا، اس کے جاہ و جلال کا سورج جو بائیس سال سے بارہ [illegible] دوں تک چمکتا تھا اب گہنانے لگا تھا، پہلے جو لوگ آتے جاتے خالی چوپال کو بھی جھک کر سلام کیا کرتے تھے، اب چھاتی تانے پٹھان بابا کے گھر کے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور صرف کنکھیوں سے اُدھر کو دیکھ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، پٹھان بابا تین بیٹوں اور کئی لڑکیوں کا باپ تھا لیکن یہ ساری اولاد دوغلی تھی، آدھی ہندوستانی اور آدھی ولایتی، پٹھان بابا مردان کی طرف سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں آ کر اس نے ایک چمارن گھر میں ڈال لی تھی۔ اسی کے بطن سے یہ اولاد پیدا ہوئی تھی، پٹھان بابا کبھی کبھی اپنے بڑے بیٹے حمزہ خاں کی کسی غلطی پر خفا ہو کر کہا کرتا تھا۔

”لالہ تیری تو وہی مثل ہے کہ ماں ٹینی باپ کلنگ، پٹھانی کی کوکھ سے جنم لیتا تو شیر کا بچہ شیر کہلاتا۔“

مگر حمزہ خاں کی ماں پٹھانی ہی کہلاتی تھی اور بہت بڑے گھیر کی شلوار پہنتی تھی وہ پشتو نہیں بول سکتی تھی لیکن پٹھانوں کے لہجہ میں باتیں کرنے لگی تھی، اور دانت صاف کرنے کے لیے اخروٹ کی چھال چبایا کرتی تھیں، پٹھان بابا کے تینوں بیٹے جوان ہو چکے تھے اور کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگے تھے، لیکن ان کا وہ رعب داب نہ تھا جو خان بابا نے قائم کر لیا تھا۔ گاؤں کے جو کساں پٹھان بابا کے قرض دار تھے وہ اس کی بیماری سے بہت مطمئن تھے، غازی کھیڑے میں بھی ایک قسم کا سکون تھا، مہینوں سے پٹھان بابا کی گالیوں کی گونج نہ سنی گئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب کبھی نہ سنی جائے گی وہ کتوں، بلیوں، مرغیوں اور بیلوں کو بھی گالیاں دیا کرتا تھا اور یہ گالیاں بالکل وہی ہوتی تھیں جو آدمیوں کو دی جاتی تھیں، وہ آدمیوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ کرتا تھا، دیہات میں اس کی یہ پالیسی بہت کامیاب تھی، جانوروں

ہو ڈارلنگ سنا؟

لال جواب ! "پھر، چانک اسے پروفیسر کا خیال آ گیا۔" ۔۔۔ فیسر !" آ بھائی تم بھی لال جواب کو دیکھ لو۔"

"ٹھہریئے !" بڑا میاں کہنے لگا۔ "ادھر بائیں طرف آ جایئے"

ہم سب اس کے پیچھے پیچھے چل کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"اب سامنے دیکھئے !"

ہماری نظریں دوڑ کر سامنے دروازے کے اندر جا گھسیں اور پتھر کے بچار سے پتھرا سی گئیں۔

اب کے پھر ہم مہاتما بدھ کے ایک دیو قامت بت کے سامنے کھڑے تھے۔

مہاتما بدھ اپنی آنکھیں کھولے سمادھی میں بیٹھا تھا پتھر میں زندگی تڑپ رہی تھی۔ ب مہاتما ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اب فکر مند نظر آنے لگا تھا اور اب جیسے اس کی آنکھوں سے نرم روشنی پھوٹ کر ہماری طرف آ رہی ہو، ہم تک اس روشنی کی ایک لکیر سی بن گئی ہو، اور اب جیسے مہاتما ہماری طرف بڑھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے کا ارادہ کر رہا ہو! ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جیسے ہماری کوئی شخصیت نہ ہو، ہم پتھر کے مجسمے ہوں اور وہ مجسمہ زندہ انسان ہو، جیسے ہم اسے نہیں دیکھ رہے بلکہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے

"کیسا ہے پٹھان بابا؟"

"کوئی ڈاکٹر یا حکیم آیا تھا؟"

"کیسا بخار ہے کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہڈیوں سے چپک کر رہ گیا۔"

"پٹھان بابا کو بڑے ہسپتال میں داخل کر دینا چاہیے۔"

اندری کسان بالکل اس انداز سے کہتا جیسے کسی ناواقف شکاری کو مشورہ دے رہا ہو کہ اپنے مارے ہوئے شیر کی کھال گاؤں کے چماروں سے نہ اُدھڑوائے بلکہ شہر جا کر کھالیں پکانے والے کارخانہ میں ڈال دے۔

عجب خاں ولایتی بہت گورا چٹا نوجوان تھا اور اس کے رخسار قندھاری انار کے چھلکوں کی مانند لال لال گول تھے، ان کے گرد کالی داڑھی کی سیاہ گوٹ بہت ہی دلکش نظر آیا کرتی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے افریقہ اور کسی کیمونسٹ ملک کی سرحدیں آپس میں مل گئی ہیں، عجب خاں دیکھنے میں پٹھان بابا کے لڑکوں سے زیادہ حسین تھا۔ وہ سب نوکر اور یہ ان کا آقا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسانوں کے پاس بیٹھ کر بڑے اطمینان سے کہتا۔

''پٹھان بابا کے تھوک میں خون آنے لگا ہے۔''

''خون؟'' ------ نرائن داس درن کش تیوری چڑھا کر تعجب سے کہتا جیسے ساتھیوں سے کہہ رہا ہو شیر زخمی ہو گیا اس کے گولی لگ گئی۔

عجب خاں چوپال میں بیٹھے کسانوں کی آنکھوں میں جھانک کر ان کے اندرونی جذبات کا اندازہ کرتا اور ان میں پٹھان کی طرف سے خوف اور نفرت کا میل دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ ان کے سامنے اپنے اندرونی ارادہ کا بھی اظہار کر دے مگر اس کے ہونٹ سل جاتے اور وہ آپ ہی آپ سہم جاتا جیسے سوات میں بانڈی سے دور دیر کی کسی پہاڑی ڈھلوان پر بندوق چل گئی ہو۔ اس علاقے میں رائفل کی آواز بڑی بھیانک محسوس ہوا کرتی تھی۔ عجب خاں چپ چاپ زمین پر اپنی ہتھیلی رگڑتا رہتا جیسے بہت زور کی کھجلی ہو رہی ہو لیکن یہ کسی روپیہ ملنے کی علامت نہ تھی کسی اور ہی بات کا نشان تھا۔ کیونکہ روپیہ تو اب اسے ملتا ہی نہ تھا کبھی کبھی عجب خاں کے گالوں کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ گلاب کے شاداب پھول گیندے کے پھولوں میں تبدیل ہو جاتے اور اس کے ہونٹ کانپنے لگتے جیسے وہ کلمہ طیب ان سے تکرار رہا ہو لیکن وہ منہ سے کچھ نہ کہتا سے کمال تیری طرف پتھر پھینکنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔ عجب خاں پٹھان بابا ہی کے دیس کا رہنے والا تھا۔ دونوں میں دور کی رشتہ داری بھی تھی وہ غازی کھیڑے میں اپنی خوشی سے نہ آیا تھا بلکہ پٹھان بابا زبردستی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ عجب خان مردان چھوڑ کر اپنے چچا کے پاس چارسدہ چلا گیا تھا جب وہ کسی مسعودی کی گولی کا شکار ہو گیا تو عجب خاں پشاور ہوتا ہوا ہندوستان آ گیا اور دیہات میں گھوم پھر کر ہینگ اور تخم حیات بیچنے لگا۔ ایک دن اچانک پٹھان بابا اسے مل گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ذہن میں پرانی روایات ابھریں۔ وہ دیر تک سوچ کیے کہ ایک دوسرے سے کتنے آدمیوں کے خون کا انتقام لینا ہے۔ ان کے خاندانوں میں، صدیوں سے دشمنی چلی آ رہی تھی جس نے رشتہ داری کی لکیروں کو انتقام کی سرخی سے ڈھک دیا تھا عجب خان بدلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ آزاد قبائل کے کسی درے میں بھی مڈبھیڑ ہوئی ہوتی تو وہ کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتا لیکن پٹھان بابا کے خون میں ابھی انتقام کی گرمی باقی تھی۔ وہ اکثر برسات کی کالی راتوں میں پٹھانوں کی لڑائیوں کے واقعات دہرایا کرتا تھا، اور اپنے دادا جہاں خاں کی موت کا حال بیان کرتے وقت اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔ وہ آج بھی سیمندیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا آرزومند تھا۔

عجب خاں کو معلوم تھا کہ غازی خاں، پلنگ خاں کا اکلوتا بیٹا اپنا دیس چھوڑ کر بہت مالدار ہو گیا ہے، لیکن وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ غازی کھیڑے میں آ کر عجب خاں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پٹھان بابا کے قبضہ میں ہزاروں بیگھہ زمین تھی جس میں مناسوں غلہ پیدا ہوتا تھا وہ سود پر روپیہ بھی چلاتا تھا اور کسانوں کو اناج بھی تقسیم کرتا تھا جو فصل پر دوگنا ہو کر لوٹ آتا تھا۔ پورے علاقہ پر اس کا اثر تھا۔ تحصیل اور تھانہ کے

اہل کار اور افسر اسی کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ ان [illegible] اور مرغوں سے ان کی تواضع کیا کرتا تھا' عجب خاں نے بہت چاہا کہ یہاں سے چلا جائے اور اپنے اسی دھندے کو چلاتا رہے مگر پٹھان بابا نے اسے یہیں رہنے پر مجبور کر دیا' اس نے عجب خاں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

عجب خاں' ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں' دشمنی تمہارے باپ دادا سے تھی' [illegible] بدلہ لیتے تم میرے مقابلے کے نہیں ہو' اگر چاہتا تو قسم [illegible] تھے [illegible] سے اڑا دیتا اور پٹھان بابا کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن میں [illegible] چلاتا ہوں کیڑوں پر نہیں

عجب خاں بظاہر مطمئن ہو گیا مگر وہ پٹھانوں سے [illegible] انتقام [illegible] وہ غازی کھیڑے میں رہ پڑا اور کھیتی کرنے کا [illegible] وہ کیا۔ ایک رقبے [illegible] تحصیل میں [illegible] خان بابا نے اسے منظور نہ ہونے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عجب خاں [illegible] اس کا محتاج [illegible] جس طرح اور بہت سے نوکر ہیں وہ بھی اسی حیثیت سے رہے۔

پٹھان بابا نے تینوں لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ عجب خاں کو میں نے صرف اس لیے نوکر رکھ لیا ہے کہ زہر شیشی ہی میں بند رہے' اور خطرہ ہر وقت پیش نظر رہے تاکہ میں اس کی طرف سے چوکنا رہوں' تم لوگ بھی اس سے ہوشیار رہنا' سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے' وہ میسندی ہے اور ہماری اس سے پشتینی لاگ ڈانٹ ہے لیکن اس کے بیٹوں نے جو خود پٹھان بابا کی نظر میں بدنسل تھے ان باتوں کو بالکل اہمیت نہ دی' ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ وہ امن وامان کی فضا میں پٹھانوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے' وہ ہل چلانا جانتے تھے' گولی بارود سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے' پٹھان بابا اپنی جگہ ہر طرح سے ہوشیار تھا' وہ ایک منٹ کے لیے بھی غافل نہ تھا' اور عجب خاں کی نقل وحرکت پر کڑی نگرانی رکھتا تھا' اس کی بیٹیاں عجب خاں سے بہت گہرا پردہ کرتی تھیں' پھر بھی عجب خاں جانتا تھا کہ بڑی لڑکی مہر النساء کی ایک آنکھ چیچک میں بیکار ہو چکی ہے' اس کے منہ پر گہرے گہرے نشان ہیں اور منجھلی فیروزہ زریں بہت حسین ہے وہی اس غازی کھیڑے کی رونق اور آب وتاب ہے اور سب سے چھوٹی زرنگاریوں تو غنیمت ہے' مگر توتلی ہے۔

فیروزہ زریں سے اس کی صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی' وہ اپنے پھوپھی زادے میں شاہ توت توڑنے گئی تھی' واپسی میں ایک بہت بڑا سانپ مل گیا تھا' وہ سہم کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی' سامنے سے عجب خاں آ گیا تھا اور فیروزہ زریں نے چیخ کر کہا تھا!

پٹھان سانپ ہے!

عجب خاں نے پہلے غور سے فیروزہ زریں کی طرف دیکھا تھا پھر کہا تھا۔

میں جانتا ہوں میرے اور تمہارے بیچ میں بہت زہریلا سانپ ہے۔

اور پھر اس نے سانپ کا سر کچل دیا تھا۔

ابھی اسے وہاں آئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ پٹھان بابا بیمار پڑ گیا۔ شروع میں معمولی جاڑا بخار آیا پھر کھانسی رہنے لگی، دھیرے دھیرے بخار جم گیا اور کھانسی نے جڑ پکڑ لی۔ پٹھان بابا کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہ بہت تجربہ کار اور جہاندیدہ تھا۔ اور اپنی بیماری کے انجام سے واقف تھا۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ٹی بی ہو گئی ہے اور یہ بڑی خطرناک بیماری ہے، سانس اور تھوک سے اس کی چھوت تندرستوں تک پہنچ جاتی ہے، پٹھان بابا بڑے دل گردے کا آدمی تھا، وہ بالکل بدحواس نہ ہوا، نہ ڈرا نہ گھبرایا، اور اس نے گھر کے انتظامات کرنے شروع کر دیے، زمین تقسیم کر کے وصیت نامہ لکھا اور لڑکیوں کی شادی کے متعلق سوچنے لگا، ایک دن اس نے عجب خاں کو بلا کر کہا۔

عجب خاں تم اب جا سکتے ہو میں تمہیں نوکری سے الگ کرتا ہوں۔

جی بابا! اس نے سر جھکا کر جواب دیا اور باہر چلا گیا اور سوچنے لگا کہاں جائے، شکاری پر اکھاڑ کر کہتا ہے کہ اب اڑ جاؤ، اور پرندے کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پنجرے سے نکلنا ہی نہیں چاہتا۔ اسی دن پٹھان بابا نے آئینہ میں اپنا منہ دیکھا، اس کے گال مرجھا گئے تھے، وہ سرخی غائب ہو گئی تھی جو اسی عمر میں بھی جھلکتی رہتی تھی، اسی وقت اسے عجب خاں کے رخساروں کی سیب کی سی سرخی یاد آئی۔ وہ جھپٹا اور دیوار سے لگی رائفل کو زمین پر ڈال دیا جیسے وہ ناکارہ ہو گئی ہو، پھر وہیں پڑے پڑے اس نے عجب خاں کو آواز دی۔

عجب خان!..........او عجب خان!!

جی بابا!

اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں دن رات ہمارے پاس رہا کرو۔

جی بابا! عجب خاں نے پٹھان بابا کی پٹی کے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے پیالہ پر مکھیاں بھنبھناتے دیکھ کر مری سی آواز میں کہا جیسے یہ حکم آزادی کے حکم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہو۔

اور اس کے بعد وہ پٹھان بابا کے پاس ہی رہنے لگا وہی اسے کھانا کھلاتا اور ضرورت پڑتی تو پاؤں بھی دباتا۔ پٹھان بابا پہلے ہی بہت غصہ ور تھا۔ بیماری میں اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا اور عجب خاں کو مار دیتا۔ گالیاں تو ہر وقت ہی بکتا رہتا عجب خاں کا جی چاہتا کہ پٹھان بابا کی چھاتی تاک کر رائفل چلا دے۔ یا کوئی بڑا سا پتھر اس کے سر پر دے مارے تاکہ کھوپڑی ریزہ ریزہ ہو جائے اور وہ ہانڈی ہی پھوٹ جائے جس میں اب بھی انتقام کی کھچڑی پکتی رہتی ہے۔ مگر وہ نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو جاتا۔ ایک دن فیروزہ زریں گلاس میں دودھ لے کر آئی پٹھان بابا نے دو تین گھونٹ پی کر گلاس عجب

خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

لے تو پی لے عجب خان' مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔

عجب خاں بہت سٹپٹایا۔ اس نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ابھی ہونٹوں تک لے جانا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پردے کی جانب اٹھ گئی' وہاں فیروزہ زریں کھڑی تھی اور اسے دودھ پینے کو منع کر رہی تھی' عجب خاں جلدی سے بولا۔

''ابھی جی نہیں چاہتا پھر پی لوں گا۔''

''خنزیر!.......... سور کا پوتا!! وہ بگڑ کر بولا۔ ''پرہیز کرتا ہے' اگر چپ ہو کا مرے سامنے!''

عجب خاں ڈر گیا اور پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا' فیروزہ زریں گول گول سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی' جیسے اس روز کی طرح دونوں کے بیچ میں سانپ آ گیا ہو'

''عجب خان!'' پٹھان بابا بولا۔ ''تیرا باپ سمندر خان تمہمدی ایک غزے میں بیٹھ کھوں کر وزیری کی رائفل کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ گولی اس کے کان کے پاس سے سنسناتی نکل گئی تھی مگر اس نے سر تک نہ ہلایا تھا اور تو میرا چھوٹا دودھ پینے ہی سے ڈر گیا' ہیجڑا کہیں کا' میرا بیٹا بہادر خاں دو غلا ہے' مگر زمین پر کھڑا ہو کر شیر مارتا ہے۔''

پٹھان بابا کا پہاڑ ایسا ڈیل ڈول تیزی سے گھلتا رہا' وہ دن رات میں بیسیوں بلغم اگل دیتا جس میں چھٹانک دو چھٹانک کچھ لہو بھی ہوتا۔ عجب خاں محض اس امید پر اس کے مظالم سہہ رہا تھا کہ آخر وہ کب تک زندہ رہے گا۔ کسی دن اسی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے دم توڑ دے گا۔

پٹھان بابا کبھی کبھی موڈ میں ہوتا تو اسے اپنی پٹی کے قریب بیٹھنے کو کہتا۔

''مہمندی شیر میرے پاس آ جا' دیکھ تیرا دادا رضا خاں مہمندی بڑا بہادر تھا' وہ اکیلا رائفل کندھے پر رکھ کر پہاڑوں میں گھومتا اور جب کوئی ہوائی جہاز آسمان میں اڑتا نظر آتا تو رضا خاں تاک کر ایسی گولی چلاتا کہ جہاز ہوا میں ڈولنے لگتا' میرے دادا نے کئی بار اس کا مقابلہ کیا ہے' رضا خاں جتنا بہادر تھا اتنا ہی مکار بھی تھا۔ وہ چیتے کی طرح دشمن پر گھات لگاتا تھا ایک چٹان کی آڑ میں چھپ کر اس نے ہمارے دادا جبال خاں کے گولی ماردی تھی اور وہ گولی کھا کر بھی پچاس گز تک چھرا لے کر دوڑا تھا۔'' اور جب پٹھان بابا اس کے دادا رضا خان کو مکار کہتا تو عجب خاں کا جی چاہتا کہ اس کا گلا دبا دے' وہ مٹھی کھولتا اور بند کرتا' مگر اسی وقت فیروزہ زریں کی زلفوں کے وہ بال یاد آ جاتے جو اکثر ان کے ماتھے پر لہرایا کرتے تھے اور پھر اس کی وہ گول گول آنکھیں یاد آ جاتیں جن کی نیلی پتلیوں پر بادل سے چھائے رہتے' جیسے آسمان میں ربڑ کے گالے اڑ رہے ہوں۔ عجب خاں کی انگلیاں نرم پڑ جاتیں' اور اسے پٹھان بابا

پر ترس آنے لگتا' پٹھان بابا کے تینوں لڑکے جوان تھے' حمزہ خان تو فیر' معمالی تن و توش کا [illegible] خان اور اکبر خان اس کے جیسے ہی مانند موٹے تازے اور خمدار تھے لیکن وہ [illegible] میں سے [illegible] ڈرتا تھا۔ ڈرتا تھا صرف فیروزہ زریں کی آوارہ زلفوں کے بکھرے اور بادامی بالوں اور گول گول آنکھوں میں چمکتی ہوئی پتلیوں سے' جن میں کشمیری بنفشہ کے پھولوں سے زیادہ تازگی اور نیلاہٹ تھی' پٹھان بابا کو باتیں کرتے کرتے کھانسی اٹھتی اور وہ کروٹ بدل کر پیالہ میں بھری راکھ پر تھوکنے کی جگہ عجب خان کو حکم دیتا۔

"عجب خان ہاتھ پھیلاؤ"

عجب خان ہاتھ پھیلا دیتا اور پٹھان بابا اس کی ہتھیلی پر تھوک دیتا پھر اس کے چہرے پر نفرت کی لکیریں [illegible] لگتا' اور گرج کر کہتا۔

"عجب خان مردار!"

"مردار کا بچہ!"

عجب خان بری طرح پیچ و تاب کھانے لگتا اس کی رگوں میں خون کھول جاتا' لیکن فیروزہ زریں کا خیال [illegible] اس کے احساس میں ٹھنڈک بن کر دوڑ جاتا' وہ بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا نہ تو پٹھان بابا کو اس کی بیوی کا حق دے سکتا تھا اور نہ عاری تیزے کی ہواؤں اور وہاں کے نمازیوں کی سرزمین سے منہ موڑ کر بھاگ سکتا تھا' اب تو اسے اس گاؤں کی سرزمین سے ایک طرح کا پیار ہو گیا تھا' جس کو بزدلی بلکہ نامردی سے تعبیر کیا کرتا تھا' حالانکہ پیار اور بزدلی میں بڑا فرق ہے' زمین اور آسمان کا فرق وہ انھیں فاصلوں میں بھٹک جاتا' اس کی ہتھیلی بری طرح کھجاتی رہتی۔ کبھی اس میں شدت کی جلن ہونے لگتی۔ وہ سوچتا یہ جلن وہ تو نہیں جو موسیٰ کی ہتھیلی میں اس وقت ہوئی تھی جب اس نے انگارا ہاتھ میں اٹھا لیا تھا' نبوت بڑی نہ ہو مگر جلن ضرور ہے' اسے ایک جن اور ایک فرعون سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے' وہ دیر تک سوچ کے سمندر میں غوطے کھاتا رہتا۔"

پٹھان بابا کھپریل کی چھت کے نمناک کمرے میں پڑا گھلتا رہا۔ بخار اس کی ہڈیوں سے چمٹ گیا تھا اور اس کی گرمی اس طرح دھیرے دھیرے انھیں جلا رہی تھی جیسے بھس میں پڑی چنگاری سلگا کرتی ہے۔ پٹھان بابا کو یقین ہو گیا کہ وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ مرتے وقت اسے اطمینان تھا کہ اس کا خاندانی دشمن عجب خان بھی جلد ہی اس کے نقش قدم پر چلے گا' اس نے عجب خاں سے ٹھنڈا انتقام لیا ہے' وہ دق کی چھوت سے بچ نہیں سکتا' اچھی زمین پر جو دانہ بویا جاتا ہے وہ اگتا ضرور ہے۔

ایک دن اس نے تینوں لڑکوں اور لڑکیوں کو کمرے میں بلا کر مدھم آواز میں حمزہ خاں کو مخاطب

کر کے کہا۔

'[illegible] یہ مت سمجھنا کہ میں گھر میں سانپ [illegible] جانتا ہوں میں نے اس طرح اس کا سر کچلا ہے کہ لاٹھی تو کیا ٹوٹتی آواز تک نہیں ہوئی۔' عجب خان [illegible] بھی ہو گیا ہے' میں نے اسے رائفل کی گولی سے نہیں مارا۔ اپنا چھوٹا [illegible] مرتبہ اس کی ہتھیلی پر تھوکا ہے۔

اس روز سب لوگ پٹھان بابا کے پاس ہی بیٹھے رہے' عجب خان [illegible] جرأت نہیں تھی' رات تک پٹھان بابا کی حالت بیحد نازک ہو گئی۔ سب لوگ رات [illegible] عجب خان ہی جاگتا رہا' رات بہت تاریک اور بھیانک تھی' غازی گھیرا گہری تاریکی میں [illegible] آسمان پر چنگاریاں سی بکھری ہوئی تھیں' رفتہ رفتہ وہ بھی بجھنے لگیں' اندر سے کراہوں کی [illegible] عجب خان چونک گیا پلنگ کے قریب فیروزہ دریں کھڑی تھی۔ وہ آہستہ سے بولی

''عجب خاں ہاتھ پھیلاؤ!''

اور جب اس نے ہاتھ پھیلایا تو فیروزہ دریں نے اپنے ہونٹ اس کی ہتھیلی پر [illegible]' عجب خان کو ایسا لگا جیسے ابھی ابھی رضا خاں نے گولی چلا دی ہے' اور وہ جیول خان کی چھاتی سے پار ہو گئی ہے۔ اس نے مٹھی خوب زور سے بھینچ لی اور اسے ڈر تھا کہ مٹھی کھل گئی تو ہر طرف چاندنی کھل جائے گی۔

گڑیا!

کنہیالال کپور

"بابوجی! یہ میری سہیلی یاسمین ہے"۔ آشا نے اپنی سہیلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ میں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر دیکھا، ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی، آشا کی ہم عمر۔۔ سبز رنگ کی شلوار اور قمیض پہنے میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"بڑی پیاری بچی ہے"۔ میں نے کہا۔ "یہ کس کی لڑکی ہے آشا"؟

"وہ جو نئے مسلمان بابو ہمارے پڑوس میں آئے ہیں نا۔۔۔ ان کی۔۔۔ یہ بھی تیسری جماعت میں پڑھتی ہے"۔

"شاباش"! میں نے لڑکی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بابوجی، یہ بہت اچھا گاتی ہے"۔

"واقعی"؟

"اس نے مجھے ایک گانا سکھایا ہے"۔

"بہت خوب"۔

"بابوجی، آپ میرے لئے گڑیا کب لائیں گے"؟

"کل"۔

"کل نہیں آج، آج شام"۔

"اچھا اچھا لا دوں گا، اب جاؤ یاسمین اور تم کھیلو۔ مجھے اخبار پڑھنے دو"۔ بڑی وحشت ناک خبریں آ رہی تھیں۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا۔ چھرے گھونپے جا رہے تھے۔ مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ عورتیں اغوا کی جا رہی تھیں۔ میں یہ خبریں پڑھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا۔ یہ کیا ہو گیا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کو؟ شریفوں کی طرح کیوں

نہیں رہ سکتے۔ عورتوں پر حملے، عورتوں کا اغوا، خیر یہ کلکتہ ہے۔ اپنے شہر میں ایسی باتیں نہیں ہو سکتیں۔ پنجابی زیادہ سمجھدار واقع ہوئے ہیں۔ وہ ان باتوں کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔ یہاں ہندو اور مسلمان شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ کلکتہ پاگل ہو گیا ہے۔ کاش وہ لاہور سے کچھ سکھتا!

''بابوجی! اس اتوار کو میں اور یاسمین گڑیا کا بیاہ رچا رہی ہیں۔ آپ دیکھنے آئیں گے نا۔۔۔ میری گڑیا دلہن بنے گی۔ یاسمین کا گڈا دولہا''!

''ہاں، ہاں ضرور دیکھنے آؤں گا''۔

یہ فساد کیوں ہو رہا ہے۔ یہ فساد کون کرتا ہے۔ دراصل ہم سب مجرم ہیں۔ ہمارے دلوں میں کھوٹ ہے۔ کہنے کو ہم ایک دوسرے کو بھائی کہتے ہیں۔ لیکن اصل میں دشمن سمجھتے ہیں۔ سینکڑوں سال اکٹھا رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکے۔ صدیوں سے گنگا بہہ رہی ہے لیکن اس میں کوثر کی دھارا کیوں نہیں مل سکی۔ شاید یہ دونوں الگ الگ بہنا چاہتے ہیں۔ شاید گنگا نے کوثر کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ شاید یہ کبھی نہیں مل سکتے۔ مگر کیوں نہیں مل سکتے۔ دونوں میں صاف شفاف اور پاکیزہ پانی ہے۔ پھر؟

شاہی محلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں کے صرف چند گھر تھے۔ اس محلے میں رہنے والے ہندو اور مسلمان بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان کا اصول تھا اپنے کام سے کام رکھو۔ یہی وجہ تھی کہ میں سید قربان علی قریشی سے جو میرے پڑوس میں تین مہینے سے رہ رہا تھا۔ ایک بار بھی ملنے نہیں گیا تھا۔ وہ شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پھر میں اسے کبھی ملنے کیوں نہیں گیا۔ لیکن وہ بھی تو مجھے کبھی ملنے نہیں آیا۔ شاید وہ بہت مصروف رہتا ہے۔ ممکن ہے اسے میرے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے میں اعتراض ہو، مگر کیوں؟

''بابوجی! آپ بہت بُرے ہیں''۔

''کیوں آشا''؟

''میری سہیلی یاسمین بیمار ہے اور آپ اسے پوچھنے تک نہیں گئے''۔

''یاسمین بیمار ہے؟ کب سے''؟

''پرسوں سے، اسے سخت بخار ہے، بے چاری بری طرح تڑپ رہی ہے''۔

''چلو میں ابھی چلتا ہوں''۔

اور آشا مجھے سید قربان علی قریشی کے گھر لے گئی۔ ''میرا نام کرشن لال کھنہ ہے''۔ میں نے اپنا تعارف آپ ہی کراتے ہوئے کہا۔ ''میں نیشنل کالج کا پروفیسر ہوں''۔

''آیئے آیئے، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، مجھے قربان علی قریشی کہتے ہیں، میں

سیکرٹریٹ میں ملازم ہوں، تشریف رکھیے"۔

"یاسمین کا کیا حال ہے"؟ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے، لیکن ابھی بخار گیا نہیں"۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں"؟

"ضرور ضرور، آیئے"۔

آنگن میں یاسمین ایک پلنگڑی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی ماں اسے پنکھا کر رہی تھی۔ یاسمین نے میری طرف مسکرا کر دیکھا پھر شرم سے اپنا منہ تکیے میں چھپا لیا۔

"انہیں سلام کرو بیٹی، یہ تمہیں پوچھنے آئے ہیں۔۔۔ اور ہاں۔ میں ان کا تعارف آپ سے کرانا تو بھول ہی گیا۔ زینب، یہ پروفیسر کرشن لال کہتے ہیں"۔

"آداب عرض! بھائی صاحب"۔

"آداب عرض"۔

"میں ان کی مسز کو تو جانتی ہوں، دراصل ہم عورتیں آپ مردوں کی بہ نسبت زیادہ سوشل واقع ہوتی ہیں۔ آپ تو مہینوں ایک دوسرے سے تعارف نہیں کرتے مگر ہم پہلے دن ہی کچھ اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ جب تک ہر روز نہ ملیں چین نہیں آتا"۔

"اچھا، تو آپ مسز کھنہ کو جانتی ہیں"۔

"بہت اچھی طرح، ابھی کل ان سے سویٹر کا ایک نیا نمونہ سیکھنے گئی تھی"۔

"اوہ، پھر تو گاڑھی چھنتی ہے"۔

"زینب بھئی"، سید قربان علی نے کہا "بھائی صاحب کو پان تو پیش کرو"۔

"نہیں نہیں رہنے دیجئے، آپ تو خواہ مخواہ تکلف۔۔۔"

"اجی پان کا کیا ہے، لیجئے نا۔۔۔ زینب پان لگاؤ"۔

"نہیں رہنے دیجئے"۔

"شاید بھائی صاحب کو ہمارا پان کھانے میں اعتراض ہے"۔ زینب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سید قربان علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں، اچھا لایئے پان"۔

زینب پان لگانے لگی۔ میں نے سید قربان علی سے کہا۔ "بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے، لیکن ہمت نہ۔۔۔

"جی ہاں، دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ آپ سے ملا جائے، لیکن آپ جانتے ہیں

سیکرٹریٹ میں کتنا کام رہتا ہے"۔

"اچھا آپ اور مسز قریشی اس اتوار ہمارے ہاں چائے پیجئے"۔

"پی لیں گے صاحب لیکن تنی کیا جلدی ہے، یاسمین اچھی ہو جائے تو کسی دن ضرور آئیں گے"۔

"یاسمین اتوار تک ضرور اچھی ہو جائے گی، کیوں یاسمین؟" میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھی ہو جاؤ گی نا"۔

"جی خیال تو ہے"۔

"اتوار کو ضرور اچھی ہو جانا"۔ آشا نے بہت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو گڑیا کا بیاہ کیسے ہو گا"۔

"ہا ہا"۔ سید قربان علی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ہاں جی، صورت تو اتوار کا ہی نکلا ہے"۔

"ہاں لیجئے بھائی صاحب"۔

"شکریہ"۔

اتوار کو یاسمین واقعی اچھی ہو گئی۔ مسٹر اور مسز قریشی میرے ہاں چائے پینے آئے۔ بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ مسٹر قریشی بھی موسیقی کے رسیا ہیں وائلن بجانے کا جنون ہے۔ دفتر سے آ کر گھنٹوں وائلن کا ریاض کرتے ہیں۔ مسز قریشی فسانے لکھتی ہیں۔ یاسمین کو گھر پر قرآن پڑھاتی ہیں۔ نماز کی حد سے زیادہ پابند ہیں۔ تھوڑا سا باغبانی کا بھی شوق ہے۔

اس کے بعد میں سید قربان علی قریشی سے کئی بار ملا۔ عام طور پر اتوار کے دن ہم مل کر پروگرام بناتے۔ کبھی راوی کے کنارے مجلس جمائی جاتی۔ کبھی جہانگیر کے مقبرے میں، قریشی صاحب کو شعر کہنے کا واقعی سلیقہ آتا تھا اپنے اشعار ترنم سے پڑھتے۔ کبھی کبھی جب موج میں ہوتے تو وائلن پر کوئی دھن چھیڑ دیتے۔ ان کے پاس متعدد اردو کے اخبارات اور رسائل ہوتے جو وہ مجھے اکثر پڑھنے کے لئے دے جاتے۔ جب کسی رسالے میں ان کی غزل چھپتی اس دن خوشی سے پھولے نہ سماتے رسالہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہتے "سب سے پہلے صفحہ بتیس ملاحظہ فرمایئے، خاکسار کی یک تازہ غزل چھپی ہے"۔

میں غزل پڑھنے لگتا۔ وہ میرے ردعمل کا انتظار کرنے لگتے۔

"کیسی لگی آپ کو؟"

"خوب ہے، مطلع کا تو جواب نہیں"۔

"مجھے بھی سطح ہی پسند ہے"۔

چھ مہینے کے عرصہ میں مسز کھنہ اور مسز قریشی یک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ جب میں کالج اور قریشی صاحب دفتر چلے جاتے۔ وہ عموماً یک ہی جگہ بیٹھ کر سویٹر بنتیں۔ رسائل کی ورق گردانی کرتیں یا سودا سلف خریدنے کے لئے ڈلی بازار جاتیں اکثر جب میں کالج سے لوٹتا، مسز کھنہ کوئی ردو کا ناول پڑھ رہی ہوتیں جو وہ نیب سے منگ کر لائی تھیں۔ یاسمین اور آشا کا یہ حال تھا کہ سکول سے آنے کے بعد ایک منٹ علیحدہ نہ ہوتیں۔ کبھی گڑیا کا گھر بنا رہی ہیں کبھی مل کر سوال نکال رہی ہیں اور کبھی منٹو پارک میں کھیلنے کے لئے جا رہی ہیں۔

ایک دن یاسمین نے مجھ سے کہا "چاچاجی! کل عید ہے، کل آپ چاچی جی اور آشا ضرور ہمارے گھر یں اور ہاں چاچا جی آشا شلوار پہن کر آئے، نہیں تو میں اس سے کبھی نہیں بولوں گی"۔

عید کی پارٹی بہت اچھی رہی۔ آشا اسی کپڑے کی شلوار پہن کر گئی جس کپڑے کی یاسمین نے پہن رکھی تھی۔ سویاں، پھل اور پان کھانے کے بعد یاسمین نے بتایا کہ اب وہ اور آشا مل کر ایک قوالی گائیں گی"۔

"اچھا بھئی سناؤ قوالی، دیکھیں تم کیسا گاتی ہو"؟

یاسمین فوراً اندر سے ایک چھوٹی سی ڈھولک اٹھا لائی اور اپنی ماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگی۔ "می اسے آپ بجائیے۔ ہمیں قوالی کے ساتھ تالی بجانی ہے"۔

اور دونوں نے مل کر گانا شروع کیا

زمانے میں چمکا ہے نام محمدؐ
محمدؐ محمدؐ محمدؐ محمدؐ

وہ دونوں بڑی اچھے لے میں گا رہی تھیں۔ ہم سب پورے انہاک سے سن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، سماں بندھ گیا ہے۔ قوالی کے اختتام پر دونوں کی آنکھوں میں خوشی کی غیرمعمولی چمک تھی۔

"کیسی رہی ہماری قوالی"۔ یاسمین نے پوچھا۔

"بہت اچھی، واقعی بہت اچھی، بھئی تم دونوں تو خوب گاتی ہو"۔

ستمبر ---- دسمبر ---- مارچ ---- مئی....

اور پھر یکلخت ایک دن لاہور میں قیامت آ گئی پُراشتعال تقریریں ہونے لگیں۔ بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ "اللہ اکبر" اور "ہر ہر مہادیو" کے نعرے فضا میں دہشت پھیلانے لگے۔

اخباروں کی سرخیاں پڑھ پڑھ کر لوگ بدحواس ہونے لگے۔

"بھاٹی گیٹ کے باہر تین ہندوؤں کے چھرا گھونپ دیا گیا"۔

"کراؤن سینما میں بم پھٹا، پانچ مسلمان مارے گئے"۔

"ڈبی بازار میں زبردست فساد، پولیس نے گولی چلا دی"۔

"آج شام سے کرفیو لگا دیا گیا"۔

ہر طرف خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ خون سفید ہو گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ خون ہی خون، اندھیرا ہی اندھیرا، انسانیت دم توڑ رہی تھی۔

مئی کی ایک دوپہر کو وہ میرے ہاں آیا۔ لمبا تڑنگا نوجوان۔ غریب سا نام تھا اس کا۔ وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا کام ہندو دھرم کی حفاظت کرنا تھا

"مجھے حفاظت کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔ "میں کافی محفوظ ہوں"۔

"آپ چاروں طرف سے مسلمانوں میں گھرے ہوئے ہیں"۔

"پھر کیا ہوا"؟

"مسلمان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں"۔

"مجھے ان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا"۔

"میں جانتا ہوں، قربان علی آپ کا دوست ہے، لیکن وہ آپ کو دھوکا دے گا"

دوسرے دن وہ پھر آیا۔ "سنا آپ نے، وہ جو اس محلے میں شام لال کلرک رہا کرتا تھا اسے کسی مسلمان نے چھرا مار کر ہلاک کر دیا"۔

تیسرے دن اس نے کہا۔ "اگر آپ کو چھرے یا پستول کی ضرورت ہو تو آپ مجھ سے لے سکتے ہیں"۔

"کس لئے"؟

"یہی، میرا مطلب ہے یہی ... مسلمانوں کو مارنے کے لئے"۔

"لیکن کیوں، انہوں نے میرا کیا بگاڑا ہے"؟

"آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں، وہ آپ کے بھائی بندوں کو مار رہے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ انہوں ....."

"میں کسی بے گناہ کو مارنا پاپ سمجھتا ہوں"۔

"پاپ تو میں بھی سمجھتا ہوں، لیکن ....."

"لیکن"؟

''پاپی کو مارنا پاپ نہیں۔ مجھے آپ کی طرح میں بھی 'اہنسا' میں یقین رکھتا ہوں کسی بے قصور کو مارنا میں پاپ سمجھتا ہوں، لیکن پاپی کو نہ مارنا اب نہیں بزدلی ہے''۔

''آپ سب مسلمانوں کو پاپی سمجھتے ہیں''۔

''بے شک''۔

''آپ عجیب آدمی ہیں''۔

وہ چلا گیا۔ اس سے بات چیت کر کے مجھے کوفت ہوئی۔ شام کو حسب معمول میں قربان علی کے گھر گیا۔ وہ ابھی دفتر سے واپس نہیں آیا تھا۔ زینب کچھ پریشان نظر آتی تھی۔ وقت کاٹنے کے لئے میں ایک رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ سات بجے کے قریب قربان علی آیا۔ وہ کچھ تھکا ہوا سا تھا۔ ''کیا بات ہے بھئی۔ آج بہت دیر سے آئے''۔

''کچھ نہ پوچھو۔ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لوگ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ اب اس شہر کا خدا ہی حافظ ہے''۔

''معاملہ کیا ہوا''۔

''ہمارے دفتر میں ایک بابو ہزاری لال ہیں، وہ دفتر سے واپس گھر جا رہے تھے کہ کوئن باغ کے نزدیک انہیں کسی نے چھرا گھونپ دیا، انہیں تانگے میں بٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔ اس کے گھر والوں کو خبر کی۔ ابھی سیدھا ہسپتال سے آ رہا ہوں''۔

''کیسی حالت ہے اب اس کی''؟ زینب نے پوچھا۔

''خیال تو ہے بچ جائے گا۔ ڈاکٹر کہتا تھا اسے خون کی ضرورت ہے، آٹھ اونس اپنا خون دیا، آٹھ اونس اور کا انتظام کر آیا ہوں''۔

''یا اللہ! وہ بے چارہ تو بچ جائے، ابھی ابھی شادی ہوئی تھی''۔

میں قربان علی کے گھر سے واپس آ کر ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ آشا کمرے میں داخل ہوئی۔

''بابوجی! ایک بات کہوں، ناراض نہ ہونا''۔

''کیا بات ہے بیٹی''؟

''آپ زینب کے گھر نہ جایا کیجئے''۔

''کیوں''؟

''اس کا ابا آپ کو مار ڈالے گا''۔

''تمہیں کیسے پتہ ہے''؟

"مجھے پتہ ہے اور بابو جی اگر وہ آپ کو پینے کے لئے پانی دے تو مت پیجئے گا"۔

"کیوں"؟

"یہ مسلمان پانی میں زہر ملا دیتے ہیں"۔

"تمہیں کس نے بتایا"؟

"سکول میں میری ہندو سہیلیوں نے"۔

"نہیں آشا، یہ غلط ہے، تمہاری سہیلیاں جھوٹ بولتی ہیں"۔

آشا کو یقین نہ آیا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں سوچنے لگا یہ زہر جو چھوٹی چھوٹی بچیوں کے دل و دماغ میں سرایت کر رہا ہے خدا جانے اس کا اثر کتنی پشتوں تک رہے گا۔

آشا اب یاسمین سے کچھ کھچی کھچی رہنے لگی۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتی۔ بڑی بے رخی سے پیش آتی۔ میں اور اس کی ماتا اسے لاکھ سمجھاتے لیکن اس کی تسلی نہ ہوتی۔ ایک دن میں اسے زینب کے پاس لے گیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بہن ذرا پانی پلانا، لیکن دیکھنا اس میں کہیں زہر نہ ملا دینا"۔

وہ حیران ہو کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ "ہائے اللہ! کیسی باتیں کرتے ہیں"۔

"بات یہ ہے بھئی کہ آشا سمجھتی ہے کہ تم پانی میں زہر ملا دو گی"۔

زینب کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آشا کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں ننھی منی کو زہر پلاؤں گی؟ اس سے پہلے میں یاسمین کا گلا کیوں نہ گھونٹ دوں، جیسی یاسمین ویسی آشا"۔

سولہ جولائی کی شام تھی۔ آسمان پر گہرے کالے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لاہور میں اب حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں کم ہوتی تھیں۔ کرفیو کے اوقات میں بھی کافی تبدیلی کر دی گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ قربان علی کو ساتھ لے کر آج لمبی سیر کی جائے کہ زینب گھبرائی ہوئی ہمارے گھر آئی۔

"بہن جی! آپ نے یاسمین کو تو نہیں دیکھا"؟

"نہیں"۔

"کہاں گئی وہ پھر، دو گھنٹے سے غائب ہے"۔

"یہیں کہیں ہو گی، چلو ذرا دیکھتے ہیں"۔

یاسمین کی سارے محلے میں تلاش کی گئی لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ زینب بہت گھبرا گئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ قربان علی تسلی دے رہا تھا کہ یاسمین ضرور مل جائے گی، لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا۔ آٹھ بجے تک یاسمین کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میں

اور قربان علی بھی گھبرا گئے۔ میں نے کہا کرفیو لگنے میں ایک گھنٹہ ہے، چلو منٹو پارک میں دیکھ آئیں''۔

منٹو پارک میں بالکل اندھیرا تھا۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ادھر ادھر کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم نے سارا منٹو پارک چھان مارا۔ لیکن یاسمین کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ہم راوی روڈ کی طرف گئے۔ گندے نالے کے پل کے پاس یکلخت ٹارچ کی روشنی میں زمین پر پڑی کوئی چیز دکھائی دی۔

یہ یاسمین تھی۔ خون میں نہائی ہوئی، اس کے پھول سے جسم میں کسی بے درد نے چھرا گھونپ دیا تھا اور پھر نکالا نہیں تھا، وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ قربان علی کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور سناٹے کو چیر گئی۔ ''ہائے میری بچی! ہائے میری یاسمین''۔ ہم اسے اٹھا کر گھر لائے۔ مسز قریشی نے ہمیں دور سے دیکھا، وہ چھاتی پر دوہتڑ مار کر بین کرنے لگی۔ قربان علی بیوی کو دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ساری رات ہم نعش کے پاس بیٹھے رہے۔ آدھی رات کے قریب میں نے بڑی مشکل سے زینب کو چپ کرایا اور کہا ''صبر کرو بہن، خدا کو یہی منظور تھا۔ روؤ نہیں، قرآن مجید کی تلاوت کرو''۔ دور کونے میں بیٹھی آشا سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ زینب قرآن پڑھتی اور آنسو بہاتی رہی۔

یہ ڈی اے وی کالج کا ہوسٹل تھا۔ ہزاروں سہمے اور گھبرائے ہوئے ہندو اس میں پناہ لے رہے تھے۔ ادھر ادھر ان کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ کرسیاں، کپڑے سینے کی مشینیں ریڈیو سیٹ، ہر شخص تباہ حال نظر آتا تھا۔ ہر انسان فریادی تھا۔ آسمان میں ساون کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ زمین پر آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہوسٹل کے کمرے، لان، کاری ڈور پناہ گزینوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور ابھی مشترکہ فوج کے جوان فوجی لاریوں میں شہر کے اندرونی حصوں سے ہندوؤں کو نکال کر لا رہے تھے۔ ہر شخص ایک نئی مصیبت کی داستان کا عنوان بن کر آتا تھا۔ کسی کا گھر جل گیا تھا، کسی کے خاوند کو چھرا گھونپ دیا گیا تھا۔

آشا اور اس کی ماتا کو ایک چھوٹے سے کمرے میں چھوڑ کر میں ہوسٹل میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے کافی لوگ ایسے بھی تھے جن کے ساتھ ان کے مسلمان ہمسایوں نے بھائیوں جیسا سلوک کیا تھا۔ لان میں گھومتے ہوئے سہسا مجھے

قربان علی یاد آیا۔ گھر سے چلتے وقت اس نے مجھ سے بغلگیر ہو کر کہا تھا "محمد صاحب ملک تقسیم ہو گیا، لیکن محبت تو تقسیم نہیں ہو سکتی۔ خدارا ہمیں بھول نہ جائیے گا"۔

مسز قریشی مسز محمد کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے آشا کو دو ریشمی فراک دیتے ہوئے کہا تھا۔ "میں نے یہ فراک یاسمین کے لئے سلوائے تھے، یاسمین نہ رہی، اللہ کو یہی منظور تھا، بیٹی یہ فراک تم پہن لینا"۔

میں انہی خیالات میں کھویا ہوا گم سم ایک ٹولی کے نزدیک سے گزر رہا تھا کہ یک لخت میری نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک مجمع کے درمیان کھڑا لیکچر دے رہا تھا۔ [illegible] اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "صاحب، یہ بات غلط ہے کہ مسلمان ہی چھرا گھونپ سکتے ہیں۔ ہمارا داؤ چل جائے تو کسر ہم بھی نہیں چھوڑتے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جولائی کی ایک شام کو میں روی روڈ سے سائیکل پر جا رہا تھا۔ دراصل میں گھر سے شکار کی تلاش میں نکلا تھا۔ چھرا میں نے تھیلے میں چھپا رکھا تھا۔ ایک پُل کے نزدیک میں نے چند لڑکیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کی جانب چھرا لے کر لپکا۔ ایک لڑکی کے سوا باقی سب بھاگ گئیں۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اور اس زور سے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپا کہ اس کی چیخ بھی نہ نکل سکی"۔

"لیکن تمہیں یہ کیا معلوم کہ وہ لڑکی مسلمان تھی"؟ مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مسلمان ہی تھی۔ اس کے بازو پر اس کا نام لکھا ہوا تھا، یاسمین"۔

مجمع میں کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دنیا غم و غصہ بھول گئے اور تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ اہنسا میں یقین رکھنے کے باوجود ان سب نے مل کر ایک چھوٹی سی معصوم بچیا کی ہتیا کر ڈالی۔

سمن پوش

مجنوں گورکھپوری

"شہید زخم شمشیر تغافل اجر ہا دارد"

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی۔ ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی، اور مبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اس پیکرِ جمال میں محو ہو گیا جو صفحۂ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا۔ گویا وہ کہہ رہی تھی "ٹھہرو! اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو"۔ اس کے رخسار گلابی تھے، بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے، اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم محویت سے چونکا۔ ایک لرزشِ خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ ناصری جو اپنا سامانِ نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا واپس آ گیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصری کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ میں غور سے مطالعہ کر

رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تصویر میں ایک ناقابلِ بیان چیز ہے جس کو کاغذ پر بجنسہٖ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذبِ نظر صورت سامنے تھی جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیاپوشیدہ تھی، میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ آخر کارخود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا۔ اور پھر قیامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ کی طرف سے جا رہا تھا، یکایک میرے قلب کی حرکت غیرمعمولی طریقہ پر تیز ہو گئی، میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا، مجسمہ کے پاس بنچ پر بیٹھی ہوئی کون پڑھ رہا تھا؟ وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس کے گلے میں وہی [illegible] کا ہار تھا جس کے ساتھ وہ بلاارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی جانب بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا، جسم کی نازک تھی، رنگ میں صاحب تھی۔ دوش تک وہ عریاں تھی، اس کی بلوری گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساڑھی میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے اور وہ ان کو برابرکرتی جا رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ ارضی کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا، مجھے حیرت ہوئی، اس لئے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لئے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا۔ کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظامِ عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علومِ جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے جس نے مجھ کو متشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب خلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی۔ اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں چند اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشان بنتا، لہٰذا میں

سے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے ”نگارخانہ“ میں دیکھ آیا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا صرف شادکامی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی مذتوں اور مختلف دلچسپیوں میں ”سمن پوش نازنین“ کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیئے، چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا، زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش، میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کیے ہوئے۔ رچسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا ”اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساڑھی زیب تن کئے ہوئے بیٹھی ہے“؟ وہی جس کے گلے میں ہار ہے“۔

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی اور سر ہلا کر جواب دیا ”نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے“؟

”بالکل سامنے“۔ میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا، ”آرچسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے“۔

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا۔ ”خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرچسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے“۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”کوئی عورت نہیں“۔ اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”شاید مجھ کو مغالطہ ہوا“۔ اور فوراً بحث بدل دیا، جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی دردمند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی۔ آج اس کے سامان آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک خوب صورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ رہ رہ کر اسی پُرمسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشا نہ ہونے دیتا تھا۔ جب تماشا ختم ہوا اور سب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ بھی اٹھی اور ساڑھی کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی ہجوم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر اس کی جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس

آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے"۔ کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے ازسرنو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے"۔ میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا لیکن یہ کیسی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لئے دکھ رہا ہے، خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو"۔

اسی کشمکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاندتا ہوا چل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری وحشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے، کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن ''سمن پوش'' اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اس کی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی اے کیا تھا اور اس دور تعطیل سے گزر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم و بیش ہر شخص کو گزرنا ہوتا ہے، یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم ایس سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز، اس لئے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جبکہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری

نی معنوی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر الناکیوں سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہرحال سائرہ کو میری طرف سے حسنِ ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا ور وہ جانتی تھی کہ زندگی کے بیشتر زحمت ناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا، وقت کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے فوراً سامان درست کر لیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

''جمال منزل'' واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی جو یک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا جس نے ایسے دیہات میں اس ''فردوسِ ارضی'' کو اپنے لئے تعمیر کرایا ہو گا۔ اس میں ذوقِ سلیم اور حسنِ لطیف کہاں تک رچ ہو گا۔ اس کے علاوہ ''جمال منزل'' سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا، چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لئے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیرمقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا ور پھر بھی ان کو میری نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسے کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شمیم نے کہا: ''تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لئے بے تاب ہو گے۔ اس کا نام ''جمال الدین'' تھا''۔

''جمال الدین''! میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈراما ''ہذیانِ محبت'' بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے ور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثرپذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا: ''آپ نے برا کیا، سہیل بھائی کے لئے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آ رہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحتِ شب سے بھی محروم کر دیا''۔

میں نے مسکرا کر کہا: "نہیں نہیں، قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو گیا"؟

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ اعلم کیوں قتل کر دیا، جمال الدین اس صدمہ کو زیادہ برداشت نہ کر سکا اور غالباً سال ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعر یوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں"

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجے سے تمسخر و استہزا پیدا ہو رہا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بھی بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا "شمیم! تمہاری گفتگو نے مجھے تو بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی، یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارۂ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے، تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو، بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کر کے کون سی نئی بات حاصل کی؟

اینکہ دل نام کردۂ ــــ بے مجاز

سوبہ ــــ پیش سگان کو انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور حیوانوں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلاف قلب (Pericardium) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے، مگر تم کو کیا کہوں بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہی خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ کارلائل نے اسی لئے ایسے لوگوں کا نام "منطق تراش" (Logic Choppers) رکھا ہے اسی لئے کسی چیز کی بات کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقاء کا سدباب ہو گیا، وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے

ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور جو ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، ورنہ آج میتھ کی

طرح یہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو "انسان" کہلاتی ہے"۔

میرے ہیجان کا دورہ شروع ہو گیا۔ میں انسان کا "جہلِ مرکب" نہیں برداشت کر سکتا۔ یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لئے جہاں سوئی سے کام لینا چاہیئے وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں۔ سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لئے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر اس کی بہن درمیان میں نہ بول رہی ہوتیں کہ "اچھا! اب بے کار بحث کو جانے دو ایک لطیفہ اور سنو یہ گانے والوں میں مشہور ہے کہ "جمال منزل" روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی کیا تھا، مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا ہے"۔

میں نے اپنے دل میں کہا: "نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ"۔ شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے، انہوں نے کہا: "مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا"۔

"غلط خیال ہے"، میں نے جواب دیا۔ "میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہو گا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا"۔

رات زیادہ جا چکی تھی ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا: "آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، خدا کے لئے آج کے مبحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا"۔

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "سائرہ! بچوں کی سی باتیں نہ کرو"۔ اور آ کر سیدھے بستر پر لیٹ رہا۔ نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا، گرمی کی سہانی رت تھی، پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے، میں اٹھ بیٹھا۔ شمیم نے کہا: "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں، یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے"؟

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کیے"؟ میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دیئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے: "تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی"۔

"ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی"۔ یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ باغ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا، قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے حسن تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ہرچند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے والا کوئی نہیں، تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریوں کی بھینی بھینی بو سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "چمن پوش" یاد آ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں ایک عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو"؟

"کوئی خاص بات نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا "اب آؤ تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں"۔ میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔ چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے، لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی۔ اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرے ایماء پا کر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے، مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا۔ اس لئے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا، اور زمانہ کی رگڑ نے نقوش کو کافی مٹا رکھا تھا۔ میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں، لیکن کچھ بس نہ چلا، شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا تاکہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا، آخرکار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید کا مزار" رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم، فونوگراف، تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کچھ لکھوں، مگر یہاں اس کی کوشش کرنا "بت پرستوں کے شہر میں نماز" کے لئے جہاد کرنے

سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کر لی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے۔ مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور اس کے کتبہ پر نظرثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرہ سے سگریٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ وہی! وہی ''کفن پوش''! اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا نہ ڈر اس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

''تم یہاں کس لئے آئی ہو''؟ میں نے آہستگی سے پوچھا: ''اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟''

اسی طرح اس نے پھر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''اس لئے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے''۔

''کیا تم سکون سے محروم ہو''؟

''یک قلم''۔ یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

''اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو''؟ میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی بیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ ''میرے لئے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لئے دعا نہیں کی۔ بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا''۔ اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

''تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا''؟ میں نے سوال کیا۔

اب ''کفن پوش'' قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا کہ اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں"۔ اس نے کہا "آپ میرا پورا فسانہ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنیئے! میں وہی ناہید ہوں جس کو مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے۔

"ہاں!۔۔۔۔"

"تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں"؟ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چکے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے۔ گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لئے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

"ذرا صبر کیجئے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں"۔ اس نے کہا۔ "میرا قاتل میرا شوہر ہے لیکن اس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا، جس کا مرتے دم تک اس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا ایسی محبت جس کی مثال اس دورِ مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھیے، وہ مجھ کو پوجتا تھا۔۔۔

آپ خاموش سنتے جایئے۔ میرے لئے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا، میرے دونوں جہان تیری آنکھوں میں ہیں۔ "جمال منزل" اس نے میرے لئے بنوائی تھی، اور میں! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات سب اس کی تجلیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے طفیل ملی ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرضِ اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں"۔

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے، وہ دم لینے کے واسطے رک گئی، میں بیخودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پارسی تھی یعنی آتش پرست"۔ اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان کرنا شروع کر دیا۔ "ور اکٹنگ میرا ذریعہ معاش۔ لیکن اگرچہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا، مجھے کسی سے بھی انس نہ ہوا تھا۔ جمال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں پپیہے کی سی دلدوز تاثیر تھی۔ سوز و

گداز اس کے خمیر میں تھا۔ وہ سراپا تصویر درد تھا۔ میرا میلان ٹریجڈی کی طرف تھا اس لئے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا"۔

وہ پھر ایک مرتبہ زبان تر کرنے کو رکی۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر سکے لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوئی"؟ اس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا، اس کا چہرہ اس کی واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

بالکل نہیں، میں اس کہانی کا مشتاق تھا"۔ میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے"۔ اس نے مسترحمانہ لہجے میں کہا:

"ورنہ آپ کا تو قب نہ کرتی"۔

ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے قالتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پرواہ ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل محو مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لئے وقف کر دی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا۔ میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اسی طرح دو سال گذر گئے۔ یکایک زمانے نے ایسی گردش کی کہ بات ہی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی، تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شیدا مشہور تھا، ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں آ کر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی، اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھیں مگر جمال اس کی ہوسناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا۔ شاعر یا صاحب فن انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے، وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گذرتی تھیں، اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر

اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی کبھی ہمت نہ کرے گا، اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے پیشاور جانا پڑا۔ رات کو آٹھ بجے جبکہ اس کی واپسی کا وقت تھا۔ میں اس کمرے میں جو اپنے کمرے کے متصل ہے، بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی۔ دفعتاً مجھے کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''روشنی تم نے کیوں بجھا دی؟'' میں سوال ختم کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا مگر کم بخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی۔ اس کے آنے میں تاخیر ہوئی، فیروز پھر میری سمت بڑھا، لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا۔ فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑایا تھا۔ جمال ''اُف! اُف!'' کرتا ہوا اپنے اسٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوشِ غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے مجروح شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا: ''دغاباز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے''۔ مجھ میں پندار ایسا تھا کہ ''دغاباز'' خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی برأت کے لئے ایک حرف بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیرمتوقع سرعت کے

ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور یہ ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا"۔

ناہید نے آنسو گرنے لگے۔ میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا:

"آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید ترین محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شیکسپیر کے مشہور ڈراما "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ "کاش! مجھے اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا"۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھی۔ چلتے چلتے اس نے کہا "ہاں! ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے، مجھے مار کر اسے تسکین نہ ہوئی تو اس نے میرے مزار کی روح پر یہ شعر کندہ کرا دیا:

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کر دیجئے:

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام گر بخود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اس پیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور جو "اسٹوڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے"۔ یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے صحن مزار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا "اسٹوڈیو" رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری، وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم

ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھو گی"۔

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے تسلیم کر لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار سے مانگ کی کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی۔ لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا تاہم میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا ادعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہو جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطق اپنے اصول، موضوع اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو مِل، اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔ اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباسِ نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

حُسن زن، حُسن ظن

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

"تم کو شاید یہ محسوس ہو گیا ہو گا کہ میں تم پر عاشق ہوں۔"

"ہاں پہلے ہی دن سے تم مجھ کو غور سے دیکھتے آرہے ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ تمہاری توجہ ضرورت سے زیادہ ہے

۔"

"میں بھی محسوس کرتا رہا کہ تم زیادہ سے زیادہ حسین ہوتی جا رہی ہو۔"

"پہلی نظر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو۔ میں نے غور سے دیکھا ہے کہ پہلی نظر میں جو اچھی معلوم ہوئی وہ غور کی نظر میں بری لگی اور پھر بری ہی لگتی رہی یہاں تک کہ اس سے دل ہٹ گیا مگر تمہارے معاملہ میں یہ نہیں۔ ہر بار ملاقات میں پہلے سے زیادہ اچھی معلوم ہوئیں اور اب تو ایسی اچھی معلوم ہو رہی ہو جیسی کبھی بھی کوئی نظر نہ آئی۔"

"اچھا تو معاملہ یہاں تک پہنچا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا" اور اسے ہنسی آگئی جس سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے اور میرے عشق کو کوئی چیز ہی سمجھ رہی ہے۔

اس ہنسی نے میرا منہ بند کر دیا اور میں نے اسے دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔ سڑک سنسانے کی تھی اوپر پہاڑی نظر آرہی تھی اور سڑک داہنے کو مڑ کر ایک کالونی میں جا رہی تھی۔ میں کبھی سڑک کے موڑ کو دیکھتا اور کبھی دزدیدہ نظر اس پر ڈالتا، اس کی ہنسی تو ختم ہو گئی تھی مگر چہرہ کھلا ہوا تھا اور آنکھوں میں شوخی کھیل رہی تھی۔

اس نے کچھ کہنے کے لئے کہا۔ "ہم اس موڑ سے واپس ہو جائیں گے۔"

"سڑک نہیں ہے تو کیا۔ ہم اس پہاڑی تک کیوں نہ چلیں۔"

"اور اگر پہاڑی کے اوپر بھی چلے جائیں تو کیا ہرج ہے۔"

"تم کبھی پہلے اس پہاڑی پر گئی ہو۔"

"کیوں نہیں بارہا، وہاں سے عجیب سماں نظر آتا ہے۔ ادھر دور پر سمندر موجیں مارتا تو نہیں نظر آتا مگر ہاں ایک سطح پانی کی سمجھ میں آتی ہے جو آسمان سے مل جاتی ہے اور ادھر سارا شہر عمارتوں پر عمارتیں لدی ہوئی اور ان کے درمیان بڑی بڑی عمارتیں جیسے قائداعظم کا مقبرہ۔ حبیب بنک کی بلڈنگ وغیرہ دلکش نظر آتی ہیں اور شام ہوتے ہی بجلیاں جل جاتی ہیں جوں

جوں اندھیرا چھاتا جاتا ہے، ووں ووں بجلیاں اور بھی روشن ہوتی جاتی ہیں۔ بالکل اندھیرا ہو جانے پر بس تارے سی تارے نظر آتے ہیں۔

میں اس سماں میں محو ہو کر اپنے کو بھول جاتی ہوں۔ مگر یہ سماں، روز نہیں دیکھنے کو ملتا، پہاڑی کافی دور ہے اور پھر اس پر چڑھنا بھی دقت سے خالی نہیں ہے۔

"اگر آج اس پہاڑی کے اوپر تک چلیں تو کیسا ہو۔"

"ہاں، یہی وقت ہے۔ شام ہوتے ہوتے پہاڑی کے اوپر پہنچ جائیں گے۔ شہر پر سے ہوتے ہوئے اور تارے نکلتے دیکھ لیں گے۔ تم اور ہم بالکل اکیلے ہوں گے اور واپسی پر یہاں بھی اندھیرا بہت چھا چکا ہوگا۔ ڈر تو نہیں لگتا؟"

"نہیں میں بہت دفعہ رات میں واپس ہوتی ہوں۔ ادھر کی بجلیوں سے گھر کا پتا چلتا رہتا ہے اور میں سیدھی چلی آتی ہوں۔"

"تو پھر کیا ہے۔ ادھر ہی قدم بڑھائیں۔"

O

وہ کسی طرح حسین نہیں کہی جا سکتی تھی اور سب سے پہلی ملاقات میں وہ مجھے حسین معلوم ہوئی تھی۔ کالا رنگ رات میں اتنا کالا نہیں معلوم ہوا تھا، مگر آنکھ، ناک اور چہرہ کی ساخت میں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جاذب نظر ہوتی۔ پھر دن کی روشنی میں دیکھا تو کافی ڈھلی ہوئی معلوم ہوئی، مگر اس میں ایک بات ہی تھی کہ وہ قریب سے قریب تر آئی تھی اور اس کے چہرہ کے نقائص مٹتے گئے۔ اس کے پاس جانے میں کوئی روک نہیں تھا بلکہ اس کے دل کے دروازے ہمیشہ پانوں پاٹ کھلے تھے، اور ہر وقت وہ مجھے ان میں داخل کرنے کو تیار تھی۔ یہ لگاؤ مجھے پہلے کسی عورت میں محسوس نہیں ہوا تھا اور اسی نے مجھے بے پناہ زور سے کھینچا۔ ہم دونوں مصروف تھے اور اپنے کاموں میں آٹھ بجے صبح سے دو بجے تک مشغول رہتے۔ ہمارے دفتر کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ضرور تھا مگر ہم ایک ہی بلڈنگ کے دو فلیٹوں میں رہتے تھے۔ اس کا فلیٹ میرے فلیٹ سے بالکل اوپر تھا۔ اس میں اس کے ساتھ ایک اور عورت اور ایک لڑکا رہتا تھا جو کسی طرح اس کے عزیز خاص تھے۔

دفتر سے آ کر دونوں آرام کرتے اور سہ پہر کی چائے کے بعد وہ سنگھار کیے ہوئے میرے فلیٹ میں اتر آتی۔ ہم دونوں شطرنج کھیلتے رہتے اور پھر ساتھ ٹہلنے نکل جاتے۔

اس کے چہرہ اور جسم کے نقائص ایک ایک کر کے غائب ہوتے گئے اور ان پر عجیب حسن چھاتا گیا۔ میں اس کے ساتھ شطرنج کھیلنے اور ٹہلنے میں زیادہ سے زیادہ محو ہوتا گیا اور دفتر میں کام کرتے وقت دھیان اس کی طرف جاتا۔ اور اس کا چہرہ ذہن کی آنکھوں کے سامنے صاف صاف کھنچ جاتا۔ سیاہ رنگ میں ایک خاص چمک آ جاتی۔ ناک کی اٹھان آسمان کی طرف لے جاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ منہ کا خط اور خاص طور پر مسکراہٹ سے اس کا کھلنا دل کو باغ باغ کر دیتا اور دل میں ہوک اٹھتی کہ اپنے دفتر کا سب کام چھوڑ کر اس کے دفتر جاؤں اور اسے دیکھنے میں محو ہو جاؤں۔

چنانچہ میں نے ایک دن ایسا ہی کیا اور وہاں جا کر عجیب سماں میرے سامنے آیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھی تھی اور متعدد لوگ

اس کے پاس آتے جاتے رہے۔ وہ ان سب سے نہایت بے باکی سے بات کرلی۔ ایک آدھ ہنسی مذاق کی بھی بات ہوئی اور پھر وہ چلے جاتے۔ میں کافی دیر بیٹھا رہتا مگر اس نے کہا۔ "ہمارا بوس بڑا بدماغ ہے اور مجھ سے تو خاص طور پر خفا رہتا ہے اس لئے اب تم چلے جاؤ۔ تو اچھا ہے اور اب یہاں آنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔۔۔"

جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو مجھے اس کے چہرہ پر ایک سختی محسوس ہوئی اور اس سختی کی وجہ سے اس کی شکل کے وہ سب نقائص جو میرے شدید عشق نے چھپا رکھے تھے ابھر آئے۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی اور اس کے پاس سے بھاگ آنا ہی اچھا معلوم ہوا۔

میں نے اپنے دفتر سے چھٹی لے لی تھی اب وہاں جانے کی بجائے میں نیٹی جیٹی کے پل پر پہنچا، اور وہاں پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے دل کو ایک شاک سا لگا تھا مگر یہ کچھ زیادہ نہیں تھا اس لئے کچھ ہی دیر کے بعد سمندر کی لہروں پر اس کا ہنسی سے شگفتہ ہوا چہرہ نظر آنے لگا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

میں خراماں خراماں ٹاور تک آگیا۔ یہاں بسیں آجا رہی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ پیرکھ جانے والی بس پر بیٹھ لوں مگر ٹاور کی گھڑی پر نظر گئی تو محسوس ہوا کہ ابھی جلدی ہے اور میکلوڈ روڈ کے بائیں فٹ پاتھ پر خراماں خراماں چلتا ہوا فریئر روڈ پر آگیا۔ یہاں صدر کو جانے والی ایک قریب قریب خالی بس پر لپک کر بیٹھ لیا۔ اور صدر میں ریگل کے بس اسٹاپ پر اترا۔ مجھے کسی چیز کو دیکھنے سے سروکار نہ تھا اور نہ کسی چیز کو دیکھتا تھا۔ میں اسی کے خیال میں گم تھا۔ اس کا ناراض چہرہ کافی ڈھلا ہوا نظر آیا تھا، مگر اب اس کا تصور رنگ سے بھر گیا تھا اور جو نقائص کچھ لمحوں کے لئے ابھرے تھے غائب ہوگئے تھے۔ اس کے چہرہ اور جسم کا ڈھلا پن پہاڑی ہی پر محسوس ہوگیا تھا مگر موقع اور وقت نے اور سب سے زیادہ جذبات کے سیلاب نے ان پر ایسا رنگ چڑھا دیا تھا کہ وہ دنیا کی حسین ترین چیز معلوم ہوتے تھے۔ دفتر میں اس کے رویہ نے اس حسین ترین تصویر پر پانی ضرور پھیر دیا تھا۔ مگر اب پانی اترنے کے بعد زیادہ روشن تصویر آنکھوں کے سامنے آئی تھی اور ناراضگی سے تنی ہوئی بھویں اور شکن دار ماتھا ایک بالکل نیا اچھوتا کرشمہ نظر آنے لگے تھے۔ میرے تصور کی تصویر اور بھی زیادہ دلکش ہوگئی اور اس کو ذہن میں لئے ہوئے میں پیدل اپنے فلیٹ کی طرف چلتا رہا۔

O

میں اس کے فلیٹ پر یہ سمجھ کر گیا تھا کہ اب وہ ضرور آگئی ہوگی اور کھانا کھانے کے بعد سو کر اٹھ بیٹھی ہوگی اور کچھ دیر شطرنج کھیل کر ہم ٹہلنے جائیں گے مگر فلیٹ میں پہنچتے ہی وہ عورت سامنے آئی جو اس کے ساتھ رہتی تھی وہ پہلے مسکرائی اور پھر زور سے ہنستی رہی۔

میں کچھ غصے میں واپس ہونے والا تھا کہ اس نے سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔۔ وہ تو آج شام کو بلکہ رات گئے آئے گی کیا معلوم رات بھر نہ آئے کیا معلوم رات بھر نہ آئے۔ مجھے تم پر ترس آتا ہے۔"

میں اس طرح صوفے پر گر گیا جیسے بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔ "تم بالکل جوان ہو تم پر مجھ کو ترس آتا ہے۔۔"

"میں آپ کے یہاں اتنے عرصے سے آ رہا ہوں۔ آپ کا اور ان کا کیا رشتہ ہے۔"

"وہ میری بڑی بہن کی لڑکی ہے۔ اس نے مجھے اپنے لڑکے کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا ہے۔"

"اس کا لڑکا۔؟"

"یہ لڑکا دیکھتے نہیں ہو۔ یہ اسی کا ہے۔ بارہ برس کا یہ ہے۔ تم اسے جوان سمجھ رہے ہو۔ تم سے بارہ یا پندرہ برس بڑی ہوگی۔ کاٹھی اچھی ہے اس لئے معلوم نہیں ہوتی۔ کالے رنگ کے لوگ بہت دیر میں ڈھلتے ہیں۔ تم اس کے پیچھے جان دے رہے ہو؟ میری ایک اور بھانجی ہے کالج میں پڑھتی ہے۔ اور اس کے ساتھ نکاح کر دو وہ تمہارے جوڑ کی ہے، رنگ بھی صاف ہے چلو آج ہی اس سے ملا دوں۔ تمہارے جوڑ کی رہے گی۔ یہ سب چکر چھوڑ دو بلکہ یہ آپ ہی آپ چھٹ گا۔"

بلڈنگ سے باہر نکل رہا تھا کہ وقار صاحب جو سب سے نیچے کے فلیٹ میں رہتے تھے ساتھ ہو لئے اور بس کر بولے "آج وہ تمہاری استانی ساتھ نہیں ہے۔"

"استانی؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں، وہ استانی ہی ہے تم کو اب تک کچھ معلوم نہیں۔ میں عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ سچ استانی تھی۔ ایک اسکول میں عرصے تک پڑھاتی رہی۔ پھر ملک سے باہر چلی گئی اور یہ لڑکا لے کر آئی۔ کہتی ہے کہ امریکہ میں ایک شخص سے شادی ہوئی تھی۔ وہ یہاں آنے کو نہیں کہتا تھا اس لئے لڑکا لے کر چلی آئی۔ اسکول کی نوکری چھوڑ کر اب ایک فرم میں نوکر ہے۔ مگر فطرت سے استانی ہی ہے تم ایسے نوخیز لڑکوں کی درس دیتی ہے۔ دو چار دن تمہیں درس دیا اب اور کوئی پنچھی مل گیا ہوگا اسے راہ پر لگا رہی ہوگی۔ مگر تم فکر نہ کرو، تم کو وہ چھوڑنے والی نہیں ہے اور تم بھی اسے چھوڑ نہ سکو گے۔ آج نہیں کل پھر ملے گی اور تم زندگی بھر اسی پر ریجھے ہی رہو گے۔ دیکھتے جاؤ گے کہ کتنے آئے اور کتنے گئے مگر تم بھی کبھی الگ نہ ہو سکو گے۔ ...... اچھا اب مجھے دھر جانا ہے۔"

وہ لپکتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف چلے گئے اور میں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا، میرے خیالات میں اب ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ تصویر میں اس کا چہرہ آیا تو کافی بدنما معلوم ہوا۔ مجھے کسی اور عورت کا تجربہ نہیں تھا اور اسی کے تجربہ کو میں عام سمجھ رہا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے بہتر بھی عورتیں ہیں۔ ہر معنی میں بہتر۔ میں بازار میں آیا جہاں بڑی بھیڑ اور چہل پہل تھی۔ کثرت سے عورتیں آ جا رہی تھیں۔ ہر عورت کو غور سے دیکھتا اور دل یہ کہتا۔ "یہ اس سے تو اچھی ہے۔ دو چار تو بہت زیادہ اچھی معلوم ہوئیں اور وہ ان کے سامنے وہ ڈھلی ہوئی معلوم ہوئی۔ میرے لئے اس کی طرح جوان بنی ہوئی اور حقیقت میں جوان عورتوں میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں تھی مگر پھر ایک یا دو عورتیں ضرور ایسی نظر آئیں جو صاف صاف اس سے چھوٹی اور باکرہ ضرور تھیں۔ ان ہی کا تصور لئے ہوئے میں گھر لوٹا۔

○

کافی رات گزر چکی تھی مگر میں نے اپنے فلیٹ کا دروازہ نہیں بند کیا تھا کہ، کدم سے وہ دندناتی ہوئی میرے فلیٹ میں

آئی اور نہایت بے باکی سے میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی۔ میرا یہ عالم ہوا کہ

گلہ کیسا وفورِ شوق میں جی نکلا پڑتا ہے قیامت کا اثر رکھتا ہے آنکھیں چار ہو جانا

میرے ذہن میں اس کا جو بدنما تصور قائم ہوا تھا وہ اک دم سے مٹ گیا اور اس کا چہرہ بالکل نئی طرح پر روشن ہو گیا۔

"نہیں خفگی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میں زندگی بھر تم سے خفا نہ ہوں گا۔ مگر جب سے تمہارا ساتھ رہنے لگا ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔

"یہ تمہاری غلطی ہے۔ ناتجربہ کاری۔"

"ہاں تم تو بڑی تجربہ کار ہو۔ استانی رہ چکی ہو اور اب بھی استانی ہی ہو۔

ہاں مجھے استانی ہی سمجھو میں تم کو اور تمہارے جیسے لڑکوں کو جنسی تربیت دیتی ہوں۔ نہ معلوم کتنے لڑکوں کو راہ پر لگا دیا۔ تم یہ سب ہی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جتنے جواں ہوتے ہو اتنے ہی دھوکے میں آتے ہو مگر جوں جوں بڑھتے جاتے ہو، تجربہ کرتے جاتے ہو وہاں دھوکے سے نکلنے کے زیادہ قابل ہوتے جاتے ہو۔ قوت فیصلہ، توازن وغیرہ جاتا ہے۔ میں اس راہ میں تم جیسے نوخیز لڑکوں کی مددگار ہوں۔" یہی میرا مشن ہے۔ میری خالہ اور سب ہی عورتیں اس بات کو نہیں سمجھتیں۔۔۔

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی تو میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم اور چہرہ کے نقائص جن پر زیادہ توجہ ہو گئی تھی ایک ایک کر کے غائب ہوتے گئے اور پھر وہ تنی ہی اچھی لگنے لگی جتنی پہلے لگی تھی، اور میں وارفتہ ہو گیا۔

یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ میری نہیں ہو سکتی اور وہ کسی ایک کی ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میرے ایسے مجھ سے کچھ بڑے یا کچھ چھوٹے نا معلوم کتنے اس کے پاس آتے اور وہ ان کے ساتھ سیر کرنے جاتی۔ ان لوگوں کے ساتھ جاتے ہوئے میں نے اسے بار بار دیکھا اور اس نے مجھ سے اس طرح منہ پھیر لیا کہ جیسے جانتی نہیں تھی۔ ایسے نہ معلوم کتنے موقعے آئے۔ پہلے پہلے مجھے برے لگے مگر پھر میں ان کا بڑی آسانی سے روادار ہوتا گیا اور ان لوگوں سے الگ ہو کر وہ نہایت درجہ تحمل کر مجھ سے ملتی۔ میرے فلیٹ میں بے باکی سے گھسی ہوئی چلی آتی۔ دروازہ بند کر دیتی اور میرے پاس مجھ سے مل کر بیٹھ جاتی۔ ہر بار وہ کچھ نہ کچھ زیادہ حسین معلوم ہوتی۔ سیاہ رنگ پر بڑی خاص رونق نظر آتی کبھی وہ مجھ سے بڑی اونچی معلوم ہوتی اور میں اس کے سامنے جھک جاتا کبھی وہ مجھ سے بہت زیادہ چھوٹی نظر آتی اور میں اس پر حاوی ہو جاتا۔ یہ عجیب بات تھی۔ اس کا چہرہ ہی وہ کرشمہ نہیں تھا جو مجھے سب کچھ بھلا دیتا تھا بلکہ اس کا سارا وجود ایک ایسا کرشمہ تھا جو حقیقت کی دنیا سے بہت دور ایک عجیب اور دلکش عالم کا نمائندہ معلوم ہوتا تھا۔ سوچنے لگا تھا کہ اس کے کثرت سے لوگوں سے تعلق سے کیا فرق پڑتا تھا اور لوگ اس کے پاس آتے تھے اور چلے جاتے تھے مگر میرے پاس وہ خود آتی تھی اور ہر پھیرے مجھے زیادہ سے زیادہ متاثر کر جاتی تھی۔

اس کی صورت کے وہ نقائص جن کو میں نقائص، سمجھتا تھا رفتہ رفتہ اوصاف میں تبدیل ہوتے گئے۔ پختہ سیاہ رنگ میں ایسی چمک آ گئی کہ مجھے گورے اور سانولے رنگوں سے نفرت ہوتی گئی۔ اس کا مخصوص ناک نقشہ ہی میرے لئے ایک ماڈل

ہو گیا جس سے میں دونوں کی صورتوں کو ملاتا ورنا قص پاتا۔ مجھے کیسے ہوئے جسم کی جوان لڑکیاں بھی دکھائی دیتیں۔ اس کی خالہ نے اپنی دوسری بھانجی سے مجھ کو ملوایا۔ یہ گورے رنگ کی چھوٹے قد کی بالکل جوان لڑکی تھی جو پہلے پہل مجھ سے بڑی شرمائی اور پھر کھلتی گئی اس کا امتحان قریب آیا تو میں اسے اس کے گھر پڑھانے جانے لگا۔ اس کا جسم اس کی خالہ زاد بہن کے ڈھلے ہوئے جسم کے مقابلہ میں بہت زیادہ دلکش نظر آتا۔ وہ مسکراتی بھی تھی مگر اس مسکراہٹ میں وہ بے باکی اور نکھار نہیں تھا جو اس کی بہن کے یہاں دل کے لئے مقناطیس کا کام کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں دونوں کی ہر چیز کا شعوری اور لاشعوری دونوں طور پر مقابلہ کرتا گیا۔

دونوں سے ملاقاتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ ایک دل میں زور سے ساتھ داخل ہوتی تھی مگر تھوڑی دیر میں پھڑ پھڑا کر نکل جاتی تھی بلکہ اڑ کر غائب ہو جاتی تھی، دوسری دل میں کھسکتے ہوئے ڈرتی ڈرتی داخل ہوتی مگر گھس جاتی تو وہاں ہمیشہ کے لئے دبک کر بیٹھ جاتی اور وہیں رہتی۔

بہن پاس ہو گئی اور خالہ نے مجھے اشارہ دیا کہ شادی کا پیغام دوں۔ اسی زمانہ میں ایک ملاقات میں اس نے مجھ سے کہا۔ ہم لوگوں کو ہر سال چھٹی ملتی ہے ایک مہینہ کی تا کہ تفریح کریں اور میں اب ایک مہینے کے لئے مسوری وغیرہ جا رہی ہوں۔

میں اسے اسٹیشن پہنچانے لگا۔ جب گاڑی چلی تو وہ کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ جوں جوں گاڑی آگے کھسکتی وہاں دور اس کے چہرے کا تاثر زیادہ دلکش ہوتا گیا۔ مسکراتا ہوا چہرہ غور سے دیکھتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں میرے تصور میں بس گئیں کہ پورے مہینے میں اس پر سر دھنتا رہا۔ اس کی خالہ زاد بہن با وجود بھری جوانی اور کسے ہوئے جسم کے اچھی نہ لگی اور اس کا ڈھلا جسم تصور میں زیادہ سے زیادہ بدنما ہوتا گیا۔

---- --------

وہ مہینہ عجیب کش مکش کا تھا ایک طرف اس کا جاتے وقت کا چہرہ سر پر سوار رہتا۔ دوسری طرف اس کی خالہ اور خالہ زاد بہن نے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ دونوں میرے فلیٹ میں آجاتیں اور ایسا بھی ہوا کہ خالہ بھانجی کو چھوڑ کر چلی جاتی۔ میرے تخیل کی صورت اور اسی تعلق کے سبب کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرتا تھا۔ دوسری ایک جال یا پھندا تھا جو ایسا گلے میں پڑتی کہ دم گھٹ ہی کر رہ جاتا۔ میں اسے چھوتا تو کیا غور سے دیکھتے ہوئے بھی ڈرتا۔

میں زیادہ سے زیادہ وقت دفتر میں گذارتا اور اس کے بعد کیا ٹہلنے نکل جاتا۔ اب ایک نہیں بلکہ دونوں کی تصویریں سامنے معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی ہیں اور میں دونوں سے بھاگ رہا ہوں یا یوں سمجھئے کہ پہلی کے سلسلے میں پکڑے جانے کا سوال ہی نہیں۔ کوئی ذمہ داری نہیں جب جی چاہے ملے جب جی چاہے الگ مگر دوسری جال میں ایسا گرفتار کرنا چاہتی ہے کہ کبھی نہ نکل سکوں۔ پہلی دور تھی اور تخیل میں اس کی تصویر زیادہ سے زیادہ حسین ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری حقیقت میں اس سے زیادہ حسین تھی مگر برابر بدنما ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی سے شروع ہی سے کھل کر مل گیا تھا، دوسری کے ساتھ کھلنے میں ڈر لگتا تھا پہلی کے ساتھ شادی کا سوال ہی نہ تھا۔ دوسری شادی ہی کے لئے میری طرف دوڑائی گئی تھی۔

اسی دوران میں نہ معلوم کس طرح میرے والدین کو خبر ہو گئی انہوں نے مجھے گھر بلایا اور باتوں باتوں میں یک

دن والد نے کہا "میں نے سید صاحب کی لڑکی کے ساتھ تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ تم کراچی میں واہی تباہی پھر رہے ہو۔ ایک بدمعاش عورت کے فلیٹ میں جاتے تھے وہ کہیں چلی گئی اب اس کی بہن تمہارے فلیٹ میں آتی ہے۔ میں تمہاری زندگی یوں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا فرض ہے کہ تم کو راہ پر لگاؤں۔ یا تم اپنی رائے سے ان دونوں کو چھوڑ کر کسی سے شادی کرلو یا پھر میرے کہنے پر چلو۔

میں نے سید صاحب کی لڑکی انجم کو بھی کالج سے آتے ہوئے دیکھا۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ان دونوں سے زیادہ دلکش معلوم ہوئی جو میرے ذہن میں عجیب طرح کش مکش بپا کر رہی تھی۔ میں نے آٹھ دن کے اندر یہ محسوس کیا کہ انجم ان دونوں کو دھکیل کر میرے ذہن پر حاوی ہو گئی ہے۔

چلتے وقت میں نے والد سے کہا۔ "میں کراچی کی زندگی سے عاجز ہوں۔ اگر یہاں کوئی کاروبار یا آمدنی کا ذریعہ نکلے تو جو آپ کہیں گے۔"

کراچی واپس آکر میں نے خالہ سے کہہ دیا۔ "میں اب یہاں کی نوکری چھوڑ دوں گا۔ سکھر میں ہی رہوں گا اور کوئی کاروبار کروں گا۔"

خالہ بھانجی دونوں دنگ رہ گئیں اور بھانجی فلیٹ سے اپنے گھر چلی گئی اور میرے ذہن سے غائب ہو گئی مگر اس بڑی بھانجی کا جو رابطہ ہو رہی تھی جاتے وقت کا تصور میرے ذہن پر حاوی رہا۔ ظاہر تھا کہ انجم اور اس کے ساتھ شادی کر کے سکھر میں رہنے کا خیال غالب آتا گیا مگر بار بار یہ بھی خیال آیا کہ اس پہلی محبوبہ کو بھی دیکھ سکوں جو میرا پہلا جنسی تجربہ تھی اور جس کا تصور مجھے عجیب طرح سے باندھے ہوئے تھا۔

کینٹ سٹیشن پر میں تیز رو کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیوں؟ وہ آ رہی تھی۔ اس سے کیا غرض تھی؟ کچھ نہیں۔ ملازمت سے بھی میں نے چھٹی لے لی تھی۔ جتنی بھی چھٹی مل سکتی تھی سب ہی جمع کر کے لے لی تھی۔ اپنے فلیٹ کا بھی ایک صاحب سے سودا کر لیا تھا۔ میں چلا بھی گیا ہوتا۔ مگر اس کا جاتے وقت کا چہرہ ایسا سر پر سوار تھا کہ اسے ایک دفعہ اور دیکھے بغیر میں نہیں جا سکتا تھا۔ بس ایک دفعہ آنے کی اطلاع اس نے مجھے دی تھی۔ میں نے خالہ کو بتایا تو وہ بولی، آپ آ جائے گی۔ اسٹیشن جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر میں نے اپنی سکھر روانگی اس کے آنے تک ملتوی کر دی تھی۔ اس کے ساتھ گزاری ہوئی سب ہی یادیں آ رہی تھیں۔ اس کی بہن سے اس کا مقابلہ بھی ہو رہا تھا۔ انجم بھی یاد آتی اور اس کے ساتھ زندگی کے خواب بھی ابھرتے۔ مگر ایک آخری ملاقات۔ آخری دیدار کے لئے دل تڑپ رہا تھا۔ اس کا سن اور اس سن کی وجہ سے نقائص کا بھی پورا احساس تھا اس کے ساتھ مستقل رہنے کا خیال بھی ممکن نہ تھا۔ مگر پھر بھی دیکھ لینا ضروری تھا۔۔۔۔۔

گھنٹی بجی ریل آتی دکھائی دی۔ سب مسافر کھڑے ہو گئے۔ انجن میرے سامنے سے سنسناتا ہوا گزرا۔ کھڑکیوں سے بہت سی شکلیں جھانک رہی تھیں۔ گاڑی رک گئی۔ میں پیچھے والے کمپارٹمنٹس میں جھانکتا ہوا آخر تک پہنچ گیا۔ ایک کمپارٹمنٹ میں وہ نظر آئی۔ کیا وہی تھی؟ وہی جس کو میں نے اتنی بار دیکھا تھا اور جس کا اتنی دیر سے بے قراری کے ساتھ

انتظار کرتا رہا تھا؟

میں اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سب نقائص جن کو میری نظر نال بید کرتی تھی بہت زیادہ نمایاں تھے چہرہ کی کھال لٹکی ہوئی۔ سیاہ رنگ کی چمک پر ماند پڑی ہوئی تھی گالوں میں گڑھے صاف نمایاں۔ دل نے کہا ''کیا اسی کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھے۔،، جی چاہا کہ اس کی طرف سے منہ پھیر لوں

قلی نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ باہر کی طرف چلی۔ میں بھی ساتھ ہو لیا اس سے [illegible] پر نگاہ جاتی تو وہ کافی [illegible] معلوم ہوتا

اسٹیشن سے نکلتے ہوئے میں نے کہا۔ ''میں نے بھی چھٹی لے لی ہے اور [illegible] جہاں تک ہمیشہ رہنے کا طے کر چکا ہوں فلیٹ ایک دوست کو دے دیا ہے۔،،

اس نے نہایت بے پروائی سے کہا۔ ''اچھا۔ اچھا۔

''وہاں میری کزن نجم سے شادی بھی ہو جائے گی۔،،

''یہ تو بہت ہی۔ بہت ہی اچھا ہوگا۔ مبارک ہو۔ بہت مبارک ہو۔،،

اس نے ایک ٹیکسی میں اپنا سامان رکھوایا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

حالانکہ میرا بھی جی چاہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر چلا جاؤں مگر میں امید کر رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہے گی۔

مگر اس نے بیٹھ کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا، چلو اور نہایت سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اچھا خدا حافظ۔،،

''خدا حافظ۔،، میرے منہ سے بھی میکانکی طرح پر نکل گیا۔

سمجھوتہ

محمد سعید شیخ

جلوس شروع ہوا تو زیادہ تر ان لوگوں پر مشتمل تھا جنہوں نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔ گلیوں بازاروں سے گزر کر یہ جلوس سڑک پر پہنچا تو دیکھنے والوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگ اس میں شامل ہو گئے تھے اور یہ قصبے کی تاریخ کا سب سے بڑا جلوس بن گیا تھا۔

بنیادی طور پر تو یہ صبح کے واقعہ کے خلاف احتجاج تھا مگر اب اس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو گئے تھے وہ بھی جنہیں اصل واقعہ کا علم تک نہ تھا مگر ان کے پاس احتجاج کے لئے اپنا اپنا جواز تھا اپنی اپنی توجیہ تھی۔

اس قصبے میں پہلے بھی جلوس نکلتے رہے۔ مذہبی اور قومی تہواروں پر مگر ظلم اور ناانصافی کے خلاف نکلنے والا یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلوس تھا پہلا احتجاج تھا۔ یوں نہیں تھا کہ پہلے یہاں ناانصافی نہیں تھی ظلم نہیں تھا۔ ایسے واقعات پہلے بھی ہوئے تھے۔ نوراں کو اسی بازار سے چند نقاب پوش دن دیہاڑے اغوا کر کے لے گئے تھے اور اس کا باپ آج تک کہتا پھرتا تھا کہ اس کی بیٹی ساتھ والے گاؤں کے بڑے چودھری کی حویلی میں موجود ہے مگر اسے آج تک بازیاب نہ کیا جا سکا اور اب اس کے باپ کا گلا بیٹھ گیا تھا (نوراں کا باپ آج اس جلوس میں شامل تھا اور ریلوے کے پھاٹک کو سب سے پہلا پتھر اسی نے مارا تھا)

غلام رسول کی جوان بیوہ آج بھی زندہ تھی اور جلوس کے ساتھ تھی اور اس ہسپتال کو قہر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جہاں اس کے بچوں کا باپ بروقت علاج اور دوا نہ ملنے سے برآمدہ میں سسک سسک کر مر گیا تھا۔

جس چوک میں کھڑے ہو کر لوگوں نے سب سے زیادہ نعرے لگائے تھے وہاں چند دن قبل فاطمہ چوری کا جوان بیٹا تیز رفتار ٹریکٹر کے نیچے کچلا گیا تھا اور ڈرائیور کے باپ نے اس سے تھانے میں کاغذوں پر انگوٹھا لگوا کر سو روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیا تھا۔ اور اس جلوس میں جہاں دین مزارع بھی شامل

تھا جس کی زمین زمیندار نے چھین کر اس کے تین جوان بیٹوں پر مقدمہ بنوا دیا تھا۔ اور دتا نائی بھی جس کی خوبصورت بیوی کو اس کا ہمسایہ بھگا لے گیا تھا اور آج تک مقدمہ درج نہیں ہوا تھا۔

ایسے کئی واقعات پہلے بھی ہوئے تھے مگر جلوس پہلی دفعہ نکلا تھا۔ لوگوں نے پہلی دفعہ مجموعی ردعمل کا اظہار کیا تھا۔

قصبے میں اس بیداری کی وجہ شاید یہ تھی کہ ملک میں بڑی مدت کے بعد پہلی دفعہ حق بات ہو رہی تھی اور لوگوں کو اپنے بھولے ہوئے دکھ یاد آ رہے تھے حالانکہ قصبے کے لوگ پہلے دن سے ہی لوگ ناانصافیوں کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرتے آ رہے تھے۔ جامع مسجد کے مولوی صاحب کے وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ ان کی آواز لحن داؤدی تھی اور وہ بڑے ترنم سے اقبال کے شعر پڑھتے تھے

وہ کہا کرتے تھے۔

مصیبت اور مشکل اللہ کی طرف سے بندے کا امتحان ہوتا ہے اور جو اس آزمائش میں پورا اترتا ہے وہی اصل مسلمان اور اقبال کا مرد مومن ہے بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

پھر وہ کہتے

ہم مقدر سے لڑ نہیں سکتے۔ مشیت ایزدی کو تسلیم کر لینے سے طبیعت کا بوجھ ہلکا رہتا ہے، اور کڑی سے کڑی آزمائش بھی آسان ہو جاتی ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں ---" اور مولوی صاحب بڑی رقت سے علامہ اقبال کے شعر پڑھنے لگتے۔

مگر آج کے جلوس کے انداز کچھ ایسے تھے جیسے لوگ اپنے فیصلے خود کرنا چاہتے ہوں اس جلوس کا کوئی لیڈر نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے جو چاہے نعرہ لگا لیتا تھا بڑی سڑک پر پہنچ کر لوگوں نے نعرے لگانا شروع کر دیئے "غنڈہ گردی بند کرو" "غنڈہ گردی بند کرو" "ناانصافی بند کرو" دونوں طرف سے ٹریفک بند ہو گئی "شیدے کو پھانسی دو! شیدے کو پھانسی دو"

اور کناروں پر کھڑی بسوں ویگنوں میں بھری مخلوق سر نکال نکال کر اس منظر کو دیکھنے لگی۔ جلوس نے ٹریفک کی بتیوں پر چاند ماری شروع کر دی اور کچھ نے سڑک پر ٹائر رکھ کر آگ لگا دی۔ دھواں اٹھنے لگا جس کے بادل دور سے نظر آتے تھے۔ پھر پولیس آ گئی انہوں نے لاٹھی چارج سے لوگوں کو منتشر کرنا شروع کر دیا اور ٹریفک بحال کر دی گئی۔

اس جلوس میں زینب کا باپ بھی شامل تھا۔ زینب جس کے ساتھ صبح کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جلوس بکھرا تو وہ اکیلا ہو کر سڑک کے ساتھ بہنے والی چھوٹی سی نہر کے کنارے غلاظت کے ایک ڈھیر پر کھڑا ہو گیا اور بکھرتے لوگوں اٹھتے دھویں اور پھنسی ہوئی ٹریفک کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

بابے برکت نے غلاظت کے اس ڈھیر پر کھڑے سوچا کہ کب اس نے زینب کی تعلیم کے خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ پانچ سات بیگھہ زمین کا معمولی مالک تھا مگر پتا نہیں کب اور کہاں سے یہ بات اس کے کان میں پڑی کہ تعلیم ہی انسان اور حیوان میں فرق پیدا کرتی ہے اور وہ جانتا تھا کہ اس نے اب تک جو زندگی بسر کی تھی وہ بس حیوانوں کی سطح تک ہی تھی کہ اس علاقے کے چوہدریوں کے کتوں کو بھی بہتر زندگی حاصل تھی۔ اس لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنی اکیلی بیٹی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے گا۔ زینب کی ماں نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے! ہائے! نہ بھلا کبھی لڑکیوں کو بھی تعلیم دیتے ہیں۔ زینب کی سہیلیوں کی تو شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں.. تو برکت! اسے سکول بھیج رہا ہے۔ تو نے اسے استانی بنانا ہے بھلا؟"

اور برکت اس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔ "نادان ہے.. عورت ہے نا اور وہ بھی ان پڑھ اسے کیا پتا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے"

برکت نے ماسٹر محمد دین کے ڈیرے پر کسی کو عورتوں کی ترقی کی بات کرتے سنا تھا "اب تو لڑکی چاند تک پہنچ گئی ہے اور ہماری عورتیں ابھی تک گوسوت دھونے سے فارغ نہیں ہوئیں۔ اور جس قوم کی عورتیں ان پڑھ ہوں وہاں ترقی نہیں ہو سکتی" ماسٹر محمد دین نے فیصلہ دیا تھا اور ماسٹر محمد دین کی بات برکت کے نزدیک پتھر پر لکیر ہوتی تھی۔ اور پھر برکت نے خود جو بغیر سکول کے تعلیم و عقل حاصل کی تھی وہ ماسٹر محمد دین کی باتوں کی مرہون منت تھی اور اب اس کی یہ جاہل بیوی کیا سمجھتی کہ ماسٹر محمد دین کیا کہتا تھا۔

اس لیے برکت نے زینب کو میٹرک تک تعلیم دلوائی اور شہر کے بڑے قصبے میں استانی بنانے والے سکول میں داخل کرا دیا۔ اس کی بیوی نے ایک دفعہ پھر واویلا کیا۔

"وہ جوان ہوگئی ہے برکت! اسے بیاہ دے! یہی بڑا کام ہوگا اس کی ہمجولیاں تو گود میں دو دو تین تین بچے لئے پھر رہی ہیں۔ اسے استانی بنا کر کیا کرے گا......؟"

اور برکت کے کان میں جیسے اس کی بیوی کی تیز آواز پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ سارا جلوس منتشر ہو گیا تھا...... ٹریفک یوں بحال ہو گئی تھی جیسے کسی کو کسی کی پرواہ نہ ہو جلتے ہوئے ٹائر اب سڑک کے کنارے سلگ رہے تھے۔ اور برکت جیسے اپنے قدموں کو اٹھاتا گھسیٹتا گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں اسے پتا تھا اس کی بیوی اب تک بھری بیٹھی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار وہ تھا۔ وہ جو اس کو تعلیم دلا رہا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو وہاں خاموشی تھی۔ قبرستان کی سی جہاں ابھی ابھی کسی کو دفنایا گیا ہو... زینب پچھلے کمرے میں سسکیاں لیتے لیتے سو گئی تھی اور اس کی ماں کھلے صحن میں پڑی چارپائی پر اوندھی لیٹی تھی۔ اس نے گھر کو اندر سے کنڈی چڑھا رکھی تھی کہ پوچھنے والیاں ہمدردی کرنے والیاں اب

انہیں مزید تنگ نہ کر سکیں۔

زینب جو صبح تک خود کو جیسے پوری کائنات کی مالک سمجھتی تھی اب منہ چھپاتی پھر رہی تھی وہ تو سمجھا کرتی تھی جیسے زندگی کی ساری رونقیں بس اسی کے دم سے ہیں۔ ہوا میں صرف اس کا بدن سہلانے، اس کے بالوں اور کپڑوں کو چھیڑنے کے لیے چلتی ہیں پھولوں نے سب رنگ اس کے اپنے خیال کے رنگ ہیں اور بادل محض اس کی خاطر امڈتے ہیں پرندے اس کے لیے چہچہاتے اور شور مچاتے ہیں اور آسمان تاروں سے اتنا نیلا محض اس کے دیکھنے کے لیے ہے۔ وہ گرمیوں کی شام کو کچے کوٹھے کی منڈیر کے ساتھ کھڑی ہو کر دور آبادی سے پرے کھیتوں کی ہریالی اور ان سے بھی پرے آسمان تک بلند پہاڑوں کو دیکھتی رہتی اور پھر اپنے پورے بازو پھیلا دیتی اور اس کا جی چاہتا کہ اس پوری کائنات کو اپنی بانہوں میں بھر لے اور رات کو جب وہ اپنی ماں کے ساتھ ہوتی تو کبھی کبھی اسے اپنی بانہوں میں زور سے بھینچ لیتی اور اس کی ماں شور مچا دیتی۔

"نی کڑیے! کیوں میرا سانس گھٹ گئی ایں میری ہڈیوں تن اب تار دو رہیں" اور اگلے دن وہ برکت سے کہتی "زینب کی جلدی سے شادی کر دے اس سے اپنی جوانی سنبھالی نہیں جاتی"

اور اس کا باپ ہنس دیتا "ابھی تو وہ استانی لگی ہے اسے پڑھانے دے بچوں کو ماسٹر محمد دین کہتا ہے تعلیم دینا سب سے بڑی عبادت ہے"

اور جب وہ سکول جاتی تو یوں چلتی جیسے وہ ستاروں پر قدم رکھ رہی ہو ماں باپ نے اسے برقعہ پہنا دیا تھا کہ اسے بازار کی رونق سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ زینب کی راہ میں شیدے کا گھر آتا تھا اور شیدا روز اس کے سکول کے وقت پر تیار ہو کر دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور زینب کی نگاہ میں آنے کی کوشش کرتا اور اسی کوشش میں وہ کئی دفعہ اس کے راستے تک آیا بھی اور متعدد بار اس نے کھنکورے مارے اور گنگنایا بھی مگر زینب کو تو جیسے اپنے سوا دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ شیدا تو اس کے لیے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی طرف توجہ کیسے دیتی۔ اور شیدے کے دوست اس کا مذاق اڑاتے۔

یار! یہ لڑکی تو تمہیں بالکل گھاس نہیں ڈالتی یار جوان ہے کی لڑکی بھی تجھے کچھ نہیں سمجھتی؟

یار! اسے تو تمہاری پروا ہی نہیں بڑے جوان بنے پھرتے ہو کیا فائدہ ہر روز اچھے اچھے کپڑے پہنے اور تیز خوشبو لگانے کا اور شیدا اکٹ جاتا۔ شرمندہ ہو جاتا۔

یار تب مزہ ہے اگر برکت جولاہے کی اس لڑکی کا پیچھا سے ماز رہ دیکھو۔

اور شیدے کی مردانگی جیسے داؤ پر لگ گئی ایک آدھ دن وہ زینب کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے تک نکل گیا۔ اگلے دن اس نے ہلکی سی آواز میں کہہ بھی دیا۔

''اگر تم نے نقاب نہیں اٹھایا تو دیکھنا...''

مگر زینب نے بالکل نہ دیکھا اس نے شیدے کی پروا ہی نہیں کی جتنی احتیاط راستے میں پڑی گندی نالی کو پھلانگنے کے لیے وہ کرتی تھی تنی احتیاط اس نے شیدے سے نہ لی۔

اسے اپنے باپ کے الفاظ یاد آتے جو اس کے باپ نے ماسٹر محمد دین سے سنے تھے

''جب تعلیم پاس ہو تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا''

ور پھر وقوعہ کے روز شیدا اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

''میں کہتا ہوں مجھے اپنا چہرہ دکھا دو میں نے اپنے دوستوں سے شرط لگائی ہے''

اور زینب ڈولی بھاری ہو جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا بھٹک رہا ہو اور پھر شیدا آگے بڑھا بھرے بازار کے چوک میں اس نے زینب کو بازو سے پکڑ کر روک دیا۔

''تو مجھے اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتی؟

کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو؟ دیکھ اب دیکھ!!''

ور شیدے نے اس کے سر سے برقعے کا پلو کھینچ لیا۔ زینب کا چہرہ ننگا ہو گیا۔ بال بکھر گئے بالوں کی چڑیاں گر گئیں

شیدے نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور غصے سے برقعے کا پلو زمین پر پھینک کر ایک زور کا تھپڑ اس کے چہرے پر لگایا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔

جتنی دیر میں یہ سارا واقعہ ہوا لوگ مشکل سے صورت حال کو سمجھے۔ خود زینب کو پتا نہیں چلا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اس کے گال میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ زبان پر اپنے خون کا ذائقہ اتر آیا کسی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پلو ڈال دیا۔ اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ کون اسے گھر تک لایا۔ اور اسی چوک سے پھر احتجاج کے لیے جلوس نکلا۔

لوگوں کے احتجاج کا نتیجہ تھا کہ شام تک شیدے کے خلاف مقدمہ درج ہوا اور وہ گرفتار ہو گیا۔ مقامی عدالت میں پیشی ہوئی۔ اور ضمانت کی درخواست مسترد ہوئی۔ مقدمے کی تفصیلات کے ساتھ ہی زینب بھی جیسے سارے قصبے میں بکھر گئی بات پہنچی کہانی آگئی باہر اس کا جتنا ذکر تھا وہ اتنی ہی گھر میں اور پھر اپنے آپ میں قید ہو گئی۔ اس کے رنگ بکھر گئے۔ گہرے رنگوں کے بادل اڑ گئے دھوپ چھا گئی اور وہ باہر نکلنے سے ڈرنے لگی۔

شیدے کی ضمانت جب بڑی عدالت سے بھی رد ہوئی تو اس کے ماں باپ اور دوستوں کو فکر ہوئی

اب شیدے کو جیل کی سلاخیں اور ہاتھوں کی ہتھکڑیاں [illegible] نے لگیں۔

اور پھر ایک شام شیدے کے ماں باپ اور بہت سے دوسرے وفد سا بنا کر برکت کے گھر آئے۔

برکت نے انہیں با دلِ نخواستہ صحن میں بٹھا دیا کہ ان میں شیدے کے ماں باپ کے علاوہ برکت کے اپنے کئی جاننے والے یہاں تک کہ مولوی عبد القدوس [illegible] بھی [illegible] تھے

گفتگو کا آغاز شیدے کے باپ اللہ داد نے کیا

''برکت بھائی! ہم شیدے کے کیے پر شرمندہ ہیں [illegible] کا کہیں سے بھی تھوڑا تھا اسے [illegible] ہم اس کی طرف سے معافی مانگنے آئے ہیں۔

اصل شرارت تو اس کے دوستوں کی تھی [illegible] انہوں نے ہی اسے بہکایا تھا۔ بہر حال ہمیں افسوس ہے۔ زینب جیسی آپ کی بیٹی ویسی ہماری''

برکت اور اس کی بیوی چپ تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہیں۔

''آپ بھی بہن جی! میرے بچے کو معاف کر دیں بے چارہ مہینہ بھر سے جیل کی چکی پیس رہا ہے۔'' شیدے کی ماں نے زینب کی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری بیٹی کا بھی تو حال دیکھیں [illegible] روشنی تک سے گھبرانے لگی ہے۔ کہیں نکلنے جوگی نہیں رہی۔ اس کا تو مستقبل ہی برباد ہو گیا'' زینب کی آبدیدہ ہو گئی۔

''ہمیں آپ کے دکھ کا اندازہ ہے بہن جی! ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ اسی لیے جہاں ہم معافی مانگنے آئے ہیں وہاں یہ درخواست بھی لائے ہیں کہ آپ زینب کو ہماری بیٹی ہی بنا دیں۔''

اور شیدے کے باپ کی اس تجویز سے برکت اور اس کی بیوی حیرت کے مارے جیسے سن ہو گئے۔

ان کی اس حالت کا اندازہ کرتے ہوئے برکت کا ایک دوست فقیر محمد جو دودھ دہی کی دکان کرتا تھا کہنے لگا۔

''بھائی برکت! اب اگر قسمت نے زینب اور شیدے کا نام اکٹھا لکھ ہی دیا ہے تو ہم اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیں تو اسی میں ہماری عزت ہے کیوں مولوی جی!''

''جی ہاں! فقیر محمد درست کہتا ہے۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے ... پھر معاف کر دینا بھی بہت بڑی عظمت ہے اللہ معاف کرنے والے کو بہت پسند کرتا ہے اور پھر علامہ اقبال نے بھی تو کہا ہے ''

اور برکت سے نہ رہا گیا [illegible] اس نے مولوی صاحب کی بات کاٹ دی

مر مولوی صاحب ہم تو کسی جگہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔'' اسی لیے تو یہ ... سر دوری ہو گیا ہے برکت بھائی اس مقدمے سے جو جگ ہنسائی ہوگی اس میں زیادہ بے عزتی تو لڑکی والوں کی ہی ہوتی ہے۔ رشیدے کو سزا ہو بھی جائے تو کیا آپ کی عزت واپس آ جائے گی اور پھر جو زینب کو عدالت میں پیشیوں ... وکیلوں کی جرح ... [illegible]

اسے کیا فرق پڑتا ہے ... آپ کی لڑکی کا نام ہی اچھلے گا''

رشیدے کی ماں کی بات میں دلیل بھی تھی اور وزن بھی ... برکت جواب تلاش کرنے لگا۔
دونوں میاں بیوی سوچ میں پڑ گئے۔ رشیدے کی ماں نے ایک دفعہ پھر زینب کی ماں کی منت کرتے ہوئے کہا

''بہن ویسے رشیدا برا لڑکا نہیں ہے۔ ماشاءاللہ کھاتا پیتا جوان ہے باپ کی زمین میں حصے دار ہے اور پھر اسے زینب پسند بھی ہے جبھی تو جوش میں آ کر اس نے یہ حرکت کی۔

پھر آج کل لڑکیوں کے رشتے کہاں ملتے ہیں اور زینب کے لیے تو آپ کو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔''

اور جس صحن میں یہ سب لوگ باتیں کر رہے تھے اس کے ساتھ ہی ایک بند کمرے میں زینب تھی جو تھکے ہارے ماؤف سے دماغ کے ساتھ ان سب باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے کم از کم یہ پتا لگ رہا تھا کہ اس کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں ... کہیں زمین پر باآسمانوں میں یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

''مگر لوگ کیا کہیں گے؟''

برکت کے منہ سے یہ سوال چیخ بن کر نکلا جس کا درد اس کے اندر ہی کہیں رہ گیا۔

''لوگوں کو چھوڑیے برکت بھائی' وہ تو اب بھی بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے نہیں سنا، اور اگر نہیں سنا تو اچھا ہے۔

لوگوں کا منہ بھی کوئی بند کر سکا ہے۔ اور پھر ابھی تو یہ واقعہ تازہ ہے ہمارے لوگ بھول جائیں گے سب کچھ' ویسے بھی رشیدے کے ہوتے ہوئے کون بات کر سکے گا۔ جس عزت کو اس نے اچھالا ہے اسے سنبھالے گا بھی وہ خود ہی''

برکت کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا... وہ سوچنا چاہتا تھا ... اچھے بھلے کی تمیز کرنا چاہتا تھا ... مگر ان باتوں سے سب کچھ جیسے اس کی نظروں میں دھندلاتا جا رہا تھا

وہ میاں بیوی تو پہلے ہی بہت پریشان تھے۔ ان کا کھانا پینا تک حرام ہو چکا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات کوئی نہ کوئی آدمی کوئی نہ کوئی عورت سنا جاتی تھی۔ ان کے کان پک گئے تھے۔ اور زینب الگ

پریشان تھی۔ ہزار افسانے ہزار کہانیاں گھڑی تھیں اور ابھی مقدمہ چل رہا تھا۔

زینب اور رشیدے کا نام کچہری کے کاغذوں میں ہی نہیں لوگوں کی زبانوں پر بھی اکٹھا آتا تھا۔ وہ دونوں ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے تھے جسے اگر وہ توڑنا بھی چاہتے تو دنیا شاید انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ لوگوں کی زبانوں نے زینب کے ہاتھوں میں جیسے رشیدے کے نام کی لکیریں کھود دی تھیں۔ زینب کو رشیدے نے پوری دنیا میں قید کر دیا تھا۔ وہ اب رشیدے سے بھاگ نہیں سکتی تھی اگر وہ بھاگنے کی کوشش بھی کرتی تو لوگ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کے رشیدے کے آگے لا ڈالتے۔ وہ رشیدے کے اٹوٹ رشتے میں منسلک ہو چکی تھی

اور یہ سب سوچتے ہوئے برکت چپ تھا ماسٹر محمد دین بھی چپ تھا خاموش تھا۔ ''بولیں ماسٹر جی! آپ بھی ان سب کے ساتھ آئے ہیں آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کہا؟ آپ کی کیا مرضی ہے؟''

ماسٹر جی نے اپنی آنکھیں اٹھائیں جو جھکی ہوئی تھیں۔

''برکت! جھلیا اب تک جو کچھ یہاں ہوتا آیا ہے کیا وہ تیری اور میری مرضی سے ہوا ہے جو اب بھی ہم اپنی مرضی کی بات کریں۔ بس تو بھی سر ہلا دے یہی سب سے آسان عمل ہے''

اور کسی کو پتا چلا ہو یا نہ چلا ہو۔ برکت ماسٹر جی کی بات سمجھ گیا تھا۔ ''میں سمجھتا تھا ماسٹر جی کوئی مختلف بات کرو گے۔ پر آپ بھی ماسٹر جی عام انسان ہی نکلے!'' برکت نے جیسے بڑی مایوسی سے کہا۔

''ہاں! میں بھی عام انسان ہوں ... میں مختلف نہیں ہو سکتا برکت! یہاں کوئی مختلف نہیں ہو سکتا ... یہاں کون ہے جو سولی پر چڑھے کون ہر وقت مصلوب ہونے پر تیار ہو!''

اور برکت نے اس پریا کی بات مان لی۔ جس طرح مقدمہ کو واپس لینے والے کاغذات پر زینب نے انگوٹھا لگایا تھا اسی طرح اس نے نکاح والے فارم پر بھی انگوٹھا ثبت کیا تھا کہ ان دونوں صورتوں میں دستخط سے انگوٹھا زیادہ معتبر تھا۔ تعلیم تو صرف پڑھنے پڑھانے کے کام آتی ہے

تیسری جنس

چودھری محمد علی ردولوی

ان کا اصلی نام احمد خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

کچی تو کھلتی ہوئی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسی ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو وہ وار۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیوی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ ہونٹ کی شرم، نہ لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے سو قلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لئے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے، ایک دن میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی

پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں [illegible] میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی [illegible] تکلف [illegible] ڈھال جو تلوار کا حد توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے [illegible]
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار [illegible]

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم [illegible] کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوش حیات نے [illegible] سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس [illegible] بہرحال قصہ سنتے جایئے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جایئے۔ مدتی کے ہر اندر [illegible] تھی۔ ایک بات البتہ تھی جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے، مگر [illegible] لوگ اس کو مرد ہی سے منسوب کرتے ہیں یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی [illegible] مردوں میں بڑی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا۔ اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے۔ تحصیلدار صاحب کا نام [illegible] گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے، مگر بے عیب خدا کی ذات، کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے۔ مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی [illegible] کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ وہ تھان [illegible] ڈوریے کے لئے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی یہ ڈوریہ کیسا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لئے۔ ڈوریہ وضعدار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا"۔

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شرتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لئے لے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا"۔

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو [illegible]، برسات کا زمانہ ہے، دھوبی دیر میں آیا کرے گا، دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں"۔

"خیر بھئی!"

تحصیلدار تخت پر بیٹھے ہیں۔ "میاں حسن علی! آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی۔"

"آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے۔ کہو تو مرغ پک جائے گا"۔ تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے محلے دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفا چٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھنوؤں داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر جنس کی چال چلیں گے تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی نئی نکالیں گے۔

بہرحال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے وہ یہ تھا کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہاں میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کر ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں، عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہم جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو حسن علی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمد خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہو گا۔ دسترخوان پر شوربا گرانا۔ لقمہ ڈبوے میں دال کا پورا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار

صاحب ہی کے یہاں رہنے لگتیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف بچھونا بچھا اور بیچ میں حسن علی کی بی
بی تھیں یا ان کی پلنگڑی لگ گئی۔ صاف چادر، گاؤ تکیہ، چھوٹے چھوٹے تکیے ہوتے۔ [illegible]
تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھ گئی۔ جوتے پہنے رہنے کی تاکید ہوتی کہ بچھونا
میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار تاکید کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔
پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آ گیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیلدار صاحب
کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا، کھانا پکوانا، سب کچھ مدی کے
ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب پھٹ اٹھا۔ دیکھنے والوں
کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے بیٹھتی تھیں تو آئینہ کے ساتھ
خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا
انہوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی نے بچپنے تو کٹوں ہی سے مانگی
تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔ جھٹ پٹ
شادی ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی، جہیز وغیرہ خوب
دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولہا بھی تحصیلدار
صاحب ہی کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو تھوڑی سواری۔ بہت
رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آ گئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام
ٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر
پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال
میں کم لگتا تھا۔ کمسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر
کنوارپنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر مدی کے چہرہ سے نہ
اس بات کا پتہ چلتا تھا نہ اس کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر
کسی خاص خوشی یا اطمینان کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ
گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے
تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی بیچ
میرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں کہ بی بی سے
کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آ جاتا تھا۔ اس لئے چپ تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر
اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا۔ رلائی جھاڑی، پائنتی جھک کے دیکھا۔ گھر میں
ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئی۔ دوپہر کے قریب ماں

سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی۔ انہوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولہا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ بیچے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دوچار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر جھگڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی نے گھر آ کر بہت سخت سست سنایا۔ اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا۔ داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پنا ہی کر بیٹھے اس لئے مدی کا پورے طور سے تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لئے معطل کر دیئے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہو گئی تھی۔ تحصیلدار صاحب چپ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے۔ مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انہوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لئے علیحدہ گھر اور کچھ پونجی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انہوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک، گلے میں جو کچھ وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنے طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں۔ اب صرف بی مدی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا برا کیا ہو گا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ

تھی، کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑے سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سی کرتی تھی کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیئے۔ جس کو کہیں ٹھکانہ نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے پان بنا بی مدی کے پاندان سے کھائے۔ اسی زمانے میں ایک عورت نہ معلوم کہاں سے آ گئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا، عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کیلیں لیس، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں، یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پرگت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں۔ کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی سے پوچھ گچھ کی نہ انہوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں

کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہو گی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا، خون بہتا جاتا تھا، مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایس اور فرائڈ نہیں پڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنی ہی جنس سے تعلقات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا سے ہے اور اس لئے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہئے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں، وہ عورت جس راہ آئی تھی اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی بچھڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جوئندہ یابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد یک اور ہم جنس مل گئیں۔ اسکے بعد اور بھی ملاکیں مگر:

> نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
> مزا میں کیوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اس لئے آمدنی بڑھانے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیلدار کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کئے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوا لیا۔ چکن کروشیا کا بھی ڈھچر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سودا گری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی [illegible] رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ مگر ان کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی اجلے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لئے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی [illegible] عزت میں بھی فرق آ گیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں آئی تھیں۔ [illegible] نے کہا "اس [illegible] عورت کس گنتی شمار میں ہے"، بی مدی بول اٹھی "آج کل [illegible]"۔ [illegible] بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ [illegible] بعض نے [illegible] تاک کیا۔ وہ ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ سننے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے گئے لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں۔ اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لئے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھیرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں۔ بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلیم باعور تھے۔ جی چاہے انگلی پر ڈال دیجئے، چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کئی گئے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر

قالین

مختار مسعود

وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی' معصوم اور اجنبی' کم سن بھی تھی اور انگریزی بھی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھی اس سستی فراک اور کھوئی کھوئی آنکھوں کو دیکھ کر میں نے جانا کہ وہ غریب بھی ہے اور غمگین بھی۔ اس نے بتایا کہ وہ جرمن ہے اور کسی فرم میں ملازمت کرتی ہے۔

میں نے پوچھا' آپ کیا چاہتی ہیں۔؟

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی میں نے اسے پر ایک نظر ڈالی۔ یہ غیر ملکی ہے' شاید ویزا کی میعاد میں اضافہ چاہتی ہے' یہ غریب ہے' شاید امداد مانگنے آئی ہو۔ یہ کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہے' شاید بیمار ہے اور ہسپتال میں داخلہ چاہتی ہے۔ یہ سادہ سی لگتی ہے' شاید تبلیغ پر اتر آئے۔ غیر ملکی' غریب' پریشان' سادہ۔ ان حیثیتوں سے میں نے اس کی ضروریت کا اندازہ لگایا اور اپنے اختیارات کی روشنی میں اس کی ہر حالت کا ایک سیدھا سا جواب بھی ذہن میں تیار کر لیا' حکم' امداد' دلجوئی' مشورہ۔ نہ جانے جواب میں کونسی روش اختیار کرنی پڑے۔ یہ بات البتہ اس وقت میرے ذہن میں نہ آئی کہ وہ سب کچھ ہونے یا نہ ہونے کے باوجود ایک جوان لڑکی ہے اور شاید ــــــــــــــــ

''آپ کیا چاہتی ہیں۔''

''مجھے قالین چاہیے۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

سے قالین چاہیے تو یہ بازار کیوں نہیں جاتی۔ میں سوچ میں پڑ گیا اور سوچ مجھے ساتھ لے کر بہت دور جا نکلی' مجھے اصفہان کے باشندے یاد آنے لگے' وہی جو نئے قالین سڑک پر بچھا دیتے ہیں تا کہ گھس جائیں' وہی گھٹے ہوئے سر' دھنسی ہوئی آنکھوں اور لمبی لمبی انگلیوں والے باشندے جو ساری عمر اڈے پر اکڑوں بیٹھے گزار دیتے ہیں۔ اور خیال بھر جہاں تہاں سے ہوتا ہوا اس سادہ سی لڑکی کی اداس آنکھوں پر جا

کر رک گیا جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''مجھے قالین چاہیے''

''محترمہ' اگر آپ کو قالین چاہیے تو آپ بازار جائیے' آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں' یہ تو دفتر ہے دفتر۔''

''اگر یہ بات درست ہے کہ میں اس وقت ضلع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مخاطب ہوں تو میں اپنا سوال پھر دہراؤں گی۔ مجھے قالین چاہیے۔''

میں نے اس کے سوال کو مہمل سمجھا اور اس کی تکرار سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس لڑکی کا دماغ چل نکلا ہے' امداد' دلجوئی' مشورہ' سبھی غیر ضروری نکلے۔ یہ کیس تو حکم کا ہے۔ مسمیٰ فلاں ابن فلاں اپنے اختیارات زیر دفعہ متعلقہ کے تحت مسماۃ فلاں بنت فلاں کو مفادِ عامہ کے تحت حراست میں لیتے ہوئے دماغی ہسپتال میں معائنے کے لیے بھیجتا ہوں۔ ابھی ان احکامات کی کاپیاں ٹائپ ہوں گی' مہر لگے گی' دستخط ہوں گے' اور پھر ایک فائل اور ایک لڑکی داخل دفتر ہو جائے گی۔

میں نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے گفتگو شروع کی۔ وہ جنگ کے دوران پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ نے جنگ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ کئی سال وہ قریہ قریہ بھاگتے رہے مگر جنگ نزدیک آتی چلی گئی۔ پھر جنگ سارے ملک میں پھیل گئی' کئی دشمن چاروں طرف سے ملک میں گھس آئے' نوجوں کا گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔ بھاگنے کی راہیں بند ہو گئیں۔ آخر ایک دن جنگ ختم ہو گئی مگر اس کے ماں باپ کو ساتھ لے گئی۔

یہ لڑکی ایک رفیوجی کیمپ' ایک یتیم خانے' ایک چرچ' ایک خیراتی تربیتی ادارے اور بہت سے آدمیوں سے گزرتی ہوئی جوانی تک پہنچی۔ اب مجھے اس کی سادگی' اور سادگی اور دھیمے پن میں چھپے ہوئے غم کی جھلک نظر آئی۔ مجھے ندامت ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے بھی میں نے یہ کیوں سوچا تھا کہ میرے سرکاری اختیارات اس لڑکی کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں' ایسے پہاڑ جیسے بوجھ کے نیچے تو اختیارات ہی نہیں بلکہ پورے پورے ملک بھی دب کر گم ہو جاتے ہیں۔

سال بھر ہوا کہ یہ لڑکی یہاں آئی۔ جرمنی میں جس فرم میں ملازم تھی اسے ایک مقامی ٹھیکہ ملا تو اس کا تبادلہ بھی یہاں کی شاخ میں ہو گیا۔ نیا ملک' نئے لوگ' اس کا دل اس غم کو بھول گیا' جسے اپنے شہر کے کھنڈر اور دوسرے ملکوں کے فوجی ہر روز تازہ کر دیتے تھے۔ یہاں اسے بڑا سکون ملا۔ وہ ایک متوسط درجے کے علاقے میں رہتی تھی۔ اسے آس پاس کے فلیٹ والوں کے بچے مس صاحب اور نوکر میم صاحب کہہ کر پکارتے۔ اسے پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ انہی فلیٹوں کے صاحب لوگ جب بھی اس کے پاس سے

گزرتے اسے ایک بار تو بڑے غور سے دیکھتے۔ لڑکا لوگ تو اکثر مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے، اسے پہلی بار اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

وہ خاموشی سے دن بسر کرتی رہی۔ دفتر کا کام اور پھر گھر کا کام۔ چھ دن ان کاموں میں یوں گزرنے کہ کسی اور بات کی سدھ بدھ نہ رہتی۔ ساتواں دن گرجے میں گزرتا یا کچھ بدیسی عورتوں کے ایک ہفتہ وار اجلاس میں۔ ایک دن اس اجلاس میں ایک سفارت خانے کی طرف سے اعلان ہوا کہ ان کے ملک کا ایک باشندہ اس ضلع کی سنٹرل جیل میں قید ہے۔ اس ملک میں نہ تو اس کا کوئی رشتہ دار ہے اور نہ ہی اسے یہاں کی زبان آتی ہے۔ لہٰذا اسے قید بامشقت کے ساتھ ساتھ قید تنہائی اور قید خاموشی بھی کاٹنی پڑ رہی ہے، جس کا اثر اس کی صحت پر بہت برا پڑا ہے۔ سفارت خانے نے سفارش کی کہ اس کے ہموطن جو اس شہر میں رہتے ہیں، ہفتہ وار ملاقات کے دن باری باری جیل ہو آئیں تو اس قیدی کا دل بہل جائے گا۔ اعلان میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر صرف پچاس ہموطن بھی اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو سال بھر میں ہر شخص کو صرف ایک بار ملاقات کے لیے جیل جانا ہوگا۔ سال کے بعد وہ قیدی رہا ہو جائے گا۔

اس نے ڈوبتے کو سہارا دینا چاہا۔ یہ سادہ سی غمگین اور یتیم جرمن لڑکی اس جرمن قیدی سے ملنے کے لیے تیار ہوگی۔

جیل میں ملاقات کا کمرہ دراصل ایک لمبی سی بارک تھی جسے سلاخوں سے بند کی ہوئی کھڑکیوں نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصے میں ملاقاتی اپنی چادریں بچھا کر بیٹھ جاتے اور دوسرے حصے میں قیدی ننگے فرش پر بیٹھ کر سلاخوں میں سے کبھی پیار سے جھانکتے، کبھی مایوسی سے نظریں نیچی کر لیتے۔ جیل میں طرح طرح کے قیدی ہوتے ہیں اور ان کے ملاقاتیوں کی قسمیں بھی ان گنت ہوتی ہیں۔ انہی رنگا رنگ کے ملاقاتیوں کے ریلے میں بہتی ہوئی یہ جرمن لڑکی بھی اس بارک میں آ نکلی۔ ادھیڑ عمر، چھریرے بدن اور واجبی شکل وصورت کے اس قیدی نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ اس نے سوچا اب اس کے دن پھرنے والے ہیں۔ پھر اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا، ابھی تو دو سال قید بامشقت میں سے صرف ایک سال گزرا تھا۔ ابھی تو ایک گرمی، ایک خزاں، ایک سردی اور ایک بہار کے گزرنے پر کہیں اسے رہائی نصیب ہوگی۔ جرمن لڑکی کو دیکھتے ہی اسے خواہ مخواہ دنوں کے بہتر ہو جانے کا خیال کیوں آ گیا، وہ پھر رنجیدہ ہو گیا۔

لڑکی نے اسے چائے کا ڈبہ، سگریٹ کے پیکٹ اور ولایتی صابن کی ٹکیہ اپنی ٹوکری میں سے نکال کر دی۔ اتنی سی بات پر قیدی پھر خوش ہو گیا، وہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے اسے جیل میں اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ دوسرے قیدی اس کو اکثر گڈ مارننگ کرتے ہیں، وہ اسے گورا صاحب کہتے

ہیں۔ بعض تو اس کے حصے کی مشقت میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس نے چکی بھی پیسی اور بان بھی بنا۔ اس نے سوتی بھی دھوئی اور اینٹیں بھی چنی ہیں۔ اب وہ آٹھ قیدیوں کے ہمراہ ایک عالی شان قالین بننے پر لگا ہوا ہے۔ یہ قالین اسے بے حد عزیز ہے۔ ابھی اسے مکمل ہونے میں چھ سات ماہ لگ جائیں گے۔ وہ اپنی رہائی کی تاریخ کا حساب کیلنڈر سے نہیں قالین کی تیاری سے لگاتا۔ قالین میں جب بھی وہ گرہ لگاتا تو اسے خیال ہوتا کہ اس نے قید کی زنجیر کا ایک حلقہ توڑ ڈالا ہے۔ پھر وہ تیزی سے گرہیں لگانے لگ جاتا۔

وہ تیزی سے بہت کچھ کہہ گیا۔ لڑکی اتنی روکھی پھیکی تو نہ تھی مگر سب کچھ سنتی رہی۔ وطنیت، فرض، ہمدردی، مجبوری، نہ جانے کون کون سے خیال اس لڑکی کے دل میں رہ رہ کر اٹھتا اور وہ واپسی کا ارادہ کرتی تو اس کا پاؤں پکڑ لیتا۔ یہاں تک کہ ملاقات کا گھنٹہ ختم ہو گیا، انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ وہ ساٹھ منٹ تک کھڑے باتیں کرتے رہے ہیں۔

اگلے ہفتے وہ پھر ملاقات کے لیے پہنچی، قیدی کے قدم بوجھل تھے، سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں سرخ اور جسم نڈھال تھا۔ وہ اس لڑکی پاس مشکل سے پہنچا اور آتے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے سر دیوار سے لگا دیا اور ہاتھوں سے سلاخوں کو تھام لیا۔ لڑکی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے وجہ پوچھی۔ قیدی نے بتایا کہ پچھلے تین دن سے اسے مشقت سے ہٹا کر بیگار میں لگا دیا ہے۔ بیگار بھی عجیب قسم کی ہے جب دھوپ خوب تیز نکل آتی ہے تو اسے ایک گھنٹے کے لیے دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہ وجہ پوچھتا ہے۔ تکلیف سے شور مچاتا ہے۔ اس کی کوئی نہیں سنتا اور سنے بھی کیسے یہاں جرمن زبان کس کو آتی ہے۔ لڑکی نے ملاقات ختم کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج ہی اس سلسلے میں جیلر سے شکایت کرے گی اور ضرورت پڑی تو سفارت خانے کی معرفت احتجاج بھی کیا جائے گا۔

وہ جیلر کے دفتر میں پہنچی تو وہاں اسے کچھ دیر ایک طرف بیٹھ کر بد مزاجی کا ایسا مظاہرہ دیکھنا پڑا کہ وہ مایوس ہو گئی۔ جب یہ آدمی کسی سے سیدھی طرح بات ہی نہیں کرتا تو اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جیلر نے اس کی بات سنی۔ وہ اب بڑا نرم دل نظر آ رہا تھا اور لڑکی کی شکایت بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اس ماتحت کو جس کے حکم سے قیدی کو دھوپ میں بٹھایا جاتا ہے نہ صرف منع کرے گا بلکہ سزا بھی دے گا۔ اس نے لڑکی کو چائے پیش کی اور بڑی عزت کے ساتھ دروازے تک آ کر رخصت کیا۔

اگلے ہفتے پھر ملاقات تھی۔ قیدی آج نمبر اور لکیروں والے کرتے پاجامے کے بجائے پتلون قمیص پہن کر ملنے آیا۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ پچھلی ملاقات پر جب اس نے جیلر سے شکایت کی تو اس کے بعد سب کا رویہ یکایک بدل گیا۔ لڑکی شکریہ ادا کرنے کے لیے جیلر کے دفتر گئی تو اس نے جیلر کا رویہ بھی بدلا ہوا

پایا۔ آج وہ خاصا بے تکلف ہو رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو چائے بھی پیش کی اور رات کو کھانے کی دعوت بھی دی۔ اس نے چائے کی پیالی ہاتھ سے لے لی مگر کھانے کے لیے معذرت کرنے لگی۔ جیلر نے بڑے اطمینان سے کہا "اگر آپ میرے کھانے پر نہیں آسکتیں تو آپ کا قیدی واپس دھوپ میں بیٹھنے پر مجبور ہوگا۔ قیدی کی تکلیف کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی جو اس کے آرام کی خاطر دعوت پہ آنے کی زحمت بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایسی خود غرض عورت سے مزید گفتگو بیکار ہے۔ آپ جا سکتی ہیں۔

اگلے ہفتے قیدی نے ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ اس سے اگلے ہفتے اس نے مکمل سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کسی مغربی ناچ کی دھن بج رہا تھا۔ لڑکی ہر ہفتے ڈنر پر جاتی رہی' اور قیدی کی سہولتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر ایک بار جیلر نے چند دنوں کی چھٹی لی اور اس لڑکی کے ساتھ پکنک منانے کسی پہاڑ پر چلا گیا جب وہ واپس آئے تو اگلی ملاقات پر قیدی نے بتایا کہ اس کی سزا میں جو زیادہ سے زیادہ تخفیف جیلر کے اختیار میں تھی وہ بھی اسے مل گئی ہے۔ اب وہ تین ماہ بعد رہا کر دیا جائے گا۔ قیدی نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔ تین ماہ ہوتے ہی کتنے ہیں' یونہی کٹ جائیں گے۔ چٹکی بجاتے۔ لڑکی نے سوچا تین ماہ کتنے طویل ہوتے ہیں۔ تین ماہ میں بارہ ہفتے ہوتے ہیں' اسے بارہ ڈنر ابھی اور کھانے پڑیں گے۔ ایسا تو ایک ڈنر بھی عمر بھر کے لیے منہ کو بدذائقہ کر دیتا ہے' یہاں تو ابھی تین ماہ اسی حال میں گزریں گے۔ اس کا جی متلانے لگا۔

آج پھر ملاقات کی باری تھی۔ لڑکی ایک نیا ریشمی فراک پہن کر آئی۔ قیدی نے آتے ہی فراک کی تعریف کی اور جب اس نے شکریہ ادا کیا تو قیدی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے دل میں سوچا کہ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس وقت ہمارے درمیان جیل کے سلاخوں والے دروازے ہیں' یہ سوچتے ہی اس کے ہاتھ سلاخوں کی طرف بڑھے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ قیدی نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ کر انہیں زور سے جکڑ لیا۔ کافی دیر خاموشی رہی' البتہ ان دونوں کے چہرے سرخ سے ہو گئے۔ آج ملاقات کے بعد جب وہ رخصت ہوئی تو لڑکی کے کانوں میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے "چار ہفتے باقی ہیں' رہائی اتوار کو صبح ہوگی۔ ہم دونوں سیدھے چرچ جائیں اور شادی کے بعد اپنے فلیٹ کا رخ کریں گے۔" چار ہفتے باقی ہیں مگر ابھی تو اسے شادی کا بہت سا بندوبست کرنا ہے اور ابھی تین ڈنر بھی تو باقی ہیں۔ ڈنر کا خیال آتے ہی اس کا جی متلانے لگا۔

چرچ کا انتظام مکمل ہو گیا' فلیٹ بھی آراستہ ہو گیا' چند دوست اور دو چار موٹریں بھی مل گئیں۔ لڑکی نے اپنی فرم سے کچھ ایڈوانس لے کر جیل میں اس قالین کا آرڈر بھی بک کرایا' جس کی ہر گرہ سے قیدی کی یادیں بندھی ہوئی تھیں' اس قالین میں تو ہزاروں گرہیں لگی ہوئی تھیں ہر انچ میں پانچ سو گرہوں کا حساب تھا' ہر گرہ ایک نہ ختم ہونے والا لمحہ بن چکی تھی' لڑکی نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ یہ قالین ہفتے کے دن اسے مل

جائے اور اتوار کی صبح کو جب قیدی اس کے شوہر کی حیثیت سے فلیٹ میں داخل ہو تو اس کا پہلا قدم سی قالین پر پڑے۔ لڑکی نے اس بات کا قیدی سے ذکر تک نہ کیا۔

لڑکی مجھ سے باتیں کر رہی تھی' میں نے کیلنڈر پر نگاہ ڈالی' مارچ کا مہینہ تھا اور آج ہفتے کا دن تھا۔ لڑکی بولی میں آج صبح قالین لینے جیلر کے دفتر گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ قالین صرف اس شرط پر مل سکتا ہے کہ آج رات کا ڈنر بھی مجھے جیلر کے ساتھ کھانا ہوگا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کل میری شادی ہو رہی ہے مگر وہ نہ مانا اور قالین دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کتنا خود غرض اور بے وقوف ہے' وہ میری مسکراہٹ اور آمادگی کو کتنا غلط سمجھا۔ مسکراہٹ میری عادت ہے' آمادگی میری ضرورت تھی۔ میں نے قیدی کے لیے قربانی دی تھی' یہ میری شرافت ہے' وہ بیوقوف سمجھتا ہے میں خراب لڑکی ہوں۔

"مسٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ' مجھے قالین چاہیے"

پھر وہ لڑکی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر سے چلی گئی' اگلے دن وہ دونوں چرچ سے ہوتے ہوئے اپنے فلیٹ میں پہنچے' فلیٹ کا دروازہ کھلا' قیدی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لڑکی کی پلکیں بھیگ گئیں' قیدی نے سوچا' شاید میں انہی دو چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے جیل گیا تھا' ایک لڑکی اور ایک قالین!

رسیلا

مسز عبدالقادر

میں من کوٹ میں ایک برانچ سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ سکول شہر سے باہر کھلی فضا میں ایک شہر ـــ قریب واقع تھا، جس سے تھوڑے فاصلہ پر مست رام کی کٹیا تھی۔ یہ ایک چری سادھو تھا، جس کے پاس قصبہ کے تمام چرسی جمع ہوا کرتے تھے۔ مست رام زندہ دل، ملنسار اور خود دار آدمی تھا۔ اس نے نور کا گلا پایا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا رس تھا کہ جانوروں تک کو اپنے داؤدی نغموں سے مسحور کر لیتا تھا۔ یہی چیز میری اور اس کی دوستی کا باعث تھی۔

جاڑا ہو یا طوفان رت کے پچھلے پہر رنگی آسا گانا گویا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پو پھٹنے پر جب وہ اپنی غمگین لے اور پرسوز آواز سے ملتانی زبان میں (دت نبیں آونا دلس پیارے کھیڈن دے دن چار ن مائے) گانا شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی اپنی پوری شانِ ربوبیت کے ساتھ کسی جدید راگنی کی تخلیق میں مصروف ہے یا کوئی فرشتہ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ملکوتی نغمے عالمِ ناسوت میں بکھیر رہا ہے۔ اس کے گیت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ میں اس کے گیتوں کا عاشق تھا اور خصوصاً راگنی آسا کا۔ کیونکہ یہ راگنی آسا میری روح کی غذا بن چکی تھی۔ اس لئے میں من کوٹ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب کبھی تبدیلی کی بھنک میرے کان میں پڑتی تو میں انسپکٹر کی منت و سماجت کر کے پھر یہیں رہ جایا کرتا۔

(۲)

من کوٹ کہنے کو تو قصبہ تھا، مگر اپنی دیرینہ شان و شوکت کے لحاظ سے اچھا خاصا شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار، سکول، ہسپتال وغیرہ سب کچھ موجود تھے۔ اگر کچھ کمی تھی تو ریل گاڑی کی۔ کیونکہ ریل گاڑی صرف غازی گھاٹ تک ہی آتی تھی ور باقی چالیس میل کا سفر لاری ،

کسی دوسری سواری کے ذریعہ طے کرنا پڑتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ من کوٹ دوسرے شہروں کی طرح ترقی نہ کر سکا اور اب تک قصبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہاں آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی تھی۔ جو چودھری کہلاتے تھے، ان کی حویلیاں بہت بڑی اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی قلعہ نما تھیں۔

من کوٹ کو ایک صحرائی علاقے میں واقع تھا مگر شاہجہاں کے عہد کی قدیم نہر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہ مقام بہت سرسبز و شاداب تھا۔ اس علاقے میں آم اور کھجور کے درخت کثرت سے تھے۔

نہر کے پاس کوس بھر کے فاصلے پر ٹکر نامی ایک گاؤں آباد تھا جس کے اردگرد من کوٹ کے چودھریوں کی جاگیریں تھیں۔ موضع ٹکر میں پختہ حویلی صرف ایک ہی تھی جس کا مالک چودھری گوبندرام تھا۔

گوبندرام نہایت بوڑھا ادمی تھی۔ تمام چودھری برادری کا سردار تھا۔ راج دربار میں بھی اس کی عزت تھی۔ اس کی حویلی کے سیاہ رنگ آلود اُلے گزشتہ عظمت اور مٹی ہوئی تہذیب کے گن گاتے ہوئے من کوٹ سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

پار جانے کے لئے نہر پہ شاہان مغلیہ کے وقت کا پُل بنا ہوا تھا۔ یہ نہر بہت چوڑی اور دریا کی ہم پلہ تھی۔ اسی نہر کے کنارے الگ تھلگ ہمارا اسکول تھا۔

عموماً شام کے وقت مست رام اپنے دوچار سنگی ساتھیوں کو لے کر میرے پاس آیا کرتا تھا جو طرح طرح کی بے سرو پا خبریں سناتے اور بے تکی بات کرتے۔ اسی طرح ایک شام کو ہم لوگ اسکول کے احاطہ میں جس کے ایک طرف باغیچہ بھی تھا بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے احاطہ مہک رہا تھا اور مست رام سرور کی حالت میں بیت بولنے لگا۔

اتنے میں اس کا ایک اور جڑی دوست آ گیا جسے مست رام نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا، مگر وہ کھڑا رہا اور سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یار بڑے بیت باز بنے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے“؟ مست رام بیت کو ادھورا چھوڑ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔ ”یار کیا بات ہے“؟ اس جڑی نے کہا: ”سنا ہے مظفرگڑھ اور غازی گھاٹ میں لوگ دھڑا دھڑ پلیگ سے مر رہے ہیں“۔ میں نے کہا: ”ہاں اس کے متعلق آج میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے“۔

یہ خبر سن کر سب سہم گئے۔ ”اب کیا ہو گا ماسٹر جی“؟ سب نے پریشانی سے کہا۔

میں نے جواب دیا۔ "خدا رحم کرے، اگر زندگی ہے تو کوئی خطرہ نہیں" وہی جی سی کہنے لگا۔ "خدا اب کیا رحم کرے گا، دنیا تھوڑے ظلم کر رہی ہے، کلجگ ہے ماسٹر جی کلجگ۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے کہ یک گائے بیمار تھی سڑک کے درمیان کہیں جا بیٹھی۔ ادھر سے لاری آ رہی تھی۔ تو لاری والے اندھے نے اس کے اوپر لاری چڑھا دی جس سے گائے کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر لاری والے سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔

اگلے دن پنڈت کا لڑکا ایک اچھوت عورت بیاہ لایا۔ سنا ہے کہ وہ کہیں تماشے میں رانی کا روپ بھرا کرتی تھی۔ وہیں اس پر ریجھ گیا اور اسے گھر ڈال لیا۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بھول ناتھ کا ایک جوگی جو کہیں باہر سے آیا تھا، شامت کا مارا چودہری متھرا داس کے گھر چلا گیا اور شہری طریقے سے ناواقف ہونے کے باعث اندر جا گھسا۔ کمرے میں اسوقت چودہری متھرا داس کا چھوٹا لڑکا جو نیا نیا ولایت پاس کر کے آیا ہے، اپنی میم کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ جوگی کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا اور چور چور کہہ کر جوگی کو پکڑ لیا۔ پھر چمڑے کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ مگر جوگی نے بھی بڑے بڑے سراپ دیئے۔ رام رام جوگی کا سراپ بھی اٹل ہوتا ہے۔ جوگی کی زبان کالی ہوتی ہے جو عالم کو نشٹ کر دیتی ہے۔ وہ دیر تک نمک مرچ لگا کر اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔

جوں جوں دن گذرتے گئے۔ نئی نئی خبریں اڑتی رہیں، جس سے پتہ چلتا تھا کہ پلیگ مظفر گڑھ اور غازی گھاٹ کے علاوہ دیہات میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔

بیساکھ کے آخری دن تھے، صحرا کی شفق آلود شام تھی۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے بور سے لدے ہوئے آم کی ڈالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے، کوئل اپنی پُردرد آواز میں کوکو کا شور مچا رہی تھی۔ میں چبوترے پر چارپائی ڈالے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ ستے میں مست رام بھی آ گیا۔

"کچھ آپ نے بھی سنا ماسٹر جی؟" اس نے دکھلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو، کیا کچھ نئی خبر لائے ہو؟" میں نے پوچھا۔ مست رام نے کہا: "ہاں ماسٹر جی لوگ کہتے ہیں کہ موضع لودہڑی میں ایک ڈنگرے کی عورت کے بچے کی بجائے بلا پیدا ہوئی ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بولنے لگی ہے۔ اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ میں نرکھ کی چڑیل ہوں جو دنیا کو ہڑپ کرنے آئی ہوں۔ پھر وہ سارے گاؤں میں پھری اور بعد ازاں اس نے من کوٹ کا رخ کیا۔ آہ اب کوئی دن میں اس شہر پر بھی تباہی آنے والی ہے"۔

اتنا کہہ کر وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھنے لگا گویا اسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا

اس کی باتیں نہ سن لے۔ مجھے اس کی بدحواسی پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "کیوں ماسٹر جی اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے"؟ اس نے کھسیانا ہو کر کہا۔

میں نے کہا: "بھئی مست رام! بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ پچھلے زمانے میں جب بیلاریوں کا نیل پھوٹ جایا کرتا تھا تو وہ ایسی ایسی داستانیں جوڑا کرتے تھے۔ وہ چڑ کر کہنے لگا "واہ ماسٹر جی سب باتیں تو جھوٹ نہیں ہوتیں، پڑھے لکھے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ کسی کی بات کو مانتے ہی نہیں۔ مگر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا تھوڑے ہی دنوں میں آپ سب کچھ دیکھ لیں گے۔ برے آثار تو شروع ہو ہی گئے ہیں"۔

میں نے اکتا کر کہا: "اچھا جو کچھ دیکھنا ہے بعد میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ مگر وہ آثار جو تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا، مجھے بھی دکھا دو۔" مست رام نے متانت سے کہا: "تو کیا آپ نے رات کو کبھی کتوں کا رونا نہیں سنا؟ وہ آج کل ایسی خوفناک آواز سے روتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گُنی لوگوں کا قول ہے کہ رات کو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں۔ جنہیں کتا اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر چیختا چلاتا ہے"۔ مست رام کے کہنے پر فوراً مجھے ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ رات کو اتفاقاً میری آنکھ کھلی، تو اس وقت باہر ایک کتا منحوس آواز میں لمبی لمبی چیخیں لگا رہا تھا جس کا میرے دل پر بہت ناگوار اثر ہوا اور پھر تمام رات نیند نہ آئی۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا: "اونہہ یہ کوئی بڑی بات نہیں، کتے ہمیشہ رویا کرتے ہیں۔ یہ برے آثار کی کوئی معقول دلیل نہیں"۔ مست رام نے زچ ہو کر کہا۔ "اچھا نہ سہی، لیکن یہ تو بتایئے آپ نے آسمان پر کبھی پہلے اتنی سرخی دیکھی تھی۔ پرانے زمانہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جب کسی بے گناہ کو سولی چڑھایا جاتا تھا تو سرخ آندھی آتی تھی۔ مگر اب تو آندھی بھی نہیں اور آسمان بلاوجہ خون کبوتر ہو رہا ہے۔ اگر یہ بدشگونیوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہے"؟

ایک دم میری نظر سامنے کی طرف اٹھی۔ نہ جانے واہمہ کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ لمبا چوڑا صحرا آسمان کی سرخی سے لہولہان ہو رہا ہے بلکہ نہر کا پانی بھی سرخ بانات کی چادر کی طرح ہلکورے لیتا اور موجوں کی خفیف سلوٹیں ڈالتا سست روی سے بہہ رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا تاہم میں نے ایک اونہہ کے ساتھ بات کو ٹال دیا۔

(۳)

جیٹھ کا آغاز تھا حسب دستور گرمی کا جوش بڑھ رہا تھا۔ ان دنوں میں نے مست رام کو

کہیں نہ دیکھا۔ اس لئے سیدھا کو خود اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ اس کی کٹیا گلو کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف پانی کا چہ بچہ تھا۔ جہاں اس نے کبوتروں کے لئے لمبی لمبی چھتریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ وہ اسوقت چرسیوں کے درمیان ایک کبوتر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ سب تعظیم کو اٹھے۔ ایک چرسی نے فوراً کٹیا سے ایک رنگیلی چارپائی نکال کر بچھا دی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بھئی مست رام دو دن کہاں غائب رہے"۔ مست رام نے اپنے کبوتر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی میرا بچہ ٹوڑو بیمار ہو گیا تھا"۔

میں نے کہا۔ "بچہ ٹوڑو کون؟ کیا تمہاری مراد اس کبوتر سے ہے جسے چھاتی سے لگائے ہو"۔ اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "ہاں ماسٹر جی یہی میرے بال بچے ہیں۔ ان پہ میری جان جاتی ہے۔ یہ خدا کے جی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں بڑا آنند ملتا ہے"۔

اس کے بعد اس نے اٹھ کر کٹیا سے ایک نیا حقہ نکالا اور بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں حقہ پینے لگا اور اس نے پاؤں دبانا شروع کئے۔ میں نے کہا "بھئی کئی دن سے کوئی تازہ خبر سننے میں نہیں آئی"۔ مست رام نے کہا "ماسٹر جی آج کل تو چاروں طرف پلیگ کی خبریں ہی پھیل رہی ہیں اور غالباً آج یا کل وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی"۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ کیسے؟ کیا اس نے تمہیں پیغام بھیجا ہے"۔ اس کے جواب میں مست رام نے اپنے ایک چرسی دوست سے کہا۔ "اچھا بھئی دھنی تم خود اپنی زبان سے ماسٹر جی کو وہ واقعہ سناؤ"

دھنی لمبی مونچھوں والا شخص تھا۔ جو عام چرسیوں کی طرح مرا ہوا نہ تھا۔ یہ آدمی یکہ چلایا کرتا تھا۔ اس نے پہلے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر گول مٹول دیدوں کو پھیلا کر کہنے لگا۔ "ماسٹر جی رام رام کچھ نہ پوچھئے"۔ پھر کافی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "میں روزانہ رات کے ڈھائی تین بجے موضع دوہرہ سے سواریاں لادتا ہوں اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی من کوٹ پہنچ جاتا ہوں۔ میری سواریوں میں زیادہ تر گوالے اور دھوبی وغیرہ ہوتے ہیں۔ جنہیں صبح سویرے ہی اپنے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ رات جب سواریاں لادنے لگا تو ان میں ایک برقعہ والی عورت بھی تھی۔ میں رات کے وقت اکیلی عورت کو سوار کرنے سے ہچکچانے لگا جس پر وہ عورت منتیں کرنے لگی۔ ان سواریوں میں موضع لوہڑی کا ایک چھٹی رساں بھی تھا۔ جو رخصت گزار کر کسی گاؤں سے واپس آ رہا تھا۔ اور صبح اسے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔ اس عورت کی منت سماجت پر اس نے کہا۔ "بھئی لے بھی چلو اسے۔ یہ بے چاری اب رات کو کہاں بھٹکتی پھرے گی، ہم سب بھی بیٹھے

والے ہیں اسے لے جانے میں کوئی حرج نہیں"۔

چھٹی رساں کے کہنے پر میں نے اسے سوار کر لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ من کوٹ جائے گی۔ خیر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ لیکن رام جانے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر رک جاتا اور بری طرح ہانپنے لگتا۔ گویا منوں بوجھ کے تلے دبا ہوا ہو۔ آخر میں نے تنگ آ کر اس کی لگام پکڑ لی اور قدم قدم اسے چلانے لگا حتی کہ کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور گھوڑے کا دہانہ بھی زخمی ہو گیا"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے جن پر واقعی چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر کیا ہوا"۔ وہ کہنے لگا۔ "اسی طرح میں نے کوئی پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا تھا کہ گھوڑا پھر ٹھہر گیا۔ اسی وقت چٹھی رساں نے یکہ سے اترتے ہوئے کہا کہ میں ذرا پیشاب کر آؤں اور پھر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا یہ اشارہ پا کر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا

تھوڑی دور پر ایک درخت کی اوٹ میں جا کر اس نے مجھ سے کہا "بھئی اس عورت کو تو سوار کر کے ہم نے بڑی غلطی کی، کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی ہوائی مخلوق ہے"۔ میں نے کہا: "وہ کیسے"؟ چٹھی رساں کہنے لگا۔ "میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں، وہ کسی وقت جواں دکھائی دیتی تھی کسی وقت بوڑھی، کبھی گوری ہو جاتی اور کبھی کالی۔ اس لئے میں نے اسے زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ لہذا اب معلوم ہوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں بھی ہیں۔ میں ڈر کر پیشاب کے بہانے نیچے اتر آیا"۔

چٹھی رساں کی بات سن کر میرا رنگ فق ہو گیا مگر وہ بڑا دل گردے والا آدمی تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ایسے موقع پر دل چھوڑنا مناسب نہیں۔ اس کے بعد وہ پھر یکے پر سوار نہ ہوا بلکہ گھوڑا پکڑ کر چلانے میں میری مدد کرتا رہا، یہ اسی کی ہمت و کوشش تھی کہ میرا یکہ دن چھپتے ہی موضع لوہڑی پہنچ گیا جہاں میں نے اپنی سب سواریوں سے کہا، چونکہ میرا گھوڑا بیمار ہو گیا ہے اور میں آگے نہیں جا سکتا اس لئے کرایہ معاف کرتا ہوں۔

سواریاں اتر گئیں مگر برقعے والی کہنے لگی، لالہ اور کسی سے خواہ کرایہ لو یا نہ لو مجھ سے ضرور لے لو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں ایک نوٹ دے دیا اور قریب کی ایک گلی میں داخل ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد چٹھی رساں نے کہا "بھئی تم پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ دکھاؤ تو کتنے کا نوٹ دے گئی ہے"؟

میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔۔۔ "ہائیں یہ کیا"؟ اس نے نوٹ کو لالٹین کی

روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو معمولی کاغذ ہے"۔ میں تعجب سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جھک گیا۔ چھنی رس نے کہا ٹھہرو بھئی اس پر تو کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اور اس کاغذ کو لالٹین کے بالکل قریب سے دیکھ کر پڑھنے لگا۔

کاغذ کا مضمون بہت لرزہ خیز تھا۔ لکھا تھا کہ یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ میں لاری سے جانا چاہتی تھی مگر تمہارا یکہ دیکھ کر جی میں آئی کہ اسی پر چلی جاؤں، جلدی جا پہنچوں گی، مگر یہ خیال ہی نہ آیا کہ گھوڑا میرا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔ میں دراصل عورت کے بھیس میں پلیگ تھی لیکن تم لوگ بھی بہادر نکلے جو یکہ کو گھسیٹ گھساٹ کر اوجڑی تک لے آئے۔ میں تم لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ من کوٹ تو مجھے پہنچنا ہی ہے آج نہ سہی کل سہی تاہم تم لوگوں کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی، اس کے صلہ میں تم لوگوں کی جان بخشی کرتی ہوں۔

اس مضمون سے ہمارے ہوش اڑ گئے۔ میں نے یہ کاغذ جیب میں رکھا اور فوراً وہاں سے روانہ ہوا تاکہ من کوٹ جا کر یہ کاغذ لوگوں کو دکھاؤں۔ اب میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے فوراً مجھے من کوٹ پہنچا دیا۔ مگر من کوٹ پہنچ کر جب میں نے وہ کاغذ نکالنے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی"۔

ابھی دھنی اپنا بیان ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا خس و خاشاک اڑاتا ہوا کٹیا کی دیواروں سے ٹکرایا۔ "اوہ، کتنی سخت آندھی ہے"۔ مست رام نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو سچ مچ خوفناک اور سیاہ آندھی بلائے ناگہانی کی طرح تیز روی سے چلی آتی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا سکول کی طرف بھاگا مگر میرے پہنچتے ہی پہنچتے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

یہ آندھی کیا تھی خدا کا قہر تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ گئے مکانوں کی منڈیریں اور مزدوروں کے چھپر صاف اڑ گئے۔ آم کا بور بالکل جھڑ گیا۔ تمام رات آندھی بڑے زور شور سے چلتی رہی اور صبح کے قریب بارش کا چھینٹا پڑنے سے اس کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن صبح صبح مست رام میرے پاس آیا اور آتے ہی رات والی آندھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس آندھی کو پلیگ کا پیش خیمہ تصور کرتا تھا کیونکہ ان دنوں اس کو سوائے پلیگ کا چرچا کرنے کے دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا۔ وہ بہت ہراساں تھا۔ میں نے ان توہمات باطلہ سے اس کا خیال ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ خیر اس وقت تو وہ کچھ قائل بھی ہو گیا مگر شام کو پھر وہی خبط لئے آ دھمکا۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک اور چری بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا "ماسٹر جی مہاراج، آج مادھو نے ایک اور تازہ خبر سنائی تھی کیا اسے بھی آپ جھوٹ ہی کہیں گے؟" میں نے کہا: "کیسی خبر ہے جلدی بیان کرو"۔ مست رام نے جواب دیا "مادھو خود ہی بیان کرے گا اور اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں کیونکہ میری بات کو تو آپ ہنسی میں اڑا دیتے ہیں"۔

مادھو ادھیڑ عمر کا بھٹیارا تھا جس کے سر پر لمبی سی چوٹی اور کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ اس نے ایک میلی کچیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور گلے سے ننگا تھا۔ یہ کچھ نیم پاگل سا آدمی تھا جس کی شکل و شباہت دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ لہٰذا میں نے ہنسی چھپاتے ہوئے کہا "سناؤ بھئی مادھو کیا بات ہے؟"

مست رام نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو خبردار جھوٹ نہ بولنا"۔ مادھو نے پھٹے پھٹے دیدوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے اور سونے کے مندروں کو پکڑ کر کہنے لگا: "مہاراج میں اس پوتر سونے کو چھو کر کہتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا"۔ مست رام نے کہا: "اچھا تو پھر بیان کرو"۔

مادھو نے کہا: "مہاراج، دوپہر کو میں حسب معمول بھٹی کے لئے گھاس پھوس جمع کرنے کی خاطر شہر سے باہر گیا اور قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو پیچھے دور سے کسی نے مجھے مادھو مادھو کہہ کر پکارا۔ میں نے سمجھا کوئی جان پہچان والا ہو گا، کیونکہ سوائے جان پہچان والے کے کوئی کسی کا نام لے کر کیسے پکار سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ میں آگے بڑھا تو قریب کے کھیت سے پھر آواز آئی۔

بازو پر ہرل کا کھیت تھا میں اس طرف ہو لیا تو کچھ دور پر ہرل کے کھیت میں ایک بوڑھیا دکھائی دی جو اپنے بدن پر سالونا لئے پڑی تھی۔ اس عورت کا چہرہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ میں دہل گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں سخت پیاسی ہوں جلد کہیں سے پانی لاؤ۔ مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا اور اٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا: 'ماتا پانی کہاں سے لاؤں؟ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں'۔ اس نے حکم دیا کہ جا کر نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہہ کر واپس ہوا۔

ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اونچی آواز میں پکار کر کہا: "مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا، میں چڑیل ہوں اگر تم پانی لے کر نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں"۔ اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں اتر گئے اور خوفزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر پر آ کر دم

لیا"۔ اس کی یہ مضحکہ خیز داستان سن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر تم پانی لے کر گئے تھے"؟ مادھو نے کہا۔ "رام رام پھر وہاں کون جاتا"۔ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "اچھا مٹی کے مادھو اب وہ تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا: "بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا۔ مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہیئے اور تم مہربانی کر کے در گھر تک پہنچا دو کیونکہ اکیلا جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میں نے اس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام سے گھر تک پہنچانے جائے۔ آخرکار اسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا: "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا" مست رام نے افسوسناک لہجے میں کہا "ماسٹر جی! اب خیر کہاں، آج مادھو بھی مر گیا ہے"۔ یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اختیاری سے کہا۔ "ہائیں رات کو تو وہ اچھا بھلا تھا۔ اس قدر جلد کیسے مر گیا"؟ مست رام نے کہا۔ "ماسٹر جی مر تو وہ اسی وقت گیا تھا جس وقت اس کے سر پر پلیگ نے چپت لگائی تھی"۔ میں نے کہا: "خیر ان باتوں کو چھوڑو، وہ پاگل آدمی تھا واہمہ کا شکار ہو گیا ہو گا، مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا"۔ مست رام نے کہا: "اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آ کر مجھے لے گیا لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کا منہ اور سر سوجا ہوا تھا، اس کے گلے میں پلیگ پھوٹی تھی"۔

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہوا جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پر رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے پاس بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ غرضیکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی پھل دار ڈالوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے

اسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آ نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سنائی۔ اس نے کہا "میں بھی شندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سن کر آیا ہوں"۔ میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے؟" اس نے کہا۔ "شندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودہری درگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا جہاں باتوں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا تو تحصیل کے نکڑ پر اسے ایک عورت ملی جو دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اس کی آواز بہت دردناک تھی۔ اس نے چودہری سے خیرات مانگی، آدھی رات اور سنسان جگہ میں اس کی مکروہ آواز کا چودہری پر بہت اثر ہوا۔ اس نے کچھ زر نقد عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا مگر عورت نے وہ پیش کش قبول نہ کی اور کہا کہ میں بھوکی ہوں مجھے کھانے [illegible] چودہری نے نرمی سے کہا: یہاں میرے پاس کچھ نہیں، البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا۔

چودہری کا جواب سن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی اور [illegible] نہیں میں تمہارے گھر نہ چلوں گی۔ کیونکہ تم بھلے آدمی ہو۔ بس اتنا کہتے ہی اس کا قد لمبا ہونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر چودہری کے اوسان خطا ہو گئے اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا۔ اب سنا ہے وہ یگیہ کی تیاری کر رہا ہے"۔

خیر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دونے انہوں نے مجھے بھی دیئے۔ میں نے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں"؟ انہوں نے کہا "چودہری درگا داس کے ہاں سے"۔ میں نے کہا "کیا تقریب ہے"؟ انہوں نے جواب دیا "چودہری جی نے یگیہ رچایا ہے"۔ میں نے کہا "کیوں"؟ انہوں نے ہنس کر جواب دیا: "ان کی مرضی"۔ میں لاجواب ہو گیا اور دونے چپکے سے اٹھا کر رسویا کے حوالے کر دیئے۔

(۴)

رفتہ رفتہ سن کوٹ بھی پلیگ کی زد میں آ گیا اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ سن کوٹ میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر کر مر جاتے اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر بیمار پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چکے تھے اور باقی کثرت اموات کی بدولت مردوں سے بدتر ہو رہے تھے غرضیکہ ہر طرف بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے ہی نہر کا پل تھا جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس وحشت خیز منظر کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا: ”بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی تھی“۔ مست رام نے کہا ”یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے کیونکہ یہ نگر جا رہے ہیں“۔

میں نے کہا ”نگر کون سا اتنا دور ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکے“۔ مست رام نے کہا: ”نہیں وہاں پلیگ نہیں جا سکتی، ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے“۔ میں نے کہا: ”نگر میں پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی“۔

مست رام نے جھوم کر کہا: ”وہ رسیلے کی نگری ہے ماشرجی رسیلے کی۔۔۔ جس کا نام سنتے ہی پلیگ رفوچکر ہو جاتی ہے“۔ میں نے تعجب سے کہا: رسیلے کی نگری۔۔۔ وہ رسیلا کون ہے؟“ مست رام نے کہا ”ماشرجی رسیلا ایک بھاگوان پرش تھا۔ جتی ستی سا، تگڑی آدمی تھا، بلوان تھا، ایشور کا روپ تھا، ایک وقت میں اس نے پلیگ کو اپنی قوت بازو سے زیر کیا تھا“۔ میں نے اشتیاق سے کہا ”وہ کیسے“؟ مست رام کہنے لگا یہ بہت لمبا قصہ ہے جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں“۔

آخرکار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہو گیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھول محیط رہتی تھی اور نامعلوم طور پر آہ بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے تا کہ بستر گول کروں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا کم کر دیا تھا کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا۔ اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا دو دن سے میں بھی بہت پریشان تھا کیونکہ میرا رسویا بھاگ چکا تھا اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو ثقیل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولھا جھونکا اور کچا پکا کھانا زہرمار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا۔

پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلوئی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلساتے تھے مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی جس سے میں چونک اٹھا اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اُف خدا بچائے۔ کھڑکی کے باہر مجھے ایک نہایت مکروہ چہرہ دکھائی دیا۔ یہ چہرہ ایک ضعیف عورت کا تھا جس کا رنگ نیلالا تھا اور منہ پر جابجا سیاہ دھبے پڑے تھے۔ آنکھیں ابھری ہوئی اور سرخ تھیں۔ یہ عورت غصیلی آواز میں خودبخود بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے نفرت سے کہا: "تم کون ہو"؟ بڑھیا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم تیسا"۔

اس کے بے باکانہ جواب پر گو میں حیران رہ گیا، تاہم اسے جھڑک کر کھڑکی سے ہٹ جانے کو کہا۔ جس پر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی اور میں نے فوراً اٹھ کر کھڑکی بند کر دی لیکن جب واپس چارپائی کی طرف آیا تو اسے سامنے دروازے پر کھڑا پایا۔

اس نے ایک بدرنگ سا لہنگا اور چولی پہن رکھی تھی اور سر سے ننگی تھی۔ سر کے بال جو خشک ہو کر جٹاؤں کی شکل میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے مٹی سے اٹ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ خاص طور پر بدنما اور غلیظ تھے۔ انگلیاں کچھ عجیب طرز کی ٹیڑھی اور مڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

نہ جانے اس بڑھیا کو دیکھ کر کیوں میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور میں نے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں مائی کیاچاہتی ہو"؟ بڑھیا نے جواب دیا "تمہارا سر صدقہ"۔ میں نے کہا: "میرے پاس تو اس وقت کچھ بھی نہیں، میرا رسویا کل سے بھاگا ہوا ہے خود کھانے سے ناچار ہوں"۔ بڑھیا نے خشک لہجہ میں جواب دیا "میں بھی تو ناچار ہوں، تمام شہر خالی پڑا ہے، اگر کچھ دے دو گے تم تمہارا ہی بھلا ہے لیکن تم لوگ جان تو دے دیتے ہو تاہم اس کی قیمت نہیں دے سکتے"۔ بڑھیا کی گفتگو سے میں حیران رہ گیا، کیونکہ اس کا انداز گفتگو سراسر تحکمانہ تھا وہ بجائے التجا کے دھمکی دے رہی تھی۔

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسی ناپاک اور شیطانی جھلک دکھائی دی جس سے گھبرا کر میں نے کہا "مائی جی یہ کمرہ تمہارے سامنے پڑا ہے جو چاہو لے سکتی ہو"۔ بڑھیا آگے بڑھی اور برتنوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مٹی کے ایک برتن میں تھوڑے سے کالے ماش پڑے تھے جو اس نے لہنگے کے پلو میں باندھ لئے، پھر تپائی سے چابیاں اٹھا کر میرا کیش بکس کھولنے لگی، یہ دیکھ کر مجھے زرِنقد جانے کا اندیشہ ہوا لیکن روکنے کی ہمت نہ پڑی۔

کیش بکس میں ڈیڑھ سو کے قریب روپیہ تھے مگر اس نے صرف ایک پیسہ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ میں ہکا بکا ابھی اسی طرح کھڑا تھا اور کیش بکس بھی بدستور میرے سامنے کھلا پڑا تھا کہ عین اسی وقت باہر سے مست رام کی آواز سنائی دی۔ وہ بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا اور بے صبری

سے کہنے لگا "کیا وہ یہاں آئی تھی"۔ میں نے پوچھا "کون" مست رام نے جواب دیا "پلیگ"۔ آہ میں نے اس سے سخت کلامی کی۔

مست رام کی زبانی پلیگ کا نام سن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "پلیگ تو نہیں ایک بڑھیا بھکارن آئی تھی"۔ اس نے کہا "وہ کہاں ہے"؟ میں نے کہا "چلی گئی"۔

"آہ کدھر گئی"۔ اس نے بدحواسی سے کہا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ "تو اس سے پوچھا۔ "تم نے اسے کیا دیا"؟ اس پر میں نے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ آئی اور کس طرح خیرات لے کر رخصت ہو گئی۔

وہ کف افسوس ملتے ہوئے بولا "بس اب تو اس کے پلیگ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھا اس نے صدقہ میں آپ سے صرف کالے ماش اور تانبے کا پیسہ لیا۔ یہی دو چیزیں تو صدقہ کے لئے مخصوص ہیں۔ اُف اب میری خیر نہیں"۔

میں اس کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر تسلیاں دینے لگا، حالانکہ خود میرے دل میں بھی ہول اٹھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح غم و الم میں کھویا ہوا واپس چلا گیا اور میں اس روز بہت مغموم رہا۔ شام کے قریب میں اس کی کٹیا کی طرف گیا مگر وہ وہاں نہ ملا۔ وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا، اسی لئے مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں واہمہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی خیال میں میں نے رات کو بھی بُرے بُرے خواب دیکھے۔ مگر شب کی آخری ساعتوں میں جب مست رام نے گانا شروع کیا (وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) تو جان میں جان آئی۔

صبح اشنان سے فارغ ہو کر میں پھر مست رام کی کٹیا کی طرف گیا۔ وہ گھٹنوں پہ سر رکھے آنگن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی چلا کر کہنے لگا: "ماسٹر جی ادھر مت آنا ابھی میری کٹیا میں ایک مردہ چوہا پایا گیا ہے"۔ میں نے مضطرب ہو کر کہا: "تو پھر تم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو ادھر میرے مکان پہ چلو۔ تمہارا یہاں رہنا اچھا نہیں"۔ اس نے کہا: "اچھا ابھی نہا کر آتا ہوں۔ آپ جائیے"۔

میں سکول میں آ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ کہیں غائب رہا۔ آخر شام کو میرے پاس آیا۔ آج اس نے نئے کپڑے پہنے تھے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے گویا نشہ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک شکیل جوان دکھائی دیتا تھا۔

وہ آتے ہی پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور تھکاوٹ کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے کہا: "بھئی کہاں رہے، میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں"۔ اس نے کہا "کمیٹی والے کٹیا کی

صفائی کرنے آ گئے تھے پھر مجھے پکڑ کر ... لے گئے جہاں انہوں نے ... دن ... رکھا اور اب ٹیکہ لگوا کر خلاصی ہوئی۔ میں ادھر سے آتے ہی آخری سلام کے لئے آپ کے چرنوں میں حاضر ہو گیا ہوں"۔

میں نے تعجب سے کہا "تو تم بھی کہیں جا رہے ہو؟" اس نے کہا "ہاں من جی ... چکا ہے، اب تو جانا ہی پڑے گا"۔ میں نے پوچھا "کیسا سمن؟" مست رام نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "وہی مردہ چوہا"۔ میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا "تمہارے بھی وہم کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے؟ ذرا آئینہ تو دیکھو ... بیٹے ... لگتے بھی معلوم ہوتے ہو"۔ مست رام نے بدستور غمگین لہجے میں ... تو موت کا بہانہ کہتے ہیں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں ... کربہ النظر آدمی ہوں ... دنیا چھوڑنے کا کچھ غم نہیں صرف ان بے زبان جانوروں کا خیال ہے جو ... تک ... لاوارث ہو جائیں گے"۔ میں نے اکتا کر کہا: "اچھا یہ ذکر چھوڑو، اس وقت کوئی ... گیت سناؤ"۔

میرے اصرار پر مست رام نے سوز و گداز سے بھرا ہوا ایک ... گیت شروع کیا جو پچھلے زمانے میں دلہن کی رخصت کے وقت گایا جاتا تھا۔ اس کی دردبھری آواز بلند ہوتے ہی فضا میں ایک اداسی کی لہر دوڑ گئی۔ ان غمگین اور الوداعی نغمات کے اثر سے ایسا معلوم ہونے لگا گویا ہزاروں بے بس دلہنیں اپنی مسرت بھری آزاد دنیا کھو کر سسرال کے مایوس کن اور تاریک ماحول میں دھکیلی جا رہی ہیں یا ہزاروں مسافرانِ عدم (جن کی رنگین اور دلچسپ زندگیاں فرشتہ اجل نے جبراً ختم کر دی ہوں) شمشان خموش کی طرف روانہ ہیں۔ مجھ پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

کچھ دیر بعد مست رام نے گانا ختم کیا اور اپنی کٹیا میں واپس چلا گیا، کیونکہ رات بھر اسے اپنے کبوتروں سے جدا رہنا گوارا نہ تھا۔ چاندنی رات تھی میں بھی اپنا دل بہلانے کی خاطر نہر پر چلا گیا اور رات کو دیر سے واپس آیا۔ چبوترے پر چارپائی بچھی ہوئی تھی، بستر لگا کر لیٹ گیا۔

آج رات بہت گرم تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت اُمس ہو رہا تھا۔ ساکت وصامت آسمان کے عین درمیان چاند گوہرِ شب تاب کی طرح چمک رہا تھا جس کی خاموش کرنیں درختوں کی گھنی تاریکیوں کو چیر کر تھکی ماندی شکستہ حال دھرتی کے میلے خاکستری دامن پر روپہلی نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

دفعتاً ماحول کچھ ایسا گم سم اور چپ چاپ ہو گیا کہ میرا دل خود بخود کسی نامعلوم دہشت

اور پوشیدہ خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ میں حیران تھا کہ اس روز فرما سنانے تک کون
ایسی بے چینی اور تملاہٹ نہاں ہے جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر دل شدت سے محسوس کر رہا
ہے۔

نہ جانے اس قیامت خیز رات کے خطرناک لمحوں میں کونسی مخفی قوت کسی کوشش میں
مصروف تھی۔ کوئی پراسرار ہستیاں ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔ کوئی غائبانہ لاہوتی مخلوق کی آمد
پر ایسا شور برپا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ ماحول کیوں اتنا مسموم ہو رہا تھا
جس کے اثر سے میری حالت دم بدم بگڑ رہی تھی۔

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور چندو بھنگی کو آواز دی جو چبوترے کے قریب ہی چارپائی پر
پڑا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ فوراً اٹھا اور کہنے لگا۔ ''مالک میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا ہوں''
میں نے کہا ''چندو خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے، میرا دل بیٹھا جاتا ہے''

چندو میرے قریب کھڑا اپنے ہاتھوں کو زور زور سے مل رہا تھا۔ (جیسی کہ اس کی عادت
تھی) میں نے سوچتے ہوئے پھر اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا ''مالک میرا بھی یہی حال ہے''۔
میں نے متعجب ہو کر کہا ''تو ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' اس نے جواب دیا ''مالک وجہ تو جانتا ہوں
مگر کچھ کہہ نہیں سکتا، کیونکہ میں بے علم آدمی ہوں ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو''۔

میں نے گھبرا کر کہا ''ہاں ہاں وہ وجہ ضرور بتاؤ، یہاں علمیت کا سوال نہیں، تجربہ علیحدہ
چیز ہے''۔ چندو نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا ''مالک کئی برس گزر گئے، میں اس وقت
جوان تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے چودہری کی دوسرے گاؤں کے چودہری سے سخت دشمنی تھی اور اسے
چوری کا خطرہ تھا۔ لہذا اس نے مجھے چوکیدار ملازم رکھا۔ میرا باپ بہت بوڑھا آدمی تھا اور اسے بے
خوابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے وہ اکثر رات کو میرے ساتھ چودہری کی حویلی میں چلا جاتا
کہ رات آسانی سے کٹ جائے۔

چنانچہ ایک رات جب ہم دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایسا ہی سماں چھا
گیا اور اسی طرح ایک پرہیبت خاموشی اور جانسوز پژمردگی طاری ہو گئی۔ میں بہت ہی خوفزدہ ہوا۔
مگر میرے باپ نے کہا۔ ''بیٹا حوصلہ رکھو اور بھجن گاؤ، کیونکہ اس وقت کوئی پوتر روح دنیا سے
جا رہی ہے جس کی پیشوائی کے لئے معمولی بھوتوں کے علاوہ ان کا سردار بھی آیا ہے''۔

غرضکہ ہم دونوں بھجن گانے لگے اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت خودبخود زائل ہو گئی۔ آخر
صبح معلوم ہوا کہ رات کو قریب ہی کے گھر میں پجاری کی نوجوان اندھی کنیا گزر گئی ہے۔

میں نے متوحش ہو کر کہا۔ ''تو کیا اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ یہاں بھی گردو پیش کوئی موت واقع ہونے والی ہے۔ جی ہاں ضرور۔ چندو نے بڑے وثوق سے کہا۔ اس وقت کوئی پوتر روح دنیا سے جا رہی ہے جس کی خاطر خود موت کا فرشتہ یم دوتوں کے پورے لشکر سمیت وارد ہوا ہے۔ یہ اسی کے پروں کی تیکھی جنبش سے مہیب خاموشی اور لرزہ خیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

چندو کی اس گفتگو سے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ میں فرط خوف سے بے حال ہو کر چارپائی پر گر گیا اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ ''آہ وہ فرشتہ شاید میری ہی روح قبض کرنے کو آیا ہے۔ چندو نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ ''مالک ایسی بات نہ کہو ابھی کوئی دم میں یہ سختی رفع ہو جائے گی۔ آؤ وہی بھجن گائیں جو ایک ایسے ہی وقت میں میں نے اپنے باپ کے ساتھ گائے تھے۔

غرضیکہ اس نے نہایت عقیدت اور جوش سے بھجن گانا شروع کیا۔ ساتھ میں نے بھی لڑکھڑاتی زبان اور کمزور آواز میں اس کے ساتھ بھجن گایا مگر باوجود اس کے کئی گھنٹوں تک وہ حالت بدستور قائم رہی۔ رات اتنی لمبی ہو گئی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی مست رام بھی آج ایسا خاموش تھا جیسے وہ آسا چھیڑنا بالکل بھول گیا ہو۔

آخر خدا خدا کرکے یہ کافر رات ختم ہوئی۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ بے حس و حرکت درخت آہستہ آہستہ انگڑائیاں لیتے ہوئے گہری نیند سے جاگے۔ برگ و بار کے مردہ تنوں میں گویا جان سی پڑنے لگی اور ماحول بتدریج سکون پذیر ہونے لگا۔ میرے اس انتشار اور دلی ہیجان میں بھی کمی ہوتی گئی حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا۔ جس کی ہر کرن تپی ہوئی سلاخ بن کر جسم کو داغ رہی تھی۔ میں کلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ چندو اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ پی رہا تھا۔ مجھے بیدار پا کر میرے پاس آ گیا اور مزاج پرسی کے بعد ساتھ حسب معمول اپنے ہاتھوں کو زور سے ملنے لگا جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہچکچا رہا ہے۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بے شک کہہ دو''۔ مالک اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''رات کو جو بات میں نے کہی تھی بالکل سچی ثابت ہوئی''۔ میں نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہا۔ ''یعنی''؟ اس نے جواب دیا۔ ''یعنی رات کو بھلا آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا''۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''وہ کون''؟ چندو بولا ''مست رام''۔ میں نے بدحواسی سے چلا کر کہا۔ ''کیا مست رام مر گیا''؟ ''ہاں مالک ابھی اس کی لاش کمیٹی والے اٹھا کر لے گئے

ہیں''۔ اس نے افسوس سے کہا۔

مست رام کی موت کی خبر ایک زبردست آہنی ہتھوڑے کی ضرب کی طرح میرے دماغ پر لگی۔ میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس دن بارہ بجے کی ڈاک میں مجھے انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ملا کہ میں سکول بند کر کے چھٹی پر چلا جاؤں۔ لہٰذا اسی دن میں روتا دھوتا اپنے گھر چلا گیا۔

(۵)

اس واقعہ سے چند ماہ بعد موضع نکر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے مست رام کے وہ الفاظ یاد تھے کہ نکر سے وہ رسیلی نگری ہے جس نے پلیگ کو قوت بازو سے زیر کیا تھا۔ رات کو میں چودہری گوبندرام کی حویلی ہی میں ٹھہرا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے بوڑھے چودہری سے رسیلے کا قصہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ صحرائی گرمی کا جوش کسی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی معتدل ہوئیں چل رہی تھیں۔ دریچوں سے باہر وسیع و لامحدود صحرا رات کی خاموشی اور تاریک آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا۔ تاروں کی کثرت سے آسمان سیاہ منقّشی چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کے کوٹھے پر (جس کے کونوں میں کلسوں پر بڑے بڑے روغنی آبدان نصب تھے آمنے سامنے بیٹھے تھے)۔

بوڑھا چودہری گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ کسی زمانے میں ہمارے گھر ایک بوڑھا مصر دیوی ناتھ رہتا تھا۔ یہ میرے باپ کے وقت کا بہت نیک اور وفادار ملازم تھا۔ ''رسیلا'' اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس لئے بوڑھا مصر اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جب رسیلا نے زندگی کی ساتویں سیڑھی پر قدم رکھا تو بوڑھا مصر چل بسا اور مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گیا۔

بوڑھی مصرانی بہت سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ ادھر رسیلے کو میں نے پاٹھ شالہ میں داخل کرا دیا۔ رسیلا بڑا ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ دوپہر کو جب پاٹھ شالہ سے واپس آتا تو بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ بٹاتا بلکہ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی نہایت شوق سے حصہ لیتا۔ اور اپنی حسنِ لیاقت سے وہ بہت جلد گھر بھر میں عزیز ہو گیا۔ رادھا کے سوائے گھر کے تمام افراد اس سے خوش تھے۔

میری اکلوتی بیٹی رادھا اس وقت بارہ سال کی تھی۔ یہ بہت تند اور تلخ مزاج کی لڑکی

تھی۔ رسیلے کے ساتھ اس کی خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ یہ اسے اپنا حریف سمجھتے ہوئے اکثر بات بات
ہی اسے پیٹ ڈالتی تھی۔ بوڑھی مصرانی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی تھکی ہوئی
آنکھوں کو دیکھ کر میں رادھا کی سرزنش کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس لئے رادھا کی عداوت روز بروز
بڑھتی گئی۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ رسیلا چودہ سال کا ہو گیا۔ رادھا اس وقت بیس
سال کی تھی۔ اس کی شادی میں نے ایک امیر گھرانے میں کی تھی۔ مگر وہ چوتھے سال ہی ودھوا
ہو کر ہمارے گھر واپس آ گئی مگر رسیلا پہلے سے زیادہ جانفشانی سے اس کی خدمت کرنے لگا۔
مگر وہ بدستور اس کی مخالف رہی۔

رفتہ رفتہ رسیلا جوان ہوتا گیا۔ جوان بھی ایسا جس پر دوشیزگی کا جوبن بھی زیادہ موزوں تھا۔
جس طرف نکل جاتا انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ گاؤں کی لڑکیاں اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں۔
گاؤں کے لڑکے اس کی دوستی پر فخر کرتے اور بڑے بوڑھے اس کو دعائیں دیتے تھے۔ وہ مردانہ
حسن کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسا شاہانہ پن تھا کہ سادہ لباس میں
بھی راجکمار دکھائی دیتا تھا۔ اب میں نے بجائے گھر کے کاموں کے باغات کا انتظام اس کے سپرد
کر رکھا تھا۔ جس کے حسنِ انتظام سے میری آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

بوڑھی مصرانی بیٹے کی سعادت مندی اور قابلیت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی زبردست
خواہش تھی کہ بیٹے کا بیاہ کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ لہٰذا اس نے کن کوششوں سے ایک اچھے
کھاتے پیتے برہمن کی حسین لڑکی کے ساتھ اس کی سگائی کر دی۔ لیکن جب لڑکی والوں نے شگن
بھیجا تو رسیلے نے شگن لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مصرانی نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت
سماجت بھی کی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

بوڑھی مصرانی اپنے فرمانبردار بیٹے کی جسارت اور گستاخی سے بہت آزردہ ہوئی اور روتی ہوئی
میرے پاس آئی تا کہ میں رسیلے کو سمجھا بجھا کر شادی پر آمادہ کروں۔ لیکن میں بھی کوشش
میں ناکام ہوا۔

اس نے کہا۔ ”مالک یوں تو آپ کو مجھ پر ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ لیکن شادی
کے معاملے میں آپ دخل نہ دیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ کیونکہ میں عورت ذات سے
سخت نفرت کرتا ہوں“۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”اس کی وجہ؟“ اس نے جواب دیا کہ میری
مرضی میں لاجواب ہو گیا۔

رسیلے کی اس ہٹ دھرمی سے اس کے متعلق گاؤں میں منافرت کی لہر دوڑ گئی گاؤں کی
لڑکیاں اسے ذلیل و حقیر تصور کرنے لگیں۔ لوگ اپنے لڑکوں کو اس کے میل جول سے روکنے لگے

تا کہ وہ اپنے زہریلے خیالات کہیں ان کے دماغوں میں نہ بھر دے۔

رادھا کو بھی اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے اسی بہانے سے رسیلے کو جی بھر کر کوسا۔ بہت بے عزت کیا اور آخر انتہائی نفرت سے اس کی منہ پر تھوک بھی دیا۔ غرضیکہ رسیلے نے زمانہ کی بدسلوکیوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آیا۔ بوڑھی مصرانی کو بیٹے کی اس ضد سے بہت صدمہ ہوا اور اسی سال وہ بہو کی آرزو دل میں لئے سرلباش ہو گئی۔

ماں کے مرنے کے بعد رسیلا بالکل خودمختار اور آزاد تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہوتا گیا۔ لوگ اسے سنت رسیلا کہنے لگے۔ اور اسی حالت میں اس نے زندگی کی پچیس منزلیں طے کر لیں۔

اس بات کو چالیس سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہی موسم تھا کہ اس علاقے پر پلیگ کا زبردست حملہ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ گھر کے تمام افراد ایک دم مر گئے۔ ان کے مردے گھروں کے اندر ہی سڑتے رہے اور چوہے درندوں کی طرح ان کو کھاتے بھی رہے۔ بعض اوقات یہ مردہ خور چوہے بھیڑ بکریوں کی طرح غول در غول گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے۔

ان دنوں اکثر ایسی بعید از قیاس اور بے تکی باتیں ظہور پذیر ہوئیں کہ بہت سے آدمی تو دہشت سے ہی مر گئے۔ آخرکار خلقت نے موت کے ڈر سے گھر چھوڑ کر باہر صحرا میں چھپر ڈال لئے۔ ہم لوگ بھی یہ حویلی چھوڑ کر باہر کچی حویلی میں چلے گئے جو سامنے والے باغ میں بنی ہوئی تھی، لیکن یہاں آتے ہی رادھا پلیگ میں مبتلا ہو گئی۔

رادھا چونکہ واحد اولاد ہونے کی وجہ سے میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ سینہ کا سرور اور آنکھوں کا نور تھی اس لئے اس کی بیماری کوئی معمولی بات نہ تھی سارا کنبہ تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ اس موقعہ پر رسیلے نے اس کی اتنی خدمت کی کہ اگر کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ بھی شاید نہ کر سکتا۔ وہ دن رات برابر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اس کی صورت سے وحشت برستی تھی، اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا مبادا بیمار نہ ہو جائے۔

خیر ایک ایک لحہ گنتے ہوئے رادھا کی بیماری کو چھ دن گزر گئے اور ہمیں اس کی زندگی کی کچھ آس بندھ گئی (کیونکہ عام طور پر یہ مرض آناً فاناً اپنا کام کرتا ہے اور جو مریض چھ لنگ جائے وہ یقینی طور پر بچ جاتا ہے) لیکن جونہی ساتویں رات آئی تو رادھا نے پھر درد و کرب سے تڑپنا شروع کیا۔ یعنی اس کی دوسری بغل میں ایک اور گلٹی نمودار ہو گئی جس سے اس کی

حالت دم بدم بگڑنے لگی۔

رادھا کو دم توڑتے دیکھ کر گھر بھر کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ میں غم سے نڈھال ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ باغ کے شمالی دامن میں ایک گھنے کنج کے درمیان ہمارے بزرگوں کے وقت کا ایک پرانا مندر تھا۔ جس میں کرشن بھگوان کی بڑی سی مورتی نصب تھی۔ انسان چاہے کتنا ہی پاپی ہو، مصیبت کے وقت ضرور پرماتما کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کے چرنوں میں اسے شکتی اور شانتی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا میری بھی یہی حالت تھی میں نے بے اختیار مندر کا رخ کیا۔

پورنماشی کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا جس کی تیز روشنی میں صحرا کے ذرات اس آب و تاب سے چمک رہے تھے گویا ہر ذرہ بذات خود ایک چاند تھا۔ لیکن سرد شب کی بھیگی بھیگی ہواؤں کی فراقیہ گونج سے کائنات میں بجائے رنگینی کے ایک اداسی اور وحشت چھا رہی تھی۔ صحن باغ میں چاندنی سے منور زمین پر درختوں کے سائے اس طرح متحرک تھے جیسے پلیگ کے ہاتھوں بے موت مرے ہوئے انسانوں کی روحیں عالم ارواح سے اتر کر اپنے مردہ جسموں کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں، غرضکہ اس سنسان اور ہُو کے عالم میں میں بھی ایک روح کی طرح فکر و آلام کو پیچھے چھوڑتا ہوا مندر تک جا پہنچا۔

اس طرح جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں مورتی کی پشت کی جانب سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے مندر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص والہانہ جوش سے اندر داخل ہوا۔

آنے والا رسیلا تھا جو اندر آتے ہی مورتی کے چرنوں میں گر گیا اور گڑگڑا کر بھگوان سے کہنے لگا۔ ”ہے بھگوان میری رادھا کو پلیگ کے خونخوار پنجے سے بچا لے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور ذلیل سمجھتی ہے مگر میرا دل اس پر مائل ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے من کی رانی ہے۔ آہ میری بوڑھی ماں میری شادی کی آرزو دل میں لئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن میں اس کی آرزو پوری نہ کر سکا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی رادھا کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ آہ آج ظالم پلیگ میری محبت کا وہ خزانہ مجھ سے چھیننے کے درپے ہے جس کی حفاظت پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آہ آج وہی رادھا جس کا میں پجاری ہوں، میرے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ بھگوان اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا“۔ کثرت گریہ سے اس کی آواز رک گئی۔

اس انوکھے انکشاف پر میں ششدر رہ گیا۔ مگر مصلحتاً کونے میں دبکا رہا۔ کچھ وقفے کے

بعد اس نے پھر سر اٹھایا اور کہنے لگا: "آہ بھگوان تم تو بالکل خاموش ہو، اگر خود میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے ہی موقع دو تا کہ میں پلیگ سے زور آزمائی کر کے اسے شکست دوں اور اس کے پنجے توڑ کر رادھا کو بچا لوں"۔

عین اسی وقت باہر سے ایک نہایت مکروہ اور کرخت آواز سنائی دی۔ "اگر مجھے مندر میں داخل ہونے پر قدرت حاصل ہوتی تو تمہیں شیخیاں بگھارنے کا مزہ چکھا دیتی۔ ہاں اتنے بہادر ہو تو باہر آ کر ذرا اپنی طاقت دکھاؤ"۔ آواز سن کر میرا دل دہل گیا، مگر رسیلا جس کی رگوں میں جوانمردوں کا خون پورے جوش سے رقص کر رہا تھا، بجلی کی سی سرعت سے تڑپ کر اٹھا اور شیر نر کی طرح دروازے سے باہر کود گیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں اسے پکڑنے کے لئے اٹھا تو سہی مگر دروازہ پر پہنچ کر میرے پاؤں خود بخود رُک گئے۔ باہر جانے کی ہمت نہ ہوئی اور حواس باختہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کہیں دور سے مرغ سحر کی دھیمی سی (ککڑوں کوں) کی صدا خاموشیوں کو چیرتی ہوئی فضا میں گھل مل گئی۔

میں پیام صبح سن کر ایک دم چونکا اور حوصلہ کر کے باہر نکلا۔ باہر بدستور وحشت برس رہی تھی۔ خشک چاندنی، شبنمی ہواؤں سے قدرے نرم پڑ چکی تھی۔ لیلائے شب کے منتشرہ سیاہ گیسو بتدریج سنورتے اور سمٹتے جا رہے تھے۔ میں ادھر ادھر رسیلے کو تلاش کرنے لگا۔

یکایک مویشی خانہ کی طرف سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نہایت بھیانک اور اُلّو کی چیخوں کی مانند تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ادھر گیا، لیکن مویشی خانہ کے سامنے پہنچ کر مجھے رکنا پڑا، کیونکہ کوئی شخص چیختا ہوا میری طرف آ رہا تھا، جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں سہم کر درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آنے والی ایک نہایت میلی کچیلی اور بے حد کریہہ المنظر بڑھیا تھی جس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکا رکھے تھے۔ گویا ٹوٹے ہوئے ہوں۔ وہ چیختی چلاتی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

اس کے دُور چلے جانے پر میں چھپر کی جانب بڑھا تھوڑے ہی فاصلے پر رسیلا چھپر کی منڈیر کے سہارے نیم دراز تھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر چھاتی سے لگا رکھی تھی، میں نے اسے پکارا مگر اس نے جواب نہ دیا۔ اس کی بے ہوشی سے آگاہ ہو کر میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اس کی کنپٹیاں سہلائیں اور آہستہ آہستہ اس کی کسی ہوئی مٹھیوں کو کھولا تو کوئی چیز اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر بکھر گئی۔ میں نے تعجب سے اس چیز کو جھک کر دیکھا۔ اُف اُس ہولناک اور ناپاک چیز کو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ خدامعاف

کرے وہ تو دس لمبے لمبے ناخون تھے جو کسی درندے کے پنجوں سے تارو تجزے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دہشت اور کراہت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں، میرا بدن پسینے میں تر ہو گیا

کافی وقفہ کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں، رسیلا ابھی تک بدستور بے حس و حرکت پڑا تھا، کیونکہ وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا صبح صادق کی پرعظمت دھیمی روشنی اور چاندنی کے اجلے سایوں میں ہوائیں موت کا راگ گاتی ہوئی ہچکیاں لے لے کر چل رہی تھیں۔ پڑوس کا کنواں نہایت حسرت ناک لے میں (وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) کی راگنی گاتا ہوا اس کی جوانمرگی پر آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فتح اور کامیابی جھلک رہی تھی، کیونکہ وہ بازی جیت چکا تھا۔

رسیلے کی موت کے بعد رادھا کی حالت روز بروز سنبھلتی گئی جس رسیلے نے پلیگ کے پنجے توڑ کر اسے بچا لیا، بلکہ بستی میں بھی بہت جلد امن قائم ہو گیا اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس گاؤں میں پلیگ نہیں پھوٹی۔ چنانچہ اس پُر حسرت واقعہ کی یاد میں اس گاؤں کا نام نگر پڑ گیا۔ پرانے زمانے کے لوگ اسے رسیلے کی نگری بھی کہتے ہیں، ورنہ کسی زمانہ میں یہ گاؤں من کوٹ کا ہی ایک حصہ تھا جو نیا من کوٹ کہلاتا تھا۔

(۲)

رسیلے کے صبر و استقلال، پاکیزہ عشق اور بہادری کی انوکھی داستان سن کر میں نقش حیرت بن گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری راتوں کا کمزور چاند کرۂ و لوح میں اپنی روکھی پھیکی چاندنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یک لخت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا سوکھے پتوں کی جھنجھ بجاتا ہوا اٹھا اور بلند ہو کر کھجوروں کی دراز چوٹیوں سے ٹکرایا تو کھجوروں کی سخت اور نوکیلی شاخوں نے زبان بے زبانی سے (وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) کا غمگین ترانہ الاپنا شروع کیا۔ تمام صحرا میں ایک پُردرد گونج پیدا ہو گئی عین اسی وقت کسی صحرانشین نے بھی یہی راگنی چھیڑ دی۔

چاروں طرف سے پیغام فنا سن کر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ آزردہ حالی سے میرا دماغ معطل ہو گیا حتیٰ کہ میں نیند کی وادی میں داخل ہو کر ایک لاہوتی دنیا میں کھو گیا۔

تشنگی

مسعود مفتی

تین دن پہلے پاکستانی فوج نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالے تھے۔
تین دن پہلے بنگلہ دیش قائم ہو چکا تھا۔

مگر بنگلہ دیش کے دور افتادہ گنجان آباد شہر میں صرف ایک دن پہلے فضا تبدیل ہوئی تھی۔ جب شہر کی زندگی فتح کے نشے میں لڑکھڑانے لگی۔ ایک دن میں تین مکانات جلائے گئے۔ چند دکانیں لوٹی گئیں اور لوگ تھانے کے باہر پڑی ہوئی چارپائیاں اٹھا کر لے گئے۔ کیونکہ تھانے میں کوئی سپاہی نہ تھا۔

آج منجو صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکلا تھا اور اس نے اپنے ساتھیوں بھولا اور مسلو کو بھی ان کے گھروں سے ساتھ لے لیا تھا۔ عمر کے لحاظ سے منجو ان سے بڑا تھا۔ اور چار سال سے میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ابھی دو دو سال ہی میٹرک میں فیل ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ہر بات میں ان کا لیڈر ہوتا تھا۔ آج وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اگر کہیں کچھ لوٹا جا رہا ہو۔ تو وہ بھی اس میں شامل ہو جائیں ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس تھے۔ منجو کی جیب میں کمانی دار چاقو اور پستول بھی تھے اور اس نے دل ہی دل میں طے کیا ہوا تھا کہ اگر کہیں بنا بنایا ہنگامہ نہ ملا۔ تو وہ موقع دیکھ کر خود ہی لوٹ مار شروع کر دیں گے اور پھر اور لوگ تو شریک ہو ہی جاتے ہیں۔

جب وہ ندی کے بڑے پل کے پاس پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع تھے اور پل کے جنگلے کو پکڑ کر ندی میں کسی چیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دور سے انبوہ دیکھ کر یہ بھی بھاگے اور ان میں شامل ہو گئے۔ اپنی سرگرمی کو دباتے ہوئے انہوں نے لوگوں سے سرگوشی میں پوچھا۔ کیا ہے؟۔۔۔۔ کیا ہے؟،، مگر جواب نہ ملنے پر وہ بھی دیکھنے والوں کی نظر کی سمت میں دیکھنے لگے۔

یہ ندی بل کھاتی ہوئی شہر کے بیچ میں سے گزرتی تھی اور شہر کے مزاج کے ساتھ ساتھ پانی بھی رنگ بدلتی جاتی تھی۔ کہیں شریفوں کی طرح سکڑ کے اور کہیں غنڈوں کی طرح اکڑ کے، جب تن سمیٹنا پڑتا تو کن ہی

من میں گہری ہوتی جاتی۔ اور جب کم ظرفوں کے انداز میں پھیل کر چلتی تو گہرائی کھو دیتی۔ اس لئے جہاں سمٹ کر گہری ہو گئی تھی وہاں تو اینٹ روڑے بانس پودے درخت کسی کو بھی تھاہ نہ ملتی۔ اور اس کی سپاٹ سطح خودداری اور اطمینان سے بہتی رہتی۔ مگر جہاں وہ چوڑی اور کم گہری تھی۔ وہاں اس کا سینہ چیر کر پودوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ اینٹوں اور روڑوں نے کیچڑ سے مل کر سطح پر جزیرے بنا لئے تھے۔ انسانوں نے اس کی کمر میں بانس چبھو کر مچانیں کھڑی کر لی تھیں۔ جن پر دکانیں اور مکانات بنتے رہتے تھے۔ ایسی جگہ ندی کا پانی کسی گم کردہ راہ کی طرح ادھر ادھر ٹکریں مارتا چلتا رہتا۔ ویرانوں میں آزاد بہنے والی ندی جب انسانوں کی بستی میں سے گزرتی تو انسانی کردار کے سانچے میں ڈھل جاتی۔ اس انحطاط پر دلجوئی کرنے کے لئے شہر کی ایک سڑک گھوم پھر کر بار بار ندی سے آملتی۔ تھوڑی دور تک اس کے کنارے سے کنارا ملا کر سرگوشیاں کرتی۔ اور پھر اپنا عذاب جھٹکنے کو پیچ و تاب کھاتی ہوئی انسانی بستی کے مخلوں میں گم ہو جاتی۔ تھوڑی دیر بعد اپنا دل ہلکا کرنے کو پھر کسی موڑ پر ندی کے ساتھ چلنے لگتی۔

جہاں منجو دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بڑا پل تھا۔ وہاں ندی کی چوڑائی تیس چالیس گز کے قریب تھی اور پل سے گذرنے والی سڑک ایک فرلانگ جا کر چھوٹے پل پر سے گزرتی تھی جہاں ندی بمشکل پندرہ گز چوڑی تھی اور کوئی میل بھر کا چکر کاٹ کر بڑے پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ اس لئے چھوٹے پل سے بڑے پل تک جانے کے لئے سڑک کے راستے تو چند ہی منٹ لگتے تھے مگر ندی کے کنارے کنارے جانے میں کافی وقت لگتا تھا۔ پانی کا بہاؤ چھوٹے پل سے بڑے پل کی طرف تھا

منجو نے دیکھا تو فاصلے پر ایک میلا سفید کپڑا بلبلے کی طرح پھول کر آہستہ آہستہ بہتا آ رہا تھا۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔ تو اسکے ساتھ ہی کپڑے کا ایک اور بلبلا ابھرا۔ مگر یہ کسی چیز کے گرد لپٹا ہوا لگتا تھا۔ پانی کا ریلا آیا تو یہ اور ابھرا۔ اور سطح پر نکلے ہوئے گھاس کے چند تنکوں کو دباتا ہوا آگے آ گیا۔

پل پر کھڑے ہوئے لوگوں سے کسی نے زیر لب کہا۔ مرد لگتا ہے۔،،

پھر یہ میلا کپڑا ایک پودے کے تنے سے ٹکرایا۔۔۔۔رکا۔۔۔تھوڑا سا گھوما۔ اور نیچے غوطہ لگا گیا۔ ساتھ ہی گز بھر دور کوئی اور چیز ابھرنے لگی۔

منجو کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ جب اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ کپڑا نہیں بلکہ انسانی لاش ہے۔
لاش بہتی چلی آ رہی تھی۔

ہولے ہولے۔ دھیرے دھیرے۔۔۔۔رک رک کر۔ اپنے کئے پر نادم گناہ گار کی طرح۔
چھوٹی چھوٹی لہروں پر نیم ہچکولے کھاتی ہوئی۔ شکوک اور وسوسوں کی طرح۔
بانسوں۔ پودوں اور جزیروں سے چھوتی الجھتی اور ٹکراتی ہوئی۔ سہارا ڈھونڈنے والے اس ہاتھ کی طرح جسے نرمی سے رد کر دیا جائے۔

زیرِ سطح گڑھوں پر اس کے سرے گھوم جاتے۔ کمپاس کی سوئی کی طرح۔

جیسے جیسے لاش آگے آ رہی تھی پل پر سناٹا گہرا ہو رہا تھا۔ ردگرد کے کناروں پر بھی خاموشی چھانے لگی تھی۔ سڑک پر ایک سکوٹر رکشے کا شور ایسا بے جوڑ سا لگ رہا تھا جیسے بھری بارش میں دھوپ نکل آئے۔ لوگ مکانوں سے دکانوں سے اور چٹانوں سے گردنیں لمبی کر کر کے اسے دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگ لاش کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کئی پہچان گئے تھے۔ مگر کسی دوسرے کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔ جب یہ شخص زندہ تھا۔ تو اس کی شکل وصورت تھی۔ نام تھا۔ کردار تھا۔ شناخت تھی۔ مگر اب لوگ یہ سب بھول جانے پر تلے ہوئے تھے اور اپنے ہی شہر میں، اپنے ہی لوگوں کے درمیان وہ سابقہ شخص مرے ہوئے گوشت کا گمنام تودہ بن کر بہتا جا رہا تھا۔

لاش لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔

اب منجو اس کے چہرے کے نقوش دیکھ سکتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ان پر کیچڑ جما ہوا تھا۔ گردن عجب انداز میں پیچھے کو مڑی ہوئی تھی۔ اور اس پر کاٹے جانے کا زخم صاف نظر آ رہا تھا۔ منجو زیادہ تو نہ دیکھ سکا کیونکہ پانی کے ریلے نے لاش کی کروٹ بدل دی اور چہرے نے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے سطحِ آب کو پردہ بنا لیا۔ مگر کروٹ بدلنے سے دو ہاتھ نمودار ہوئے جو آپس میں ایک رسی سے بندھے تھے اور پیٹھ کے اسی تھوڑے حصے سے جکڑے تھے جو اب پانی سے باہر تھا۔

لاش پل کے نیچے گھس گئی۔ منجو بھاگ کر پل کی دوسری طرف پہنچا۔ تو لاش اسی انداز میں دھیرے دھیرے بہتی ہوئی اس سے دور جا رہی تھی۔ اور وہ حیران ہو رہا تھا کہ انسان کتنا بڑا ہوتا ہے۔ مگر پانی میں بہتی ہوئی لاش کتنی چھوٹی لگ رہی ہے۔ اس کے دل میں ایک نامعلوم سا جذبہ ابھرا۔ ترس؟؟ ۔ نہیں۔ ہمدردی؟؟ نہیں ۔ ۔ ۔ یہ کچھ اور تھا جس کی شدت وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔

کون تھا یہ؟،، کسی نے پوچھا۔ مگر لوگ نظریں چرا گئے

پھر پل پر سے بھیڑ ایک دم چھٹ گئی۔ کچھ لوگ خاموشی سے سر جھکا کر چلے گئے۔ باقی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر باتیں کرتے رہے۔ منجو اور اس کے ساتھی کبھی ایک گروپ کی باتیں سنتے۔ کبھی دوسرے کی۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ ساتویں لاش ہے جو آج اس ندی سے گزری ہے۔ علی الصبح چھ لاشیں تھوڑے تھوڑے وقفے بعد بہتی گئی ہیں۔ جن میں دو لاشیں بچوں کی بھی تھیں۔ عام خیال یہی تھا کہ لوگ رات کو مار کر پھینکتے ہیں۔ اور لاشیں سورج نکلنے سے پہلے آبادی سے دور میل چلی جاتی ہیں۔ یہ لاش کہیں اٹک گئی ہو گی۔ یا شاید کسی نے دیر میں ہاتھ مارا ہو۔

"بہاریوں کو مار رہے ہیں" کسی نے کہا۔

"پاکستانی بنگالیوں کو مار رہے ہیں۔،،، دوسرا بولا۔

"غداروں کا یہی حشر ہونا چاہیے۔" ایک اور کا خیال تھا۔

"سارے غدار ہی نہیں ہوں گے۔ لوگ اپنی دشمنیاں بھی پوری کر رہے ہیں۔ پوچھنے والا کوئی ہے نہیں۔ نہ قتل کا پرچہ لکھوانے والا۔ ذاتی دشمنوں سے نپٹنے کا اس سے اچھا موقع کیا ملے گا۔ سمجھ دار لوگ ہیں۔"

لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اور منجو سن رہا تھا۔ لاش دیکھ کر اسے جو وحشت اور صدمہ ہوا تھا۔ وہ ان باتوں سے تحلیل ہونے لگا۔ لاش کا نظارہ اسے غیر معمولی چیز لگی تھی۔ مگر ان باتوں کا تاثر یہ تھا کہ یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ بلکہ مستحسن عمل ہے۔ کچھ لوگوں کی سزا ہے کہ انہیں مار دیا جائے اور کچھ لوگوں کا حق ہے کہ انہیں ماریں۔ یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ ندی میں لاش کا ملنا کوئی بڑا حادثہ نہیں۔ بلکہ معمولی چیز ہے۔ کسی کو ماریں گے تو اسے ندی میں ہی پھینکیں گے۔ کوئی اس کی قبر قبرستان میں بنائے گا نا۔ کسی کو ختم کیا۔ ندی میں پھینکا۔ اپنی جان چھڑائی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ سب چلتا ہے۔

یہ باتیں سن کر منجو اور اس کے ساتھی ایک نیا ولولہ لے کر لوٹنے کے لیے روانہ ہوئے۔ سب چلتا ہے۔ کچھ لوگوں کو ضرور سزا ملنی چاہیے اور ہم کیوں پیچھے رہیں۔

انہیں علم تھا کہ بازار میں ایک جگہ سات آٹھ بہاریوں کی دکانیں اکٹھی ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے ادھر ہی روانہ ہوئے۔ مگر وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ ابھی ابھی لوٹ ختم ہوئی ہے۔ اور اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ منجو کو اتنا غصہ آیا کہ پہلے تو اس نے ایک دکان کے سامنے والے تختے توڑے۔ پھر جیب میں سے ماچس نکال کر ایک کھوکھے کو آگ لگا دی۔ جو کسی پان والے نے دکان سے ذرا ہٹ کر بنایا تھا۔ راہ گیروں میں سے کسی نے اسے نہیں روکا۔ دیکھنے والوں نے مسکرا کر تماشے کا مزہ لیا اور ایک آدمی نے تو اسے تھپکی بھی دی۔

منجو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بھولا نے بتایا کہ فلاں جگہ ایک مغربی پاکستانی کی دکان ہے۔ ادھر کا رخ کیا جائے چنانچہ تینوں ادھر چل دیے۔ مگر وہاں پہنچے تو دکان پر ایک بنگالی بیٹھا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر سے کنسولی تو معلوم ہوا کہ اصل دکاندار لاپتہ ہے۔ بتانے والے لوگ "لاپتہ" کہہ کر مسکراتے جیسے انہیں پتہ ہو کہ اس کا کیا حشر ہوا ہے

تیسری جگہ البتہ انہیں کامیابی ہوئی۔ جہاں ایک بنگالی کا گھر لوٹا جا رہا تھا جو علانیہ پاکستان کی حمایت کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ وہاں اتفاقاً پہنچ گئے تھے اور لوٹ میں شریک ہو گئے۔ سلو کو ریڈیو مل گیا۔ بھولا نے ٹائم پیس گھڑی اور تین دھوتیاں قابو کر لیں۔ مگر منجو زنانہ کپڑوں کی تلاش میں تھا جب ایک صندوق ملا تو اس نے سارے کپڑے زمین پر گرا دیے۔ اور ایک نئی سی لال ساڑھی اٹھا لی۔ باقی کپڑوں کو اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے بکھیر دیا۔ ساڑھی اٹھاتے اٹھاتے اس کا دل دھک دھک ہوا۔ اور یہ اپنے ساتھیوں کو

وہیں مصروف چھوڑ کر گھر کو بھاگا۔ چلنے سے پہلے اس نے ساڑھی کو ایک کاغذ میں لپیٹ لیا۔

یہ ساڑھی اس نے زائرہ کے لئے اٹھائی تھی جو منجو کے گھر کے سامنے رہتی تھی۔ وہ درمیانی عمر کی بھرپوری عورت تھی۔ منجو بچپن ہی سے اس کے گھر آیا جاتا کرتا تھا۔ جیسے ہمسایوں کے گھر بچوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ مگر جب سے منجو نے داڑھی منڈوانا شروع کی تھی وہ اس پر مہربان سی ہو گئی تھی اور اب پچھلے چھ ماہ سے آپس میں جسمانی تعلقات بھی قائم تھے۔ وہ منجو کو پیسے وغیرہ بھی دیا کرتی تھی۔ جن سے ہوا اپنے دوستوں کی تواضع کیا کرتا۔ آج پہلی دفعہ وہ اس قابل ہوا تھا کہ زائرہ کی جملہ نوازشات کے عوض اسے کوئی تحفہ دے سکے۔ اس لئے جب وہ ساڑھی بغل میں دبائے گھر کو چلا تو اس کا دل اچھل رہا تھا ٹانگیں اینٹھ سی گئی تھیں منہ خشک ہو رہا تھا۔ اور سردی کے دنوں میں بھی ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔

سامنے والے مکان کی کھڑکی دیکھ کر اس کے لبوں سے بے اختیار گالی ٹپک پڑی۔ کیونکہ کھڑکی خالی تھی۔ اور وہاں تولیہ سوکھنے کے لئے نہیں لٹکا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ زائرہ کا خاوند گھر میں ہے۔ جب تولیہ لٹکتا تھا تو یہ اشارہ تھا کہ اب مطلع صاف ہے۔

تھوڑی دیر بعد منجو کی ماں نے جب اس سے پوچھا۔ "آج تم کیوں اتنی بے چینی سے کمرے کے اندر بار بار چکر لگا رہے ہو۔" تو منجو ایک دم بھونچک سا رہ گیا۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ مگر فوراً ہی بات ٹالنے کو اپنی ماں کو صبح والی لاش کا قصہ سنانے لگا جو ندی میں بہتی جا رہی تھی

ماں بات سنتے وقت غور سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اور جب وہ واقعہ سنا چکا تو اس نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے کو چوما اور بولی "اچھا۔ ادھر گلاس میں دودھ پڑا ہے۔ وہ پی لے۔ دیکھ تو خوف سے چہرے کا رنگ کیسا ہو رہا ہے۔"

بالآخر زائرہ اسے کھڑکی میں نظر آئی۔ منجو نے بے صبری سے اشارہ کیا کہ میں آ جاؤں تو اس نے بند مٹھی دکھا دی۔ جس کا مطلب تھا کہ تھوڑی دیر انتظار کرو۔

پھر چند ہی منٹ بعد اس نے دیکھا کہ اس کا خاوند نکل کر جا رہا ہے اور ساتھ ہی کھڑکی میں تولیہ پھیلا دیا گیا۔ منجو ماں کی نظر بچا کر نکلا اور سیدھا وہاں جا پہنچا۔

ساڑھی لے کر زائرہ نے اسے بڑی میٹھی نظروں سے دیکھا اور گال پر ہلکا سا چپت مار کر بولی۔

"بگلے۔ تو کہاں کا کماؤ مرد ہے۔ جو میرے لئے کپڑے لا رہا ہے۔"

منجو کا لڑکپن کانپتی ہوئی آواز میں منمنایا۔ کماتا نہیں تو کیا تیرے لئے لوٹ بھی نہیں سکتا۔۔۔

وہ ہنسی پھر ساڑھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مگر اچانک منجو نے خود ہی ساڑھی اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر دور پھینک دی۔ اور اسے دبوچ لیا۔ وہ نہ نہ کرتی رہی۔ مگر منجو نے ایک نہ سنی۔

تھوڑی دیر بعد وہ جب چلنے لگا۔ تو زائرہ نے کہا "منجو ٹھہر۔ تیرے لئے میٹھا بھات بنا کر رکھا ہے

وہ کھاتا جا۔،،

اور جب وہ سر جھکائے کھا رہا تھا تو نرم سے ہاتھ نے اس کا گال سہلا دیا۔ تھوڑی کے نیچے آکر۔ مرتعش انگلیوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔ وہ مخموری آنکھیں منجو کی آنکھوں میں ڈوب گئیں۔ اور وہ لرزہ ریلی سرگوشی میں بولی۔

،،منجو سندر۔ آج تو تو بڑے جوش میں تھا۔ کیا بات ہے۔۔۔ ایک دم شیر لگتا تھا۔،،

منجو کو میٹھا بھات کئی گنا زیادہ میٹھا لگنے لگا۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

اگلے دن تینوں دوست سورج نکلنے سے پہلے ہی بڑے پل پر پہنچ گئے۔ انہوں نے رات ہی ان سے طے کر لیا تھا اور پھر صبح سویرے انہیں جگانے پہنچ گیا تھا۔ نیم تاریکی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پل پر سے دیکھتے رہے۔ مگر کوئی لاش نہ آئی۔ ایک جھاڑی بہتی ہوئی آئی۔ تو یہ لاش سمجھ کر پل کی ریلنگ سے ٹک ٹک کر دیکھنے لگے۔ جب منجو کو پتہ چلا کہ یہ جھاڑی ہے۔ تو اس نے زور سے تھوکا۔ مایوسی میں گالی دی اور بے چینی سے سڑک پر ٹہلنے لگا۔

تینوں دوست کبھی کھڑے ہو کر گپ لگانے لگتے۔ کبھی پل پر ٹہلتے۔ اور کبھی ندی کے کنارے کنارے اوپر کی طرف چلے جاتے۔ بالآخر بیزار ہو کر انہوں نے مشورہ کیا کہ چھوٹے پل پر چلا جائے۔ اگر وہاں کچھ نہ ہوا۔ تو پھر ادھر آ جائیں گے۔ چنانچہ یہ سڑک پر چلتے چلتے چھوٹے پل پر پہنچ گئے۔ چند منٹ ادھر ادھر گھومے۔ پھر پل سے جھک کر پانی کی صاف سطح کو دیکھنے لگے۔

بھولا نے محسوس کیا کہ ان کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز ہے دیکھا تو ایک پتھر تھا۔ اس نے پاؤں سے ذرا آگے سرکا دیا۔ تو وہ آہستہ سے لڑھک کر نیچے گرا۔ پانی ذرا سا اچھلا۔ بلبلے کی تھاپ کی ایک آواز ابھری اور پھر سطح ساکن ہو گئی۔

،،مچھلی اچھلی تھی۔،، صلو چلایا۔

بھولا زور سے ہنسا۔ بڑی بھوک لگی ہے جو مچھلی یاد آ رہی ہے۔ وہ تو میں نے پتھر پھینکا تھا۔

پتھر؟۔ بوریت دور کرنے کے لئے اس سے اچھا شغل اور کیا ہو سکے گا۔ منجو نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پل پر جو پتھر روڑ نظر آیا اسے اٹھا اٹھا کر وہ پانی میں پھینکنے لگے۔ پل صاف ہو گیا تو پل پر کھڑے ہو جاتے۔ اور ایک دو تین کہہ کر زور سے پتھر ندی میں پھینکتے کہ کس کا روڑا دور جائے گا۔

یہ کھیل بڑی سرگرمی سے جاری تھا کہ اچانک بھولا چلایا۔ رک جاؤ۔ وہ کچھ ہے۔،،

ان کے ہاتھ جہاں تھے جم گئے۔ جیسے اچانک بجلی بند ہونے سے مشین رک جاتی ہے۔

وہ واقعی لاش تھی۔

تینوں دم سادھ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ بائیں کنارے کے قریب تھی۔ اس لئے جیسے جیسے وہ قریب آتی گئی یہ بائیں طرف کو سرکتے گئے پل کے جنگلے پر قریباً لٹکتے ہوئے وہ مبہوت سے لاش کو دیکھتے رہے اور جب لاش سرکتی پل کے نیچے گھس گئی تو یہ چونکے جیسے پکی نیند سے جاگے ہوں۔ منجو بھاگ کر دوسری طرف پہنچا اور بانس سے لاش کو چھونے کی کوشش کی۔ مگر چھوٹا پل پانی کی سطح سے کافی اوپر تھا۔ وہ بانس نیچے نہ پہنچ سکا۔ منجو نے کہا۔ اگر ہم بڑے پل پر ہوتے تو بھی بانس پانی تک پہنچ جاتا کیونکہ وہ پل پانی کی سطح کے قریب ہے۔

لاش دور گئی تو یہ بھاگم بھاگ بڑے پل کی طرف چلے۔ پھسلتے قدموں اور ہانپتے سانسوں کے بیچ بیچ تبصرے بھی جاری رہے۔ ہم کتنا پہلے پہنچ جائیں گے۔۔ سڑک کے راستے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگتے مگر ندی کا چکر اتنا لمبا ہے کہ آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی۔ نہیں آدھ گھنٹہ نہیں بیس منٹ۔۔۔ بوڑھا تھا۔ ہاں داڑھی میں مٹی اور کیچڑ بھرا تھا۔ معلوم نہیں بنگالی تھا یا بہاری۔ بنگالی ہوگا کیونکہ ناک چپٹا سا تھا۔ ایک بازو کٹا ہوا۔ کٹا کہاں ہوگا۔ پانی کے نیچے ہوگا۔۔۔۔ نہیں میں نے غور سے دیکھا ایک بازو تھا ہی نہیں۔۔ جس نے پورا آدمی مارا ہے وہ ایک کیوں کاٹے، تماشا دیکھنے کے لئے۔۔ مزہ آتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایک آدمی نے نہیں مارا۔ بلکہ بہت لوگوں نے مل کر مارا ہوگا۔ ذرا آہستہ چلو میرا تو سانس پھول رہا ہے۔ چلتے آؤ۔ چلتے آؤ۔

جب یہ وہاں پہنچ گئے تو انتظار کرنا مشکل تھا۔ چند منٹ رکے۔ پھر بھولا نے کہا کہ یہاں کھڑے رہنے کی بجائے ندی کے کنارے کنارے اوپر کی طرف چلتے ہیں اور پھر لاش کے ساتھ ساتھ کنارے پر چلتے ہوئے نیچے آئیں گے۔

تجویز اتنی معقول تھی کہ کچھ کہے بغیر سب لپک کر چل دیئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں یہ لاش سے جا ملے۔ جو اب کم گہرے پانی میں پہنچ گئی تھی۔ کناروں پر کئی لوگ کھڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کئی لوگ آدھی نظر ڈال کر آگے نکل جاتے۔ اب آمد و رفت کافی تھی کیونکہ دن بہت نکل آیا تھا۔ مگر کوئی بھی اہم بات نہ سمجھتا تھا۔ کئی لوگ تو ایک آدھ آوازہ بھی کس دیتے۔ جو عام طور پر غداروں کے لئے گالی کی شکل میں برآمد ہوتا۔

بیس پچیس لڑکوں کا ایک جلوس فتح کی خوشی میں بنگلہ دیش کے جھنڈے اٹھائے سڑکوں کا چکر لگا رہا تھا۔ سڑک ان کو ایک جگہ ندی کے کنارے لے آئی عین اسی وقت لاش بھی وہیں پہنچی۔ لاش کو دیکھ کر ہجوم کے نعرے بلند سے بلندتر ہونے لگے۔ اور وہ ایسے چیخ چیخ کر ''جے بنگلہ'' کہتے جیسے مردہ بڈھے کی روح کو پکار کر اسے تنگ کر رہے ہوں۔ جلوس کے چند شرکا سڑک سے روڑے اٹھا کر لاش پر پھینکنے لگے۔ اور جب ایک نشانے پر لگا تو ہجوم نے تالیاں بجائیں۔ اور چند لڑکوں نے ہنستے ہوئے اور منہ سے سیٹیاں بجاتے

ہوئے ہاتھوں سے فحش اشارے کئے۔ اس کے بعد بڑک مسرور اور پر جوش جلوس کو ندی سے دور لے گئی۔ اور بے جان۔ بے ضرر۔ بے بس اور بے قصور بڈھا پانی کی لہروں پر ہولے ہولے بہتا رہا۔

جلوس چلا گیا۔ مگر منجو۔ بھولا اور صلو کنارے کنارے چلتے رہے اور ہر چند قدم پر لاش دیکھتے لگتے۔ اگر وہ کنارے کے قریب آ جاتی تو یہ خوش ہو جاتے اور اگر وہ دور بہتی تو یہ شور کرتے۔ ارے بڈھے ادھر نہیں۔ ادھر کو۔۔۔ اور پھر قہقہے لگاتے۔

ایک جگہ لاش ایک چٹان کے کنارے سے اٹک کر رک گئی۔ جس پر دکان بنی ہوئی تھی۔ بھولا نے چلا کر دکان والے کو آوازیں دیں درخواست کی کہ وہ بانس سے اس کو پانی میں دھکیل دے۔

تھوڑا اور بہنے کے بعد وہ ایک درخت کے تنے سے رک گئی۔ تینوں دوست بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ کہ ابھی پانی کا ریلا اسے ہٹا دے گا۔ مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو یہ پتھر پھینکنے لگے۔ جس سے پانی کی سطح پر دائرے بن بن کر چاروں طرف پھیلنے لگے۔ بڈھا جسم ان لہروں پر اوپر نیچے ہلتا رہا لیکن رکاوٹ سے اپنا دامن نہ چھڑا سکا۔ تب منجو کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنا بانس تیزی سے اندر تک زور سے اچھالا۔ وہ ایک ہوائی جہاز کی طرح فضا میں ابھرا۔ خوب صورت سی قوس بناتا ہوا فضا میں اڑتا گیا اور بڈھے کے قریب ہی جا کر چھپاک سے گرا۔ اسے لگا تو نہیں اگر اس کے گرنے سے ایک بڑی لہر پیدا ہوئی جس نے مردہ جسم کو اچھال دیا۔ اس نے ایک دو ہلکورے لئے اور پھر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح جھول کر درخت سے علیحدہ ہو گیا۔ اور پانی کے ریلے پر بہنے لگا۔

تینوں دوستوں نے خوشی سے نعرے لگائے۔ منجو کو تھپکیاں دیں اور کنارے پر خوشی خوشی چلنے لگے۔ مگر ان کی خوشی زیادہ دیر پا ثابت ہوئی اور تھوڑا آگے جا کر مردہ جسم ایک چھوٹے سے جزیرے کے کٹے پھٹے کنارے میں پھنس گیا۔ جزیرہ ندی کے عین درمیان تھا۔ انہوں نے سب حربے آزمائے مگر لاش کو اس پھندے سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ بالآخر باہمی مشورے سے طے پایا کہ صلو جو ان سب میں سے بیباک بھی تھا اور اچھا تیراک بھی۔ ندی میں چھلانگ لگائے۔ اور وہاں جا کر بڈھے کو چھڑائے۔

صلو چھپاک سے نیچے کودا جسم کو مچھلی کی طرح چلاتا، پھراتا، لہراتا لمبے لمبے ہاتھ مارتا وہاں پہنچ گیا۔ مگر قریب جا کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ بڈھے کے چہرے کی جھریاں۔ ان میں چمکتا ہوا گدلا پانی۔ بے نور اور بے جان نیم وا آنکھیں جن کی سفیدی بہت ہی سفید تھی۔ اور چہرے کی کرختگی سے اسے خوف آنے لگا۔ چنانچہ مینڈکوں کی طرح اس کے ارد گرد اچھل اچھل کر اس نے پانی کے چھلاوے اٹھائے۔ جنہوں نے بوڑھے کو پہلے ادھر ادھر ہلایا۔ پھر جگہ سے سرکایا۔ اور بالآخر صلو کے بامقصد ہاتھوں سے اٹھائے ہوئے دھاروں نے اسے پانی کے درمیانی ریلے میں ڈال دیا۔

صلو اپنی کامیابی پر سرشار ہو کر پہلے تو اس کے پیچھے پیچھے تیرتا رہا۔ اور کنارے سے منجو اور بھولا بھی

اسے بھی کہتے رہے۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ دوستوں سے الگ ہو کر اور لاش کی معیت میں۔ اس کا شغل ختم ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی باہر آ گیا۔ اور کپڑے نچوڑتے ہوئے ان کے ساتھ اچھل کود کر چلنے لگا۔

جیسے جیسے لاش پل کے قریب ہوتی گئی۔ منجو کی بے چینی بڑھتی گئی۔ سے صلو کی طرح خوف نہیں آیا بلکہ جوش سا چڑھتا گیا۔ راستے میں جو درخت یا کھمب آتا۔ وہ اسے اتنے زور سے دھپ مارتا کہ اس کی ہتھیلیاں اپنے سانولے رنگ کے باوجود قرمزی ہو جاتیں مگر خود درد محسوس نہ کرتا۔ اور جب وہ پل کے قریب پہنچے تو اس نے بھولا کے ہاتھ سے لمبا بانس چھینا اور بھاگتا ہوا پل پر پہنچ گیا۔ وہاں پل کے جنگلے سے پورا جھک کر اس نے لاش کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر پانی کا ریلا تیز تھا اور مردہ جسم بانس سے چھوتا ہوا آگے نکل گیا۔۔۔۔

ایک لمحے کے لئے منجو نے اپنے دل میں اسی غیر معمولی جذبے کا ابال محسوس کیا جو بہت شدت سے گرداب کی شکل میں اس کے رگ و پے میں گھوم گیا۔ یہ نہ تو ترس تھا۔۔۔۔ نہ ہمدردی۔۔ نہ معلوم کیا تھا۔ مگر تھا بہت شدید۔ اتنا شدید کہ جب لاش گزر جانے کے بعد تینوں دوست واپس پہنچے تو منجو کا دل بولنے کو نہیں چاہتا تھا۔

اس کے بعد تینوں دوستوں کا معمول ہو گیا کہ یہ ہاتھوں میں بانس لئے صبح صبح ندی پر آ جاتے اور لاشوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے۔ لاشوں کی کمی نہیں تھی۔ ہفتہ بھر میں شاید ایک آدھ دن ہی ناغہ ہو ہو۔ ورنہ ایک یا دو لاشیں یہ ہر صبح کو دیکھ لیتے۔ بلکہ بعض اوقات تو تین بھی مل جاتیں۔ یہ لوگ پہلے چھوٹے پل سے دیکھتے۔ پھر ساتھ ساتھ چلتے۔ اور راستے میں چھیڑ چھاڑ کرتے اور بالآخر بڑے پل پر آ کر بانسوں سے کچوکے دیتے۔ پتھروں سے مارتے اور کیلے کے چھلکوں سے نشانہ بازی کرتے

صلو اور بھولا کے لئے تو یہ شرارت تھی۔ شوخی تھی۔ مہم جوئی تھی۔ لوگوں پر رعب جمانے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش تھی۔ مگر منجو کو ان حرکات میں ایک خاص مزہ آتا تھا۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں میں ہلکی لالی جھلکنے لگتی۔ سانس پھولنے لگتا۔ جسم کے سارے پٹھوں میں پچکاریاں چلنے لگتیں۔ اس نشے کے مزے میں وہ سب کچھ بھول کر لاش کو نت نئے طریقوں سے چھیڑنے کی کوشش کرتا۔

لوگ دائیں بائیں سے گزرتے مگر کبھی کسی نے مداخلت نہیں کی۔ کیونکہ زیادہ تر لوگوں کے نزدیک یہ لاشیں غداری کی علامتیں تھیں۔ اس لئے قابل نفرت تھیں۔ انہیں تنگ کرنا گویا ثواب کمانا تھا۔ روح نکلنے کے باوجود جسم کو بھی معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ان لڑکوں کی حرکات کو جذبہ حب الوطنی کا مظاہرہ سمجھتے اور کبھی ہنس کر۔ کبھی مسکرا کر اور کبھی تھپک کر داد اور تحسین دیتے۔

جو چند لوگ مختلف انداز میں سوچتے تھے۔ وہ اس خوف سے خاموش رہتے تھے کہ وہ وقت کے خلاف بولنے میں کہیں ان کا حشر بھی لاش جیسا نہ ہو جائے۔ لہذا یہ تینوں لڑکے بے روک ٹوک ان کھلونوں

سے کھیل کھیل کر مزہ لیتے رہے۔ اور منجو کے دل میں وہ نامعلوم جذبہ جوان ہوتا گیا۔

بنگلہ دیش کو آزاد ہوئے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ بہاریوں اور پاکستان کے حامی بنگالیوں کا سارا سامان لٹ چکا تھا۔ مگر شہر کی فضا میں ٹھہراؤ کی بجائے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیونکہ ہنگامہ دار و گیر زوروں پر تھا۔ اور ایسے لوگ دھڑا دھڑ گرفتار ہر نئی گرفتاری پر تبصرہ کرتے۔ ہر پکڑے جانے والے کے نامہ اعمال کے پوشیدہ گوشوں کو سرعام اچھالتے یا اس کے فرضی جرائم کی داستانیں پھیلاتے۔ جنگ کے ہیجان کے بعد امن اور آزادی سے سکون نہیں ملا تھا بلکہ غیر یقینی صورت حال بڑھ گئی۔ سرکاری گرفتاریوں کے علاوہ بھی مکتی باہنی کے سربراہ لوگوں کی اپنے طور پر پکڑ دھکڑ کرتے رہتے تھے۔ جن غنڈوں کو سیاسی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ دن دیہاڑے جرم کرتے۔ ان تمام حالات سے ماحول ایسے جسم کی مانند تھا۔ جسے بخار چڑھا ہو۔ اور اندر ہی اندر ہلکی کپکپی طاری ہو۔ کبھی کبھی ندی میں بہہ کر آنے والی لاشیں بھی پس منظر کا حصہ بن جاتی تھیں اور ان میں منجو اس ہستی سے وجود کی صورت تھا جو سب سبزیوں والے لینڈ سکیپ پر رینگتی ہے۔ مگر دیکھنے والوں کو اس کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

سولہویں دن کی صبح کو تینوں دوست پھر چھوٹے پل پر کھڑے تھے جب انہوں نے وہ لاش دیکھی جو ایک عورت کی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اور وہ بالکل برہنہ تھی۔ عورت کی لاش وہ پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے اور دم بخود تھے۔ جیسے پانچ سالہ بچہ پہلی دفعہ نمائش کی روشنیاں اور رونق دیکھ کر چندھیا جاتا ہے اور وہ کیا خوب عورت تھی بالکل پکی ہوئی جوان عورت۔ جس کے سڈول اعضا کی خوب صورتی کو موت بھی بگاڑ نہ سکی۔ پانی کے ریلوں میں کروٹیں بدلتا ہوا جسم ہلکورے سے کھاتا آگے بڑھتا تو سانولے رنگ کی گیلی قوسوں پر چمک لہرا سی جاتی۔ پچھلی طرف سورج طلوع ہو رہا تھا جس کی مدھم ترچھی شعاعیں بعض قطروں کو موتیوں کی طرح جگمگا رہی تھی اور بعض قطرے قوس قزح کے رنگوں کی مبہم پچکاریاں سانولے سڈول جسم پر پھینک رہے تھے۔ انہی رنگوں سے سر کے بالوں میں اٹکے ہوئے قطرے کرنوں کا تاج بن گئے تھے۔ گیلے جسم سے حسن کے بخارات اٹھ رہے تھے۔ موت۔ بے چارگی۔ بے بسی اور کس مپرسی کے باوجود وہ جسم مردہ نہیں لگتا تھا بلکہ جنوری کی سرد صبح کو اٹھنے والی بھاپ میں ترشا ہوا گدرایا ہوا گرم گوشت لگتا تھا۔ جو حسن اور زندگی کی حرارت میں نہا کر سو رہا ہو۔

منجو کنارے کنارے چل رہا تھا۔ تو اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ قدم بار بار اینٹ روڑوں سے ٹھوکر کھا رہے تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ ابھی پل کچھ دور ہی تھا کہ وہ بھاگ کر تیزی سے وہاں پہنچا اور جنگلے سے جھک کر بانس نیچے لٹکا دیا۔ اس کے دوست سمجھ گئے کہ وہ لاش کو روکنا چاہتا ہے۔ جیسا پچھلے دنوں میں وہ پہلے بھی کئی دفعہ اکٹھے مل کے کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ بھی بھاگ کر آئے۔ اور اس کے دائیں بائیں جھک کر بانس نیچے لٹکانے لگے۔ مگر منجو نے دبلے پتلے صلو کا بانس چھین کر جھپاک سے پانی میں پھینک دیا۔ اسے زور

سے دھکا دے کر دور گرا دیا۔ اور بھولے کا بانس زبردستی چھین کر اپنے دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔

دونوں دوست احتجاج کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے تو منجو پوری آواز سے دہاڑا ہٹ جاؤ ورنہ سر پھاڑ دوں گا۔

وہ منجو کے طرز عمل سے بھونچک سے رہ گئے۔ مگر اس سے فیصلہ کرنے کی بجائے وہ اس وقت لاش کا آخری نظارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اور فوراً ریلنگ سے نیچے جھک کر دیکھنے لگے۔

لاش آہستہ آہستہ آگے بڑھتی آ رہی تھی اور ان تینوں کی آنکھیں بھاگ بھاگ کر اس کے سر، چہرے، سینے ٹانگوں اور پاؤں کو نگل رہی تھیں۔

لاش پل سے بالکل متوازی ہو کر وہاں پہنچی تو منجو کے دونوں بانسوں نے راستہ روکا۔ لاش بانسوں سے بالکل اس طرح اٹک گئی جیسے وہ اسی سہارے کی تلاش میں تھی۔

تینوں دوست آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے جسم کی ہر تفصیل دیکھ رہے تھے۔

منجو کا سانس بڑے زور سے چلنے لگا۔

پھر وہ بڑی احتیاط سے ایک بانس کو ہلا کر جسم کے درمیان لایا اور دوسرا بانس اٹھا کر لاش کے سینے پر رکھا۔

بانس پتھر کو چھوئے لکڑی کو چھوئے۔ گیلی مٹی کو چھوئے اور روئی کو چھوئے تو ہر ایک کے چھونے کا احساس بانس پکڑنے والے ہاتھ کو مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح منجو بھی بانس کی وساطت سے ایک نئے قسم کے احساس سے دوچار ہوا باوجود اس کے کہ بانس پندرہ بیس فٹ سخت لکڑی کا بے جان ٹکڑا تھا۔ اور لاش ایک مردہ جسم تھا۔ منجو نے چھاتی کا نرم لمس اپنے سارے جسم میں ایسے محسوس کیا جیسے وہ خود نرم اور گرم جسم سے ہمکنار ہے اور اس کی انگلیاں اس گرم ابھار میں دھنسی جا رہی ہیں۔

وہ سر سے پاؤں تک لرزنے لگ گیا۔

پھر اس کا دل چاہا کہ وہ بانس سینے سے اٹھا کر پیٹ پر رکھے۔ اس نے اپنی دانست میں بہت آہستگی سے بانس اٹھایا۔ مگر نہ معلوم یہ اس کے ہاتھوں کی لرزش کی وجہ سے تھا یا پانی کے ریلے کی وجہ سے کہ لاش یکدم گھومی۔ اور ایک دم بہہ کر پل کے نیچے گھس گئی۔

منجو کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے کھولتے ہوئے پانی سے نکال کر برف کی سل کے نیچے دبا دیا ہے۔ اس کا اپنا جسم جس کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ ایک دم حسرت اور مایوسی سے سن ہو گیا۔ اور ایک عجیب قسم کی تشنگی اس کے تالو سے آندھی بن کر اٹھی۔ کانوں کے پردے سن سنا گئی۔ اور گلے کے زخرے میں پھنس کر رہ گئی۔۔۔۔

وہ چند لمحوں کے لئے منجمد ہو کر رہ گیا۔

پھر وہ اچانک چونکا۔ جیسے کوئی گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھے۔ اور بھاگ کر پل کی دوسری طرف لپکا۔ مگر لمبے بانسوں نے اس کی تیز حرکت میں مزاحمت کی اور ایک بانس ریلنگ میں اٹک گیا۔ جھنجھلا کر اس نے بانس کو وہیں چھوڑا۔ اور دوسرا بانس سر سے اونچا کر کے مڑا۔ اور ایک رکشے سے ٹکرا گیا۔ خوش قسمتی سے رکشا بہت ہی ہلکا چل رہا تھا۔ مگر منجو نے نہ تو اس سے احتجاج کیا۔ اور نہ چوٹ کی پرواہ کی بلکہ بھاگ کر پل کے دوسرے ریلنگ پر جا پہنچا۔

مگر لاش پل عبور کر کے چند گز پرے جا چکی تھی۔ اور اب لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

منجو نے یوں محسوس کیا جیسے حسرت مایوسی اور بے بسی سے اس کے اپنے جسم کے مسام سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ اور تشنگی کا احساس اس کے پیٹ میں مروڑ بن کر اٹھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب تینوں دوست واپس چلے۔ تو سلو اور بھولا اس کے طرز عمل پر احتجاج کر رہے تھے اور برا بھلا کہہ رہے تھے۔ مگر وہ سر جھکائے چپ چاپ چلا جا رہا تھا جیسے اسے اپنے دوستوں اور ان کی باتوں سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

گھر پہنچا تو گلی والے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ وہ اپنی کیفیت میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس نے غور ہی نہ کیا کہ سامنے والے مکان کی کھڑکی میں تولیہ سوکھنے کے لئے ڈالا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کروٹیں لیتے ہوئے اس کی نگاہ پڑی۔ تو نہ تو پہلے کی طرح اس کا دل اچھلا اور نہ ہی جسم کے پٹھے اینٹھے۔ بلکہ وہ خالی خولی نظروں سے تولیے کو دیکھتا رہا۔

زائرہ نے کافی دیر انتظار کیا اس دوران میں وہ دو ایک دفعہ جھانک کر اسے لیٹا ہوا بھی دیکھ چکی تھی۔ مگر جب بھی دیکھتی تو منجو لاتعلق سا پڑا ہوتا۔ وہ نہ تو کھڑکی کی طرف منتظر آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا۔ اور نہ ہی بے صبری سے اشارہ کرنے کا موقعہ ڈھونڈتا ہوتا۔

بالآخر ایک دفعہ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ مسکرائی۔

منجو نے بھی دیکھا اور مسکرایا مگر وہ جوابی مسکراہٹ تھی۔ خواہش والی بے تاب مسکراہٹ نہ تھی۔

زائرہ نے اشارہ کیا کہ آ جاؤ۔

منجو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ حیران ہوئی ۔۔ چند لمحے سوچا۔ پھر بظاہر نادانستہ طور پر ساڑھی کا پلو گرا کر ایک زوردار انگڑائی لی۔

منجو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ مگر اس دلچسپی میں ابھی تک خواہش کی شدت نہ تھی۔

زائرہ نے وہ سب حربے آزمائے جو فطرت نے عورت کو سمجھائے ہیں ۔۔۔ بالآخر منجو وہاں چلا گیا مگر اس کا دل بھاری بھاری تھا۔ اور اس گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے دل میں وہ تڑپ و بے کلی نہ تھی

جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ وہاں جا کر چارپائی پر بیٹھ کر زائرہ سے باتیں کرنے لگا۔

زائرہ غیر محسوس انداز میں کھسک کھسک کر قریب ہوتی گئی تھی۔ پھر اس نے کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کی۔ مگر منجو کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا۔ نہ ہی اس پر کوئی اثر ظاہر ہوا۔

پھر ایک دم زائرہ پوچھ بیٹھی۔ ''منجو آج کیا بات ہے۔ تم بجھے بجھے سے اداس بیٹھے ہو۔

منجو بہت خفیف ہوا۔ اسے خود اپنی طبیعت سے وحشت ہو رہی ہے اس پر اب مزید خفت کا تازیانہ پڑا تو اسے سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے۔ بے چارگی سے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک دم زائرہ سے لپٹ کر اس کے بلاؤز میں منہ چھپا لیا۔

زائرہ مسکرائی کہ اس کی محنت کارگر ہوئی۔ اب منجو خود ہی آگے بڑھتا جائے گا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور اپنا رخسار منجو کے سر پر ٹکا دیا۔

مگر منجو جہاں تھا وہیں رہا۔

زائرہ دھیمے سے گنگنانے لگی۔ اور ساتھ ساتھ منجو کو لوری کے انداز میں ہلکے ہلکے جھلانے لگی۔ مگر وہ بالکل ویسے ہی رہا۔

تھوڑی دیر بعد زائرہ نے ساڑھی کا پلو اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا تو منجو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا منجو سندر؟''۔۔۔ وہ حیرت سے بولی۔

کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔۔۔ وہ اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ اسے خود بھی علم نہ تھا۔

چل رہنے دو آج۔۔۔ تیری طبیعت اچھی نہیں۔۔۔ زائرہ نے مایوسی چھپاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نرمی سے الگ کر دیا۔

اس دن کے بعد منجو اکیلا اکیلا گھومنے لگا۔

اگلی صبح وہ ندی پر گیا۔ پہلے چھوٹے پل پر اور پھر بڑے پل پر۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ کہ کوئی لاش آئی یا نہیں۔ آج اسے اشتیاق بھی زیادہ تھا۔ اور کئی دفعہ کل والی عورت کی لاش بھی اس کے ذہن میں ابھری۔ آج وہ اکیلا آیا تھا۔ اور اپنے دوستوں بھولا اور حلو کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ البتہ اس کے ہاتھوں میں ایک کی بجائے دو بانس تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کے انتظار کے بعد جب کوئی لاش نہ آئی۔ تو وہ بہت پژمردہ ہو کر گھر واپس چلا گیا اور دوسرے کمرے میں دن بھر لیٹا رہا۔ جہاں سے زائرہ کی کھڑکی نظر نہ آتی تھی۔ ماں نے پوچھا بھی کہ آج تو اس کمرے میں کیوں بیٹھا ہے۔ تو وہ مختلف بہانوں سے ٹال گیا۔

اگلے دن علی الصبح وہ پھر ندی پر گیا۔ مگر کوئی لاش نظر نہ آئی۔

جب تیسرے اور چوتھے دن بھی یونہی ہوا تو اسے الجھن ہونے لگی کہ یہ سلسلہ بند کیوں ہو گیا ہے

۔اور وہ گھر واپس جانے کی بجائے دن بھر بازاروں اور گلیوں میں بلا مقصد گھومتا رہا۔ ایک دفعہ اسے بھولا اور صلو بھی نظر آئے۔ مگر ان کی دور ہی سے دیکھ کر منجو آنکھیں چرا کر دوسری گلی میں گھس گیا۔ وہ ذرہ سے بھی نہ ملنا چاہتا تھا۔

پانچویں دن وہ عام دنوں سے بھی جلدی چھوٹے پل پر پہنچ گیا اور ندی کے پانی پر نظریں گاڑے کسی لاش کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے دنوں کی ناامیدی کے بعد اب انتظار نے بھی خواہش کی شکل لے لی تھی۔

سورج کے افق کے اوپر نظر آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ مشرق کا آسمان روشن ہو چکا تھا مگر مغرب کا آسمان نسبتاً تاریک تھا۔ شہر میں جرائم کی کثرت اور غیر یقینی صورت حالات کی وجہ سے سڑکیں سنسان پڑی تھیں اس نے دو ایک دفعہ ارد گرد دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ جنوری کی سرد صبح میں وہ اکیلا ہی کھڑا ہے۔ اور آس پاس کوئی نہیں۔ مگر آج کل وہ اپنے اندر اس قدر گم رہتا تھا کہ باہر کسی کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اور ماحول کو بھول کر ایک دفعہ پھر سطح آب کے جائزے میں گم ہو گیا

تھوڑی دیر بعد اس نے آہٹ سنی۔ دیکھا تو ایک عورت پل پر کھڑی تھی۔ اس کنارے کے پاس جس پر دکان تعمیر ہو رہی تھی، اور اینٹ پتھروں کا ڈھیر تھا۔

وہ عورت ریلنگ پر سے جھکی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں بانس کی تیلیوں کی بنی ہوئی چنگیر تھی۔ جس میں سے کچھ اٹھا اٹھا کر وہ وقفے وقفے سے پانی میں پھینک رہی تھی۔ منجو سمجھ گیا کہ یہ عورت عام رواج کے مطابق کسی دعا کی قبولیت کے لئے مچھلیوں کو اناج کھلا رہی ہے۔ منجو بھی منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ریلنگ سے پیٹھ لگا کر بوریت دور کرنے کے لئے اس عورت کو دیکھنے لگا جو کسی موجودگی سے بے خبر ریلنگ پر سے بہت آگے جھک کر اپنے کام میں پورے خلوص سے منہمک تھی۔

اچانک منجو کو یوں لگا کہ اس کا سر تیزی سے گھوم رہا ہے۔ ورا سے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ یہ کیسے ہوا۔ اور کیوں ہوا۔ مگر سب کچھ چشم زدن میں ہی ہو گیا۔۔۔۔

منجو سوچے سمجھے بغیر گھومتے ہوئے دماغ سے ہی دوڑا۔ اور عورت کے پیچھے جا کر اپنا چاقو اس کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ پھر جلدی سے اس کی دونوں ٹانگیں، اٹھا کر اسے ندی لڑھکا دیا۔۔۔ ایک آدھ کھلی چیخ اور پھر پانی میں گرنے کا دھماکہ۔۔۔

پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑا۔ اور دکان کے تعمیری سامان کے ڈھیر میں سے پتھر اور سیمنٹ کے بلاک اٹھا لایا۔

عورت ڈبکیاں کھا رہی تھی۔ چونکہ وہ منہ کے بل گری تھی اور خوف کی وجہ سے چیخنے میں منہ کھلا تھا۔ اس لئے پانی سیدھا اس کے گلے میں گھس گیا تھا۔ چنانچہ وہ شور تو نہ کر سکتی تھی۔ البتہ جب بھی ڈبکی کھا کر

ابھرتی تو ٹوٹی پھوٹی دبی دبی کھانسی کے ادھ موئے جھٹکے سنائی دیتے۔

منجو ایک بڑا سا پتھر اٹھائے، ریلنگ پر سے جھکا ہوا تھا۔ جیسے ہی عورت کا سر ابھرا۔ اس نے تاک کر پتھر مارا۔ چٹاخ کی آواز آئی اور عورت کا سر پھر ڈوب گیا۔

جب منجو دوسرا پتھر اٹھا کر دوبارہ جھکا تو سرخ خون کی ایک لکیر سطح آب پر ابھر آئی تھی۔ اب منجو نے پاگلوں کی طرح پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ عورت ذرا نیچے کو بہنے لگی تو یہ کنارے پر ہولیا۔ بھاگ بھاگ کر پتھر اٹھاتا اور تاک تاک کر مارتا۔ حتیٰ کہ اسے یقین ہو گیا کہ عورت دم توڑ چکی ہے یا بے ہوش ہو چکی ہے۔ کیونکہ اب اس نے ہاتھ پاؤں ہلانے چھوڑ دیے تھے۔

آخری پتھر پھینکتے ہوئے منجو کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔ جب اسے خیال ہوا کہ کہیں اس ضرب سے وہ نیچے نہ ڈوب جائے۔

وہ چند لمحے لحظہ بہ لحظہ دور بہتی ہوئی عورت کو۔۔۔ عورت کی لاش کو۔۔۔ دیکھتا رہا۔ پھر بھاگ کر اس نے دونوں بانس اٹھائے اور لرزتی ہوئی ٹانگوں سے ندی کے بڑے پل کی طرف اتنی تیزی سے بھاگا جتنی تیزی اس کے ناہموار قدموں سے ممکن تھی۔ اس کا دل تڑپ اور مچل رہا تھا۔ اور ٹانگوں کے پٹھے اینٹھ رہے تھے۔

بھاگتے بھاگتے اسے یوں لگا جیسے دماغ میں گھومنے والے دھوئیں کے مرغولے تیز سے تیز تر ہوتے ہیں۔

آئینہ

ممتاز شیریں

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کئے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرہ پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اور کیا کہئے بڑا ہی مزہ آ رہا تھا۔۔۔ بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امی کہیں گی: "کچھ کام بھی کرو گی پروین! تم ہو، آئینہ ہے اور بس، جب دیکھو آئینہ کے سامنے"۔۔۔ نہیں آج امی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں، ابھی ابھی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کر دی۔ سیکنڈ ڈویژن، اور میرے گال تمتما رہے تھے۔۔۔ ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوں میرے لئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اول آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز۔۔۔ ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟۔۔۔ پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پرواہ نہ تھی۔ بی اے! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا۔۔۔ گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ پردۂ فلم کی کسی ہیروئین کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو یا کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو کینوس پر کھینچا ہے۔۔۔ اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی، خوب ستائیں گی۔ "مٹھائی کھلاؤ، مٹھائی کھلاؤ" اور میں کہتی پھرتی تھی نا کہ اس سال ہرگز کامیاب نہ ہو گی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرا بھر بھی تیاری نہ کی تھی۔ اور وہ کہتی تھیں۔ "آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے"۔ اور مجھ سے شرطوں پر شرطیں بدھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی ہی دینی پڑے۔ ہاں، کیوں نہ آج ہی اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں۔ خوب لطف آئے گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اکتا گیا ہے۔۔۔ اوہ، امی بھی ادھر آ نکلیں۔ "آج میں سہیلیوں

کو چائے پر بلاؤں امی"؟

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں بیٹی، شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے"۔ آہا، آج امی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زیبی کو ضرور بلاؤں گی۔ وہ تو پارٹی کی جان ہو گی پھر۔ اور صرف اسی کو معلوم ہے نا کہ --- اوں۔۔۔ اوں۔۔۔ بڑی شریر ہے وہ تو سب سے کہہ دے گی۔ پروین کو ڈبل کنگریچولیشن دو۔ ایک تو اس کے گریجویٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی انگیج منٹ (Engagement) پر"۔ اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔ چھیڑتے چھیڑتے میرا ناک میں دم کر دیں گی۔ اور میں بناوٹی غصہ سے یوں منہ بنا لوں گی--- ارے تو غصہ بھی مجھے بھاتا ہے۔ منہ پھلائے ہوئے بھی میں اچھی لگتی ہوں۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔

ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نا۔ "غصہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو"۔ لیکن میں نے آج تک توجہ سے نہ دیکھا تھا۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو دیکھ لو۔ جس طرح بھی چاہے دیکھ لو--- ہاں تو میں اپنے چہرے پر مصنوعی غصہ پیدا کر دوں گی۔ گو جی تو یہی چاہتا ہو گا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں۔ ہاں گھنٹوں یونہی چھیڑتی رہیں۔ کیسا لطف آئے گا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں۔ ایک خاص لذت۔۔۔ چائے کے اختتام پر زیبی مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں؟ --- ہاں وہ فلمی گیت گاؤں گی۔ وہ گیت۔۔۔۔

ساجنا بنا کیسے کھیلوں --- کھیلوں اکیلی کیا؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زیبی ایسی معنی خیز، ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو گی--- اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی۔ ساتھ ہی گدگداتی ہوئی "اکیلی، اکیلی! ہم اتنی سکھیاں جو ہیں۔ اونہہ! اب ہماری حقیقت ہی کیا ہے۔ سے تو اپنا ساجن چاہیے، اپنا--- نہ ہو تو"۔۔۔ اُف۔۔۔ میں --- کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ میں پھر دیکھا۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی۔ میں --- کے سامنے شرماتی ہوئی بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا۔۔۔

"چھوٹی بی بی!" "کیا ہے خیرن بی بی"؟ ایک خبر سنانے آئی تھی"۔ "خبر"؟ میں نے مڑ کر پوچھا۔ "ہاں ہاں کہو نا کیا خبر"؟

"ارے آج تو تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ بی بی! ہاں یاد آیا۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں، تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بری خبریں سنا کر رنجیدہ کروں اچھی بھی۔ توبہ توبہ"۔ وہ جانے لگی۔

"ارے ٹھہرو خیرن بی، آخر کچھ معلوم بھی ہو"؟

"کچھ نہیں بی بی، وہ جو ہمارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا، وہی جو بچپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں۔۔۔ ارے تو یہ میرے منہ سے نکل ہی گیا نا ہائے۔ بھی بھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں"۔

"میری خوشی جائے بھاڑ میں، آخر کہتی کیوں نہیں ہو، اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی، خواہ کچھ بھی ہو جائے"۔

"اوئی میرے اللہ میں نے کیا کیا؟ بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں گی۔ اس وقت تم چھوٹی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ "نانی بی" کا نام تمہارے سامنے نہ لیا جائے"۔

"امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی، اس کا ذمہ میں لیتی ہوں"۔

"کل رات نانی بی جاتی رہیں۔ بجی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں" خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا"۔

گویا تصویروں کے سیٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی ۔۔۔ اداسی کی جھلک۔۔۔ اور میں بال گوندھتی ہوئی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی۔

"نانی بی۔۔۔ میری بوڑھی انا، وہی جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ کاش میں اپنی انا کو مرنے سے پہلے ایک بار دیکھ لیتی میں کیا کچھ نہ دے دوں گی۔ پھر اپنی انا سے صرف ایک بار ملنے کیلئے۔۔۔ میری انا کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یاد کو، ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑ سے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی، ایک مایوسی کے ساتھ، اس دنیا سے چمٹی ہوئی تھیں، غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں۔۔۔ اور تم تو، نانی بی، چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ لیتی تھیں۔ ستائی ہوئی تصویر کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذرا سی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں۔۔۔ ہاں میری انا، تم مصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امی، ابا کو بھی نہیں۔ گو ان کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی

تھیں۔ گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی سورت سی۔۔۔ ور میری غریب انا۔۔۔ تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذرا سی بھی کشش رکھتی۔۔۔ جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ، پچکے ہوئے گال، روکھے سفید بال، پوپلا منہ، لٹکتے ہوئے ہونٹ، بے نور، اندر کو دھنسی ہوئی، چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں۔۔۔ انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر۔ تمہاری یہ ہیئت اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت، ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔۔۔ گویا تم پرانے قصوں کی کوئی جادوگرنی ہو۔ ور امی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی وہ تمہیں ڈانٹ بتاتیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مدعا طلب رحم ہوتا۔ مگر تمہاری پھیکی بے نور [illegible] کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ اور امی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں سے [illegible] جادو اتار رہی ہو۔ ابا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے۔۔۔ وہی خوف ملی ہوئی نفرت کا جذبہ۔۔۔ گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر میری بوڑھی بے بس انا، میں تمہیں چاہتی تھی ننھے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی فلاسفر بنا دیا تھا۔ کیونکہ میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابا کا علم، ان کی عمر، امی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ مگر میں گو ننھی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہمدردی تھی، میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں، کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی۔ ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں، (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کرلیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں۔ طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں منگواتیں مگر میں مچلنے لگتی۔

''اوں، یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تو کھوپرے کی مٹھائی پسند ہے۔ نانی بی لے دیں گی''۔ امی بڑبڑانے لگتیں۔ ''کمبخت بازار کی سستی مٹھائیاں دلا کر بچی کی صحت خراب کرتی ہے''۔ میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو لڑکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگا دیتیں۔ مٹھائی ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ ''میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی کھاؤں گی''۔ امی جھلا اٹھتیں۔ ''اری پروین! کہاں بھاگی چلی، خدایا اس بوڑھی نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے''۔

ہاں امی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ محبت کا جادو، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں میری ننھی پروین، ارے کیا نام ہے تمہارا۔۔۔ اونہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس زمانے میں؟ ہم پرانے زمانے کی بوڑھیاں کیسے بول سکیں۔ یہ زمانہ ہی کیا میرا نام بھی بچوں نے کچھ ایسا ہی رکھا ہے۔ جھا۔ را۔ جیرہ۔ مجھے کھود بولنے نہیں آتا۔ میں تمہیں شہزادی پکارا کروں گی۔ چھوٹی شہزادی ہاں تم ایک شہزادی کی طرح کھبصورت ہو۔ ہوں۔ تو میری چھوٹی شہزادی کیا چاہیئے؟ یہ مٹھائی تم اپنے ہاتھ سے کھلا دو نانی بی''۔ میں ننھی مٹھی کھول کر ننھی سی ٹکیہ بڑھا دیتی۔ نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ کر مجھے کھلانے لگتیں۔ اور یہ معمولی مٹھائی ان کے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں میں سجے ہوئے گلاب جامن، برفی، لڈو پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امی سے نانی بی کا نام پوچھا۔ ''نانی بی، اور کیا۔ انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''نہیں امی کچھ ایسا نام جھارہ زہراء اور مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام ''زہرہ'' ایسا پیارا نام ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے نام کا سا۔۔۔ اور امی مجھے پروین کہہ کر بلاتیں تو مجھے خاک اچھا نہ لگتا اوں۔۔۔ امی مجھے شہزادی کہو پروین نہیں ۔۔ امی سر پیٹ لیتیں۔ ''ارے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے اللہ اس بوڑھی نے کچھ کھلا نہ دیا ہو؟ آخر امی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی اور سے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا برا معلوم ہوتا ہو گا۔ پھر جب نسیم اور نسرین پیدا ہوئیں تو امی نے یوں انتقام لینا شروع کیا کہ ساری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امی مجھے جھڑک دیتیں تو میرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی ''نانی بی میں تم۔۔۔ تمہارک بے ٹی ہوں، امی کی نہیں''۔ رو نہ میری ننھی، میری شہزادی کو کس نے رلایا''؟ وہ اپنے لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کو اور سامنے لا کر میرے تھوڑی پکڑ کر رونے لگتیں۔۔۔ ''میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کو کیسے چاہتا ہو گا۔ وہ ان دو چھوٹے بچوں پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہزادی کے سے کھوبصورت بھی تو نہیں''۔

آخر امی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں، وہ صرف انتقام کے لئے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی کو گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرنا چاہا مگر یہ خیال کر کے کہ مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا اور نانی بی اس سلیقہ سے سب کام سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں

نقش نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈر۔ امی چپ ہو رہتیں۔۔۔ مگر آخر یہ ہو کر ہی رہا۔۔۔ ایک دن نسرین نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔۔۔ اس پر میں نے سے نوچا۔ وہ تھی ہی امی کی لاڈلی۔۔۔ منہ بسورتے ہوئے امی کے پاس دوڑی، "ارے کیا ہوا میری بچی کو"؟۔ ہونہہ ان کی بچی کو بچھو نے کاٹ کھایا تھا۔۔۔ امی کا یہ کہنا تھا کہ نسرین نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا "آپا پروین نے میرا منہ نوچ لیا، خون نکل آیا ہے، وں ۔۔۔ اوں۔۔۔ اوں"۔۔۔ اُف ری اداکاری گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس لیا تھا۔۔۔ امی نے مجھے گھسیٹ کر طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کیے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ "ہنہہ امی نسرین نے میری گڑیا توڑ دی ہے"۔ میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امی کہیں سننے والی تھیں۔۔۔ میں نانی بی کی بیٹی جو ہوئی۔ "اونہہ، گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا دیں گے، گویا تیری موئی گڑیا میری منی سے زیادہ ہے۔ دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی ہے"۔ اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی مجھے امی سے چھین لینا چاہا۔ "بیگم آخر کیوں بچی کو مارے دیتی ہو، کیا قصور کیا تھا اس ننھی نے، ننھی سی جان، ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی"؟ امی کی آنکھوں سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی۔ "دور ہو جا"۔ امی نے مجھے کھینچ کر نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ "تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر، میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں"۔

"نہیں بی بی، سوچو تو ننھی سی جان۔۔۔۔ کہہ اترنے پر تمہیں خود رنج ہو گا"۔

"چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی، دور ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے"۔۔۔ امی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشا تڑاتڑ مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں۔ "اچھا لے جاؤ، اس دیوانی کو ابھی لے جاؤ میرے سامنے سے۔۔۔ یہ میری بچی نہیں"۔ امی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی منکوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔۔۔ میرے اللہ خدا جانے کیوں کچھ روز سے بیگم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے"۔۔۔۔ نانی بی اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا

تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ڈبہ۔۔۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ تک بھر لئے اور "نوکرانی کی بیٹی" کہہ کر قہقہہ لگاتی ہوئی زور سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا ٹوٹے، میں خود ہی خوب پٹوں اور نسرین میری ہنسی اڑا لے، میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "نانی بی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہارا گھر کہاں ہے، نانی بی؟ میں امی کے پاس جانے کے لئے کبھی ضد نہ کروں گی۔ تمہاری بیٹی بن کر رہوں گی"۔

"میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن یوں پڑی رہتی"؟ پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔۔۔ مٹھائی لے آئیں، ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسوؤں کو تھما نہ سکی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانہ میں ہی نانی بی کے پہلو میں سو گئی۔ دوسری صبح امی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روئی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش، گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں۔ یکلخت منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امی کو تک رہی تھی۔ امی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگیں۔ "میری بچی، مجھ سے ڈرتی ہے، کیوں ڈرتی ہو منھی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ زہرہ بی! (امی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو۔۔۔ تم کون ہوتی ہو میری بچی کو مجھ سے چھیننے والی؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔۔۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو، کہتی ہو میرا دل بچی سے بھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو، تمہاری طرف سے میں نے اپنی منھی کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں بھن رہی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان"؟

"بی بی، میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے"۔

"بچی کا دل لگ گیا ہے، شرم نہیں آتی بوڑھے منہ سے جھوٹ بولتے، تمہیں اپنے سفید چونڈے کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے ورنہ وہ ایسی کریہہ صورت بوڑھی سے مانوس ہو جاتی؟ (میں دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی وہ غصہ میں کیسی کیسی باتیں کہے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دن تک یہ سہا ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی

برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ۔۔۔ برداشت میں ایک موئی نوکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں؟ ہونہہ۔۔۔ میں بھی کتنی دیوانی ہوں؟ ادنیٰ نوکرانی سے دبوں"؟ امی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں۔ "سنتی ہو، کان کھول کر سن لو تم اب ایک لمحہ بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتیں، چلی جاؤ اسی وقت۔۔۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی، اٹھو، بوریا بستر باندھو۔۔۔ بیٹھی کیا تک رہی ہو مجھے پھٹے پھٹے دیدوں سے؟ کیا مجھ پر بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے۔

"بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آ کر دیکھنے کی اجاجت دے دو۔۔۔ اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلاوے کا جریہ (ذریعہ) ہے بی بی اس کو بھی نہ چھین لو۔۔۔ کھدا واسطے اتنا جلم (ظلم) نہ کرو۔۔۔ اللہ میاں تمہیں برکت دے۔ میں نے بہت دن تمہارا نمک کھایا ہے"۔

"بچی کو دیکھنے، بچی کو دیکھنے۔۔۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دوں گی۔ اگر پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اپنی منحوس صورت دکھائی۔۔۔ میری بچی کو پھر مجھ سے چھیننے۔ میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں"؟ امی نے مجھے بھینچ لیا اور رونے لگیں۔ اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی ادھر۔۔۔ ان دونوں مورتوں میں کتنا فرق تھا؟ ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت۔۔۔ امی کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پتھر کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔۔۔ غم اور حسن کا امتزاج۔۔۔

ادھر نانی بی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امی کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں سے۔۔۔ اگر ان پھیکی، بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں میں یاس اور رنج کی دنیا ہوتی مگر بظاہر وہ جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔۔۔ مگر میرا ننھا دل انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور امی کی طرفداری کرتا۔ آخر "غمگین حسن" اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا، نہ نانی بی کے پچکے ہوئے گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ ہاں مجھے امی پر ترس آ رہا تھا، مگر اس دل کا کیا حال ہو گا جس سے ایک عزیز چیز چھین لی گئی ہو۔ امی کے پاس دولت تھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔ چاند سے بچے تھے، اس قسمت کی ستائی ہوئی بوڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی تو نہیں۔۔۔ ہاں امی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی اور اس

سو کھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا، کتنی دبی ہوئی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔

نسیم کے رونے کی آواز آئی اور امی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔ امی کے جاتے ہی میں دوڑتی ہوئی ان کے گود میں جا بیٹھی۔ ''نانی بی، مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی نانی بی''۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ نانی بی نے مجھے گلے لگا لیا۔ پھر کیا تھا جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔ رکا ہوا سیلاب امڈ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعے بہہ رہا ہے۔ ''میری بچی، میری ننھی شہزادی تمہیں چھوڑ کے کیسے جاؤں''۔ ''اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی نا''؟ ''نہیں بیٹی اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی''۔ ''کیوں نانی بی، مجھ سے روٹھ تو نہیں گئیں، میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ تم جو کچھ کہو سنوں گی ... رہو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے''۔

''اچھا میں جو کچھ کہوں وہ سنو گی''؟ ''ضرور''۔۔۔ ''مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا دے دو نا، اچھی بیٹی''۔ نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی، اپنے چھوٹے ٹرنک میں سے ریشمی بٹوہ نکالا۔ اس بٹوے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین منکے، موتی، کانچ کے ٹکڑے۔ گڑیوں کے ننھے زیور، بے ڈھے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں ''ساورن'' کہا کرتی تھی۔ سفید چمکتی ہوئی چونیاں، دونیاں۔۔۔ اس میں میں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چکنائی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، عنابی، فیروزی، آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انہوں نے پیار سے چمکار کر کہا۔ ''میری اچھی بیٹی تمہیں مٹھائی لا دوں گی۔ یہ نہ لو''۔ میں کوئی چیز مانگوں اور نانی بی نہ دیں، وہ کبھی نہ، نہ کرتی تھیں۔ ہو نہ ہو اس میں کچھ ہوگا ہی اور میں آئینہ لینے پر مُصر ہو گئی۔ ''ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی''۔ بچپن کی ضد، میں نے ہٹ کر کے، رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسوؤں کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے پاس رہا۔ کئی بار نانی بی نے ترسی ہوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی۔ ''ہوں، وہ غلیظ آئینہ کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے''۔ نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں۔ مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں، مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں، میں وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بٹوہ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ

ان کے سامنے انڈیل دیں۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

"یہ سب کچھ لے لو نانی بی مگر ضرور آتی رہنا نہیں تو میں خوب روؤں گی"۔ اچھا بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی وہیں آ کر جان و دل سے تمہاری خدمت کروں گی۔ مرتے دم تک وہیں پڑی رہوں گی۔ پھر مجھ پر دو مٹھی خاک ڈال دینا بیٹی۔ نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا اور اپنے میلے رومال میں لپیٹ کر کرتے میں چھپا لیا۔ پھر مجھے گود میں لے کر میری بلائیں لیں، گلے سے لگایا، پیار کیا اور مجھے آہستہ سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی اور سر جھکائے خاموشی سے چلی گئیں۔ اب میں رو نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ اب تم اپنا گھر بساؤ گی کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی میں اپنے بکھرے ہوئے خزانے کو سمیٹ کر بٹوے میں ڈالنے لگی۔ کیسی پیاری چیزیں تھیں۔ نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر اس گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں چن لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گذرنے تھے اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے۔ ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپ ہو تھا۔ اب کتنا صاف ہے۔ نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت، اس دن کی، جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں وہ آخری سین جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں سے لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بارہا ابھرتی ہیں۔ یہ یادیں بارہا میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں، بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے؟ اس بجھے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ اس سوکھے سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یاد چٹکیاں لے رہی تھی، یہ آئینہ انہیں راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا جب ہم ہوا خوری کے لئے جا رہے تھے۔ ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لے جایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے دور نکل جاتے ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خود رو گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی۔ اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی میٹھی بولی بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر بیٹھتیں ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں نغموں سے معمور ہو جاتی۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوں کی دوکان

لگتی تھی، جہاں صرف پان کی بیڑی بکتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسے سے پان اور سپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر بڑے انہماک سے پان کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بوڑھا دکاندار اندر جا کر ''پان کوٹنی'' لے آتا اور نانی بی کے سامنے رکھ دیتا اتنے میں دو چار پوپلے منہ والی بوڑھیاں اور آ جاتیں۔ سب کی سب پان خرید کر ''پان کوٹنی'' کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں بھی چلم لے کے آ جاتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی مجلس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور ان سب کی عجیب عجیب حرکتوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بڑھیاں نسیں نکالتی ہوئی، پان کوٹتی ہوئی اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے جھڑ جھڑ کی باتیں کرتے رہتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی، پوتے پوتوں کی، کبھی محلے والوں کی اور اکثر ''ہمارے زمانے اور اب کے زمانے کی''، ''اب کے جیور بھی کوئی جیور ہوئے۔۔۔ بوا اب کی چھوکریوں کا دماغ تو آسمان پہ چڑھ گیا ہے''۔ ایک بوڑھی منہ پر زور سے ہاتھ مار کر کہتی۔ ''پرانے جیوروں کے نام ہی سے کان پکڑتی ہیں۔ ہونہہ ہاتھوں میں دو چوڑیاں، گلے میں باریک ''سنگل'' کانوں کی لو میں ایک باریک کرن پھول یا جھومر اور بس بھلا یہ بھی کوئی جیور ہوئے۔ ہمارے زمانے میں جو پہنتی تھیں کان بھر کر سونے کی بیتاں۔ ہایا ''رخساروں'' پر جھومتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں''۔

''اور یہ بھی دیکھا، ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا چھی چھی کیسی بری لگتی ہے ناک''۔ ایک بوڑھیا، نتھنے چڑھا کر نفرت ظاہر کرتی۔

''نانا یہ زمانے کی چھوکریاں بھی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ موٹی موٹی لٹیں لٹکی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصہ کوڑے کا ڈھیر بنا لیتی ہیں۔ حشر کے دن پل صراط پر سے پھسل پھسل کر نہ پڑیں تو جانیں۔ کیا ہمارے بزرگوں نے جھوٹ کہا تھا۔ ''بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں سیدھے پل صراط طے کر لو گی''۔ اب تو اللہ ہی بچائے ان ٹیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھی مانگ نکالو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ ٹیڑھی مانگ تو کیسی اچھی صورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس بچی ہی کو دیکھ لو بوا۔ کیسا پھول سا مکھڑا، چاند سی پیشانی، سیدھی مانگ نکالتی تو چہرہ پر کیسی رونق آ جاتی، اب تو کرشتان لگتی ہے کرشتان''۔ اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور میرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی''۔ اماں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے فیشن''۔

"وہ بوا، وہ مکھیش کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا دیکھو تو پنڈلیاں ننگی بازو ننگے، لعنت بھیجو لعنت"۔

اور یہ رنگ تو دیکھو بوا، کیسا پھیکا چھی چھی، یہی کیا اب کے سب رنگ پھیکے سچ پوچھو تو اجلے رنگ میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں"۔

"اونہہ اجلا رنگ، اب کی چھوکریاں جیسے کپڑے پہننے کو عار نہیں سمجھتیں، ہم سے بڑھیاں ہی پھرتی ہیں۔ بھلا ان چھوکریوں کو کہیں جلا رنگ سجتا ہے"

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں....

"ہمارے زمانے کی شادیاں، شادیاں تھیں، کئی ہفتے لگتے تھے، کیسی کیسی رسمیں... اب دیکھو چٹ منگنی پٹ بیاہ، اور بیاہ بھی کیسا بیاہ ادھر نکاح پڑھا گیا، ادھر دلہن کی رخصتی ہوئی۔ ۔ کوئی رسم نہ ریت"۔

"اور اب کی دلہنیں تو خلا اتاری چھوریاں، توبہ توبہ آنکھ کا پانی بہ گیا ہے۔ ہنسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔ اپنے خصم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ رو رو کر بے سدھ ہوجاتے تھے اللہ اللہ کیا زمانہ آیا"۔

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی، اماں! کاہے کو بولوں اس دلہن کی بے شرمی"۔ اور سب بوڑھیاں ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگائے آنکھ پھاڑے بڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی ہمجولیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے، توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا ماں بے چاری نے سر پیٹ لیا۔ کیا کرتی سمدھنوں کو منہ دکھانے سے رہی۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔ اوئی، میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی، اس چھوکری کی آنکھوں میں... نا بابا ہم سے تو رہا نہ گیا، آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی، سمدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بوڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے سے اتنے زور سے نوچا کہ اس کے چیخ نکل گئی۔ جب کہیں جا کر دو بوند پانی نکلا وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پر پلٹ نہ پڑی، ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔

"اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ اس بے شرم کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے تھا"۔ سب یک زبان ہو کر کہتیں۔ ور بوڑھے میاں بھی بڑے زور سے سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔ یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے ہمہ تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔ جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کیسی پگڑی ایک بڑے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے

تھے) اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجانے لگتے۔ اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد یک جملہ نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں۔ یہاں بھی نانی بی خاموشی سے سب کی باتیں سنتیں۔ اب نہ جانے یہ ان کی [illegible] تھی [illegible] رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرہ سے کسی جذبے کا اظہار ہوتا۔ شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔۔۔ پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی [illegible] کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں سے لے جاتی۔

یہاں ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے [illegible] جھوڑوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی اور نانی بی [illegible] آ بیٹھتی۔

''ایک اچھی سی کہانی بولو نانی بی''۔ آج کون سی کانی (کہانی) [illegible] اور ساتھ ہی اپنی نسوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں۔ پھر میلا سا رومال اپنی سوسی کے ''لہنگے'' کے نیفے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہوئی کہانی شروع کرتیں۔ ''اچھا تو سنو ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں''۔ پھر ناک پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔ اس نے سب شہزادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے۔ سب بولیں۔ ''آپ'' مگر چھوٹی شہزادی بولی''۔ اور نانی بی اس جملے سے رومال کو پھر نیفے میں ٹھونس لیتیں۔ اس سے پونچھنے پر بھی کالی کالی دھول کی ایک تہ سی ان کے نتھنوں پر جمی رہتی۔ اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے منہ کے کناروں پر پان کی لال لال پیک بہ آتی۔ اور وہ ایک طرف منہ پھیر کر پیک کو تھوکتی ہوئی اپنی کہانی کو جاری رکھتیں۔ ''چھوٹی شہزادی بولی۔ ''ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں اور حضور آپ کو بھی''۔ اس جواب کو سن کر بادشاہ۔۔۔

''کیسی چھوٹی شہزادی نانی بی''؟ ''مجھ جیسی''؟ میں بیچ میں کہہ اٹھتی اور وہ لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیتیں۔ ''ہاں بٹی تمہاری جیسی شہزادی ایسی ہی خوبصورت شہزادی''۔ میں خوشی سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ ''ننھی کیسا پیارا مکھڑا ہے تمہارا ماہ، چاند کا ٹکڑا''۔ نانی بی میری بلائیں لینے لگتیں۔ تت، تت، تت، ''دیکھو تو سب انگلیاں ٹوٹیں، کتنا پیار ہے مجھے اپنی بچی سے''۔ اور میں اپنی ننھی ننھی باہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نتھنوں پر جمی راکھ دھول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔

پھر نانی بی اپنی ہتھیلی پر ذرا سا چونا پھیلا کر، پھونک پھونک کر خشک کر لیتیں اور اس میں تھوڑی سی نسوار انڈیل کر ملنے لگتیں۔ ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ کہانی بولتی جاتی تھیں۔ نانی گھس گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بناتیں اور ایک پیاری بڑی سفید ڈبیا میں۔ بالکل میرے کریم

کی ننھی سی ڈبیہ کی سی۔ انہیں ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ سب کرتی ہوئی وہ بڑی ہی دیر سے کہانی سناتی تھیں۔ یک ایک جملہ مزے سے لے کر نانی بی کو کہانی سنانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا۔ بار بار کسی نہ کسی بہانہ سے ایسی جگہ ٹھہرا دیتیں۔ جہاں میرا اشتیاق بڑھ جاتا، پان کی پیک تھوکنے کے بہانے یا گولیاں بنانے میں بہت ہی منہمک ہوتیں، میں بے تاب ہو جاتی۔

"اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہو نا"۔

"نا بیٹی جلد بولوں تو کھاک مجا آئے گا"۔ اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان کرنے میں کہانی کا دوگنا مزہ آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے، اتنی اچھی طرح بیان کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی "شہزادی" سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر "شہزادی" پہ کوئی نہ کوئی مصیبت آ پڑتی۔ پھر کہیں سے ایک "شہزادہ" آ نکلتا۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے، اور اس شہزادی کو مصیبت سے نجات دلا کر اپنے محل لے جاتا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ختم ہوتی۔ یہ شہزادہ کتنا اچھا ہے، چھوٹی شہزادی کو بچانے والا، میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہزادی ہوں، نانی بی! مجھے بھی یک ایسا چھوٹا شہزادہ لے جائے گا" میں بہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی۔ اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک سی جاتی۔ ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہو کر انگریزی پڑھو گی۔ کھوب پڑھ کر بی۔ اے پاس ہو جاؤ گی تو ــــ اس پر تم ہو بھی کھوبصورت تمہیں ایک بہت بڑا آدمی بیاہ لے جائے گا کوئی بہت بڑا ہافسر"ــــ

"ہوں، ہوں بڑا ہافسر نہیں چاہیے۔ چھوٹا شہزادہ"۔ میں مچلنے لگتی۔

"ہاں ننھی۔ وہ شہزادہ ہی ہو گا۔ میری شہزادی وہ دن کب آئے گا۔ اللہ مجھے اس وکھت تک جیتا رکھے۔ تمہیں دلہن بنی دیکھ لوں۔ تو چین سے مر سکوں گی۔۔۔" آہ نانی بی، شہزادہ تمہاری شہزادی کو لینے آ گیا ہے مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی تمہاری آخری آرزو تھی۔ اس کو دیکھ کر فرط خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ ان کے حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیں نہ لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں۔۔۔

ہاں تو یہ ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔ کچھ دور ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی تھی کہ اس تالاب تک ہو آئیں، مگر نانی بی کے کہانی بولتے ہی میں اندھیرا ہو جاتا، اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے

دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور مچاتے آ رہے تھے، تالاب کے پاس آ کر وہ بندر والا اکڑوں
بیٹھ گیا اور اس نے تماشہ دکھانا شروع کیا۔ لڑکے اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے
چند بے فکرے مرد بھی جمع ہو گئے۔ ”میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے پاس
چلو“۔ نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور لے جا کر ایک اونچے ٹیلے پر
کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ ”یہاں نہیں وہ قریب لے چلو نانی بی“۔ ”نا
بی، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ اتنے گیر مردوے کھڑے ہیں ہائی میرے اللہ۔“ اور نانی بی نے چادر
کھینچ کر اپنے چہرہ کو اور زیادہ ڈھانپ لیا۔ ”اچھا تم نہیں آؤ گی تو میں یہیں کھڑی رہوں گی“۔
میں نانی کی چادر تھامے تماشہ دیکھنے لگی۔

”اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو“۔ بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر حکم دیا۔
بندریا نے جلدی سے ایک چھڑی اٹھائی اور اسے سر پر رکھ کر جلدی جلدی چلنے لگی۔ گویا
بہت کام کر رہی ہے۔ ”اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کرو بیٹا“۔ بندریا نے زور سے
چھڑی زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

”بندریا نے چھڑی کیوں پھینک دی نانی بی“۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو دو ایک
جھٹکے دے کر پھر وہی پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی
بی ایک مٹی کے ڈھیر میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔

--- انہوں نے میری بات سنی تھی، کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک آئینہ کا
ٹکڑا... ”کیسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھاؤ نا“۔ نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے
غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ مجھ
سے نہیں اپنے آپ سے۔

”آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا“۔

”ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا۔ نانی بی؟ وہی ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی“۔ ”تمہارے
گھر والے کون نانی بی“۔ ”وہی بزرگوں نے جن کے ساتھ میرا بیاہ کیا تھا“۔ ”تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی
بی۔ باجے بجے تھے، تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا
قصہ سناؤ نانی بی، آج کہانی کے لئے اصرار نہ کروں گی“۔

”میری بھولی بچی ہاں میں نے اچھے اچھے جیور اور کپڑے پہنے تھے۔ مگر بیاہ کے معنی یہی
نہیں۔ اچھا آج کانی (کہانی) نہ سنو گی۔ مگر میری جندگی کہانی سے کیا کم ہے بی۔ کیا بتاؤں
کیسے دھوم دھام سے ہوا تھا میرا بیاہ... کہتے ہیں پانچ ہرار کھرچ ہوئے تھے، پانچ ہزار! برابر ایک

مہینہ لگا تھا، پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لد گئی تھی گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑتی تھی۔ جھومر، مانگ میں موتی، پیشانی پر ٹیکہ جھومتا ہوا، ہاتھوں میں کنگن، پونچیاں، گوٹ اور کونوں کے بیچ میں ہاتھ بھر کر ہری ''ریشم کی چوڑیاں'' اتنی بڑی سی نتھ۔ پاؤں میں چار جوڑی تیور، کان بھر کے سونے کی بتیاں اور مجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے، ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ منہ پر چمکتا ہوا ریزہ چمکیاں پھر مہندی، کاجل مسی سے سولہ سنگار اور میں اکی کاہے کو تھی بنی۔۔۔ نانی بی نے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گول صورت، پھولے پھولے گال، کیسی روکھ تھی چہرہ پر اب یہ پچکتی ہوئی ہڈ چمڑا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس زمانے میں کیسی بھاری جوان تھی میں۔ ایک ایک بازو یہ موٹا دروازے میں نہ سماتی تھی''۔۔۔ اور کپڑوں کی بھڑک کا کیا کہنا دستی یہ بڑے بڑے طلائی بوٹوں والی''۔ نانی بی نے بوٹوں کی چوڑائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلا دی ''ہرے ہرے لہنگا اور اطلس کا کرتہ، کیسی بن سنور کر بیٹھی تھی میں'' میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور تصور میں نانی بی کو دلہن بنی دیکھ رہی تھی، پچکے ہوئے نہیں، ''پھولے پھولے گالوں والی''، نانی بی کو۔

''میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اور ہم تھے ہی کتنے، ایک بھائی، ایک بہن، بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ کھرچ کیا۔ ''ان'' کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیز مانگے اور وہ نہ ملے بات ابھی جبان پر بھی نہیں آتی تھی وہ چیز میرے کھدموں میں۔۔۔ کیا کہوں بٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گجرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ کر لائی تھیں آکھر ایک ہی تو بیٹا تھا۔ جگر کا ٹکڑا۔ میں پھولوں پر بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو دھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے، مجھے گھر کی ''پاچھا جادنی'' کہا کرتے تھے، مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز میرے لئے لے آتے، کیسے کیسے پیار کے ڈھنگ آتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن مسہری پر بیٹھی اپنے دامن میں گوٹا ٹانک رہی تھی، پیچھے سے آ کر میری آنکھیں بند کر دیں''۔ پھر جلد ہی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبا لی۔ ''چھی چھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ کھیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔ ہاں آنکھیں بند کر دیں اور چیز میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹا لیا۔ اوئی میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے آئینہ میرے چہرے

کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھوں کیسے سجتے لگتے ہیں۔ جھومر تمہارے کانوں میں"۔ میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھے تو بڑے بُرے لگتے تھے۔ اتنے لاب اب لٹکتے ہوئے۔ نا بابا مجھے تو کھاک اچھے نہیں لگتے۔ وہ ہنس کر بولے۔ "تم تو پرانے زمانے کی ہو۔ آٹھ دن رات چار دیواری میں بند رہتی ہو نا۔ تم کیا جانو۔ زمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے جس یہ نیا فیشن ہے نیا فیشن"۔ فیشن ویشن کیا جانوں مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے۔ [illegible] یہ آئینہ تو پسند ہے۔ دیکھو اسے بھی نہ نہ کہنا۔ بڑی دور سے منگوایا ہے۔ [illegible] آئینہ! آئینہ کیا کہوں، کیسا پیارا تھا۔ پھر یہ تو ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی خوبصورتی [illegible] کھر ہے۔ کناروں پر کیسے کیسے رنگا رنگ پھول گویا ہیرے جواہرات جڑے [illegible] تک تو بہت کھوں تھی مگر یونہی گلہ کرنے لگی۔ "ارے بھلے آدمی کاہے کو [illegible] روپیہ [illegible] رہے ہو مجھ پر، تمہیں تو پیسوں کی کھدر ہی نہیں، کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری بجھ میں۔ پچھتر روپے بابا"۔ اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے۔ "جہرہ تمہیں یوں [illegible] دیکھ کر کھیت ویت سب کچھ بھول جاتا ہوں، تمہاری کھوڑی پر پچھتر (۷۵) روپیہ تو [illegible] صدقے ہیں"۔ آہ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں، ان باتوں کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے"۔ نانی بی نے آنسو پونچھے اور دبی آواز میں کہنے لگیں۔ "آہ اس زمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے، پچھتر (۷۵) روپیہ دے کر، اتنی دور سے پرائے ملک سے میرے لئے آئینہ منگائے تھے۔ اللہ اللہ یہ آئینہ تو ان کی یادگار محبت ہے"۔ اور انہوں نے اس آئینے کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا۔ "اور میں کیسے پھخر سے وہ آئینہ اپنی سہیلیوں کو دکھاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں "اری جہرہ تو تو بڑے بھاگ والی ہے، کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے"۔۔۔

آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں، یہ آسمان کا چکر۔۔۔ یہ زمانہ کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اپنا دکھڑا کیا سناؤں بیٹی۔ میرا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ میری کھسمت ایسی پھوٹی ایسی پھوٹی خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے"۔ نانی بی پھر رونے لگیں۔ "میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے"۔ نانی بی نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا۔ "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا اتنی دھن دولت تھی۔ باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وکھت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ وہ تارتکھوں کے پُل باندھتے اور یہ تھے سیدھے سادھے آدمی بھولے نہ ساتے اپنی تعریف سن کر۔ سب کو سچے دوست جان کر کھوب کھاطر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے برے کی

تیج کرنے اور پھر کھدا نے انہیں ایسا رم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے درواجے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانوں بہت سے لچے لفنگے گنڈے بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ بری صوبت (صحبت) سے اللہ ہر ایک کو بچائے۔ جب پیکمبر کا بیٹا تک کھراب ہو گیا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ تو ہر ایک کو کھراب کرتا ہی ہے۔ پھر بھری جوانی ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لئے ان کو شرب اور جوئے کا چسکہ لگا دیا۔ کھدا ان سب کو گارت کرے۔ میرے ہیرے جت آدمی کو کھرب کیا۔ پھر کیا تھا بٹی، باپ کی اتنی محبت سے کمائی ہوئی پونجی مہینوں میں اڑ [illegible] پھر میرے۔ جہیج کی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں یہاں تک تو کھیر تھی، [illegible] تو کیا کہوں بٹی"۔۔۔ نانی بی زور زور سے سسکیاں لینے لگیں۔۔۔ "تو میرے [illegible] لگے۔ شراب کے نشہ میں چور آدھی آدھی رات کو آتے اور جیور کے لئے تنگ جا کرتے [illegible] لیتی تو بس میری شامت ہی آ جاتی۔ اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے، لکڑی کہیں [illegible] پڑتے تو اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوج جاتے اور ان پر نیلے نیلے نشان ابھر آتے۔ سارے جیور کپڑے برتن سب ٹھکانے لگ گئے۔ یہاں تک کہ میرے بدن پر ایک دامنی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پھاکوں پہ پھاکے گجار کے میرے دیدے اندر دھنس گئے۔ گلوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رت انہوں نے شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچہ سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے درواجا کھولا، مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے وہیں پر بلایا۔ گئی، تو کیا کہوں بٹی انہیں بر بر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی کھینچنے لگے۔ یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاکت لگائی، بہت روئی بھی، مگر انہوں نے دامنی کھینچ ہی لی۔ وہ دامنی تھی ریشم کی۔ یوں چند پیسوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی بدن پر ایک کپڑا نہیں ہوگی، ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی، ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی کھسمت پر رویا کی۔ صبح رسوئی میں ادھر ادھر سے کچھ کوئلے جمع کر کے انہیں سلگا کر چولھے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں۔ میرا بھائی آ کھڑا ہوا ہے۔ کھدایا مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جمین میں گڑ جاتی ایسی حالت میں، مادر جاد ننگی، کھدایا جمین سک (شق) ہو جاتی اور میں گڑ جاتی۔ آہ! ہم جیسی گھنا گاروں کی دعا کہاں کھبول ہوتی ہے وہ تو اگلی نیک بی بیوں کی ہی کھی تھی ادھر دعا ہونٹ سے نکلی اور جمین سک ہو گئی۔ کھیر کیا کرتی، ادھر ادھر دیکھا تو ہانڈیوں پکڑنے کا کالکھ سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی گنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی، پھٹی پھٹی حیران نجروں سے مجھے گھور رہا تھا جبان سے ایک لفج نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ کھبر نہ تھی

کہ مجھ پر یہاں کیا گجر رہی ہے۔ ہاں ایک دن پیچھے میرا بھائی آیا تھا مگر میں اس سے کھلا کیسے جبان کھولتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ بھابی دیکھتے کہہ گیا تھا جبرہ کتنے دن ہو گئے تمہیں میکے آئے۔ بیچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں نوکری کی خاطر پرائی بستی جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں تو آ کر تمہیں ضرور بلا کر جاؤں گا۔ اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایک اچار ساس نے اس کو اسے کتنا دکھ پہنچا ہو گا؟ آ کھر کھون سے کھون لگا تھا"۔ اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز ہی نہ نکلی تھی۔ لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور زیادہ لٹک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ننھا دل بھر آیا۔ گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی پھر بھی نانی بی کو یوں روتے دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔ آنسو پونچھے اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ "رو نہ ننھی تم کاہے کو روتی ہو ننھی شہزادی، اتنا درد ہے میری بچی کو"۔

"اچھی نانی بی، تمہیں کہانی سنانے سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں ضد نہیں کرتی، چلو گھر چلیں"۔

"نہیں بیٹی تمہیں اپنی دکھ بھری کانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ اب تلک میں کسی سے نہ بولی تھی۔ کس سے بولتی؟ اس کھودگرجی (خودغرضی) کی دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں، مگر تم بیٹی ننھی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی --- اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جندگی میں لگا ہی رہتا ہے۔ پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ کھیر لو باقی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں۔ کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔

"یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے جبرہ"؟ میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی کھد ہاجر ناجر ہے۔ ان کے کھلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھڑی پھینک کے وہ بولا۔ "لو جبرہ یہ پہن لو"۔ اور آپ دوسری طرف منہ پھیر کر توشہ دان میں سے کچھ کھانے کی چیجیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھڑی کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے، کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔ نجریں نیچے کئے بیٹھا رہا۔ کھا چکنے کے بعد آہستہ سے دبی آواج میں بولا، چلو جبرہ گھر چلو مجھے اس بدماس کے سب کرتوت معلوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی کھسم میں تمہیں پھر اس نامحھ کے

گھر بھیجوں۔ اس جالم کو اپنے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کھدم رکھا تو محلہ بھر میں پھجیتی (فضیحت) کراؤں گا'۔ پھر وہ کچھ نہ بولے۔ کھاموشی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ یہ ضرور کرے گا۔ اوہ! میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے ان سے پھر ملنے نہ دے گا۔ نانی بی بہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ ''وہ گھصے میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گصہ اتر ہی جاتا اور مجھے تسلی ہوتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس کے چہرہ پر کیسا سکون تھا۔ گصہ دم کو نہیں۔۔۔ میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے۔ نانی بی نے سرد آہ بھری۔ میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آہ بی، بی''۔ میں تعجب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ''آہ! کیا کہوں۔۔۔ بے۔۔۔ ن۔۔۔ ان کے چہرہ پر چپت، تھا۔ اداسی تھی وہ جور اپنے کئے پر رنجیدہ تھے اور بیٹی ان کے ہاتھ میں نئی ساری بھی تھی۔ میں دروازہ کھولنے بھاگی۔ بہت جلد بھاگی۔ پھر بھی میرا بھائی آ ہی گیا۔۔۔ آ ہی گیا۔ مجھے جور سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں کیسی الٹی باتیں سنائیں، انہیں شہدا، لفنگا، بدمعاش کہا، بے گیرت کہا، میرے اللہ! نہیں کبھی نہیں وہ بے گیرت نہیں تھے۔ ان میں سرتھنوں کا خون تھا، میں بھائی کے پاؤں پر گر پڑی۔ ''اللہ واسطے ایسا نہ کہو بھائی''۔ اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ اللہ یہ سن کر بھی وہ کھاموش کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے۔ ''میں تمہارے گھر پڑے رہنے نہیں، جہرہ کو لینے آیا ہوں'۔ اب اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں''۔ ''شرم نہیں آتی اسے اتنا ستا کر''۔ میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا۔ 'کیا میری بہن اتنی سستی ہے ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی کھسم اگر میری بہن بھوکوں مرے، پر اسے تم جیسے جالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ مار ہی تو دیا اسے میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساری کھینچ کر نالی میں پھینک دی۔

''مجھے جہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں جرور چلا جاؤں گا۔ اگر راجی ہے تو تمہارا کوئی حکھ نہیں اس پر وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے جرور لے جاؤں گا''۔ ہائے! کیوں نہ کہے گی؟ پھر آ جائے گی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے'۔ اور میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی۔ ''بھائی میں جاؤں گی، بھائی مجھے جانے دو' اور بھائی نے مجھے آگ برساتی نجروں سے دیکھا چپ بے گیرت کہیں کی''۔

''نہیں میں جہرہ ہی سے پوچھوں گا۔ انہوں نے دہلیز پر کھدم رکھتے ہوئے کہا کھریب تھا، میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے ''بے شرم اندر کھدم رکھتا ہے؟ ایسا بے شرم نہ ہوتا تو

عورت جات کے گھنے بیٹھا، کیا پوچھتا ہے جیرہ سے۔ وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے۔ ''میں اس جالم کے ساتھ نہ جاؤں گی''۔ آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا۔۔۔ کیسا جھوٹ بولا۔۔۔ 'اگر تجھ میں ذرا بھی گیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا۔۔۔ پھر کبھی ادھر نہ پھٹکنا'۔۔ پھر میرے بھائی نے اتنے زور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور پر کھڑے تھے۔ آہ بٹی میں نے اچھی طرح دیکھا، ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا۔۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے، ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے گیرت والے تھے۔ بٹی، اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر آتے۔۔۔ تو میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا ہوا۔ میں موکھا پا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے نکلی بٹی تو نوکری کے لئے ماری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں کھدم نہ رکھا۔۔۔ میں ماں کے پاس چین سے رہ سکتی تھی۔ مگر میری گیرت کیسے گھولتی کہ وہاں پڑی رہوں، مجھے کسی کے گھر کی نوکری تو کیا کولی، مجوری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا، بھیک مانگنا منجور تھا، مگر اس دروازے پر جانا منجور نہ تھا جو ان پر بند ہوا تھا۔۔۔ اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو بھی ایسا نہ کرتے۔ مجھے جرور بھیج دیتے۔ انہیں بٹی کا لاکھ درد سہی، وہ میاں کا درجہ پہچانتے تھے۔

کہا کرتے تھے عورت کا مکام سوہر کا گھر ہی ہے۔ بھائی نے جوش میں یہ نہ پہچانا۔ وہ ہوتے تو ضرور بھیج دیتے۔۔۔ سبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے اور مجھے تو ایسا معلوم پڑتا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی بہت سنبھل گئے تھے۔ پھر میری جندگی کیسے سکھ سے گجرتی؟ ایک دو دن تکلیف سہہ ہی لیتی۔ اور پھر وہ مارتے تو کیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا تھا صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو ان نیلے سوجھے ہوئے حصوں پر ہاتھ نہ پھیرا کرتے۔ پھر ایک دو دفعے تو انہوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نجروں سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی اوکھدا، کھدایا! ان کی ایسی ایک نجر ہی بس تھی۔۔۔ ایک نجر ہی بس تھی''۔ نانی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں تو ڈر ہی گئی ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس کے اندر بھونچال آ گیا ہو۔ کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ آہستہ تھما، کہنے لگیں۔

''اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ سراب جوئے کا کیا کہنا اگر یہ لت فرشتوں کو بھی پڑے تو نہ چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری باتوں میں ان کی طرف انگلی

اٹھائے۔ ایسے تھے وہ۔ کیر عورت کی طرپھ کبھی نجر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گن ہوں، یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی"۔

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہوئی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جا گھسی تھیں۔ صرف ایک بات مجھے اہم معلوم ہو رہی تھی۔ "نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا"۔ اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی پی کہانی ختم کریں تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لیے تو میں بڑی ہمدرد صورت بنائے بولی۔

"نانی بی! تم نے سچ مچ کتنا دکھ اٹھائی ہو۔ کیسا خرب تھا تمہارا آدمی، تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا؟ کیسا خراب آدمی، تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا"؟

"نپھرت بیٹی؟ اس کی صورت سے نپھرت"؟ کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا، کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا چھیلا جوان، گٹھا ہوا بدن، چوڑا سینہ اور صورت کا تو کیا کہنا۔ چوڑی صورت، یہ اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹھی اس صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا۔ جب اُجلے اُجلے کپڑے پہنے لال کشمیری رومال کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھنے کو یہ دو آنکھیں بس نہیں تھیں، میں جلدی جلدی لال پیلا پانی لے آتی اور ڈیوڑھی کے باہر کدم رکھتے ہی اتار پھینکتی کہ کہیں چاند سے مکھڑے کو نجر نہ لگ جائے۔ اس کی صورت سے نپھرت بیٹی! وہ تو بادشاہوں کا بادشاہ تھا۔ شہجادوں کا شہجادہ"۔۔۔

"کیا کر رہی ہو پروین؟ اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوا دوں۔ سب سامان آ گیا ہے۔ تم آؤ نا خیرن بی کی کچھ مدد کرو۔ بے چاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ دو ایک تم کر لو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوڑتا ہی نہیں"۔

"نہیں امی آج پارٹی نہیں دوں گی"۔

"کیوں بیٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ"۔

"اس دنیا میں صرف خوشی ہی تو نہیں ہے امی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے"۔

"ہونہہ"۔ امی زور سے ہنس پڑیں۔ ابھی سے قنوطیت چھا رہی ہے۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی"۔

"امی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں"۔ میں نے نہایت سنجیدگی

سے جواب دیا۔

"پھر وہی نانی بی! سچ سچ اس بڑھی نے تم پر جادو کر دیا تھا"۔

امی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔

روغنی پتلے

ممتاز مفتی

شہر کا ایک شاپنگ سنٹر۔۔۔ جس کی دیواریں، شلف، لماریاں بلوری بنی ہوئی ہیں جس کا بنا سجا فیکیڈ جلتے بجھتے رنگدار سائنز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹر مختلف رنگوں کے گلوکلرز پینٹس کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہیں ہال میں جگہ جگہ کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں۔ جوان کے ارد گرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگارنگ لباس پہنے کھڑے ہیں۔۔۔۔۔ یاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے ہیں نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ ٹھنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کیلئے آئی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں گھاگ بیگمات گرین یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں، رومان آرکیڈ بھی ہے، کیوں نہ ہو آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زربفت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن گیجٹس سے سوئی سلائی تک سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک سب کچھ وہاں موجود ہے لوگ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالا لیکر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انہیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کا باس پہنے کھڑے ہیں۔ چہروں پر جوانی کی سرخی

جھلملا رہی ہے آنکھوں میں رات بھری چمک ہے ہونٹوں پر رضا مندی بھرا تبسم ہے جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے سپردگی کے لئے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے نہیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں الیوژن لہریں لے رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو یہ لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی [illegible] سے کہے گی '' مجھے سنبھالو میں گری جا رہی ہوں۔ اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو [illegible] چل پڑے گا ...، ہولڈن ڈارلنگ۔ دیکھو میری گود میں گرنا۔ ،

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی۔ [illegible] والی [illegible] کا سٹیوم والی، بیکنی والی، سی تھرو لباس والی، لٹکتے بالوں والی۔ پتلون والی۔ [illegible] والی [illegible] انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں شکاری جیکٹ والا دانشور، موٹر سائیکل والا بلیک سوٹ۔ اچکن۔ ہپی۔ کرتے پاجامے والا۔ سٹوڈنٹ۔ ڈینڈی مصور۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے پرانی میزیں کرسیاں شلف اور پتلے جن کا رنگ روغن اڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے آرکیڈ بند ہو چکا ہے ہال میں سات بتیاں روشن ہیں۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے ......،،

گھڑی نے دو بجائے ...... سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی سی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانگا عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چکائی لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اڑنے لگے۔

'' مائی گاڈ۔ سی تھرو چلائی۔ یہ دیکھو اس نے اپنی ٹانگ لہرائی میری ٹانگ پر نیلی رگیں ابھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔

کیوں نہ ہو بلیو بلیڈ ہے بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی ۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں ۔ سب لوگ جس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف
دیکھنے لگے ۔

تیرے ہاتھ تو خالی ہیں ۔ کہاں ہے ساغر ۔ کرتے پاجامے والے نے پوچھا ۔

''اندھے وہ تو خود ساغر ہے ۔ دکھتا نہیں تجھے ۔،، جین والا ہنسا ۔

میں تو بور ہو گئی ہوں ۔ موٹر سائیکل والی نے گلیڈ آئی چمکائی ۔

''تم تو سراپا حرکت ہو تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے تم کیسے بور ہو سکتی ہو ۔ ،

''کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے''۔ دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا ۔

''ہاں ہلہ ان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا ۔،، وہ خیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی ۔ اب تو کاٹھ پر کاٹھ رہ گیا ہے ۔،،

''شٹ اپ ۔،، پیچ، جین والے نے آنکھیں دکھائیں ۔'' اپنے دقیانوسی رجعت پسندانہ خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو ۔،،

''ابے مسٹر چکن ۔،، اسٹوڈنٹ چلایا ۔'' ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو ۔ جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو ۔،،

''یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری ۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے ۔،،

''اینٹیکس میوزیم میں ۔،، جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا ۔

''بالکل ۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں''۔

''یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں ۔،،

''ہپوکرٹس ۔،، ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں ۔

''اگنور ہم ہٹاؤ ۔ کوئی اور بات کرو''۔ سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی ۔

''ہاؤ کین وی اگنور ہم ۔ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں ۔،،

''نانسنس ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا ۔ وی آر آل فار پروگریس موومنٹ ۔ جیکٹ والا چلا کر بولا ۔

''ہیر ہیر ۔،، تالیوں سے ہال گونجنے لگا ۔

''ہاہاہا ۔،، اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا ۔ اس کی آواز میں کھرچ تھی انداز والہانہ تھا ۔
تالیاں رک گئیں ۔ ہال میں خاموشی چھا گئی ۔ پھر سرگوشیاں ابھریں ۔

''کون ہے؟''

''کون ہنس رہا ہے۔''

''پتا نہیں اوپر سے آواز آرہی ہے۔''

''ہے میں تو ڈر گئی کتنی ہورس آواز ہے۔''

قہقہہ رک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک ٹھک۔

''کوئی چل رہا ہے اوپر۔''

''ہے میری تو جان نکلی جارہی ہے۔''

''پتا نہیں کون ہے۔ منی سکرٹ بولی۔

''ڈونٹ فیئر ڈارلنگ۔ آئی ام ہیر بائی یور سائیڈ۔''

''وہ دیکھو وہ۔ ٹوکرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

''اوپر۔ گیلری کے جنگلے پر۔ ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اٹھ گئیں۔

گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرا جھانک رہا تھا۔

''توبہ ہے۔ اف۔ ہائے، چلبلوں نے شور مچادیا۔

''کون ہے تو۔'' موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرایا۔

'' میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا جہاں آج تو کھڑا ہے۔''

''اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے۔'' ہی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

''کہاں سے بول رہا ہے۔'' پتلون والی نے پوچھا۔

میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو۔'' لنگی والا کہنے لگا۔

چلبلوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں۔ ''نو نو۔ نو نو۔ نیور مائی گاڈ۔ ہے اللہ۔''۔۔۔ وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔

ڈونٹ مائنڈ۔ ڈارلنگ۔'' جین والا بولا۔ ''یہ تو پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا۔''

''ڈیش اٹ ڈیش اٹ۔ وہ بے بلانگ ٹو دی پاسٹ۔''

''یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ جیکٹ والا حقارت سے بولا۔

''بڑے میاں سلام''۔ جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔ ''ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔ حضرت اب جدید قسم کا زمانہ ہے۔''

گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔ احمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔

''یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔،، مشہدی لنگی والے نے قہقہ لگایا۔'' کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا جو آج نیچے ہے کل اوپر جائے گا۔،،

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی۔ ان کباڑ خانے والوں کی باتیں۔ سنو یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو۔،،

''جدیدیت کے دیوانے آج تیری پتلوں کے پائنچے کھلے ہیں کل تنگ ہو جائیں گے پرسوں پھر کھل ہو جائیں گے یہی ہے تیری جدیدیت۔'' رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔

''ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو۔،، لنگی والا بولا۔ نیلی پتلون پر سرخ ٹکی ٹکی ہوئی ہے ہاہا۔ ہاہا ۔،،وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔۔۔۔۔،،

''احمق یہ ٹکی نہیں۔ پیچ۔ پیچ فیشن ہے۔ پیچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے تجھے کچھ بھی ہو۔،،

''پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑھی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔ مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ ''تم عجب تماشہ ہو۔،،

''رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔ ''جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔،،

''سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔،، ہپی نے سر اٹھا کر کہا۔

لو۔،، سی تھرو زیر لب گنگنائی۔ چھلنی بھی بولی۔

''ہاں۔،، ہپی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔،،

''کس بات کا کریڈٹ۔،،

''تعفن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کون سا۔،، بیڈنگ کاسٹیوم بولی۔

ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا۔ جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بت توڑنے کا کریڈٹ جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا۔،،

سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

''ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو۔ میڈم۔ ہپی ہنسا۔ ہم نے دور حاضرہ کے سب سے بڑے

بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کمفرٹس کی نفی کر دی ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔

یہ بے چارے کیا جانیں پٹن بولی ''ظاہریت کے متوالے۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں۔۔،،

''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر رہی ہے۔،، روی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

''بالکل درست۔،، لنگی والا چلایا۔ ''یہ ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جمعدار آ جاتے ہیں۔ یہ جمعداروں کا دور ہے۔

''سلی فول،، سی تھرو بلی۔ ''یہ تو رومانس کا دور ہے۔،،

''رومانس۔،، گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیو تا لپک کر [illegible] ''تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے۔۔۔۔تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو غنڈا بنا کر رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔۔،،

''بالڈ ڈلیش۔،،

''نانسنس۔،،

روی ٹوپی نے ایک لمبی آہ بھری۔ دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا تو گال دیکھ کر مرد میں حس پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔۔۔۔،،

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا عینک اتاری۔ ''ہم جنس کے متوالے نہیں ہم جنس کی لذت میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دور حاضرہ میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔،،

''حالات حاضرہ۔،، روی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔ تمہارے نزدیک حالات حاضرہ روٹی کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے۔ self کا۔ میں کا۔،،

''روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو۔،، پٹن چلائی۔ ''جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے جو میسر آتا ہے پہن لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔،،

''اونہوں انہیں کچھ نہ کہو یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا''۔ روی ٹوپی والا بولا۔

کل جب روٹی کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ

۔۔۔پیں بولی۔

''یہ تو حرکت کے حوالے ہیں منزل کے نہیں، نہیں صرف چلنے کا شوق ہے کہیں پہنچنے کا نہیں۔۔۔

مشہدی لنگی نے منہ بنایا

''تو نہیں۔ ہمارے رستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا۔ اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔۔۔

پکی عمر والی عورت نے ''سو وٹ۔ ہم پیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ بے شک لگاؤ۔ تم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے ہم میں اور ان گوریوں میں کیا فرق ہے۔۔ سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔۔۔

''صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے'' پین نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی عمر والی اپنے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی والی اپنا پلو سنبھال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر جھکائے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ کتابوں میں یہ تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔۔۔۔

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا ''خود کو زندگی کے حوالے گردانے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے بغیر چل نہیں سکتے۔ یہاں زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر زندگی حال ہے کسی صاحب حال سے پوچھو۔۔۔

''جو قیل و قال کے دیوانے ہیں انہیں حال کا کیا پتا۔ لنگی والا بولا۔ ''انہیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو حال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔۔۔

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری۔۔۔''میں کہاں آ پھنسی ہوں' میں کہاں آ پھنسی ہوں۔۔۔ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔ یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔۔۔

''عورت کا نہیں بی بی۔'' پتلون کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔ ''یہ تو لڑکی کا دور ہے۔ انہیں کیا پتا کہ عورت کسے کہتے ہیں بال سفید ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔۔۔

''خاموش۔۔۔ آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی۔ سنو سنو۔ یہ کیسی آواز ہے۔۔۔

''کون سی آواز۔۔۔

''کدھر ہے آواز۔۔۔

''چپ۔۔۔ ٹوکرا بالوں والی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

سب کان لگا کر سننے لگے۔

"ارے۔" موٹر سائیکل چلایا۔ "یہ تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔"

"یہ تو باہر سے آواز آ رہی ہے۔" منی سکرٹ نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

"ہائے اللہ۔" سی تھرو بولی۔ "آواز تو ایمرجنسی فون بوتھ سے آ رہی ہے۔ جو باہر پورٹیکو میں

ہے۔"

"خاموش۔" شکاری ڈانٹ کر بولا۔ سب اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو۔ "وہ آ رہا ہے۔"

"کون آ رہا ہے۔" سی تھرو نے زیرلب پوچھا۔

"چوکیدار۔"

"چوکیدار۔" پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

"سامنے ایک اونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی پہنے ہاتھ میں سونٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

"بالکل اجڈ نظر آتا ہے۔" پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

"خاکی۔ کروڈ۔" ان کوتھ۔ ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی۔

"میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔" سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا۔ ور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

"ضرور کوئی ایمرجنسی ہے۔" شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں روسی ٹوپی والا ہنسا۔ "ایمرجنسی ۔۔۔ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمرجنسی

ہے۔"

"ایک ابال ہے۔ بے مقصد ابال" لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

"اگنور ہم مائی ڈیر۔" موٹر سائیکل نے سائلنسر فٹ کر کے کہا۔

"میں کہتا ہوں ضرور یہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے ضرور کوئی آنے والا ہے۔" سٹوڈنٹ زیرلب

بولا۔

''چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔'' ی قمرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لنگی والے نے مسکرا کر پوچھا۔ ''بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے ہوتی تو تو سی قمرو نہ ہوتی۔۔۔

''کتنی ڈراونی شکل ہے چوکیدار کی۔ کتنی عجیب بات ہے اپنوں کی دیکھ کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔۔

''شٹ اپ۔۔ بلیک سوٹ نے کہا۔ ''ہیر ہیر۔۔ جنٹلمن چیرز۔۔''

ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا' ہمارے دور میں ان سو بلا یرڈ۔ ان ایجوکیٹڈ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

تمہارا دور۔'' مجنوں نما ہنسا۔ نقالوں کا دور۔ چربے دور۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے کاپی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو ان کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے لٹھوں سے نفرت کرو بھی نا۔''

''مغربی تہذیب مغرب میں خودکشی کر چکی ہے۔ چاند غروب ہو چکا ہے اس کی آخری شعاعیں یہاں سراب بن کر دمکتی ہیں۔ بپی مسکرایا۔ اور۔۔۔

''میں کہتی ہوں۔۔ بپن نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے زندگی ہے چربہ بنتا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا ہو جو ابھر رہی ہے کیوں ڈوبتے سورج کو پوج رہے ہو۔۔۔

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا۔ کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں ابھر رہی ہیں۔۔۔

مشہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو۔۔۔

''کیا یہ منی سکرٹ۔ یہ ی قمرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعویدار ہو کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقصد کی نشان دہی کرتا ہے۔۔ روی ٹوپی والا جوش میں بولا۔

''ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں ۔۔ سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا۔

مجنوں نما ہنسا۔ ''ذرا آئینہ دیکھو میاں کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں کیا ان کی قلمیں سارنگی نما ہوتی ہیں۔ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں کیا ان کی آنکھوں میں سرمے کی دھار ہوتی ہے کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو۔ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایمان سے۔''

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔

سب چپ ہو گئے رومی ٹوپی چلنے لگا۔

کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا۔

وہ دن کب آئے گا۔" دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔

"کون سا دن بی بی۔" کرتے پاجامے نے پوچھا۔

"جب مجھے ممتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہو۔ بچے کو انگلی لگائے ... جب اس آرکیڈ میں میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔"

"سچ کہتی ہو۔ بی بی آج کی مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرمندگی ... " رومی ٹوپی نے کہا۔

"وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں" کرتے پاجامے والا بولا۔ "بچوں سے ... ہیں۔ مجھے باجی کہہ کر بلاؤ۔"

"آج کی عورت عورت بن کر جینا چاہتی ہے ماں بن کر نہیں"۔ لنگی والا بولا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے"۔ بلیک سوٹ نے کہا۔

"نہیں تمہیں پتہ ہی نہیں ہے۔" رومی ٹوپی ہنس کر بولا۔ "وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں۔ جنہوں نے ممتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔"

پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے" جیکٹ والے نے عینک اتار کے صاف کی"۔ اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔"

"بالکل بالکل" بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"بچے کم خوشحال گھرانا۔" سوٹ سائیکل گنگنانے لگا۔

"سبحان اللہ۔" مشہدی لنگی بولا۔ سوشل ازم کے نام پر سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔"

"بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں، قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہو گی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے گا شاید ختم ہو جائے۔ رومی ٹوپی نے کہا۔

مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں"۔ مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

چٹلیاں ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ۔۔؟

''گاڈ نوز۔۔،،

''ہے۔ چلڈرن آر اے نوے سنس۔،،

''سیانوں نے کہا تھا''۔ کرتا پاجامہ کہنے لگا کہ۔۔۔

''ہمارے لکتے لوگ۔ کرتا پاجامہ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''تم اپنے لکتوں کی کیا بات کر رہے ہو۔،، لنگی والے نے اسے ٹوکا۔'' نہیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان کے لکتے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔،،

وہ دن دور نہیں۔'' اچکن والے نے کہا۔'' جب انہیں اپنے لکتوں کو اپنانا پڑے گا۔

''بھول جاؤ وہ دن۔،، جیکٹ والا جلال میں بولا۔'' وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔''

''ہم ترقی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔،،

موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں کی طرف دیکھا۔'' کیوں ڈارلنگ۔،،

''فارگٹ دیٹ ڈے۔ اٹ ول نیور کم۔،، لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا سر پر کلاہ تھا۔'' کون نہیں مانتا اس دن کو کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ دنیا کا نظام بدل رہا ہے۔،،

''اچھا بدل رہا ہے۔'' شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے ہنسنے لگے۔

''دنیا کے سارے مذہب سارے نجومی آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔ چغے والا چلایا۔

''عیسائی مسلمان یہودی ہندو سب ہی مانتے ہیں۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔،، روی ٹوپی نے کہا۔

''وہ گولڈن ایج۔،، چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔'' جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن اور اطمینان کا دور دورہ ہو گا۔،،

موٹر سائیکل نے طنز بھرا قہقہہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا۔'' ضعیف الاعتقادی نہیں خوش فہمی ہے یہ۔''

''اچھا۔'' ماں بولی'' یہ کیسا گولڈن ایج ہو گا وہ۔،،

''نشاۃ ثانیہ۔،، چیخنے والا چلا کر بولا۔

''نشاۃ ثانیہ۔،، ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔

'دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اثر ہو رہا ہے ایسا اثر جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔ پتے ہو رہا۔

''اس کے اثرات ۱۹۸۰ء تک یا اس کے لگ بھگ ظہور میں آ گئے۔،

ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی۔'' ج۔۔۔

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا۔

سی تھرو کا رنگ اڑ گیا۔

سارے پتلے سہم سے گئے۔

''خاموش' لٹکے بالوں والی چلائی۔ وہ دیکھو وہ۔،، اس نے انگلی سے ۔۔ کی طرف اشارہ کیا۔

سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا ہوا۔،، دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی چتون والی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟،،

''پتا نہیں۔۔،،

''کون ہے،؟،،

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائیکلسرفٹ کر کے کہا۔ وہ آ رہے ہیں۔'' خاموش،، اس نے دور کھڑے پتلوں کو خبردار کیا''۔ وہ آ رہے ہیں۔ ادھر آ رہے ہیں۔۔،،

''ہاں ہاں۔۔،، لٹکے بالوں والی بولی۔'' انتظامیہ کے لوگ آ رہے ہیں ،،

''بالکل۔،، ساڑھی والی نے کہا۔'' وہ ضرور اندر آئیں گے۔۔،،

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔'' سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ یقیناً کوئی ایمرجنسی ہے۔،، موٹر سائیکل والا بولا۔ ورنہ اسوقت ناظم کا یہاں آنا۔۔۔،،

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ پرانے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال میں سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا اس کے پیچھے نائب تھا نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔'' دیکھو، اس وقت تین بجے

ہیں'' ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ '' ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لئے آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہئے۔ سمجھے۔''

ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یس سر۔'' نائب نے جواب دیا۔ ''اٹ شیل بی ڈن۔''

''ہوں۔'' ناظم نے کہا۔ '' ہمارے پرائم منسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہوگا۔ اور پاکستانی زندگی دستکاری اور فن کا مظہر ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے،''

''آپ فکر نہ کریں۔ سر۔'' نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ ''دیکھو بھئی تنے وقت میں۔ اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ روغن کر کے گزارا کرنا ہوگا۔''

''جی صاحب۔'' کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے پیچھے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑھی والی نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سی تھرو چھینٹ کا گھگھرا پہنے سر پر پانی کی گاگر رکھے کھڑی تھیں۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔

آشیانہ

م۔م۔راجندر

جس وقت جرنیل سنگھ کو پتہ لگا کہ وہ جیل سے رہا ہونے والا ہے تو وہ کچھ بھونچکا سا رہ گیا۔ جیل سے باہر کی دنیا اس کے تصور میں بھی نہیں تھی اور رہائی کے اس اچانک خیال نے ایکا ایکی اس کی نظروں کے سامنے ایک وسیع بیابان سی دنیا پھینک دی۔ اس کے سامنے اس کا اپنا گاؤں جنڈیالہ تیر گیا جہاں آج سے پندرہ برس پہلے اس نے کھیتوں میں پانی دینے کے معمولی جھگڑے پر اشتعال میں آ کر اپنے چچا کو گنڈاسے سے ہلاک کر دیا تھا۔ کوئی سال بھر مقدمہ چلا تھا اور اگرچہ سیشن جج نے اسے موت کی سزا دی تھی مگر ہائی کورٹ نے اپیل پر یہ سزا چودہ سال کی قید میں تبدیل کر دی تھی۔ جب سے آج تک جرنیل سنگھ اسی سنٹرل جیل میں تھا جو اس کے گاؤں سے چند ہی میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ جیل سے سال بھر پہلے رہا ہو رہا تھا جو اس نے جیل میں اپنے اچھے رویے سے کمایا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ لگا کہ اگر وہ چند سال پہلے جیل وارڈن کے مکا نہ مارتا تو وہ پچھلے سال ہی رہا ہو جاتا۔

جب وہ اس جیل میں آیا تھا تو یہ اتنی بڑی نہیں تھی مگر ان تیرہ برسوں میں جرنیل سنگھ نے اسے کسی نئی آبادی کی طرح بڑھتے دیکھا تھا۔ آج اس جیل میں ڈھائی ہزار قیدی تھے اور ایک اچھی خاصی بستی آباد تھی۔ شروع شروع میں تو اس جیل کی زندگی بڑی سخت اور صبر آزما تھی۔ مگر اب تو اتنی اصلاحیں ہو چکی تھیں کہ جیل میں کئی ایسی سہولتیں تھیں جو جرنیل سنگھ کے گاؤں میں بھی نہیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں زندگی بڑی بامشقت تھی مگر پھر محنت کون نہیں کرتا اور جرنیل سنگھ تو جاٹ تھا جس نے ہمیشہ اپنے ہاتھ سے سخت سے سخت محنت کا کام کیا تھا۔

اسے جیل وارڈن اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے سوا جیل کے ہر آدمی سے پیار ہو گیا تھا۔ اس کا پیار جیل کی مٹی میں، اس کی اینٹ اینٹ میں سمویا ہوا تھا۔ اس کی اپنی کوٹھری اسے بڑی عزیز تھی۔ دراصل یہ ساری جیل اسے اپنا گاؤں معلوم ہوتی تھی۔ جیل کے قیدی ساتھی رسو، بیٹے، مالی، بھنگی، سب جرنیل سنگھ کو پہچانتے اور

اسے پسند کرتے۔ اگرچہ اس جیل میں قتل اور ڈاکے کے کئی مجرم اور بھی تھے مگر جرنیل سنگھ جیل کے اس گاؤں کا سب سے پرانا رہنے والا تھا۔ اس کے اس امتیاز نے اسے جیل میں ایک خاص مقام دے رکھا تھا۔ اس نے شروع میں تو پتھر توڑنے اور چکی پیسنے کا کام بھی کیا تھا مگر اب تو کئی سالوں سے دریاں بنا کرتا تھا اور وہ ایک اچھا کاریگر بن گیا تھا۔

یہ خبر کہ جرنیل سنگھ سوموار کو رہا ہو جائے گا جیل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ کم سے کم جرنیل سنگھ تو نہیں۔ جیل کے کئی اور آدمیوں کی مانند وہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے کبھی رہا ہونا ہے۔ دراصل اب تو کئی سالوں سے اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس جیل میں قید ہے۔ یہاں زندگی ایک ڈھب میں ڈھلی ہوئی تھی اور اس کے معمول میں ایک سرگرمی تھی جس کی گردش میں باہر کی دنیا کا تصور کسے تھا۔ اتنے عرصے کی قید کو قید بھلا کون کہے گا۔ اپنی محدود چار دیواری کے باوجود جیل اس کے لیے ایک کھلی دنیا تھی جہاں وہ تیرہ برس جیا تھا!

جرنیل سنگھ جدھر جاتا ادھر ہی اس کی رہائی کے متعلق باتیں ہونے لگتیں۔ جیل میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو یہ دکھ تھا کہ اب جیل کے احاطے میں جرنیل سنگھ نظر نہیں آئے گا اور اس کی جانی پہچانی شکل ایک دھندلکے میں ڈوب جائے گی۔ مگر چونکہ جرنیل سنگھ قید سے رہا ہو رہا تھا' سب رسمی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ دینا لانگری بولا:

''جرنیلے تیرے سے بھی جیل میں رونق تھی۔ کبھی کبھی چٹھیاں لکھیو''

جرنیل سنگھ کی داڑھی اور مونچھیں ایسے پھڑپھڑائیں جیسے وہ کوئی کبوتر تھیں جسے دینا لانگری نے رسوئی کی چھت پر سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ایک بے جان سی ہنسی ہنس پڑا۔ دینا پھر بولا

''اپنی کھیتی سنبھال اور موج کر۔ تیرا لڑکا بھی اب سیانا ہو گیا ہوگا۔''

لڑکے کا ذکر سن کر جرنیل سنگھ چونک پڑا۔ جب وہ قید ہوا تھا اس کا لڑکا صرف چار سال کا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ اپنی بیوی نیتو اور اپنے لڑکے سے صرف دو دفعہ جیل کے پھاٹک پر ملا تھا۔ مدت سے اس نے ان کے بارے میں نہیں سنا تھا اور اگرچہ وہ دونوں اس کے اپنے تھے مگر اتنے لمبے عرصے کی جدائی نے اس کے پیار کو غیر متعلق سا' دھندلا سا کر دیا تھا اور ان کے ذکر نے اسے ایک لمحے کے لیے چونکایا تو مگر اس کے دل میں کوئی تڑپ اور درد پیدا نہیں کیا۔

''کدھر جائے گا بول بھی جرنیلے'' دینا نے پھر پوچھا۔

''دینا جنڈیالے جانا ہے اور کہاں جاؤں گا۔ کھیتی ویتی اب کیا ہوگی۔ کرنیل سنگھ نے کچھ سنبھالا ہو تو پتہ نہیں۔''

سوموار کی صبح کو جرنیل سنگھ معمول سے پہلے ہی اٹھ گیا۔ وہ اتوار کو سب سے مل چکا تھا مگر اس کے باوجود وہ جیل کے کونے کونے میں گھوما اور اس نے اپنے بہت سے ساتھیوں سے وداع لی۔ لوٹ کر وہ اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا اور اس اثنا میں اس کی رہائی کے کاغذات بنتے رہے۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ ایک معصوم بت کی مانند بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے اس نے روٹی کھائی اور ... نے اسے زبردستی اپنی طرف سے زیادہ کھلائیں۔ بارہ بجے ڈاکٹری معائنہ ہوا اور اسے جیل سے باہر پہننے کے لیے دھلے ہوئے کپڑے ملے۔ وارڈن اور سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوتا ہوا وہ کوٹھی میں بیٹھا رہا اور قاعدے کے مطابق شام کی روٹی کے پیسے اور جنڈیالہ تک پہنچنے کا کرایہ دیا گیا۔ جب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جیل کے آہنی پھاٹک سے باہر نکلا تو پہرے پر کھڑے ہوئے سپاہی نے بھی ... سلام کیا۔

جرنیل سنگھ ایک ایسے مجبور بوڑھے کی مانند باہر کھڑا رہا جسے اس کی مرضی کے بغیر کوئی بچپن عطا کر رہا ہو۔ سہ پہر کی چلچلاتی دھوپ تھی اور اس کے سامنے اسی کی طرح سڑک کا ... بے حس پڑا تھا۔ اس نے تھکی ہوئی اور مشکوک نظروں سے سڑک کی دوری میں جھانکا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ وہ چند قدم جا کر رکا اور مڑ کر جیل کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے اپنی کوئی چیز بھول آیا ہو۔ وہ پھر چلنے لگا اور جب سڑک کے اس موڑ پر پہنچا جہاں سے مڑنے پر جیل کو نظروں سے اوجھل ہو جانا تھا تو وہ پھر رک گیا اور چند منٹ تک جیل کی طرف منہ کر کے جھانکتا رہا۔ پھر اس نے جیل کی طرف ہاتھ جوڑ دیئے جیسے رخصت مانگ رہا ہو۔

موٹر کے اڈے پر پہنچا تو اس کی آنکھیں ایسے ہو رہی تھیں جیسے وہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا۔ اس نے کرایے کے پیسے نکالے مگر کچھ سوچنے لگا۔ یہاں سے اس کا گاؤں سات میل تھا۔ قید ہونے سے پہلے وہ ہمیشہ گاؤں سے یہاں پیدل آتا تھا اور پیدل لوٹتا تھا۔ وہ راستہ اب بھی جوں کا توں موجود تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کل کی ہی بات تھی اور وہ آج بھی اسی طرح شہر سے گاؤں لوٹ رہا تھا۔ اسے کچھ خیال آیا اور اڈے سے بازار کی طرف مڑ گیا۔ شہر میں بہت تبدیلی آ چکی تھی اور وہ چاروں طرف حیرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کتنا چھوٹا شہر تھا اور اب کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کرائے کے پیسوں سے ایک دکان سے ایک مضبوط سی لاٹھی خریدی جس کے بغیر اس نے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ اس نے لاٹھی کو زمین پر رکھ کر ہاتھ سے دبا کر دیکھا اور پھر کندھے پر رکھ کر موٹر کے اڈے پر لوٹ آیا۔ اسے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وہی پرانا جرنیل سنگھ ہے اور زمین' آسمان' سڑک' درخت کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ اس کے پاؤں میں وہی گرد لپٹی ہے' جنڈیالہ وہ سامنے ہے' اور وہ تیزی سے چلنے لگا!

راہ میں اسے شہر آتے ہوئے کئی گاؤں والے نظر آئے مگر نہ وہ کسی کو پہچانتا تھا اور نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ادھر دیہات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اتنی مدت کے بعد جا رہا تھا کہ اسے شک سا ہوا کہ اس کا گاؤں ہے بھی یا اجڑ گیا۔ کم از کم وہ جنڈیالہ کی موجودگی کو محسوس

کرنے کی تحریک پانا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے ایسے ہی ایک راہگیر سے جنڈیالے کا راستہ پوچھا اور اس نے انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ رہا اس طرف" تو اس کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ اس نے لاٹھی کو زمین پر مارا اور آگے بڑھ گیا۔

جس وقت جرنیل سنگھ اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر مڑا، سورج افق کی سانولی فضا میں کانپ رہا تھا اور اس کا زرد سونا گاؤں کی منڈیروں کو چھو رہا تھا۔ کئی کسان اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے جا رہے تھے اور جرنیل سنگھ دو تین کے بارے میں تو یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کون ہیں۔ مگر جرنیل سنگھ کو کسی نے بھی نہیں پہچانا۔ جس وقت وہ گاؤں کے پہلے چند گھروں کو پار کر رہا تھا تو اسے ایک بانکا نوجوان نظر آیا جس کی شکل اس سے ملتی سی تھی مگر وہ نوجوان جرنیل سنگھ کو پاس سے دیکھ کر گزر گیا اور جرنیل سنگھ بھی جان گیا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ بوڑھا چودھری منگوا اپنے مکان کے باہر حقہ پی رہا تھا۔ جرنیل سنگھ نے چودھری کو بندگی دی تو چودھری کچھ دیر آنکھیں جھپکانے کے بعد سمجھ گیا کہ جرنیل سنگھ ہے۔ وہ فوراً ایسے پیچھے ہٹا جیسے ڈر گیا ہو اور اس نے زور سے اپنے لڑکے کو آواز دی۔ ایک منٹ کے لیے ایسا بنا جیسے اس نے جرنیل سنگھ کو نہیں پہچانا۔ جرنیل سنگھ بولا۔ "چودھری میں ہوں جرنیلا۔"

"اوہو جرنیلے تو..."

"چودھری میں چھٹ گیا ہوں۔ میری جیل ختم ہو گئی۔"

وہ چودھری کے سامنے، زمین پر لاٹھی ٹیک کر بیٹھ گیا اور چودھری اور پیچھے کھسک گیا۔ آناً فاناً گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ جرنیل سنگھ چھٹ کر آ گیا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں چودھری کے گھر کے آگے میلہ سا لگ گیا۔ اس بھیڑ میں گاؤں کے وہ لوگ تو تھے ہی جو جرنیل سنگھ کو جانتے اور پہچانتے تھے مگر دوسرے لوگ اور بچے بھی تھے جن کے لیے کسی کا جیل سے چھٹ کر آنا ہی ایک عجیب بات تھی۔

اب جرنیل سنگھ سے کوئی بھی نہیں ڈر رہا تھا اور اس نے جیل کی کوئی باتیں سنائیں اور گاؤں والوں کا لایا ہوا پکی کھنڈ اور کنوئیں کے پانی کا شربت پیا۔ وہ بھیڑ میں کھوج کھوج کر دیکھ رہا تھا مگر کرنیل سنگھ اس بھیڑ میں نہیں تھا۔ اگرچہ خبر تو سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ اس نے چودھری کے گھر کی دیوار کی آڑ میں سے جھانکتے ہوئے گھونگھٹوں میں تلاش کیا مگر بنتو بھی نظر نہیں آئی۔ جب اس کی نظریں بھیڑ میں پگڑیوں پر تیر رہی تھیں تو چودھری بولا:

"کرنیل سنگھ دو برس ہوئے یہ کہہ کر چلا گیا کہ فوج میں بھرتی ہوں گا۔ پتہ نہیں کہاں سے کہاں نہیں۔ سب نے سمجھایا کہ تیری عمر تھوڑی ہے مگر مانا نہیں۔ اس کے کچھ دن بعد تیری بہو بھی اس گاؤں سے چلی گئی۔ اس کے گھر کا پتہ کروایا تھا مگر وہاں بھی نہیں پہنچی اور تیرا سورا کئی دفعہ یہاں آیا۔ تیرا گھر سارا لوٹ

پھوٹ گیا ہے۔ میں نے اپنے ڈنگر باندھ دیئے تجھے کل کھلواؤں گا۔''

جرنیل سنگھ جھکا ہوا سنتا رہا اور وہ ایسا بے حس و حرکت تھا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چودھری کی بات ختم کرتے ہی وہ فوراً جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور بھیڑ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ جرنیل سنگھ کو جاتا دیکھ کر چودھری بولا۔ "روٹی لا رہا ہے کاکا کھا کے جائیو۔ اپنا گھر بار دیکھو اور کھیتی سنبھال لے۔ تیرا ایک بندہ تو مر گیا تھا۔ دوسرا انبیا لے گیا تھا۔ اگر اس نے بیچا نہیں ہے تو جو کچھ اس کا دینا ہے دے کر چھڑا لے۔"

جرنیل سنگھ رک گیا اور اس نے روٹی کھائی۔ بھیڑ [illegible] پر جمتی رہی [illegible] اندھیرا ونچک آیا اور کالی رات ہونے کی وجہ سے سب اس اندھیرے میں سائے سے [illegible] جرنیل سنگھ اٹھا اور خود بخود ہٹی ہوئی بھیڑ کو چیر کر نکل گیا۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں پھرتا رہا [illegible] ایک چھوڑ رہے' کچھ ساتھ چلتے رہے۔ وہ اپنے گھر سے گزرا تو اس نے زور سے [illegible] رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔

وہ گاؤں کی ایک ایک گلی میں بے مقصد گھوما۔ پھر وہ باہر کھیتوں کی طرف ہو لیا اور وہاں سے نہر پر۔ آج کی کالی رات میں نہر کا سفید پانی ہی اردگرد کا چاندنا تھا۔ اس نے اپنی پگڑی کھولی' بالوں کو ٹھیک کیا' اور نہر کے کنارے پگڑی بچھا کر لیٹ گیا۔ وہ بہت دیر تک لیٹا رہا اور پانی اپنے بہاؤ پر چلتا رہا۔ اس وقت میں وہ سویا بھی اور جاگا بھی۔ پھر اس نے اپنی پگڑی سمیٹی اور اٹھا کر بغیر باندھے اپنے سر اور ٹھوڑی کے گرد لپیٹ لی۔ وہ کھیتوں سے باہر آ کر جس پگڈنڈی سے آیا تھا اس پگڈنڈی پر ہو لیا۔

سڑک پر پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر جھانکا اور اپنے گاؤں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ تاریکی اور فاصلے کے باوجود کے ذہن کی آنکھیں گاؤں کی گلیوں میں اپنے اجڑے ہوئے آشیانے کو صاف دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے منہ موڑ لیا۔ سڑک گہرے اندھیرے کی گود میں سوئی پڑی تھی اور دائیں بائیں دوری میں کھمبوں پر بجلی کے مدھم سے بلب ٹمٹما رہے تھے۔ وہ جس راستے سے آیا تھا اسی پر ہو لیا۔ اس کے قدموں میں ایک تیزی تھی اور وہ کبھی کبھی اپنی لاٹھی یونہی سڑک پر مار دیتا تھا۔ اس نے کتنی ہی کنارے لگی ہوئی بیل گاڑیوں اور اونگھتے ہوئے بیلوں کو پار کیا۔ کھیتوں میں گیدڑوں کی آوازوں سے بیگانہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ کشن گڑھ کے موڑ اڈے پر پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی پگڑی ٹھوڑی پر سے اتاری' بالوں کو ٹھیک کر کے اسے سر پر باندھا اور ایک کاٹھ کے کھلونے کی مانند جو چابی سے حرکت کرتا ہے وہ جیل کی سڑک پر ہو لیا۔

اس کا تنفس تیز ہو گیا۔ وہ جیل کے پھاٹک سے کوئی پندرہ بیس گز اِدھر ہی سڑک سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جیل کی طرف گھورنے لگا۔ بند پھاٹک کے باہر ایک لٹکتے ہوئے تیز روشنی کے بلب کے نیچے ایک

سپاہی رائفل کندھے پر رکھے لفٹ رائٹ کر رہا تھا۔ جرنیل سنگھ نے اسے غور سے دیکھا مگر اس کا جانا پہچانا سپاہی نہیں تھا شاید کوئی نیا سپاہی لائن سے آیا ہو۔

دو چار منٹ تک جرنیل سنگھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور آہستہ سے رینگ کر جیل کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ایک منٹ سانس روکے کھڑا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ پھاٹک کے اتنا قریب کھسک آیا جتنا وہ بغیر نظر آئے آ سکتا تھا۔ وہ بالکل دیوار سے چپک گیا۔ پہرے والا سپاہی اب اپنی لفٹ رائٹ کو روک کر اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ جرنیل سنگھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا اور اس نے لاٹھی کا ایک بھرپور ہاتھ سپاہی کی پیٹھ پر مارا۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور سپاہی لڑکھڑایا۔ اندر کی گارڈ نے حرکت کی، ایک شور سا مچا، خبردار کی آوازیں آئیں، جیل کی خطرے کی گھنٹی بجی مگر جرنیل سنگھ نہیں بھاگا۔ اس نے اپنی پگڑی منہ پر لپیٹ لی اور لاٹھی کو سنبھالے کھڑا رہا۔ اتنے میں باہر کے دوسرے نقطوں کے پہرے دار بھی آ گئے، پھاٹک کھلا اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے بڑے شور و غل کے درمیان جرنیل سنگھ کو گرفتار کر لیا!

ببول سے لپٹی بیل

منشا یاد

''بس روانہ ہوئی تو میں نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

پکی سڑک بن جانے کی وجہ سے راستہ بدلا ہوا ضرور نظر آتا تھا مگر سڑک سے ہٹ کر وہی میرے دیکھے بھالے کھیت اور درخت تھے البتہ بعض چھوٹے درخت بڑھ کر تناور پیڑ بن گئے تھے اور بعض تناور پیڑ بوڑھے اور ٹنڈ منڈ ہو گئے تھے۔ میرے ذہن میں یادوں کی فلم سی چلنے لگی۔

یہ بیریوں کا جھنڈ ہے جہاں ہم سالانہ امتحانوں کے بعد بیر کھانے آیا کرتے تھے۔ یہ سیم نالہ ہے جہاں ہم مچھلیاں پکڑتے تھے یہ نہر کا پل ہے جہاں حسینو جلاہے سے میری لڑائی ہوئی تھی اور اس نے تختی مار کر مجھے زخمی کر دیا تھا۔ یہ سائیں نظام دین کا مزار ہے یہاں میں نے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان کے لئے منت مانی تھی۔ بچپن کے ساتھی۔ ان کی باتیں۔ شرارتیں، باہمی لڑائیاں اور محبتیں ماں باپ کی شفقتیں، ماسٹر شاہنواز کی جھڑکیاں' خرگوشوں کا شکار۔ کبڈی کے اکھاڑے اور تاجی۔

اس کا زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور ویرانوں میں گزرتا تھا۔ ان کے اپنے کھیت تھے نہ کوئی کمانے والا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چنتی رہتیں۔ کبھی لالی کی جھاڑیاں کاٹنے نہر پار والے کلر میں چلی جاتیں۔ ان جھاڑیوں کی راکھ سے وہ کپڑے دھونے کے صابن کا کام لیتیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو کئی بار اس کی ماں کے منع کرنے کے باوجود میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ اس کی ماں عجیب و غریب قسم کی چیزیں جمع کرتی رہتی ساگ پات کی گٹھڑی سی باندھ لاتی۔ پوہلی کو جھاڑ کر اس کے بیج نکالتی جسے وہ بھٹی میں بھون کر مزے سے کھاتیں۔ کبھی گاؤں میں کوئی جانور ذبح کیا جاتا تو وہ اوجھری آنتیں اور پھیپھڑے اٹھا لاتیں۔ دونوں جنگلی شہتوتوں تالابوں میں اگی کمیوں اور آندھی سے گرے کچے کچے آموں کے لئے کئی کئی کوس کا سفر کرتیں۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران ایک بار میرا پاؤں کانٹا لگنے سے زخمی ہو گیا تھا تو وہ پریشان ہو گئی تھی اور اس نے کہا تھا:۔

''تو اس گرمی میں ہمارے ساتھ کیوں پھرتا ہے تیرا باپ تو زندہ ہے اور پٹواری ہے۔،، مجھے یاد آیا۔ ماں بیٹی دونوں بہت خوددار تھیں کسی کی مدد قبول نہیں کرتی تھیں کپاس چن کر اور اجرت پر سوت کات کات کر وقت گزارتی تھیں میں کئی بار گھر سے کھانے پینے کی کوئی چیز یا پھل فروٹ لے کر گیا اور انہوں نے واپس کر دیا۔ البتہ اس نے میرے میٹرک میں پاس ہونے کے موقعہ پر مٹھائی کا ڈبہ نہایت خوشی سے قبول کر لیا تھا ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''تمہاری کامیابی میں میری دعائیں بھی تو شامل ہیں۔،،

جن دنوں میں بی۔ اے میں تھا اور کبھی کبھار گاؤں آتا تھا تاجی مجھ سے میاں محمد کی سیف الملوک پڑھنے آجاتی تھی۔ ایک روز کہنے لگی۔

''ذرا اس شعر کی وہ تو کرو۔ کیا کہتے ہو تم؟،،

''تشریح۔،،

''ہاں وہی۔،،

''کون سا شعر ہے۔،،؟

''حسن کھیڈن نال لے گیوں پا گیوں ڈونگھے فکراں
پائی پیر پرانی واگوں ٹنگ گیوں وچ کِکراں

''اس میں کیا مشکل ہے؟،،

''مشکل تو نہیں مگر تم تشریح بہت اچھی کرتے ہو۔،،

''اچھا سنو۔'' میں نے خوش ہو کر کہا ،، یہ تو تمہیں پتا ہی ہے کہ بدیع الجمال پری بہت خوب صورت تھی تمہاری طرح۔،،

''ہاں،،۔ وہ شوخی سے بولی۔،، میری پھوپھی جو لگتی تھی۔،،

''جب اس کا محبوب شہزادہ اس سے بچھڑ جاتا ہے۔،،

''تمہاری طرح اس نے لقمہ دیا۔،،

''بیچ میں مت بولو۔ میں نے کسی معمر استاد کی طرح ڈانٹ کر کہا۔'' تو بدیع الجمال اسے یاد کر کے کہتی ہے کہ تمہاری فرقت میں میرا کھانا پینا ہنسنا بولنا چھوٹ گیا ہے تم مجھے گہرے غموں کے حوالے کر گئے ہو اب میری حالت اس دھجی کی سی ہے جسے جاتے وقت تم نشانی کے طور پر ببول کی کسی ٹہنی پر لٹکا گئے تھے۔،،

میں چونک پڑا وہ رو رہی تھی۔ میں نے سبب پوچھا تو گلوگیر آواز میں بولی۔'' مجھے پتا ہے تم بھی ایک دن مجھے اسی طرح کانٹوں میں الجھا چھوڑ جاؤ گے۔،،

مجھے یاد آرہا تھا میں شعر پڑھتا تھا وہ دہراتی جاتی مگر جس طرح ہر مصرع اس کی آنکھوں میں تحلیل

ہو کر ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اسے لفظوں کے ذریعے کسی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں اور اس کی پلکیں جھپکنے ابرو سکیڑنے اور آنکھیں میچنے کے سینکڑوں انداز تھے ۔ جب اس کی سیاہ روشن آنکھیں پوری طرح وا ہوتیں لگتا آدمی ڈوب کر اب کبھی نہ ابھر سکے گا پھر وہ کسی مصرعے پر آنکھوں کو تھوڑا سا بند کر لیتی تو شکنجے میں کسے جانے کا احساس ہوتا۔ ایک بار میرے عقب سے دھوپ کی ایک کرن آ کر اس کے چہرے پر پڑنے لگی۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لئے آنکھیں نیم وا کر کے میری طرف دیکھا اور میرا دم نکل گیا۔ مجھے یاد آیا ان دنوں وہ [illegible] دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ جس کو جو حکم دیتی فوراً تعمیل ہوتی پھر اس کے بہت سے امیدوار [illegible] مراد ان میں سے ایک تھا۔ اس کی ماں کے بگڑ جانے پر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ [illegible] ادی کے لڑکے کی خاطر وہ سارے بیاہ نہیں کرے گی تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا [illegible] آدمی سے ایسا اقدام کچھ بعید نہ تھا اس خیال سے کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچے وہ مجبور ہو گئی تھی [illegible] کے ساتھ رکی تو میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا روبی میگزین پڑھ رہی تھی [illegible] انہماک سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک تھی شاید اسے بھی اپنا بچپن اور بچھڑے ہوئے لوگ یاد آ رہے تھے۔ میں نے اس کے لئے دل میں ہمدردی کے گہرے جذبات محسوس کئے مگر دوسرے ہی لمحے تاجی نے پھر مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

پچھلے دنوں ہمارے وطن لوٹنے پر گاؤں سے میری پھوپھی زاد آپا ہمیں ملنے آئی تھیں اور انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ تاجی کے بارے میں بھی بہت سی معلومات فراہم کی تھیں اور جہاں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ اب بھی مجھے یاد کرتی اور میرے بارے میں پوچھتی رہتی تھی وہاں مجھے یہ سن کر دکھ ہوا تھا کہ شادی کے چند سال بعد ہی وہ بھی اپنی ماں کی طرح بیوہ ہو گئی تھی ۔۔۔ اور اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر اپنی ماں کے پاس آ گئی تھی۔ آپا نے یہ بھی بتایا تھا کہ شوہر کی بے وقت موت سے اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا مگر محنت مزدوری اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس لیے ہمت نہیں ہاری نہ کسی کے آگے دست سوال دراز کیا مگر عسرت کی زندگی دن رات کی محنت و مشقت اور غم کی کڑی دھوپ نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

مجھے یاد آیا ۔۔۔ میں اس کی یاد کو دل کی ٹیپ سے کبھی اریز نہیں کر سکا تھا۔ مجھے اکثر اداسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ فوزیہ منہ سے تو کچھ نہ کہتی تھی مگر جب کبھی میں ڈیپریشن کا شکار ہو جاتا وہ زیادہ توجہ دینے لگتی۔ مگر پیندے میں سوراخ ہو تو آپ گھڑے کو کتنا ہی بھر بھر کر رکھیں ضرورت کے وقت خالی ہی ملتا ہے۔ بظاہر مجھے کسی چیز کی کمی نہ تھی فوزیہ حسین اور تعلیم یافتہ تھی اور مجھ سے بہت محبت کرتی تھی چاند سی بچی، معقول آمدنی اور خوب صورت گھر۔ مگر مجھے ہمیشہ کسی نجانے چیز کی کمی کا احساس رہتا تھا لگتا جیسے میرا دل

خوشی کے سچے ذائقے سے خالی ہو۔۔۔ عام حالات میں اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا مگر جب کبھی علالت کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی تو دکھوں کے سنپولئے اندر کے بلوں سے جھانکنے لگتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار مجھے سردی لگ کر بخار آ گیا تھا۔ معمولی سا بخار تھا۔ ڈاکٹر دوائی اور تسلی دے کر چلا گیا۔ مگر نصف شب کے قریب بخار تیز ہو گیا فوزیہ تھوڑی دیر بعد آ کر میری مزاج پرسی کرتی اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے دوا پلاتی رہی۔ پھر مجھے غنودگی آ گئی اور میں عجیب و غریب خواب دیکھنے لگ گیا۔

ایک بہت ہی باریک سا نقطہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جاتا اتنا بڑا کہ ہر طرف پھیل جاتا اور میں اس کے بوجھ تلے کراہنے لگتا۔ پھر وہ سکڑنا شروع کر دیتا اور سکڑتے سکڑتے اس قدر چھوٹا ہو جاتا کہ میرا دم گھٹنے لگتا۔ پھر مجھے عجیب و غریب شکلیں دکھائی دینے لگتیں۔ سینگوں والا گھوڑا۔ دم کٹی چھپکلیاں۔ دو منہ والے سانپ۔ گردن کٹے مرغ، موٹر سائیکل چلاتا آدمی اور الاؤ کے گرد بڑے بڑے پر پھیلا کر آگ تاپتی چمگادڑیں۔ پھر ایک بڑی سی کشتی میرے پیچھے لگ گئی میں جتنا تیز بھاگتا وہ میرے پیچھے لپکتی آتی پھر وہ فوزیہ کا روپ دھار کر ہنسنے لگی۔

اس رات میں نے ماں کو کفن پہنے اپنے سے بغل گیر ہوتے دیکھا۔ پھر مٹی میں لت پت ذکیہ دکھائی دی۔

''ذکیہ تم؟،،

''ہاں بھیا میں مری نہیں تھی ان لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے دفن کر دیا تھا۔،،

''اوہ ... میری پیاری ذکیہ۔ میری جان۔ تمہیں تو بہت تکلیف ہوئی ہو گی قبر میں۔،،

''بھیا تاجی کہاں ہے۔،،

''تاجی۔۔۔؟،،

''کیا آپ تاجی کو بھول گئے بھیا۔،،

پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ فوزیہ میرے سرہانے بیٹھی تھی اور خاصی متفکر تھی بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ مجھے ۱۰۶ درجے بخار تھا۔ اور اس نے ایمبولنس کے لئے ٹیلی فون کر دیا تھا۔

ٹھیک ہو جانے کے بعد میں نے اپنے ایک ہم وطن اور دوست ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے مجھے دوائی کے علاوہ مشورہ دیا کہ میں وطن واپس جاؤں اور کچھ عرصہ وہاں رہ کر پرانے واقف کاروں رشتہ داروں اور دوستوں سے ملوں اور ان جگہوں کو دیکھوں جن کو عرصہ تک نہ دیکھنے کی وجہ سے میرا دل خوشی سے خالی ہو گیا تھا۔ میرا اپنا دل بھی وطن جانے کو چاہ رہا تھا۔ چنانچہ ہم ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ گئے۔ مگر ہمارا بہت سا وقت شہر میں چھوٹے بھائی کے ہاں گزر گیا دوسرے بہت سے رشتہ دار اور ملنے والے بھی وہیں

تھے۔

بس رکی تو میں چونک پڑا۔ سامنے میرا گاؤں تھا۔

میں نے آپا کو خط لکھ کر آنے کی اطلاع دے دی تھی اس کا میاں اور بچے گاؤں کے بس سٹاپ پر ہمارے منتظر تھے گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی استقبال کے لئے موجود تھے۔

ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے کھوئی ہوئی کوئی چیز مل گئی ہو گلیوں میں آتے جاتے مردوں سے علیک سلیک کرتا اور دروازوں پر کھڑی ماسیوں، پھوپھیوں اور چچیوں کو سلام کرتا اور ان کی دعائیں لیتا میں آپا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا تاجی بھی اپنے گھر کے دروازے پر ضرور نظر آئے گی۔ پتا نہیں وہ کیسی ہو گی۔ اتنے طویل عرصے کے بعد مجھے دیکھ کر اس کے جذبات کیا ہوں گے اور وہ کس طرح پیش آئے گی۔ میرا دل اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ لیکن اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ شاید اسے میرے آنے کی خبر نہیں تھی یا اس کی ماں نے منع کر دیا تھا۔ میرا دل بجھ سا گیا۔

آپا کے گھر کا دالان اور منڈیریں گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں سے بھر گئیں وہ فوزیہ کے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں میں بہت دلچسپی لے رہی تھیں۔ آپا بہت مصروف ہو گئی تھیں۔ جتنے لوگ جاتے تھے اتنے اور آ جاتے تھے۔ رات گئے تک ملنے ملانے والے لوگوں بچپن کے دوستوں اور ہم جماعتوں کا تانتا بندھا رہا۔ مگر مجھے جس کا خاص طور پر انتظار تھا اس کا کچھ پتا نہ تھا۔

تاجی اگلے روز بھی نہیں آئی۔ اس دوران میں، میں تائیوں کے گھر تعزیت کے بہانے آتے جاتے اس کے گھر کے سامنے سے بھی گزرا مگر دروازہ بند تھا۔ جی چاہا دستک دوں مگر یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کے بچے جوان ہوں گے پتا نہیں ان کا رد عمل کیسا ہو اور وہ کیا سوچیں۔

اگلے روز ہمیں واپس آنا تھا۔ تاجی اب تک نہیں آئی تھی شاید وہ مجھ سے ناراض تھی یا وہ فوزیہ سے ملنا نہیں چاہتی تھی؟ مگر کیوں؟ آپا نے تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجھے یاد کرتی اور میرے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ کیا پتا اس کی ماں نے منع کر دیا ہو یا اب تک مجھ سے خفا ہو گی۔

جب ہم رخصت ہو رہے تھے اچانک خلاف توقع تاجی کی ماں آ گئی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی تاجی کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی راہ ہموار ہوتی نظر آئی میں نے اٹھ کر سلام کیا۔

''سلام خالہ۔،، جواب میں اس نے اس نے مجھے سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے دیکھا اور ٹھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ مجھے عمر بھر کے لئے پشیماں چھوڑ کر۔۔۔۔

پاگل کون

منظور الٰہی

وہ حسب معمول کرسی عدل پہ متمکن تھا۔ مقدمے پیش ہو رہے تھے، فاضل وکلا، بحث کرتے، مدلل تقریریں کرتے، سزا بحال رہتی یا ملزم بری ہو جاتے۔ وہ ایک مشین کی طرح کام کئے جا رہا تھا، ایک نظر ملک کے قانون پہ تھی دوسری انصاف کے عمومی اصولوں پر۔ فہرست مقدمات چھنتی جا رہی تھی کہ پولیس کے دو سپاہی ایک ننگ دھڑنگے کو ہتھکڑی باندھے اندر لے آئے۔ اسکے جسم پہ برائے نام لنگوٹی تھی۔ "پاگل ہے حضور، خلق خدا کو تنگ کرتا ہے، بچوں کو پتھر مارتا ہے"۔۔۔ "میں پاگل نہیں ہوں۔ میں نے اسلام کی راہ میں پکے مکان اور مال مویشی چھوڑ دیے اور ہجرت اختیار کی لیکن میرے بھائی اپنی املاک نہ چھوڑ سکے، میں مشرقی پنجاب میں انہیں ملنے گیا تھا لیکن مجھ سے ان کی زبوں حالی نہ دیکھی گئی۔ میرے دل پہ اثر ہو گیا تھا اور میں نے واپس آ کر اپنا مال و متاع لٹ دیا، لیکن اب میں اچھا ہوں، مقامی اسلامیہ سکول میں بدستور چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا ہوں، مسلمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے بھٹک گئے ہیں مجھے اس کا بڑا دکھ ہے"۔۔۔ اس کے لفظوں میں ربط اور تقریر میں تسلسل تھا، وہ سوالوں کا صحیح جواب دیتا تھا، وہ پاگل نہیں تھا۔ اس کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔

ایک ماہ بعد اسے پھر پابجولاں لایا گیا، اس کا جنون خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا، اب اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور زبان جواب دینے سے عاری، اسے تن من کا ہوش نہ تھا بیوی کی گریہ و زاری کے باوجود اسے علاج کے لئے پاگل خانے بھیجنے کا حکم ہوا، بیوی بچوں کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ "جب تک ممدو پاگل خانے میں ہے اس کے گھر آٹا برابر پہنچتے رہنا"۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں اردلی سے کہا تھا۔

جیپ کی مسلسل گڑگڑاہٹ کے سوا سڑک کے دونوں طرف اتھاہ اشانت کا احساس تھا۔

تاحدِ نظر گندم کی مغرور فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں اب ہم پختہ ہوا ہی چاہتی ہیں، گزشتہ بارش ہمارے حق میں امرت تھی، ہمارے خوشے بھر چکے، ہم اپنے سنہرے [illegible] سے اگلی کر دہقان کا دل نہال کر دیں گی، چھ ماہ ادھر مایوسی کا دور دورہ تھا، ساون کا تندوتیز کسان کی ساری کائنات سیلاب کی نذر ہو گئی تھی، پانی بھر جانے سے زمین اس حد تک [illegible] ہو چکی تھی کہ "وتر" آنا محال معلوم ہوتا تھا، فصل نہ ہوئی تو جئیں گے کیسے؟ ۔ تھا سوالیہ نشان ہر کسان کے چہرے پر ۔۔۔ لیکن یہ بل کھاتی ہوئی مغرور سڑک، دو بجے صبح کی تاروں میں نہائی ہوئی چاندنی ایسی اداس روشنی میں لپٹی ہوئی سڑک اور دونوں کناروں پر کھڑے درخت جیسے کسی طلسم میں اسیر ہوں، دم بخود ہوں اور گھنیری پُرافسوں زلفوں کے سائے میں [illegible] ۔

باہر گلرکہار کی ایک طوفانی رات چیخ رہی تھی ہوا کی تیز سیٹیاں اور بیوقوں کی عجیب دلدوز آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی تھیں۔ بجلی لیمپ کی مدھم روشنی رات کے تیرہ گھنٹوں کو اپنے ہالے میں لئے تھی۔

عالمِ تصور میں کوٹھی ویسے ہی سجی تھی۔ نشست گاہ میں Madonna of The Street کی تصویر، معصومیت کی مظہر، قصرِ الحمرا کا Facade کانسٹیبل کی عکاسی سب اپنی جگہ آویزاں تھیں، کھانا کمرہ کی دری میں مختلف رنگوں کی آمیزش فرش کے ساتھ چپک کے رہ گئی تھی جیسے پچی کاری کا نقش ہو۔ چھوٹا حمام اور سیلنگ، اونچے دروازوں کو ڈھانپے ہوئے دبیز پردے سب چیزیں اپنی جگہ پر جامد و ساکت تھیں۔ مکین جا چکے تھے لیکن یہ چیزیں کسی سحر کے تابع فرمان تھیں۔ اس کے لئے ایک ایسے گھر کا تصور ناممکن تھا جو لٹ چکا ہو جس کی آرائش کی چیزیں ایک ایک کر کے نوچ لی گئی ہوں، کمرے اور برآمدے کوڑا کرکٹ سے اٹ گئے ہوں۔

نقل مکانی تکلیف کا باعث کیوں ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ قیام دو ایک سال سے زیادہ نہیں ہم اس خطۂ زمین سے اس مکان اور پائیں باغ سے مانوس ہو جاتے ہیں، ہم مستقر سمجھ لینے کی بجائے اسے دوام بخش دیتے ہیں، وقتی طور پر سہی۔

آخری دن کئی لوگ ملنے آئے تھے، رخصت کرتے وقت انہوں نے رسمی اور غیررسمی باتیں کہی تھیں، دنیاداری کی باتیں تھیں اور ایسی باتیں بھی جن سے اخلاص کی بُو آتی تھی، ایک وکیل صاحب نے کہا "جب آپ یہاں آئے تھے تو ہم سمجھے تھے کہ آپ بہت شریف آدمی ہیں"۔ سخت گیری کی ستائش کا یہ انوکھا انداز تھا۔ دریا کے پار بسنے والا بڈھا بابا کالو جو اتنا بہرہ تھا کہ اس سے بات کرتے چیخنا پڑتا، جس نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن اب بیشتر زمین یا تو بٹوارے کی نذر ہو چکی تھی یا سرحد کے قرب کی وجہ سے جائے متنازعہ بن چکی تھی، جو خیریت پوچھنے کے جواب میں

ہمیشہ دو باتیں کہا کرتا "جی تہاڈا مہر چاہیدا اے ... جی بڑی خاہش سیں سکوں میرے ہندیاں ہائی ہو جاوے پر نظر آندا اے حسرت نال ای لے جانی اے"۔ آخری ملاقات میں بابا کالو کا گندمی سالخوردہ چہرہ وفور جذبات سے تمتما گیا، آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ ممنون مرد صحت یاب ہو کر پاگل خانے سے لوٹ آیا تھا۔ وہ آخری ملاقاتی تھا، الوداع کہتے وقت اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں اور بے تاب آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا: "میں دعا کرتا ہوں قیامت کے دن تو اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ تھے، اس روز بھی میں یہ مکھڑا دیکھ سکوں اور میری تپتی روح اس نظارے سے شادکام ہو"۔ اور دو کھردرے گنوارانہ ہاتھوں نے اس کا چہرہ ہالے میں لے لیا۔

اس پر رشوت سیرت ہونے کا لزم لگایا گیا تھ حالانکہ وہ کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ عامیانہ پن، عام لوگوں کی سب خامیاں اس میں موجود تھیں، شیورلیٹ ۵۶ء کی خواہش، گلبرگ میں بنگلہ بنانے کا جنون اور ان آرزوؤں کا ماتم جو امتدادِ وقت سے حسرتوں میں بدل گئیں، ناکردہ گناہوں کے لئے واویلا ... گناہ جو جرأتِ رندانہ کے فقدان کے باعث اس سے سرزد نہ ہو سکے۔ کبھی بنگلہ بنانے کی خواہش شیورلیٹ ۵۶ء پر غالب آ جاتی، کبھی بنک بیلنس برقرار رکھنے کا خیال دونوں پہ حاوی ہو جاتا۔ اور اسے محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایک بے بس مکڑی کی طرح مایا اور لوبھ کے جال میں پھنس گیا ہے۔ کبھی اس کے سینے میں لاتعلقی اور کبر نفس کا الاؤ روشن ہو جاتا، حرص و آز اس آگ میں تحلیل ہو جاتی اور کندن دمکنے لگتا، خواہشات کی جگہ طمانیت لے لیتی اور یہ موڈ مہینوں طاری رہتا۔

اسے اپنے گھٹیا پن کا شدید احساس اس روز ہوا جب غصے سے بے قابو ہو کر اس نے ایک بس ڈرائیور کو مارا تھا۔ کیونکہ باوجود ہارن کرنے کے اس نے آدھی سڑک نہیں چھوڑی تھی بس ڈرائیور کبھی سڑک نہیں چھوڑتے انہیں سیدھا کرنا چاہیے لیکن یہ بربریت کی طرح خود اس کے اعصاب پر مسلط ہو گئی تھی اور اسے یہ خیال ستاتا رہا کہ بس ڈرائیور پہ ہاتھ اٹھانا کمینگی تھی۔

ویران سڑک پر کوئی اکا دکا راہ گیر اور خالی تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی Monotonous سی آواز، جس میں تندی نہ ہو شعلے بلند نہ ہوں۔ سموں کا زمین کو چھونا گوارا کر لیا جائے اور کوچوان خون گرما دینے والی کوئی سُر الاپنا چاہے تو احساسِ محرومی اس خواہش کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کی روح ایک ایسے گھوڑے کی مانند آگے بڑھ رہی تھی جس کے ارادوں میں عزم و توانائی نہ ہو منزل کا تعین نہ ہو۔ کبھی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ تار عنکبوت توڑ دیتا اور ایک ارفع مقام سے اپنا تجزیہ کرتا تو عام دنیاوی خواہشات حقیر نظر آنے لگتیں۔ اور ایک احساسِ

برتری کے تحت ان کے پیچھے بھاگنے والے لوگ کیڑے مکوڑے دکھائی دیتے اور اس کا یقین ایمان میں بدل جاتا کہ وہ کوئی بہتر مقصد لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ کبھی وہ یہ ضرور سوچتا نسلِ زندگی کا راز کیا ہے؟ جب دنیا دکھوں کا گھر ٹھہری تو تخلیقِ آدم سے منشائے ایزدی کیا تھا؟ ہم ہمیشہ کرموں کا پھل اس دنیا میں نہیں پاتے۔ بسا اوقات بڑے بڑے شیطان سستے داموں چھوٹ جاتے ہیں اور چند ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔ ہزارہا سال سے زندگی کا بیباکانہ مظاہرہ ''دام و دد'' کی فراوانی اور ''انسانم آرزوست'' کی تشنہ کامی ظواہر وا کرنے والے ''فرشتوں'' کا ہجوم، مذہب کی روح سے بیگانگی، مذہب کے اجارہ داروں کی خود بینی اور عوام فریبی شرابِ طہور، حور و قصور استعارہ ہے ''قربِ جمال'' کے لیے؟ قربِ دوست جنت ہے در فراق میں روح انگاروں پہ لوٹتی ہے، خدا کے نیک بندے کون ہیں؟ خدا کیسے ملتا ہے؟ بلھے شاہ رب انہاں نوں ملدا نیتاں جنہاں دیاں اچھیاں؟ طاغوتی قوتوں کے بے پناہ سیل سے متاثر ہو کر زندگی میں سزا و جزا کے فقدان سے متاثر ہو کر اس نے حیاتِ مابعد موت کو اشتباہ کی نظر سے دیکھا تھا۔۔۔

''ممدو پاگل خانے سے ٹھیک ہو کر لوٹ آیا ہے، کل الوداع کہنے آیا تھا۔ دعائیں دے رہا تھا''۔

''تو پھر ممدو نے کیا کہا تھا، کیا دعا دی تھی''؟ بیوی نے کھانے کی میز پر پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے کہا تھا۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ ۔۔۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور بلکتے بچے کی طرح سسکیاں لینے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے محشر کے تپتے ہوئے صحرا میں وہ تن تنہا اپنے خالق کے حضور، ربِ ذوالجلال کے سامنے کھڑا ہے اور گرد و نواح سے ہم آہنگ ہو کر اس کی روح اک مجسم شعلہ بن گئی ہے اور کمالِ حدت سے خود اس شعلۂ جوالہ کے اندر صدہا شعلے فروزاں ہو گئے ہیں، پھر ٹپ ٹپ ایک ایک قطرہ گرتا ہے، گرم آنسو کا قطرہ، رقت و شرمساری کا قطرہ، ترحم و تضرع کا قطرہ، پھر ان قطروں نے اس سرکش دریا کی شکل اختیار کر لی جو کنارے توڑ کر نکل جائے۔ سَن سَن کے ساتھ وہ شعلہ فرو ہونا شروع ہوا اور اسے وہ تسکین محسوس ہونے لگی جس کی لذت کو وہ جسمانی ہیولی میں ترس گیا تھا، تشکک و اوہام کا انبار خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا، لاادری کے آبلے پھوٹ گئے اور لایقینی کا مواد بہہ نکلا۔۔۔

جب اس نے سر اٹھایا تو دو خوبصورت آنکھیں اسے حیرانگی سے گھور رہی تھیں۔

———

قصہ سوتے جاگتے کا

منیر احمد شیخ

خواب کے عالم میں کیا دیکھتا ہے کہ وہ مقدس مقامات کے سفر پر رواں ہے' راہ میں ایک بحر بیکراں ہے' جس کو وہ پار کرتا ہے' پھر خشکی آتی ہے' تو وہ اپنے آپ کو ایک صحرا کے سامنے کھڑا پاتا ہے۔ ریت ہی ریت۔ اس صحرا میں کبھی وہ پیدل چلتا ہے۔ کبھی اونٹ پر سوار ہو جاتا ہے۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد بالآخر اسے دور سے منزل کے نشان نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک مینار جو ایک مخروطی گنبد کے ساتھ کھڑا ہے' اس کا شوق مینار کو دیکھتے ہی تیز تر ہو جاتا ہے' وہ گرتا پڑتا جب اس مقام پر پہنچتا ہے' تو کیا دیکھتا ہے کہ اس عمارت میں ستون ہیں اور ستونوں کے درمیان ایک چاردیواری ہے۔ چاردیواری کے اوپر گنبد ہے اور ستونوں کے اوپر چھت ستونوں کے درمیان چاروں اطراف سے راستے اس چاردیواری تک جاتے ہیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوتا ہے' تو اسے وہاں کسی کے موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اچانک ایک جانب سے تیز روشنی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس روشنی میں وہ ایک صورت دیکھتا ہے۔ لیکن وہ صورت نور میں اس طرح سے لپٹی ہوئی ہے کہ اس کے خدوخال اسے دکھائی نہیں دیتے۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ نورانی صورت اندر آئی' اس کے چہرے کے گرد نور کا ایک ہالہ ہے۔ جب اس نے اس صورت کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی' تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ عالم خواب سے وہ اب عالم ہوش میں تھا۔ دیر تک لیٹا اس منظر میں ڈوبا رہا کہ اتنا طویل سفر کر کے وہ کس جگہ پہنچا تھا' ہو نہ ہو یہ مقدس مقام وہی تھا جس کا ذکر اس کی نانی اس سے کیا کرتی تھی۔ وہ اسے بچپنے میں اپنے سفر کا قصہ سنایا کرتی تھی۔ جب وہ ایک دخانی جہاز میں سوار ہو کر ایک ریتلے ساحل پر اتری اور پھر اونٹوں کے ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کے ریتلے صحراؤں میں کئی دن سفر کی حالت میں رہی۔ رات کو یہ قافلہ پڑاؤ کرتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں راہزن ان پر حملہ آور ہوتے اور جو اثاثہ ان کے پاس ہوتا' سے لوٹ کے لے جاتے مگر دوسرے روز ان کا سفر جاری

رہتا۔ بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر کئی مسافر جان سے چلے جاتے۔ جو بچ جاتے۔ بالآخر منزل پہ پہنچ جاتے۔ یہ منزل عشق تھی کہ راستے کی کوئی مشکل ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کر پاتی۔ بچپن میں نانی اماں اس گنبد والی عمارت کا ذکر کرتیں۔ اس ذکر میں ایک عجب والہانہ پن ہوتا۔ اس عمارت والے کے ذکر پر وہ جھومنے لگ جاتیں اور پھر اپنی لرزتی ہوئی آواز میں ایسے اشعار گا گا کے پڑھتیں' جن میں واری اور قربان ہو جانے کا ذکر ہوتا۔ یہ اشعار گاتے گاتے وہ جھومنے لگتیں اور جھومتے جھومتے ان پہ نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور جب یہ کیفیت ان پہ طاری ہو جاتی' تو وہ وہاں سے چل دیتا۔

پھر جب اسے نیند آتی' تو وہ خواب میں دیکھتا کہ اس سفر پر وہ خود جا رہا ہے۔ بالکل اکیلا تن تنہا اور اسی عمارت کو دیکھتا ہے' جہاں نورانی صورت دکھائی دیتی ہے مگر اس کے خدوخال واضح نہیں ہیں۔

یہ خواب اس نے اپنی نیند میں کئی بار دیکھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے دیکھا کہ وہ سمندر میں ربڑ کی ایک ٹیوب پر جس میں ہوا بھری ہوئی ہے سوار ہے اور سمندر میں چلا جا رہا ہے۔ پھر وہی ٹیوب ساحل پر آتا ہے اور وہ ٹیوب سے اتر کر اونٹ پر سوار ہوتا ہے، اور ایک مقام پہ پہنچتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ جہاں وہ اس وقت موجود ہے یہ اللہ کا گھر ہے۔ اسے دیکھتے ہی ایک ہیبت اس پہ طاری ہوتی ہے اور وہ فوراً یہ خواہش کرتا ہے کہ میں اسی مکان میں پہنچوں' جہاں روشنی دکھائی دیتی ہے اور ایک نورانی چہرہ ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جس کے خدوخال واضح نہیں ہوتے۔ مگر اسی نورانی صورت کی موجودگی میں اسے ایک عجیب گہری طمانیت ملتی ہے اور اسے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ اس نے جس مقام کے لیے سفر کیا تھا' اس کی منزل یہی ہے جیسے یہ مقام عشق ہے۔ پھر اس کی آنکھ کھل جاتی اور اسے افسوس ہوتا کہ آنکھ کیوں کھل گئی ہے۔ جس لذت سے وہ سرشار ہو رہا تھا' وہ لذت تو اس کے خواب کے ساتھ ہی تھی۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ حقیقت تو بڑی گھناؤنی اور محدود سی کیفیت ہے' اس میں تو تشنگیاں ہی تشنگیاں ہیں' حقیقت میں اگر خوابوں کی جگہ نہ ہوتی' تو حقیقت کس قدر بے وسعت اور بے رنگ ہوتی۔ خوابوں میں جذبوں کی تسکین تھی اور لامحدود وسعت۔ جس مقام پہ جانے کا اس نے کبھی سوچا نہ تھا' خواب اسے ان مقامات پر لے گئے۔ اس نے سوچا کہ خواب اس دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہیں۔ دیکھنے کے لیے سونا بڑا ضروری ہے یہ غلط ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے' اس نے جو بھی جاگ کر پایا تھا' وہ سو کر ہی ملا تھا۔

پھر وہ دن آیا' جب وہ ایک روز عالم ہوش میں اس مقام پر لایا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے' یا ہوش میں ہے۔ اس کی آنکھ کے سامنے وہی مقدس مکان تھا اور سامنے جالی تھی۔ ستونوں کے اندر چار دیواری کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور ستونوں کے گرد بھی جالیاں لگا کے اطراف کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ خواب میں تو وہ چار دیواری کے اندر اپنے آپ کو پاتا تھا مگر عالم ہوش کا منظر صرف اسی قدر مختلف تھا کہ وہ چار دیواری اور ستونوں کے باہر ایک جالی کے سامنے

کھڑا تھا جس کے تمام راستے اب بند کر دیے تھے۔ باقی حقیقت وہی تھی' جسے وہ خوابوں میں دیکھ چکا تھا۔

اس نے دیکھا کہ ستون بالکل وہی ہیں' اور ان کا رنگ بھی وہی گہرا زرد ہے' جو اشتداد زمانہ سے سیاہ ہو گیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کا خواب اس کے سامنے ہے۔ مجسم صورت میں حقیقت بن کر۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا واقعی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے اس جالی کو چھونا چاہا' تو سامنے کھڑے ایک حاجب نے اس کو ڈنڈے کے اشارے سے کہا کہ وہ جالی کو دیکھ سکتا ہے' پاس کھڑا ہو سکتا ہے مگر چھو نہیں پا سکتا۔ لمس تو یقین کی پہلی منزل ہے۔ لمس کے بغیر اسے یوں لگ رہا تھا کہ نہیں یہ حقیقت نہیں' خواب ہی ہے۔ خواب میں بھی تو وہ بس دیکھتا ہی تھا اور یہاں بھی دیکھ ہی رہا ہے' اسے حاجب پہ سخت غصہ آیا' جو حقیقت اور خواب کے درمیان کھڑا ہو گیا تھا۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان اس کا وجود نفرت کی دیوار کی طرح تھا۔ حقیقت تو گھناؤنی اور بے رنگ ہوتی ہے اور رنگ تو لمس کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن وہ وہاں کھڑا تھا' جو اسے پہلے دکھا دیا گیا تھا۔ وہی نقشہ' وہی رنگ۔ اس کے دل میں ویسی ہی طمانیت اتر آئی تھی جو خواب میں اسے اس مقام پر پہنچ کر ہوتی تھی۔ سرشاری کی وہی کیفیت تھی' جو خواب میں تھی۔ اس پہ آشکارا ہوا کہ اس کے خواب سچے تھے اور جس مقام پہ وہ اب کھڑا ہے یہ اسے دکھا دیا گیا تھا۔ اس نے وہاں کی ہر چیز کو پہچان لیا تھا' جو پہلے خواب تھا اب حقیقت میں بدل گیا تھا۔ جو اس نے سوتے میں دیکھا تھا' اب جاگ کر دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے خوابوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اسے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اسی طرح کا واقعہ اس کا ساتھ گزر چکا ہے۔ اسے یاد آیا کہ اس نے ایک روز ایک شخص کو دیکھا اور اس کا دل ایک دم سے دھڑکا اور اس نے خواہش کی کہ یہ شخص میری زندگی میں آ جائے۔

اس روز وہ سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک حسین صورت کو سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا۔ وہ صورت اس کے دل میں ایک دم اُتر گئی اور اس نے خواہش کی کہ وہ اس کی زندگی کا حصہ بن جائے۔ وہ اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس کا نام پتا کچھ بھی اسے معلوم نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ صورت دکھائی دی اور پہلی بار اس نے خواہش کی کہ وہ صورت اس کی زندگی میں شریک ہو جائے اس سارے عرصے میں وہ پھر دکھائی نہ دی۔ وہ خواہش جیسے کوئی خواب تھا' جو اس نے دیکھا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ذہن کے پردے سے محو ہو گیا۔

سات برس گزر گئے اور ایک روز اس نے کیا دیکھا کہ وہی مہ رخ اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے اور شریک زندگی بن گئی ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ اس نے اسے ہاتھ سے

چھوا۔ حقیقت اور خواب کے درمیان اب کے کوئی حاجب کھڑا نہیں تھا۔ جس سے رنگ ابھرے اور ان رنگوں کے درمیان اس نے دیکھا کہ سات برس پہلے اسے یہ منظر دکھا دی گئی تھی۔ جب وہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اسے دیکھتے ہی ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔ پھر وہ خواہش خوابوں میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اس واقعہ کو بالکل بھول بھی گیا مگر اب سات برس بعد وہ جو ایک خواہش تھی حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے تھی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اسے جو عطا ہوا ہے وہ پہلے دکھا دیا گیا تھا۔ پتا چلا کہ چہرے، چیزیں اور جگہیں جو حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں وہ اسے پہلے دکھا دی جاتی ہیں اور وہ جب حقیقت کی شکل میں انہیں دیکھتا ہے تو اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ یہ تو اسے پہلے دکھا دی گئی تھی۔

اب جو اس نے سوچنا شروع کیا تو اسے پتا چلا کہ یہ واقعہ تو اس کے ساتھ مسلسل ہو رہا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی کسی ملک میں گیا اور وہاں کچھ برس قیام کیا تو اسے پتا چلا کہ جن جگہوں پر اسے بٹھایا گیا ہے، یہ تو وہی تھیں، جو یہاں آنے سے پہلے اسے دکھا دی گئی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ کئی برس ہوئے وہ یورپ کے اس ملک میں چند مہینوں کے لیے بھیجا گیا تھا۔ گھومتا گھامتا وہ اس کے دارالحکومت میں پہنچ گیا اور وہاں اپنے آپ کو ایک عمارت کے کمرے میں بیٹھا ہوا پایا۔ اس کمرے میں میز کے سامنے ایک کرسی تھی جو استعمال سے پرانی ہو چکی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کرسی پر آ کے رک گئیں۔ پتا نہیں کیوں۔ اس کمرے میں اور بھی تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، مگر یہ میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی اس کی نظروں میں اٹک گئی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی، الماریوں اور ان کے اندر رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ زمین پر بچھے ہوئے میلے کچیلے قالین پر بھی اس کی نگاہ پڑی اور بائیں طرف شیشے کی دیوار کے پیچھے خوبصورت چھوٹے چھوٹے گھر بھی اسے نظر آئے۔ وہ کچھ دیر اس کمرے میں بیٹھا رہا اور پھر اس کرسی پر جو اس کی نظروں میں اٹک گئی تھی۔ بیٹھے ہوئے شخص سے گفتگو کرتا رہا۔ سلسلہ کلام جب ختم ہوا، تو وہاں سے اٹھا اور چل دیا۔ اس واقعہ کے پورے نو برس بعد اس نے دیکھا کہ وہ اسی کمرے میں اسی کرسی پر آن بیٹھا ہے، جو اس کی نظروں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ وہی کمرہ تھا، وہی کتابوں سے بھری الماریاں، وہی شیشے کی دیوار جس میں سے چھوٹے چھوٹے خوب صورت گھر دکھائی دے رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ یہ جگہ جہاں اسے چند برس قیام کرنے کا حکم ملا ہے، یہاں تو وہ ایک روز آیا تھا۔ اور اب اسی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، جو اس کی نظروں میں اٹک گئی تھی۔ ایک ایک چیز اسی جگہ پہ تھی، جو نو سال پہلے وہ کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ پھر پورے ساڑھے چار سال تک وہ روزانہ اسی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس کا رزق اس عرصے کے لیے اسی جگہ پر لکھا گیا تھا۔

عجب بات تھی وہ ایک دن جو نو برس پہلے اس کی زندگی میں آیا تھا، گزر گیا، اسے وہ یاد بھی نہیں رہا تھا۔ درمیان میں نو برس جیسے وہ سویا رہا اور پھر ایک روز جو جاگا تو اسی کمرے میں اسی کرسی پر اپنے آپ کو بیٹھے پایا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو نو برس پہلے دیکھا تھا، خواب تھا یا جو اب دیکھ رہا ہے خواب ہے

لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہاں لانے سے پہلے اسے دکھا دیا گیا تھا کہ اسے ایک روز یہاں آنا ہے اور ساڑھے چار برس تک یہاں قیام کرنا ہے۔ گویا کچھ چیزیں اسے سوتے میں دکھائی جاتی تھیں جو جاگتے میں۔ پھر وہ چیزیں اس کی زندگی میں در آتی تھیں۔

جب ساڑھے چار برس بیتنے کو آ رہے تھے' تو اس نے ایک خواب دیکھا کہ وہ سیاہی مائل پتھروں کی دیواروں کی ایک عمارت میں داخل ہو رہا ہے۔ پتھروں کی یہ دیوار سبز پتوں اور پھولوں کی بیل سے ڈھکی ہوئی ہے اور بڑی خوب صورت ہے۔ بیلوں سے لدی ہوئی دیواروں اور مکانوں میں اسے ہمیشہ بڑی کشش محسوس ہوتی۔ اس خوب صورت دیوار کے سائے میں اندر داخل ہونا اسے بڑا اچھا لگا۔ دیوار کے اندر گیا' دیکھتا ہے کہ نیم گنبدی محل نما ایک عمارت ایستادہ ہے جسے دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے مبہوت ہو کے رہ گیا۔ یا اللہ یہ کوئی محل ہے یا قلعہ؟ سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے پاس پہنچا' تو اسے محسوس ہوا کہ اسے اندر آنے سے منع کیا جا رہا ہے۔

اس خواب کے چند روز ہی بعد اس نے اپنے آپ کو اس محل نما قلعہ کے اندر پایا۔ اس کا رزق اب کچھ دیر کے لیے اس عمارت کے اندر تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اسے پتا چلا کہ اسے اس عمارت کی چار دیواری دکھا دی گئی تھی' جس کے اندر وہ داخل ہو رہا ہے اور یہ کہ اس کا یہاں آنا کہیں اوپر طے ہو چکا تھا۔ اسے اب یقین آیا کہ اس کا مقدر یہی ہے' اور اوپر جو مشورے ہوتے ہیں ان کے فیصلے سے اسے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی سوتے میں کبھی جاگتے میں۔ یہ دکھانا دراصل بتانا ہے۔ گرچہ زبان یا آواز سے کچھ نہیں کہا جاتا۔ گویا جو دکھایا جاتا ہے' وہ برحق ہے اور وہ ایک دن ہو کے رہتا ہے۔

پھر اس نئے مقام پر اس نے ایک نیا چہرہ دیکھا۔ اس چہرے میں عجیب کشش تھی۔ دھلا دھلایا صاف شفاف اور روشن۔ اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ان آنکھوں میں جب اس نے جھانکا تو اپنا ہی عکس دیکھا۔ اسے ایسے لگا جیسے یہ چہرہ اس نے نہایت بچپنے میں دیکھا تھا۔ جب وہ ابھی معصوم تھا اور شعور کو نہیں پہنچا تھا۔ اس چہرے میں اس نے اپنے لیے بلا کی کشش محسوس کی اور اسے یک لخت اپنے سامنے پا کر اسے لگا جیسے ایک چیز جو کھوئی تھی' وہ اسے دوبارہ مل گئی ہے۔ پھر اس چہرے میں اس نے اپنے لیے بھی اتنی ہی کشش دیکھی۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے' کہیں بچھڑے ہوئے تو پھر ایسے دوبارہ تو نہیں مل رہے؟ اس نے پھر پیچھے' بہت پیچھے مڑ کے دیکھا اور بچپن کو یاد کیا' تو اسے اس چہرے کے سوا اور کوئی ایسا دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ بجز اس کے جسے وہ اب اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔ یہ تو وہی چہرہ ہے وہی تمکنت وہی کشش۔ کچھ لوگ اپنی جھلک دکھا کر پھر کہاں گم ہو جاتے ہیں! اور گم ہو جانے کے بعد وہ اچانک پھر واپس آ جاتے ہیں' تو خوشی کے ساتھ ساتھ غم کی لکیریں بھی ابھر آتی ہیں کہ یہ پہلے کہاں گئے تھے' اوجھل کیوں ہو گئے؟ پھر جب اوجھل ہو گئے تھے' تو اب اتنی مدت گزر جانے کے بعد اچانک یوں سا

ہو گئے ہیں؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ کیسا پلان ہے؟ کوئی پلان ہے بھی یا نہیں؟ یا یہ واقعات و حادثات ہو رہے ہیں، انہیں اسی طرح ہی ہونا ہے۔ کوئی نہ کوئی سسٹم پس پردہ ہے، جس کی کوئی منطق نہیں مگر پھر بھی ایک منطق ہے۔ کچھ عجیب کھیل کرتار کے، میرے سائیں غریب نواز کے۔

وہ خواب سا چہرہ اپنی تمام تر کشش کے ساتھ اسے کچھ دیر نظر آیا۔ یہ محبت سے بھرا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر اس کا اس دنیا میں زندہ رہنے کو جی چاہنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اس چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہے۔ وہ اس خواب کو حقیقت میں بدلنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے تمام خواب حقیقتوں میں بدل دیے گئے تھے۔ اس خواب کو بھی وہ خواب نہیں رہنے دے گا، اسے بھی حقیقت کا روپ دے گا، جو کچھ دیکھ رہا ہے، وہ جاگتے میں دیکھ رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آنکھ لگ جائے اور وہ چہرہ غائب ہو جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب سوئے گا نہیں۔ وہ اگر سویا، تو وہ چہرہ منظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ پھر خواب میں بھی نظر نہ آئے گا۔ اسے پہلی مرتبہ خواب پہ شک ہونے لگا۔ اس نے سونے سے انکار کر دیا اور جاگتے ہی میں سب کچھ پانے کی خواہش کی، وہ خوابوں سے محروم ہو گیا۔

پہلے جو کچھ اسے خوابوں کے راستے سے ملتا تھا، وہ دروازہ اب بند ہو گیا۔ وہ چہرہ جسے اسے اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھنے کی تڑپ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے خواب ہو گیا اور خواب اس پہ اب بند ہو گئے تھے۔

کیا وہ چہرہ اب اس سے چھن گیا ہے، جسے جاگتے میں پانے کی اسے خواہش کی تھی؟ وہ تو اب خوابوں میں بھی نہیں آتا۔ خوابوں میں وہ اب کیسے آتا، خواب تو اب اس سے منہ موڑ گئے تھے۔

اس روز سے وہ حالت عذاب میں ہے۔ خواب اس کی زندگی میں نہیں رہے۔ چاروں طرف حقیقت ہی حقیقت ہے۔ گھناؤنی کرخت اور ظالم۔ اس چہرے کے انتظار میں جاگ جاگ کر اس کی آنکھیں اینٹھ گئی ہیں اور وہ آدمی سے پتھر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی ساکن اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے، تو اسے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ تم خوابوں میں زندہ رہو گے مگر زندگی خوابوں میں نہیں ہوتی۔

وہ یہ سب سن کے چپ رہتا ہے، پتھر بنا دیکھتا رہتا ہے۔ وہ انہیں کیسے کہے کہ خواب اگر زندگی میں نہ رہیں، تو پھر زندگی خالی ہو جاتی ہے، پتھر ہو جاتی ہے۔ خواب سے باہر زمین اور آسمان بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔

اب اسے کوئی خواب نہیں آتا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اندھیرا ہی اندھیرا چاروں جانب ہے اب اسے کچھ معلوم نہیں کہ آگے کیا ہو گا؟

اس نے جو جاگ کر پایا تھا، سے خوابوں ہی میں ملا تھا۔ خواب رخصت ہوئے، تو دنیا عالم خالی

ہو گئی۔

جس روز آدم کے جسم میں روح پھونکی گئی تو اس نے آنے والے روز کا خواب دیکھا۔

جس دن سے خواب اس سے روٹھ گئے ہیں اس سے اگلا دن اس پہ نہیں چڑھ رہا۔ وقت رک گیا ہے۔ زندگی میں حرکت نہیں رہی۔

تب سے وہ مسلسل جاگ رہا ہے اور اس کی آنکھیں اب بالکل پتھرا گئی ہیں، وہ سب خواب جو اس نے پہلے دیکھے تھے۔ اب پتھر بن گئے ہیں اور وہ چہرہ بھی اب پتھر ہو گیا ہے جو اسے دکھایا گیا تھا اور جس میں اس نے اپنے سے بے پناہ کشش محسوس کی تھی۔

خواب اب اس سے ہمیشہ کے لیے چھن گئے ہیں۔

بیگانگی کی تخ

منیر الدین احمد

اس روز ریستوران خلافِ معمول آدھا خالی تھا۔ اکثر میزوں پر اکیلے دکیلے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بے حد سوہنی صورت والی لڑکی بھی شامل تھی، جو یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے آرڈر دے جانے کے بعد مال کی وصولی کے لیے گاہک نہ آیا ہو۔ اس نے لڑکی کو سلام کرنے کے بعد، خلافِ قاعدہ پوچھا کہ آیا اس کے میز کی کوئی کرسی خالی تھی اور کیا اسے اس پر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ لڑکی نے بڑی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اس کی اپنی کرسی کے سوا باقی کی تینوں کرسیاں خالی ہیں، اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا، جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اس پر بیٹھ سکتا ہے۔ اس رسم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دو اجنبیوں کے درمیان چپ کی برف ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے از سرِ نو جمنے سے قبل اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ یقیناً مینو کا مطالعہ کر چکی ہوگی اور اسے مشورہ دے سکے گی کہ اسے کیا آرڈر دینا چاہیے۔ دراصل اسے کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہ سال بھر سے ہر اتوار کے روز اس ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھاتا آیا کرتا تھا اور باری باری مینو کے کھانے اول سے آخر اور آخر سے اول تک چکھ چکا تھا۔ اس ریستوران میں مچھلی کی پچیس تیس قسمیں پکائی جاتی تھیں۔ مگر اس نے یہ بات لڑکی کو نہ بتائی۔ تاہم جب ویٹرس آرڈر لینے کے لیے آئی، تو لڑکی نے نوٹ کیا کہ اس نے اس کے ہم میز کو پرانے واقف کاروں کی طرح سلام کیا جس سے اسے بھاری ٹپ ملنے کی توقع ہو۔ پھر آرڈر لینے سے پہلے اس نے میز پوش کو بدل دیا، جس پر ایک دھبہ پڑا ہوا تھا۔ یہ دھبہ اس وقت بھی موجود تھا، جب لڑکی وہاں پر آن کر بیٹھی تھی اور ویٹرس نے آرڈر لیتے وقت نظر بچا کر دھبے والی جگہ پر ایش ٹرے کو رکھ دیا تھا۔ نوجوان نے بیٹھتے ہی ایش ٹرے کو اس جگہ سے ہٹا دیا تھا۔ وہ جگہ عین اس کی ٹھوڑی کے نیچے تھی، اور اسے دونوں بازوؤں کو میز پر ٹیک کر بیٹھنے کی عادت تھی۔

یہ چوبیس دسمبر کی بات ہے۔ وہ اتوار کا روز نہ تھا، اگرچہ اس کا تعلق بھی ایک تہوار کے ساتھ ہے۔

جرمنی میں دنیا جہان سے انوکھا دستور رائج ہے۔ کہ کرسمس کے تحفے تحائف چوبیس دسمبر کی شام کو دیے جاتے ہیں۔ جب کہ اصل تہوار اس سے اگلے روز منایا جاتا ہے۔ چوبیس دسمبر کو صبح سے لے کر دوپہر تک دکانیں کھلتی ہیں۔ اس روز وہی لوگ خریداری کے لیے شہر میں آتے ہیں' جو ہر کام کو آخری لمحے پر اٹھا رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس نے گمان کیا کہ لڑکی بھی اس روز آخری منٹ پر تحفے خریدنے کے لیے نکلی ہوگی۔ مگر اس نے دیکھا کہ وہ خالی ہاتھ تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ کرسمس کے تحفوں کے بارے میں گفتگو خوب رہے گی مگر ایک نئے ملنے والے شخص کے سامنے کوئی کیوں کر کپڑوں کی باتیں کر سکتا ہے۔ پھر اس بات کا امکان موجود تھا کہ لڑکی بھی اس کی طرح تحفے تحائف دینے کے دھندے سے بیزار ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ موسم پر بات کی جائے۔ مگر یہ موضوع اس قدر پٹا ہوا ہے کہ اس میں کوئی انوکھا پن پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس روز اگر برف باری ہو رہی ہوتی تو بات دوسری تھی۔ مگر اس روز تو بارش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے سیدھے سیدھے کہہ دیا کہ وہ کوئی موضوع ڈھونڈ رہا تھا جس کے بارے میں بات کی جا سکے۔ مگر اسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ یہ سن کر لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے۔ لڑکی نے کہا کہ بات تو کسی بھی چیز کے بارے میں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً اس روز خلافِ معمول بارش نہ ہونے کے بارے میں۔ یا اس بارے میں کہ لوگوں نے دکانوں میں کوئی کام کی چیز نہیں چھوڑی تھی اور سب کچھ خرید خرید کر گھروں کو ڈھو کر لے گئے تھے۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اس روز کچھ خریدنے کے لیے نہیں نکلی تھی' اسے کسی کو تحفہ نہیں دینا تھا اور نہ ہی وہ تحفے وصول کرنے کے موڈ میں تھی۔ وہ دراصل کرسمس اور سالگرہ کے چکروں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ مگر اس نے بتایا کہ اس روز اس کی سالگرہ تھی اور اس کا اس اجنبی شہر میں کوئی دوست نہیں تھا' جس کے ساتھ مل کر وہ اپنا جنم دن منا سکتی۔

اس کی بات درست تھی' باتیں کرنے کے لیے موضوعات کی کوئی کمی نہ تھی۔ بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ ریستوران سے اٹھ کر وہ ایک کیفے ہاؤس میں جا بیٹھے' اور جب شام کے وقت وہاں پر بھی کرسیوں کو میزوں پر اوندھے منہ رکھا جانے لگا' تو باہر نکل کر دونوں پہلو بہ پہلو چلتے رہے' بغیر ایک دوسرے کے ساتھ یہ طے کرنے کے کہ ان کی منزل کیا تھی۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا گیا' توں توں سڑکیں اجاڑ ہوتی گئیں' بسیں اور ٹرام تک چلنی بند ہو گئیں اور سڑکوں پر اکا دکا ٹیکسیاں رہ گئیں۔ گھروں میں کرسمس کے درختوں پر موم بتیاں جلا دی گئی تھیں' اس زمانے میں ابھی بجلی کے قمقموں سے درختوں کو سجانے کا رواج نہ تھا۔ فلیٹوں کی کھڑکیوں میں سے وہ لوگوں کو تحفے دیتے' گلے ملتے' چومتے' ناچتے' گاتے دیکھ سکتے تھے۔ گاہے گاہے وہ کسی ایسے نظارے سے محظوظ ہونے کے لیے رک جاتے تھے اور ایک دوسرے کو اشاروں سے کوئی انوکھی چیز دکھاتے تھے۔ منہ کی جگہ ہاتھوں نے لے لی تھی۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ آپس میں مس ہو جاتے تھے۔ اس نے ایک بار جب کہ وہ پہلو بہ پہلو ایک جیولری کی دکان کے سامنے کھڑے شوکیس میں دیکھ رہے تھے

اپنا ہاتھ لڑکی کے کندھے پر رکھ دیا اور اسے ایک نیکلس دکھانے کے لیے اپنی طرف کھینچا۔ ہیلگا 'یہ اس لڑکی کا نام تھا' دھیرے سے گھوم کر اس کی گرفت سے نکلی اور ساتھ کی دکان کی طرف بڑھ گئی اور اشارے سے ادھر آنے اور ایک چیز دیکھنے کو کہنے لگی۔ جب اگلی بار اس نے بے دھڑکے کے بعد ہیلگا کے کندھے پر ہاتھ رکھا' تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس نے اس وقت بھی کچھ نہ کہا۔ جب اس نے اس کی گالوں کو چوما۔

شام کے کھانے کے لیے وہ ریلوے اسٹیشن کے ریستوران میں گئے' جہاں پر شہر بھر سے بے گھر لوگ جمع تھے۔ عورتیں ان میں کم کم ہی تھیں' باقی کے سب مرد تھے جو ہیلگا کی طرف اپنی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے' جیسے اسے آنکھوں کے رستے نگل جائیں گے۔ اسے یہ ماحول بالکل پسند نہ آیا۔ مگر مجبوراً رکنا پڑا' کیونکہ کرسمس کی شام کو انسان اور کسی جگہ پر کھانا کھانے کے لیے نہ جا سکتا تھا۔ ہیلگا تو جیسے ان ساری باتوں کی پرواہ بھی نہ کرتی تھی لگتا تھا کہ اس روز کوئی چیز بھی اس کا موڈ خراب نہ کر سکتی تھی۔ انھیں میز بھی الگ نہ مل سکا اور ان کے ہم میز مردوں نے بھونڈے انداز میں ہیلگا کو شراب پینے کی دعوت دی' جسے اس نے بے پروائی سے رد کر دیا۔ دوسرے میزوں پر سے ہیلگا کی صحت پر جام پیئے جانے لگے' جس کے جواب میں ہیلگا نے ایک نظر غلط بھی اُدھر نہ ڈالی۔ دونوں اپنی نظروں کو مینو کارڈ پر جھکائے ہوئے کھانے کا انتخاب کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے ہیلگا سے سرگوشی میں کہا کہ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو' تو وہ فوراً اٹھ کے اس کے فلیٹ میں چلے جائیں۔ کچھ کھائے پیئے بغیر ریستوران سے اٹھ جانا اسے پسند نہ تھا۔ رہے وہ مرد تو ان کی طرف وہ بالکل کوئی توجہ نہ دے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ ہوا ہیں جیسے ہوا نظر نہیں آتی' ویسے ہی وہ مرد اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس نے کہا کہ شاید وہ بھی ہیلگا کو نظر نہ آتا ہو' کیونکہ آخر وہ بھی اوپرا مرد ٹھہرا۔ ہیلگا نے اس کی طنز کو سمجھتے ہوئے دانت نکوسے' جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں تو میں کچا کھا جانا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا کہ اس بات کا فیصلہ بعد پر چھوڑ دیا جائے کہ کون کسے کھائے گا' فوری طور پر وہ کھانا کھا لیا جائے' جو ان کے سامنے اس عرصے میں چنا جا چکا تھا۔ قرب و جوار کے میزوں سے مردوں نے انھیں کھانے کی جان نوشی کی خواہشات سے نوازا' اور ان کے منہ میں پڑنے والے ایک ایک لقمے کا ساتھ دینے لگے۔ کھانا توقع کے برخلاف مزیدار تھا۔ دونوں نے اتنی بے شمار امتحان کرنے والی اور گھورتی ہوئی نظروں کے تحت کھانے کے تمام آداب و قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئے کھانے کو ختم کیا۔ ہیلگا نے کہا اسے کم از کم اس امتحان کو پاس کرنے کی سند ملنی چاہیے۔ اس نے گھر چل کے سند بنا کر دینے کا وعدہ کیا۔

جب رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ کھانا کھانے کا امتحان پاس کر کے ریستوران سے نکلے' تو طے پایا کہ پہلے چرچ میں چلا جائے' جہاں پر کرسمس کی رات میں نصف شب کو سروس ہوتی ہے۔ سینٹ نکولائی چرچ اس رات اپنی وسعت کے باوجود لوگوں کے ازدحام کے سبب تنگ ہو چکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کرسمس کی رات نصف شب کی سروس میں اس قدر لوگ شرکت کرنے

کے لیے جاتے ہیں۔ کرسیاں ساری بھری ہوئی تھیں اور دائیں بائیں کی دیواروں کے ساتھ اور کرسیوں کے پیچھے خالی جگہ پر ہر طرف لوگ کھڑے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف کھسکتے گئے۔ ہیلگا کو ہجوم میں سے راستہ بنانے کا فن آتا تھا۔ جہاں کہیں تھوڑا سا خلا نظر آتا۔ وہ جھٹ سے وہاں جا نکلتی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی دائیں اور بائیں کھڑے لوگوں سے معذرت چاہتا ہوا گھستا جاتا تھا۔ سروس شروع ہو چکی تھی اور لوگ بڑے انہماک کے ساتھ اس میں حصہ لے رہے تھے۔ ہیلگا اس سے دو تین قدم آگے تھی اور ان کے درمیان فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ ہیلگا کو کرسیوں کی قطاروں میں کہیں بہت آگے ایک خالی کرسی دکھائی دی۔ اس نے اشارے سے اسے بتایا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکتا' ہیلگا جھپک کر کرسیوں کے درمیان سے روسے گزرتی ہوئی خالی کرسی پر جا بیٹھی۔ جہاں پر وہ کھڑا تھا' وہاں سے وہ جگہ جہاں پر ہیلگا کی کرسی پائی جاتی تھی' یہی کوئی چالیس پچاس میٹر دور تھی سروس کے دوران اس نے ہیلگا کو اپنی نظروں میں رکھا۔ مگر جب سروس ختم ہوئی اور لوگوں کا ہجوم باہر کی طرف حرکت کرنے لگا' تو اس کے لیے اپنی جگہ کھڑا رہنا ممکن نہ رہا۔ ہیلگا اپنے اپنے چھوٹے قد کے سبب لوگوں کے ریلے میں گم ہو چکی تھی۔ چرچ کے گیٹ پر پہنچ کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ہیلگا کی راہ تکنے لگا یہاں تک کہ سارا چرچ خالی ہو گیا۔ ہیلگا کب چرچ سے باہر نکلی تھی' اس بارے میں اسے کوئی خبر نہ ہوئی۔ شاید وہ کسی دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور وہاں پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی وہ باری باری سارے گیٹوں پر گیا' پھر سارے چرچ کے ارد گرد گھوما۔ قریب کی ساری گلیاں چھان ماریں۔ نزدیکی انڈر گراونڈ سٹیشن پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا۔ مگر ہیلگا کہیں پر نظر نہیں آئی۔ اس دوران میں آخری گاڑی کے چھوٹنے کا وقت آ گیا اور اسے بھاری دل کے ساتھ اپنے گھر کا رخ کرنا پڑا۔

رستے میں اسے شدت کے ساتھ یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ اس نے کیسا ہیرا پا کر گنوا دیا تھا۔ اسے ہیلگا کا فیملی نام تک معلوم نہ تھا' نہ ہی اس نے یہ پوچھا تھا کہ وہ شہر کے کس حصے میں رہتی تھی اور اس کا فون نمبر کیا تھا۔ اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ دو سالوں سے وہاں پر رہتی تھی' کام کسی اخبار کے دفتر میں کرتی تھی اور اکیلی رہتی تھی۔ ہیلگا نے بھی اس کا فون نمبر یا پتہ نہ مانگا تھا۔ اس کے نام یا اس کے کام کی نوعیت سے بھی وہ واقف نہ تھی سو اگر وہ چاہتی بھی تو اسے نہ ڈھونڈ سکتی تھی۔ اس نے دو تین اخباروں کے دفتروں میں فون کیا' تو پتہ چلا کہ ہر دفتر میں ہیلگا نام کی عورتوں کی بھرمار تھی اور جب تک فیملی نام کا پتہ نہ ہو' ٹیلی فون پر کسی سے رابطہ نہ کیا جا سکتا تھا۔

اب صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ اخبار میں اعلان کروایا جائے شہر کے ایک اخبار میں ہر سنیچر کے روز ذاتی اعلانات چھپتے ہیں' جو دو تین سطروں کے ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کرتے' اپنی گمشدہ چیزوں کو تلاش کرتے یا کسی اور خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے

اشتہار کا مضمون یہ تھا کہ اسے اس لڑکی سے دوبارہ ملنے کا شوق ہے' جس کا ساتھ کرسمس کی رات سینٹ نکولائی چرچ کی نصف شب والی سروس کے دوران اس سے چھوٹ گیا تھا۔

منگل کے روز اخبار کے دفتر میں ایک خط اس کے حوالے کیا گیا' جو اس کے اشتہار کے جواب میں آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ بھی اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتی ہے اور تجویز پیش کرتی ہے کہ وہ بدھ کے روز چھ بجے شام سینٹ نیکولائی چرچ کے بڑے گیٹ پر میں ملے۔ اس نے نہ تو پتہ نہ فون نمبر دیا تھا۔

وہ بدھ کے روز وقت سے بہت پہلے سینٹ نکولائی کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہیلگا کو پہلی ہی نظر میں پہچان جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس روز سردی سے بچنے کو آئی' سر ڈھانپے ہوئے ہوئی اور کسی اور رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے ہوئی' تو واضح ہے کہ پہچاننا مشکل ہوگا۔ اس روز برفباری ہو رہی تھی اور ٹریفک بالکل جام ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لیے خدشہ تھا کہ شاید ہیلگا وقت مقررہ پر نہ آ سکے گی۔

عین چھ بجے ایک لڑکی گیٹ پر پہنچ گئی جس کی ہیلگا کے ساتھ قطعاً کوئی مشابہت نہ تھی۔ وہ اس سے قد میں اور شاید عمر میں بھی بڑی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور پوچھا کہ کیا وہ اس کا انتظار کر رہا تھا؟ واضح تھا کہ خط اس نے لکھا تھا۔ اس لیے انکار کرنے میں کوئی تک نہ تھی۔ ہیلگا نے شاید اس کا اشتہار نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا تھا تو اس نے جواب دینا پسند نہ کیا تھا۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا اور اپنا نام انگے بتایا۔ اس نے کسی نزدیکی کیفے میں چلنے کی تجویز پیش کی' جہاں پر بیٹھ کر بات کی جا سکے۔ عین اس وقت برفباری تیز تیز ہو گئی۔ اس نے چھتری کھول کر تان لی۔ انگے بھی اس کے نیچے آ گئی اور اس نے اس کے بازو کے اندر اپنا بازو ڈال کر اسے تھام لیا۔ اس کی اس بے تکلفی میں کوئی اوپراپن نہ تھا' یوں لگتا تھا جیسے وہ عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہی انداز انگے کے بات کرنے میں نمایاں تھا۔ جب اس نے پوچھا کہ اس نے اس کے اشتہار کے جواب میں کیوں لکھا تھا' تو انگے نے قہقہہ لگا کر کہا کہ کیا وہ سچ مچ کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو کھو گئی تھی؟ گویا اس کے نزدیک اس کا اشتہار بھی محض ایک بہانہ تھا کسی لڑکی سے ملنے کا۔ اس نے کہا کہ ان کی دوستی کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جا رہی ہے۔ اس پر انگے نے جواب دیا کہ یہی دنیا کا دستور ہے اور یہ کہ اسے پھلوں سے غرض رکھنی چاہیے نہ کہ درختوں کی گنتی ہے۔ یوں بھی ہر چیز کا انحصار اتفاق پر ہے۔ اگر اس نے اتفاقیہ طور پر اس کا اشتہار نہ پڑھا ہوتا' تو وہ اس وقت پہلو بہ پہلو نہ چل رہے ہوتے۔ وہ جان گیا کہ ان کی دوستی بہت دور تک نہ چل سکے گی۔

کیفے میں اوورکوٹ، ٹوپیاں، مفلر اور دستانے اتار کر جب وہ آمنے سامنے بیٹھے، تو اس نے پہلی بار انگے کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اسے ان میں عیاری کی جھلک دکھائی نہ دی جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔ انگے نے کسی ڈری ہوئی ہرنی کی طرح اس کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو کہ میں نے کیا کیا ہے؟ کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ اس عرصے میں اس بات کو نظر انداز کر چکا تھا اور کبھی کا انگے کے حق میں فیصلہ دے چکا تھا۔ ہیلگا، یہ تو خیر کلی کی طرح تھی، جب کہ انگے ایک کھلا ہوا پھول تھی جس کی خوشبو اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی جرأت کی داد دے رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا، کہ اس طرح ان کی ملاقات کا بہانہ پیدا ہوا تھا۔ انگے کا باتیں کرنے کا انداز جداگانہ تھا۔ اس کا ہر فقرہ بظاہر بے ساختہ مگر در حقیقت ایک سوچی سمجھی سکیم کا حصہ ہوتا تھا۔ اس نے جلد ہی جان لیا کہ انگے کسی شطرنج کے کھلاڑی کی طرح تھی، جو کوئی مہرہ حرکت دینے سے پہلے اپنے مد مقابل کی ساری ممکنہ چالوں کا جائزہ لیتی تھی۔ اس لیے اس بات پر اسے حیرت نہ ہوئی، جب انگے نے کہا کہ دونوں کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دیں ورنہ انکار کر دیں۔ اسے یہ جاننے کا شوق نہیں تھا کہ ہیلگا کون تھی اور اس کی ملاقات اس کے ساتھ کہاں پر اور کن حالات میں ہوئی تھی۔

البتہ وہ انگے کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا، جس کی کلاسیکل موسیقی میں دلچسپی کا اظہار کھل سے ہو چکا تھا کہ وہ اس شام کو کھیلے جانے والے اوپیرا ''ڈون جوانی'' کے لیے دو ٹکٹ ریزرو کروا کے آئی تھی۔ اس لیے دوسری باتوں میں پڑنے سے قبل انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا وہ اوپیرا ہاؤس میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اگر ایسا تھا تو انہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ باتیں کرنے کے لیے اور ایک دوسرے کو جاننے کے لیے بہت وقت پڑا تھا۔ رستے میں انگے نے بتایا کہ وہ ہر ہفتے میں ایک دو بار موسیقی کے کسی پروگرام میں ضرور جاتی تھی۔ تو کیا وہ خود بھی موسیقی میں دسترس رکھتی تھی اور کسی آلۂ موسیقی کو بجانے کی مہارت رکھتی تھی؟ واضح ہے کہ اس کے مثبت جواب کا یہ مطلب تھا کہ انگے کا تعلق کسی علم و ثقافت میں دلچسپی رکھنے والے گھرانے سے تھا۔ وائلن بجانے کی تربیت اس نے ایک پرائیوٹ مؤدب سے حاصل کی تھی۔ مگر اس بات پر بہت وقت گزر چکا تھا۔ ان دنوں میں وہ ایک جمنازیم کی طالبہ تھی۔ پھر تو اس نے جمنازیم کو پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم بھی حاصل کی ہو گی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ موسیقی کی طالبہ رہی ہو؟ یونیورسٹی میں اس نے موسیقی کی نہیں، بلکہ مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ تو کیا وہ مصورہ تھی اور اپنی روزی تصویریں بیچ کر کماتی تھی؟ ہاں وہ مصورہ ضرور تھی، مگر اپنی روزی تصویریں بیچ کر نہیں بلکہ ایک دوسرے کاروبار سے ذریعے کماتی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ کاروبار کی نوعیت کے بارے میں سوال کا جواب نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے اس نے سلسلہ سوالات کو روک دیا۔

اوپیرا ہاؤس میں انگے ہر کسی کو جانتی تھی۔ وارڈ روب والی عورت سے لے کر ٹکٹ چیک کرنے

والے مرد اور وقفے کے دوران ریفریشمنٹ بیچنے والے تک ہر کسی نے اس کا نام لے کر استقبال کیا وہ اس بات سے بے حد مرعوب ہوا۔ کیوں کہ اس کے لیے اوپیرا ہاؤس ثقافتی معبد خانے سے کم نہ تھا۔ مگر جب انگے نے اس کا تعارف اپنے واقف کاروں سے کروانا شروع کیا' جو معلوم ہوتا تھا اس کی طرح اوپیرا کے مستقل تماشائیوں میں سے تھے تو اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے' جن کا تعلق انگے کی ذات سے تھا۔ اگر مرد لوگوں میں مقبول ہو' تو اس بات کو اس کی کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے' جب کہ عورت کی مقبولیت کو اس کے کردار کی کمزوری کی نشانی قرار دیا جاتا ہے۔ اور انگے کے واقف کاروں میں عورتیں کم اور مرد زیادہ تھے۔ اس کے دل میں یہ سوال اٹھنے لگا کہ اتنے مردوں کے ہوتے ہوئے انگے کو اس کے ساتھ واقفیت پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے پتہ تھا کہ وہ اس سوال کو انگے کے سامنے نہیں رکھ سکتا تھا۔

اوپیرا کے بعد وہ ایک وائن ہاؤس میں جا کر بیٹھے بیرا آرڈر لے کر گیا' مگر بیچ خود مشروبات لے کر آیا اور انگے کے ایک عرصے کے بعد اس کی دکان میں آنے پر خوش آمدید کہہ کر گیا۔ اس بات سے اس نے جان لیا کہ انگے عام قسم کی عورت نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت مشہور یا بہت امیر ہو' بہر صورت وہ اس کی ٹکر کا آدمی نہ تھا' مالی طور پر نہیں اور معاشرتی حیثیت کے اعتبار سے نہیں۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے کہ شاید اس کو کسی سکیم کے تحت پھانسا جا رہا تھا' کسی غیر قانونی کارروائی کی خاطر۔ آخر اخباروں میں آئے دن انسان خبریں دیکھتا ہے کہ کس طرح لوگوں کو بے خبری میں کسی معاملے میں ملوث کر لیا جاتا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کو بے حد محتاط ہونا چاہیے اور کسی صورت میں اپنا نام یا پتہ نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے جب نصف شب کو وائن ہاؤس سے نکلے تو اس نے انگے سے رخصت چاہی' جو اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے نہ تو اپنا فون نمبر دیا اور نہ ہی انگے کا نوٹ کیا' بلکہ جلدی سے یہ کہہ کر چل دیا کہ مزید رابطہ کرنا ہوا' تو اسی اخبار میں سنیچر کے روز اشتہار دے کر کیا جا سکتا تھا۔ انگے اس کے اس اقدام پر اسی طرح حیران ہوئی جیسے وہ اس وقت حیران ہوا تھا۔ جب ہیلگا کی جگہ پر انگے سینٹ نکولائی چرچ کے گیٹ پر نمودار ہوئی تھی۔

دو ہفتوں کے وقفے کے بعد' جس کے دوران نہ اس کی طرف سے اور نہ ہی انگے کی طرف سے اخبار میں اشتہار چھپوایا گیا تھا' ہیلگا کا اشتہار چھپا' جس میں سینٹ نیکولائی چرچ میں کرسمس کی رات کو نصف شب سروس کے بعد بچھڑنے کا حوالہ دے کر رابطہ قائم کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ اشتہار انگے کی طرف سے ہو سکتا تھا' جس سے نہ ملنے کا وہ تہیہ کر چکا تھا۔ لیکن اگر اشتہار سچ مچ ہیلگا کی طرف سے ہوا' تو ایک زریں موقعہ اس سے ملاقات کا ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اخبار کی معرفت ہیلگا کے نام خط لکھا اور اسے اس ریستوران میں اگلے اتوار کو آنے کو کہا' جہاں پر ان کی ملاقات 24 دسمبر کے روز ہوئی تھی۔ چونکہ اس ریستوران کے بارے میں اس نے انگے کو نہیں بتایا تھا' اس لیے اگر اشتہار

اس کی طرف سے ہوا تو وہ مقررہ جگہ پر نہ پہنچ سکے گی البتہ اشتہار ہیلگا کا ہوا تو وہ فوراً جان جائے گی کہ وہ اسکو کہاں پر مل سکتی تھی۔

اتوار کے روز وہ مقررہ وقت سے تھوڑا پہلے ریستوران میں پہنچ گیا اور عین اسی میز پر جا کر بیٹھ گیا جس پر وہ اور ہیلگا چوبیس دسمبر کے روز ایک دوسرے کو ملے تھے۔ مگر ہیلگا کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس گھڑی اس کا وہاں پر انتظار ہو رہا تھا کیونکہ اشتہار انگے نے چھپوایا تھا۔ اور انگے وہاں پر نہ آ سکتی تھی کیونکہ وہ ریستوران سے ناواقف تھی ایسے وقتوں میں بسا اوقات حسن اتفاق آڑے آ جاتا ہے اور کہانی کو وقت سے پہلے ختم ہونے سے بچا لیتا ہے۔ اس روز بھی یہی ہوا اور ایک لڑکی آن نکلی جو اپنے قد بت کے لحاظ سے ہیلگا کی ہمزاد لگتی تھی مگر اس سے کہیں زیادہ پر اعتماد تھی۔ اس نے اسے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور اس امر پر قدرے حیران بھی ہوا کہ وہ سیدھی اس میز کے پاس آن کر رکی۔ جہاں پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے سلام کیا اور پوچھا کہ آیا اس میز کی کوئی کرسی خالی تھی اور کیا اسے اس پر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اس نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اس کی اپنی کرسی کے سوا باقی تینوں کرسیاں خالی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ اس پر بیٹھ سکتی تھی۔ لڑکی نے بیٹھتے ہی کہا کہ وہ یقیناً مینو کا مطالعہ کر چکا ہوگا اور اسے مشورہ دے سکے گا کہ اسے کیا آرڈر دینا چاہیے۔

اس نے بہت ضبط کرنے کی کوشش کی مگر اس کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے کہا کہ اگر محترمہ کا نام اب ہیلگا نکل آیا تو غضب ہو جائے گا۔ لڑکی نے اس کا سبب جاننا چاہا اور بتایا کہ اس کا نام کرسٹینا تھا۔ اس نے سارا ماجرا سنایا اور بتایا کہ وہ اس روز وہاں پر ہیلگا سے ملنے کی توقع لے کر آیا تھا۔ کرسٹینا بھی اس اتفاق پر حیران ہوئی اور سنانے لگی کہ کئی سال پہلے اسی ریستوران میں اس کی ملاقات اپنے بعد میں ہونے والے شوہر کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اتوار کا دن تھا اور اسے خوب یاد تھا کہ اس روز بندرگاہ کی سات سو بہترویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ شہر میں اور بالخصوص بندرگاہ کے علاقے میں موسیقی، سائیکل ریسلنگ اور کشتیوں کی ریگاٹا کے پروگرام ہو رہے تھے، جن کو دیکھنے کے لیے لاکھوں تماشائی دور و نزدیک سے آئے ہوئے تھے۔ اسے اس شہر میں رہتے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا اور کسی لڑکے کے ساتھ اس کی دوستی نہ تھی، جس کی معیت میں وہ ان پروگراموں کو دیکھنے کے لیے جاتی۔ اس لیے اسے بے حد خوشی ہوئی تھی، جب ریستوران میں ایک نوجوان اس کی میز پر بیٹھنے کا خواہشمند ہوا اور بتانے لگا کہ وہ بندرگاہ کے جشن کے پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے شہر میں آیا تھا۔ پھر اس نے خود ہی تجویز پیش کر دی کہ اگر وہ چاہے تو وہ اس کی ہمراہی کے لیے تیار تھا۔ پھر یہ ہمراہی اتنے لمبے عرصے تک قائم رہی کہ دوستی میں بدلی اور بالآخر ان کی شادی پر منتج ہوئی۔

کھانے کے دوران کرسٹینا نے بتایا کہ وہ اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر رہی تھی اور اس روز

ایک فلیٹ کرائے پر لینے کے لیے دیکھنے جا رہی تھی۔ اس نے کرستینا سے ہمدردی کا اظہار کیا اور معذرت کرتے ہوئے کہ وہ اس کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کا مرتکب ہو رہا تھا، اس نے اپنے خاوند سے علیحدہ ہو جانے کا سبب جاننے کا خواہش مند ہوا۔ کرستینا نے کہا کہ وہ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچاتی نہیں تھی مگر اسے یقین نہیں تھا کہ کوئی غیر متعلقہ شخص ان وجوہات کو پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس کے خاوند کا سلوک اس کے ساتھ قطعاً غیر منصفانہ نہ تھا، نہ ہی مالی مشکلات اس کا سبب تھیں۔ معمولی جھگڑا تک نہ ہوا تھا اس کے باوجود وہ اپنے خاوند سے علیحدگی چاہتی تھی۔

اس نے پوچھا کہ کیا کرستینا کے خاوند نے کسی دوسری عورت کی طرف رغبت ظاہر کی تھی یا شاید وہ کرستینا کو کوئی اور مرد مل گیا تھا؟ کرستینا نے بتایا کہ اس کے دونوں مفروضے درست نہیں تھے۔ اس کا خاوند اس سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا تک نہ تھا۔ اور نہ ہی اس نے اتنے سالوں کے دوران اپنے خاوند سے بے وفائی نہ کی تھی۔ دراصل اس کے خاوند کی بے پناہ محبت نے اس کو بیچ کر رکھ دیا تھا۔ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے گرد گھومتی تھی، جس میں کسی تیسرے کے لیے حتیٰ کہ ایک بچے تک کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ انہوں نے شروع سے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ بچہ پیدا نہیں ہونے دیں گے تاکہ وہ اپنی محبت کو ایک دوسرے پر مرتکز کر سکیں۔

اس کا خیال تھا کہ ان کے مسئلہ کا حل آسان تھا۔ جس چیز کی کمی ان کے باہمی تعلقات میں تھی وہ ایک بچے کا وجود تھا۔ دونوں جوان اور تندرست تھے اور بچہ پیدا ہونے میں اگر کوئی طبی رکاوٹ نہیں تھی تو انہیں اس نسخے پر عمل کرنا چاہیے۔ کرستینا نے بتایا کہ انہوں نے اس عرصے میں ماہرین نفسیات سے بھی مشورہ کیا تھا، اور آخرکار اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کے مسئلے کا کوئی اور حل سوائے علیحدگی کے نہ پایا جاتا تھا۔ کرستینا اندرونی طور پر اپنے خاوند سے اس حد تک دور جا چکی تھی کہ وہ اس کے بدنی قرب کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

اس شام وہ کرستینا کے ہمراہ فلیٹ دیکھنے کے لیے گیا، جو دونوں کو پسند آیا اور اسے کرائے پر لے لیا گیا۔ چونکہ کرستینا کا اس شہر میں اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس لیے وہ اس کے کہنے پر ہوٹل سے اس کے ہاں اٹھ آئی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ جونہی اس کا سامان نئے فلیٹ میں منتقل ہو جائے گا، وہ وہاں پر چلی جائے گی۔ اس طرح انہیں ایک پورا ہفتہ اکٹھے رہنے اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ دونوں کی عادات میں بہت نمایاں فرق تھا۔ مثلاً کرستینا سگریٹ پیتی تھی، جب کہ وہ تمباکو کا دھواں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے رات کو دیر سے سونے اور صبح دیر سے جاگنے کی عادت تھی۔ اس کے برعکس کرستینا کی آنکھیں شام کو نو دس بجے بند ہونے لگتی تھیں اور وہ صبح سویرے مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ بیدار ہو جاتی تھی۔ اسے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور ٹیلی ویژن کو صرف خبریں دیکھنے کے لیے لگاتا تھا۔ کرستینا کا دیوانے فلم کو دیکھنا

چاہتی تھی۔ وہ فرانسیسی شانساؤں گیت سننے کا رسیا تھا' اور کرستینا کے ٹیپ ریکارڈ سے دن رات سننے والی
دوسرے گیت بجتے رہتے تھے۔ جب ایک ہفتے کے بعد کرستینا اپنے فلیٹ میں منتقل ہوئی' تو ... نے
اطمینان کا سانس لیا۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے ایک دوسرے سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ ہفتے میں ایک ...
مل بیٹھتے تھے۔ کسی اچھے سے ریستوراں میں جا کر کھانا کھاتے تھے' کبھی کبھار فلم دیکھنے جاتے تھے۔ اور گاہے
گاہے تھیٹر یا اوپیرا میں چلے جاتے تھے اس کی توقع کے برعکس اس کا سامنا اوپیرا یا میوزک ہال میں بھی ...
کے ساتھ نہیں ہوا' ... کرستینا کم از کم ایک بار دیکھنے کی خواہش رکھتی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ یہ خیال پیدا
ہونے لگا تھا ... اور ہیلگا کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا اور ساری کہانی اس کے دماغ کی اپج تھی۔
دراصل کرستینا کو اندر ہی اندر اس سے محبت ہو چکی تھی' مگر وہ اس کا اظہار کرنے سے کتراتی تھی۔ ... ا ے
پتہ تھا کہ وہ ... اور پانی کی طرح ایک دوسرے سے مختلف تھے اور محض اتفاق کی بدولت ایک دوسرے
کے اس قدر قریب آ گئے تھے۔

انہی دنوں میں کرستینا کے بچپن کی سہیلی ایلکے کہیں سے آن نکلی۔ وہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ
تھی۔ نکلتا ہوا قد' متناسب ہاتھ پاؤں' ترشے ہوئے خدوخال' لگتا تھا کہ قدرت نے ... تخلیق پر خاص
توجہ برتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ایلکے کا حسن ... پر جادو کر گیا۔ پھر یہ جان کر ... خوشی ہوئی کہ کرستینا
نے ایلکے کو اپنے فلیٹ میں رہنے کی دعوت دی تھی۔ بہت جلد وہ وہاں پر منتقل ہو گئی' جس کے بعد تینوں اپنے
فراغت کے اوقات مل کر گزارنے لگے۔ کرستینا کوئی کام کل پر اٹھا کر رکھنے کی قائل نہ تھی اور عملی کاموں
میں بے حد مستعد تھی۔ جب کہ ایلکے کے اندر چیزوں کو جاننے اور ان کے پس منظر میں دیکھنے کا جذبہ جنون کی
حد تک پایا جاتا تھا۔ اس نے سالہا سال کی محنت و مشقت کے نتیجے میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے
لیے ضروری امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کر لیے تھے۔ اس کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے کرستینا نے
بھی وہی رستہ اختیار کر لیا۔ اور بالآخر دونوں کو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

اس عرصے میں کرستینا نے اپنے خاوند روبرٹ سے طلاق حاصل کر لی تھی۔ مگر ان سے ...
دوستانہ تعلقات بدستور قائم رہے اور ان کا آپس میں باقاعدگی کے ساتھ ملنا ہوتا تھا۔ دونوں نے اپنی
شادی کے دوران ایک مکان تعمیر کیا تھا جس میں طلاق کے بعد روبرٹ اکیلا رہ گیا تھا' اگرچہ مکان کی نصف
ملکیت کرستینا کی تھی' اور وہ گاہے بگاہے وہاں پر جا کر ٹھہرتی تھی' تاکہ اس کے حق ملکیت کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔
کرستینا اپنے ساتھ اکثر ایلکے کو لے جایا کرتی تھی۔ بالآخر تینوں نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ کرستینا اور ایلکے
اپنا کرائے کا فلیٹ چھوڑ کر روبرٹ کے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ روبرٹ اس کے لیے ایک ... تھا
تھا' جس کے ساتھ اس کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ جو کچھ اسے روبرٹ کے بارے میں پتہ تھا وہ ...

اور ایلیے کا بتایا ہوا تھا دونوں نے اس کی نیک سیرت کے متعلق اتنے قصیدے گائے تھے کہ اس نے روبروٹ کو ''سینٹ'' کا لقب دے دیا تھا' جسے اس دنیا سے اور اس کے ارضی واردات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دونوں عورتوں نے اسے باور کرنے کی کوشش کی تھی' کہ روبرٹ ان کے لیے محض ایک دوست تھا' جس کا مرد ہونا بس ایک اتفاقی حادثہ تھا۔

کرسٹینا اور ایلیے کے ساتھ اس کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار ملتے تھے اور گھنٹوں مشترکہ دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ثقافتی پروگراموں میں شامل ہوتے تھے' سیمیناروں اور لیکچروں میں اکٹھے جاتے تھے۔ اور تینوں کو یہ احساس تھا کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ البتہ کرسٹینا نے پہلے سے بڑھ کر اس کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب کہ اس کے دل میں ایلیے کے لیے پیار کا ایک سمندر موجزن تھا مگر ایلیے کی طرف سے دوستی کے عام جذبے سے بڑھ کر کوئی ردعمل نہ ہوتا تھا۔

ایلیے ایک عجیب و غریب لڑکی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد ایک غیر مرئی دیوار بنا رکھی تھی جو اس تک رسائی کے رستے میں بہت مضبوط رکاوٹ تھی۔ وہ اپنے اندر کی کوئی خبر باہر نہ نکلنے دیتی تھی۔ اس کے دلی جذبات کو جاننے کے لیے انسان کا زلزلے کی پیش گوئی کرنے والے آلے کی طرح حساس ہونا ضروری تھا۔ بعض اوقات ایک بالکل غیر متعلقہ چیز کے بارے میں کہی جانے والی بات انسان کے اندرونی احساسات کو سمجھنے میں بے حد مد ہو سکتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایلیے کے ذاتی ذخیرہ الفاظ اور اس کے استعمال کے موقعہ و محل کا اس حد تک احاطہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی مدد سے ایلیے کی ان باتوں کو بھی سمجھنے لگ گیا تھا' جن کے بارے میں ایک لفظ بھی اس کے لبوں پر نہ آتا تھا۔

وہ یہ امر جان گیا کہ ایلیے کو روبروٹ سے پیار تھا' جس کا اظہار کرنے سے وہ کتراتی تھی' شاید اس امر کا اظہار کر ہی نہ سکتی تھی۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ روبرٹ بدستور کرسٹینا پر عاشق تھا' جو کسی طور پر اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا' اگر چہ کرسٹینا کی طرف سے اسے کوئی امید افزا جواب نہ مل رہا تھا۔ روبروٹ اپنے پیار کی بھٹی میں جل رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس سے کیسے نجات پائے چاروں ایک شیطانی چکر میں جکڑے ہوئے تھے۔ کسی تھرڈ کلاس سوپ اوپیرا کی طرح ان میں سے ہر کوئی غلط عورت یا غلط مرد سے پیار کرتا تھا۔ کرسٹینا اسے چاہتی تھی' وہ ایلیے سے پیار کرتا تھا' ایلیے روبروٹ کی دیوانی تھی اور روبروٹ کرسٹینا کو نہ بھول سکتا تھا۔

پچھلے ہفتے چوبیس دسمبر کے روز وہ ایلیے اور کرسٹینا کے لیے کرسمس کے تحفے خریدنے کی خاطر ایک کتب خانے میں گیا' جہاں پر اس کی طرح آخری منٹ پر تحفے خریدنے والوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔

• اچانک اس کی نظر ہیلگا پر پڑی' جو ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی ہیلگا نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ مگر ایک دوسرے کے بازوؤں میں گر جانے کی بجائے دونوں نے اپنی اپنی نظریں جھکا لیں۔ ان کے درمیان بیگانگی کی خلیج جم چکی تھی

(کمر فیلڈ۔ 31 دسمبر۔ 1990)

جہاں میں رہتا ہوں

مہندر ناتھ

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں؟ وہ کون سا مضمون ہے جس پر مصنفوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ میں عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتا؟ یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا ہے اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق تو لکھا ہے۔ اب میرا جی خود ان باتوں سے اکتا گیا ہے لیکن خدا کے لئے مجھے اس طرف نہ دھکیلو۔ مجھے اپنے متعلق لکھنے دو۔۔۔ مجھے اپنی اداسی، اپنے غم، اپنے دکھ کے متعلق لکھنے دو۔ شاید تم اس اداسی، اس غم اس یاسیت میں ہندوستان کی اداس روح کی جھلک دیکھ سکو۔

یہ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ میں کتنی دور سے چل کر آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر، پنجاب کے حسن سے مرعوب ہو کر، دہلی اور لکھنو کا چکر لگا کر اور پونا کے طرب سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں، آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں لیکن پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا' راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی۔۔۔

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ لوگوں نے سڑکوں، بسوں اور ریلوں کی تعریف کی ہے، مگر میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ ہاں! جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر اور دور ۔۔۔ بہت دور ۔۔۔ ایک کشتی لہروں پہ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رخ کئے ہوئے چلی جاتی ہے اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈ کے جھنڈ۔۔ ناریل کے درخت کافی لمبے ہوتے ہیں۔ شاید سرو اور یوکلپٹس سے بھی

درختوں سے لمبے اور اونچے۔۔۔ یہ درخت ہر وقت ہوا میں جھومتے ہیں۔ آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے ہو کر گزرتی ہے تو ایک عجیب سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتے جھومتے ہیں، کسی جوان لڑکی کے پریشان بالوں کی طرح۔۔۔ چاند شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان درختوں کے پیچھے چھپ رہتا ہے۔ لیکن چاند کی سیمیں کرنیں سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں، لہروں کو چومتی ہیں، کھیلتی ہیں، لہریں بڑھتی ہیں، کھیلتی ہیں، ریت کے ذرے بکھرتے ہیں، چمکتے ہیں اور سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اداس نغمہ پیدا کرتی ہے۔۔۔

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں۔ سمندر، ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرسیں۔۔۔ اصل میں ان تین چیزوں سے بمبئی زندہ ہے۔ اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی بمبئی نہ رہے۔ شاید دہلی بن جائے یا لاہور یا ایک ایسا ہی معمولی سا شہر۔۔۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کی وجہ تم جانتے ہو، وہی روزگار کی تلاش، پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا مسئلہ ہے مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا اور جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے گا، یہ جنگ رہے گی، یہ بھوک رہے گی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں۔ آخر کھانے کو تو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے، کہیں نہ کہیں تمہارے جیسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے ادھار لیتا ہوں، لیکن یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہہ دو یہ کمینگی ہے، ہو گی بھوک ہی کمینگی سکھاتی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالیشان محل تیار کرتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ جابر کمزور کو مار کر سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر حکومت کرتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لیتا ہوں اور پھر واپس نہیں کرتا تو میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں اور میں ہر گام، ہر قدم، ہر منٹ، ہر سیکنڈ ان قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں اور ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں، چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار۔۔۔

پہلے میں شیوا جی پارک میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی محبوب ترین جگہ ہے۔ شیوا جی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کے ہر نکڑ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دکان پر یا ایرانی کی دکان پر تم ایکٹروں کو دیکھو گے۔ یہ لوگ اتنے عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جتنا تم، یا میں۔ یہاں آ کر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو

دیکھنے کے لئے دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہر روز تم انہیں دیکھ سکتے ہو اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یوں پروتما گپتا کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی چھوڑو ان ایکٹرسوں کو۔۔۔ یہاں درد سر مول لیتے ہو، بچاری اب بہت موٹی ہو گئی ہے۔ کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ [illegible] ہو بھی تو۔۔۔ شاید مہتاب تمہیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں وہی عورت ہے جسے جوان کہا جا سکتا ہے باقی تو پھول کر کپا ہو گئی ہیں۔ دراصل ہندوستان میں ایکٹرسیں اپنے جسموں کا خیال نہیں رکھتیں ایک بار ایکٹرس بن گئیں اور ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں [illegible] نہ کمر ہی نہ لچک، نہ آنکھوں میں شوخی، چہرے پر گوشت چڑھنے لگا، کولھے اتنے چپٹے [illegible] اور آخر پھیلتے پھیلتے جسم کپا بن گئیں۔ اور اب بتاؤ۔۔۔ کیا کرو گے تم ان کا [illegible] کل ہی میں نے "Metro" کے سامنے ایک اشتہار دیکھا جس میں مغربی [illegible] ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ اف کیا ٹانگیں تھیں۔ کتنی سڈول، جیسے سانچے میں ڈھلی ہوں۔ کتنی خوبصورت۔۔۔ کتنی پُرفریب جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ سارا ہندوستان چھان ڈالو ایسی خوبصورت ٹانگیں نہ ملیں گی۔ یہاں ان لوگوں سے رہنا سہنا سیکھو۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورتی کس چیز کا نام ہے؟ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورت ٹانگیں کیسے تیار ہوتی ہیں؟ سڈول بازو کہاں سے ملتے ہیں؟ یہ گرو "Curve" ، یہ حسین، جوان، خوبصورت "Curve" جو عورت کی خوبصورتی کی روح ہوتی ہے، کہاں سے آتی ہے؟ کس طرح بنتی ہے؟ اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کہو گے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے، ان لوگوں میں اتنی توفیق کہاں جو وہ اپنے جسموں کا خیال رکھیں؟ لیکن ان ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ تو غریب نہیں یہ توہزاروں روپے کماتی ہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ انہیں بھی خوبصورتی کا احساس نہیں، ہماری عورتیں تو پھول کر کپا ہونا جانتی ہیں اور جب پھول کر کپا ہو گئیں تو سمجھ لو "نروان" حاصل کر لیا۔

اور جہاں کہیں خوبصورت عورت نظر آتی ہے، وہ اپنے آپ کو، اپنی ٹانگوں کو اتنا چھپا کر رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی نظریں ادھر نہ جا سکیں۔ ہمیں تو زندہ رہنے کی بھی تمیز نہیں۔ جمالیات کا پاس نہیں، ہمیں ان لوگوں سے سیکھنا چاہیے۔

ارے بھائی! پروتما کا ذکر کرنے میں ادھر ادھر بہک گیا اور ہالی وڈ کی خوبصورت ٹانگوں کا ذکر کرنے لگا۔ اگر تم واقعی ان خوبصورت ایکٹرسوں سے ملنے کے لئے اتنے بے تاب ہو رہے ہو تو سیدھے بمبئی چلے آؤ۔ میں بمبئی کی مشہور ایکٹرسوں سے تمہارا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ بھی شہرت کے اتنے بھوکے ہیں جتنے ہم یا تم۔ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ میں یوں ہی ایکٹرسوں

کے جھمیلے میں پھنس گیا۔ کر رہا تھا ذکر اپنا، بیچ میں بیچاری ایکٹرس آ گئی۔ تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں رہتا ہوں؟ میں پہلے شیوا جی پارک میں رہتا تھا، وہاں سے کیوں چلا آیا؟ اس کی وجہ تمہیں بتاتا ہوں۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ دشمن۔۔۔ میرا دوست جس کا نام تم "R" رکھ لو، ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے۔ جسم دیکھو تو جی پھڑک اٹھے۔ورزش کا بہت شوقین۔۔۔ اکثر وہ دن رات ورزش کرتا ہے۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ دراصل اس کا خواب حقیقت بن چکا ہے۔ بیچارے میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ عورت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف دیکھتا ہوں تو اکثر وہ اس فعل کو برا بتاتا ہے۔ کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نظریہ درست ہے۔ آخر یوں ہی اپنے دل و دماغ کو خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل! بہتر یہ ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنٹر پیلے جائیں، من یا وزنی پتھر ہر روز اٹھایا جائے اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی لہروں کو تکتا رہے، جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی، یا لہریں ہی لہریں۔۔۔ دور۔۔۔ نظروں سے دور۔۔۔ سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چھوتا ہے، اور آخر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی، آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل، اور ٹھنڈی، تازہ زندہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی، ور ناریل کے درخت اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو۔۔۔ ان کو چھوڑ کر عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے، سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھ لو تو یہی کہو گے کہ کتنا اچھا حسین ترشا ہوا بت ہے۔ بالکل یونانی مجسمے کی طرح حسین اور خوبصورت۔۔۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی ہریالاہٹ ہے اور اس کے رخساروں کی رنگت سیبوں کی طرح سرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو تو اس کے جسم سے ایک ہلکی ہلکی صحت مندانہ خوشبو نکلتی ہے جو مکھن، ٹماٹر، دودھ، دہی کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔ عورتیں میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں، ان کی نگاہوں میں تعریف ہوتی ہے وہ سوچتی ہیں کہ یہ بازو اتنے سڈول کیوں ہیں؟ اس کی آنکھوں میں اتنی چمک کیوں ہے؟ اس کا جسم اتنا متناسب کیوں ہے؟ لیکن میرا دوست عورت کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ نہ جانے اسے عورت سے کیوں چڑ ہے؟ اور جب عورت ایک حقیقت ہے تو حقیقت سے منہ موڑنا کہاں کی عقلمندی ہے صرف ورزش کرنا اور گھی کھانا اور ایک خوبصورت جسم بنانا ہی زندگی نہیں ہو سکتا۔

میری طرف دیکھ لو، میں ورزش بھی کرتا ہوں اور صحت مند بھی رہنا چاہتا ہوں، لیکن میں

صرف Boxer بننا نہیں چاہتا۔ زندگی میں کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں مثال کے طور پر میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس بالکونی میں کھڑی رہتی ہے، کیا تم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا؟ دیکھا ہو گا، ضرور دیکھا ہو گا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم اپنے باغ میں چلے جاتے ہو اور ریشمی شبنمی گھاس پر ایک سفید چادر بچھا دیتے ہو اور اس چادر پر بیٹھ جاتے ہو چاند آکاش پر مسکراتا ہے اور اس کی روپہلی کرنوں میں تم نہاتے ہو، ٹھنڈی اور برفاب کرنیں، گھنٹوں تم ان کرنوں میں نہاتے رہتے ہو۔ پھولوں کی خوشبو سے اپنے جسم کو بھگوتے ہو اور بڑی بڑی گھاس کو چومتے رہتے ہو۔ یہ تم کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف کبھی دیکھا؟ وہ بھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی خوشبو نکلتی ہے۔ بہت ہی پیاری اور کتنی حسین۔ بالکل اس چاند کی طرح خوبصورت اور حسین——— تمہارے دل میں چاند کو چھونے کی خواہش پیدا ہوتی ہو گی۔ چاند تو خوشی اور مسرت کا منبع اعظم ہے۔ میں بھی اپنے چاند کو چھونا چاہتا ہوں اس خوشی میں نہانا چاہتا ہوں۔ اس مسرت کو اپنانا چاہتا ہوں، اس لڑکی کے قریب سے گزرنا چاہتا ہوں تا کہ اسے میرے وجود کا علم ہو جائے، تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ جو شخص ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہے اسے پسند کرتا ہے۔ اس عمل میں برائی کی بات کوئی نہیں یہ تو بالکل ایک ذاتی خواہش ہے۔

اور پھر میرے دوست کو ایک لانبے بالوں والی لڑکی سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اور اگر وہ ایک دن تمہیں دیکھنے کے لئے تمہارے کمرے میں چلی آئی تو اس میں غصہ ہونے کی کونسی بات تھی؟ اسے گھر سے نکالنے میں کون سی دانشمندی تھی؟ کیا اس حرکت کی لوگ تعریف کریں گے؟ کیا یہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہے؟ تم نے اس قسم کی حرکتیں کر کے اس کی خواہشوں کو کچل ڈالا، خوشی کے سرچشمے کو خشک کر دیا۔ وہ آج کل اداس اور غمگین کیوں نظر آتی ہے؟ اس کے رخسار آج کل کیوں زرد ہیں؟ وہ کیوں کھوئی کھوئی اور مغموم سی رہتی ہے؟ تم نے ورزش کی اور مکھن گھی کھا کر آرام کی نیند سو گئے لیکن اس کی راتوں کی نیند حرام ہوتی گئی۔ اور بچاری سوکھ کر کانٹا ہوتی گئی۔ میں اس قسم کی اخلاقی قدروں کو پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں جب تمہیں عورت کی ضرورت پڑتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟ تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو اور ٹھنڈے پانی کی ٹب میں نہاتے ہو۔ یہ کب تک کرتے رہو گے؟ اور اگر دنیا کے سب لوگ اسی فارمولے پر عمل کرنے لگیں تو زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو کر رہ جائے۔

تو ہاں! میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ ایک دن یک لڑکی میرے دوست کے کمرے میں آئی۔ میں بھی وہیں موجود تھا، لڑکی کو دیکھ کر میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ اس نے لڑکی کو

گالی دی، برا بھلا کہا۔۔۔ کہ وہ طوائف ہے، وہ ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بچاری بتی بکی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور ہم لوگوں سے دوستی کرنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم لوگوں کو وہ اچھی لگے اور پسند آئے۔ اس سے پہلے وہ ایک لونڈوں سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف جھک گئی مگر میرے دوست نے لڑکی کی بے عزتی کی اور گھر سے نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں پیشہ کراتی ہے، وہ کیوں اپنے جسم کو بیچتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں کو نہیں سمجھتا، اور اگر سمجھتا ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر، ایک ایسی عورت پر وار کرتا ہے جو نہتی ہے، جو اکیلی ہے، جس کا وارث کوئی نہیں، جس کی بے عزتی کا ذمہ دار سماج ہے، گورنمنٹ ہے، موجودہ سامراج ہے۔

طوائف کا مسئلہ۔۔۔ طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہو گا۔ بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں کو نوکری دینے سے، عورتوں کے لئے کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے اور عورت کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے ہو گا۔ جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں رہیں گی۔ آج بھی وہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی بلکہ میری بہن کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس میرے دوست نے اس لڑکی کے بے عزتی کر کے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی ایک دن اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہرآلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا، اس سے صاف عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ لگا کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہے جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہگیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے۔ کیا اس کے سینے کے ایک گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا خاوند ملے جو خوبصورت ہو، نیک ہو، جو کماتا ہو اور جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اور اگر زندگی میں یہ چیزیں میسر نہ ہو سکیں اور بھوک اور فاقوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو بیچنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور؟ وہ اداس شام مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا گیا۔

آجکل ماہم میں رہتا ہوں۔ سمرسٹ کا ماہم نہیں، منٹو کا ماہم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا

ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں۔ یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں۔ ہوا ناریل کے پتوں سے کھیلتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہوں۔ اکثر لوگ میری طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ لڑکا یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے؟ کیا اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟ اور میں ان کی طرف اس طرح دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان سے [illegible] ان کی بے بسی، ان کی لاچاری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن میں نے کبھی بتانے کی کوشش نہیں کی۔ میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے۔ میں اکثر [illegible] کو ادھر اُدھر پھرتے دیکھتا ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ پہلے یہ لڑکی [illegible] (Extra) [illegible] کا کام کرتی تھی پھر اس ایکٹر کو پسند آ گئی اور اب اس نے اسے گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کرتے ہیں اور پھر اپنی بیویوں کو گھر کی چاردیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ اکثر ان لڑکیوں نے آزاد زندگی [illegible] ایک انتہا سے نکل کر دوسری انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہاں وہ کھلم کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں، لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتیں۔ نتیجۃً بے بسی، ایک بے حیثیت [illegible] جو ہمیشہ ان کے اردگرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مبادا ان کا مرد انہیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے نہ دیکھ لے، اور ان کا پھر وہی حشر نہ ہو جائے جس سے اکتا کر انہوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کے چند سال بعد انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی اداسی ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ کبھی کبھی سامنے والے ایکٹر کی بیوی میری طرف جھانک کر دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی ہے، چہرے پر ڈر کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا زور زور سے چلتی ہے، کھڑکی کے پردے ہلتے ہیں، آنکھیں چمکتی ہیں، لمحہ بھر کے لئے، اور پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ماہم لاہور کی طرح گندا سڑا علاقہ ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سرخ فراک دیکھو کسی جوان لڑکی کا ہو گا۔ وہ سفید فراک دیکھ لو، یہ کتنا لمبا فراک ہے کسی بڑھیا کا ہو گا۔ رنگ برنگ کی ساڑھیاں، پائجامے، قمیصیں، دھوتیاں، ٹائیاں، بستر، چادریں جابجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ناریل کا درخت گرا ہوا ہے۔ چند دن ہوئے ہوا بہت زور سے چلی تھی جس کی وجہ سے ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی کے سامنے ایک چھوٹا سا

مندر دکھائی دیتا ہے، دراصل یہ مندر نہیں ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں۔ یہاں گوردوارے اور مسجدیں بھی کم دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں! شائد یہاں کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی تو انہوں نے یک گڑھا کھود کر اس میں یک پتھر رکھ دیا ہے اور اردگرد ٹین کی چادریں لگا دی ہیں۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گر پڑا تھا۔ میرا مطلب ہے بس خدا پر، لیکن درخت بھاری تھا، خدا کچھ نہ کر سکا، بچارا درخت کے بوجھ تلے دب گیا۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کافی مل جاتا ہے۔ نہیں تو اسی بات پر ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت کو گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی ہو۔ لیکن آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے۔۔۔ جب پیٹ بھرا ہو تو خدا بھی یاد نہیں آتا۔۔۔ مذہب۔۔۔ بچارا۔۔۔

میرا فلیٹ سیکنڈ فلور پر ہے اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو اردگرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ مکان کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بچارا بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے۔ گر خوبصورت ہوتی تو میں ضرور اس سے عشق کرتا۔ بچاری نہایت ہی بدصورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آ جاتی۔ اکثر وہ پھولوں کا گچھا اپنے جوڑے کے اردگرد باندھتی ہے۔ یہاں تم ہر لڑکی کو، ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے۔ عورت بیاہی ہوئی ہو یا کنواری لیکن پھول اس کی جان ہے۔ بغیر پھولوں کے تمہیں یہاں کوئی عورت دکھائی نہ دے گی۔ لیکن چہرے کے خطوط، ان کی چال ڈھال، ان کا رہن سہن بالکل عجیب ہے۔ کم از کم مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ کاش بمبئی کی عورتیں پھولوں سے کم محبت کرتیں تو شاید ان کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ جب ایک خوبصورت پھول کو دیکھنے کے بعد ایک بدنما چہرے پر نظر پڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ دونوں کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ بہرحال اس گجراتی عورت کو پھولوں سے محبت ہے۔ بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے اور شام ہونے کے بعد گھر آتا ہے۔ عورت دن بھر چارپائی پر پڑی رہتی ہے، بالکل اوندھی، اور سرہانے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے اور آجکل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ گجراتی خود تو باہر رہتا ہے اور نوکر دن بھر گھر میں رہتا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتن کو چومتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گجراتن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر پر لٹا لیا اور پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ شام کے وقت گجراتن پھر باہر نکلی، آج اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے حسن میں ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں پھول کھلے

ہوئے تھے۔ لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہو گئی۔ بوڑھے گجراتی کو عشق کا علم ہو گیا اور اس نے نوکر کو گھر سے نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی یاسیت ابھر آئی ہے، اس کی ہنسی میں اداسی ہے، اس کی باتوں میں غم کی جھلک ہے۔ وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اس کی ٹانگیں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہتے ہو گے کہ میں پھر محبت کا قصہ لے بیٹھا۔ سچ کہوں تو برا نہ مانو گے۔ میں ہر طریقے سے یہ کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ نہ لکھوں لیکن ہر بار جب لکھنے بیٹھتا ہوں عورت سامنے آجاتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بغیر افسانہ پھیکا رہے گا۔

لیکن آؤ۔ عورت کی دنیا سے تمہیں دور لے چلتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کرتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں، یعنی جس فلیٹ میں رہتا ہوں، وہ فلیٹ صرف ایک انسان کے رہنے کے لئے ہے لیکن آج کل اس فلیٹ میں پانچ انسان رہتے ہیں۔

میرے ساتھ ایک بنگالی نوجوان رہتا ہے، اس کا نام چٹرجی ہے، یہ بنگال کے ایک دورافتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آیا ہے تا کہ روزگار مل سکے اور وہ امن اور چین کی زندگی بسر کر سکے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے۔ وہ نہایت ہی دبلا اور پتلا ہے۔ اس کی ماں تپ دق سے مر گئی تھی۔ شاید اس کے چھریرے جسم میں تپدق کے جراثیم موجود ہیں۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں، اس کی آنکھوں میں پریشانی کی جھلک رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ لیکن چٹرجی نہایت چالاک آدمی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی کام نہیں ملا۔ وہ بمبئی میں اس لئے آیا تھا کہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے اس کا بھائی فوٹوگرافر ہے اور اس نے فوٹو کھینچنے کا کام بھائی کی دکان پر سیکھا تھا۔ اس کے بعد بمبئی کی طرف رخ کیا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی ہو کر اردو بول لیتا ہے۔ لیکن وہ ہندی بھی جانتا ہے، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول سکتا ہے۔ ایک بار اسے فلم میں جگہ ملی، لیکن کام اچھا نہ کرنے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ اب وہ ڈائریکٹر بننا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اکثر وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بار اسے زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار بھی۔ آگے ہی کیا توانا تھا کہ زکام اور بخار نے سے اور لاغر کر دیا۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا

س کی آنکھیں دھنس چکی ہیں۔ چہرہ زرد ہو چکا ہے اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن اس نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری۔ وہ ب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ضرور ڈائریکٹ کرے گا۔ کیا ہوا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں۔ کیا ہوا وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھا سکتا ہے۔ وہ فاقے کرے گا، وہ زندگی سے لڑے گا، وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں گر کوئی پروڈیوسر بننا چاہتا ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ کسی حسین خاتون کو پھانس لے، یا کوئی حسین خاتون سے پھانس لے۔ بس چند دنوں کے اندر وہ شخص پروڈیوسر بن جائے گا۔ لیکن چٹرجی خوبصورت نہ ہونے کے باوجود بھی پروڈیوسر بننا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی سمجھدار عورت اس پر عاشق نہیں ہو سکتی۔ اس سے عشق نہیں ہو سکتی، لیکن وہ بڑی دھن کا پکا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ اکثر وہ بمبئی کے اسٹوڈیوز کا چکر لگا کر تھک جاتا ہے اور پھر تھک کر اسے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے، اسے زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ خود کشی کرے گا۔ جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی ہوتی ہے، وہ ہنسی میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ اس ہنسی میں کتنی شکستیں پنہاں ہوتی ہیں جو رندہ ہو کر اس کے لبوں پر ناچتی ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، بمبئی کا ہر سینٹھ زندہ ہے، بمبئی کے ہر ہر ہوٹل میں روشنی کے قمقمے روشن ہیں۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں لوگ شراب پیتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں ہزاروں لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی رہتی ہے۔ ٹراموں، بسوں اورموٹروں کی آوازیں مدھم نہیں پڑتیں، لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اداس دکھائی دیتا ہے، اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے۔ آخر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد...؟ آج کل وہ کبھی کبھی کھاتا ہے، کیا اسکو تپ دق ہو گئی ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائریکٹر بن سکے گا؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی؟

میرے ساتھی اکثر چٹرجی کو چھیڑتے ہیں، اس سے مذاق کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کب ڈائریکٹر ہو گے؟ کب پروڈیوسر ہو گے؟ یہ بھی اس کے ساتھی ہیں جو خود بھی بھوکے مرتے ہیں، لیکن چٹرجی پر فقرے کسنے سے باز نہیں آتے اور جب زندگی میں اور کچھ نہیں کر سکتے تو سب مل کر چٹرجی کو گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں، محض اس لئے کہ اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے کہ وہ فلیٹ کے کرایے میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ وہ کثر دوسروں کا دست نگر رہتا ہے اور چٹرجی ان

سب کی گالیاں خاموشی سے سنتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے نکال دیا جائے تو وہ کہاں رات بسر کرے گا؟ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں بن سکتا۔ وہ غصے میں آ کر خط لکھنے لگتا ہے۔ کس کو؟ شاید اپنے باپ کو جس نے اسے پیدا کیا۔ شاید اپنی ماں کو جو اب دنیا میں نہیں تھی، یا اپنے بھائی کو جو ایک دورافتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ خط لکھتے جاؤ۔ دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چرچل کو خط لکھو، ٹرومین کو خط لکھو۔ کہ وہ تمہیں روپیہ بھیجیں، دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلائے۔ تم دنیا کے ہر بڑے انسان سے پوچھو کہ تم کیوں فاقے کرتے ہو؟ تم کیوں بھوکے مرتے ہو؟ تمہیں رہنے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ دوستوں کی گالیاں نہ سنو۔ تم اس ذلت کو برداشت نہ کرو۔ یہ ذلت میرے دل میں آگ لگا دیتی ہے۔ یہ سلوک میں برداشت نہیں کر سکتا اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پھینک دوں۔ یہ ہر شخص ہٹلر ہے، مسولینی ہے، کمینہ ہے، رذیل ہے۔۔۔ دنیا میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے۔۔۔ سمجھا؟ میں کمیونزم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں کہانی لکھنا نہیں جانتا۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے نہ ماحول۔ میں منظر نگاری کے معجزے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں رنگین عبارت نہیں لکھ سکتا، میں اردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ میری تشبیہیں نئی نہیں ہوتیں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، اپنی نثر میں خوبصورت سٹائل کا مالک نہیں ہوں۔ میں موپساں اور زولا بننا نہیں چاہتا۔ میں شہرت کا قائل نہیں۔۔۔ میرے پاس اس وقت صرف چار آنے ہیں۔ صرف چار آنے۔ لیکن میں جو کچھ بھی کہوں گا صاف صاف کہوں گا۔ میں وہ زبان لکھنا چاہتا ہوں جو ہر شخص کی سمجھ میں آ جائے، میں وہ نظام چاہتا ہوں جس میں ہر شخص کو روٹی ملے۔ کپڑا ملے، ایک گھر ملے۔ میں انسانیت کا قائل ہوں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنی کمینگی کیوں ہے۔ اتنی بے کاری کیوں ہے؟ اتنی بھوک کیوں ہے؟ اس کا جواب تم کیا دو گے، انسانی خداؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

خیر۔۔۔ ان سے ملو۔ ان کا نام ہری چند ہے۔ یو پی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے، ہری چند اپنے مالدار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی اس کا بچا سب کچھ سٹے میں ہار گیا اور بچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ سرکاری ڈپو میں کام کرتا رہا۔ لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی۔ نوکری چھوڑ دی، کسی نے کہا کہ تم ایکٹر بن سکتے ہو۔ بس پھر کیا تھا، ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے۔ کاش

اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ وہ اصلیت کا کبھی سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ آجکل دن بھر میں بیس بار کنگھی کرتا ہے۔ آئینہ ہر وقت اس کے سامنے رہتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا دھو کر نکلتا ہے تو کریم پاؤڈر کی آفت آتی ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ میں Afghan Snow کی ایک شیشی ختم ہو جاتی ہے، وہ ہر روز دوئی قیمت پر کپڑے دھلواتا ہے۔ آج کل وہ روپے گھر سے منگوا کر گذر کرتا ہے۔ لیکن کب تک۔۔۔؟ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں ہو سکتا، وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے، وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے۔ بتاؤ ان سب باتوں میں کون سی بری بات ہے؟ ہر عقلمند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے کیونکہ آج کل ایک ایکٹر ہزاروں روپے کماتا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے کیونکہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر ہو جائے گا یا محض بھکاری۔ ہری چند زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ جن حالات، جس ماحول میں رہتا ہے اس میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی دن بدن اس کا وزن کم ہو رہا ہے، سر کے بال جھڑ رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا معلوم پڑتا ہے۔ آج وہ طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے۔ وہ دوائی کا استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دوائیوں کے استعمال سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر کب تک؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں نہایت ہی خراب خوراک ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو میں نوکر ہو جائے مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے اور شیشے کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے۔ اور بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور زور زور سے چہرے پر کریم ملتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور ہلکی ہلکی کھانسی ہو جاتی ہے لیکن میں ڈپو میں نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ بامشقت قید ہے۔ میں اس قید کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو اس ٹرنک میں میری بی اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا تو (وہ پھر ہنستا ہے ایک کھسیانی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا) یہ ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس پہنچا دینا۔ زیادہ عرصہ اپنے پاس نہ رکھنا۔۔۔ ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے۔ اور باقی ۔۔۔ ہے بھی کیا۔۔۔

میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھئی کوئی نوکری کر لو لیکن وہ بالکل نہیں سنتا اس دورِ ابتلا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر

کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قسمت ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت، عزت اور عہدے کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں پرانے راستوں پر گامزن ہیں جن پر کئی صدیوں سے ان کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر دن بھر باہر رہتا ہے اور رات کو تقریباً بارہ بجے گھر واپس آتا ہے۔ تم پوچھو گے کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے؟ دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے، ہاں وشو کو چھوڑ کر۔ اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا۔ نہایت ہی چھوٹے قد کا انسان ہے، دور سے دیکھو تو ایک کھلونے کی طرح دکھائی دے گا اور جب نزدیک سے دیکھو گے تو شاید تمہیں خوبصورت دکھائی نہ دے۔ اس کے بال بھورے ہیں۔ اس کا رنگ گورا ہے۔ اسے سفید کپڑے پہننے کا شوق ہے۔ عورتیں اسے کھلونا سمجھ کر پیار کرتی ہیں۔ رگھبیر جب کبھی گھر آتا ہے تو اسکے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر وہ شعر لکھتا رہتا ہے پہلے پہل وہ کچھ گنگناتا ہے، پھر شعر لکھتا ہے۔ دراصل وہ شاعر نہیں ہے۔ وہ ایک فلمی شاعر ہے۔ شاعر اور فلمی شاعر میں جتنا فرق ہوتا ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہو گا۔ رگھبیر ایک دلچسپ عاشق ہے، وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے بلکہ وہ ہر عورت سے عشق کرتا ہے۔ اگر وہ کسی عورت کی طرف دیکھ لے اور اسے پسند آئے تو سمجھو رگھبیر کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا۔ سڑک پر چلتے پھرتے، ٹرام یا بس میں چڑھتے اترتے، گلی کے موڑ پر ہوٹل، سینما، گارڈن ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے۔ وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور گنگناتا ہے۔ ''زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں'' آہ بھرتا ہے اپنی محبت کے قصے دوستوں کو سناتا ہے۔ من گھڑت افسانے سنانے میں وہ نہایت کامیاب انسان ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے شادی کا وعدہ ضرور کرتا ہے۔ چند دنوں بعد عشق کا ابال سرد پڑ جاتا ہے لیکن رگھبیر کی نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے، یہ سن کر ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ہم سب اس کی محبت کی گہرائی کو جانتے ہیں۔ آج کل وہ ہر روز اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ یاسیت سی آ گئی ہے۔ کیا واقعی رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ بنگالن جس کا نام گیتا ہے شروع میں اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو

گئی تھی۔ گیتا ایک نرتکی ہے، وہ ایک مشہور فلم اسٹار کے ٹروپ میں کام کرتی ہے اور بیچارہ رگھبیر اس پر اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور بنگالن کے پیچھے ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب یہ ٹروپ کلکتہ پہنچا تو اس بنگالن نے صاف جواب دے دیا۔ اس کے چاہنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو، ان کاروں اور چمکتی ہوئی ہیرے کی مالاؤں کو دیکھو، وہ شاعر تمہیں کیا دے گا۔ فقط چند شعر اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مر جاؤ گی، وہ کماتا ہی کیا ہے، وہ خود بھوکا ہے تمہیں کیا کھلائے گا؟ اور وہ پھر بنگالی نہیں ہے، وہ پنجاب کی ایک نام نہاد ریاست کا باشندہ ہے۔ اپنے گھر رہو، اس کلکتہ میں رہو، یہاں ناچو گاؤ، لوگوں کو الو بناؤ اور زندگی کے دن اس ہنسی خوشی میں بسر کرتی جاؤ۔ اور بیچارہ رگھبیر جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ عورت کی بیوفائی نے اسے بری طرح اداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے، وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پرامید تھا لیکن آج کل اس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہر کی لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ شملہ کی خوبصورت وادی میں اپنا مسکن بنائے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان، الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا۔ تیل اور نمک کی دکان کھولے گا، اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے، اسے شاعری سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندۂ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کے پہاڑوں کو بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کو فراموش نہیں کر سکتا اور اس کے ذہن میں اس الھڑ لڑکی کے نقوش ابھر آتے ہیں جس نے اسے شہر جانے سے ایکبار روکا تھا لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دھند چاروں طرف سے ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ لڑکی کافی عرصہ تک رگھبیر کی طرف دیکھتی رہی اور رگھبیر اسے بے یارومددگار چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ شاید؟ کون کہہ سکتا ہے، کیا اسکی شادی نہ ہوئی ہو گی کسی زمیندار سے، کسی نمبردار کے ساتھ۔ ایسی حسین لڑکی کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہری اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، دونوں میں جبر ہے، ہر جگہ ظلم ہے، ہر جگہ محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ آج کل رگھبیر روتا ہے، شراب پیتا ہے اور شعر لکھتا ہے --- بیچارہ رگھبیر---

اوتار سنگھ بڑی عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ یہ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے۔ صبح چھ بجے

گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے ۸ بجے گھر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے [illegible] میں [illegible] جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ [illegible] لئے اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ [illegible] چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے، وہ نہایت اچھا سوٹ پہنتا ہے اور ہمیشہ ٹائی لگا کر دفتر جاتا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ اسے آج کل ترقی ملنے والی ہے اور ترقی ملنے [illegible] صرف اس کے صاف اور ستھرے کپڑے ہیں خاص کر اس کی نیلی ٹائی جو وہ عام طور سے پہنتا ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ اس سے بہت خوش ہے، اور ہمیشہ باقی کلرکوں کو [illegible] ملامت کرتا ہے کہ تم کو بھی اس سردار کی طرح کپڑے پہن کر آنا چاہیے۔ اوتار سنگھ [illegible] یقین نہیں ہے وہ گوردوارے نہیں جاتا اور اکثر قینچی سے داڑھی بھی صاف کرتا ہے۔ [illegible] سے متعلق کوئی مذاق کیا جائے تو وہ اسے بہت برا مانتا ہے۔وہ سکھوں کے خلاف [illegible] بات سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے [illegible] زندگی پسند نہیں، آخر کب تک آدمی دن رات کام کرے۔ [illegible] کی نظروں [illegible] انسان [illegible] ذلیل ہے اور نوکری کتنی ذلیل ہے۔ پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لئے Identification Card چاہیے۔ کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے، حاضری لگانی پڑتی ہے .... اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دولت کی غلامی ہے، موت ہے اور پھر ان لمحوں میں کبھی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے، کبھی کسی عورت کی طرف مسکرا کر دیکھ لے، یا عورت ہماری طرف ہنس کر دیکھ لے۔ میں کہتا ہوں کہ اس فلیٹ کے رہنے والوں میں اتنی جنسی بھوک ہے کہ تم ان کی باتیں سن کر گھبرا جاؤ اور سوچتے رہو کہ یہ لوگ کس ملک کے باشندے ہیں؟ یہ انسان نہیں بھوت ہیں۔

تم نے بمبئی آنے کے لئے کہا ہے۔ آؤ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو۔ اگر برا نہ مانو تو میں تمہیں اپنے گھر کا نقشہ کھینچ دوں تا کہ تمہیں میرے پاس پہنچنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور تم یونہی ادھر ادھر نہ بھٹکتے پھرو۔ اسٹیشن سے اترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ لو اور پھر ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے، سیدھے اس گلی کی طرف مارچ کرو۔ جو دوسرا مکان ہے اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔ آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا، اور جوں ہی تم داخل ہو گے تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہ انسان اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے لوگ اسے پاگل کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی اسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اکثر یہ آوارہ پھرتا رہتا ہے، ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنتا ہے۔

اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان میں مٹی کی تہہ جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان کافی دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اکثر یہ چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب لیٹے رہنے سے تنگ آ جاتا ہے تو سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہو۔ اس پاگل کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے۔ کتا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا۔ اس کتے سے گھبرانا نہیں یہ کتا ہر نووارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ اس کی سرخ آنکھوں میں تم یاسیت کی جھلک پاؤ گے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر تم اس بلڈنگ کے رہنے والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہو وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔ یہ کتا ایک دو بار دیکھنے کے بعد تم سے گھل مل جائے گا اور پھر تمہیں دیکھ کر کبھی نہیں غرائے گا۔ نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں، انہوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے۔ میں نے اس لونڈیا کو اکثر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سڑک والی کھڑکی میں بیٹھ کر ادھر ادھر جانے والے لوگوں کو پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر اس لونڈیا کو کہاں سے لے آیا" میوزک ماسٹر کی شکل کسی بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس کے گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے۔ یہ موٹر اکثر بلکہ ہر روز خراب ہو جاتی ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ موٹر اچھی طرح صاف نہیں کی جاتی، پٹرول کی کمی کی وجہ سے انجن خراب ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شام کے بعد میوزک ماسٹر اپنی خوبصورت بیوی کو کار میں بٹھا کر باہر لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجے کے بعد دونوں واپس آتے ہیں۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا، وہ مسرت جو ازدواجی زندگی میں ہونا چاہیے، کبھی ان کے چہروں سے نمایاں نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے چیختی ہے، چلاتی ہے، میوزک ماسٹر کو دھمکی دیتی ہے کہ یہاں سے چلی جائے گی، وہ یہاں نہ رہے گی۔ دونوں زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دن دونوں کو پھر اسی کمرے میں دیکھتا ہوں اور لڑکی پھر اسی کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے، معلوم نہیں کیوں۔۔۔؟

ذرا سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل آجائے گی۔ یہاں ذرا ٹھہر جاؤ۔ ذرا دم لے لو، یہاں ایک ہی آشیانے میں تمام ہندوستان نظر آئے گا۔ یہاں ایک کرسچین لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی؟ اس کا مجھے علم نہیں، کہتے ہیں کہ اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں پر کھیلتے رہتے ہیں اور یہ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑی ہو کر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس لڑکی کا کیا نام ہے اس کا مجھے علم نہیں اور نام پوچھنے کی

ضرورت ہی کیا ہے۔ بیچاری کی بری حالت ہے، گو رنگ سفید ہے لیکن جسم پر گوشت نہیں
چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں اور
پنڈلیاں جو اکثر ننگی رہتی ہیں نہایت میلی اور سڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے اس کے خاوند کو
کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی میں نے اس گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہرحال کوئی مرد تو اس گھر
میں آتا ہی ہو گا ورنہ یہ بچے کہاں سے آ گئے اور بیچاری کرسچین لڑکی کا اندازہ [illegible] مرتی ہو
گی۔ جب تم یہاں پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے۔ وہ تمہاری
طرف دیکھے گی اور پھر منہ موڑ لے گی، وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے، یہ مجھے علم نہیں
لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہوتا ہے۔ وہ کب تک انتظار
کرے گی میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے
لیکن میں نے ہمیشہ اسے دروازے میں کھڑا دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں، یہاں ایک بیوہ عورت
رہتی ہے جس کی بہت سی بدصورت لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں سب جوان ہیں، کاش ان لڑکیوں پہ جوانی
نہ آتی۔ وہ شباب ہی کیا جو تمہیں اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک
نظر دیکھنے کے لئے جی نہ چاہیے۔ عورت کے حسن میں کشش ہونا چاہیے اگر تم اسے ایک بار دیکھ
لو تو تمہیں یہ محسوس ہو جائے گا کہ تم ایک زندہ متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو۔ لیکن
آشیانہ بلڈنگ میں حسن مردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حسن
سے پیدا ہوتی ہے، خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں تو بدصورتی
کا مقابلہ ہے، معلوم پڑتا ہے کہ لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے اور اس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی
لڑکیوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے ان لڑکیوں کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ گھر کے دروازے
اکثر بند رہتے ہیں اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو اس میں ایک بیوہ کا چہرہ
تمہیں گھورتا ہے۔ اس چہرے پر نفرت کی جھریاں ہیں، مٹتے ہوئے شباب کے آخری نشے، بیوگی کی
تلخیاں، زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار جو مدراسن کی آنکھوں
سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کا پرتو تم ان جوان لڑکیوں کی آنکھوں
میں بھی دیکھ سکتے ہو۔ صرف آنکھوں میں نہیں بلکہ اس نفرت، اس بھوک، اس تشنگی اور اس بیوگی
کی تشکیل تم ان لڑکیوں میں دیکھ سکتے ہو۔ اکثر یہ لڑکیاں خاموش رہتی ہیں، اداس اور پریشان رہتی
ہیں۔ ہم سب اکثر اپنے کمرے کی چابی ان مدراسنوں کو دے جاتے ہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کی
جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو تو کسی دن کمرے کی چابی خود انہیں دینا۔ تمہیں معلوم ہو جائے

گا کہ وہ چابی پینے کے لئے کتنی بے قرار رہتی ہیں۔ اکثر وہ دروازے میں کھڑی رہتی ہیں اور جب تم سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترو گے تو ایک بدصورت چہرہ تمہاری طرف دیکھے گا، اور ایک میلا گندہ سا ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا۔ میری انگلیاں کئی بار غیرشعوری طور پر ان بری انگلیوں سے ٹکرا گئیں۔ لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، ان کے کام، ان کے چلنے پھرنے کا انداز، ان کے دیکھنے کا انداز ایک ہی ہے۔ وہ اکثر تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی لیکن ان کی نگاہوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے، اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کے ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی ترتیب دی جائے تو ممکن ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں۔ اس سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔ گو ان کا رنگ سیاہ ہے لیکن کیا ہوا۔ جوانی کو رنگ سے کیا نسبت ہے؟ دور کیوں جاؤ ہمارے محلے میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ ان مدراسنوں سے بالکل ملتا جلتا ہے لیکن اس کے حسن میں کتنی کشش ہے۔ اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔ یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے۔ کالی رنگت والی کو سفید ساڑھی بہت اچھی لگتی ہے۔ کالی رنگت اور سفید ساڑھی، سفید ساڑھی اور کالی رنگت، لڑکی کو ساڑھی پہننے کا سلیقہ آتا ہے۔ ساڑھی پہننے سے جسم کا ہر نقش ابھر آتا ہے اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ لڑکی ایک مصور ہے جو ساڑھی کو مصور کے برش کی طرح استعمال کرنا جانتی ہے۔۔۔ حسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن لڑکی کا حسن اسی طرح قائم رہتا ہے۔

آؤ میرے قریب آؤ۔ وہ لڑکی آ رہی ہے، وہ وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز، ان کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے، اور کبوتر ہوا میں پرواز کر رہے ہیں۔ ناریل کے پتے سو رہے جھومتے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پر ناچتی ہیں، ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے جسم کا ہر خط واضح ہے، پنڈلیوں سے اوپر رانوں سے بڑھ کر کولھوں کا تنگھم، کتنا دلفریب ہے، مصور کو داد دو، اس کی انگلیوں کو چوم لو اگر چوم سکتے ہو نظر کر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں اور سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم، اور سمندر، لہریں مار رہا ہے۔ لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں، اور اور ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ۔ چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کبھی کبھی زبان، ان مرمریں ہونٹوں پر پھرتی ہوئی۔۔۔ ہونٹ چمکتے ہیں جیسے سبز پتوں پر شبنم کے قطرے، نچلا ہونٹ کچھ کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئیں۔۔۔ یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں لڑکی شرماتی نہیں۔ آنکھوں میں فتح ہے، کامرانی ہے لڑکی و

احساس ہے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے۔ مرلی پھر سے
آہ بھرتا ہے اور پھر کہتا ہے "مار ڈالا، مار ڈالا، ہائے مار ڈالا" اور چڑ کی سی ہنسی۔ جیسے مردہ
زندہ ہو گیا اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا "زندگی چند دن کی عورت سے سوا
کچھ بھی نہیں" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں بکنا مذہب و تہذیب
کو، سرمایہ داروں کو، گورنمنٹ کو، ماں باپ کو، اور کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹھٹھا لگانا، چرن
کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اتارنا اور لمبے لمبے بدبودار بالوں میں کنگھی کرنا---
اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا--- حتیٰ کہ حسن آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور شراب کی
خوشبو ہوا میں گم ہو جاتی ہے اور صرف گالیوں کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دماغ
سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ "ابے او حرام زادے، الو کے پٹھے--- تیری ماں کو --- ... ---"

شہر آشوب

نذر الحسن صدیقی

سورج کے بلند ہوتے ہوتے اس سنسان فٹ پاتھ کے اردگرد اچھی خاصی ہماہمی اور چہل پہل شروع ہو جاتی۔

چھوٹے سے قد والا منحنی بنگالی ایک بھد میلی بنیان، گھٹنوں سے اونچا پرانا تہبند نما کپڑا کمر کے گرد لپیٹے گنے کی مشین میں بڑی تیزی اور مستعدی سے گنا پیلتا، رس ایک بڑے تام چینی کے جگ میں جمع ہو جاتا پھر وہ رس کو گلاس میں انڈیل کر گاہکوں کو تھماتا جاتا اور یہ سب کچھ مشینی طور پر ڈھلے ڈھلائے انداز میں ہوتا رہتا۔ گرمیوں بھر بنگالی کے ٹھنڈے ٹھنڈے رس کے گلاس خوب چلتے، مگر جاڑا شروع ہوتے ہی کام کا مندا ہو جاتا تو بنگالی مونگ پھلی اور ریوڑیوں کا ٹھیلا سنبھال لیتا۔ اور اس سے تھوڑی ہی دور پر دلی والے کے چاٹ کے ٹھیلے سے اٹھتی ہوئی گرما گرم چٹ پٹی بھاپ سونٹھ کے بتاشوں کی خوشبو فضا میں تیرتی ہوتی اور دوسری طرف مارواڑی کے چھوٹے سے ہوٹل سے آتی ہوئی گرم گرم چائے، ڈبل روٹی، بند بسکٹوں اور پاپوں کی مہک تمام فضا کو بہ یک وقت مختلف النوع خوشبوؤں سے بھر دیتے۔

اور میرے پیٹ میں ان ملی جلی خوشبوؤں نے ابھی ایک عجیب احساس بیدار ہی کیا ہوتا کہ سامنے سے مولوی صاحب اپنی مخصوص چال چلتے فٹ پاتھ کی جانب بڑھتے نظر آتے اور ان کو دیکھتے ہی مجھ پر تو کیفیت ہی دوسری طاری ہو جاتی۔ نورانی سرخ و سپید چہرے پر بھرا ہوا خط، بلند پیشانی گٹھا ہوا بدن، میانہ قد، گرمی ہے تو وائل یا ململ کا سفید براق کرتا۔ ٹانگوں میں علی گڑھ کٹ چھوٹی موری کا پاجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ اور اگر جاڑے ہیں تو موٹے کپڑے کا کرتا اور اس پر روئی کی تلی ہوئی مرزئی اور سر پر کالی رام پوری ٹوپی تو ہر موسم میں نظر آتی جس کے نیچے نماز کا گٹا پیشانی پر دور سے ہی نظر آتا۔ ان کو دیکھتے ہی میں فٹ پاتھ پر پھیلے ہوئے اخباروں کے پاس سے اٹھ کر تعظیماً کھڑا ہو جاتا۔ ادب سے سلام کرتا، وہ بڑے پیار اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے، کمر بند سے چابی کا گچھا کھولتے، فٹ پاتھ سے ملحق ایک چھوٹی

سے دکان کے تختے پر چڑھ کر تالے میں چابی لگاتے' دکان میں جا کر دو ایک اگربتیاں سلگاتے اور تختے پر ایک صاف ستھرا کپڑا بچھا کر زور سے بسم اللہ کہہ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل تختے پر جا کر ان کے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھ جاتا۔ بغدادی قاعدہ کھولتا' وہ ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کرتے' اتنے میں مولوی صاحب کو دیکھتے ہی ہر روز کی طرح ہوٹل میں کام کرنے والا لڑکا نہ جانے کیسے اپنے ہاتھوں میں چائے کے دو گلاس' ایک بڑا اور ایک چھوٹا' پاپے سے دکان پر پہنچ جاتا اور 'سلام مولوی صاحب' کہہ کر چائے کا بڑا گلاس اور بند مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیتا اور پاپا اور چھوٹا گلاس میرے آگے۔ وہ اشارے سے مجھے چائے پینے اور پاپا کھانے کو کہتے۔

اور یہ روز کا معمول تھا۔ شروع شروع میں جھجک ہٹ اور تکلف فطری امر تھا مگر چند ہی دن میں کچھ تو بابا کے سمجھانے بجھانے اور بہت کچھ مولوی صاحب کی بے پناہ شفقت اور محبت نے ان سے قرب کا ایک ایسا عجیب انوکھا لطیف احساس پیدا کر دیا تھا' جس کو میں اس وقت تو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا' مگر رفتہ رفتہ ایک نیا جذبہ' انس و محبت' عقیدت و احترام کی ملی جلی کیفیت سے پروان چڑھتا رہا۔ چائے میں ڈبو ڈبو کر میں پاپا کھاتا جاتا' بیچ بیچ میں گرم گرم چائے کے گھونٹ لیتا' اور میرے سامنے بیٹھے مولوی صاحب بھی چائے اور بند کے ساتھ یہی شغل کرتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں ہی اپنے صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر سادھان ہو چکے تھے۔

اور اب میں اپنا بغدادی قاعدہ کھول کر پہلے کل کا آموختہ دہراتا' پھر مولوی صاحب نیا سبق پڑھاتے اور ابھی نیا سبق یاد ہی کر رہا ہوتا کہ بابا پہنچ جاتے' وہ منہ اندھیرے کے نکلے گھر گھر اخبار ڈال کر واپس پلٹ چکے ہوتے اور ذرا کی ذرا دکان پر مولوی صاحب سے سلام و دعا کے تبادلے کے بعد نکل لیتے اور پھر مجھے ساتھ لے کر چل پڑتے' کیونکہ انہیں دفتر پہنچنے کی جلدی ہوتی مگر اتوار کے اتوار یہ نکلی ہی نشستوں میں بدل جاتی۔ مولوی صاحب کے ساتھ دکھ درد کی ہوتی۔ ماضی کی یادوں' بیتے دنوں کی باتوں میں دونوں کھو کھو جاتے۔ اور ان دونوں کی باتوں کو سن سن کر ہی میں بہت کچھ مولوی صاحب کے بارے میں خصوصاً ان کی ہجرت سے پہلے کی زندگی کی بابت جان گیا تھا اور بابا تو تھے ہی میرے اپنے بابا' پھر بھی ان دونوں کی گفتگو سے کچھ نہ کچھ کوئی نہ کوئی بات بابا کی پچھلی زندگی کے بارے میں بھی کان میں پڑ جاتی۔

مولوی صاحب گڑھ مکتیشر کے اصلی نسلی نجیب الطرفین پٹھان تھے۔ گڑھ مکتیشر میں ان کے والد تاجر عطر تھے۔ کاروبار بہت بڑا اور وسیع نہ تھا' ایسا ہی جیسے کہ چھوٹے شہروں میں معمولی نوعیت اور درمیانہ درجے کا ہوتا ہے۔ تاہم انہیں خوشبوؤں کے طفیل گھر میں خوش حالی کی مہک تیرتی رہتی۔ اور فارغ البالی کی سوگندھ رچی بسی رہتی۔ قنوج اور لکھنؤ کی تمام مشہور زمانہ خوشبوئیں۔ صفدر علی محمد علی تاجران عطر لکھنؤ' اور اصغر علی خان مقدا خان کے تیار کردہ اعلیٰ درجے کے عطریات' شمامہ' شمامۃ العنبر' حنا' کستوری' مشک' خس' عطر

کیوڑہ وغیرہ' موسم کی مناسبت سے خوشبوؤں کا استعمال ہوتا اور اسی حساب سے خرید و فروخت بھی ہوتی۔ جاڑوں میں شمامہ' شمامۃ العنبر' حنا وغیرہ' گرمیوں میں خس اور برسات میں عطر کیوڑہ جیسی خوشبوئیں۔ مولوی صاحب کے والد ولایت علی خان خوشبوؤں کی بڑی اچھی پرکھ اور پہچان رکھتے تھے' ان کے یہاں یہ کاروبار کئی پشتوں سے ہوتا چلا آیا اور یہ پرکھ اور پہچان توارثی انداز میں منتقل ہوتی رہی تھی' پھر اس میں خاندانی شوق کا بھی بڑا دخل تھا' خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد' ہر دور میں خوشبوؤں میں خلقی طور پر دلچسپی لیتا رہا تھا' اور یوں شوق اور خاندانی تجربہ' معاملہ ایک اور ایک گیارہ کی میزان پر ہی لگتا رہا۔ ور مولوی صاحب کو بھی یہ شوق ورثے میں ملا تھا' وہ بچپن ہی سے اپنی دکان پر بیٹھتے چلے آئے۔ پڑھائی لکھائی سے جو وقت بچتا' وہ دکان ہی پر گزرتا اور یوں عمر گزرنے کے ساتھ خوشبوؤں کی پرکھ پہچان پیدا ہوتی چلی گئی' بھلا مچھلی کا بچہ بھی کسی سے تیرنا سیکھتا ہے۔

مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم مکتب میں عربی اور فارسی کے عالم سید باقر علی سے حاصل کی تھی۔ اس زمانے کی مکتب کی تعلیم کے بڑے گہرے اور کارگر اثرات مرتب ہوتے تھے اور اگر استاد سید باقر علی جیسا مل جائے تو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی جاری رہتی ہے اور شخصیت اور کردار کا سونا نکھر نکھر کر کندن بنتا رہتا ہے اور ہمارے مولوی صاحب عنایت علی خان' سید باقر علی کے شاگرد اس کی جیتی جاگتی' چلتی پھرتی تصویر اور مکتب کی تعلیم کا زندہ منہ بولتا ثبوت تھے۔ محبت' ایثار' اخلاص کے پیکر' ہمدرد' نیک دل و نیک طینت' شفیق و مہربان دوسرے کے دکھ کا مداوا کرتے اور درد بانٹنے والے۔ انہوں نے خود بھی غربت کے سوا بہت سے دکھ اور غم جھیلے تھے' وہ بتایا کرتے کہ ان کی شادی نوجوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھتے ہی ہوگئی تھی' مگر ابھی گھر میں شادی کی خوشیاں اور گہما گہمی ماند نہ پڑنے پائی تھیں کہ والد صاحب کی اچانک وفات نے ہنستے کھیلتے گھر میں صف ماتم بچھا دی۔ بائیں جانب فالج کا اچانک حملہ جان لیوا ثابت ہوا' چند دن کی ہی کی علالت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

اور والد صاحب کے جاتے ہی گھر کا بار' دکان کی ذمہ داری بڑا اور اکلوتا بیٹا ہونے کی سعادت کے باعث مولوی صاحب کے نوخیز کاندھوں پر آ پڑا۔ مگر یہ کاندھے ناتواں ثابت نہ ہوئے۔ دکان پر ویسے تو باپ کے زمانے ہی سے بیٹھتے چلے آئے تھے مگر ایسے ہی جیسے عموماً باپ کی زندگی میں بیٹے بالخصوص اس عمر میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر یہاں پر بھی سید باقر علی کی تربیت جس نے مولوی صاحب کی شخصیت کی تربیت و تشکیل میں بڑا قوی اور مثبت کردار ادا کیا تھا' حالات کی اس اچانک تبدیلی میں ان کا سہارا بن گئی۔ سید صاحب کی تربیت نے ان کی شخصیت میں عالی حوصلگی اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم ودیعت کر دیا تھا۔ چنانچہ باپ کی موت کے بعد معاشی اعتبار سے تو کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ دکان اور گھر کے تمام تر معمولات اسی ڈگر پر چلتے رہے' جیسے باپ کی زندگی میں چلتے رہے تھے۔ ہاں تعلیم کا سلسلہ ضرور منقطع ہو گیا'

مگر پڑھنے کی لگن کم نہ ہوئی۔ مطالعے کا شوق فزوں تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ذاتی کتب خانہ بنا لیا۔ اور اس میں انہوں نے بڑی تگ و دو اور کاوش سے چند چیدہ اور کتابیں اور چند نایاب مخطوطات بھی جمع کیے تھے اور جب انہوں نے یہ کتابیں اور مخطوطات اپنے استاد سید بابا کو دکھائی تھیں تو انہوں نے ان کو دیکھ کر جس خوشی اور مسرت کا اظہار کیا تھا اس کو بیان کرتے وقت مولوی صاحب پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ان کی بات بات اور حرکات و سکنات سے خوشی اور مسرت ٹپکتی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں خوشی و مسرت کا یہ اظہار کرب و غم کا روپ دھار لیتا، جب وہ 1947 کے خونیں آشام دور کا تذکرہ کرتے۔ آواز گلوگیر ہو جاتی، گلا رندھا سا جاتا اور وہ کوئی اور ہی شخص دکھائی دینے لگتا۔

"ان دنوں انسانی خون اور جانوں کی بڑی ارزانی تھی۔ گلی گلی انسانی خون پانی کی طرح بہتا۔ درندے انسانوں کے روپ میں بستیوں میں دندناتے پھرتے اور اس دوران ان کے رستے میں میرا گھر بھی آ گیا۔ اتفاق کہیں، یا قسمت اور مقدر کی خرابی، میں ان دنوں گھر پر بھی نہ تھا بلکہ کسی کی بیماری کے سبب قنوج گیا ہوا تھا، واپسی پر اسی کام کے لیے لکھنؤ بھی رکنا تھا مگر لکھنؤ پہنچتے ہی وہاں جب پہنچی تو ہوش و حواس ہی گم ہو گئے۔ اپنے شہر میں بلوے فساد کی خبر تھی اور خبر میں خاص طور پر میرے محلے میں قتل و غارت گری کا تذکرہ تھا۔ ہوش و حواس تو تھے ہی گم، دنیا کا ویسے ہی پٹ آیا۔ دل و دماغ طرح طرح کے وسوسوں کی آماج گاہ، ہول سا کھاتا جب گھر پہنچا تو دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ گھر پر تھا ہی کون، ایک بیوہ ماں، چھوٹی بہن، اور میری نوبیاہتا بیوی۔ گھر کی جلی ہوئی سیاہ دیواروں پر خون کے چھینٹے اور دھبے تھے۔ میرا اپنا خون میرے اپنے ہی گھر کی دیواروں اور آنگن میں بہا ہوا تھا۔ عورتوں نے سرفروشی سے لڑتے ہوئے اور جان دے کر شاید اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کی تھی۔ گھر جل گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اور سب کچھ بھی بھسم ہو گیا تھا۔ کاغذات راکھ کے ڈھیر تھے اور کاغذات بھی کیسے اور کون سے؟ نادر کتابیں، نایاب مخطوطات کی تحریریں، سب کچھ چند مٹھی راکھ بن گیا تھا۔ اقبال کی شاعری جلی تھی، غالب و میر اور ولی کی غزل جلی تھی، ذوق اور سودا کے قصائد جلے تھے، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ راکھ ہوئے تھے، میر درد اور سودا، میر امن جلے تھے، امیر خسرو، رحیم اور کبیر راکھ ہوئے تھے۔ شیخ سعدی کی حکایتیں جلی تھیں، انیس و دبیر کے مرثیے اس المناکی پر نوحہ کناں تھے، غرضیکہ کیا بتاؤں، کیا کیا اور کون کون جلا تھا۔ ایک میں ہی بدقسمت تھا کہ ان سب کے ساتھ جلنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا تھا۔" اور یہاں مولوی صاحب کی آواز شدت جذبات سے تھرتھرانے لگتی۔

بابا ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے، تسلی دیتے۔ مولوی صاحب آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کو خشک کرتے متغیر چہرے کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے۔ تھوڑی دیر کے لیے ماحول بڑا ہی بوجھل اور اداس سا ہو جاتا۔ چند ثانیے پژمردہ پژمردہ خاموشی سی طاری رہتی۔ صرف ہم تینوں کی تیز تیز چلتی ہوئی

سانسوں کی آواز دکان میں چھائے سکوت کو توڑتی یا پھر ہمیں اپنے ہی دل کی دھڑکنیں اپنے کانوں میں بازگشت سی بنی سنائی دیتیں۔ پھر مولوی صاحب پہلو بدل کر منہ پر ہاتھ پھیرتے' چہرے پر اک ذرا سکون اور بشرے پر قدرے اطمینان کی نشانیاں، پھر تھمیں اور جیسے اندر سے کوئی قوت انہیں سنبھال لیتی' وہ دوبارہ سلسلہ کلام شروع کرتے' مگر آواز دھیمی دھیمی سی لہجہ میں بھی ایک عجیب سی ملائمت۔

''پھر بھلا شیخ صاحب' وہاں ٹھہرتا ہی کیوں اور کیسے؟ سب کچھ جل جلا ہی گیا تھا' سو آج یہ چھوٹی سی دکان کل سرمایہ اور کائنات ہے' ایک پرانے شناسا نے بڑی مدد کی اور اس بے سروسامانی اور بے یارومددگاری میں بڑا سہارا دیا' ان کی چھت تلے ان کے کوارٹر میں پڑا رہتا ہوں۔ ان کے بچوں اور آپ کے بیٹے کو تھوڑا بہت پڑھا دیتا ہوں' تو ہمہ وقت ستار محترم سید صاحب مجھے سامنے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک بار پھر مولوی صاحب کا چہرہ عجیب سی خوشی سے دمکنے لگتا۔

''ایک بار پھر ان کے کاندھوں کو تھپتھپاتے اور پھر دکان کے تختے سے اتر کر دل گرفتگی کے عالم میں بوجھل بوجھل قدموں سے گھر کی جانب چل دیتے' چھٹی کا دن ہوتا' دن خاصا چڑھ جانے کے باوجود سڑکوں پر اور دنوں کی طرح ابھی زیادہ ہما ہمی نہ شروع ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نہ جانے کیوں اپنی یہ کہانی بار بار دہرایا کرتے' مہینے ڈیڑھ مہینے پیچھے کسی نہ کسی پہلو الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اسی کہانی کا اعادہ ہوتا اور ہر مرتبہ مولوی صاحب اسی شدید جذباتی کیفیت سے گزرتے اور ہم دونوں باپ بیٹے بھی ہر دفعہ اسی انداز سے متاثر ہوتے۔ اور کبھی کبھار کسی تو ار کو بابا کا ماضی بھی اپنی کہانی دہرا دیتا۔''

یوں تو یہ مجھے معلوم تھا کہ ہم لوگ پاکستان بننے سے پہلے ضلع پیلی بھیت کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے۔ بابا کے والد اور میرے دادا شیخ نیاز احمد اس قصبے کے چھوٹی حیثیت کے مگر خوش حال زمیندار تھے۔ مگر یہ بابا اور مولوی صاحب کے درمیان ہونے والے دکھ درد سے ہی پتا چلا تھا کہ یہ چھوٹی سی زمینداری بھی مقدمے بازی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ دادا کے ایک رشتے کے بھائی تھے ان سے پرانی خاندانی چشمک اور لاگ ڈانٹ چلی آتی تھی' ایک قطعہ اراضی پر ان سے مقدمے بازی چھڑ گئی' اور نوبت ہائی کورٹ تک پہنچی۔ اتنی طویل اور اس اونچے پیمانے کی مقدمے بازی کی دادا کی مالی استطاعت اور حیثیت نہ تھی۔ چنانچہ کھیت' باغات بکنے سے لے کر نوبت بنئے سے قرض لینے تک جا پہنچی۔ پرانے زمانے کے زمیندار تھے' گو چھوٹی حیثیت کے تھے' آن پر مر مٹنے والے۔ سب کچھ داؤ پر لگا بیٹھے' مگر اپنی پوری حیثیت منا کر بھی ہاتھ کچھ نہ آیا' بابا کہتے۔

''نتیجہ تو مولوی صاحب وہی نکلا' جو ایسی مقدمے بازیوں کا نکلتا ہے' زمینداری کا بیشتر حصہ تو بک ہی گیا تھا' رہی سہی کسر بنئے کی قرض کی رقم نے پوری کر دی جو سود در سود چڑھتی ہوئی' والد صاحب کے

حواس پر ہر وقت طاری رہتی۔ میں ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا' مجھے پڑھانے کا والد صاحب کو بڑا شوق تھا' مگر اب گھر میں معاشی پریشانیوں کا دور دورہ تھا' مقدمہ ہارنے اور پیروی کے طویل بڑے خرچے میں زمینداری کا بڑا حصہ نکل جانے نے ان کی کمر توڑ دی تھی' جو ایک آدھ کھیت سر خود کاشت کے رہ گئے تھے اس پر خود کھیتی باڑی کرنے کے لیے' زمیندار ہونے کے باوجود خود ہل کی مٹھیہ پکڑ لی اور جو باغ بچ رہا تھا اس کی دیکھ بھال پر بھی خود ہی خصوصی توجہ دی' اور حقیقت تو محنت اور دیکھ بھال چاہتی ہے' مٹی سے کچھ پیدا کرنے کے لیے خود مٹی میں ملنا پڑتا ہے۔ باپ کی مدد کے لیے مولوی صاحب نے تعلیم چھوڑ دی' ان کے اکیلے دم کا یہ ہوتا نہ تھا۔ باپ کے کندھے سے کندھا ملائے بغیر بات بنتی نہ تھی اور ان کی محنت نے ہی کا دست نگر ہونے سے بچالیا' وہ زمینداری والی بات تو ظاہر ہے ہوتی۔ ۔ ۔ تھی جب پیٹ خوب گھر بھرا ہی رہتا۔ مگر والد صاحب نے شاید یہ صدمے اپنے دل پر لیے تھے' کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں خود کو معروف رکھتے ہاں میری اسکول کی کتابیں دیکھ کر ان کے چہرے پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ان کے دکھ کا اب اندازہ تھا' مگر شاید ہم دونوں ہی مجبور تھے۔ وہ ۔ ۔ ۔ کرتے وقت بابا میری طرف کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے میں اس وقت ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ان ۔ ۔ ۔ ہوئی تمنا اور آرزو پڑھنے سے قاصر رہتا جو نہ معلوم کب سے ان کے وجود میں پل بڑھ رہی تھی۔ پھر وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے۔

''اور پھر مولوی صاحب معاشی تنگی تو شروع ہی ہو چکی تھی' جب یہ فسادات وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا تو قدم بالکل ہی اکھڑ گئے' اس رات جب وہ سرزمین چھوڑی' جو ہمارے اجداد کا نہ معلوم کب سے مسکن تھی تو بڑی بے سروسامانی کا عالم تھا۔ فضا میں غضب کی ہیبت اور دہشت تھی' ابھی نصف رات ہی گزری تھی کہ برابر کے گاؤں سے دو تین کوس کے فاصلے پر جو مسلمان اکثریت کا گاؤں تھا' وہاں سے متواتر اور چیخوں کی مسلسل آوازوں نے نہ صرف رات کے سناٹے کا پردہ تار تار کر دیا تھا' بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں نے جیسے رات کے تاریک پردے پر ہر چیز منعکس کر دی تھی۔ یہ حملے جگہ جگہ دن رات کا معمول تھے' مسلمان ہر اس کا شکار تھے' اور قریب کے گاؤں پر حملے نے تو کل مسلم آبادی کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیا' ان پر زمین تنگ سے تنگ ہو جاتی جا رہی تھی' نماز فجر سے پہلے پہلے کل گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں موت کہاں پیچھا چھوڑتی ہے اور جس کو جب اور جہاں جیسے آنی ہے آ کر رہتی ہے'' مولوی صاحب تیز رفتار اسٹیشن کے تعاقب میں بھی موت بھاگی اور اس کے ہرکاروں نے ایک سنسان بیابان میں اس کو جا لیا۔ مگر شاید ابھی ہمارے لیے موت کے فرشتے کو حکم نہ ملا تھا' سو ہم سب اس کی قدرت سے بچ گئے۔ جس ڈبے میں ہم تھے وہ مہاجرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور جب تلواروں' تیروں' بھالوں اور نیزوں سے مسلح موت کے ہرکارے جھپٹے تھے تو میں اور بیوی بچے سیٹ کے نیچے دبک گئے تھے۔ کیا بتاؤں مولوی صاحب ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا اور کیسے دیکھا' بس یہ سمجھ لیں کہ ہم لاشوں کے انبار تلے دبے اور خون کے تالاب میں ڈوبے ہوئے

تھے' جو چند خوش قسمت نہ معلوم معجزانہ طور پر کیسے بچ گئے تھے ان میں ہم بھی تھے' مگر والد صاحب اس انسانی کاٹ چھانٹ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے''۔ اور اس کے بعد بابا کی آواز بھی مولوی صاحب کی آواز کی طرح شدت جذبات سے کانپنے لگتی' گلا رندھ جاتا۔ ایک مرتبہ ماحول پر بڑا ہی بوجھل اور سوگوار سا ہو جاتا

یہ باتیں جب کی ہیں جب میرا یہ شہر اتنا پھیلا اور بڑھا نہ تھا' فاصلے اتنے نہ تھے۔ دوریاں نہ تھیں قربتیں تھیں چھوٹا سا صاف ستھرا شہر۔ مگر بڑا وسیع القلب۔ آدمیوں کے ہجوم سے کہ حسن کی سمائی بڑے سے بڑے شہر میں نہ ہوتی بڑی محبت سے اپنی بانہیں پھیلائے اپنے قلب میں سب کو سموتا رہا اور یہ وسیع القلبی بڑھتی ہی گئی۔ ہم ان دنوں جیکب لائین اور جٹ لینڈ لائین کے خط اتصال پر بیچ در بیچ بیلوں کی شکل میں پھوٹتی ہوئی جھگیوں میں سے ایک جھگی میں رہتے۔ بابا کو ایک سرکاری دفتر میں دفتری کی آسامی پر ملازمت مل گئی تھی۔ آٹھویں درجے تک کی معمولی تعلیم روزی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ مگر نوکری کی ماہانہ آمدنی اتنی قلیل تھی کہ پوری نہ پڑتی۔ پھر بابا پر ایک اور بار آ پڑا' بابا کے ایک رشتے کی بہن اور ان کی دو چھوٹی بچیاں لٹی پٹی اپنے شوہر اور دو جوان بیٹوں کی جانوں کا نذرانہ دے کر جب پاکستان کی سرزمین پر پہنچیں تو یہاں ان کا کوئی سہارا نہ تھا' سوائے بابا کے اور ان دنوں تو ہر ایک کا دل بڑا وسیع تھا' گھر اور جھگی میں تو سمائی نہ ہوتی مگر دلوں کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے۔ اور یہ وسیع القلبی ہی ان دنوں نفسا نفسی اور کسمپرسی میں ایک دوسرے کے لیے بڑا سہارا تھی۔ ہر ایک کا درد مشترک تھا اور درد کی ٹیس لوگ اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرتے۔ جھگی تنگ تھی' دل تو تنگ نہ تھا۔ آمدنی ہی تو قلیل تھی' مگر طبیعت میں تو کشادگی اور فراخی تھی۔ بابا جھگی میں جگہ کی تنگی کے باعث رات کو مسجد میں سوتے اور نماز فجر کے بعد اول وقت گھر آ جاتے اور منہ اندھیرے ہی نکل پڑتے۔ دفتر کی نوکری کے ساتھ ساتھ انہوں نے صبح میں گھر گھر اخبار ڈالنے کا کام بھی سنبھال لیا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیتے۔ اخباروں کو علیحدہ کرنے میں' میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان دنوں اخبار بھی تو چند ایک ہی تھے' اور گھر پر لینے والے بھی محدود ہی تھے' جنگ انجام' ڈان وغیرہ۔ کچھ اخباروں کو میں مولوی صاحب کی دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر دن چڑھے تک لے کر بیٹھا رہتا اور یوں بھی کچھ پلے پڑ جاتا۔

دفتر میں بھی بابا کا کام اخباروں ہی سے متعلق تھا' دن بھر بقول شخصے اخبار و رسائل سے دست و گریباں رہتے۔ میں نے دفتر میں ہمیشہ انہیں اخباروں کے ڈھیروں کے ساتھ کام کرتے دیکھا۔ ہاتھ میں ایک بڑی سی قینچی لیے وہ ڈھیر میں سے ایک ایک اخبار اٹھاتے جاتے' اس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور اخبار میں جہاں جہاں نشانات لگے ہوتے اس حصے کو کاٹ کر ایک کاغذ پر لیئی سے چسپاں کرتے۔ تمام دن انگلیاں قینچی چلاتیں اور ہاتھ تراشوں کو کاغذ پر چسپاں کرتے اور پھر ان کاغذوں کی وہ ترتیب و سلیقے کے ساتھ الگ

ڈھیریاں بناتے جاتے اور پھر یہ ڈھیریاں متعلقہ افسروں کے میزوں پر منتقل ہو جاتیں۔ یوں بابا کی اخبار اور اخبار سے متعلق کام سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ پڑھے لکھے تو واجبی ہی تھے مگر کام کی نوعیت ایسی تھی کہ ہمہ وقت پڑھائی لکھائی ہی سے واسطے میں رہتے۔ کچھ عرصے بعد شام سے بھی ایک اخبار نکلنے لگا اور بابا دفتر سے نکل شام کو سیدھے صدر پہنچتے اور اخباروں کے بنڈل ہاتھ میں لیے [illegible] ہر قیمتوں کو زور زور سے پکارتے ادھر ادھر چکر لگاتے، یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگتا [illegible] سورج کی پیلی پیلی دھوپ پر شام کا ملگجا جھٹپٹا غالب آنے لگتا، تو وہ دن بھر کے تھکے ماندے [illegible] مندے کے بعد جتنا بچتے اپنی محبت اور مشقت کی اجرت اور اکل حلال [illegible] میں لیے گھر پلٹتے۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتے، فرش پر پڑی چٹائی پر لیٹ کر [illegible] کہ اتنے میں عشاء کی اذان ہو جاتی اور وہ مسجد کی راہ لیتے، اور پھر فجر پڑھ کر ہی [illegible] لیتے۔

وقت کی رفتار مسلسل اور پیہم ہے، یہ نہ رک سکتا ہے، نہ ختم ہو سکتا ہے، یہ رفتار پل، سیکنڈ، منٹ اور گھنٹوں سے گزرتی ہوئی سالوں اور صدیوں سے چلتی ہے، یہ سلسلہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ وقت کی رفتار یوں ہی قائم رہے گی، وقت نہ ٹھہرتا ہے اور نہ تھکتا ہے اور ہماری اس کائنات کی ہر شے بھی اسی انداز میں متحرک ہے اور اسی حرکت میں زندگی ہے کہ جامد اور ٹھہری ہر شے کو بے جان تصور کیا جاتا ہے۔ وقت کی آغوش میں حالات اور ماحول بدلتے رہتے ہیں، بڑے بڑے انقلاب جنم لیتے ہیں، تہذیبیں عروج پاتی ہیں معاشرے زوال پذیر ہوتے ہیں اور صرف تاریخ کے صفحات میں زندہ رہ جاتے ہیں۔ حال ماضی بنتا ہے اور مستقبل حال اور پھر یہ حال بھی ماضی کی گود میں آسودہ ہو جاتا ہے۔ عمریں بڑھتی ہیں یا گھٹتی ہیں، معلوم نہیں؟ شاید نوجوانی میں ہم عمر کو بڑھتا محسوس کرتے ہیں اور پھر عمر کا ڈھلاؤ عمر گھٹنے کا احساس دلانے لگتا ہے اور وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار عمر کو تھوڑا اور اپنی لپیٹ میں لیتی ہے تو پھر، چاپ سنائی دینے لگتی ہے اور پھر یہ چاپ ہر چیز پر غالب آ جاتی ہے۔ وقت کڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح چلتے ہوؤں کو آہستہ خرامی پر مجبور کرتا ہے۔ تناور درخت کی طرح کھڑے ہوؤں کی کمریں جھکی اور خمیدہ نظر آتی ہیں وقت سروں پر برف جماتا ہے، گلاب کی طرح کھلے شاداب شگفتہ چہروں پر جھریاں ڈالتا ہے، گرم سنسناتا خون سرد ہوتا اور پھر یہی وقت نوخیزوں میں چلوؤں گرم گرم خون اچھال اچھال کر ان کو نوجوانی، جوانی کی دہلیز پر کھڑا کر کے ایڑ، ایڑا کر چلنا سکھاتا ہے، حرارت اور تندی سے زندگی عبارت ہوتی ہے اور زندگی پھیلتی پھولتی ہے، نسلیں پروان چڑھتی ہیں ایک نسل کی جگہ دوسری نسل لیتی ہے یہ سلسلہ نہ معلوم کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ وقت نے مولوی صاحب کی کمر کو خمیدہ کیا، بابا کی کنپٹیوں پر برف اتر آئی، میرے لڑکپن پر جوانی چڑھ آئی، میں مولوی صاحب کے مکتب سے اٹھ کر اسکول پہنچا اور وہاں سے کالج اور یونیورسٹی۔ گھر کے حالات کو بھی وقت نے بدلا، ایک طویل عرصہ تنگی میں گزارے کے بعد بابا

ایک مختصر سے گھر پکے 'جی' ٹائپ کوارٹر کے الاٹمنٹ کے مستحق ٹھہرے' اخباروں اور رسالوں کا کام بھی بڑھا اور مستقل ہمہ وقت صبح شام حرکت میں رہنے والے ان کے پیروں کو سائیکل کے پیڈلوں اور پہیوں کا سہارا نصیب ہوا اور میری تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو اپنا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔ پھر میرا یہ شہر بھی پھیلتا بڑھتا گیا' ویرانے آباد ہوتے گئے' تازہ بستیاں آباد ہوتی گئیں' مشرق و مغرب' شمال و جنوب ہر چہار سمت ایک بڑے اژدہے کی طرح اس نے اپنے پنجے جمالیے' گھیرے اور بہت گھیرے۔ شہر کیا انسانوں کا جنگل سا بن گیا' اور اس پھیلتی بڑھتی آبادی' انسانوں کے اس جنگل میں ہر چیز کھو گئی۔ پرانی ہر شے معدوم ہوتی گئی' یہاں تک کہ ان کی شناخت اور پہچان بھی مشکل ہو گئی۔ مگر کچھ لوگ اور بستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو نہ وقت بدل پاتا ہے اور نہ بدلتے ماحول اور حالات' وہ کسی چیز کے تابع نہیں ہوتے ہر چیز پر ان کا کردار اور شخصیت غالب رہتی ہے۔

مولوی صاحب ایسی ہی ایک شخصیت تھی' تیزی سے بدلتے حالات ماحول نے ان کے کردار اور شخصیت کو قطعی متاثر نہ کیا حتی کہ ان کے روزمرہ کے معمولات اور رہن سہن میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہی لباس' وہی اطوار' وہی رکھ رکھاؤ' ویسی ہی محبت اور شفقت' ہاں وقت نے قویٰ میں اضمحلال ضرور پیدا کر دیا تھا' بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے مگر جب تک تھوڑی سی بھی سکت رہی دکان پر برابر آتے رہے اسی انداز سے صبح سویرے پہنچ جاتے' چھوٹی سی دکان بھی ویسی کی ویسی تھی' حالانکہ گرد و پیش کا حلیہ ہی بدل گیا تھا' ماضی کی کوئی چیز بھی تو اپنی اصلی حالت میں نہ رہی تھی' مگر مولوی صاحب کی دکان اپنے ماضی کے تشخص کو ہر دور میں سنبھالے رہی تھی۔ جب نقاہت اور کمزوری زیادہ بڑھ گئی تو مولوی صاحب نے دکان پر بیٹھنا کم کر دیا۔ صبح کو آتے اور دوپہر سے پہلے پہلے چلے جاتے' دوپہر تک میں کالج سے پہنچ جاتا اور پھر شام کو بابا دیکھ بھال کرتے' مولوی صاحب کی ضروریات ہی کیا تھیں' دکان سے جو کچھ آمدنی ہوتی گزر بسر کے لیے بہت کافی تھی' وہ اب تک اسی کوارٹر میں قیام پذیر تھے جہاں ہجرت کے بعد ان کے ایک شناسا نے انہیں سر چھپانے کے لیے جگہ دی تھی وہ تو نہ معلوم کہاں گئے' مگر مولوی صاحب نے وہ کمرہ نہ چھوڑا' دوسرے صاحب جو الاٹی آئے' وہ بھی فقط میاں بیوی دو دم تھے' ان کو بھی دوسرایت تھی اور ایک بزرگ کا سہارا' پھر مولوی صاحب نے حسب توفیق ان کو کمرے کے کرائے کی ادائیگی بھی کی۔ میں نے دکان میں کچھ کتابیں اور رسائل بھی رکھنا شروع کر دیے' اور جب مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو ان کے کمزور اور نحیف چہرے پر خوشی کی سرخی پھوٹ پڑی' اس دن کچھ علیل بھی تھے' مگر میرے اور بابا کے منع کرنے کے باوجود ترنگ میں بھر کر اٹھ کھڑے ہوئے' دکان تک آئے اور کتابوں رسالوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے پھر ایک مدت کے بعد اپنے کتب خانے کا تذکرہ بھی کیا اور تادیر اسی کی باتیں کیا کیے' مجھے ہدایت کی کہ کتابوں اور رسالوں کی تعداد اور بڑھاؤں۔ یہ مولوی صاحب کی دکان پر آخری آمد تھی۔ روبہ انحطاط

صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی‘ میرا اور بابا کا زیادہ تر وقت اب ان کے پاس ہی گزرتا۔ میں تو رات گئے تک ان کے ساتھ رہتا۔ اور صبح سویرے پھر پہنچ جاتا اور جب بابا آ جاتے تو وہاں سے ہٹتا۔ ہمارے پیچھے کوارٹر کے مالک اکرام صاحب اور ان کی بیگم بھی مولوی صاحب کا خیال رکھتیں۔

اور اس روز تو سہ پہر سے ہی طبیعت بگڑنا شروع ہوئی تھی‘ تنفس میں غیر معمولی تیزی تھی‘ آواز میں نمایاں نقاہت اور کمزوری تھی‘ میں دکان سے حسب معمول پہنچا تو ان کی متغیر حالت دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا‘ طبیعت ہول سا کھانے لگی بابا ان کے سرہانے بیٹھے تھے مجھے ان کے چہرے پر ہراس اور پریشانی کی پرچھائیاں تیرتی نظر آئیں‘ برابر ہی اکرام صاحب بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے الگ لے جا کر بتایا ”ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا ہے اور حالت تشویشناک بتاتی ہے‘ ہسپتال میں داخل کرانے کو کہتا تھا مگر مولوی صاحب ”کسی صورت راضی ہی نہیں ہوتے‘ تم کہہ کر دیکھو‘ تمہاری بات مان جائیں گے۔“

میں بڑھ کر مولوی صاحب کی پٹی تک گیا‘ ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا ہاتھ اپنے نحیف و نزار ہاتھوں میں بھینچ لیا نیم وا آنکھیں کھول دیں‘ میرے چہرے پر ایک ٹکٹکی باندھے دیکھا کیے‘ ان کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں ثانیہ بھر کے لیے عجیب سی جوت چمک اٹھی میں نے کہا

”مولوی صاحب ہسپتال چلیں‘ ڈاکٹر کہہ کر گیا ہے۔“ انہوں نے پھر ایک نظر مجھے دیکھا اور سر سے نفی کا اشارہ کیا اور اپنی انگشت شہادت کو اوپر کی طرف اٹھا دیا‘ نہ معلوم کس بات کی گواہی اور کس چیز کی شہادت دے رہے تھے‘ شاید موت کے اٹل حقیقت کی مالک حقیقی کے بلاوے کی ۔۔۔ مجھے تیزی سے دھڑکتا ہوا دل حلق میں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ مولوی صاحب نے میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ کر لیا‘ پھر مجھے ایک صندوق کی طرف اشارہ کیا جو اس مختصر سے کمرے میں رکھی ہوئی چند چیزوں میں سے ایک تھا‘ مولوی صاحب کی چارپائی کے علاوہ‘ ایک نماز کی چوکی‘ دو بید کے موڑھے تھے‘ نماز کی چوکی پر ایک مصلیٰ یک جانب‘ تہہ کیا ہوا رکھا تھا‘ اور دوسری طرف رحل پر قرآن پاک تھا‘ میں نے مولوی صاحب کا اشارہ سمجھ کر صندوق کھولا‘ مولوی صاحب نے گردن موڑ کر آہستہ سے کہا

”کپڑوں کے نیچے ایک کاغذ ہے اس کو نکالو‘ اور ایک بٹوہ بھی ہے وہ بھی۔“ مولوی صاحب کے چند جوڑے کپڑے بڑے سلیقے سے تہہ کیے رکھے تھے اور اس کے نیچے ایک اسٹامپ پیپر اور ایک بٹوہ نظر آیا۔ میں نے دونوں چیزیں لا کر مولوی صاحب کو دیں۔ انھوں نے اشارے سے مجھے اسٹامپ پیپر پڑھنے کو کہا۔ میں نے اسٹامپ پیپر کے مندرجات پڑھے تو یہ مولوی صاحب کی دکان کے مالکانہ حقوق کی میرے نام باقاعدہ قانونی طور پر منتقلی تھی۔ مجھے اپنے وجود میں لرزش خفی کا احساس ہوا۔ مولوی صاحب نے میری داخلی کیفیت کا اندازہ کر کے مجھے اور قریب بلا کر ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا اور

ان ہاتھوں کی نرم وگداز گرمی میرے ٹوٹتے بکھرتے وجود میں یوں جذب ہوتی گئی جیسے کسی نیم جاں جسم میں زندگی کی نئی لہریں نفوذ کرتی ہیں۔ میری آنکھوں میں نمی تر آئی۔ پھر مولوی صاحب نے مجھ سے بٹوہ کھولنے کو کہا' اس میں چند سو روپے تھے۔ مولوی صاحب نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے نحیف آواز میں کہا۔

''بس بیٹا...........اس سے میری آخری رسوم ادا کر دینا.....''

ایک صندوق' ایک چارپائی' دو بید کے موڑھے' نماز کی ایک چوکی' ایک رحل قرآن پاک' چند جوڑے کپڑے اس درویش کا کل اثاث البیت تھا اور بقدر اپنے کفن کے چند سو روپے زندگی بھر کا اندوختہ' ایک دکان کل جائیداد، جو اپنی زندگی کی ایک طویل مدت کرائے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں گزار کر اسی کمرے سے اپنے آخری سفر کی روانگی کے لیے اپنے اللہ کے حکم کا منتظر تھا۔

بڑھتی ہوئی رات ڈھلنے لگی۔ رات کا اندھیرا صبح کے سپیدے میں گم ہو جانے کے لیے سحر کے اجالے میں دم توڑنے کے لیے آہستہ آہستہ اپنے ناگزیر انجام کی طرف بڑھتا رہا۔ اور اس چھوٹے سے کمرے میں جوں جوں رات ڈھلی مولوی صاحب بھی اپنی آخری منزل سے قریب ہوتے گئے۔ یٰسین شریف کی تلاوت کرتے ہوئے میری آواز آپ ہی آپ بلند ہوتی گئی۔ بابا اور اکرام صاحب بھی مولوی صاحب کی پٹی سے لگے کلام پاک پڑھ رہے تھے۔ ہم تینوں نے سر اٹھا کر بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ میری نظر کھڑکی سے باہر دم توڑتے اندھیرے میں تیرگی جس پر سپیدۂ سحر غالب آ رہا تھا اور پھر چند ثانیے میں پوری فضا میں سرخی پھوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے کل کائنات نور سے معمور ہو گئی' میں نے پلٹ کر دیکھا مولوی صاحب کا چہرہ نور ہی نور تھا۔ وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرا رہے تھے اور مسکراتے ہی مسکراتے انہیں ایک ہلکی سی ہچکی آئی اور پھر آنکھیں مند گئیں' ہمیشہ کے لیے۔ وہ ابدی نیند سو گئے۔

مولوی صاحب کیا گئے اپنے ساتھ ایک عہد لے گئے۔ اس دور کے لوگ اب بس اپنے درمیان خال خال ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی یوں کہ ان کے وجود اس کی شخصیت کو ہی لوگ در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اب وہ تہذیب ہی اٹھ گئی' وہ اقدار و روایات ہی نہ رہیں جن کے یہ بزرگ امین تھے۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد کافی دن تک تو دکان کی جانب میرے پاؤں ہی نہ اٹھ سکے اور جب غم کے اثرات کا وقت نے مرہم نے تھوڑا بہت اندمال کر بھی دیا' تب میں دل گرفتگی کے عالم میں دکان پر پہنچا۔ دکان گرد میں اٹی بے ترتیب سی پڑی تھی۔ یہ سوچ کر کہ کل دکان کو آ کر ٹھیک کروں گا' میں فٹ پاتھ پر آ کر کھڑا ہوا۔ فٹ پاتھ وہی تھا جہاں میرے بچپن نے مولوی صاحب سے درس علم لینا شروع کیا تھا۔ جہاں اخبارات بیچ کر میں معاش کسب معاش کے مطلب سے آشنا ہوا تھا جس نے میری زندگی پر بڑے گہرے نقوش مرتسم کیے تھے۔ بیتے

دنوں کی دھندلی دھندلی سی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ تادیر اطراف و ماحول سے بے خبر یہ فلم دیکھا کیا کہ مسجد سے اذان کی آواز نے ماضی کی اس [illegible] کا سلسلہ توڑ دیا۔ مسجد میں جا کر نماز مغرب ادا کی تب طبیعت ہلکی اور مائل بہ سکون ہوئی۔

دکان کو میں لے نئے سرے سے جماتا رہا [illegible] ہر وقت رہتا کہ یہ دکان ہی زندگی بھر اب روزی کا ذریعہ رہے گی، حالانکہ تعلیم کا سلسلہ بھی ذوق و شوق سے جاری تھا اور اچھی نوکری کے لیے ساتھ ہی ساتھ تگ و دو بھی کہ اچھی نوکری کی آرزو جیسے بوڑھے وجود میں جوانی تو جوانی سے پل بڑھ رہی تھی۔ پھر ایم۔ اے میں [illegible] سے کامیابی حاصل کرنے کے باوجود بھی تمام کوششیں سعی لا حاصل ثابت ہوتی چلی گئیں تو [illegible] چپ بیٹھ رہا۔ جب دوسرا ایم۔ اے کرنے کے بعد بھی ہر دروازے سے ناکام و نامراد [illegible] میں برسوں سے پلتی بڑھتی آرزو بھی سرد پڑ گئی، ان کو بھی صبر ہی کرتے بن پڑی [illegible] اچک کر مولوی صاحب کی محبت کے طفیل دکان کے تختے پر جا بیٹھا [illegible] جہاں اس کا درویش صفت مالک بیٹھتا تھا اور یہ شاید مولوی صاحب اور ان کی دکان سے [illegible] کا نتیجہ تھا کہ دکان صرف کتابوں اور رسائل کی دکان میں بدلتی گئی۔ اخبارات کی ایجنسیاں [illegible] باعث مل گئیں، اور اب میرا رشتہ کتاب و علم سے یوں جڑ گیا کہ وہ میری روزی کا بھی واحد ذریعہ بن گیا۔ صبح سویرے جب اخبار فروش اخبارات لینے میری ایجنسی پر آتے تو ان میں نوعمر لڑکے بھی شامل ہوتے جو روزانہ مجھے اپنا ماضی یاد دلاتے رہتے۔

دکان کے اطراف میں تبدیلی تو مولوی صاحب کی زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی مگر اب تو یہ جگہ جیسے پہچان ہی میں نہ آتی۔ مارواڑی کے چھوٹے سے ہوٹل کی جگہ ایک ماڈرن ریستوران نے لے لی تھی۔ کالج کی لمبی چوڑی عمارت اور اس کے ساتھ ساتھ کئی کثیر المنزلہ عمارات کو دیکھ کر گمان بھی نہ ہوتا کہ یہ وہی جگہ ہے جس کا نقشہ میری ماضی کی یادوں کے ساتھ میرے دماغ و ذہن پر ثبت ہے اور اسی جگہ پر کیا منحصر میرا یہ شہر ہی ایسا بدلا تھا کہ پچھلی باتیں محض خواب و خیال ہی معلوم ہوتیں، یقین ہی نہ آتا کہ ہم اسی شہر میں رہتے بستے ہیں۔ اب اس شہر میں تیسری نسل پروان چڑھ رہی تھی، مولوی صاحب اور بابا کی تیسری نسل، وہ جس نے یہاں جنم لیا، پلی بڑھی، یہ شہر جس کی جنم بھوم ہے، جو اس کی مادر گیتی ہے۔ وہ نسل اب جوان ہو چکی اور دفتروں، کارخانوں میں سرگرم عمل ہے اور کالجوں یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم بھی، اسی نسل کے گروہ کے گروہ میں کالج کی عمارت اور تمام علاقے میں گھومتے پھرتے دیکھتا۔ ان میں سے کچھ وہ کہ جن کو کتابوں رسالوں سے دلچسپی تھی میری دکان پر بھی آنے جانے لگے تھے، مگر چند ہی سنجیدہ ادب میں دلچسپی لیتے، بیشتر سنسنی خیز کہانیوں اور ڈائجسٹوں کے دلدادہ تھے۔ ان میں فیصل اور نسرین بھی تھے، یہ دونوں دوست

ذرا بے تکلف قسم کے لڑکے تھے' بے جھجک ہو کر بات کرتے' اچھی خاصی محفلیں رہتیں' بحث مباحثے ہوتے' سیاست پر بات ہوتی' مگر بات زیادہ تر مقامی سیاست اور وہ بھی نچلی سطح کی گروہ بندی اور طلبہ تنظیموں سے متعلق رہتی۔ ان لوگوں کی بات چیت اور مباحث سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس نسل میں ایک تلخی سی رچتی بستی جا رہی ہے۔ ایک گونا بیزاری کا احساس جس میں سے کبھی کبھی تنفر بھی جھلک پڑتا' ہر چیز سے نفرت' حتیٰ کہ اپنے ملک تک سے احساس تنفر میں مبتلا اور یہ بڑا ہی المیہ تھا' جس میں یہ پوری نسل مبتلا معلوم ہوتی۔ اور میں کبھی کبھی تنہائی میں ان کے تحرکات پر غور کرتا تو ان عوامل کے کسی منطقی نتیجے پر نہ پہنچ پاتا۔

بابا اور مولوی صاحب کی نسل کا تو خیر سوال ہی نہیں میری نسل بھی جو یہاں پل بڑھ کر جوان ہوئی اس میں بھی کبھی ایسے احساسات نہ بیدار ہوئے' ایک رشتہ تھا' عجیب و غریب رشتہ' ایک غیر محسوس اور غیر مرئی طاقت تھی جو رابطے کا باعث تھی اور وہ غیر محسوس اور غیر مرئی قوت' غیر محسوس طریقے سے ہی معدوم ہوتی چلی گئی' ایک رابطہ تھا جو مولوی صاحب اور بابا کی نسل اٹھ جانے کے باعث رخصت ہوتا گیا' رشتے ٹوٹتے گئے اور تمام تار و پود بکھرتا چلا گیا' اور اب فیصل اور سہیل کی نسل ٹوٹی اور بکھری ہوئی ہے' خانوں میں بٹی' احساس محرومی میں دبی تلخ' نفرتوں کے آتش فشاں دہانوں پر کھڑی' پھر میں یہ بھی سوچتا کہ احساس محرومی ہے کون سے جو دوچار نہ رہا خود میری مثال میرے سامنے تھی اور مجھ جیسے نہ معلوم کتنے اور تھے' مگر ایسے احساسات تو کبھی نہ بیدار ہوئے اور اس کا جواب' ٹٹولتے ٹٹولتے میں ماضی' حال اور مستقبل میں گم ہو جاتا مگر سرا نہ پکڑ سکتا' شاید سرا ہی گم ہو گیا تھا' مگر اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ دوسرا سوال تھا اور دونوں سوال مل کر ایک گتھی بنا رہے تھے جو سلجھتی نہ معلوم ہوتی۔

اور پھر تمام کی تمام فضا میں زہر گھلتا گیا' نفرتوں کا زہر' بارود کا زہر' زہر اور صرف زہر ہی زہر۔ محبتوں کے میرے اس شہر پر آگ و خون کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ روشنیاں بجھا دی گئیں تاریکیوں نے ڈیرا جما لیا۔ اندھیروں کے پرہول سائے دن کے اجالوں پر بھی غالب آتے چلے گئے' دن سنسان اور ویران اور راتیں مہیب اور ہیبت ناک ہوتی گئیں۔ انسانی خون پانی کی طرح گلی کوچوں میں بہتا' شہر بھر میں چنگاریاں چٹخیں' آگ کے شعلے بھڑکتے۔ شہر کیا جنگل سا بن گیا' درندوں اور حیوانوں کا مسکن جنگل۔ وہ جنگل میں تو جنگل کا ہی قانون چلتا ہے اور اس جنگل کا کوئی نہ کوئی خونی واقعہ روزانہ اخبارات کی زینت بنتا۔ آتشزنی لوٹ مار' اغوا' تشدد اور قتل کی خبروں سے اخبارات کے صفحات بھرے ہوتے۔ بستیوں اور محلوں میں کہرام بپا رہتا اور ایسے میں افواہوں کا زہر فضا میں مزید زہر گھولتا۔

صبح کو اخبار دھڑکتے دل اور ایک ہمہ وقت مسلسل جاگزیں خوف کے تحت اٹھاتا' ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں کے برعکس خبریں ملتیں' صبح کو شہر کی صحیح صورت حال کا علم ہوتا۔ کئی روز سے گھر میں بند پڑا تھا۔ کرفیو لگا تار کئی دن کے بعد کھلتا بھی تو بس سودا سلف لینے جاتا اور پھر گھر میں مقید ہو جاتا۔ کرفیو کے وقفے

کے دوران دکان کھولتا بھی تو کس لیے ایسے میں بھلا کون رسالے کتابیں خریدنے آتا' لوگوں کو دو وقت کا چولہا گرم کرنے کی ہی فکر رہتی۔

اس روز بھی رات' اہل محلہ نے جاگ کر گزاری تھی اور یہ ڈیڑھ ماہ سے شہر بھر میں محلے محلے کا معمول تھا' فجر کی نماز کے بعد سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی' دماغ بوجھل ہو رہا تھا اور دل ہر وقت نت نئے اندیشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ صبح صادق کے آثار نمایاں ہو چکے تھے' میں چھت پر چلا گیا کہ شاید صبح کی تازہ ہوا سے طبیعت کچھ بہتر ہو۔ ملگجا جھٹپٹا چھٹ رہا تھا اور تیرگی کا جالا اپنا عکس سمیٹنے والا تھا' میں چند منٹ چھت پر ٹہلا کیا' ہوا کے تازہ جھونکوں سے طبیعت میں قدرے فرحت اور تازگی پیدا ہوئی۔ مشرق کی جانب نظر کی تو سورج کا آتشیں گولا بلند ہو رہا تھا' دھندلی دھندلی سی فضا سے ہر چیز بہت صاف اور واضح نظر آنے لگیں' میں نے سڑکوں پر نظر ڈالی' سڑکیں ویران اور سنسان تھیں' کبھی کبھار کوئی پولیس وین یا فوجی ٹرک گزرتا تو سناٹا ٹوٹتا' رات بھر جاگنے والا شہر اب تک سو رہا تھا۔ چند لمحوں ہی میں مشرق میں سرخی پھوٹ پڑی' لتھڑا لتھڑا سا خونی سورج طلوع ہو چکا تھا۔ ہر طرف فضا میں ایسی سرخی ہو گئی جیسے آسمان سے خون کی بارش ہو رہی ہو۔ میں گھبرا کے نیچے اتر آیا' اخبار دروازے میں پڑا ہوا تھا۔ کھول کر دیکھا تو وہی سرخیاں تھیں جن سے میرے شہر کی باسیوں کی نظریں نہ معلوم کب سے عادی ہو چکی تھیں۔ مگر اب خبر کی سرخی نے میرے وجود میں دوڑتے خون کی لہروں کو تیز کر دیا۔ جہاں میری دکان تھی وہاں کئی کثیر المنزلہ عمارتوں کے جلنے کی خبر تھی' اخبار نے لکھا تھا کہ ان عمارات کے جلنے سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا ہے۔ میری طبیعت ہول سا کھانے لگی' کرفیو کھلنے کے اوقات پر نظر ڈالی' دو گھنٹے بعد کرفیو میں ایک گھنٹہ کا وقفہ تھا۔

اور کرفیو کھلتے ہی میں نکل کھڑا ہوا' شہر کی سڑکوں پر ہجوم تھا' ایسا ہجوم کہ چلنا دوبھر' میرے شہر کی سڑکیں تو ہمیشہ ہی پر ہجوم رہتیں' مگر یہ ہجوم نہ تھا' اس میں فوجی ٹرک شامل تھے' پولیس کی گاڑیاں تھیں وہ کہ جن پر جوان مشین گن تانے کھڑے تھے' لوگوں کے چہروں پر خوف تھا' پریشانی تھی' کھانے پینے کی دکانوں پر یلغار تھی' پیٹ کی آگ کو تو ہر صورت بجھانا ہی پڑتا ہے۔ میں ماحول اور اطراف سے لاپرواہ بڑھتا رہا' فضا میں دھوئیں' آگ' خون اور بارود کی بو تھی اور اب اس شہر کی آلودہ فضا کو ان نئی آلودگیوں نے اور زیادہ آلودہ بنا دیا تھا' میں جوں جوں دکان کی طرف بڑھتا رہا' میرے دل میں پلتے بڑھتے خوف میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور جب دکان کے قریب پہنچا تو چلنا دوبھر ہو گیا' قدم ہی نہ اٹھتے۔ چاروں طرف عمارتیں جلی ہوئی تھیں۔ کالے دبیز دھوئیں میں اٹی ہوئی۔ ملبوں کا ڈھیر اور چاروں طرف دھوئیں اور سیاہی کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے بھی تاریکی چھانے لگی۔ دل پر جبر کر کے دکان کی طرف دیکھا' مگر وہاں تو اب کچھ بھی نہ تھا۔ تاریکی تھی اندھیرا تھا بس! اور تاریکی کی اس چادر کو چیرتا میں فٹ پاتھ کے دوسرے

کنارے جا کھڑا ہوا۔ نہ معلوم کیسے، جیسے ایک نجانی قوت مجھے کشاں کشاں کھینچ کر وہاں لے گئی جس جگہ سے بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی ہر دور کی یادیں وابستہ تھیں۔ جو مولوی صاحب اور بابا سے وابستہ یادوں کا گہوارہ تھی، مگر وہ جگہ اب راکھ اور ملبے کا ڈھیر تھی اور میں اپنی اس خاکستر کائنات پر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی اپنے ہمدم دیرینہ اور پیارے کی میت پر اور اس ملبے پر میرا پورا وجود نوحہ کناں تھا۔ دلدوز چیخیں تھیں کہ میرے اندر سے اٹھ رہی تھیں مگر میرا حلق تو بند سا تھا، حلق جواب دے چکا تھا، اندر ہی اندر سے کچھ لاوے کی طرح پک رہا تھا جو میرے سارے بدن کو ہی جھلسائے دے رہا تھا۔

اور میں اپنے جلتے بجھتے وجود کو سنبھالے، دکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا، جلے ہوئے صفحات کے ڈھیروں کو اپنے قدموں تلے روندنے سے بچا تا کہ میرے نزدیک تو جلے ہوئے لفظوں کی بھی حرمت تھی۔ دکان میں موجود انسان کی نسل کی ترقی ہوئی بڑی بڑی عمارات زمین بوس ہو گئی تھیں وہ کہ جن کے جلنے اور برباد ہونے کے نقصان کی خبر صبح اخبارات میں چھپ چکی تھی، مگر یہ تو ایسا نقصان عظیم تھا جس کا اندازہ روپے پیسے کی مالیت میں لگانا ممکن نہ تھا۔ موپساں، چیخوف، جیمس جوائس، ہارڈی، ہیمنگوے اور نہ معلوم کس کس کی کیسی کیسی کہانیاں جل کر بھسم ہوئی تھیں۔ غالب، میر، اقبال، فیض و جگر، شیلے، کیٹس کی شاعری جلی تھی۔ کرشن کا "ان داتا" اپنے ان داتا کے چرنوں میں گڑگڑا گڑگڑا کر فریاد کر رہا تھا۔ شہاب کا "یا خدا" اپنے خدا کے سامنے دونوں ہاتھ جانب آسماں اٹھائے اپنے وجود کی راکھ کو دونوں ہتھیلیوں سے فضا میں اڑا اڑا کر اپنے مالک ارض و سما کے سامنے گریہ کناں تھا۔ ہیزلٹ، ورجینیا وولف، لارڈ میکالے کے Essay راکھ کے ڈھیر، برٹرینڈ رسل کی فکر و دانش خاک ہوئی تھی۔ شیکسپیئر کا ایک ایک فرد رو رہا تھا۔ Tall Staff بھی اس تباہی و بربادی پر اشکبار تھا۔ ادب اور ادب کی ہر صنف جل چکی تھی۔۔۔

اور میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں سفید ریش، نورانی چہرہ اور وہ ملبے پر بیٹھے اس خاکستر کو کریدتے ہیں۔ جلے ہوئے صفحات کے راکھ کے ڈھیر سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکالتے ہیں۔ چہرے پر بڑا ہی ملال اور آنکھوں میں کرب ہی کرب، بڑی حسرت و یاس سے ایک ایک جلے ہوئے نسخے کو دیکھتے ہیں، کرب انگیز آنکھوں میں آنسو چھلک چھلک آتے ہیں اور پھر مایوسی کے عالم میں ان کو ملبے میں ڈال دیتے ہیں۔ میں عالم بے خودی میں، بڑے والہانہ انداز میں ان کی جانب بڑھتا ہوں وہ کشش شخصیت کا وہ سحر جو میرے بچپن سے لے کر ان کے تادم واپسیں مجھ پر طاری رہا، مجھے ان کی جانب کھینچتا ہے۔ اور جب میں بڑھ کر وہاں پہنچا تو وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ ہاں ایک تصویر نظر آئی جو ملبے پر جلے ہوئے کاغذات کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ ایک مشہور پرانے اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی ایک عجیب و نادر تصویر، جس کو میں نے نہ معلوم کیوں اور کس جذبے کے تحت محفوظ کر لیا تھا۔ اخبار کا وہ صفحہ تو پورا چاروں طرف سے جل گیا تھا، مگر تصویر پوری کی پوری صحیح سلامت تھی جیسے کسی نے اخبار سے تراش کر فریم کرانے کے لیے رکھ

دی ہو۔

اور پھر میں نے اس انوکھی تصویر کو فریم کرا کے اپنی خاکستر کائنات کے اوپر ٹانگ دیا اس امید موہوم پر کہ میرے شہر کے باسی اپنے ہی شہر کے ایک شہر خموشاں کی تصویر سے کچھ درس لے سکیں۔

تصویر جو پکار پکار چیخ چیخ کر میرے شہر کے زندہ چلتے پھرتے لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی۔۔۔"اے نطق کی غلام اولاد آدم دیکھو اس شہر خموشاں" کی تصویر کو کہ جہاں دو ازلی و ابدی دشمن ساتھ ساتھ رہتے اور جب ان میں سے ایک نئی نسل کو جنم دینے کے بعد چل بسا تو دوسرے نے اس کی نئی نسل کو اپنی نسل کے ساتھ پروان چڑھانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ دیکھو اس خونخوار جانور کتیا کو جو اپنی جبلت کے خلاف اپنے بچوں کے ساتھ اس شہر خموشاں کی باسی بلی کے بچوں کو بھی دودھ پلاتی ہے جن کی ماں ان کو جنم دے کر چل بسی ہے۔ آؤ اور دیکھو کہ کس طرح یہ کتیا اپنے وجود سے زندگی نچوڑ نچوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ حیات بیز قطرات ننھے ننھے آنکھیں موندے بلی کے بچوں کے منہ میں بھی ٹپکا رہی ہے۔"

اور میں نے دیکھا کہ آدمیت اور انسانیت کے داعی جوق در جوق آتے ہیں اس تصویر کو دیکھتے ہیں اور سر جھکا کر سوچ میں گم چلے جاتے ہیں۔۔۔نہ معلوم کس سوچ میں گم"۔۔۔

بھروسا

نذیر احمد ڈپٹی

کلیم شش بجے کے منصوبے سوچتا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکھٹو بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی۔ تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخصیت کی حیثیت یہ تھی۔ کہ شاید اس کا نانا (وہ بھی حقیقی نہیں) ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار' دوسرے اعتبار منصب' اردلی کا جمعدار' تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی۔ اس پر خود اس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا' یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کے رو داروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے (باوجودیکہ دور کی قرابت تھی) حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمے لیا' جمعدار اپنی حیات میں تو ایسا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے۔ پوتے۔ نواسے کثرت سے تھے انھوں نے اعتنا نہ کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر ان کے ورثا نے بہزار دقت کٹلر کے پہلو میں ایک چھوٹا سا قطعہ رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینے کے کرایہ کی دو دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی تین آدمی۔ اور سات روپیہ کی کل کائنات۔ اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان۔ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا۔ اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتے ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیرزادگی تھے تو کیسے نبھے۔ دوکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہت بکی' مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو۔ پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی۔ سر پر دہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب۔ نیچے کوئی طرحدار ساڑھا کے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو

بانات مگر سات روپیہ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی۔ بس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سرخ نیفہ کا پائجامہ۔ اور ایسے پائنچوں کا ہوا توکل دار۔ اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ سو ہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں۔ اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا ریشمی ازاربند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض جب دیکھو تو مرزا صاحب اسی ہیئت کذائی سے چھیلا بنے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے۔ اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال کبھی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جعدار کا سب ترکہ مرزا کو ملا اور جعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔ اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا۔ تو سیدھا جعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ باہر سے پکارنے اور کنڈی کے کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا کہ ”کون صاحب ہیں؟ کون صاحب ہیں؟ اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟“

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ، جن کا یہ مکان ہے اور کون مرزا۔ لونڈی۔ میاں یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی کواڑ بند کر لے۔

کلیم۔ کیوں جی کیا یہ جعدار صاحب کی محلسرا نہیں ہے؟

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے؟ کیا ظاہر دار بیگ جعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے مرزا ظاہر دار بیگ جعدار کا وارث بننے والا کون ہے۔؟

دوسری لونڈی۔ اری کمبخت ایہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں

جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نہ جن کی رنگت زرد زرد ہے؟ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ ہاں ہاں! وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی۔ تو میں اس مکان کے پچھواڑے، بیلوں کی نال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اس میں رہتے ہیں

کلیم نے وہاں جا آواز دی۔ تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب۔ تنگ دھڑ تنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور ہم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے آہا آپ ہیں معاف کیجئے میں سمجھا' کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو لیٹرا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں۔ تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ چلیے تو کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو۔ تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا' تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت چھوٹی سی مسجد ہے' وہ بھی ویران وحشت ناک' نہ کوئی حافظ ہے' نہ ملا' نہ طالب علم' نہ مسافر' ہر رہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھڑ نجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کر کے جب کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے۔ "کہ بندہ کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے' خفقان کا عارضہ' اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا۔ تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے تو یہ فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟"

کلیم نے باپ کی طلب' اپنا انکار' بھائی کی التجا۔ ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو

مرزا۔ خیر نیت شب حرام۔ صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے' میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں' اور مجھ کو مریضہ کی تیمار داری کے لیے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علامت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دہری فصیل [illegible] میں متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹڑے اور گنج اور دوکانیں اور سرا میں ہیں۔ میں جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہو گی۔ جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک [illegible] کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے۔ ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تم جمعدار کے تمام ترکہ پر قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں [illegible] تمام [illegible] کا ایک تنکا بھی نہیں دیکھا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات [illegible] مدت تک سے آپ سے محبت رہی۔ مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ [illegible] بات جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ [illegible] اپنا جانشین [illegible] تھے۔ شہر کے کل روسا اس سے واقف و آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد [illegible] یاں کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ [illegible] ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ۔ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ [illegible] روز سے واویلا مچی ہوئی ہے [illegible] بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا۔ تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور [illegible] سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور ماحضر کی تیارداری کروں۔

کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا! میں نے تو لمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جئے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنی شروع ہوں گی۔ اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گی۔

تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔

دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا۔ کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ھو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے۔ تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ "سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

مرزا۔ سچ کہتے ہو! نہیں۔ جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کے بھنوں تم کو دونوں کو کافی ہوں گے۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے باہر گئے۔ اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے۔ یا تو کم کے لائے۔ یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار! ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ۔ دیکھو تو کیسے جلس رہے ہیں! اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے اد یکھئے اتنی تو رات ہو گئی ہے۔ مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے بہ تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھئے۔ کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا۔ ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور ہے۔ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے۔ کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے۔

کلیم۔ فرمایئے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں۔ جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریاد لے کر گیا۔ کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ کہ جوں میں نے زمین سے سر نکالا [illegible] چلنے لگا۔ مکولات اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں۔ کسی پر نہیں ہوتے نشو و نما سے میری آفت شروع ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں۔ ورنہ مجھے بیلوں کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار آور ہو تو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چرا جاتے ہیں [illegible] ت توڑتے ہیں۔ تو ہولے کرنے شروع کیے۔ پکا تو شاخ و برگ۔ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے [illegible] شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ۔ اس کو چکی میں ڈالیں۔ گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں۔ گھنگنیاں پکائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی سختیاں ہوا کرتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بے باکانہ چیں بہ جبیں ہونا [illegible] کس قدر ناخوش ہوئے۔ کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر چنا [illegible] رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں۔ کہ فرشتوں کے دندان [illegible] افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا' ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں!

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلا دیے۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا۔ اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی۔ جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی' نہ بہن نہ بھائی' نہ مونس' نہ غم خوار۔ نہ نوکر' خدمت گار' مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا' جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار۔ یا قفس میں مرغ نو گرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اسی وقت نہیں تو سویرے فجر دم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھتے تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں تیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی۔ تو نہیں معلوم مرزا یا محلہ کا کوئی عیار۔ ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ دری یعنی جو چیز کلیم نے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا کی تھی لے کر چمپت ہوا۔ یوں ہی کلیم بہت دیر کو سو کر اٹھتا تھا اور آج تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا۔ تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا ادھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اس

میں پانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جونہی زینہ پر چڑھا کہ کلیم مرتبی مطلب کے لیے لپکا وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا۔ یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہزار ہیئت دوسرے فاقے سے شام پکڑی۔ اور جب اندھیرا ہوا۔ تو اوسی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی۔ تو یہ جواب ملا کہ وہ بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے۔ اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا "کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں" اندر سے آواز آئی کہ "ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔"

"میرا نام کلیم ہے۔ اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بہت دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔"

"گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے۔ جو رات تمہارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا۔"

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا۔ کہ اندر سے آواز آئی۔ "مرزا زبردست بیگ دیکھنا! یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ اور دری تو اس سے لے لو۔" کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا۔ کہ زبردست نے چور چور کر کے جالیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ظاہر کیے۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا۔ اور کلیم سے اس کا حسب و نسب پوچھا۔ ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھجکتا تھا مگر چار و ناچار اس کو بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ۔ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے۔ کہ ان کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے۔ جو تم نے اپنا بیان کیا۔ محلّہ کا پتا گھر کا نشان جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمہاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں۔ بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی۔ مجھ کو باور نہیں ہوتا اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے۔ جرم سنگین ہے۔ ان کو حوالات میں رکھو۔ صبح ہو۔ میں ان کے والد کو بلواؤں۔ تو ان کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سن کر رو دیا۔ اور کہا میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے ور
آپ کو یقین نہ ہو۔ تو میں اپنے افکارِ تازہ آپ کو سناؤں۔ چنانچہ کل شب لو جو مسجد اور مرزا کی شان میں
کہا تھا سنایا۔ اس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کئے۔ اور ان کو حکم دیا کہ ان کو
میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ ان کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا۔ ورنہ واپس لا کر حوالات میں
قید رکھنا۔

کلیم پر اس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا جیسا کچھ شاق گزرا ہوگا۔ ظاہر ہے [illegible] سکتا تھا۔
سپاہی اس کو کشاں کشاں لے ہی گئے۔ محلے کی مسجد جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس کے گھر سے بہت
قریب تھی۔ صحن میں ایک شاداب چمن تھا۔ اور چمن کے بیچوں بیچ ایک مرتفع چبوترہ عجب تفریح کا مقام تھا۔
نصوح بیشتر نماز عشاء کے بعد خصوصاً چاندنی راتوں میں اس چبوترہ پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خداوند تعالیٰ
کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اس کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور نصوح کو وعظ و
پند کے طور پر ان کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔

نصوح اور اس کے مستمعین مسجد کے چبوترہ پر جمع ہو چلے تھے کہ کوتوالی کے سپاہی کلیم کو لئے ہوئے
آپہنچے۔ یہ اتفاق منجانب اللہ شاید اس وجہ سے پیش آیا۔ کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اس وجہ سے ذلیل
تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے سامنے اس کی گردن نخوت نیچی ہو۔ اب وہ انہیں
قلاوزیوں اور مردہ شویوں اور بھک منگوں اور ٹکڑ گداؤں کے روبرو اس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی
طرح دو سپاہی اس کی گردن پر سوار تھے۔ نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی دو وقت کے فاقے سے منہ
سوکھ کر ذری سا نکل آیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ
حال تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہوتا تو بہتر تھا۔ جوں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی۔ گویا ایک تیر سا کلیجے میں لگ
گیا۔ اگر پہلا سا نصوح ہوتا۔ تو نہیں معلوم عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر روتا یا سر پیٹنے لگتا۔ یا دوڑ کر بیٹے
کو لپٹ جاتا۔ یا سپاہیوں سے بے پوچھے گچھے دست و گریبان ہو پڑتا۔ خدا جانے اضطراب جاہلانہ میں کیا
ہوتا۔ مگر اب اس کی جملہ حرکات و سکنات معظم دینداری کی مطیع اور مؤدب خدا پرستی کی تابع تھیں۔ اس نے
ایک دم سرد بھر کر انا للہ و انا الیہ راجعون تو کہا اور اف بھی نہ کی۔ سپاہیوں نے اس سے کلیم کی نسبت پوچھا
تو اس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا "جب حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے دم تک بیٹا بیٹا پکارتے گئے تو میں
اس کے فرزند ہونے سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں" سپاہی تو اتنا سن کر رخصت ہوئے اور کلیم کو رفقائے نصوح
میں سے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔

نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ کیوں کلیم! میں نے ایسا کونسا قصور کیا تھا۔ کہ تم کو میری
طلعتِ منحوس تک دیکھنی گوارا نہ ہوئی۔ تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ شفقتِ اولاد ماں باپ کی

طینت میں تم اور اس کی جبلت میں داخل ہے۔ وہ شفقت جو اس وقت مجھ کو اس بات کی محرک ہوئی کہ میں سچ بیوں کے پیچے سے تمہاری نجات کا باعث ہو۔ وہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی تھی ور کرتی ہے ور ... ے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں۔ جو تمہاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو۔ میں نے تم سے نہیں کہا۔ کہ میرے لیے کمائی کرو۔ میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اٹھاؤ ... ر میں ایسا کہتا بھی۔ تو مجھ کو اس کا منصب اور حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا۔ وہ تمہارے ہی کام آئے گی۔ اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمہیں کو آرام دے گی۔ اگر کسی بیمار کا طبیب مہربان سے پرہیز کرانا ... بیت کا ہدرد خیر خواہ سے گریز کرنا روا ہے۔ تو بیشک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم؟ کیا ہمیشہ تمہاری خوشی مجھ کو منظور، تمہاری رضا جوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا، یا اپنا عدو ٹھہرایا تو اس کا سبب؟ عداوت کا موجب؟

میں نے سنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنوں اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو۔ سو میں اس تشخیص صحیح اور تجویز درست اور اس فراست صائب پر جرح نہیں کرتا۔ میں باؤلا اور سڑی اور پاگل سہی۔ لیکن اگر کوئی باؤلا تمہاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے۔ تو کیا اس کی بات نہ سننا۔ اس کی نصیحت کو نہ ماننا۔ اس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا شیوۂ دانشمندی ہے؟ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا اور چاہیے کہ آیا میں اکیلا اس جنون میں مبتلا ہوں۔ یا اور بندگان خدا بھی میری ہی سی رائے، میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں۔ کلیم! میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ جتنے بزرگان دین ہو گزرے ہیں (خدا ان کی پاکیزہ اور مطہر روحوں پر رحمت کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا ان کی حیات میں برکت دے) کوئی اس جنون سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو جتنا یہ جنون زیادہ اسی قدر وہ برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔ کیا اس بات کا اقرار کرنا جنون ہے کہ ہم بندے ہیں اور اس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے۔ جس نے ہم کو پیدا کیا۔ جو ہم کو روزی دیتا ہے۔ جس نے ہماری جانوں کی شادابی! اور تازگی کے لیے آب شیریں وخوشگوار کی سوتیں زمین میں جاری کر رکھی ہیں۔ اور ہماری روحوں کے انبساط کے لیے ہوا کا ذخیرہ کافی مہیا فرما دیا ہے۔ جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں۔ تاکہ کام کرنے کے لیے دن ہو اور آرام لینے کے لیے رات۔ جس نے دنیا کے قوی ہیکل اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع و منقاد بنا دیا ہے کہ ان سے ہم سواری لیتے ان پر ہم اپنا بوجھ لادتے۔ ان کے گوشت اور پوست اور دودھ سے مستفید ہوتے ہیں۔ جس نے انسان کو گویائی اور بیان کی قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا مافی الضمیر اپنے ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے۔ جس نے انسان ضعیف البنیان کو عقل کی قوت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے۔ جس نے کائنات میں سے ہر موجود کو اس کی مناسب حالت پر خلق کیا ہے۔ اگر دنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کر دیے

جائیں۔ اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ میں کام لایا جائے اور پڑھے لکھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے ہیں۔ سب کے سب مل کر اس کی تعریف اس کے احسانات۔ اس کے انعامات روز قیامت تک بیٹھے لکھا کریں۔ تو قلمیں گھستے گھستے درخت ہو چکیں۔ سمندر سوکھ جائیں۔ لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں۔ مگر اس کے حق واجب کا ایک عشر عشیر بھی ادا نہ ہو۔ کلیم! اتنا ایک ایسی بدیہی بات ہے۔ کہ دنیا میں کوئی اس کا منکر نہیں۔ اور نہ اس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضہ کی وبا رفع ہوئے برس نہیں گزرے۔ تمہارے دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ چل بسے۔ تندرست اچھے چنگے۔ چلتے پھرتے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل۔ بھلے برے۔ سبھی طرح کے صد ہا ہزار ہا بے توقف مر گئے۔ صدا رہے نام اللہ کا۔ وبا پر کیا منحصر ہے۔ وعدہ سے دم زیادہ نہ کم۔ مرنا برحق۔ [illegible] پیچھے یہ ہوگا۔ وہی عقلمند ہے۔ وہی فہیم۔ وہی زیرک۔ دانشمند جو اس سوال کا جواب معقول دے۔ جو اس معمے کو حل کرے۔ جو یہ پہیلی بوجھے۔ کلیم! انسان کی خاص طرح کی خلقت۔ یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ ضرور اس سے کوئی بڑی خدمت متعلق اور اس کے ذمے زیادہ جواب دہی ہے۔ اگر اس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سو رہے اور گرمی سردی سے اپنے تئیں بچائے تو اس کے لیے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی۔ جانور اپنے بڑے بڑے جثوں کی پرداخت پر بخوبی قادر ہیں۔ حالانکہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں۔ پس اس خدمت اور ذمہ داری کو دریافت کرنا شرط انسانیت ہے۔

نصوح کا وعظ سن کر اس کے ہمراہیوں کے دلوں میں دینداری کے ولولے اور خداپرستی کے جوش تازہ ہو گئے۔ حاضرین میں کلیم کے سوائے کوئی متنفس نہ تھا۔ کہ جس پر تھوڑی یا بہت رقت طاری نہ ہوئی ہو۔

تنکوں کے محل

نوید انجم

آنگن میں سے وہ چھلاوے کی مانند اچھلتی کودتی سیڑھیوں کی جانب آئی!

رنگ برنگا غرارہ گھٹنوں تک اٹھ ہوا گوری گوری پنڈلیاں تھرکتی ہوئیں اور پھر بیں سڈول،

دیکھتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر بھر آیا لپک کر وہ اس کے پیچھے مست ناگ کی مانند پھنکارتا ہوا کوٹھے پہ جا چڑھا۔

پیچھے کوئی یوں بھاگا چلا آئے اور خبر نہ ہو وہ تو مڑ کر دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ ایسی باتیں تو آپ ہی آپ معلوم ہو جایا کرتی ہیں سو اس کے دل میں بھی گدگدیاں ہونے لگیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی وہ منڈیر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ پالتو کتے کی طرح وہ بھی ہانپتا ہانپتا، دھر کوآ کھڑا ہوا......

''اے ہٹو بھی خالہ بی کی نظر پڑ گئی تو؟'' اس نے فیروز کو انگوٹھا دکھا کر کہا۔

''میری بات تو سنو!'' وہ کیسا بے صبر ہو رہا تھا!

وہ مسکرائی ایسے موقعوں پہ یہ مسکراہٹ قیامت ڈھانے کے برابر سمجھو بھرے بھرے رسیلے ہونٹوں کی یہ مخصوص مسکراہٹ کسے نہیں مار جاتی؟

اس سے رہا نہ گیا۔ بڑھ کر ریماں کی نازک پتلی سی کلائی تھام کر مسکرانے لگا۔ ''اب بتاؤ! کہاں جاؤ گی بچ کر...... ؟''

اس کی کمر آپ ہی آپ بل کھانے لگی ''اونھ بھلا میں تم سے ڈرتی ہوں؟'' وہ کمر پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر بڑے ٹھاٹ سے بولی۔

وہ تو بس دیکھتا رہ گیا۔ کالی سیاہ لانبی ریشمیں پلکیں بار بار جھپکتی ہوئیں کتنی بھلی لگ رہی تھیں

اور پھر اس کے پھول سے رخسار! جانو آگ تھی آگ ... وہ تو مجسم شعلہ تھی!

اسے چپ دیکھ۔ اس نے اِدھر اُدھر یوں دیکھا گویا شرما رہی ہو یا گھبراہٹ کے مارے بوکھلا گئی ہو .... "اے ہٹو بھی! کیا جو ہے کہ خالہ جی نے دیکھ لیا تو آفت آ جائے گی!"

اس نے سیماں کی کلائی پہ اپنی گرفت سخت کر لی "آئے وہ اس آفت ... ... بھی تو آ کر ہی رہے گی۔"

بات کاٹ کر وہ بولی "ہائے .... چچی! تم بڑے بودے!"

وہ پھر بولا "میں کوئی غیر تھوڑا ہی ہوں ... "

مارے شرم کے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ جیسے گلابیاں سی بکھر گئیں۔ ... ل ... ی جیسے ہلکی ہلکی چٹکیاں لینے لگیں .... "اللہ! جانے دو نا!"

وہ آہستہ سے کہنے لگا "چند روز ہی تو رہ گئے ہیں ... منگنی ... بعد ... پھر جب .... ؟" اس نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

مارے لاج کے سیماں کے جسم میں کوئی پھریریاں سی لینے لگا ... انگ انگ جیسے مسکرا کر ناچ اٹھا اور دل کی دھڑکن خود بخود تیز ہونے لگی ... اپنی شرم پہ قابو پانے کو اس نے ... فیروز کو دھکا دے دیا "ہٹو بھی .... چھیڑ خا ..... "

ایک خوفناک چیخ فیروز کے منہ سے نکلی اور سیماں کی بات ادھوری رہ گئی ... وہ منڈیر پہ کھڑا تھا۔ نیچے پکا فرش اور وہ اس ہلکے سے دھکے سے ہی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ... اور ... پھر ایک چیخ سیماں کے منہ سے نکلی اور دوسرے ہی لمحے نیچے پکے فرش پہ فیروز کا وجود دھڑام سے گرا اور خون سے لت پت ہو گیا!

پھر جب فیروز کو ہوش آیا تو وہ خیراتی ہسپتال میں پڑا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں درد کے مارے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اذیت کے سمندر میں ڈوب رہا ہو۔ درد کی گہری تاریکی اس کی نگاہوں میں زبردستی گھستی گئی اور پھر جب بڑی مشکل سے اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کے جسم کے کئی حصے بٹ کر رہ گئے ہوں۔ سر پیر ہاتھ بازو اور ٹانگیں سب اِدھر اُدھر درد کے سمندر میں علیحدہ علیحدہ بکھرے ہوئے۔ اس نے گھبرا کر اپنا دایاں ہاتھ ہلانا چاہا۔ بایاں ہاتھ بھی ہل گیا۔ گردن بھی مڑنے لگی مگر ... مگر اس کی دونوں ٹانگیں؟ ... ہاں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے نہ جانے کہاں غائب ہو کر رہ گئیں ... اس کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔ ہاں وہ معذور ہو چکا تھا۔ دونوں ٹانگیں گھٹنوں تک کٹی ہوئیں۔ یہ خیال اس کے ذہن میں ... تعداد ... تک تصور

حسرتوں کے بھوت لے کر آیا ۔ وہ شدتِ غم سے بیہوش ہو گیا!

دوبارہ ہوش میں آتے پہ اس نے سسکیوں کی آواز سنی وہی جانی پہچانی مانوس سی سسکیاں ۔ ۔ وہ جب بھی اسے یوں روتے دیکھتا تو کیسے کیسے جتن کیا کرتا تھا کہ وہ یوں رونا دھونا بھول کر گھنٹیوں کی سی آواز میں ہنسنے لگے لیکن اس بار اسے ہنسانے کا خیال اس کے ذہن میں صرف ایک لمحہ کے لیے آیا۔

اور یہ خیال اس کے ذہن نے فوراً جھٹک دیا۔ سیماں رو رہی ہے۔ ہاں خوب روئے۔ اسے رونا ہی چاہیے۔ اسی نے تو اسے دھکا دیا تھا۔ مگر وہ یہ تھوڑا ہی چاہتی تھی۔ کہ وہ معذور ہو کر رہ جائے۔ بلا سے نہ چاہتی تھی۔ مگر مگر ایسا ہو تو گیا! اس کے ذہن میں شیطان نے اپنا گھر کر لیا۔

گھبرا کر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

خالہ، بڑی اماں، پھوپھی زیب اور سیماں بیٹھی ہوئی اسے تک رہی تھی سیماں کی سسکیاں مدھم ہوتے ہوتے ایک دم تیز ہو گئیں۔ خالہ بی نے آنکھوں کے پلو سے پونچھتے ہوئے جھٹ سے کہا ''اے ہے۔ کیسے بری طرح رو رہی ہے۔ جب سے فیروز بیٹا تجھے یہ حادثہ پیش آیا ہے اس نے رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لی ہے!''

سیماں کے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکل گئی۔ آپی آپ منہ میں سے سب کے سامنے نکل گیا۔ ''مجھے معاف کرنا فیروز مجھے کیا خبر تھی ۔ ۔ ۔'' رونے کی وجہ سے وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

فیروز کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ خیالات گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ اپنی معذوری کا احساس ...... تکلیف درد رحم ہمدردی سب ایسے گھل مل گئے تھے کہ وہ نڈھال ہو کر رہ گیا۔

درد کی شدت سے بے تاب ہو کر وہ اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخنے لگا!

پھر نہ جانے کتنے دن گزر گئے ۔ اسے کچھ خبر نہ تھی صبح کیسے ہوتی اور شام کیونکر ڈھلتی ہے۔ دن رات کا ایک چکر سا چلتا رہا مگر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ کیا ہوا۔ کیونکر ہوا اور اب کیا ہوگا۔

پھر وہ لوگ اسے گھر لے آئے۔

ڈیوڑھی سے چھوٹا بھائی رشید، اسے اٹھا کر جب صحن میں سے کر آیا تو اس کی نظریں خود بخود بہک کر آنگن کے ساتھ والی سیڑھیوں پہ جا ٹکیں اور پھر ایک ایک سیڑھی اس کی نظر نے ہولے ہولے طے کی اور اوپر کوٹھے کے دروازے کو تصور کی نگاہ میں لا کھڑا کیا پھر وہی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے

گھومنے لگا۔

"کچھ رہ ہی تو رہ گئے ہیں۔ منگنی کے بعد دیکھنا۔ پھر جب [illegible] "

اور وہی دوسرے لمحے دھکا دے کر سیماں کا کہنا' جو بھی [illegible] چھ [illegible] جہیز [illegible] "وہ نقرہ تو ہمیشہ کے لیے نامکمل رہ گیا تھا!

سوچتے ہوئے فیروز کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ تیر کی طرح نکل گئی

سیماں کی ماں نے جب اسے دیکھا تو کیسے بری طرح رو [illegible] منہ و [illegible] بین اس کے منہ سے نکل نکل کر دوسروں کو رلانے لگے۔ اور [illegible] چوٹی [illegible] رہی ...... بے چاری سیماں کی قسمت [illegible] لنگڑے لولے [illegible] "

وہ یوں چونکا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ یا پھر جیسے [illegible] انکار کر دیا ہو۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ہر ایک کو کوٹھے پر سے [illegible] اور [illegible] دونوں ٹانگیں یوں ٹوٹ کر پرے جا گریں جیسے ذبح کی ہوئی مرغی کی [illegible] پھڑک دیتی تھیں ...... اس کی رگ رگ میں انتقام کا کڑوا جذبہ [illegible] کی مانند چیلنے لگا [illegible] ہاں یہ سیماں اسی کی بیوی ہو گی ... اس کا سارا جسم سارا وجود اس کی روح [illegible] وہی روح جو اس سے پیار [illegible] تھی۔

"فیروز ...... میں ہی تمہاری نہیں ...... وہی روح تک تمہاری ہے [illegible] "

لیکن کیا وہ اب بھی اس سے پیار کرتی ہے [illegible] کیا وہ اس کی بیوی بن جائے گی [illegible] کیا ...کیا؟ بے شمار ایسے سوالات اس کے دماغ میں آ کر تیزی کے ساتھ چکر لگانے لگے "سیماں!" کوئی دل میں سانس لینے لگا۔

پر یہ چاہت نہ تھی تو اور کیا تھا۔ گھڑی گھڑی وہ اس کو دیکھنے پھیرے پہ پھیرا ڈالنے لگی۔ اور پھر جو رشتہ داری تھی وہ بھی کوئی ایسی ویسی تھوڑا تھی۔ خالہ زاد بہن اور گھر بھی [illegible] سمجھو کہ بیچ میں بس ایک دیوار ہی تو تھی جو دونوں گھروں کو علیحدہ کرتی۔ ورنہ تھا تو دونوں کا ایک ہی مکان جسے نصوں [illegible] تھا! اسی مکان میں بھی زینب بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی تھی اور ہر موقعہ پر دخل [illegible] کا کام تھا ہی!

اور پھر پھوپھی زینب کی بات پہ فیروز تو ادھر چونکا' سیماں کی ماں بھی کم نہ تھیں۔ [illegible] ناک رکھنے کو منہ کھول کر جھٹ سے بولی۔ "اے لو! اور سنو۔ اب سیماں ہی بیاہ نہ کرے گی۔ تو بھلا تیرے میرے گھر سے کوئی اور آئے گا؟"

خالہ بی کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ خود دل ہی دل میں سبھی جا رہی تھی۔ آنکھوں دیکھے مکھی بھلا کون کھائے!

ساروں کو زری کی زری یماں کا خیال تو ضرور ہو۔ ''اے ہے بھلا لڑکی ساری عمر کیسے نباہے گی؟''

ہر ایک کی انگلی ناک پہ چڑھی رہتی پھر یہ ساری ہمدردی کی چڑیا آسمان کی نیلاہٹ میں پھر سے گم ہوگئی جب سگی ماں ہی نے کہہ دیا ''اب بھلا ہم اپنی زبان سے مکر جائیں؟ توبہ توبہ!''

مگر فیروز کا دل تھا کہ اندر ہی اندر ڈوبا جاتا یہ اوپر نیچے ہوئے کی ایسی عادت پڑی کہ لاکھ سنبھلنا چاہا، پر نہ سنبھلا۔ دل اور ضمیر کی آوازیں چین نہ لینے دیتیں۔ یہ ضمیر کا یہاں کام ہی کیا تھا۔ اس کے باوجود فیروز کو لگتا یوں ہی جیسے دل اور ضمیر میں جنگ چھڑ گئی۔ کوئی سوچے تو بھلا اس نے کیا گناہ کیا تھا؟ بیچارہ دونوں ٹانگیں کھو بیٹھا تھا۔ مگر فیروز کو تو یوں ہی محسوس ہوتا جیسے اگر اس نے گناہ کیا نہیں تو کرنے ضرور لگا ہے۔ یماں کی عمر اس کے سنگ کیسے گزر سکے گی۔

دل کہتا اسے مجھ سے پیار ہے۔ یماں میرے بغیر کیسے رہ سکتی ہے۔ اور پھر میں اس کے بغیر کیسے زندگی گزاروں گا۔

ضمیر کہتا اسے تجھ سے پیار نہیں فقط ہمدردی رہ گئی ہے۔ آج کل کے زمانہ میں پیار بھلا کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ تو فریب ہے۔ واہمہ ہے۔ یہ رہا کی مانند ناپید ہے۔ آبِ حیات کدھر ملتا ہے؟

پھر دل جیسے جھنجھلا کر بول اٹھتا آخر اس حادثے کی وجہ تو وہی یماں ہے نا نہ وہ دھکا دیتی نہ میں گرتا۔ اور پھر دونوں ٹانگیں یوں زبردستی خدا نہ چھین لیتا

مگر ضمیر کی آواز کبھی روکے رکی ہے؟ ''یہ تو تیری اپنی غلطی ہے۔ تو جو پیچھے پیچھے بھاگا تھا؟ بھلا بیاہ سے پہلے تجھے چھیڑ خانی کرنے کی اجازت کس نے دی تھی؟''

گھبرا کر وہ اپنا سر ادھر اُدھر پٹخنے لگتا اور دونوں بانہیں مارے بے بسی کے ادھر اُدھر کسی سہارے کو ڈھونڈنے لگتیں۔

اس لمحے یماں اگر نہ تکتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ازل سے بے سہارا ہے۔ ہمیشہ سے بے سہارا ہے اور یونہی ہمیشہ کسی سہارے کی آرزو میں جلتا رہے گا۔

وہ جو منگنی کو چند روز رہ گئے تھے وہ چند روز مہینوں میں بدلنے لگے۔ آپ ہی آپ دن مہینوں

کے روپ میں ڈھل گئے۔

خالہ بی نے ایک روز سیماں کی ماں سے ذکر کیا تو وہ دل کی بات دل ہی میں چھپاتے ہوئے ایک آہ بھر کر بولی "لو بہن بھلا میں نے کوئی انکار کیا؟ میری طرف سے آج ہی منگنی کی بجائے نکاح کر لو۔ پر میں تو اس خیال میں تھی کہ ذرا فیروز کے زخم اچھے ہو جائیں۔ تو پھر جی بھر کے خوشیاں کریں گے!"

خالہ بی بڑی خوش ہوئیں بہن نے کیسی سمجھداری کی بات کی تھی!

ادھر سیماں کو تو جیسے ہر طرف سے چھٹی مل گئی۔ سارا دن کے ساتھ فیروز کی خیریت پوچھتی۔ پٹیاں بدلتی دوا دارو پلاتی۔ وہ جاتی تو پیچھے خالہ بی فیروز کا خیال رکھتیں پھر فیروز کا چھوٹا بھائی رشید تھا جو اس کی تیمارداری میں بڑی مسرت محسوس کرتا۔ رشید کو نوکری مل گئی سب کو بڑی خوشی ہوئی ... وہی رشید تھا نا جو سب کو نکھٹو اور کاہل لگتا تھا اور جو در در کے دھکے کھاتا پھرتا اور بری طرح رویا کرتا تھا .... اب وہی رشید سرکاری دفتر میں چپڑاسی بن گیا! اور وہ بڑا فیروز جس سے سب کو طرح طرح کی امیدیں وابستہ تھیں اب گھر میں دونوں ٹانگیں تڑا کے بڑا نصیبوں کو رو رہا تھا!

بھائی کو نوکری مل جانے پہ فیروز کو بھی بڑی خوشی ہوئی۔ سیماں کی اماں بھی تھالی بھر مٹھائی لے کر آ پہنچی۔ پھوپھی زینب بھی یہ خوشی سن کر مسرت میں حصہ بٹانے آن موجود ہوئی اور اور وہ بھی آئی ......

سیماں آتی تو روز ہی تھی ... پر جس انداز سے وہ اس روز آئی فیروز کے خیال کے مطابق پہلے یوں کبھی نہ آئی تھی!

ست رنگا دوپٹہ. ریشمی شلوار اور پھر ریشمیں گہرے نیلے رنگ کی قمیض جو اس کے گورے چٹے رنگ پہ خوب بہار دے رہی تھی۔ اس کا سارا بدن ان تنگ کپڑوں میں اُبھرا اُبھرا ہوا تھا! جسم کا ہر زاویہ ور ہر قوس نظروں کو اپنی جانب کھینچے ور فیروز کا دل نہ دھڑکے ؟ مگر یہ دھڑکن غیر معمول بن کر رہ گیا ... اس کا دل الجھن اور خوف و تفکرات کے سمندر میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔

پھوپھی زینب نے معنی خیز نظروں سے سیماں کی ماں کو دیکھا اور پھر خالہ بی کے سامنے مٹھائی کی تھالی کر کے بولی "آج اس خوشی کے موقعہ پہ دوستی خوش کر لو منگنی بھی آج ہی کر لو"

سیماں کی ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا!

ادھر خالہ بی ذرا چپ سی ہو گئیں۔ ایک نظر اپنے فیروز کو دیکھا پھر اپنے رشید کو غور سے دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں تو بڑی آہستگی سے۔ "آج؟ ..... منگنی کو کوئی جلدی تھوڑا ہے اے بہن آج تو رشید کی نوکری کی خوشی ہے ..... "

''ہاں تو آج خوش دولی ہوجائے تو اچھا ہے نا ''بی زینب کی باتیں تو سیماں کی ماں بے چارگی کے دل پہ چھریاں چلا رہی تھیں!

خالہ بی نے پھر اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا دونوں ٹانگوں سے معذور بے چارگی ولاچارگی کا مجسمہ آنکھیں بجھی بجھی سی سارا بدن لاغر اور کمزور ہو رہا تھا۔ بھری بھرائی جوانی اس کوٹھے پہ سے ایسے گری کہ گوشت کا نام ونشان تک نہ رہا وہ تو بالکل بدل کر رہ گیا تھا ''چچ !''خالہ بی کے منہ سے یونہی چچ چچ افسوس کی آواز نکل گئی۔ پھر گھبرا کر بولیں۔

''اے بہن ....تو کیا میں ساری خوشیاں آج ہی کرلوں ۔ ....؟''

یہ سُن کر سیماں کی ماں ہنس دی۔ ''یہ تو تمہاری مرضی پہ ہے سیماں تو تمہاری ہی بچی ہے !'' یہ کہہ کر وہ بھی ادھر کو دیکھنے لگی جدھر خالہ بی دیکھ رہی تھیں فخر و مسرت کے ملے جلے اثرات ان کے چہرے پہ ظاہر ہو رہے تھے ....وہ رشید کو دیکھنے لگیں۔

رشید کا بڑا اڑیل بدن تھا جوانی پھوٹ پھوٹ کر جا تو بہہ رہی تھی اور اب اس بیکاری کے زمانے میں نوکری مل جانے کی خوشی سے چہرہ تمتما رہا تھا'

اس روز گھر میں بڑی دیر تک غل غپاڑہ ہوتا رہا بڑی ماں' پھوپھی زینب اور خالہ بی بڑی دیر کے بعد ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر دل کی باتیں زبان تک لاتی رہیں اسی دم پھوپھی زینب کو جانے کیا سوجھی کہ خالہ بی کے کان میں اپنا منہ دے کر بولیں'' اے بہن میری مانو تو سیماں کا بیاہ رشید سے کرو؟''

خالہ بی لمحہ بھر کو کانپ کر ہی رہ گئیں ۔ پھر سنبھلیں اور پھوپھی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بڑی معنی خیز خاموشی تھی ۔ ۔ جو ظاہر کر رہی تھی کہ پھوپھی نے خالہ بی کے دل میں یک ہلچل مچا دی تھی ....!

سیماں کی ماں کے کانوں میں بھی اس سرگوشی کی بھنک پڑی اور اس نے نظریں جھکا کر اپنی بیٹی کی جانب دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا۔

سیماں فیروز کو برآمدے میں پانی پلا رہی تھی ایک طرف مدہوش جوانی تھی تو دوسری طرف ویران کھنڈر اور وہ کھنڈر بھی ایسے نہیں کہ تاریخی ہوں۔ تاریخی کھنڈروں کی تو کچھ اہمیت ہوتی ہی ہے ... ...ادھر تو وہ محل تھے جنہیں گرا دینا ہی مصلحت سمجھی جاتی ہے ۔ تینوں عورتیں خاموش ہو کر رہ گئیں

؟

پھر جب بات خالہ بی کے منہ سے نکلی اور خاموشی کے سمندر کو خشک ریگستان کے روپ میں بدل گئی تو ذکر مہنگائی کا شروع ہو گیا اور خالہ بی نے بڑے دکھ سے ایک ہنڈ اپنے کو ہے پہ مارتے ہوئے کہا۔ "ے ہے اکہوں کیا آج کل تو گزر ہی نہیں ہوتی۔ اب رشید نوکر ہوا ہے تو گھر میں گھی تو نظر آئے گا؟"

پھوپھی زینب نے ہاں میں ہاں ملائی "اور کیا؟ پھر جب کھانے والے اتنے ہوں ...." اس نے بچوں کی ایک پلٹن کی طرف اشارہ کیا ....

خالہ بی کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ "ہاں بہن اور جب "وہ بات پوری نہ کر سکیں۔ پر سننے والیاں سمجھ ہی گئیں اور پھوپھی زینب نے تو ترت سے بات پوری کر ڈالی" اور جب ایک جوان ٹانگوں سے معذور اپنا دوزخ جیسا پیٹ لیے موجود ہو!"

اس لمحہ خالہ بی کا دل چاہا زور سے ایک چانٹا پھوپھی کے رسید کر دے مگر وہ جبر کر رہ گئیں!

شام کو سب اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں نہ گئی تو سیماں! وہ خالہ بی کے کہنے پہ رک گئی۔ اسی رات فیروز کو شدت کی تکلیف محسوس ہوئی سیماں اس کی پائنتی جا بیٹھی خالہ بی اٹھ بھی رہ گئیں۔ "اے بیٹی تو کیوں اپنی نیند حرام کرتی ہے۔ رہنے دے۔ میں فیروز کو سنبھال لوں گی۔ نہیں تو رشید کیلا ہی کافی ہے!" ....

فیروز کا دل مارے خوشی کے جھوم جھوم گیا وہ اسے کتنا چاہتی تھی یہ چاہت ہی تو تھی جس نے سیماں کی نیند چھین لی تھی اور وہ اس کے پاس بیٹھی کیسے پیار بھرے انداز کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی!

خالہ بی ذری کو سیماں کے پاس بیٹھیں مگر پھر انہیں نیند نے آ دبوچا وقت ہونے پر سیماں نے بڑے پیار کے ساتھ فیروز کو دوا پلائی

اور یہ اُسی دوائی کا اثر تھا یا اس کے پیار بھرے دلاسہ کا اللہ جانے کب فیروز کو بھی نیند آ گئی اور درد کا ذرا آرام ہوا۔

اچانک وہ چونک گیا۔ کچی کچی نیند میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے سیماں اسے کہہ رہی ہو۔ "میں اپنے منہ سے کیا کہوں۔ میں بے بس ہوں۔ میں تو اب پنجرے میں قید فاختہ کی مانند ہوں!"

اس نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ اور فوراً ہی بند کر لیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا تھا؟ اس کا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا .... وہ بظاہر تو سوتا بن گیا مگر اس کے جسم کا ہر ذرہ جاگ اٹھا اور اس نے سنا' سیماں ہولے ہولے رشید سے کہہ رہی تھی۔ "تم ہی بتاؤ اب میں کیا کروں؟" اس

روز جو یہ میرے پیچھے بھاگا تو میں نے کوشش کی کہ اس سے بچ جاؤں۔ اسی لیے تو اسے دھکا لگ گیا تھا!''

''اب تم انکار کر دو۔ پھر میں دیکھوں گا کہ اماں کیسے تمہارے ساتھ فیروز کا بیاہ کرتی ہیں ...''

آہ! یہ اسی کا لاڈلا بھائی تھا ... ...وہی رشید جسے بچپن میں سب دھتکارا کرتے تھے تو فیروز ہی اسے سب سے بچاتا۔ پچکارتا اور دلاسہ دیتا ... ...''وہ اس کا بھائی اور ... ... اور ...

سیماں کی آواز آئی۔''رشید! تم خود ہی سوچو میں ایسے شخص سے بیاہ کر کے خوش رہوں گی؟'' وہ سسکتے ہوئے پھر بولی''اور پھر تم جانتے ہی ہو مجھے تم بچپن ہی سے میں فیروز کو نہیں ... ...تم کو... ...تمہیں ... ...''وہ ہچکی ہو رہی۔

فیروز کے رویں رویں میں درد کی ایک لہر دوڑی اور وہ زور سے کراہ اٹھا۔

کراہنے کی آواز سن کر رشید جلدی سے چھلانگ مارتے ہوئے اپنی چارپائی کی طرف لپکا اور آنکھیں موند کر جھٹ سے سو بن گیا! اور سیماں نے اسے تھام کر کہا۔''ہائے اللہ! کیا ہوا؟''

اس کا وہی مخصوص انداز اب اسے زہر دکھائی دینے لگا۔ اسی انداز نے تو اسے موہ لیا تھا۔ اس کے دل میں آگ لگ گئی۔ انتقام کی آگ! ہاں وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ ہر ممکن طریقے سے بیاہ کرے گا۔ اسی کی وجہ سے تو وہ معذور ہو گیا تھا۔ اس نے دانت پیس کر سوچا۔ 'یہ جوانی مجھے زندہ رکھنے کا وسیلہ بنے گی۔ اسی کے سہارے میں اپنی عمر گزاروں گا۔ مگر۔ مگر آہ! یہ سہارا کتنا ناپائیدار تھا!

وہ پوچھ رہی تھی''بتاؤ نہ ... ...کیا ہوا؟''

اس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور کوئی جواب نہ دیا رات دھیرے دھیرے گزرنے لگی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی' فیروز کو یوں لگا جیسے آگ کا ایک کنواں اس کے قریب ہو۔ وہ سیماں نہیں تھی۔ دوزخ کی آگ کا شعلہ تھی! جو اسے جلا رہی تھی۔ اس کے وجود میں نفرت کا ایک کھولتا ہوا لاوا پیدا کرنے کی محرک!

پھر سے خیال آیا کہ وہ اگر سو گیا تو رشید سیماں سے ملنے پھر آ جائے گا۔ اس نے خود سے فیصلہ کیا۔''چاہے کچھ بھی ہو' میں نہیں سوؤں گا! نہ ہی سیماں کو نیند کی آغوش میں آرام کرنے دوں گا ... ... اور ... ...اور یوں آج کی رات یہ بھی شمع کی مانند جلتی رہے گی۔ رشید سے ملنے کی آرزو میں!''

مگر جب کچھ دیر کے بعد وہ اپنے بستر پر جانے کے لیے اٹھی تو اس نے روکنا چاہا مگر وہ کاہے کو رکنے والی تھی! بولی''اے لو۔ اب تو مجھے نیند آ رہی ہے!''

وہ بن کر بولا۔ ''میری خاطر نہ جاؤ''

''اے ہٹو بھی!'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ میں تو سونے لگی ہوں''

اسے سخت غصہ آیا۔ وہ اسے دھوکا دے رہی تھی۔ ادا میں دکھا دکھا کر اس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ ''تو یہ وہ بدل رہی تھی [illegible] کی تیزی کے ساتھ جیسے [illegible] جیسے '' اس کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ ''جیسے چھوڑ ایک دو روز میں یہ الگ سے مرجھا جائے!''

اتنے میں خالہ بی کی آنکھیں بھی کھل گئی۔ اسے وہاں کھڑی دیکھ کر بولیں ''اچھی اب تم بھی جا کر آرام کرلو۔''

وہ بولی ''ہاں خالہ میں بھی تھک گئی ہوں ...۔ نیند بھی تو آ رہی ہے!''

وہ خاموش رہا۔ زبان نے جیسے چھوڑ دیا۔ اور پھر وہ اکیلا رہ گیا۔ تاریک رات میں اکیلا اپنے جلتے سلگتے ہوئے خیالات کے ساتھ ہجوم کے ساتھ تنہا!

اس کا ذہن بوجھل ہوگیا اور گھبرا کر وہ ادھر اُدھر تاریکی میں اجالا دیکھنے کی آرزو میں آنکھیں پھاڑے گھورنے لگا!

پھر کچھ روز ایسے ہی گزر گئے ... اس نے لاکھ کوشش کی کہ سیماں سے نفرت کرے لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ سیماں سے نفرت نہ کر سکا۔ وہ آتی تو اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آ جاتی ..... مسکراتی تو وہ بھی تھی مگر اب اسے معلوم تھا کہ یہ مسکراہٹ اس کے لیے نہیں رشید کے لیے تھی۔ جو ہر شام تیمارداری کرنے کے بہانے اس کے پاس آ بیٹھتا اور سیماں سے نظریں چار کیا کرتا!

پھر جوں جوں دن گزرتے چلے گئے۔ سیماں کا آنا کم ہوتا چلا گیا ... آتی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تھی مگر اس کے پاس بیٹھنے کے لیے نہیں حال چال پوچھنے کے لیے نہیں۔ بلکہ ادھر اُدھر سب کی نظروں سے چوری چھپے رشید سے ملنے!

اور رشید بھی تیمارداری کرتے کرتے کچھ تھک سا گیا! اور یہ تھکن بڑھتی ہی چلی گئی

پھر تو جیسے ساری دنیا ہی بدل کر رہ گئی!۔

خالہ بی نے رشید کا مدعا جو سنا تو دل تھام کر رہ گئیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھوں نے رشید کی جانب دیکھا جو سیماں کا ہاتھ مانگ رہا تھا اسے تو سگا بھائی ہی رقیب بن گیا!

ان کے ذہن میں کشمکش ہونے لگی۔ ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ ایک طرف فیروز ... معذور

اپاہج جسے پیار شفقت اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس کا حق وہ کیسے چھین سکتی تھیں!

دوسری جانب رشید ان کا کماؤ بچہ۔ جو جوان ہو چکا تھا۔ ہر ماہ ان کی ہتھیلی پہ دس دس کے نوٹ لا کر رکھتا تھا جسے وہ نار فض کریں تو سارا گھر بھوکا مرے۔ پیٹ ایک عذاب یہ دوزخ کیسے بھر سکے گا پھر ..

وہ بوکھلا کر کبھی رشید کو دیکھتیں کبھی فیروز کو اور کبھی ان کی نگاہ سیماں پہ جا پڑتی اور یونہی آنکھوں کے سامنے پھوپھی زینب بھی آن موجود ہوتی۔ سرگوشی کرتے ہوئے "بی! شکر رو۔ رشید کو نوکری مل۔ اب تو کچھ آرام پاؤ گی ... !"

مگر یہ آرام کیسا کہ دل کا سکون ہی ختم ہو کر رہ گیا

ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں جلنے لگی فیروز معذور بچہ ان کی ہی کوکھ کا جنا ہوا اسی دکھ کا جس کا رشید بھی ایک حصہ رہ چکا تھا دونوں بھائی ایک دوسرے کے برعکس تو بہ! انھیں کیا خبر تھی کہ ایسا دن دیکھنا بھی نصیب ہوگا!

کوئی ان کے ذہن میں آ دھمکتا فیروز کو کیا منہ دکھاؤ گی مگر وہ کر ہی کیا سکتیں تھیں یا تو سارے گھر والوں کو زہر دے کر آرام سے سیماں کا ہاتھ فیروز کو پکڑا کر خودکشی کر لیں۔ یا پھر فیروز کو دودھ کی مکھی سمجھ کر باہر کریں یہ رشید ایسا ذہیٹ واقع ہوا تھا کہ کوئی بات ہی نہ سنتا تھا۔ اب سمجھائیں تو کسے اور کیسے۔

وہ بے چارگی کے ان لمحوں میں خود کیا فیصلہ کرتیں۔ ایسے میں فیصلہ تو خود بخود ہی ہو گیا۔ دن گزرنے لگے اور وہ فیروز سے دور ہونے لگیں۔ روحانی۔ ذہنی اور جسمانی طور سے۔ نہیں ... وہ خود دور نہ ہوئیں۔ تنکوں سے بنے ہوئے محل کو بچانے کی خاطر انھیں فیروز کی اپنی ممتا کی اپنے دل کے ٹکڑے کی کچھ قربانی دینی پڑی؟

خالہ بی کے دل کا سکون ختم ہو گیا ... سمندر میں طوفان جیسے آیا ... اور پھر اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ سب کچھ بہہ گیا! سارے گھر میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ "فیروز بوجھ ہے۔ بوجھ ہے ...... !" سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پہلے دبی زبان میں یہ فقرہ ادا ہوتا رہا۔ پھر اور ذرا بلند ہوا ...... بلند سے ترش ہوا ... ترشی نے پھر تلخی کو اپنا لیا اور تلخی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا! اور یوں خالہ بی بدلیں تو سارا گھر بدل کر رہ گیا! ...

وہی خالہ بی جو گھنٹوں اپنے اپاہج بیٹے کے پاس بیٹھی رویا کرتیں۔ اب فرصت نہ ملنے کے بہانے سوچنے لگیں۔ پھر جوں جوں دن گزرتے چلے گئے۔ بی زینب اور رشید کی باتوں نے انھیں یہ احساس دیا

دیا کہ فیروز کا پیٹ ایک بہت بڑا تندور تھا جس میں بہت سی روٹیاں ایندھن بن کر جلتی تھیں!

اور پھر رشید اپنی ماں کے دل میں یہ بات ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہو گا کہ وہ جوانی کے اس دور میں سے گزر رہا ہے جب بیوی کی رفاقت ملنی ضروری ہے فیروز کی نسبت بہت زیادہ ... ورنہ اس وسیلہ کے کھوئے جانے کا امکان ہے جو ہر ماہ ایک بندھی ٹکی رقم ان کے ہاتھوں میں دیتا ہے۔ جس سے وہ اتنے بڑے گھر کا پیٹ بھرتی ہیں! اُف وہ یہ مجبوریاں! اور وہ بھر دیتیں۔ کبھی نہ بھی یوں ہی منہ میں ٹھنڈی سانسیں نکل نکل جاتیں!

خالہ بی کو اپنا معذور بیٹا ایک بوجھ اور عذاب نظر آنے لگا اور سب دن ان پر بیتی کو بوجھ کیسے نہ سمجھتیں؟ ادھر یہ عالم تھا اور ادھر سیماں کی ماں دن ہی دن میں اس بدبختی پر مرتی جب اس رشتہ کو اس نے منظور کیا......

بی زینب کی بات پر ایک روز وہ پھٹ ہی تو پڑی ... ں میں سے بیٹے ہوں ... بس یہ سمجھو کہ چپکی بیٹھی ہوں۔ دیکھ رہی ہوں کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ بیٹی کی ماں ہوں ... کوئی دشمن نہیں ... کے سامنے چپ ہوں مگر دیکھوں تو وہ کیا فیصلہ کرتی ہیں!

گھر بھر کا رویہ بدلا تو خیر بدلا ہی مگر خالہ بی کو یوں نظریں پھرتے دیکھ کر فیروز کے احساسات پر ایک پہاڑ کا سا بوجھ آن پڑا۔ اور اس روز تو غضب ہی ہو گیا جب خالہ بی نے پھوپھی زینب سے کہا ''بہن کروں کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ دو ڈھائی من کی لاش آخر کب تک یونہی پڑی رہے گی ... آگے ہی مشکل سے گزر ہو رہی ہے !''

پھوپھی زینب نے جانو طنز کی ''اور پھر اب بیاہ کی تیاریاں کر رہی ہو نا ... دو ایک سال بعد دو چار جو تکڑے بھی جان کو چمٹ گئے تو پھر کیا کرو گی؟ ...... یہ بھی تو سوچو۔ ابھی سے گھبرا گئیں ... ؟''

خالی بی جانے کس بات پہ پہلے ہی سے جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ سر ہلاتے ہوئے اپنا نچلا لب سیکڑ کر بولیں۔ ''اے ہے۔ شادی نہ ہوئی تو کہیں مر تو نہ جائے گا!''

پھوپھی زینب بولیں۔ ''کوئی طریقہ سوچو۔ فیروز بھی کمانے لگے تو تمہیں ... ''

''ونہہ ... ٹانگوں سے معذور مرد ... نہ کہیں جانے کا نہ آنے کا ... اے ہے ایسوں نے بھی کبھی کچھ کمایا ہے؟''

اسی شام سیماں کی ماں سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے پھوپھی زینب نے کہا ''بیکاری سے کون تنگ نہ آئے۔ اب تو ٹھیک ٹھاک ہو چکا ہے۔ سارے زخم ٹھیک ہو گئے ہیں۔ کہیں سے دو پیا کھیاں لے کر کسی

کام میں ہاتھ ڈالے تو کچھ کمائے بھی۔ بھلا بیکار کو بیٹی دوں گی۔ مری، تو تو آج بہن سے صاف صاف بات کرلو۔ کہیں سر سے پانی نہ گزر جائے!''

وہ جھٹ سے سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ خالہ بی کے ہاں دوڑی آئی۔ ''اے بہن! تم ہی کہو اب کیا کروں۔ سیماں تو اب تمہاری ہو چکی ... چاہے فیروز کو دو ... چاہے ... ' وہ رک گئی''

خالہ بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''بہن! کل کیا تاریخ ہے؟ چھبیس؟ ... تو بس سمجھو کہ اگلے مہینے چاندنی دوسری کو دونوں کی منگنی کر دوں گی۔ سیماں کی ماں کے دل میں کوئی شور مچا رہا تھا ' نہیں ... نہیں' ضبط کر کے رہ گئی مگر غم کے مارے اس کے حلق میں الفاظ اٹک اٹک گئے۔ ' چاندنی دوسری — دوسری کو ...... منگنی ...''

خالہ بی نے نظریں جھکا کر کہا۔ 'ارے ہاں ... منگنی کے فوراً بعد بیاہ ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو''

''فوراً ...... بیاہ ... ؟ مگر ... مگر'' وہ بجھے بجھے لہجے میں بولی۔ ''مگر فیروز کی نوکری کا کیا بنے گا۔ میں باز آئی ...''

اس کی بات کاٹتے ہوئے خالہ بی بولیں۔ چھوڑ فیروز کے ذکر کو ... میرا رشید کمانے لگا ہے۔ اللہ رکھے کب تک کنوارا رہے گا۔ کماؤ پوت ہے۔ میں سیماں سے رشید کا بیاہ کروں گی''

سیماں کی ماں کی بتیسی نظر آنے لگی!

فیروز نے جو یہ خبر سنی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے! ۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا جسم کسی دلدل میں دھنسا جا رہا ہے ... زندہ درگور! گھبرا کر اس نے جیسے ہاتھ ادھر اُدھر مارنے شروع کئے ... خالہ بی سے سیماں کا ذکر کرنے کو ہمت کی تو خالہ بی نے ناک چڑھا کر کہہ دیا۔ ''اے کچھ شرم کرو ... مفت کی کھا کھا کر بدہضمی ہونے لگی ہے۔ اے ہے ذرا یہی خیال کرو کہ رشید کی ہونے والی بیوی ہے۔ وہی رشید تیرا سگا بھائی اور جس کے ٹکڑوں پہ تو پل رہا ہے۔ نمک کھا کر نمک حرامی پہ کمر بستہ ہے؟''

وہ مارے حیرت کے سکتے میں رہ گیا۔ تین چار ماہ کے عرصہ میں اس کی اپنی ماں اتنی بدل جائے گی۔ فیروز کی وہم و گماں میں بھی نہ تھا ... !

جمعرات کو چاند کی پہلی تھی ..... اور جمعہ کو منگنی ہونی تھی ... سارے گھر میں شور وغل ہو رہا تھا۔ بچے ایک طرف بڑے بنے ہوئے چیخ رہے تھے اور بڑے ادھر چھوٹے بنے چلا رہے تھے۔ فیروز کے کانوں میں اچانک باہر گلی میں سے بھکاریوں کی صدائیں آئیں۔ وہ ہونے والے دولہا کو دعائیں دے

رہے تھے۔ "اللہ کرے تیرے سہرے کی کلیاں کھلیں!"

اس کا جی کلپ گیا۔ سہرے کی کلیاں تو مرجھا رہی تھیں۔ پھول بننے سے پہلے ہی وراں کے دماغ میں جانو کوئی لوہار دوکان کھول کر بیٹھ گیا دھپ دھپ؟ شادی بیاہ سماں۔ رشید ساری رات وہ مارے جلن اور صدمے کے کروٹیں بدلتا رہا اور یوں پہلو بدلتے بدلتے صبح ہو گی!

یہ صبح اس کے ارمانوں کی شام تھی!

ادھر اُدھر کے کئی عزیز ایسے موقعوں پہ آن ٹپکتے ہیں۔ جیسے پہ کے ا اشی تھا۔ مگر یہ بھی کوئی تک تھا کہ جو آتا وہ آتے ہی اس کے زخموں پہ نمک چھڑکتا۔ معنی خیز نگاہوں سے ... وتک تے ہیں تو باتوں ہی باتوں میں ٹھنڈی آہیں نکلی جا رہی ہیں۔ کسی کا تجسس بڑھتا کہ آخر یہ ... نے تو ہیچ ہیچ سے افسوس کرنا شروع کر دیا۔ اے ہے سگا بھائی ہی رقیب بن گیا

اور پھر پھوپھی زینب کی تو عادت ہی ایسی تھی۔ ادھر لگائی اُدھر بجھائی جیسے پیار بھرے انداز میں اس کے پاس آ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی "ہے ہے مجھے کس قدر افسوس ہے۔ تیری ٹانگیں نہ یوں ٹوٹتیں تو کاہے کو آج کا دن دیکھتے" "وہ مارے غم کے اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا تو وہ پھر بولی۔ "اے میری مانو کہیں کمانے کی فکرو آج اس مہنگائی کے زمانے میں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ ماں باپ کب تک جوانوں کا بوجھ برداشت کریں"

اس کا دل ڈوب سا گیا۔ ہاں سچ ہی تو کہہ پھوپھی نے ماں باپ کب تک بیکار اور معذور بچے کا بوجھ برداشت کریں۔ اور پھر ادھر ماں ہی ماں تھی باپ کدھر؟ وہ تو برسوں گزرے بٹوارے کے وقت دنیا سے منہ موڑ چکے۔ پھر بھائی ہی تو تھا۔ رشید جو کما رہا تھا۔ پھر خالہ بی ادھر اُدھر کے کپڑے سی سلا کر کچھ کما لیتی تھیں!

وہ کیا کرے... کیا کام کرے۔ اسے کچھ سجھائی نہ دیتا پھر ایسے وقت جبکہ اتنا بڑا صدمہ دماغ پر ہتھوڑے سے چلا رہا ہو۔ فیروز کو کیا سوجھتا... اس کی زندگی اس سے چھین کر یہ ظالم دوسرے کے ہاتھوں میں سونپ رہے تھے!

اس کو ان لوگوں کی ہمدردانہ اور رحم آمیز نظروں سے شدت کی تکلیف ہونے لگی۔ وہ ان زہریلے نشتروں کی تاب نہ لا سکا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ غسل خانے میں دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھا روتا رہا۔

اس کے کانوں میں بہت سی آوازیں جیسے گونجنے لگیں۔ کانوں کے پردوں سے لاتعداد چیخیں اور

ٹکرانے لگیں۔ ''تم بیکار ہو۔ معذور ہو۔ ارے تم تو دوسروں پہ بوجھ ہو !''

''بوجھ!'' اس نے اپنے کانوں میں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ ''ہاں ہاں ہاں

میں بوجھ ہوں معذور ہوں۔ میں کیا کروں کیا کروں کیا کام کروں!''

تب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک سانپ کا روپ دھار چکا تھا۔ وہ ناگ جس نے تمام گھر والوں

کے ذہنوں کو ڈس لیا تھا۔ سب کے احساسات میں زہر ملا دیا تھا وہ بیکار تھا بیکار

آہ یہ بیکاری کا ناگ ...... زہریلا سانپ!

''وہ کچھ زیادہ سوچ نہ سکا۔ ایک طرف معذوری 'بیکاری کا صدمہ اور دوسری طرف سیماں کا

غم! اتنے سارے صدموں نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا۔ غسل خانے کے فرش پہ وہ بیقراری کے ساتھ

اپنے بازوؤں کے سہارے ادھر اُدھر گھسٹنے لگا۔ چین نہ ملا تو پہلو بدل بدل کر کراہنے لگا جیسے آگ پہ لوٹ

رہا ہو۔

پھر کسی نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا وہ چونکا مگر یونہی پڑا رہا۔ تب دستک شدت

اختیار کرنے لگی تو اس نے مجبوراً دروازہ کھولا۔

خالہ بی اندر داخل ہوئیں۔ ''ارے ادھر کیا کر رہے ہو۔ بھائی کی خوشی میں شرکت نہ کرو

گے ؟'' وہ ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ انھوں نے اس کے اداس چہرے پر انتہائی خوفناک

زردی دیکھی۔ آنکھوں کے ڈھیلے خلا میں ڈوبے ہوئے سے، جانو بے نوری کے پیالے۔ وہ سہم کر رہ گئیں۔

ماتا کا طوفان ایک دم ان کے دل کے سمندر میں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف طوفان پھیل گیا۔

خالہ بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں .... بڑھ کر فرش پر ہی وہ بیٹھ گئیں اور اس کا سر اپنے

زانوں پہ رکھتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان وہ رک رک کر بولیں۔ ''میرے بیٹے تو ہی بتا

اب میں کیا کر سکتی تھی جب رشید ہی ضد کر رہا تھا۔ پھر اس بچی پہ ظلم نہ تھا تو اور کیا تھا اسے میں تیرے

پلے باندھ کر ساری عمر کو کس لیے جلاتی۔ تو ہی بتا . . . تو ہی بتا میرا اس میں کیا قصور ارے تو

... تو معذور ہے۔ معذور ہے اور پھر بیکار ہے۔ سو برائیوں کی ایک برائی یہ بیکاری!

اتنے بڑے مرد کی بھی چیخیں نکل گئیں!

پھر وہ سنبھل گیا .... وہ تمام سسکیاں' ہچکیاں اور چیخیں اس نے اپنے حلق میں دبا لیں .

اور خالہ بی کے ساتھ وہ گھسٹتا ہوا باہر نکلا اور تماشائی بنا اپنے دل کی دنیا کو ویران ہوتے ہوئے دیکھتا رہا!

پھر کافی دن یونہی گزر گئے۔ وہ روز صبح کے وقت گھر سے گھسٹتا ہوا برگد کے پیڑ کے نیچے کرسیاں

بنانے والے کا کا مستری کے ہاں جانے لگا اور اس سے کام سیکھنے لگا۔

مگر اب تو الٹا اثر ہوا۔ بجائے اس کے کہ گھر والے شکر کرتے کہ اب وہ کسی کام ولگ گیا تھا رشید کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آنے لگا کہ کہیں وہ سیماں کو انہی نظروں سے نہ دیکھنے لگے جس سے وہ پہلے دیکھنے کا عادی تھا۔ منگنی کے واقعہ نے اس کی آنکھوں پہ ایک پردہ سا ڈال دیا تھا مگر یہ پردہ کہیں پھٹ کر نہ رہ جائے۔ وہ کہنے لگا تو کیا خبر وہ سب کی ہمدردیاں حاصل کر لے!

پھر گھر میں ہر روز جھگڑے پہ جھگڑا ہونے لگا...... رشید آ کر خالہ بی کو کہتا اماں اگر تم کس خیال میں ہو کہ وہ کام سیکھنے لگا ہے۔ ارے وہ تو وہاں جا کر ادھر اُدھر کے بدمعاشوں سے ساتھ کھیلا کرتا ہے اور ہم سب کی آنکھوں میں یوں دھول جھونک رہا ہے کہ کام سیکھ رہا ہوں۔

''ہائے ہائے!'' خالہ بی نے سینے پر دوہتڑ مارے۔ ''مر نے ہوگا میں کہتی ہوں یہ کوٹھے پہ سے گر کر مر کیوں نہیں گیا۔''

اب سیماں کی ماں بھی کھل کر بولا کرتی۔ ''ہائے بہن یہ تو ہمارے جیسے پہ وہ کلنک لگانے کو ہی رہ گیا...... جواں مرد بھلا یوں گھر والوں کی مٹی پلید کرتے ہیں۔''

پھر رشید نے ایک اور گپ سنائی ''اماں نہ مانو بوا! وہ تو بھنگ بھی پیتا ہے۔ چرس پیتا ہے۔ دیکھ لینا کسی روز یہ سارے گھر کو ہی نشہ میں ڈبو دے گا۔''

اور اب تو خالہ بی سب لیے کو بھی کوسا کرتیں جب وہ ممتا کے بارے میں اس کا سر زانوں پہ لے کر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں۔

ادھر سیماں نے ایسی نظریں پھیریں کہ کبھی بھولے سے بھی اسے فیروز کا خیال نہ آیا اور خالہ بی ایسی ڈھیٹ ہوگئیں کہ منہ پہ فیروز کو جلی کٹی سنانے لگیں۔

''نامراد! ہمیں کب تک یوں تنگ کرے گا دفعہ کیوں نہیں ہوتا کہیں جا مر!''

پھوپھی زینب ہاں میں ہاں ملانے کو تیار ''توبہ ہے! کب تک کوئی کسی کا بوجھ اٹھائے۔''

خالہ بی بال نوچنے لگتیں...... ''میں پوچھتی ہوں آخر کب کام سیکھے گا یہ موا، کون سا سال بھر کا کورس ہے جو ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔''

پھوپھی زینب کو جیسے معلوم تھا۔ ''اے بہن کام وام سیکھنے کا تو بس یونہی بہانہ ہے۔ سچ کہتا ہے رشید۔ کام کے بہانے یاروں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں......''

شروع میں تو فیروز نے ایک دو جواب دیے۔ مگر ان جوابوں نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور پھر جب احساسِ کمتری نے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو تو جواب دینے کی ہمت کہاں رہتی۔

چپ چاپ بت کی مانند خاموشی سے سارے طعنے سنتا جب کچھ نہ بن پڑتا تو ٹھنڈی سانسیں بھر کر اپنے دونوں بازوؤں کے سہارے گھسٹتا ہوا ایک طرف کونے میں جا بیٹھتا اور سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

ادھر رشید کے دل میں شک کا پودا امبر دیل کی مانند بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا اسے دل میں یہ احساس بھی تو تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو ناحق دکھ دیا۔ اس کے پیار کے سبز سبز و تیز بانع کو بوتا۔ اور یہ احساس اسے چین نہ لینے دیتا

وہ بات بات پر ماں سے بگڑ بگڑ کر کہتا ''اماں آخر کب تک میں اس کو برداشت کروں۔ بس بہت ہوگیا بالرلریاں بنائے اور کمائے کہیں علیحدہ جا کر رہے۔ میں کب تک اس کا بوجھ اٹھاؤں؟'' مگر وہ رلیاں بناتا تو کیسے۔ ابھی سے یہ کام سیکھتے کوئی زیادہ دیر تو ہوئی نہ تھی پھر وہ لاچی کا مستری بھلا اتنی جلدی اور مفت میں اسے یہ کام کیونکر سکھاتا.....

اور ایک روز رشید نے ماں سے کہا کہ اب اس کا بیاہ جلدی ہو جانا چاہیے۔ خالہ بی سوچ میں پڑ گئیں۔ بیاہ کیسے ہوگی! مہنگائی کا زمانہ کمانے والا ایک اور کھانے والے سو۔ نوکری کی خوشی کے جوش میں منگنی تو کر دی مگر اب بیاہ کی ہمت کون کرے۔

''اماں کس سوچ میں ہو؟'' رشید نے پوچھا۔

''ہاں! بیٹا مہنگائی کا زمانہ.........'' خالہ بی اٹک کر رہ گئیں!

رشید کو آگ لگ گئی ''تو نکالو! باہر کرو اپنے لاڈلے کو.........اسے لاڈ لا بنا کر بڑے پیار کے ساتھ پال رہی ہو۔ دیکھو ماں!'' اس نے جوش سے کہا۔ ''میں اسے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔''

''اے تو کیا گھر سے نکال دوں؟'' خالہ بی نے ناک پہ انگلی رکھ کر کہا۔

''مجھے نہیں خبر۔ کیوں گھر سے نکالا نہیں جاتا؟'' وہ چیخ کر بولا۔ ''تو رکھو اسے میں ہی نکل جاتا ہوں''

''ہاک!...... ہاک! میرے منہ میں خاک! بھلا تیرا کہا میں ٹال سکتی ہوں'' خالہ بی نے گھبرا کر کہا۔

فیروز تھکا ماندہ اسی وقت گھر آیا تھا کہ کان میں ماں اور بھائی کی یہ تکرار پڑی دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا بس سر جھکائے باہر گلی میں آ گیا۔

دوپہر کا وقت! اور پھر گرمی کا عالم پتھریلی سڑک جیسے چولھے پہ رکھا ہوا توا بن گئی تھی!

بازوؤں کے سہارے گھسٹتا ہوا وہ سڑک کے کنارے بڑ کے درخت کی چھاؤں کو چلا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ آنکھیں خشک جھیل کی مانند ویران اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پسینہ بہہ بہہ کر سڑک پہ چھڑکاؤ کر گیا۔ اس کا دل چاہا کہ قیامت آ جائے ۔ ور ... تو ... سے یہ آ کر چکے۔ وہ مر جائے۔ خالہ بی مر جائے سیما جل مرے رشید۔ زینب گھر والے ختم ہو کر رہ جائیں ... اپنا انجام دیکھ لے۔ مگر آہ۔ یوں چاہنے سے بھلا کبھی کچھ ہوتا ہے؟

یہ دنیا ...... یہ کا کا مستری ...... کیا یہ سب لالچی ہیں۔ پیسہ پیسے پہ جان دیتے ہیں۔ کیا آج یہ چمکتا ہوا سنہری سکہ خدا بن گیا ہے۔ یا اس سنہری جھلک نے لوگوں کی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی ہے۔ یہ پیسہ ...... یہ دولت ...... یہ سونے کا بت خانہ ...... یہ دنیا!

وہ بڑ کی چھاؤں تلے بیٹھ گیا ...... ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے پاس پڑے ہوئے پتھر سے کوئی چیز آ کر ٹکرائی۔ وہ چونکا نیچے پتھر کے پاس مٹی پہ ایک آنہ چمک رہا تھا۔ ایک آنہ۔ آنہ۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ایک شخص جا رہا تھا

اس کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی ...... کیا وہ فقیر ہے؟ ...... کیا اسے فقیر سمجھا گیا ہے؟ ایک اپاہج اور معذور اپنی ٹانگوں سے محروم ...... وہ فقیر ہے ......"

اس کا دل چاہا کہ اس آنہ کو زور سے جاتے ہوئے شخص کے پیچھے پھینک دے اور چیخ چیخ کر کہے میں فقیر نہیں ہوں۔ مجھے تم لوگوں کی ہمدردیاں نہیں چاہئیں ... لے جاؤ ... یہ آنہ لے جاؤ ...!

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنہ اس کا منہ چڑا رہا ہے۔ تیزی کے ساتھ اس کا ہاتھ بڑھا۔ اس نے وہ آنہ اپنی مٹھی میں لے کر زور سے نیچے پٹخنا چاہا۔ مگر ... مگر اس کا ہاتھ ساکت ہو کر رہ گیا ... وہ کچھ نہ کر سکا۔

پھر نظریں جھکا کر اس نے وہ آنہ اپنی پھٹی ہوئی قمیض کی جیب میں ڈال لیا اور بازوؤں کے سہارے بیٹھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ "معذور کو ایک آنہ ... اللہ تمہارا بھلا کرے۔ بھائی!"

پھر دونوں ہاتھوں کو پیالہ کی شکل میں سامنے بڑھا کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں!

کیوپڈ و سائکی

نیاز فتح پوری

یوں تو یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود ایک حسن آباد تھا لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً ''عورت دنیا'' میں ایک سحر تھا، اک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر اک ، ہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا، جسے سائکی کے حسن عالم افروز سے کوئی نسبت دی جا سکتی، پھر یہ خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اس کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب الٹ الٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

گلارس و کیوپڈس بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقش حسن و شباب (سائکی) ورنہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں کہ دنیا انہیں کے لئے ترستی، انہیں کے لئے تڑپتی، اس لئے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں تو جائے تعجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لئے وہ اپنی تسلی، اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین سہی، مگر کم از کم وہ ان لذات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں۔ ''کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی بات نہ تھی''؟ اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی اک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آنے، خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں، اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی آرزو اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے تو اس بیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ سائکی کے لئے کوئی بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب ساگی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو برے بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی، وہ تو اب پوری جوان تھی اور اس لئے انتخاب شوہر جو عورت کی جوانی کی تجسس ہے اس میں بدرجہ اتم موجود تھی اول تو بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی بھی جاتی تھیں، تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غرور سے از سر تا پا دیکھ لیتی، اسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھ دیا کہ ''اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں'' مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک سچی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہوتا کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اس کی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو جاتا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اٹھا لیتی اور جذبات حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوا کہ جب کتاب دیکھتے دیکھتے ... باغ میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی۔ خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو، اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں، جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھنا یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیوں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گزر گئے، یہاں تک کہ ساگی کا شباب، سرور سے سکر، اور سکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا، جس کی زمین کے نسبت فرش گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ ساگی اپنے باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی، یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی، مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لئے روشنی ہے، اور اس کی ہر رات چاندنی، وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی، اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ کر گردن اٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کئے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی، اپنا دکھڑا کہہ رہی تھی، شکایتیں کر رہی تھی کہ۔

اے چاندنی تُو تو آسمان کی ساگی ہے، آسمان ہی میں رہ، دنیا کو تیری
ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک ساگی سے بیزار ہے، زمین جس میں اب مردانی
جنس پیدا ہونی بند ہو گئی ہے سنسان ہے لیکن نہیں تو مجھے چاہتا، تو تو روز یہاں آ
کے ڈھونڈھ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی
ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بے تابانہ آتا ہے، میں اسے پکڑ لیتی ہوں اور تھنوں
دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھونرے کو گرفتار کر
لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں
نکلوا دیں کہ جب شمع نہ ہوگی تو پتنگے کیا کریں گے، کلیاں نہ ہوں گی تو بھونرے کہاں
جا بیٹھیں گے، لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری انگلیوں کے سرے
چراغ کی وہیں تو دن کو وہ چھپاتی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں
قربان ہیں، ڈھلی جاتی ہے، میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں،
رونا چاہتی ہے، میرا وہ چہرہ، جس پر اے چاندنی، ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا
ہے، افسردہ ہے کیونکہ دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگار حسن
باقی رکھے، کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے، اور کوئی مغنی ایسا نہیں
جس کے بربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں، پھر اے آسمان کی ساگی تو ہی بتا
کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سندر کو لکھ سکے، جو نغمے کو گا سکے کہاں ملے
گا؟"

ساگی جیسی حسین و جمیل تھی، ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی، اور اس
لئے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی
بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی، یہاں تک
کہ وہ خستہ سی ہو گئی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کئے۔ بربط کو پھینک
دیا، گویا وہ اس سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی ہیں
لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب
ہی رہتی تھیں اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں۔۔۔ ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ
شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اتر رہی تھیں، سو رہی تھی۔ مگر
سکوت خوب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بے ہوش ساگی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ، اس حالت کو نیچر گھنٹوں دیکھا رہا یا یانِ کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی۔ یعنی صبح

جاگی، ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی جتنی کلیاں جاگ اٹھیں۔ سانگی اٹھی اور کنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اٹھا، وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اٹھا سکی، جس کے ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کا شباب صرف ہوتا تھا۔ گیت کے بول جس میں اس کے سارے حسیات لطیفہ کی قوت کھنچتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے، چنانچہ وہ سو گئی اور نہیں تمناؤں، شکایتوں اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لئے ہوئے سو گئی، جس میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اٹھی تو اس کے اعضاء دکھ رہے تھے، اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ سے اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ مل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہو لی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے، اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں، بلکہ ایک جدا حسن ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سانگی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا تھا۔ اقدام کا کوئی نقش نہیں، مگر ہوا اس سے معمور ہے، جھنجیری اڑ کر نکل گئی، مگر اس کی لچک اور سبک پرواز اب بھی نگاہ میں تھرتھرا رہی ہے۔ سانگی کنجوں میں غائب ہو گئی، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی، اس نے سمجھا کہ بدن کا درد، اعضا کی دکھن عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی کہ نسرین جو سانگی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زریں بربط لئے ہوئے آئی اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بربط کے تار اپنی نازک انگلیوں سے درست کیے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے، اس نے افسون خواب نہایت ہی نرم و شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا:

"اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے، اے نیند آ اور نگھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے، وادئ یونان کی بیٹی کو افشردۂ انگور کی ضرورت نہیں۔ اس کا شباب خود شراب ہے، میں نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر اسے ٹہلتے دیکھا ہے، اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزشِ رفتار نہ پہچان لے۔ اے نیند آ جا کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ سانگی کروٹیں لے رہی ہے، اس کا بدن شاید دکھ رہا ہے، رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ ——"

''نسرین خاموش افسوں خواب کو ختم کر کہ میرا جی گھبراتا ہے''۔

اب ساگی اٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن، یک ننھی سی موج بلوریں ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ آخر کار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا اور یوں ہی بغیر کسی نظام و اصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ نسرین خاموش مودب کھڑی ہوئی ساگی کی اس خلاف معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی، یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل احکام اور ضروریات صبح کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ لیکن ساگی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی

''اے نسرین، آج تو ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکال جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے۔ تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر، جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آ جائیں، تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری ان راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں۔ تو تُو مجھے لوریاں سنا کہ میں اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ مجھے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے، میری زندگی تو اک ایسی صدا ہے جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو تُو ہزار دفعہ وہی گا جو ابھی گائی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طرمیں تار دے، نغموں کو بھول جا اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ اور میرے ساتھ کر اہ''۔

قبل اس کے کہ ساگی اپنی گفتگو ختم کرتی، وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور ساگی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دی۔

ساگی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی، ور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سترھویں سالگرہ تھی اور اسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعراء، شاہزادے، سفیر، مغنی سبھی موجود تھے اور دربار میں ساگی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو ساگی کتان

کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور سافو اپنی جگہ پر جو بہت مرتفع تھی، کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی، ہر شخص جو بڑھتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہار ہوتے تھے اور دوسرے میں وہ چیز جو نذر کے لئے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھول ڈالتا اور پھر نذر پیش کرتا تھا، چنانچہ تھوڑی دیر میں سافو کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صنعت انسانی کے نازک و لطیف ترین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعراء نے اپنے قصائد شروع کئے، مغنیوں نے اپنے ساز درست کئے، یہاں تک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آ گیا، جس کے لئے ہر دل تڑپ رہا تھا اور جس کے لئے یہ سارے تکلفات تمہیدی برداشت کئے گئے تھے۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا تو ان ہدایا کی پذیرائی میں سافو کو ایک لمحہ کے لئے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دینا پڑتی تھی اور غالباً اسی برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں سافو کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دنیا اس جلوۂ عریاں کے لئے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنا ہے کہ جس وقت سافو پورے بارہ برس کی ہو گئی اور اول اول دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ جب پانزدہ سالہ سافو کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اس کے حسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی اور اس سال جبکہ اس کا شباب پورے سترہ سال کا تھا، اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہوگا، غرضکہ وہ ساعت آئی جب سافو کو بے نقاب ہونا تھا، یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطرار، ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا، اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی، لب باہم وصل ہو کر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخرکار سافو اٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لئے اور اپنے سحر حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لئے پتھر کا بنا کے چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا تو بے جا نہ تھا کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا، گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انہوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ بت تراشوں نے اس کے مجسمے تیار کیے مصوروں نے اس کی تصویریں بنائیں شعراء نے اس کے حسن کی تعریف میں قصیدے کہے اور مغنیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دنیا کو مبہوت و متحیر کرنا چاہا۔ مگر یہ پرستاران حسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لئے آخرکار انہیں منہ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ ''اے ملکۂ حسن تیرے مجسمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں ان کی تیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں نادرست ہیں، ہمارے قصائد جن میں حسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے، ناقص ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے ایک ذرات محبوبیت کی صورت میں تیرے آستانہ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں، مکرر و ناقص ہیں، پھر اے تو، کہ جو حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے، اے تو کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پر شکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ بتا کہ تو کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کہ تو کیسی ہے''۔ ۔ ۔ یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا ایک عام بے چینی و وارفتگی کا حال۔

وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے سما میں چمکتی تھی، آج بھی شاندار انداز سے درخشاں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے اور ہم ایک کرۂ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا ہو، اور وینس وہاں کی ملکہ ہو اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کی حکمراں ایک حسین و جمیل عورت تھی، جو ہر چند طبقۂ انسان سے نہ تھی، مگر طبقۂ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا جو سافگی نے زمین میں۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں) بہر حال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے، وینس اپنے کاشانہ بلوریں میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشۂ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی۔ ایک بلوریں حوض جس کی تہہ اور دیواریں صیقل کئے ہوئے آئینہ کی تھیں نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور اس میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی اور آپس میں کھیل رہی تھیں، چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لئے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس

کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا۔ غرضکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جدوجہد کا تماشہ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آ کر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اروٹس، وینس کے ملک کی مشہور سیّاح اور شہرت کی دیوی، جو اس سے قبل کئی بار کرۂ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرب درباریوں میں تھی، وینس سے ملنے آئی تھی۔ وینس تپاک سے ملی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اس کی نئی سیاحت دنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس، میرے حالاتِ سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی کوشش نہ کر، یقیناً ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لئے اضمحلال وافسردگی کا باعث ہو"۔

وینس نے نہایت متحیر ہو کر پوچھا: "اے اروٹس آخر تو وہ کون سی بات [illegible] سی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہوگی، مجھے یقین ہے کہ تو نے کرۂ ارض کے ان ذلیل شہدوں میں جن کو ہوش نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی بات ایسی نہ پائی ہوگی جس کو سن کر وینس چپ [illegible]، کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ سن کر ہنستے ہنستے بے تاب نہیں ہوئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں۔ اے اروٹس کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ، جو کچھ تو نے دیکھا ہے، میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلاف معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے"۔

اروٹس جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ و متین دیوی تھی یہ سن کر کچھ چیں بہ جبیں ہوئی اور بولی، "اے وینس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور اس کے رہنے والے جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے، جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن جب تو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سن میں بتاتی ہوں کہ والیٔ یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائکی ہے، ایسی حسین ہے کہ اگر اس کی خاکِ پا مل جائے تو وینس کو چاہئے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے۔ کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس تقریب میں اتفاق سے پہنچ گئی تھی لیکن اے وینس یقین کر کہ میں جو اس سوقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں، اس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکی، جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا۔ اے وینس، میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو تو اپنے دل میں پیدا کر سکتی"۔

وینس جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا

ہے، یہ سن کر کہ ایک عورت اور وہ بھی کرۂ ارض کی، اس سے زیادہ حسین ہے، چونک پڑی اور اس کے غرورِ حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکرمند ہو کر خاموش ہو گئی، لیکن کچھ سوچ کر بولی:

''اے اروس ٹھہر، میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے تو یہ سمجھ رکھ کہ وینس جس طرح حسنِ خدمات پر انعامات کی بارش کر سکتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کے بدترین سزا کیا ہے''۔

اس نے اروس کو رخصت کیا اور کنیزوں سے طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا اور سب کو علیحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی، یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی، لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا، جو حقیقتاً وینس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں، آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اور نسبتاً بیتابی میں کچھ کمی پیدا ہوئی۔ بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی، پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہئے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے اور اس کی رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اس کو جلد سے جلد دردِ عشق دینا چاہئے۔ اور عشق بھی نہایت شدید، سخت ناکام و مایوس' یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ، وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لئے، اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے، روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیراندازی کرے (ہرچند اس وقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی کی شکل میں دکھائی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس کا عنفوانِ شباب تھا اور اس نے اس کی ناوک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی، اور بیٹے کا منہ چوم کر کہنے لگی۔ ''اے کیوپڈ میں نے سنا ہے کہ جب تو تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اچھے کیوپڈ، جی چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے، لیکن خدا کے لئے پیروں میں زنجیرِ محبت نہ ڈال، کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیرِ محبت سے زیادہ آسان ہیں، کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ تو ان تیروں سے کیونکر وہ زنجیر طیار کرتا ہے، کرۂ زمین میں رئیسِ یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قائل نہیں، جا اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیرانداز

غرور شکن ہے''۔

کیوپڈ یہ سن کر بھڑک گیا، نئے شکار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں سب بے چین ہو گئیں۔ کمان شانہ سے اتر کر ہاتھ میں آ گئی اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس نے پروں کی شاخیں کھولیں اور دیکھتے دیکھتے نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سائکی کی رسم سالگرہ جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافہ و قیامت کیا، ختم ہوئی اور سارا عالم پھر ایک سال تک اسی لمحۂ عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اس وقت لوگوں کی تمنائیں اس درجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض ادا بھی کیا جاتا تو سائکی کے بے نقاب چہرہ اور نگاہ محبوب کے سامنے اس کی حیثیت بھی ناچیز ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لئے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھانا چاہتا تھا اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دنیا سے اب یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ سائکی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات، ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ، اس کے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لئے میسر آ جائے، آہ یہ خواہش تو ایسی خواہش تھی، جو اب کفر میں داخل تھی، کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے، عالم اسے پوجنے لگے، سائکی کا نام لیا جائے، تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اٹھ چکی ہے رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیمان قابل اعتبار سمجھا جائے جو سائکی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو، غرضکہ رئیس یونان کو پورا یقین تھا کہ اب سائکی کی شادی کسی طرف نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اس کو کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ سائکی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ سائکی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے، اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ سائکی کے حسن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، بہرحال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا، لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سائکی اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید چند لمحوں کے لئے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی سائکی ہے جس کی

ناکامیاب رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ اس سال بھی اپنے شباب کو خلوت و مجبوری میں کاٹنے کے لئے مجبور ہے۔ ورنہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دنیا کی تمام تفریحیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور ذرا حسین ہونا، ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں، اس نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ غذا بقائے حیات کے لئے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے جی الجھا تو اٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ ساتھی جہاں کہیں نہیں، مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یوں ہی رکھے، رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید کچروں کو کوئی، اپنے لئے نہیں پہنتا۔ ہار اس لئے گردن میں نہیں ہوتے کہ اس کی نکہت کوئی غذا ہو اس لئے پھر ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پر پڑے پڑے سوکھ جائیں۔ بلکہ شاید ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نکہت سے بیقرار ہونے والا ہو اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے، اسے بے قراری کا جواب دے، ورنہ یوں تو ناکام سینہ ایک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا، اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی، کیونکہ وہ لحن میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی، سازوں کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تاروں میں کسی خاص تار کی کمی ہوگئی ہے، اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے، اگر گانا سکون ہے تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو دل کو بیقرار کئے دیتا ہے۔

غرضکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دیئے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حیات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہو گئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انہیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے، وہ اپنی نازک کمر وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دکھائے اور دکھائے جائے، وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت و دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرور حسن باقی نہ رہا تھا کہ شہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی، اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی اور ہنس کو بھی گردن اٹھائے، ابھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی، تو وہ چاہتی تھی کہ یہی بازو کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی ڈھل گردن پر اپنی زبردست گردن ڈال دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اول شکست نے معاملہ کی صورت کو اس قدر اہم بنا دیا تھا کہ اب چارۂ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے، لیکن آہ، کون جانتا ہے کہ ایک دیوی جس کو دنیا معصوم جانتی ہے، اس وقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لئے ہوئے تھی۔

بہر حال وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی ورنہ نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی، کنیزیں پھولوں کے پنکھے لئے سے ہوا پہنچا رہی تھیں اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سرود لئے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی کہ ساقی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی کہ "نسرین، یہ تو کیا گنگنائی، پھر کہہ، ذرا آواز سے کہہ، ساز لے اور گا کہ مجھے کچھ لطف آیا"، نسرین جو ساقی کی افسردگی سے بہت فکر مند تھی، خوش ہو گئی اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا

> وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانہ میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، [illegible] وہ راتیں جب سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی، گذر گئیں، اب [illegible] ہے کہ نقاب میرے چہرے سے جدا ہو اور پھر چاروں طرف [illegible] بال نظر آئے، آنکھیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ نہیں، [illegible] تھا، شاید میں افسردہ تھی کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے [illegible] تھیں، راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغموں نے انہیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا، لیکن اب اے صبح، اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کر لے کہ میں آج بے نقاب پھر رہی ہوں، اے شام اپنے تئیں خوب بسا لے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر کھلے ہوئے ہیں، اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے، میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی، انہیں مسحور ہونا نہیں آتا، میرا حسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اس کی پرستش ہی کی جائے گی، وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو، دنیا اگر میرے لئے تڑپ رہی ہے تو تڑپے، میں کسی کے لئے کیوں تڑپوں، میری رعنائی ایک مستقل سلطنت ہے، اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوۂ گریزپا کا ادنیٰ خراج"۔

ساقی یہ سن کر جوش میں آ گئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ سیاہ ریشمی چادر جو اس کی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہنچ گئی تھی، ڈھلک گئی، شانے کھل گئے بیاض گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے، ابروئیں تن گئیں، مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں، ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش ساقی پر خالی کر دے گا، لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے، کیوپڈ نے ساقی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر ہاتھ سے چھوٹ گیا، کمان گر پڑی، چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ، کاش کوئی ساگی سے اس وقت جا کر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزو مند ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے صیاد خود اس کا مجروح ہے۔ عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے، خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کئے ہوں گے، لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکاں، جنہیں صرف اک حسین دوشیزہ ہی کی ہم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ وجہ فگن ہیں۔

جا، تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ جو پیدا ہوا تھا دو لیے۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آشفتہ ... باغ میں بے ہوش پڑا ہے۔

وینس کو یقین تھا اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ بھی یقین کرے گا کہ ایک ساگی کیا اگر اس جیسی ہزار ہوں تو وہ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے، مگر فطرت کے پاس اک تیر اور بھی تھا، اک اور ناوک تھا جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا، مگر ان سے زیادہ کارگر تھا اور جس وقت ساگی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اس کی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا، کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی، اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے، لیکن ساگی کی مست آنکھوں کو یہ احتیاج کہاں، نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھیں، اور نہ کسی اہتمام کو، وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھیں، ورنہ کسی انصرام سے، ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

غرضکہ کیوپڈ، ساگی کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا اور اس کی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اپنے اضطراب و بےقراری کا لطف اٹھا رہا تھا کہ وینس آئی اور خلاف معمول اسکو اس درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا مضمحل ہو کر لوٹنا، وہ کچھ جھجکی، اور کچھ ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی، اور ایک خاص انداز میں بولی۔ ''اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تیر چلاتے چلاتے تیری چٹکیاں دکھ گئیں، ہاں، ہاں، سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہوگا کہ کیوں ساگی کو زخمی کیا، وہ ایسی ہی حسین ہے، اور اے کیوپڈ بھی

وجہ تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی کو لازم کر دیا تھا۔ اے کیوپڈ بول، جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں کہیں خراب و خستہ پھر رہی ہے''

کیوپڈ، سائکی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بے قرار ہو کر یوں اٹھا۔

''ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دکھتی ہیں، کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کے لئے یہ عذر کافی نہیں ہیں، میں سائکی کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر نہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوگی، کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی، تیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ سائکی سے درد و مصیبت میں اپنے تئیں مٹا دے۔ اے وینس مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے، آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا تو میں اس کو اس حال میں کہ وہ میرے خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا، اولمپس و اٹلس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور یہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپیٹر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر ڈالے''

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پر کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا، وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آ کر دیا یہ تھا کہ ''سامان سفر درست کیا جائے''۔

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ، اہتمام و تیاری میں مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لئے آمادہ، پردار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دُم و ایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے، وینس کے زریں رتھ میں لگائے گئے اور معاً اپنی اپنی کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے دفعتاً بادلوں کی طرح جو سما پر چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب۔

(۴)

سارے یونان میں آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر بزم رقص و سرود۔۔۔ ایک سیلاب مسرت تھا کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی۔ ایک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا، ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی، شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔ آگسٹس والی

یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ رعایا کا خیر خواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس سے بہتر موقع اس کے لئے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا، سارا دربار زرانندوہ تھا اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔

یونان کے تمام امراء جمع تھے دربار تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی، اگلاریس و کیوپڈس، سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دلہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہر ان کے پہلو میں مست و سرشار، ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری والماسی گلاسوں میں چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آکر روتی چلی گئی، اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہوگئے، مسرتیں منغص ہوگئیں، سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا، آنکھیں شدت درد سے ابل پڑی تھیں اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے، ملکہ چیخ کر بادشاہ سے لپٹ گئی کہ ''خدایا یہ کیا ہوا''؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر ہاں ایک وینس، جو لوگوں کی نگاہ سے غائب گویہ کہتی ہوئی چل دی کہ ''یہ ابتدا ہے انتقام کی، سائکی، وینس کے بیٹے کو بے قرار کر کے زندہ رہے، ناممکن ہے''۔

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہوگیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے، لوگ دوڑ پڑے، ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کر دیں۔ شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوئی اور اس لئے پایان کار تمام ارا کین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے اور جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی، اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی، اور اس عرض والتجا کے لئے ایک خاص مقام مقرر تھا۔ یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگ مقدس کہتے تھے اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آجاتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفع بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی۔ چنانچہ اس وقت صعب میں، جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا

تھا، سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگِ مقدس سے مدد چاہی جائے۔ چنانچہ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد ملکہ، امرائے دربار، اراکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لئے چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہنچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کئے گئے جن کا ادا کرنا ضروری تھا۔ مگر آہ کہ خبر تھی کہ وینس کے ہاتھ نے اس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا جس کے دیکھنے اور سننے کے لئے نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہو گئیں تو ملکہ دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا جو سنگِ مقدس پر پڑا ہوا تھا۔ اس تحریر کا مضمون یہ تھا:

''رئیس یونان بیمار ہے، لیکن اس کی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے، سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ، لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ کیا مرض ہے۔ ساری دنیا کے اختر شناس جمع کرو، لیکن وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ یہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے، وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دور کر سکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر نے اس پر نازل کیا ہے، یہ اس کا غصہ ہے کہ اگر اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا، اگر یونان کی ملکہ، یونان کے امراء، یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن وسکون کے آرزومند ہیں تو ان کو چاہئے کہ شاہزادی سائکی کو کوہ الونڈ کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپیٹر اس قربانی کو کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرے گا اور بادشاہ فوراً صحیح وتندرست ہو جائے گا اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار سائکی کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور نہ کر سکیں گے''۔

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امراء متحیر رہ گئے، کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں اس حلقہ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا اور جن کے لئے اس ظالم پتھر کی یہ ظالم تحریر اک شعر سے زیادہ پُر لطف ایک نغمہ سباحی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلاریس و کیوپڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور ہوش میں لا کر جلد واپس چلنے پر اصرار کرتی ہوئی بولیں: ''اے ماں اٹھ، خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہو گا، ہر چند جیوپیٹر کا فیصلہ نہایت شدید وظالم ہے لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ وبے رحم ثابت ہو گا۔ اگر سنگِ مقدس کی تحریر پر عمل نہ کیا گیا''۔

بہر حال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لئے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی تو وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلہ میں برداشت کر لیتی، مگر نہیں فطرت اس وقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی، سخت المناک آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی، شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس سے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے، یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے، مگر کس کو دے اور کس کو رکھے۔ یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا، لیکن جب اس نے ساگی کو باپ کے پاس حسرت و ملالت فسردگی میں بیٹھا پایا تو وہ "ہائے ساگی" کہہ کر زمین پر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی، ہمیں خبر نہیں کہ وہ کب تک اس عالم میں رہی، اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا، مگر ہاں، جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا، آنکھوں میں حلقے پڑے تھے اور ضعف و نقاہت کا وہ عالم تھا کہ بغیر کسی کے سہارے سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا، مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اس نے اپنے چند ارمیں بحالت خواب و بے ہوشی پایا تھا۔

نہ صرف امراء، درباریوں اور اراکین سلطنت، بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھئے ملکہ کس نتیجہ پر پہنچتی ہے، بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ ایسا سخی اور رحیم حکمران پھر یونان کو نصیب نہ ہوگا، اس لئے جس قدر گراں قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے، لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو ساگی زندہ رہے کیونکہ بادشاہ تو ضعیف ہے اور بہر حال یونان کو ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن ساگی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جس کی ذات ساری زمین کے لئے مایۂ ناز ہے، روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت منتظرہ میں دفعتاً بادشاہ کی خواب گاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتاً آنکھیں کھول دیں اور اس سکوت کے دور کرنے کے لئے جو اس وقت سارے دربار پر چھایا ہوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کے سننے کے واسطے یونان کا ہر متنفس ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا وہ اٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال میں لئے ہوئے، اس عجیب و غریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کر کے کوئی فتح حاصل کر چکی ہے اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ ساگی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوک سے نفع نہ اٹھانے دوں، اگر ساگی کو ہاتھ سے دے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کرے گا تو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے ساگی کو مخاطب کر کے بولی "اے بیٹی تیار ہو جا، میں تجھے اجازت دیتی ہوں، تیرے فخر سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر، اے ساگی ہر چند مجھے یقین ہے کہ میں تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی، لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی تو کیا مجھے پس و پیش کرنا پڑتا، تیرا چلا جانا بھی تو میرا اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے، اے میرے جگر کے ٹکڑے دیکھ اپنی کمزوری سے اس وقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا، تو زیادہ پریشان نہ ہو، کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تیرے پاس آئے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لئے تجھے اپنی آغوش میں لے لے گی"۔

اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ امنڈ کر آنے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اسے اس بات کا اشارہ کرنا پڑا کہ "بس اب ساگی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو"۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ساگی نے اول، اول اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی، کس طرح سنا اور اس حالتِ انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا، مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو وہ بالکل مردہ سی تھی اور اس کے قوا نے بالکل جواب دے دیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے، اس لئے ساگی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی تھی، لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنا دیا، جس صدمہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو جذب کر لئے وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو ماں، کیونکر برداشت کر سکے گی"۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلا کر دیا اور اس طرح گویا اس نے اجازت دے دی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔

اگلاریس و کیوپڈس نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب ساگی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الونڈ کی طرف چل دیئے۔

سوگوار ماں، جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی اور ایک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ کو گھیرے ہوئے تھا، سارے شہر میں ایک کہرام برپا تھا اور ہر گھر میں نالہ و

ماتم، کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہ ہو، اور کوئی دل نہ تھا جو بے قرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسوقت ساری کائنات پلٹ جانے کو ہے اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں ساگمی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں پس پشت رسی سے باندھ دی گئی تھی اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیائش کے لئے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی، اس کی وہی ریشمی چادر جسے وہ نصف باندھتی اور نصف اوڑھ لیتی تھی اس کے جسم پر تھی، لیکن وہ نقاب جو پانچ سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا اب جدا تھا، کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر، چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

ساگمی کا یہاں تک لایا جانا، اس کی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا، یہ سب عالم بے ہوشی میں ہوا لیکن جس وقت اس کی ماں نے بے تابانہ ایک آخری بوسہ اس کی پیشانی کا لیا تو ساگمی کی آنکھیں کھل گئیں اور چونکہ وہ اب ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے) دو قدموں پر نہ گر سکتی تھی، (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق د زبان خشک تھے) اس لئے وہ ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضا سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آ گئی تھیں، اور اس لئے عالم یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے رحم طلب کرنا، حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں کیا لا سکتی تھی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی، لوگوں نے اسے اٹھایا اور ساگمی کو یوں ہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیئے

مگر آہ، وہ ساگمی کا کسمسا کسمسا کر ایک آخری نگاہ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا، جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی، مگر آہ نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا اور نہ ماں موجود تھی کہ پھر ایک بار چیخ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں ساگمی کی نگاہ واپسیں گم اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بے ہوش۔

(۵)

"اے خواب کی ملکہ، اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سکون سے بھر دے اور تو بھی اے تبسم کی دیوی اٹھ اور اس کی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے، کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا

ساحر و دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کرو کیونکہ میرا دل اس کی محبت میں چھلک رہا ہے''۔ کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور دفعتاً کوہ الوند کی اس خوفناک چوٹی پر پہنچ گئیں جہاں شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبش شروع ہوئی۔ پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و عجیب خوشبو نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائکی کے دماغ کا اس تعطر سے متاثر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کا سونا تھا کہ باد نسیم نے درخت سے جدا کر کے اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر فرش پر سلا دیا۔

سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی، چادر اس کے سر و سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے اپنا عریاں حصہ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیئے اس کے بال ہوا سے اڑ اڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پر آ رہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے، اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیئے

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی، مگر محو خواب نہ تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائکی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو، اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ سائکی کی سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے، وہ متحیر تھا کہ اس کی نازک کمر پر اپنے تئیں تباہ کرے یا اس کی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر۔ وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سائکی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا، اس کے رنگین تلوؤں پر ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ

''اے سائکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا، تجھ سے پیار نہیں کروں گا، تجھ سے
عشق نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ بھی ایک ناقص طریقہ اظہار جذبات کا ہے،
میں تیری عظمت کروں گا، تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈروں گا، ایک ایسا ڈر اپنے دل
میں لئے ہوئے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا، تجھے دیکھوں گا اور
کانپ کروں گا، بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی ہیں،
تجھے ایک ملکہ، نہیں، ایک دیوی آہ، یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا، اور

> اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم، ایک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب، فقیر، اک ذلیل گدا، ایک خوار بھکاری اور اس سے زیادہ حقیر وہ پیچ سمجھوں گا، جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا''۔

مارفیس وزفر نے سائکی کو اٹھایا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کرہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر سائکی کے لئے تیار کرایا تھا، وہ ایک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ مانی دی گئی اور مارفیس، اپنی نیند اس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہو گئی۔

سائکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنی تئیں اک طلائی برج میں جواہر کی روشنی میں پایا، اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے، اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو، مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا، اور اک شیریں آواز سائکی کے کانوں میں آئی کہ ''یہ خواب نہیں حقیقت ہے''۔ اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے، سونے کی بوچھاڑوں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ ''متعجب نہ ہو، تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے، اسے کوئی حکم دے شاہانہ لب ولہجہ کے ساتھ جو کرنے کو کہہ، کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے، اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں۔ جس کے لئے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی، اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشات قلب مہیا کر دے''۔

سائکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت، مردم خور عفریت اس کا شوہر بنے گا، لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب، اس کا کندنی رنگ جو نقاب سے چھنا پڑتا تھا، کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے، ایک نہایت ہی خوبصورت اور پر شباب چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حسیات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے، دفعتاً زندہ ہو کر پھر اس کے خون میں دوڑنے لگے، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا، انفعال سے بھیگ گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آ گئی جس سے اس کا حسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخرکار اپنے تمنا سے مغلوب ہو کر اٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ ''اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات، اپنی تمناؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں ان سے محبت کرنا سیکھوں گی گو انہیں مجھ سے محبت نہ ہو، میں اپنے بہترین ہدایائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی، خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائی جائیں''۔ یہ کہتے ہوئے سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و نیز لجاجت لہجہ میں بولا کہ:

''اے سانگی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر، جس وہ میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھی کو افسوس کرنا پڑے، اگر تو مجھ پر صرف اس لئے رحم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لئے تیار نہیں تو تو رحم کر، ورنہ اے سانگی پھر میں تجھ سے چھپ جاؤں گا اور مر جاؤں گا''۔

سانگی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پا کر رک گئی۔ ٹھہر گئی اور ایسا محسوس کرنے لگی گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار، اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے، آخر کار اس نے اپنے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا، اپنے تئیں اس کی آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اور جس کے لئے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی، آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہو کر گر پڑی۔

ہر چند، ملک، وطن، ماں باپ کو اس طرح یکایک چھوڑنے کا رنج، یہ معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی، حساس اور ایسی لطیف الخیال نازک طبع جلد فراموش کر سکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے، یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغلِ حیات میں بھی منہمک ہو، مختلف اسباب تفریح سے گہری دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ بھی مکمل یگانگت کا اظہار کرے، لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کرو، جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو، پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے، یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی، حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو، اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سانگی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ الفت، یہ جاں نثاری، یہ قربانی اسی وقت تک تھی جب تک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا، لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا، اور اس کی وارفتگی، اس کی افتادگی اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، کانوں سے سن لی اور ہاتھوں سے چھو لی تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کہ وہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیات معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکتی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بار شباب سے

خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی، آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے، اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے، حسین ہے، اس لئے اس نے مطلق پروا نہیں کی، اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا، اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لئے آمادہ ہے، اس لئے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی، وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں۔ کبھی وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب، کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے۔ غرضکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا۔ مجنوں تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پرنم ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیے اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا اور اس کی آغوش میں بے ہوش ہو کر پڑ رہا۔

(۲)

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو کیونکہ اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی جلگاہ تھیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا انسانی قوت سے باہر تھا، ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں۔ ناقابل پیمائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے عمیق چشموں کی اس وسعت میں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت، بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ، اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ! یہ تھا کوہ اولمپس جہاں کیوپڈ نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا، اور یہ انتخاب اس نے اپنی کسی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہ اولمپس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی، اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا، کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب نازل کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر اتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہ اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپیٹر کا غصہ آگ بن کر نکلا اور دور دور آبادیوں کو تباہ و برباد کر گیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا، مگر چونکہ کیوپڈ، جیوپیٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں پہنچ سکا، اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں، مارفیس اور زفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زریں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت ایک ایسی مسرت سائکی [illegible] تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اسے یہ ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس [illegible] خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اسے یہ معلوم ہو کہ اب کیوپڈ [illegible] زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ انہیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ سے متعلق [illegible] خلق سے رجی اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور [illegible] ضرورت تھی کہ وہ [illegible] کے ساتھ اس کی کو پورا کرے، لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ [illegible] وقت [illegible] گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟ اس کا جواب [illegible] سے چھوڑ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالی قصر میں ان تمام اسباب [illegible] جن کی وہ اپنے زمانۂ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اٹھا کر زمین پر دے مارے جو خود [illegible] ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹنکے ہوئے تھے اور جن کی عمریں [illegible] نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے انسے کہا کہ "جاؤ اور قبل [illegible] دروازہ تک پہنچے تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کر دو جو والی یونان کے محل سے متعلق ہیں" [illegible] رخصت کر کے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش زمین پر پٹکنا شروع کیا، یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے بھر گیا اور سائکی ان پر دار پیش خدمتوں سے گھر گئی، ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں کے ارتعاش کے وقت عجیب مسکر خوشبو پیدا ہوتی تھی، سائکی اس زمانہ قیام میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اس کی نگاہ دروازہ سے باہر نکل کر پہلی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہو گئی کہ شاہ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشوں، نہروں، فواروں، درختوں اور حوضوں کے کیونکر یہاں منتقل ہو سکا، وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر بچھے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس تھے، وہاں حوض سنگ مرمر و بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں وہ اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرتی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ مست و سرشار تھی۔

سائکی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں۔

شام ہو گئی تھی، چاند نکل آیا۔ اس لئے پھر سائکی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصد آ اس نے

کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہتی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک
طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

(۷)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لئے باہر چلا جاتا اور پھر اک نیا شوق، نیا
جوش لے کر واپس آتا اور سائکی کے پاس رہتا۔ ہر چند سائکی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی
غیبت میں انتظار کی گھڑیاں، مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی، لیکن وہ کیوپڈ کی اس تھوڑی گھڑی کی
مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی، اور وہ اپنے کنجوں، پھولوں اور پریوں سے بیزار
، اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کا ہم جنس مل جائے، اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان
پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ
نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کیں جن سے سائکی گفتگو کر سکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو
وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہ ان بے
زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ ''میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں''۔

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک کلی کی
سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے، وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت
میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات معاشقانہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی
ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار۔ جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا
نہیں، لیکن جب کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کے لئے قابل فہم بنا دیتا
ہے تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے
جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے، یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی
تھی اسی طرح اپنے سرور و شادکام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے، اس لئے
سائکی بعض وقت گھبرا اٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اس کی بہنیں، اگلارس دیکوپڈس ہی آ کے دیکھیں اور
اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلاف معمول کئی دن کے بعد آیا تو سائکی مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو
دیکھوں گی، اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انہیں کو یہاں بلوا دوں گی یا تو وہ اس کے پاس سے ہٹا نہ کرے یا
پھر کیوپڈس و اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انہیں کے ساتھ بسر ہوں۔

کیوپڈ خاموشی سے سائکی کی ضدوں کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت

سنجیدگی سے جواب دیا کہ ''اے سائگی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منقلب نہ کر دے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آ جائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور بھی ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، اے سائگی اب بھی سوچ اور مجھے ان کے بلانے پر مجبور نہ کر''۔

مگر سائگی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی، اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو با دل نخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے زیفیروز فر کو بلایا اور اگلاریس و کیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ ان کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

''میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گزر جاتی ہیں کیونکہ جب تک تُو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے، لیکن ہاں میں ان راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو ادھر مجھ پر اور ادھر تجھ پر تنہا گزریں، کیونکہ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انہیں کے ساتھ ہے، لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں، کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی، تجھ سے محبت کرنے کی، پھر اگر تو مجھ سے علیحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو تیرے ساتھ ہے، پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے، وہ سکوت و فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں تو رات کو کسی دور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے، گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے، یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائگی ہے جو تیری آنکھوں میں آ جاتی ہے، اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے لوگ کہتے ہیں محبت بُری ہے، مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا''۔

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لئے بول اٹھا

کہ ''اے سائکی، کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا''؟

سائکی بولی ہاں سچ ہے، تمہیں نے چدیا، تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے سنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا، اسکے دل میں ذرا رحم نہیں ہے، اس کا سینہ گداز عشق سے خالی ہے، وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو''۔

کیوپڈ ''ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی، شاید درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں''۔

یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر، سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے آئیں اور جھکا کر غائب ہو گئیں۔ سائکی اپنی بہنوں کو لے کر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ اور جلیں کہ سائکی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے لیکن ظاہر میں انہوں نے سائکی کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ یہ زر و جواہر یہ سامانِ نشاط کہاں سے آیا''؟

سائکی نے جواب دیا کہ ''مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے، جس نے مہیا کیا''۔

انہوں نے نہایت حیرت سے کہا: ''تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا''؟

''آہ میں اس کا نام نہیں جان سکتی، اس کی ممانعت ہے''۔

''مگر اے بہن، تُو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا، کیا بہت خوبصورت ہے''۔

''نہیں، میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے''۔

''ہاں ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب اور میری نیندیں اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اٹھتی ہیں''۔

بہنیں بولیں: ''اے لڑکی، تجھے فریب دیا گیا کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھا لے گا''۔ سائکی نے کہا، ''نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہو سکتا''۔ مگر دونوں بہنوں نے پھر بھی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سائکی بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اس تفکر سے انہوں نے اور فائدہ اٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ ابھی جائے اور نقاب الٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی، کیوپڈ اپنی خواب گاہ میں بے ہوش پڑا سو رہا تھا، سائکی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ سے نقاب الٹ دیا، مگر بجائے اس کے کہ وہ عفریت کی ڈراؤنی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں سائکی کی محبت نے خدا جانے کتنے

مدارج اور طے کر لئے۔

کیوپڈ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ ''اے بیوقوف سائکی یہ تُو نے کیا کیا؟ کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں کہ قوتِ غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بار بار نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا''؟ یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سائکی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح وہ لوٹ آئے اور اس کی خطا معاف کر دے۔ ہر چند کیوپڈ سائکی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رک گیا، کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر فانی روح اس سے چھن جاتی۔ اس لئے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سائکی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سائکی بے ہوش ہو گئی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بے ہوش رہی، لیکن ہاں، جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا، نہ وہ اس کی مکلف خوابگاہ، نہ وہاں باغ تھا، نہ کوئی کنیز، وہی وحشت ناک کوہستانی چٹان پڑی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لئے لائی گئی تھی، اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ رسیوں کے باندھ دی گئی تھی، پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا پڑا کہ خواب نہیں ہے، بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پُر لطف زندگی بسر کی، مگر ایسا خواب، ایسا طویل خواب نہیں ہو سکتا، مگر پھر کیا تھا؟

آہ، وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی، وہ بالکل مبہوت تھی، دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مر جانا چاہتی تھی۔

(۸)

سائکی دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے اور سارا بدن چوٹوں سے داغ دار، کراہتی تھی اور روتی تھی، چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی، لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا۔ اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس چلی گئی۔ جیوپیٹر اس کا شوہر اولیں تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی، اس لئے اس نے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا، مگر جس وقت سائکی لائی گئی تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوصف تمام تدابیر حسن فروز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، عرق عرق ہو گئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیئے، لیکن جیوپیٹر نے رات کو وینس کے خواب میں آ کر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پراسرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اٹھی، کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب کے نیچے ایک عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے"۔ یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی۔ نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، بلکہ ایک روشنی تھی، ایک محبت پاش جھلک تھی جو اس کے آگے آگے تھی، اور اسے ان مصائب میں تسلی دیتی جاتی تھی، راستے میں درندے اسے ملے، مگر وہ اس کے حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا راہ میں آئے لیکن وہ بھی خشک ہو گئے، غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسرپائن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا۔ سائکی خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا، اس امید پر۔ شاید وہ زمانہ پھر واپس آ جائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، لیکن وینس، سائکی کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جلی اور بدعہدی پر آمادہ ہوگئی۔ جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آ گیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، آخر کار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب لاہوتیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی۔

(۹)

کیوپڈ سائکی پھر اسی کوہ ولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی شروع ہوگئی جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی، اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا۔ مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر ان پر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

گھاؤ

واجدہ تبسم

حمید دودھ کی بالٹی اٹھائے اندر آیا تو سکینہ آلو ابال رہی تھی۔۔ سسد کر بالٹی زمین پر ٹکتے دیکھ کر وہ ذرا دھیرے سے بولی۔۔۔

"کتنا دودھ ہوا آج۔۔۔؟"

حمید نے لاپروائی سے اس کی طرف دیکھا اور آواز نیچی کر کے بولا۔۔۔

"ایک پاؤ سے بھی کم۔۔۔"

ابھی سکینہ کوئی جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ ادھر سے ماں چنگھاڑتی ہوئی آ موجود ہوئی۔۔۔

"ایک پاؤ۔۔۔ آدھ پاؤ۔۔۔ ڈیڑھ پاؤ۔۔۔ دو پاؤ۔۔۔ کبھی اس سے بڑھ کر دودھ دیا بھی ہے تیری گیا نے۔۔۔؟"

حمید نے لرز کر ماں کو دیکھا۔ ساس کی تیز آواز سن کر سکینہ نے خود کو آلو کے چھلکے اتارنے میں مشغول کر لیا۔۔۔

"میں کہتی ہوں اس حرامزادی کو بیچ کیوں نہیں دیتا تو۔۔۔" ماں جھلا جھلا کر ہاتھ نچانے لگی۔۔۔

حمید ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ماں پھر چیخ اٹھی۔۔۔ "جانے منحوس ماری کون گھڑی سے خریدی گئی ہے کہ گھر واڑے میں الو بول گیا۔۔۔ کوئی دن تو سکھ کا نصیب نہ ہوا، اس پر بھی نئی نویلی دلہن کی طرح مرگھلی گائے کو کلیجے سے لگائے لگائے رہتا ہے"۔۔۔

حمید ذرا ڈر کر بولا۔۔۔ "ماں کیسی بات کرتی ہے تو۔۔۔ دودھ تو بے چاری کا اب سوکھا ہے۔۔۔ پہلے تو تین تین سیر دودھ اس نے ایک ایک دوہنے میں دیا ہے"۔۔۔

"ہاں ہاں جبھی تو تیرے ہاں مکھن کی دکان لگ گئی نا--- ارے نابکار! تو نے تو عقل بیچ کھائی ہے--- بھلا کوئی مجھے بتائے تو اس گائے نے تجھے کیا سکھ دیا ہے"؟

پیچھے بیٹھی ہوئی سکینہ بولی "یہ تو نہ کہو ماں--- ہمارے تین تین بچے اسی لالی نے پالے ہیں--- ورنہ میں ایسی کون بڑی تندرست تھی کہ آج تین بچوں کے بعد بھی زندہ دکھائی دیتی"---

"ہونہہ---" بڑھیا زور سے چیخی--- "لالی --- لالی--- لالی--- لالی نہ کہو کالی کہو کالی--- سارے میں سیاہی پھیر دی کوکھ جلی نے--- اس پر بھی اتنا مان ہے نسری کا--- میرا بس چلے تو آج طبیلے پر بیچ آؤں"---

"تمہارے سینے میں تو دل نہیں ہے ماں، پتھر ہے پتھر"--- سکینہ بیزاری سے بولی--- "کوئی ایسے بھی سوچتا ہے بھلا--- ابھی اسے لیے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ قصائی کو دینے کے بارے میں سوچتی ہو"؟

"جب اتنا ہی پیار پھٹا پڑ رہا ہے تو پھر پوجتی کیوں نہیں اسے شانتی کی طرح--- شانتی اسے گائے میا کہتی ہے تو بھی کہنے لگ جا"۔

سکینہ ذرا مسکرا کر بولی---

"اور جو کہنے بھی لگوں تو کیا بگڑ جائے گا ہمارا"---

اس دیدہ دلیری پر بڑھیا تو حیران ہی رہ گئی--- دیدے پھاڑ کر بولی---

"کیا بگڑے گا"---؟ پھر تیزی سے بولی---"اس سے بھلا تو یہ ہے کہ تو بھی ہندو بن جا"---

سکینہ ہانڈی میں ڈوئی چلاتی ہوئی بولی--- "ماں! ہتھنی جیسا تو تیرا ڈیل ڈول ہے، اس میں دل بھی بڑا سارا ہو گا، پر اتنے بڑے دل سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں سوچنا تجھے اچھا لگتا ہے کچھ"؟

"اری کلموہی--- ہتھنی جیسا ڈیل تو گیا تیری لالی کے بھک میں--- اب بھی میں تجھے ہتھنی ہی نظر آتی ہوں"؟

ماں کی لالی سے ساری دشمنی بس یہی تھی کہ حمید کے باپ نے جب گائے خریدنے کی بات اٹھائی تو گھر میں سوائے تین بیسی کے ایک دھیلا بھی زیادہ نہ تھا--- اور یہ تین بیسی بھی ماں نے پائی پائی کر کے اس لیے جوڑے تھے کہ بہو کی پہلی زچگی پر اسے گھی اور میوہ کھلا سکے--- مگر حمید کا باپ تو جو سوچتا تھا، اسے پورا بھی کر دکھاتا تھا--- ماں کے کانوں میں تولے تولے بھر کی بھروان انتیاں تھیں اور گلے میں موہن مالا--- سب کچھ ملا کر تین ساڑھے تین تولے

سے بھی اوپر جاتا تھا۔۔۔ اشرف کی نظر بیوی کے گلے اور کانوں پر تھی۔ بیوی بھی یہ بات جانتی تھی مگر ہندوستان کی عورت تھی۔۔۔ جو زیور کو اولاد ہی کا ایک روپ سمجھتی ہے۔ اشرف نے جب دبی دبی زبان سے زیور کی بات سنائی تو وہ بگڑ گئی۔۔۔

"ہے ہے کیسے مرد ہو تم۔۔۔ کوئی یوں بیوی کے زیور پر نگاہ رکھتا ہے۔۔۔ یوں ہی گائے خریدنے کا ارمان ہے تو اپنا بل بوتا کیوں نہیں دکھاتے''!

اشرف چاپلوسی سے ہنس کر بولا۔۔۔ ''اری جھلی کون ہے تیرا زیور میں تو گہنے رکھنے کو بولتا ہوں۔ گائے کے دودھ کی آمدن پر تیرا ایک ایک ماشہ نہ چھڑا لاؤں تو اپنے باپ کی نہیں سور کی اولاد کہہ دینا۔۔۔ ہاں۔۔۔"

اشرف ہنسی ہنسی میں اتنا دباؤ ڈال گیا کہ بڑھیا کو ہاں کہتے ہی بنی اور گائے گھر میں آ گئی۔۔۔ اونچی پوری لال رنگ کی گائے۔ مانو گائے نہ ہو ونجی جبل کی جنس ہو۔۔۔ اتنے اتنے کو نہیں پورے تین سو کو ملی تھی۔۔۔ اشرف کو تو یہ بھی خیال تھا کہ اس کی نسل سے نکلنے والے بچھڑے کیسے نامی بیل بنیں گے۔۔۔ ادھر دودھ کی آسانی تو تھی ہی تھی

لالی ڈچ گائے تھی، پہلے ہی دن حمید آستین چڑھا کر دودھ نکالنے بیٹھا تو تیز تیز جھر جھر کرتی دھاروں سے پیتل کی بالٹی آدھی بھر گئی۔۔۔ ماپ لا کر دودھ کا اندازہ لگایا تو تین سیر سے بھی بڑھ کر تھا۔۔۔ اشرف نے بڑے فخر سے بیوی کی طرف دیکھا۔۔۔ جیسے۔۔۔

''یوں اب کیا بولتی ہے''۔۔۔

بیوی نے جھکولے سے منہ پھیر کر غصہ دکھایا۔۔۔ جیسے۔۔۔

''مجھے کیا لینا دینا تمہاری گائے سے''۔۔۔

پہلے دن جو دودھ اتارا تو گھر کا گھر ہی میں رہ گیا۔۔۔ دونوں جوان میاں بی بی اور دونوں بوڑھا اور بوڑھی بی بی۔۔۔ حمید تو ڈگ ڈگا کر کوئی سیر بھر دودھ اکیلے ہی چڑھا گیا۔۔۔

دو ایک دن دودھ کا یہی حال رہا کہ ادھر گائے کے تھنوں سے بالٹی بھی اور پینے والوں کے منہ کو لگی۔۔۔ مگر چوتھے پانچویں اشرف نے راتب لگا دینے کی بات سامنے رکھی۔۔۔

''گائے کا پیٹ اسی کے دودھ پر پلتا ہے اور پھر اس کی قیمت وصول کر کے تیری ماں کا زیور بھی چھڑانا ہے''۔۔۔

حمید سر ہلا کر بولا: ''بات تو ٹھیک ہے۔۔۔ گائے کا دودھ اور ایسی نسلی گائے کا دودھ، کون نہ خریدنا چاہے گا۔۔۔ تم کہو تو کل ہی سے سارا دودھ بکوا دوں''۔

ماں ادھر سے بولی۔۔۔ ''اور جو بہو پورے دنوں سے ہے، اس کا دھیان ہے کچھ۔۔۔؟''

تھوڑا گھر میں رہے تو اچھا ہے۔ اب گائے خریدی ہی ہے تو بہو دودھ کیوں نہ پیے"؟

گائے ہرا چارہ کھاتی تھی اور بہتی دھاروں دودھ دیتی تھی۔۔۔ حمید باپ بھی بن گیا اور ماں کا آدھا دھودا زیور بھی چھوٹ کر آ گیا۔۔۔ بچہ ہوتے ہی سکینہ کی صحت کی گرتی آ گئی۔۔۔ بچہ بھی اوپر کے دودھ سے لگ گیا۔۔۔ اور پھر یہ ہوا کہ گائے کا آدھا دودھ گھر ہی میں اٹھنے لگا۔۔ سکینہ اوپر تلے بچے پہ بچہ جنتی گئی اور سوکھتی گئی۔۔۔ سکینہ کی بجائے لالی نے ماں بن کر بچوں کو پالا۔۔۔ ماں کا جتنا زیور آ گیا بس آ گیا۔۔۔ باقی کا سارا ساہوکار کے ہاں رہ گیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ حمید یا اشرف مہینے کے مہینے اس کا سود ضرور ادا کر آتے اور زیور ڈوبنے کی نوبت نہ آئی۔۔۔ لیکن ایک لازمی بات جو ہونی ضرور تھی وہ ہو کر رہی کہ ماں لالی کی دشمن بن گئی۔ اسی کی وجہ سے اس کا زیور گہن میں پڑا تھا۔ اور اب دن گزرتے جا رہے تھے اور زیور واپس ملنے کی کوئی آس باقی نہ رہ گئی تھی۔۔۔ کبھی کبھی بڑھیا بہت گرم ہونے لگتی تو اشرف اسے اطمینان دلاتا۔۔۔

"اپنا زیور ہی لے گی نا۔۔۔؟ یا پھر لالی کی جان لے کر رہے گی"۔

بڑھیا پھاڑ کھانے کو دوڑتی ـــ ہاں ہاں میں تو لالی کی جان ہی لوں گی۔۔۔ بڑے زیور دینے والے آئے۔۔۔ گلا کان سارے ننگے ہو گئے۔۔۔ اور پھر بھی طعنہ دیتے ہو کہ جان لے گی کیا۔۔۔؟"

اشرف چھیڑنے کو بولتا۔۔۔

"اری بڑھاپے میں زیور پہن کر کیا کرے گی۔۔۔ اب تو بہو کے دن ہیں۔۔۔ تجھے اتنا شوق کیوں ہے زیور کا۔۔۔"؟

بڑھیا تپ کر شعلہ بن کر بولتی: "اپنے خصم کو دکھانا ہے نا، اس لیے شوق ہے"۔

اشرف زور زور سے ہنسنے لگتا۔۔۔

اشرف نے زبان دے رکھی تھی کہ زیور نہ لوٹا دوں تو انسان کا نہیں سؤر کا جنا کہہ دینا۔۔۔ اس کی نوبت ہی نہ آئی، موسمی بخار میں چار دن بھگت کر چٹ پٹ ہو گیا۔۔۔ مرنے والے کو سؤر کی اولاد کہتی تو کیسے۔۔۔ اور اگر کہہ بھی دیتی تو ملتا کیا تھا؟ پھر مرنے والے کو برا بول بول کر گنہگار کیوں بنتی"؟

اشرف تو مر گیا۔ حمید نے سوچا تھا کہ ماں کا زیور اس برس ضرور ہی لا دے گا۔۔ اور یہ بات اس نے یوں بھی سوچی تھی کہ اب کے لالی گابھن تھی۔ چند روز بچھڑے کو دودھ پلوا کر کہیں نہ کہیں بیچ دے گا۔۔۔ کون نہ لے گا بھلا۔۔۔ بس ایک دم ماں کا زیور لا کر اس

کے قدموں میں ڈال دے گا۔۔۔ مگر قسمت اندھی تھی، لالی کو سفید رنگ کا خوبصورت سا بچھڑا ہوا ضرور۔۔۔ پر جانے کیا ہوا، کسی نے کچھ جادو ٹونا کر دیا یا اس کی موت ہی آئی تھی کہ دوسرے ہی دن تھان پر مرا ہوا ملا۔۔۔ یہ صدمہ تو حمید کی جان کو ایسا لگا کہ تڑپ کر رہ بھی نہ سکا۔۔۔ مگر ماں اب اچھی طرح جان گئی کہ میرا زیور تو اب عمر بھر بٹنے سے رہا۔۔۔ لالی اس کی آنکھ کا کنکر بن کر ہر لحہ کھٹکنے لگی۔۔۔ مر جائے تو جی کو سکون ملے۔۔۔ مر لالی بھی بی عمر لے کر آئی تھی۔ مرتی تو کیا اس کا تو بال تک بیکا نہ ہوتا۔۔۔

دھوپوں کے دن آئے تو لالی نے دودھ اک دم کم کر دیا۔ کہاں تو پیتل کی بالٹی چھلکی پڑتی تھی یہ اب دھاریں بالٹی کے پیندے سے ٹکراتیں تو چھرچھر آوازیں بھی نہ نکلتیں۔ بس حمید دو چار ہاتھ چلاتا اور تھن خالی پڑ جاتے۔۔۔ چارہ ستا ہی کھاتی۔۔۔ کھوی کھلی میں بھی فرق نہ پڑا تھا مگر اک دم سے بند جیسا کر دیا۔۔۔ یہاں تو خود گھر والوں کے کھانے پینے پر آ کر بنی ہوئی تھی، لالی کی برابری کہاں سے ہوتی۔۔۔ مگر حمید تھا کہ اس کی سیوا کیے جاتا۔۔۔ کبھی کبھار سکینہ بھی الجھ کر بول جاتی۔۔۔

"اس گائے نے تو ہماری گرہستی چوپٹ کر دی"۔۔۔

حمید اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بولتا۔۔۔ "اری دیکھ ہریالی اگتے ہی ایسا دودھ دے گی کہ ایک چھوڑ دو دو پیلی بالٹیاں بھریں گی"۔۔۔

یہ خیال تو حمید کو بھی ستاتا تھا کہ لالی فضول کا بوجھ بنی ہوئی ہے۔۔۔ جانور سے فائدہ کی بجائے الٹا نقصان ہو تو اس کا بیچ دینا ہی بھلا۔۔۔ مگر جب یہ خیال آتا کہ باپ نے کن رمانوں اور چاؤ سے خریدی تھی تو طے کر لیتا کہ چاہے گھر کا برتن باسن تک بک جائے مگر کبھی گائے کو بیچنے کا سوچے گا بھی نہیں۔۔۔

حمید اپنے بھائے تو گائے کی پوری دیکھ بھال کرتا رہتا تھا مگر جب گھر میں اپنے بچوں ہی کے کھانے کی برابری نہ ہوتی ہو تو گائے کا مان کون رکھے؟ لالی گھوڑی کی طرح اُچک اُچک کر چلتی تھی، بھینس کی طرح دودھ دیتی تھی۔۔۔ ایک نظر کوئی دیکھ لے تو آنکھوں میں بھر کر رہ جاتی تھی، اب تو یوں کھڑکھڑی ہو گئی تھی کہ ساری ہڈیاں نمودار ہو گئی تھیں۔

"جانے یہ ہڈیوں کا پنجر کیوں پال رکھا ہے۔۔۔ بیچ دے تو اچھا ہو جائے کہ میرا زیور چھوٹ جائے"۔۔۔

حمید ماں کے سامنے کچھ نہ بولتا مگر جی ہی جی میں جل کر رہ جاتا۔۔۔ "کون سے کرموں کی دشمنی نبھا رہی ہے ماں۔۔۔ سمجھ نہیں پڑتا۔۔۔ زیور کی ایسی بھی کیا چتا"؟

لالی دن بدن سوکھتی جا رہی تھی۔ حمید نے اب لالی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ جہاں چاہے چرے اور اپنا پیٹ بھر لے۔ لالی ڈنڈے بھی کھاتی اور چار بھوسہ سرکی۔۔۔ جو بھی مل جائے۔۔ مگر یہ سودا حمید کو مہنگا پڑا۔۔۔ پتہ نہیں کس نے ایک دن اپنے کتے کو لالی پہ چھوڑ دیا۔۔۔ کتے نے مالک کی ایسی بات مانی کی لالی کو دوسرے تیسرے دن ہی کھروں کے پاس کھرنچ ہو گئی چلتے چلتے وہ اوپر ہی اوپر بڑھنے لگی۔۔۔ اب حمید کا یہ کام تھا کہ لالی کو ڈور پکڑ کر روزانہ ڈھور ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔۔۔ اس کی دوا درمن کرتا اور اپنے طور پہ جڑی بوٹیوں کو کوٹ چھان کر زخموں پہ تھوپتا رہتا۔۔۔

کہاں تو ماں اس کی موت کا ارماں لیے بیٹھی تھی یا اب حمید تھا کہ اس کو زندگی کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔۔۔ ماں نے تڑپ تڑپ کر بددعائیں تو بہت مانگیں مگر ایک بھی بددعا نہ لگی اور لالی دھرتی کا بوجھ بنی پھر آنگن میں بندھی رہنے لگی۔۔۔ بیمار بچہ اچھا ہو جائے تو ماں کا اور بھی دلارا ہو جاتا ہے۔ لالی بیماری جھٹک کر اٹھی تو حمید کی آتی جاتی سانس بن گئی۔۔۔ ماں نے اپنے جسم کی ساری طاقت لگا کر چیخ چیخ کر گھر سر پہ اٹھا لیا۔۔۔ روز یہی واویلا کلکل رہنے لگی۔۔۔ حمید تھک ہار کر کھیتوں پہ سے آتا تو دیکھتا کہ سکینہ منہ تھتھائے ایک طرف پڑی ہے۔۔۔ بچے الگ منہ بسورے بیٹھے ہیں۔۔۔ ماں کونے سے لگی گائے کو گھورے جا رہی ہے۔۔۔ پوچھنے پہ پتہ چلا کہ ماں نے آج لالی کی جھوٹن میں بہو کی کندی کر دی۔۔۔ کبھی بچوں کو کوٹ ڈالا تو کبھی خود کو نوچ ڈالا۔۔۔

حمید سوچتا ماں کی بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔ اس کا زیور برسوں کا گیا اب آتا ہے نہ جب۔۔۔ ادھر گھر میں خرچ کی وہ تنگی ہے کہ صبح کھا تال گیا تو دوپہری کی امید نہیں کہ کیا بنے گا؟ ایسے میں لالی دودھ بھی نہیں دیتی، الٹا اسی کا پوری کرو مگر جب لالی کے دکھ کا خیال آتا تو لرز کر رہ جاتا۔۔۔ وہ تو اب بیٹی جیسی ہو گئی تھی۔۔۔ کیا حمید سے یہ ممکن تھا کہ ربعہ کو کسی کے ہاتھوں بیچ دیتا؟۔۔۔ پھر یہ ماں کیسی بات سوچتی ہے؟۔۔۔

مگر ماں کے سوچنے کا انداز نہ بدلا پہ نہ بدلا۔۔۔ وہی روز روز کی جھک جھک ۔۔۔ وہی بک بک۔۔۔ حمید حواس میں تھا مگر پھر بھی پاگل تھا۔۔۔ ماں نے گھر کا چین ہی جو لوٹ لیا تھا۔۔۔

ایک دن حمید چارپائی پہ بیٹھا رابعہ اور ستو کو طوطے مینا کی کہانی سنا رہا تھا کہ اک دم سے دروازے کی کھڑکھڑ ہوئی اور آگے آگے جمن خان اور پیچھے پیچھے تھو برآمد ہوئے۔۔۔ ابھی حمید اس بے وقت کی آمد کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ جمن خان نے بھد سے

چارپائی پر گرتے ہوئے کہا۔۔۔

''تو پھر میں گائے کھول لے جاؤں''؟۔۔۔

حمید اچھلا۔۔۔ پھر سنبھلا۔۔۔ رک کر رسان سے بولا۔۔۔

''وہ کیوں جی''؟۔۔۔

اب کے جمن خان نے نھو کو ذرا حیرت سے دیکھا۔۔۔

''اوے۔۔۔ تیری ماں آ کے بول گئی ہے کہ گیا لے جا [illegible]۔۔۔ یہ سودا تو تیری ماں کا پٹایا ہوا ہے''۔

حمید چارپائی سے اترا اور نیچی مگر غصہ بھری آواز سے بولا۔۔۔

''کہاں ہے ماں؟۔۔۔ اسے میرے سامنے تو بلاؤ''۔۔۔

نھو ڈر کر پیچھے ہٹا۔۔۔ ''واہ بے وے۔۔۔ ماں کی جتی کرے [illegible]۔۔۔ اندان تو یہی کہتے ہیں تیرے''۔۔۔

جمن خان نے اسے سر سے پیر تک ذرا تضحیک بھری نگاہوں سے دیکھا اور طنز بھری ہنسی سے بولا۔۔۔

''ایسی باتیں تو پیسے والوں کو بھی دکھتی ہیں۔۔۔ تو کیا کھا کے اکڑ دکھاتا ہے بے۔۔۔''

جمن خان چھ فٹا تھا، جسم کا ایسا بھاری جو جنگل کا شیر ببر۔۔۔ لڑنے پر اتر آتا تو ابھی کے ابھی میں حمید کی بجائے، حمید کا سرمہ آنگن میں بکھرا نظر آتا۔۔۔ حمید طرح دے کر بولا۔۔۔ ''پانی کون رکھتا ہے ساہو جی۔۔۔ تمہیں تو اپنی رقم ہی چاہیے نا۔۔۔ ماں دوانی ہے گائے کی بات فضول بیچ میں لے آئی۔۔۔ میں تمہاری رقم دے دوں گا''۔۔۔

جانے جمن خان کے دل میں کیا لگی تھی، اپنی فٹ فٹ بھر کی جوتیاں گھسیٹتا ہوا یونہی چلا گیا۔۔۔ پیچھے سے نھو مڑ کر بولا۔۔۔

''بھادوں کے مہینے میں رقم مل جائے۔۔۔ ورنہ بھادوں ہی کی طرح رونا پڑے گا جی۔۔۔ ہاں۔۔۔''

بھادوں میں تو صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔۔۔ حمید اس رقم کا کیا بندوبست کرے؟ اسے کچھ نہ سوجھتا تھا۔۔۔ ماں سے جھگڑا پڑا۔۔۔ بیوی کو دھانس لیا۔ بچوں کو دھنادھن کوٹ کر رکھ دیا۔۔۔ مگر ان ساری باتوں سے رقم کا کیا بندوبست ہو سکتا تھا۔۔۔ صرف ماں کے بس میں تھا۔۔۔ وہ چاہتی تو آج یہ سودا پھیر سکتی تھی مگر وہ کہتے کیوں گئی تھی۔۔۔ سارا فساد تو اسی کا

اٹھایا ہوا تھا۔۔۔حمید کو خیال ہوتا شاید ماں خود ہی ایک دن دھیرے سے کہہ دے۔۔۔

"ارے بیٹا مجھے زیور کی کیا پڑی ہے۔۔۔ رہنے دے، ڈوبا تو میری قسمت، ملا تو میری قسمت، میری زندگی تو کسی گزری ہوئی اپنے کارن تمہیں کیوں دکھ دوں"؟

مگر ماں تو جیسے جیسے بھادوں قریب آ رہا تھا کھلتی جا رہی تھی۔۔۔ حمید ایک دن جیسے پھٹ پڑا۔۔۔

"بڑھاپے میں کس کو سنگار دکھاؤ گی [illegible] ایسا شوقین تو کسی کو نہ دیکھا"۔۔۔

بڑھیا نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھالیا۔۔۔ "ہاں ہاں! قبر میں ساتھ لے جاؤں گی۔۔۔ تیرا [illegible] ڈرتا ہے۔ حرامزادہ، [illegible] کا جنا مجھے ٹوکتا ہے۔۔۔ ہاں ہاں سنگار کروں گی۔۔۔ کروں گی۔۔۔ کروں گی۔۔۔ ضرور کروں گی۔۔۔ تجھ سے تو لینے نہیں جاتی نا"؟۔۔۔

حمید بگڑ کر بولا۔

"اُس دن لالی کا خون پیا۔۔۔ ذرا تو دیا دکھاتی۔۔۔ تیرے کلیجے میں تو ڈائن بیٹھی ہے ڈائن"۔۔۔

بڑھیا بچوں کی طرح منہ اچکا کر بولی۔۔۔ "ہوں ڈائن۔۔۔ پھر۔۔۔؟ تیرا کیا بگاڑتی ہوں"؟۔۔۔

یوں تو مصیبت کے دن کاٹے نہیں کٹتے مگر یہ سات ہفتے تو پر لگا کر اڑ گئے۔ بھادوں کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا۔۔۔ اس دن حمید صبح ہی صبح اٹھا۔۔۔ گاؤں میں اتنوں کے آگے ہاتھ پھیلایا، کہیں کچھ نہ ملا۔۔۔ آتے آتے جمن خاں کا گھر راستے میں پڑا۔۔۔ تھان پر کتنے جانور بندھے تھے۔۔۔ حمید کا دل کٹنے لگا۔۔۔ اب لالی بھی یہاں بندھے گی۔۔۔؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں اس کمینے کے ہاں کبھی لالی کے پاؤں کی چھاپ بھی نہ پڑنے دوں گا۔۔۔ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ قصائی کے ہاتھ لالی کو بیچ دوں اور رقم اس کے منہ پر دے ماروں۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔۔۔ بس اب یہی ہو گا۔۔۔ گھر میں سب سے یہی کہہ دوں گا۔۔۔

گھر میں داخل ہوا تو بچے پتھر سے پتھر ملا کر چکر بلا کھیل رہے تھے۔۔۔ لالی کھونٹے سے بندھی تھی۔۔۔ دکھ کے ساتھ حمید اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور مری مری آواز سے بولا۔۔۔

"سکو۔۔۔ میں لالی کو جمن کے تھان پر نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ میں نے اسے قصائی کے ہاتھ بیچنا طے کیا ہے"۔۔۔

"ہائے اللہ۔۔۔" سکو سینے پہ ہاتھ مار کر بولی۔۔ "قصائی کو بیچ دو گے؟ تم نے تو اسے رابعہ کی جگہ دی تھی۔ بھلا کوئی اپنی بیٹی قصائی کو بیچے گا"؟

حمید یونہی سر جھکائے کھڑا رہ گیا۔۔۔ اس کے منہ سے آواز نکل ہی نہ سکی۔ ایک دم ایک پتھر چکر کھاتا ہوا آیا اور لالی کے پیر پر گر پڑا۔۔۔ لالی بچک گئی اور پرے ہٹ گئی۔۔۔ حمید گلا پھاڑ کر چیخا۔۔۔۔

"حرام زادے۔۔۔ گر لالی کے زخم لگ آیا تو قصائی کہاں خریدے گا اسے"

سکینہ کے کلیجے میں اب تک کھٹک ہو رہی تھی۔۔۔ پھر بولی۔۔۔

"کہاں تو تینوں کا کاجل بنائے رکھتے تھے، یہ سب قصائی کے نمبر۔۔۔ کے دینے پر تلے ہیں۔۔۔ میں کہتی ہوں تمہارے دل ہے یا نہیں"؟۔۔۔

اک دم پھر سے ایک پتھر تیرتا ہوا آیا اور لالی کی دم پر بس گیا۔ حمید نے کھا جانے والی نظروں سے بیٹے کو دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ سکو دھیرے سے بولی۔

"ہائے میں تو دعا کر رہی ہوں کہ اس کے کوئی گھاؤ ہی نہ ہو۔۔۔ تاکہ قصائی خریدے ہی نا"۔۔۔۔

"اگر گھائل گیا کو قصائی نہ خریدے گا تو میں آپ اسے مار دوں گا۔ میں نہیں برداشت کر سکوں گا کہ جو لالی اتنے دنوں سے میرے کھونٹے سے بندھی تھی، اب کسی اور کے تھان پر کھڑی نظر آئے"۔۔۔ حمید تیزی سے بولا۔۔۔ اس کا منہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں

"اور اگر ایسا ہو ہی گیا تو پھر ماں کے زیور کا کیا بنے گا"؟ سکو نے کن انکھیوں سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔

حمید گرجا۔۔۔ "تو نے جن کے ساتھ ایک رات سو جانا"۔۔۔۔

ہا۔۔۔ سکو کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔۔۔ اس کی آنکھیں جیسے پھٹی ہی رہ گئیں۔۔۔

صبح قصائی آنیوالا تھا۔۔۔ رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔۔۔ اس دن کے بعد سے حمید کچھ بولا ہی نہ تھا۔۔۔ اس چپکی نے اس کا من مار کے رکھ دیا تھا۔۔۔ وہ بے سُدھ پڑا تھا۔۔۔ کونے میں سکو اپنے بچوں کو لیے سوئی تھی۔ آنگن میں کھونٹے سے بندھی لالی بھی ٹانگوں میں گردن دیے خاموش تھی۔۔۔ بس ایک ماں تھی کہ جس کی آنکھ میں نیند نہ تھی۔۔۔ کوٹھڑی میں ایک تو یونہی حبس ہو رہا تھا، دوسرے نیند بھی لاپتہ تھی۔ ماں نے دھیرے سے اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ مارے اور کونے میں سے کلہاڑی کھینچ لی۔۔۔ کلہاڑی اٹھا کر وہ بلی کے سے قدموں سے دھیرے دھیرے آنگن تک آئی۔ لالی نے مانوس چاپ سن کر گردن اونچی کی، اس کی گردن کے گھنگھرو بج اٹھے۔۔۔ ماں نے آرام سے اس کے گلے سے گھنگھرو کی پٹی اتار کر زمین پر رکھ

دی اور اس کی رسی کھول کر دھیرے دھیرے آنگن سے باہر لے چلی۔۔۔

باہر نکل کر بڑھیا نے اطمینان کی سانس لی اور پھر گائے کی رسی کھینچ کر اسے بھگانا شروع کیا۔۔۔ گھر سے بہت دور پہنچ کر اس نے گائے کو روک لیا۔۔۔ جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اب گھر کافی دور ہو چکا ہے اور گائے کی آواز گھر تک نہ پہنچ سکے گی تو اس نے چاند کے ملگجے اجالے میں کلہاڑی اٹھائی اور کھچ سے گائے کی ٹانگ پر دے ماری

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔" گائے تکلیف سے چیخی۔۔۔

ماں کا دل ایک لمحے کو اپنی جگہ سے ٹلا۔۔۔ دوسرے لمحے اس نے جھک کر دیکھا۔۔۔ لالی کی ٹانگ میں اتنا بڑا گھاؤ پڑ گیا تھا۔۔۔

پھر اس نے دھیرے سے گائے کی رسی تھامی اور واپس چلی۔۔۔ جوہڑ کے کنارے رک کر کلہاڑی دھوئی اور گائے کو کھینچتی گھر پہنچ گئی۔

آنگن میں پہنچ کر اس نے گھنگھرو کی پٹی اٹھا کر پھر سے لالی کے گلے میں باندھ دی اور کلہاڑی کونے میں رکھ کر خود اپنے بستر میں اطمینان کے ساتھ جا سوئی۔

باوفا/بے وفا

وحید رضا بھٹی

نواز کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی، منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا، شدت جذبات سے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں جلتی ہوئی لکڑی پکڑے وہ بڑبڑ بک رہا تھا اور دو [illegible] کی جانب چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی ''میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا [illegible] بوٹی بوٹی کر کے چیلوں کو ڈال دوں گا۔ بے شرم، بے حیا، بے غیرت، چھنال، [illegible]'' اور اس کو سنبھالنے والے اسے کہہ رہے تھے، ''ہوش کرو نواز، ہوش کرو، کیوں جگ ہنسائی کا سامان بن رہے ہو؟''

ابھی کچھ ہی دیر پہلے سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ آج نواز اور اصغری کے سب سے چھوٹے اور آخری بیٹے کا ولیمہ تھا۔ بیاہ بخیریت انجام پا گیا تھا، اس سے پہلے وہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے بیاہ رچا چکے تھے۔ یہ آخری لڑکا، حامد بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے گیا ہوا تھا اور پچھلے مہینے ہی وطن لوٹا تھا۔ چنانچہ آج اس کے والدین اس آخری فرض یعنی حامد کی شادی خانہ آبادی سے بھی سبکدوش ہو گئے تھے۔ اور اپنے آپ کو یوں ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے سروں پر سے بھاری گٹھڑیاں اتار دی گئی ہوں۔ لیکن نواز کے تئیں مکمل فراغت تب ہی میسر ہوتی تھی جب وہ اور اصغری فریضہ حج سے بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ انہی سوچوں میں گم وہ صحن میں آن کر بیٹھ گیا۔ بہت سے مہمان اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے تھے بقیہ کوچ کی تیاریوں میں تھے۔ اندر کمروں میں ان کے ٹرنکوں کے گھسیٹے جانے، کھلنے اور بند ہونے کی تیز کرخت آوازیں صحن میں گونج رہی تھیں۔ نواز نے شامیانہ کھلوانے کے لیے کہہ دیا تھا اور کرایہ پر آئی ہوئی کراکری اور دیگر سامان وغیرہ اٹھوانے کے لیے آدمی بھی دوڑا دیا تھا تاکہ خواہ مخواہ اس شام کا کرایہ بھی ادا نہ کرنا پڑ جائے۔ صحن میں اب اکا دکا بے فکرے لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مقامی تھے یا ہمسائیگی میں رہتے تھے اور جنہیں گھر جانے کی چنداں جلدی نہ تھی۔ پھر بھی ان میں سے بھی چند ایک حضرات کو ان کی بیویوں نے، ماؤں نے یا دوسرے اہل خانہ نے دو چار بار اوپر تلے بلاوا بھیج کر بھری محفل سے اٹھا کر گھر کی راہ دکھا دی تھی۔

نواز نے ایک اچٹتی نگاہ صحن پر ڈالی تو دور ایک نکڑ میں اصغری کو ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ

کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا۔ اس شخص کو اس نے پہلے کبھی اپنے کسی بھی لڑکے یا لڑکی کی تقریب پر نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کون ہے؟ خیر اسے کیا؟ وہ اٹھ کر دیگوں کی طرف چلا گیا اور حساب لگانے لگا کہ کتنی دیگوں کا سامان بچ رہا تھا۔ دو دیگیں پلاؤ کی ایک زردے کی' اور آدھی شوربے کی بچ رہی تھی۔ ان کے علاوہ دو دیگوں کا خشک سامان الگ بچ رہا تھا جسے حفظ ماتقدم کے طور پر الگ رکھا ہوا تھا' لیکن جسے پکانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ شادی کی تقریب میں متوقع آمد میں کمی کی وجہ مہنگائی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچ پانے کے لیے بھاڑے کے علاوہ دولہا دلہن کو سلامی کی رقم یا کچھ نہ کچھ تحفے کی صورت میں دینے کے لیے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر سہرا بندی اور رونمائی جیسی رسموں پر بھی کچھ نہ کچھ گرہ سے نکالنا ہی پڑتا ہے۔ آج کل لوگوں کی روزمرہ ضروریات ہی بمشکل ہو رہی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر پنڈ چھڑا لیتے ہیں۔ کسی کے مقدمے کی تاریخ ٹھیک اسی روز آن پڑتی ہے' کسی کے لڑکے یا لڑکی کا امتحان سر پر آن پہنچتا ہے بلکہ انہی دنوں میں جاری ہوتا ہے یا پھر کسی نے باپ کو ہسپتال میں داخل کرایا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام صورتوں میں ان کا اپنے شہر میں ٹھہرے رہنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ نواز کو اگر پہلے سے یہ بھنک پڑ جاتی تو وہ حور دونوش کے اتنے سامان کا تردد ہی نہ کرتا۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ محلے کے وہ گھر جنہیں شادی پر مدعو کرنا یاد نہ رہا تھا یا مدعو کرنا مناسب نہ سمجھا گیا تھا۔ ان کے ہاں ایک ایک تھال چاولوں کا بھیج دینا مناسب رہے گا۔ اس طرح رزق کی بے حرمتی بھی نہیں ہوگی' اور رعب الگ بیٹھ جائے گا۔ اسی سوچ میں گم نواز دیگوں سے ہٹ کر واپس کرسی پر آ بیٹھا تو خواہ مخواہ اس کی نظر پھر اصغری کی جانب اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ اصغری پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کھرچ رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ گلنار ہو رہا تھا۔ برسوں پہلے جب نواز اصغری کو بیاہ کر اس گھر میں لایا تھا تو اس وقت وہ ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی تھی اور بات بات پر شرمایا کرتی تھی اور شریر نواز اسے تنگ کرنے کے لیے ابا اماں کی موجودگی میں ان کی نظریں اور کان بچا کر اصغری سے بے وقت کسی ایسی ویسی بات کا مطالبہ کر بیٹھتا وہ ''اوئی اللہ! شرم نہیں آتی'' کہہ کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اور گول گول آنکھیں نکال کر ایک بار تو نواز کی جان ہی نکال لیتی۔ لیکن اپنے اس عمل پر فوراً ہی شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتی اور پھر دیر تک دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کھرچتی رہتی۔ نواز کو وہ سماں یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے تو اس کی آنکھیں نشے سے بھاری ہو کر مندھ سی گئیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اچانک اس کو کرنٹ سا لگا۔ یہ ابھی ابھی اصغری پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کیوں کھرچ رہی تھی؟ یہ سفید کنپٹیوں والا شخص کون ہے؟ نواز سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آہستگی کے ساتھ کرسی پر سے اٹھا اور بظاہر ٹہلتا ہوا اس نکڑ کی جانب آہستہ آہستہ اس طرح چلنے لگا گویا بلا مقصد مٹر گشت کر رہا ہو۔ جوں جوں وہ نکڑ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کی ساری حسیں کانوں میں سمٹ آئی تھیں۔ خراماں خراماں ٹہلتا وہ عین دونوں کے سر پر پہنچ گیا' لیکن وہ

سر جھکائے باتوں میں اس قدر گم تھے کہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ مدھ بھری آواز میں' جس سے اس سے پہلے نواز کے کان قطعاً ناآشنا تھے' اصغری کہہ رہی تھی۔ ''وہ تو ابھی تک میں نے سینے سے لگا رکھی ہوئی ہے۔ اس کو دیکھ دیکھ کر' اسی کے سہارے تو پہاڑ جیسی زندگی کاٹ پائی ہوں''

نواز کو چکر آ گیا۔ اس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی۔ تو یہ دھوکا' اتنی بڑی چال۔ تیس جگ بیت گئے' کئی نشیب و فراز آئے' کٹھن گھڑیاں آئیں اور کسی نہ کسی طور کٹ گئیں۔ بچے ہوئے' ان کو پالا پوسا جوان کیا' حتیٰ کہ بیاہ ڈالا' لیکن اس ماں کی جائی دم گھُنّی نے ایک بار بھی تو اپنے من کا بھید نہ دیا۔ مجھے صرف ایک بار سرسری بتا دیتی' ہلکا سا اشارہ ہی کر دیتی۔ خدا کی قسم اگر کبھی جتا جاتا تو اپنے باپ کی اولاد نہ ہوتا۔ آخر انسان خطا کا پتلا ہی تو ہے۔ لیکن اس مکار عورت نے مجھ پر اعتبار ہی نہ کیا۔ تیس برس اعتبار نہ کیا' مجھے دھوکا ہی دیتی رہی' اداکاری کرتی رہی۔ تمام عمر اداکاری ہی میں بتا دی۔ کبھی بس نہیں کی۔ سانپ کی اولاد۔ حرام زادی؟ نواز کی آواز یک لخت اونچی ہوتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا' منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا دیگوں کی جانب گیا اور جلتی ہوئی لکڑی سمیت وہ اصغری کی طرف لپکا لیکن اونچی آواز میں ہذیان بکنے اور بھاگ دوڑ سے مہمان چوکنے ہو چکے تھے انہوں نے نواز کو راستے ہی میں جا لیا۔ اصغری حیران پریشان کھڑی نواز کا منہ تک رہی تھی' جو سے عمر بھر میں پہلی بار ننگی گالیاں دے رہا تھا۔ ان کے تین بیٹے' دو بیٹیاں' تین بہویں' اور دونوں داماد بچے کھچے مہمانوں کے ہمراہ کھڑے معاملے کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ کا فائدہ اٹھا کر وہ سفید کنپٹیوں والا شخص نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔

انتظار

وقار بن الٰہی

اچانک میری آنکھ کھل گئی اور کروٹ بدل کے میں نے دیکھا تو کالے خاں اپنے بستر میں نہیں تھا۔ وہ موٹی سلاخوں والے دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے جھنجھوڑ رہا تھا۔ جیسے اگر وہ دروازہ ٹوٹ جائے تو کالے خاں بیرک سے نکل کے بیرونی دیوار پھاند کے بھاگ جائے گا۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا اور آنکھیں میری بھیگی ہوئی تھیں۔ مجھے وہ رات یاد آگئی کہ جب میں اپنی باقی ماندہ زندگی اس بیرک کی بھینٹ چڑھا دینے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس رات مجھے بھی نیند نہیں آئی تھی اور میں نے آدھی رات کے بعد اسی طرح دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ اس بھری بیرک میں آخر کتنے ہیں، جو یوں دروازے اکھیڑ سے کے بھاگ سکے ہوں گے۔ ذرا دور بیرک کے وسط میں جلتے بلب کو دیکھ کے میں نے سوچا، مصیبت میں گھر کے، غم کا شکار ہو کے آخر انسان ایک سا کیوں ہو جاتا ہے۔!

پچھلی شام ہی جب میں فیکٹری سے کام کے بعد لوٹ کے آیا تھا تو میرا ''پڑوس'' آباد ہو چکا تھا۔ بیرک میں قیدیوں کے سونے کے لیے اوپر نیچے تھوڑے فاصلے پر سیمنٹ کے تین تین فرش بنے ہوئے تھے۔ انہی کو ہم اپنا گھر اور اپنے بستر کہتے تھے۔ لیکن جانے میری بدقسمتی تھی یا نصیب کا چکر کہ پورے چار برس میرے ساتھ کے دونوں فرش کسی کو بھی الاٹ نہ ہوئے اور کسی ساتھی، کسی ہمسائے کا انتظار کرتے کرتے میری تو جیسے پلکیں بھی سفید ہو چلی تھیں۔ لیکن پچھلی شام سورج کے غروب ہونے ہی اور تھی ــ وقت سے پہلے جب میں یہاں آیا تو دو نمبر گھر کالے خاں کو الاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے مارے خوشی کے روٹی بھی نہیں کھائی۔ اپنے دوست کو دیکھ کے تو میری بھوک ہی مٹ گئی تھی۔ کالے خاں کو دیکھ کے مجھے یہ بات تو یاد ہی نہیں رہی تھی کہ وہ نیا قیدی ہے اور اسے اس بیرک میں آئے ابھی چند گھنٹے ہی گذرے ہیں۔

اسے جب میں نے پہلے پہلی دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی جیل کا داروغہ بھیس بدل کے ہماری

حرکات ترک کرنے یہاں چلا آیا ہو۔ کسی طرح وہ پھیلا ہوا اور طاقت ور بھی کسی طرح ہوئے بھی
تھے۔ کالے خاں نے کھدر کے میلے کپڑے اور میلی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اور قمیص کی بغل مارے ہوئے تھا۔ وہ
کسی قدر ڈھیلی ہو گئی تھی اور اس کے اندر سے کالے خاں کی چوڑی چکلی چھاتی جیسے پھٹ رہا پہاڑ جھانک رہی
تھی۔ بازوؤں پر قمیص کی گرفت سخت ہونے کی وجہ سے اس کے پٹھے اور مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کا
چہرہ گو اس وقت زرد پڑ گیا تھا لیکن پھر بھی اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ چند ہی دن پہلے
وہ ٹہنی پر جھومتے ہوئے تازہ انار کو بھی شرما دیتا ہوگا میں نے اس دیکھا تھا وہ قمیص
سے باہر تھے۔ کالے خاں نے اپنا چہرہ بڑی دیر سے ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا مضبوط لمبے اور
کسی قدر کھردرے تھے۔ میں نے سوچا تھا۔ ان ہاتھوں میں زنجیریں شاید ہی سما
سکے۔ اس وقت بیرک سے باہر ساری روشنیاں جل چکی تھیں۔ سورج ڈوب چکا تھا اندھیرا جیل کے
ارد گرد پھیل گئی تھی۔ بیرک کے اندر چند لمحے تو سارے بلب جلتے رہے لیکن ساتھ ہی
وہ سب کے سب سوائے ایک کے بجھ گئے۔ یہ روشنیاں اس وقت گل ہوتی تھیں جب وارڈن صاحب گنتی
اور "سب اچھے" کے بعد لوٹ جاتے تھے ان کے جاتے ہی قیدی اپنے اپنے گھروں سے نکل آتے
اور بیرک کے وسط میں جمع ہو کے اتنا اودھم مچاتے جیسے وہ کسی ڈانس فلور پر ہوں۔ پہرے دار
بند دروازوں کے پیچھے سے لاکھ چیخے چلائے، وہ چپ نہیں ہوتے تھے۔ اگلی صبح انہیں اچھی خاصی سزا ملتی تھی
لیکن کیا مجال جو وہ باز آ جائیں۔ اس وقت بھی جب وہ سب اکٹھے ہو گئے۔ تو میں نے صرف یہ سوچ کے کہ
اور نہ سہی، کم از کم کالے خاں کا غم تو ہلکا کر دوں گا، اس کی ہمت ہی بڑھا سکوں گا۔ ذرا اونچی آواز میں
اس سے پوچھا۔ "کیوں دوست، تمہیں کتنے برس کی قید ہوئی۔" کالے خاں نے وہ تین لمحے جواب نہ دیا
قمیص کے اندر اس کے ہاتھ ہلتے رہے جیسے وہ اپنی آنکھیں خشک کر رہا ہو۔ پھر سر اٹھا کے اس نے کہا
اکیس برس۔" میں گنگ رہ گیا۔ بولنا چاہا بھی تو ہمت جواب دے گئی۔ اگر دو چار برس کی سزا ہوئی تو
پھر ہمت بندھانا اچھا بھی لگتا۔ لیکن یہ اکیس برس ہمت بندھانے یا تسلی دینے سے تھوڑی ہی کٹنے والے تھے۔
البتہ اسی بہانے میں نے اس کا چہرہ ضرور دیکھ لیا تھا جس پر بڑی مقدس معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ مونچھیں
ذرا بڑھی تھیں، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں بے بسی اور بے چارگی کی تو جیسے ایک لگی لاش
کی جھلک سی تھی۔ سزا کا غم ہر کسی کو ہوتا ہے لیکن کالے خاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس بیرک میں چند دن
گزار کے مر جاتا ہو۔ پھر میں نے سوچا، اس سے دوسری بات نہیں کرنی چاہیے۔ اس بیرک میں آنے سے پہلے
اسے یقیناً چند دنوں تک احاطہ نمبر چار میں رکھا گیا ہوگا۔ یہ وہ احاطہ تھا جہاں خطرناک اور سنگین جرائم کے
ارتکاب کرنے والے قیدیوں کو صرف اس لیے تاریک کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا تھا کہ وہ جیسے تیسے جیل کے
ماحول سے مانوس ہو جائیں اور اگر ان کے ذہن میں بھاگ جانے کا کوئی خیال ہے بھی تو اسے اپنے ہاتھوں

ختم کر دیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کالے خاں نمبر تین احاطے میں آ کے اتنا زیادہ دکھی دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اس سے اور کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اٹھ کے اسے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔ پہلے دو کمبل تختے پر بچھائے اور باقی کے دو اوپر نیچے پھیلا کے رکھ دیے "سو جاؤ دوست، تمہیں نیند آ رہی ہوگی" مجھے اس بات کا علم تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی اس لیے کہ جب میں بھی یہاں آیا تھا تو کئی بھی رات تک نہیں سو سکا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کے کہ نیند تو اتنی بری بلا ہے جو پھانسی کے تختے پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس سے یہ ہی کہا۔ ابھی ابھی نیند آ جائے گی۔ مگر کالے خاں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ بس جوتا اتار کے اپنی قمیص کی بغل کھولے بغیر لیٹ گئے اس نے کمبل اوپر کھینچ لیے۔

جب تک میں اونگھ رہا تھا تو اس وقت میں نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی تھی۔ پھر جب آدھی رات کے بعد میری آنکھ کھلی اور میں نے اسے سامنے جھنجھوڑتے دیکھا تو سوتے سے کہا "وہیں آ جاؤ کالے خاں" اس ساتھ والی اور اس بیرک نے جھنجھوڑ کراو میرے دوست!" کالے خاں نے فوراً پیٹ کے میری طرف دیکھا اور پھر تیزی سے کمبل اوڑھ لیے۔ اور مجھے پھر اس کی سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

پہرے دار بیرک کے سارے دروازے اس وقت کھولتا تھا جب سورج بہت اوپر آ جاتا تھا۔ بعد سورج کے طلوع کے ساتھ ہی وہ مشرقی حصے کے پہلے دو دروازے کھول دیتا تھا۔ اور جب دار وغہ صاحب صبح کے "سب اچھے" کے بعد لوٹ جاتے تو قیدی ایک ایک کر کے بیرک سے باہر سامنے نل پر منہ ہاتھ دھونے چلے جاتے تھے۔ جب میں جاگا تو میرے سر کے اوپر اور چھت کے قریب روشن دان میں سے چھنتی ہوئی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں، مگر کالے خاں سو رہا تھا۔ میں نے اپنے کمبل تہہ کر کے ایک طرف رکھے۔ اپنے قمیص کی بغل ماری اور پھر کوپ اٹھا کے باہر کی طرف ہو لیا۔ نل کا پانی تازہ اور نیم گرم تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے میں نے قمیص سے انہیں خشک کیا اور جلتی آنکھوں کو ملتا ہوا کوپ میں چائے لے کے لوٹ آیا۔ کالے خاں اس وقت بھی سو رہا تھا۔ پھر جب میں نے دو چار گرم گرم چائے کی چسکیاں لیں تو وہ ایک دم چونک کے اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پلکیں اور اس کے اردگرد کا گوشت سرخ بھی تھا اور سوجا ہوا بھی۔ سوتے میں گندہ لعاب اس کے منہ سے بہہ کے گال کے ساتھ لگ کے سوکھ گیا تھا۔ میں چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور کالے خاں چپ چاپ اور تھکا تھکا سا دیکھتا رہا۔ یوں جیسے وہ رات سویا تو کسی اور جگہ ہو، مگر اس کی آنکھ کھلی کسی اور جگہ ہو۔

میرے بتانے پر وہ منہ ہاتھ دھو آیا تھا اور آتے ہوئے چائے بھی لیتا آیا تھا۔ جس کی بھاپ سے وہ اپنی آنکھیں سینک رہا تھا اور کبھی کبھی گھونٹ بھی بھر لیتا تھا۔ پھر جب فیکٹری کا بھونپو زور سے بج اٹھا تو میں نے اٹھ کے قمیص کی بغل اور بھی سختی سے ماری اور کالے خاں سے کہا۔ "کام کا وقت ہو گیا ہے کالے

خاں۔ میں تو فیکٹری جا رہا ہوں'' کالے خان نے پہلی مرتبہ ٹوپ لبوں سے ہٹایا اور بڑی قدر حیرت سے بولا ''فیکٹری ... یہاں کاہے کی فیکٹری ہے؟'' ''جیل میں چھوٹی سی فیکٹری ہے جہاں معمولی فرنیچر بنتا ہے۔ اور اسے قیدی بناتے ہیں۔'' اس کے لیے یہ بات جیسے خلاف توقع تھی۔ ٹوپ رکھ کے اور بھی حیران ہوتے ہوئے اس نے پوچھا ''تو یہ قیدی چکی نہیں پیستے'' ... سوگا کہ جیل میں تو چکی ہی پسوائی جاتی ہے'' ''نہیں۔ چکی تو وہ قیدی پیستے ہیں جو جیل میں بھی شرارتوں سے باز نہ آئیں۔ باقی یا تو ادھر ادھر کے کام کرتے ہیں اور یا پھر فیکٹری میں جاتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام آتا ہے کیا؟'' کالے خاں جیسے سوچ میں پڑ گیا۔ ٹوپ ... کہنے لگا ''اور تو کچھ بھی نہیں کر سکتا' البتہ کرسی بن لیتا ہوں'' ... تمہاری ... اچھا تو اب ہمارا ساتھ فیکٹری میں بھی رہے گا۔ جانے کیا بات تھی' کالے خاں ... پہلی معصومیت اور بھول پن نے مجھے بری طرح متاثر کیا تھا اور میں بار بار یہی سوچتا کہ یہ ... صورت ... اتنا بڑا جرم بھی کر سکتا ہے......؟'' تم یوں کرو' تھوڑی دیر میں چکر کا جمعدار آئے گا ... داروغے کے پاس چلے جانا۔ تمہاری ڈیوٹی فیکٹری میں لگا دی جائے گی'' کالے خاں نے جواب ... میں نے انتظار بھی نہ کیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آیا اس لیے کہ دیر ہو رہی تھی۔ البتہ راستے میں اتنا سوچ ضرور تھا کہ ......شاید وہ ساری رات روتا رہا

دوپہر تک میں دو کرسیوں پر ہی پالش کر سکا حالانکہ اتنی دیر میں تو میں چار پانچ کرسیوں کو تیار کر دیتا تھا۔ لیکن اس روز تو کام نہیں کر رہا تھا بلکہ مجھے تو کالے خاں کا انتظار تھا۔ دوپہر کا کھانا ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا کہ جب کالے خاں چکر کے جمعدار کے ساتھ جیلر صاحب کے پاس رپورٹ کرنے کے بعد فیکٹری کے بڑے شیڈ میں داخل ہوا۔ میرا سینہ مارے خوشی کے پھول گیا۔ اپنا دکھ درد کہنے' کسی کو سنانے کی آرزو تو انسان کو ہمیشہ ہی بے چین رکھتی ہے۔ کالے خاں نے کرسی کا ایک ڈھانچہ اٹھایا اور میرے پاس آن بیٹھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ کرسی بنتا جا رہا تھا اور میں تیار کرسیوں پر پالش کرتا جا تا تھا۔ برش روک کے میں کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ جی چاہتا تھا' اس سے بات کروں' لیکن پھر جانے کون سی شے میرا گلا دبا دیتی تھی۔

وہ ابھی چوتھائی حصہ ہی بن سکا تھا کہ نمبردار قیدیوں کا کھانا لئے وہاں چلے آئے۔ کالے خاں اپنی تھالی نہیں لایا تھا۔ میں نے ایک ہی تھالی میں اس کا کھانا بھی لے لیا اور روٹیاں جھولی میں بھر کے لوٹ آیا۔ کالے خاں نے کرسی ایک طرف رکھ دی لیکن جب میں نے تھالی اس کے سامنے رکھی تو وہ یوں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے میں اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ پھر اس نے ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہاں کیا ایسی ہی ترکاری کھانے کو ملتی ہے؟'' شاید اس کا یہ پہلا ہی سابقہ تھا۔

''ہاں جیل جو ہوئی۔ اپنا گھر تو نہیں' جہاں یہاں تو ایسی ہی دال ملے گی کہ جو پیٹ میں اتر جائے اور پانی ناک سے باہر نکل آئے۔'' اس نے دوسری بات نہیں پوچھی۔ چپاتی اٹھائی اور بڑے بڑے نوالے منہ میں ٹھونسنے لگا۔

''لیکن اسے بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن مصیبت ہے تو یہ کہ ان دنوں میرے پاس گھی ختم ہو گیا ہے اور پیسے بھی نہیں رہے۔ مدتوں سے گھر سے کوئی بھی ملنے نہیں آیا۔ ورنہ پانی گرا کے گھی ڈال کے کام چل جاتا تھا۔'' میں نے نوالہ اٹھایا تو کالے خاں نے ہاتھ روک لیے۔ ادھر اُدھر دیکھ کے اس نے پیٹ کو ٹٹولا اور دوبارہ نیفے میں نظریں دوڑا کے اس نے چند روپے میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ یہ پانچ پانچ کے چار نوٹ تھے۔ اس وقت دیکھ کے میری آنکھیں جھک گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جیل تھی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک قیدی ہی قیدی بھرے پڑے تھے لیکن جانے کیوں وہ دنیا کی خود غرضی اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ وہ یہاں بھی اپنے ہی نفس کو پوجتے تھے۔ یہاں بھی وہ اپنے ہی دوزخ کو بھرنے کے لیے بھاگتے رہتے تھے۔ اس وقت تو ہم نے وہی دال کھائی لیکن شام کا انتظام ہو گیا تھا۔

اس دن قریب قریب بیٹھنے کے باوجود کالے خاں نے مجھ سے کوئی دوسری بات نہ کی۔ اس دن ہی کیا' چار پانچ روز گذر گئے۔ وہ میرا ساتھی ضرور تھا لیکن کیا مجال جو منہ سے ایک لفظ تک نکالے۔ میرے اندر تو جیسے کھوج کی آگ بھڑک چکی تھی۔ میں چاہتا تھا' جتنی جلد ہو سکے' وہ اپنے متعلق بتا دے اور اسی لیے میں نے اسے اپنے بارے میں ایک ایک بات بتا دی تھی۔ لیکن کالے خاں کا جواب تو ہی ہوں یا ہاں تھا۔ وہ میرے ساتھ فیکٹری سے لوٹ کے آتا' میرے ساتھ کام پر جاتا۔ جب تک میں جاگتا رہتا' وہ بھی نہیں لیٹتا تھا' بیٹھا دروازوں کو ہی گھورتا رہتا۔ ہم دونوں اکٹھے جاگتے۔ منہ ہاتھ دھونے جاتے اور چائے کی چسکیاں بھرتے' ایک ساتھ فیکٹری سے نکل کے مسجد سے ہوتے ہوئے لنگر میں آتے اور باورچی کو کہہ کے بیرک میں جاتے۔ لیکن اس سارے وقت میں' اس سارے ساتھ میں کالے خاں اپنی طرف سے ایک فقرہ تک نہیں کہتا تھا۔ وہ تو جیسے سر سے پاؤں تک راز ہی راز تھا اور راز ہی رہنا چاہتا تھا۔ البتہ ایک بات تھی کہ ہم جب بھی کھانے بیٹھتے تو پہلے دو چار نوالے اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ جاتے تھے' اس کی آنکھوں میں پانی تیر جاتا تھا۔ وہ سر جھکا کے ہولے ہولے اپنی حالت پر قابو پا لیتا اور پھر آرام سے کھانے لگ جاتا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کے میرے ذہن میں کانٹا چبھتا کہ آخر وہ کون ہے کہ کالے خاں جب بھی کھانے بیٹھتا ہے تو اسے یاد کر کے اس کے ہاتھ ڈگمگا جاتے ہیں۔

جس دنوں وہ نہیں آیا تھا' ان دنوں فیکٹری تو تین بجے ہی بند ہو جایا کرتی تھی لیکن میں انھیں اٹھتے بھی ڈیڑھ دو گھنٹے وہیں گزار دیتا تھا۔ پانچ بجے گنتی ہوتی تھی۔ تین سے پانچ بجے تک یہ دو گھنٹے جیسے میرا خون چوس لیتے تھے۔ آخر میں تنہا کہاں بھٹکتا پھرتا۔ پھر بیرک میں تو سارے کے سارے قاتل' چور' جوئے

بار اور مکروہ شخصیتوں والے لوگ تھے کسے دوست بناتا؟ سے کہتا کہ وہ میرے ساتھ باتیں کرے اور گھومے چلے۔ لیکن جس دن سے کالے خاں آیا تھا اس دن سے "تھوبنو" تین بجے بجتا تھا ہم پہلے ہی سے فارغ ہو کے بیٹھ جاتے تھے۔ جونہی سورج کی روشنی سامنے اہپتال کی چار دیواری کی چھت پر سے غائب ہوتی۔ میں گری کو وہیں چھوڑ دیتا۔ کالے خاں سوراخوں میں چھینیاں [illegible] ہم دونوں اپنے اپنے کپڑے جھاڑتے، چپل پہنتے اور نکل [illegible] فیکٹری سے نکل کے ہم یا تو ساری جیل کے چکر لگاتے اور [illegible] چلے جاتے۔ ہسپتال میں ہم چھا تک آ کے تھے، اور [illegible] بابو کو سلام کرتا تو ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل تھا۔ [illegible] یہ دوسری بات تھی کہ ہم آپس میں بات چیت تک نہ کرتے تھے۔

کالے خاں نے جو بیس روپے دیئے تھے۔ [illegible] ختم ہو گئے کہ دس روپے کی تو چیزیں منگوائی گئی تھیں اور باقی دس روپے بیرک کا کوئی قیدی سرہانے کے نیچے سے اٹھا لے گیا تھا۔ اس نے کہیں جیب سے نکالتے دیکھ لیا تھا موقع ملتے ہی لے اڑا۔ اس شام جب ہم فیکٹری سے نکلے تو میں نے کالے خاں سے کہہ دیا تھا [illegible] "آج پھر لنگر کا ساگ ہی کھانا پڑے گا [illegible]" کالے خاں نے نہیں پوچھا کہ کیوں۔ اچھا کہہ کے چپ ہو گیا۔ اب تو اس کے پاس بھی پیسے نہ تھے۔ شاید پیسے نہ ہونے ہی کی وجہ تھی کہ ہم دونوں بڑے اداس اداس لگ رہے تھے اور اتنے بوجھل قدموں اور لٹکے ہوئے چہروں سے بیرک میں لوٹ آئے تھے جیسے ہم نے کندھوں پر کوئی جنازہ اٹھا رکھا ہو اور اب اسے دفنانے جا رہے ہوں۔

اپنے اپنے تھڑے پر بیٹھے ہم چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ چکر کا جمعدار بیرک میں داخل ہوا اور دروازے کے قریب ہی رک کے زور سے بولا۔ "کالے خاں ولد شہباز خاں قیدی اکیس سالہ کون ہے؟" کالے خاں کے ہاتھوں میں چائے کا کپ کانپ گیا۔ اس کی نگاہوں میں ہلکا ہلکا خوف پھیل گیا۔ کپ پکڑے وہ اٹھا تو جمعدار نے پھر کہا۔ "تمہاری ملاقات آئی ہے۔ کارڈ لاؤ" کالے خاں پل بھر کے لیے چپ کھڑا رہ گیا۔ اس کی ملاقات [illegible] ؟ پھر اس نے کپ رکھ کے سرہانے کے نیچے سے کارڈ نکالا اور ڈرے ڈرے سے قدم اٹھاتا ہوا جمعدار کے ساتھ بیرک سے باہر نکل گیا۔

گنتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔ تاکہ ملاقات کو گئے ہوئے قیدی بھی واپس اپنی بیرکوں میں پہنچ جائیں اور تقریباً اسی وقت کھانا بھی تقسیم ہوتا تھا۔ نمبردار بہت دیر سے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور کھانا بانٹ رہا تھا۔ میں، اپنا اور کالے خاں کا کھانا لے آیا تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ کھانا بانٹنے کے بعد نمبردار چلا گیا تھا اور پہرے دار نے سوائے ایک کے باقی سارے دروازے

بند کر دیے تھے۔ لیکن جانے کالے خاں ملاقات کے بعد کہاں چلا گیا تھا کہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے پانی میں تیرتی دال کو دیکھا تو سوچا' یہ کیوں کر حلق سے اتر سکے گی۔ آج نہ تو پیسے تھے اور نہ ہی گھی۔ پھر میں نے اپنے گھر والوں کو کوسنا شروع کیا کہ جو اتنے دن گذر جانے پر بھی پوچھنے نہ آئے تھے۔ میں اس ہی رو میں تھا کہ آخری کھلے دروازے میں سے کالے خاں اندر داخل ہوا۔ میں نے دور سے دیکھا' اس کی باچھیں سوج رہی تھیں اور ایک گہری اور تیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل رہی تھی۔

قریب آ کے وہ رکا تو آپ ہی آپ کھلکھلا کے ہنس دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر یہ ہنسی کیسی' میں نے تو کوئی بات کہی نہ تھی۔ ہنسی سمٹ کے مسکراہٹ بن گئی تو اپنے تھڑے پر بیٹھ کے اس نے قمیص اوپر اٹھایا۔ ایک بغل میں پوٹلی تھی اور دوسری میں پیکٹ۔ دونوں چیزیں سامنے رکھ کے اس نے پہلے صاف دسترخوان کی گانٹھیں کھولیں۔ کنارے ادھر ادھر گرے۔ گھی میں تلے ہوئے چار پانچ پراٹھے اوپر نیچے رکھے تھے اور ان کے اوپر پتے سے بنے' دونوں کی چھوٹی سی ڈھیری بنی ہوئی تھی۔ گھی کی سوندھی سوندھی خوشبو جب نتھنوں سے ٹکرائی تو پیٹ سے ڈھیر سارا پانی منہ میں پھیل گیا۔ کالے خاں پھر ہنس دیا اور کہنے لگا ''لو یار! ہم تو دال اور ساگ کھا کھا کے جانور بنے جا رہے تھے۔ آج تو اللہ نے سن ہی لی ہماری بھی۔'' اس نے یہ نہیں بتایا کہ پراٹھے آئے کہاں سے تھے۔ اور کون لایا تھا۔ اس نے شاید پہلی بار اتنی بے تکلفی سے یار کہہ کے مجھے پکارا تھا۔ اس کی ہنسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ہم دونوں نے لمحہ بھر بھی انتظار نہ کیا اور دونوں یوں پ[illegible]ے جیسے مدتوں کے بھوکے ہوں۔ ہم بڑے بڑے نوالے تیزی سے اٹھا رہے تھے۔
میں نے خود ہی اس سے کہا۔

''واقعی کالے خاں۔ آج تو جیسے قسمت بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ ورنہ آج جو دال آئی تھی۔ تمہاری تو دیکھ کے ہی طبیعت صاف ہو جاتی۔'' کالے خاں نے ہاتھ میں اٹھایا ہوا لقمہ وہیں رکھ دیا۔ گھی میں لت پت انگلیاں فوراً قمیص کی پہلو والی جیب میں ڈال دیں۔ کہنے لگا۔''
پورے پانچ نوٹ ہیں۔ بولو' کتنے دوں؟'' پراٹھے ختم کر کے ہم پیکٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک تیل کی شیشی' ایک کنگھی' دو صابن' پان سات ماچسیں اور چودہ پندرہ سگریٹ کی ڈبیاں۔ [illegible] ان چیزوں کو دسترخوان میں باندھ کے کالے خاں نے پوٹلی سرہانے تلے رکھ لی۔ پیسے احتیاط سے تکیے میں اڑسے' بستر بچھایا اور پھر سگریٹ کا دھواں اڑاتا لیٹ کے جانے کیا سوچنے لگا۔ اور میں اس کے پاس ہی بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ یہ وہی کالے خاں ہے جو لنگڑی سے میرے ساتھ آیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ ہنس رہا تھا' وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔

ہمیں اپنے ہی کاموں میں پتہ بھی نہ چلا کہ کس وقت داروغہ صاحب آئے اور چلے گئے۔ بتیاں کب روشن اور گل ہوئیں اور قیدی کس وقت ہیر گاتے ہوئے بکھر گئے۔ کبھی ہم انہی سرد دیواروں میں کچھ

کے اپنی حسرتوں کا ماتم کیا کرتے تھے لیکن آج تو جیسے ہم رہ ہو کے اپنے گھروں میں پہنچ گئے تھے۔ پھر جب قیدی سو گئے اور روز روزن میں سرد ہوا تاریکی میں لپٹی اندر آنے لگی اور چاروں طرف موت کی بھیانک خاموشی چھا گئی تو کالے خاں نے نیا سگریٹ جلایا۔ بیٹھ کے چار کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا اور دوسرا کش لے کے بولا۔ "کیا اتنی جلدی سو گئے یار؟" میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک سگریٹ سے زیادہ تھی۔ اس کا لہجہ کہہ رہا تھا کہ وہ رات بھر نہیں سوئے گا اور جیسے بہت کچھ کہہ جائے گا۔

کالے خاں کمبل اوڑھ کے بیٹھ رہا۔ اس کی انگلیاں کانپتی رہیں اور سگریٹ کا گل لمبا ہو ہو کے گرتا رہا ...... ٹوٹتا رہا ......

کالے خاں کو اس کے ماموں نے ہی پالا تھا۔ ماں باپ تو بچپن ہی میں اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے لیکن تھوڑی سی جائیداد اس کے لیے ضرور رکھ گئے تھے ماموں نے نہ صرف اس کی پرورش کی بلکہ اس کی جائیداد کی دیکھ بھال بھی کرتا رہا۔ گاؤں کے ننھے سے سکول میں اس نے چار جماعتیں بھی پاس کی تھیں اردو کی دو تین کتابیں پڑھی تھیں اور جمع تفریق کے سوال حل کیے تھے۔ لیکن یہ سب پڑھائی اس کے کسی کام نہ آ سکا کہ مستقبل میں اسے ہل ہی تو چلانا تھا۔ جب وہ جوان ہوا اور اس نے اپنی زمینوں سے گندم کی بوریاں بھر کے ماموں کے صحن میں لا پھینکیں تو ماموں کے ذہن میں جانے کیا سمائی وہ اپنے بھانجے کے لیے گاؤں کے امیر ترین زمیندار کی اکلوتی بیٹی بیاہ لایا۔ نجی اپنے ساتھ اپنی چاندی کے روپے جیسی کھنکتی ہنسی ہی نہ لائی تھی بلکہ بے شمار زمینیں بھی لائی تھی۔ اتنی کہ انسان صبح گھوڑے پر سوار ہو کے اسے روندنا شروع کر دے اور شام تک دوڑاتا جائے تو زمینیں ختم نہ ہوں۔ لیکن نجی کو پانے کے بعد کالے خاں کو اور سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس نے خود کہا۔ "یار دین محمد! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیسا نشہ ہے۔ شراب یا بھنگ کا نشہ تو پھر اتر جاتا ہے۔ پر یار! یہ نشہ تو ہے ہی ایسا کہ ساری عمر نہ اترے۔ وہ جب ہنستی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے گھر میں برتن بج اٹھے ہوں۔ اور جب وہ چلتی تھی تو بڑی صحت مند ہوتی تھی اس کی چال کتنا شہد ٹپکتا تھا اس کے لبوں سے سچ یار! اس کے لب چوم کے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے کسی شہد کے چھتے کے نیچے منہ رکھ دیا ہو .... میرے ہونٹ مٹھاس سے تر ہو جاتے تھے۔ پر یار، میرے بغیر تو اسے کوئی شے اچھی ہی نہ لگتی تھی۔ میں باہر جاتا تو ظالم رات رات بھر جاگ کے انتظار کرتی اور میں گھر جاتا تو یوں کھل اٹھتی جیسے اسے زندگی مل گئی ہو .... "

اس کی ساری باتیں سچی تھیں۔ میں اب اس کی ساری سنجیدگی، سارا غم سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ میں جان گیا کہ وہ پہلے کیوں بجھا بجھا سا رہتا تھا اور آج وہ چانک ہی کیوں کھل اٹھا ہے پر گاؤں میں اور لوگ بھی تو تھے۔ جنہیں اس کی مسکراہٹوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ انہیں اگر دلچسپی تھی تو نجی کی زمینوں سے۔ ایک روز جب وہ کھیتوں کو جا رہا تھا تو دشمنوں نے مل کے اس پر حملہ کر دیا۔ کالے خاں بھی بے خبر نہ تھا۔ اس

نے فوراً ڈب میں سے چاقو نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے پیٹ میں بھونک دیا۔ جس کی آنکھوں میں لالچ رقصاں تھا' اس کی انتڑیاں ڈھیر ہو چکی تھیں۔ موقع کے گواہ تو تھے ہی۔ اسے پھانسی کی سزا نہیں ہوئی' کیس برس قید کی سزا مل گئی۔ پھر اپنے لب سکیڑ کے اور سگریٹ جلا کے وہ کہنے لگا۔

''دین محمد۔ سوچو تو یار میں نے جی کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ اس وقت تو وہ ایک مسکراتی کلی ہے۔ لیکن میں نے اسے کیا دیا ہے۔ یہی نا کہ وہ اکیس برس کے طویل انتظار کے جہنم میں جل کے ختم ہو جائے سچ جانو! میں جب سوچتا ہوں تو میرے سر میں سانپ رینگ جاتے ہیں اور کوئی میرے کلیجے کو کاٹ کاٹ کے گھسیٹنا شروع کر دیتا ہے لیکن وہ تو بڑی ہمت والی ہے یار! دیکھ کتنی دور سے مجھے ملنے آئی ہے۔ میرے لیے کتنی ساری چیزیں لائی ہے اور پھر وہ تو سینہ تان کے کہہ رہی تھی کہ اکیس برس آخر ہوتے ہی کتنے ہیں ......؟''

''اس طرح غم کرو گے تو تمہاری صحت گر جائے گی کالے خاں تمہیں اپنی جی! پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی تو سوچو۔ ممکن ہے تمہاری اپیل منظور ہو جائے اور پھر تمہیں بہت ساری معافیاں' بہت ساری رعائتیں بھی تو ملیں گی۔ ان سب کا شمار کرو تو دن رہ ہی کون سے جاتے ہیں''

اس رات ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کالے خاں نے باتیں شروع کی تھیں تو جیسے وہ سارے دنوں کی کسر پوری کر لینا چاہتا تھا۔ اس رات تو جیسے ہم سوئے ہی نہ تھے کہ اِدھر آنکھ لگی اور اُدھر بھونپو زور زور سے چیخنے لگا۔

اگلے دس پندرہ دنوں میں اس میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اب چپ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات چھیڑے رکھتا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس کی ساری دلچسپیاں میرے تک ہی محدود تھیں۔ بیرک کے دوسرے ساتھیوں سے شاید وہ بھی واقف ہو چکا تھا۔ اس لیے ان کے نزدیک تک نہ جاتا۔ ہم دونوں کام ایک ہی جگہ بیٹھ کے کرتے تھے لیکن اب اتنے زیادہ کام چور ہو گئے تھے کہ سارا دن بیٹھے رہتے اور ایک کرسی بھی تیار نہ ہو جاتی۔ فیکٹری سے نکل کے ساری جیل کو چھان مارنا جیسے ہماری عادت ہو گئی تھی ... اور جب گنتی کا وقت قریب آتا تو ہم، اپنے ایک بی کلاسیے دوست سے ملنے چلے جاتے۔ ہم نے اپنا گھی' چینی' پتی اور دوسری چیزیں اسی کے کمرے میں چھپا کے رکھی ہوئی تھیں۔ بیرک میں رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوست سے مل کے ہم اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹتے اور جلدی جلدی' دروازہ بند ہونے سے پہلے لوٹ آتے۔ کھانا لے کے اس میں گھی ڈالتے اور کبھی دال ٹھنڈی ہو جاتی تو ہم نوالہ منہ میں رکھ کے ذرا سا گھی بھی توڑ کے ڈال دیتے تھے۔ کہ پیٹ میں جا کے خود ہی حل ہو جائے گا۔ جب گنتی ختم ہوتی اور روشنیاں بجھ جاتیں۔ اور قیدی اودھم مچانے کے لیے اکٹھے ہوتے تو میں اور کالے خاں کمبل اچھی طرح

اگر ایک بار بھی ٹوٹ گئی تو پھر مشکل ہی ہے جو وہ . لیکن پھر میں نے فوراً اپنے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ نہیں، اس کی اپیل ضرور منظور ہوگی، ضرور ہوگی . بیرک کے آخری کونے کی طرف دیکھا تو وہ پچھلی طرف بغلیں بجاتے ہنستا، جھومتا چلا آ رہا تھا۔ یہ خوشی بھی کیا چیز ہے۔ ”یہ تو انسان کو جیسے پر لگ جاتے ہیں چھن جائے تو جیسے وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

قریب آ کے کھیس کی بکل کھولتے ہوئے اپنی خوشی کو بمشکل دباتے ہوئے اس نے پوچھا

”کہیں ہواں تو نہیں کھا گئے؟“ ”مجھے آپ ہی آپ ہنسی آ گئی نہیں یار، تمہارے بغیر تو اب ہوا تا حلق سے اترتا ہی نہیں “ وہ سنبھل کے اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ بکل کھول کے پوٹلیاں سامنے رکھتے ہوئے ہنس کے بولا ”بڑی بھاگوان ہے وہ بھی یار۔ جانے کیا الا بلا اٹھا لاتی ہے “ اس نے پہلی پوٹلی کھولی تو اس میں دہی پراٹھے اور انڈے تھے۔ دوسری پوٹلی میں باجرے کی میٹھی روٹیاں اور گڑ کی بھیلیاں تھیں جن میں بادام اور اخروٹ توڑ کے ملائے گئے تھے اور تیسری میں وہ صابن اور سگریٹ بیڑی آئی تھی۔ کالے خاں نے اور چیزیں تو دوسری طرف سرکا دیں اور دسترخوان سامنے رکھ کے نوالہ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”یار دین محمد! یہ ملاقات کی جگہ تو بڑی واہیات ہے۔ یار! یہ جیل والے اچھے مردود الوئیوں ہیں۔ جب وہ جانتے ہیں کہ ایک بیوی اپنے خاوند سے ملنے آتی ہے اور وہ بھی اتنی مدت بعد تو انہیں کم از کم چند لمحے تو تنہا رہنے دیا جائے “ کالے خاں ٹھیک کہتا تھا۔ کہ ملاقات کا کمرہ ڈیوڑھی کے بائیں پہلو میں داروغوں کے دفتروں کے بالکل عقب میں تھا۔ اس بڑے کمرے میں بہت ساری موٹی سلاخیں ایک قطار میں زمین اور چھت میں گاڑی گئی تھیں۔ اس طرف قیدی بیٹھے تھے اور دوسری طرف ملاقاتی اور ان سلاخوں میں سے بڑی مشکل سے بازو ادھر اُدھر جا سکتا تھا۔ میں نے بات ذرا ہیر پھیر سے اس سے کہی۔ ”تمہارا گلہ ٹھیک ہے، لیکن کالے خاں۔ ان کے نزدیک تو ایک عورت ایک قیدی کو ملنے آتی ہے۔ اور بس لیکن یار! تم نے پہلے کہا ہوتا تو اس کا بھی بندوبست ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا بلی کلا سیا یار کس وقت کام آئے گا۔ تم آئندہ فوراً بتانا داروغے سے سفارش کروا کے کسی خالی دفتر کا کمرہ کھلوا لیں گے

اس بار بھی نے اس کا کہنا مان لیا تھا۔ ایک ایک روپے کے بہت سارے نوٹ لائی تھی۔ جیل میں بخشیش کا دھندا تو زیادہ ہوتا ہے۔ نا۔ ایک روپے سے زیادہ کون دے، پیسے گن کے جیب میں ڈال کے اور باقی سامان سرہانے رکھ کے کالے خاں بولا ....

”اس کی صحت بہت ہی گر گئی ہے دین محمد! پہلے تو وہ آنگن میں چلتی تھی تو سارا آنگن کانپ جاتا تھا ...پر اب تو ... ...بڑی کمزور ہو گئی ہے پھر رو تو وہ بات بات پر پڑتی ہے۔ میرے میلے کپڑے اور بڑھی شیو دیکھ کے تو وہ اس طرح روئی ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ پھر بڑے تنے گلے سے کہنے لگی۔ لاؤ کالے خاں! تمہارے کپڑے دھو دوں دین محمد! میں بھی کیا انسان ہوں مار کر اچھا بھلا ہونے

کے باوجود اسے دکھی کئے ہوئے ہوں۔ اس نے آنسو بہتے ہیں تو چپ دیکھتا رہتا ہوں چھوڑ بھی تو نہیں سکتا نا۔ ......" کالے خاں کا لہجہ اداس سا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن تاپی۔

"تم نے پھر وہی بکواس شروع کر دی ہے۔ خدا تمہارا ستیاناس کرے۔ کب تو سے تمہاری اپیل منظور ہو جائے گی۔ تم پھر ...... تم نے اسے تسلی دی ہوتی نا۔" کالے خاں نے ذرا بعد سر ہلایا اور مجھے دیکھ کے کہا۔ "تسلی تو بہت دی ہے لیکن ان تسلیوں سے کبھی دل مانتا بھی ہے۔" پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "اگلی بار جو آئے گی تو تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گا۔ میں نے آج بھی ذکر کیا تھا تمہارا اور" لیکن فوراً رک کے وہ کہنے لگا۔

"نہیں بھئی! اگلی مرتبہ تو تم علیحدہ کمرہ کھلوا کے دے رہے ہو نا۔ تو تمہیں کچھ یہاں سے جاؤں۔ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑا مارنے والی بات ہوگی ...... یہ تو" زور سے ہنس کے کالے خاں نے کروٹ بدل لی اور میں بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

میرا خیال تھا کہ ملاقات کا اثر زیادہ دیر تک نہیں رہے گا اور کالے خاں کی اداسی صبح تک ٹھیک ہو جائے گا میرا خیال درست نکلا۔ کیونکہ صبح تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ہشاش بشاش تھا۔ ابھی سارے قیدی سوئے ہوئے تھے کہ اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے آنکھیں مل کے روشن دان کی طرف دیکھا تو آثار بتا رہے تھے کہ مشرق کی سمت چاندی اور دودھ بہنے لگ گئے ہیں۔ میں بھی اٹھ بیٹھا اور ہم دونوں ان چیزوں کا شمار کرنے لگے جو دو روز پیشتر ختم ہو گئی تھیں اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ہم منگوا نہ سکے تھے۔

کالے خاں اب پہلے سے بھی زیادہ خوش رہتا تھا۔ اب اس کی چہل قدمی بڑھ گئی تھی اور اس نے دفتر میں کام کرنے والے بابو قیدیوں بیرک کے نمبرداروں اور چکر کے جمعداروں سے واقفیت پیدا کر لی تھی ... ہسپتال کے سارے لوگ اسے جانتے تھے اور باورچی تو اس کا جیسے لنگوٹیا یار بن گیا تھا۔ پر ایک تبدیلی اس میں یہ آئی تھی کہ اب وہ ہر روز ہی دفتر کے بڑے بابو قیدی کے پاس جانے لگا تھا۔ اس کی یہ عادت سی بن گئی تھی کہ کھانا نہ ملے تو بھوکا سو رہتا تھا لیکن بابو سے ملاقات نہ ہو تو اسے رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ وہ کئی بار مجھ سے پوچھا کہ کہیں میں تو بابو سے نہیں ملا اور بابو نے مجھے کوئی بات تو نہیں کہی۔ اس کا خیال تھا، جونہی اس کی اپیل کا فیصلہ آئے گا۔ بابو جھٹ سے اسے بتا دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر روز ملنے کا عادی سا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھ سے بھی وہ اکثر پوچھتا رہتا تھا اور جب میں اسے بتاتا کہ اپیل کے فیصلے میں تو چھ ماہ بھی لگ سکتے ہیں تو وہ بڑی حسرت سے کہتا۔

"تین ماہ تو ہو چلے ہیں اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا یار!"

لیکن ایک ماہ اور گذر گیا تھا مگر جیل کا کوئی جواب نہیں آیا تھا اور نہ ہی فیجی اس سے ملنے آئی تھی۔

ایک رات بات یوں ہوئی کہ جانے کیوں کالے خاں نے نیفے میں رکھے ہوئے آٹھ دس روپے نکال کے اپنے سرہانے رکھ لئے تھے۔ اور صبح جب وہ فیکٹری جانے لگا تو اس نے گو بستر تہہ کر کے رکھ تھا لیکن روپے اٹھانا بھول گیا تھا وہ تو اسے اسی وقت یاد آیا جب میں نے اس سے کہا کہ آج گھی ختم ہے' تھوڑا منگوا ہی لیں۔ تو وہ مجھے گھسیٹتا بھاگتا ہوا بیرک میں آیا' کمبل اٹھا کے دیکھا' ایک ایک کمبل کو جھاڑا لیکن روپے ہوتے تو ملتے۔ غیر حاضری میں کوئی دوسرا قیدی ہاتھ پھیر گیا تھا۔ کمبل اسی طرح چھوڑ کے وہ باہر نکلا' اور کہنے لگا۔ ''پیسے تو ختم ہو گئے یار۔ رات آٹھ دس روپے تھے' وہ تو کوئی لے اڑا۔ لیکن یہ بھی کہاں مر گئی جو اتنے دنوں سے نہیں آئی.........؟''

فجی سے پچھلی ملاقات کو لگ بھگ چھ ہفتے ہو رہے تھے۔ اور دو دنوں سے تو وہ بے حد بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ گو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن میں اس کی حرکات ہی سے تاڑ گیا تھا کہ وہ بے چین ہے اور اس کی بے چینی کی وجہ سمجھنا بڑی بات نہ تھی۔ جس دن اس کے پیسے چوری ہوئے' اس سے اگلی رات وہ بڑی دیر تک نہیں سو سکا تھا پیسے ایسے بھول گئے تھے۔ شام اس نے لنگر کی دال کھائی تھی تو فجی کو بے اختیار یاد کیا تھا اور اب فجی ہی سے متعلق طرح طرح کے خیالات اس کی نیند کو دور بھگائے جا رہے تھے۔ شام مجھ سے بھی اس نے کہا تھا کہ وہ خیریت سے ہو کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ اور میں نے اسے تسلی بھی دی تھی لیکن اس کے دل میں جو وسوسے جنم لے چکے تھے' وہ کسی طور ختم نہیں ہو رہے تھے۔

اگلے روز کالے خاں کی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ وہ کھو سا گیا تھا۔ دوپہر میں جب پھر اسے گاجروں کا سالن ملا تو اس کے لب' پلکیں اور ہاتھ ایک ساتھ کانپ گئے تھے اور اس نے بڑی مشکل سے ایک ایک نوالے کو حلق سے اتارا تھا۔ لیکن ہم ابھی بیرک میں چھٹی کے بعد آ کے بیٹھے ہی تھے کہ جمعدار نے اپنی مخصوص آواز میں اسے پکارا..... ''کالے خاں ولد شہباز خاں قیدی اکیس سات۔ چلو' تمہاری ملاقات آئی ہے۔'' تو ہم دونوں ایک ساتھ بھوک کھڑے ہوئے۔ بابو کو پکڑا۔ سفارش کرائی اور ڈیوڑھی میں جب دفتر کا کمرہ مل گیا اور اُدھر جیل کی بڑی پھاٹک سی فجی اندر آئی اور ادھر بڑے دروازے سے کالے خاں گیا تو میں نے جھری میں سے دیکھ کے' پھر نگاہیں ہٹا کے سوچا... ''وہ دن کب آئے گا میرے دوست! جب تم اس گیٹ سے باہر جاؤ گے اور پھر کبھی بھی اس دنیا میں لوٹ کے نہیں آؤ گے' کبھی نہیں جانے وہ دن کب آئے گا.. ...؟'' میں ہولے ہولے بیرک میں چلا آیا وہاں ٹھہر کے لیٹا بھی کیا تھا...

لیکن جانے کیا بات تھی' پہلے کالے خاں ملاقات کے بعد اُس وقت لوٹا تھا جب بیرک کا آخری

دروازہ بھی بند ہونے والا ہوتا' اس شام تو ابھی سارے دروازے کھلے تھے اور قیدی احاطے سے زیادہ باہر تھے کہ وہ لوٹ آیا۔ میں نے چونک کے حیران سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر [illegible] کیفیت کے ساتھ بہت سے جذبات چھائے ہوئے تھے۔ وہ ہنسنا بھی چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ جیسے رونے میں چھپ کے گھٹنے پر سر رکھ کے کچھ سوچنا بھی چاہتا تھا [illegible] نجی آج صرف ایک پوٹلی لائی تھی جو [illegible] حد مختصر نکلی۔ اس میں تو صرف سگریٹ اور ماچسیں ہی تھیں۔ بس [illegible] صابن اور وہ گڑ کی بھیلیاں [illegible] میرے پاس بیٹھ کے پہلے اس نے سگریٹ جلایا' پھر [illegible]

''دین محمد ——— نجی کی صحت تو بہت اچھی ہوگئی ہے یار [illegible] ہو گئے ہیں اور اس کا جسم تو پہلے سے بھی زیادہ بھر گیا ہے کہہ رہی تھی' وقت نہ تھا [illegible] پھر پیسے بھی تو دس ہی روپے لائی ہے۔ کہتی تھی' ہفتے بعد آؤں گی تو [illegible] دین محمد! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ وہ آج کھل کے بات کیوں نہیں [illegible] ملا کے بات ہی نہ کرتی تھی یار' پہلے تو اس کی نگاہیں میرے چہرے پر [illegible] جاتی تھیں [illegible] بات ہے؟'' کالے کا اداس چہرہ اور اس کی اکھڑی اکھڑی باتیں ہی بتا رہی تھیں کہ [illegible] اس نے اس اکل پن کا اظہار نہیں کیا تھا' جو وہ پہلے کرتی آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''یہ صرف تمہارا وہم ہے کالے خاں [illegible] ہو سکتا ہے کوئی چاہنے والا [illegible] اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہو ہو۔ پھر دیکھو نا! جب تم بھی اس کے پاس نہیں تو اس نے غم تو کرنا ہی ہے' پریشان تو ہونا ہی ہے''

لیکن اس بار کالے خاں کی آواز چکرا گئی جیسے کسی بڑے خدشے کو اگل رہی ہو

''لیکن پہلے تو ہم بھرے آنگن میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے تھے۔ ایک دوسرے کا بوسہ لیا کرتے تھے لیکن آج جب اس تنہا کمرے میں اسے چومنا چاہا تو وہ اپنا چہرہ چھڑا کے بڑی ناگواری سے کہنے لگی۔ کوئی دیکھ رہا ہوگا' کیا کر رہے ہو تم کالے خاں! اب اس بات کا پریشانی سے کیا واسطہ ہے یار!'' پھر اس نے خود ہی جھٹ بڑی لاپروائی سے کہا۔ 'چھوڑ بھائی! میں بھی کیا لے بیٹھا ہوں۔ ہفتے بعد ملنے آئے گی تو سب کچھ پوچھ لوں گا ... ''پہلے کی طرح ایک ہی تھڑے پر بیٹھ کے ہم نے کھانا کھایا۔ ایک ساتھ کمبل اوپر کھینچے۔ لیکن کالے خاں نے کروٹ بدل کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جیسے وہ جلد سو جانا چاہتا ہو۔

کہنے کو تو اس نے بڑی لاپروائی سے کہہ دیا تھا کہ بات معمولی ہے لیکن اب یہی معمولی بات اس کے ذہن میں ایک طوفان سا مچائے ہوئے تھی۔ اس رات تو اس نے صرف کروٹیں ہی بدلی تھیں۔ لیکن اگلے سات دنوں میں کوئی شے اسے اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ کپڑے کے اس تھان کی طرح کہ جس کے اوپر کا

یک گز ٹکڑا تو صحیح ہو لیکن نیچے ساری تہوں کو کیڑا چاٹ گیا ہو۔ وہ اب بھی ہنستا تھا' جی بھر کے گپیں ہانکتا تھا لیکن ایک بات جو اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی' مارے خوف کے وہ اس سے کچھ سہم سا گیا تھا۔ اور بیٹھے بیٹھے بری طرح چپ ہو جاتا جیسے اب پھر بولنے کا نام بھی نہیں لے گا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ جی نے اس سے کچھ کہا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتا دیتا۔ آج تک اس نے مجھ سے بات چھپا لے رکھی کون سی تھی جو میں اس پر شک کرتا۔

اس بار جو سگریٹ اور ماچسیں جی اس کے لیے لائی تھی' کالے خاں نے انہیں ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ ملاقات سے آ کے اس نے ان چیزوں کو جس طرح رکھا تھا' ایک ہفتے بعد بھی وہ اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ اس ایک ہفتے میں کالے خاں نے جی کے بارے میں بہت کم بات کی تھی۔ زیادہ تر وہ ... اور جیل سے متعلق ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ البتہ اب وہ قیدی بابو کے پاس دن میں دو مرتبہ جانے لگ گیا تھا۔ موقعہ ملتا تو ... تیسری مرتبہ بھی جا نکلتا۔ جاتا وہ یہ امید لے کر تھا کہ ممکن ہے اس کی اپیل کا جواب آ گیا ہو لیکن ... وہ ... منہ لٹکائے آتا تھا۔ ان سات دنوں میں ایک یا دو مرتبہ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ ''دین محمد ... فیصلہ آ جائے اور میں رہا ہو کے گھر چلا جاؤں۔ تو جانتے ہو میں کیا کروں گا ...؟'' خود ہی کہہ دیتا۔ ''چھوڑ بھئی۔ مجھے نیند آ رہی ہے!''

ٹھیک سات دن بعد جو چکر کا جمعدار آ کے چلایا اور کالے خاں اپنا کارڈ اٹھا کے گیا تو جمعدار نے مسکراتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''کالے خاں' تمہاری تو اب کچھ زیادہ ہی ملاقاتیں آنے لگی ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ جیل ہے اپنا گھر نہیں کہ جس کا جی چاہا' منہ اٹھا کے چلا آیا۔ یہاں ہفتے میں صرف ایک ملاقات کی ہی اجازت ہے۔ جاؤ تم ...'' کالے خاں نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھائے لیکن پھر یہ حقیقت بھی تو بڑی تلخ تھی کہ وہ صرف ایک قیدی ہے ... ڈیوڑھی میں کمرہ کھلوانے' میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ کالے خاں کو شاید یاد ہی نہ رہا تھا۔ ورنہ وہ مجھے ضرور لوٹ جانے کو کہتا۔ دفتر کھل گیا اور کالے خاں انتظار کرنے لگا۔ اتنی دیر میں برقعے پہنے درمیانے قد کی ایک عورت بڑے گیٹ کے ساتھ آ کے کھڑی ہو گئی۔ سپاہی نے اسے دیکھا تو فوراً چابی گھما کے تالا کھولا اور چھوٹا سا دروازہ کھینچ کے ایک طرف ہو گیا۔ عورت اندر آ کے سیدھی دفتر میں چلی گئی۔ اس نے نقاب الٹا تو میں نے شیشے میں سے دیکھ لیا تھا کہ ... جی تو کالے خاں کی باتوں سے کہیں بڑھ کے حسین تھی۔ اس کے لب تو واقعی ... جوانی اس طرح پھٹ پڑی تھی جیسے ندی میں باڑھ آ گئی ہو ... مجھے دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں دوسرے گیٹ سے اندر چلا آیا۔

لنگر کی سولیاں اور پانی اپنے سامنے رکھ کے میں کالے خاں کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا' وہ آج بھی جلد ہی لوٹ آئے گا۔ لیکن پہلے نمبردار نے کھانا تقسیم کرنا بند کیا۔ پھر سنتری نے سب کی گنتی لی۔ ...

نے دروازے بند کیے‘ بیرک میں بتیاں بُجھ گئیں اور جب سپاہی آخری دروازہ بھی بند کر کے لگا تو سر جھکائے کالے خاں بیرک میں داخل ہوا۔ مجھے تسکین یوں ملی تھی کہ میں ان چپ سی باتوں میں گُم تھا‘ وقت کا احساس ہی نہیں رہا‘ لیکن اس کالے خاں کا سر تو جھکا ہوا تھا۔ جانے کیا بات تھی؟ مجھے اس کی غلیل بھی خالی سی لگ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اپنے تھڑے کے پاس آ کے اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ کوئی بات نہیں کی۔ چپل اتارے اور قمیص کی بکل ہی میں لیٹ کے کمبل اوپر کھینچ لیے۔ میں نے کالے خاں کی طرف دیکھا‘ اس کی سانس ہموار نہ تھی ... ہی چپ ہا سے باد وں پھر خود ہی رک گیا۔

کافی دیر گزر چکی تھی اور تھالیوں میں سالن کے اوپر ایک جھلی سی تن گئی تھی اور روٹیاں چمڑے کی طرح سوکھ چکی تھیں میں نے اس سے کہا۔ ”اٹھو بھائی! کھانا ٹھنڈا ہو ... “ کالے خاں کا منہ میری طرف تھا۔ اس نے چہرہ ننگا نہیں کیا۔ کہنے لگا ”تم کھا لو۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ مجھے اس بار شدت سے احساس ہوا کہ کوئی انہونی نہ ہو گئی ہو۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے میں اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور کمبل ہٹا ہی لیا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔ ”تم تو بالکل ہی بچے ہو کالے خاں۔ مجھے بتاؤ تو سہی‘ بات کیا ہے آخر ...“ کالے خاں نے آنکھیں صاف کیں۔ لیکن اٹھا پھر بھی نہیں ... ”اٹھو نا یار! کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے اور میں تمہارے بغیر کھاؤں گا بھی نہیں ...“ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور میرے اصرار سے تنگ آ کے کہنے لگا۔

”دیکھ۔ سمجھ میں نہیں آتا‘ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ نجی تو آج میرے پاس پانچ منٹ بھی نہیں بیٹھی۔ کوئی بات ایسی ضرور تھی کہ جسے کہنے کے لیے وہ بار بار چہرہ اوپر اٹھاتی‘ لب وا کرتی لیکن ہر بار جیسے ہمت جواب دے جاتی۔ ... یار! آج تو وہ ایسی انجان نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کا اور میرا کوئی رشتہ ہی نہ ہو ...“ میں نے پھر وہم کہہ کے بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن میرے دل میں بھی خدشات نے سر اٹھانے شروع کر دیے تھے۔

اس بار نجی آئی تو وہ کالے خاں کے لیے کچھ بھی لائی نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کوئی ایسی شے اسے دے ضرور گئی تھی کہ جسے پا کے کالے خاں کا سب کچھ چھن گیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح رات دن ایک ہی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ لب کھولتا تک نہیں تھا۔ وہ نہ چین سے کھا سکتا تھا اور نہ ہی سو سکتا تھا۔ کتنے ہی دن اس نے بغیر کچھ کھائے گزار دیے کتنی ہی راتیں اس نے بغیر سوئے کاٹ دیں۔ میں نے ایک دو بار کوشش کی تھی کہ اسے تسلی دوں لیکن اب تو جیسے میری ہمت بھی جواب دے گئی تھی اور پھر کالے خاں خود بھی تو یوں انجان بن گیا تھا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔

پانچ چھ ہی دنوں میں اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور چہرے کی ہڈیاں ایک دم باہر نکل آئی تھیں۔ اس کے کپڑے میل سے سیاہ ہو چکے تھے۔ داڑھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن اس نے نہ تو کپڑے دھوئے تھے اور نہ ہی شیو بنوائی تھی۔ اسے تو خود اپنے آپ کا ہوش نہ تھا' کپڑوں کی فکر کون کرتا۔

جس شام منی اس سے ملنے آخری مرتبہ آئی' اس سے دو ہی روز قبل اسے بخار آنے لگا اور وہ میرے مجبور کرنے پر ہسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔ دوپہر کے وقت اس کی حالت اچھی تھی۔ کم از کم بخار نہیں تھا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ فیکٹری چلے لیکن میں نے ہی اسے روک دیا۔ فیکٹری سے واپس آ کے بیٹھا ہی تھا کہ بڑے بابو قیدی میرے پاس چلے آئے۔ انھیں صبح کی ڈاک سے چٹھی ملی تھی' اور اب بات ان کے پیٹ میں ٹھہر نہیں رہی تھی کہ کالے خاں کی اپیل منظور ہو گئی تھی اور اس کی سزا سات برس کر دی گئی تھی۔ بابو قیدی یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ابھی کالے خاں کو پتہ نہ چلے اس لیے کہ چٹھی صاحب نے نہیں دیکھی تھی۔ بابو چلے گئے تو میں رکو سے میں نے سوچا' کالے خاں سنے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ معافیاں وغیرہ ملا کے یہ سات برس تو وہ پلک جھپکتے میں گذر جائیں گے۔ اس وقت داروغہ اور جیلر دونوں راؤنڈ پر تھے' میں سر جھکا کے اپنے آپ ہنستا ہوا کام میں جت گیا۔

شام بھونپو کے بجنے کی دیر تھی کہ میں نے جلدی سے اٹھ کے چپل پہنے۔ بھیس کی بغل ماری اور بھاگتا ہوا ہسپتال کی طرف ہو لیا۔ بابو جائے جہنم میں' بھلا کالے خاں نے کوئی ڈھنڈورا تھوڑی دینا ہے جو بات اس سے نہ کہی جائے۔ پھولے سانس اور خوشی سے پھیلے سینے کو لیے جب میں ہسپتال آیا تو کالے خاں وہاں نہیں تھا۔ اسے تو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ میں پھر بھاگتا ہوا بیرک چلا آیا کہ وہ ہسپتال میں نہیں تو بیرک ہی میں ہو گا۔ لیکن وہ تو وہاں بھی نہ تھا۔ چند ہی لمحے قبل اس کی ملاقات آئی تھی اور وہ ڈیوڑھی میں چلا گیا تھا۔

نمبردار نے کھانا تقسیم کیا اور میں ابلا ہوا گوشت لے کے آیا ہی تھا کہ کالے خاں قیدیوں کے درمیان میں سے گذرتا ہوا میرے پاس چلا آیا۔ اس کی ملاقات آئی تھی نا میں نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ چہرے پر سکون تھا کچھ اس قسم کا سکون جو موت کے بعد چھا جاتا ہے۔ کالے خاں مردہ سی ہنسی ہنس کے بولا... ''کھانا لے آئے ہو... ؟'' تو مجھے اپنی بات اچانک یاد آ گئی میں نے جلدی سے کہا ''تمھیں ایک خوشخبری سناؤں کالے خاں۔'' کالے خاں کا سر فوراً جھک گیا اور وہ بڑے رندھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ''ٹھہرو' پہلے میں تمھیں سناتا ہوں۔ منی آج آخری بار مجھے مل کے گئی ہے'' میرے تو پاؤں تلے سے زمین سرک گئی... ''کیا کہہ رہے ہو تم کالے خاں۔ تمھارا ذہن تو ٹھکانے ہے نا......'' کالے خاں تھڑے پر بیٹھ چکا تھا۔ بغل کھول کے بولا۔

''میرے ذہن کو کچھ نہیں ہوا ہے دیپے۔ یہ تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہ بات ہو گئی ہے کہ جو مدت

سے میرا خون چوس رہی تھی اور جسے تم میرا وہم کہتے تھے۔ نفی آئی تو میں نے کمرہ کھلوایا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ بیٹھ کے بڑی بے رخی سے کہنے لگی۔ کالے خاں! اس جیل میں رہتے کبھی تم نے میرے متعلق بھی سوچا ہے۔ تمہیں تو یہاں اکیس برس گزارنے ہیں نا۔ لیکن بتاؤ تو میں یہ مدت یوں گزاروں۔ یہ تو ایک زندگی کے برابر ہے۔ کم از کم میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے یاد پڑتی ہے جو میں تمہاری آس پر اپنی زندگی، اپنی جوانی سب کچھ برباد کر ڈالوں [illegible]۔ بابا! [illegible] ہوگا۔ تم تم مجھے [illegible] دینے میں اس کی ان غیر متوقع باتوں سے [illegible] گیا تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگی۔ ''تم مجھے طلاق دے دو [illegible] یا۔ کالے خاں چپ ہوگیا۔ میں گم سم پھٹی پھٹی سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کالے خاں [illegible] نفی پر اتنا اعتماد تھا۔ لیکن وہ اس کے اعتماد کو دھوکا دے گئی [illegible] کالے خاں سے مجھے پوچھا

''آج لنگر کی کھا رہے ہو نا۔ اسے باہر پھینکو۔ چلو بی کلاس [illegible] جاتے ہیں۔ دیکھو تو میرے پاس آج کتنے پیسے ہیں؟ [illegible] ''اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا [illegible] ایک گڈی نکال کے میری گود میں پھینک دی۔ پھر ہنس کے کہنے لگا [illegible] ''نفی نے اپنا حق مہر معاف کر دیا ہے، ورنہ تین ہزار، اس لیے پھینک گئی ہے کہ میں جیل سے باہر نکلوں تو کسی اور سے شادی کر لوں [illegible] اچھی بات ہے' میرا ذہن بالکل ماؤف ہوگیا تھا' میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا' جیسے مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا [illegible] ''لیکن کالے خاں! تم نے آخر اسے جواب کیا دیا؟'' کالے خاں نے نگاہیں اٹھا کے میری طرف دیکھا اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے دو زار زار رونے لگا۔

''میں اسے کیوں کر کہتا دوست! کہ وہ میرا انتظار کرے۔ انتظار اور وہ بھی اکیس برس کا [illegible]! میں نے اسے طلاق دے دی ......'' میرے ذہن کے افق پر جیسے بجلی گر پڑی اور دور دور تک گڑگڑاہٹ پھیلتی چلی گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیسے کہوں کہ میرے دوست! میرے کالے! تمہاری تو اپیل منظور ہوگئی ہے اور تمہاری سزا ...... میں کیسے کہتا اس سے!

تیسری منزل

ہاجرہ مسرور

حلیمہ بائی منزل کی چوتھی منزل کے خوبصورت فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے حلیمہ بائی کو ایک دم غصہ آ گیا۔ انہوں نے وفد کے لیڈر دلی والے کی فصیح و بلیغ شکایات سننے کے بعد سر ہلا کر کہا۔

''چپ ہم کسی سے بولنے کا کس طرح یک دم مان لیں گا۔۔۔ فیر دیکھو، بابا کوئی آ کر تمہارے گھر کو کچھ بولیں گا تو ہم پہلے اس کا تپاس کریں گا فر (پھر)''۔

دلی والے ایک دم گرم ہو گئے۔

''پھر آپ اسے نہیں نکالیں گی تو ہم پولیس کو اطلاع دیں گے۔۔۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ شریفوں کے رہنے کی جگہ پر''۔۔۔

''او بابا گرم کیوں ہوئیں گا وہ ہمارا سگے والا نہیں لگتا۔ ہم بولا پہلے تپاس کریں گا''۔۔۔ یہ کہہ کر حلیمہ بائی نے اپنے کارندے کو بلایا اور اسے بظاہر سخت آواز میں تحقیق کرنے کا حکم دے دیا۔۔۔ اس کے بعد دلی والے کی قیادت میں وفد والے حلیمہ بائی بلڈنگ سے اتر گئے۔۔۔

حلیمہ بائی نے زور سے دروازہ بند کر کے کھڑکی میں سے رابعہ بائی بلڈنگ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ یہ ان کی دادی کی ملکیت تھی۔ اسے دیکھ کر انہیں اپنی بوڑھی زرد رو دادی یاد آتی جس کے مرنے کا انہیں بہت عرصے انتظار کرنا پڑا تھا۔ رابعہ بائی بلڈنگ بھی میلی زرد سی تھی بدرنگ کھڑکیاں، ٹوٹے شیشے اور ہلتے ہوئی چوبی زینے۔۔۔ وہ ہمیشہ اپنے کارندے سے کہا کرتیں ''یہ بلڈنگ گریں گا تو ہم اس جگہ آٹھ منزل کا بڑا بڑا فلیٹ والا بلڈنگ بنائیں گا۔۔۔ آج کل کو چھوٹا چھوٹا کمرہ کرائے پر اٹھانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ بڑا ہو تو امریکی لوگ اصل سے دس گنا کرایہ دیں گا''۔۔۔

لیکن یہ بلڈنگ موجود تھی۔ اس میں بال روم ڈانسنگ کی ماہر مس ڈورتھی پریرا رہتی

تھی۔۔۔ اور ابھی جس کی شکایت لے کر اس کی بلڈنگ سے لوگ آئے تھے۔۔۔ حلیمہ بائی کو افسوس سا ہوا، کیونکہ مس ڈورتھی رابعہ بائی بلڈنگ کی سب سے پرانی مکین سب سے بہتر کرایہ دار تھی۔۔۔ حلیمہ بائی کے کارندے نے جب بھی جھوٹوں کرایہ بڑھانے کو کہا، ڈورتھی نے اسے قبول کر لیا۔ وہ سالانہ سفیدی وغیرہ کے روپے بھی کرنے میں نہ کاٹتی۔

"اکیلی ہے مگر اس کے گھر کبھی کوئی دنگا نہیں ہوا" حلیمہ بائی سوچتی میں بہہ رہی تھیں۔۔۔ ان کی آنکھیں بار بار مس ڈورتھی کے کمروں پر اٹھتیں، جس کی پیشانی پر اس نے نیلا پینٹ کرا رکھا تھا۔۔۔ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں کے سارے شیشے سلامت اور صاف تھے۔

مگر یہ گندگی کا قضیہ نہیں تھا۔۔۔ اگر ایسا سوال اٹھتا تو دلی والے کے کمرے کے سامنے کوریڈور میں سب سے زیادہ گندگی بکھری رہتی تھی۔ بلکہ ساری بلڈنگ ہی گندگی کی پوٹ تھی۔۔۔ گراؤنڈ فلور پر "فینسی شومیکرز" کے ہاں سے پھینکی ہوئی چمڑے کی کترنیں، فٹ پاتھ پر بکھری رہتیں، دوسری منزل کی بوہرہ جھینگا مچھلی کی ٹانگیں اور مونگ پھلی نوچ کر ہمیشہ زینے پر پھینک آتیں۔ اور ان کے پڑوس کے کمرے میں رہنے والے مسٹر ڈگلس واشنگ کی مشق کرتے کرتے کھانستے تو ہمیشہ دوڑکر بوہرہ خاتون کے دروازے پر تھوکتے۔۔۔ پھر تو شاید تیسری منزل کی بھولی بھالی میمن زینب بائی بھی اس چکر میں آ جاتی جو ایک اچھی پڑوسن تھی لیکن اپنے بچے کا پاخانہ کاغذ میں لپیٹ کر ڈورتھی کے گھر کے سامنے پڑے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں چپکے سے ڈال دیا کرتی تھی۔۔۔

"اُفوہ، لوگ کا دماغ پھریلا ہے اپنا کام نہیں کرتا"۔۔۔ حلیمہ بائی نے رابعہ بائی بلڈنگ کے رخ پر کھلنے والی کھڑکی کا پردہ گھسیٹ دیا اور بیٹھ کر اپنے سیاہ ڈوپٹے پر فیتہ ٹانکنے لگیں۔

حلیمہ بائی کا کہنا ٹھیک تھا کہ لوگ اپنے کام سے کام رکھیں۔ مگر رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں میں سوائے مس ڈورتھی پریرا کے کوئی ایسا نہ تھا جسے صرف اپنے آپ سے مطلب ہو یہاں مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگ رہتے تھے اس لئے ہر شخص خود کو بھول کر دوسرے کو کھوجنے کی فکر میں رہتا۔۔۔ لیکن مس ڈورتھی پریرا اپنے آپ میں اتنی مست رہتی کہ لوگوں کے لئے پراسرار حد تک دلکش بن گئی۔۔۔ مرد اس پر عاشق تھے اور عورتیں حاسد۔ بلڈنگ کی سب عورتیں ڈورتھی کی چال ڈھال اور لباس کی نقل کرتیں۔

وہ عموماً دن بھر اپنے گھر میں رہتی۔ ٹیلکم پوڈر میں بسی بڑے بڑے پھولوں والے پرانے جاپانی کیمونو میں ملبوس لکڑی کی جاپانی کھڑاؤں پر وہ یوں چلتی جیسے سمندری لہروں پر کوئی ننھا سا بادبانی ڈونگا۔۔۔ جانے یہ جاپانی کھڑاؤں کے تلے کی تراش کی وجہ سے تھا یا کیا، بہرحال یہ چال

غیر معمولی تھی۔ جسے اس کے پڑوس کے دلی والے کی جوان ہوتی ہوئی بیٹی بہت غور سے دیکھتی اور اپنی اماں رضیہ بیگم کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی کہ "اے بی اس کا سٹکنا کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو۔۔۔ اس سے تو پردہ جائز ہے"۔۔۔ مگر مس ڈورتھی کو کسی پردے وردے کا خاک خیال آتا۔۔۔ وہ صبح صبح اٹھ کر کوریڈور سے اپنے ملازم چھوکرے کو اٹھاتی اور پھر نہ صرف اپنے فلیٹ کی صفائی آپ کرتی بلکہ اپنے سامنے چھوکرے سے کوریڈور کی بھی خبر لوا ڈالتی۔۔۔ اس بلڈنگ کی جینتیں تو ایسی کام چور تھی کہ فلش بھی ٹھیک طرح دھو کر نہ جاتی تھی کوریڈور کی صفائی؟۔۔۔ رضیہ بیگم اس صفائی پر برا مانتیں۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ سب اپنے یاروں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حالانکہ ڈورتھی کی دوسری پڑوسن میمن زینب بائی کا کہنا تھا کہ اگر مس ڈورتھی کے ہاں آنے والے اس کے یار ہوتے تو رات کو بھی تو رکتے؟۔۔۔

"دن کو جو آتے ہیں؟ اے بی یہ بھی کوئی بھولی ہے کہ رات کے اندھیرے میں میاں کی صورت دیکھے نہیں تو حرام سمجھے"۔۔۔

رضیہ بیگم منطق چھانٹتیں اور زینب بائی جھلا کر چپ ہو جاتیں۔

اب اس بات پر کیا بحث یہ تو ساری بلڈنگ والے جانتے تھے کہ مس ڈورتھی کے گھر جہاں کبھی کوئی مرد آیا تو کمرے کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا نظر آنے لگا۔۔۔ دروازہ بند ہو تو سمجھو ڈورتھی گھر میں اکیلی ہے۔ اور جب وہ اکیلی ہوتی تو اس کی پڑوسنوں کو خبر ہوتی کہ وہ یا تو سو رہی ہو گی یا ناچ کی مشق کر رہی ہو گی۔۔۔

رابعہ بائی بلڈنگ میں آنے کے بعد شروع شروع میں مس ڈورتھی ناچ والی بات کو یہاں کے رہنے والے سے چھپاتی مگر اسکے ڈرائنگ روم کی چھت تلے رہنے والی بوہرہ عورت نے اوپر کی بے تحاشہ کھٹ کھٹ کی شکایت کرنی شروع کی تو مس ڈورتھی نے صاف کہہ دیا کہ ناچ اس کی زندگی ہے۔ وہ ناچے گی اور ضرور ناچے گی۔ نہیں ناچے گی تو زندہ کیسے رہے گی؟۔۔۔ جب جھگڑا بڑھا تو بوہرہ عورت کے پڑوسی مسٹر ڈگلس وائلن والے نے اس سے اپنا کمرہ بدل لیا۔۔۔ اس لئے اب مس ڈورتھی کو ناچنا ہوتا تو نیچے مسٹر ڈگلس اپنے وائلن پر ناچ کے مطابق دھن بجایا کرتا۔ بڈھا ڈگلس جس کے سفید کوٹ پر ہر دوسرے تیسرے مہینے کالے رنگ کی ماتمی چٹ سلی ہوئی ہوتی۔۔۔ اور جو کام کی تلاش میں عموماً بیکار رہتا تھا۔۔۔ مگر مس ڈورتھی ڈگلس سے بھی کوئی واسطہ سوائے "ہلو" کے نہ رکھتی۔۔۔ ہاں سال میں ایک بار کرسمس کے موقعے پر وہ اسے ضرور اپنے ہاں لنچ پر بلاتی۔ یہ اور بات ہے کہ دوسری منزل پر رہنے والے نوجوان بابو نے ڈورتھی کے ملازم

چھوکرے کے ہاتھ سے چٹیں لے کر کئی بار پڑھیں جس میں ڈگلس کو مخاطب کر کے لکھا ہوتا :
''فلاں ہوٹل میں یا فلاں فلم کمپنی میں وائلن بجانے والے کی ضرورت ہے۔ فوراً پہنچو۔ شاید کام بن جائے''۔۔۔

ان چٹوں کی وجہ سے بہاری نوجوان بابو ڈگلس کو ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھتا اور راتوں کو ڈگلس کے دروازے پر کان لگائے رکھتا کہ کب بڈھا چپکے سے تیسری منزل پر جانے کے لیے نکلے گا۔۔۔ لیکن جب دوسرے دن وہ دفتر جانے کے خیال سے جلدی سے [illegible] اٹھتا تو بڈھے ڈگلس کا دروازہ بند دیکھ کر اس کا کلیجہ مسلنے لگتا۔۔۔ دیکھا ابھی تک سو رہا ہے۔۔۔ شب جاگا ہو گا نا۔۔

اسی چکر میں ایک رات یہ بابو صاحب ڈورتھی کے کمرے پر پہنچے۔ [illegible] سناٹے میں ان کے ہولے سے کھٹکھٹانے پر ایک دم دروازہ کھلا اور پھر ڈورتھی نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔۔۔

''ہم تمہارے کو پولیس میں دیں گا۔۔۔ بولو تم ہم کو کیا سمجھا''۔ [illegible] ڈورتھی نے ہاتھ میں بابو کی ٹائی تھی۔ بڑی مشکل سے دلی والے اور میمن دکاندار نے اس کو چھڑوایا تھا۔

دلی والی رضیہ خانم نے اس قصے کے بعد سینہ ٹھونک کر رابعہ بائی بلڈنگ میں منعقد ہونے والی محفلِ میلاد میں دعویٰ کیا۔۔۔

''اے بی ہمارے میاں نے جو عورت بوٹن مارکیٹ میں کر رکھی ہے اس نے ایک دن ایسا ہی شور کیا تھا۔۔۔ اس پر ہمارے میاں کو اس کا یقین آ گیا اور نکاح کر بیٹھے۔۔۔ سمجھو اب یہ مس ڈورتھی بھی کہیں ہاتھ مارے گی۔۔۔ اے ایک اچھی بھلی ''بمبئی والی'' ہے۔

بمبئی کی زینب بائی بے وجہ یہ برا مان کر بولیں۔ ''مس ڈورتھی بمبئی کا کدھر ہے۔ وہ تو ''گوا'' کا ہے''۔۔۔

مس ڈورتھی گوا کی تھی۔ یہ بات اس نے کب چھپائی تھی۔۔۔ وہ تو کئی بار کوریڈور میں کھڑے کھڑے زینب بائی اور رضیہ بیگم کے سامنے بتا چکی تھی کہ وہ جب چھوٹی سی تھی تو گوا سے اپنی ماں کے ساتھ بمبئی آئی تھی۔۔۔ اور بمبئی اسے بہت پسند تھا۔ بہت زیادہ۔۔۔

''ادھر ہم اسکول پڑھا، ادھر ہمارا مدر ایک بوہت بڑا سیٹھ کے بچوں کا گورنیس تھا''۔۔۔ اس بیان پر ڈورتھی دیوار سے ٹک جایا کرتی اور اس کی آنکھیں دور دیکھتیں۔

''گورنر تھی۔۔۔ تمہاری ماں''، ایک بار رضیہ بیگم نے جل کر پوچھا۔

''گورنیس۔۔۔ مطلب بچوں کا دیکھ بھال کرنے والا۔ اس کو گورنیس بولتا انگلش میں''۔

ڈورتھی نے نرمی سے سمجھایا۔

"آیا سمجھو"۔ رضیہ بیگم نے قصہ مختصر کیا تو ڈورتھی اپنے جاپانی کھڑاؤں پر کھٹ کھٹ ذوق اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔۔۔ اس کے پیچھے زینب بائی اپنے بچے کو گود میں اٹھائے پہنچ گئیں تھیں کیونکہ اس وقت مس ڈورتھی ان کے بچے کو ٹافی کا پیکٹ دینے کے بعد ہی تو اپنے بچپن اور اپنی ماں کا ذکر کرنے لگی تھی۔۔۔

اس دن وہ کتنی دیر تک زینب بائی کو اپنے بارے میں بتاتی رہی تھی۔

"ادھر بمبئی میں ہمارا کتنا کام تھا۔ ادھر ہم بال روم ڈانسنگ سیکھا۔۔۔ ڈانسنگ اسکول کا مالک ہم کو دوسرا چھوکرا لوگ کا پارٹنر بننے کا کتنا بہت روپیہ روز کا دیتا تھا پر ہم کو روپیہ کا لوز نہیں، ہم کو ناچ کا شوق تھا۔ ادھر سب ہم کو بولتا تم لوریٹا ینگ کی مافق ہے، تم کو فلم میں کام کرنا مانگتا۔۔۔ مگر ادھر کا فلم والا ہمارا بیوٹی کو نہیں سمجھا۔ فیر ہم کو لوگ بولا تم ہالی وڈ جانا مانگتا۔ پن ہمارے کو اتنا کرایہ نہیں جڑا۔۔۔ فیر ادھر بمبئی میں ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا، بڑا حرامی سب کا قرض کھا گیا۔ ہم سے بھی قرض لیا۔ ہم مانگا تو بولا، ہمارے سنگ پاکستان چلیں گا تو ادھر کام دیں گا۔ ادھر ڈائریکٹر بھی مانگتا اور ہیروئین بھی۔۔۔ فیر (پھر) ہم ادھر کراچی آ گیا۔ ادھر کا فلم والا بھی ہماری بیوٹی کو نہیں سمجھا۔۔۔ تم لوریٹا ینگ کو دیکھا ہے بائی "گارڈن آف اللہ" والی؟" وہ اپنی داستان کہتے کہتے زینب سے پوچھنے لگی۔ مگر زینب بائی نے کبھی کوئی انگریزی فلم نہیں دیکھی تھی۔۔۔ وہ مایوس ہو گئی، وہ اکثر مایوس ہو جایا کرتی تھی۔۔۔

"ادھر کا چھوکرا لوگ بھی لوریٹا ینگ کو نہیں دیکھا"۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ اور پھر اپنے سنہرے بالوں میں سے پنیں کھول دیں۔ ایک دم اس کے سانولے چہرے کے گرد سنہرے ریشمی بال دھوپ میں گرتے ہوئے آبشار کی طرح پھیل گئے۔۔۔

مگر مسٹر ڈگلس نے لوریٹا ینگ کی فلمیں دیکھیں تھیں اور بمبئی میں ڈورتھی پریرا کو بھی دیکھا تھا۔ نمبر ون پاپولر ڈانسر تھی اس کی ماں سیٹھ کے بچوں کو رکھتی اور یہ اسکول میں پڑھتی۔ پھر ایک دن اس کی ماں سیٹھ کے مکان میں بہت چیخی کہ سیٹھ نے میری بچی کو اپنے کمرے میں رکھ لیا ہے۔۔۔ میں نے اسکی ماں کو بہت سمجھایا چپ رہو۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔۔۔ اور ڈورتھی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔۔۔ میں ان دنوں سیٹھ کے ایک بیٹے کو وائلن سکھاتا تھا۔۔۔ چھوٹی سی گڑیا سی لڑکی تھی۔۔۔ اب نکل سے بولتی بھی نہیں۔۔۔ پرچے لکھتی ہے۔۔۔ مسٹر ڈگلس اپنے مر جانے والے عزیزوں کی تصویروں کے درمیان بیٹھا ڈورتھی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پرزوں کو دیکھ کر تنہائی میں بڑبڑایا کرتا۔۔۔ اس کی ایک بیٹی لکھنؤ میں تھی اور اس نے کسی سکھ سے شادی کر رکھی تھی۔

"میں اگر لکھنؤ میں ہوتا تو ایسا ہو سکتا تھا"؟ مسٹر ڈگلس "فینسی شومیکرز" کے مالک حنیف سے بات کرتے ہوئے کہا کرتا۔۔۔ "انسان کو اپنے مذہب میں ہی شادی کرنا چاہیے"۔

"بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔" حنیف نہایت یقین سے کہتا۔

"لیکن غیرمذہب والی سے عشق میں کیا ہرج ہے"۔۔۔ حنیف جی ہی جی میں اپنے آپ کو قائل کرتا۔۔۔ کیونکہ وہ اس دن سے ڈورتھی پریرا پر باقاعدہ مرنے لگا تھا جب سے ڈورتھی اس کی فیکٹری میں موٹر سے اتر کر اچانک آ گئی تھی۔۔۔ حنیف اور سارے کاریگر ڈورتھی کو دیکھ کر ایسے بوکھلائے تھے کہ صف بستہ کھڑے ہو گئے۔۔۔ ایک تو ڈورتھی، اس پر موٹر سے اتری ہوئی اور پھر وہ بول بھی رہی تھی۔۔۔

"دیکھو ہم ایسا مانگتا گولڈن سینڈل مانگتا۔ ادھر بازار میں کہیں ملیں گا"۔۔۔ ڈورتھی نے اپنے بٹوے سے مارلین منرو کی نیم برہنہ تصویر نکال اور ایک کاریگر کی طرف بڑھا دی۔۔۔ سینڈل منرو کے پاؤں میں تھی۔

"میں پروپرائٹر ہوں"۔۔ حنیف نے بمشکل آواز نکالی تھی اس کے بعد چند لمحے میں قیمت طے ہوئی اور ڈورتھی اپنی مخصوص مترنم کھٹ کھٹ کرتی رابعہ بائی بلڈنگ کا زینہ چڑھ گئی تھی۔۔۔ لیکن حنیف کی روح ڈورتھی کے ساتھ ساتھ کھنچی چلی گئی۔۔۔ حنیف نے کبھی تیسری منزل پر قدم نہیں رکھا تھا۔ حالانکہ دلی والے صاحب کئی بار کہہ چکے تھے کہ میاں دلی لکھنؤ کی لڑائی بند اب تو کراچی ہی سب کچھ ہے، کسی دن ہمارے ہاں آؤ تمہاری خالہ تمہاری بہت تعریف کرتی ہیں کہ بڑا شریف بچہ ہے کبھی کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا"۔ لیکن حنیف کو اپنے کام سے فرصت ہی کب ملتی، دوسرے رضیہ بیگم (تمہاری خالہ) اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ اتنی بار برقعہ الٹ الٹ کر اس سے اپنی بیٹی کی سینڈل بنانے کو کہہ چکی تھیں کہ اسے ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔۔۔ آخر وہ انہیں اتنی بار بتا چکا تھا کہ وہ پرائیویٹ آرڈر نہیں لیتا۔ اس کے بنے ہوئے جوتے لینا ہیں تو دکان سے جا کر لو۔۔۔ ہمیں کوئی موچی مقرر کیا ہے؟

مگر اس دن اس کا جی بے ساختہ چاہا تھا کہ رضیہ بیگم کے گھر ہی چلا جائے، آخر تو وہ گھر بھی تیسری منزل پر ہی ہے۔۔۔ تیسری منزل جہاں ڈورتھی پریرا رہتی ہے۔ جس کے گھر کی سجاوٹ اور صفائی کے بڑے چرچے تھے۔۔۔ جو موٹروں میں بیٹھ کر آتی جاتی تھی۔۔۔ موٹریں جو اس کی نہیں تھیں، بلکہ زینب بائی کی زبانی یہ روایت عام تھی کہ یہ موٹریں فلم کمپنیوں کی ہیں، جہاں ڈورتھی ہیروئنوں کو ناچ سکھانے جاتی ہے اور خود بھی فلموں میں ناچتی ہے۔۔۔ یہ کون سی فلمیں تھیں ان کا نام کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔ ایک بار حنیف نے کراچی کی ایک فلم کے گروپ

ڈانس میں ڈورتھی کی ذرا سی جھلک دیکھی تھی اور وہ اپنے ساتھ کے لڑکے کو بتانے ہی لگا تھا کہ وہ غائب ہو گئی۔۔۔

''سنا ہے یار ہزاروں لیتی ہے''۔۔۔ اس کے ساتھ کے لڑکے نے مرعوب ہو کر کہا تھا۔۔۔ ''ویسے اپنا یار کلو خان کہہ رہا تھا کہ ہوٹلوں میں لونڈوں کے ساتھ ناچتی ہے۔ اس کے بھی بڑے پیسے ملتے ہوں گے؟۔۔۔ کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ ناچنا تو بہانہ ہے کرتی ہے''۔۔۔ حنیف کا ساتھی لڑکا اطلاعات پہ اطلاعات بہم پہنچاتا رہا۔۔۔ اسے خبر نہ تھی کہ حنیف تو جانے کب سے ڈورتھی کا مداح تھا۔ اگر تیسری منزل پر دوسری منزل کے بابو صاحب کی بے عزتی کا قصہ نہ ہوتا تو حنیف کب کا اظہار عشق کر چکا ہوتا۔

''یار پتہ نہیں چلتا لوگوں کا۔۔۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ''۔۔۔ حنیف جب جوتے بنانے والے کاریگروں سے ڈورتھی کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں سنتا تو اکتا کر کہہ کرتا تھا۔۔۔ لیکن جب حنیف نے اپنے اصول کے خلاف مس ڈورتھی کے دیے ہوئے نمونے کی سینڈل خود بیٹھ کر بنانا شروع کر دی تو استاد کاریگر بندو معنی خیز ہلکی ہنس کر بولے تھے۔۔۔

''کیوں میاں کاٹنے میں سینڈل کا چارہ لگا رہئے ہو''۔۔۔

اور سچ مچ یہ سینڈل چارہ بن گئی۔۔۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ حنیف اس رات سنہری سینڈل کی کتربیونت میں پھنسا رہا اور میر کلو لکھوی کے تنور پر دیر سے پہنچا، کھانا ختم ہو چکا تھا صرف چنے کی دال گوشت کی ایک رکابی بچی پڑی تھی۔۔۔ وہ کھا کر اپنی شو فیکٹری میں بستر بچھا کر لیٹا تو مس ڈورتھی کی دی ہوئی ماڈرن منرو کی تصویر، سینڈل کا نمونہ ذہن میں اتارنے کو پکڑ لی۔ بس پھر اس نے اتنی رات گئے تک ڈورتھی کی پسندیدہ سینڈل دیکھی کہ وہ پوری ٹانگ ہی اسے ڈورتھی کی ٹانگ لگنے لگی۔۔۔ اس گڑبڑ میں ہاضمہ بگڑ گیا۔۔۔ صبح صبح اپنے گراؤنڈ فلور کے مشترکہ غسلخانے کی طرف بھاگا۔۔۔ غسلخانہ اندر سے بند پا کر دوسری منزل پر مشترکہ چیزوں کو گالیاں دیتا گیا۔ مسٹر ڈگلس اسے دیکھ کر باتیں کرنے کے موڈ میں آنے لگے تو وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا غسلخانے کی طرف چلا گیا مگر ایک فلش خراب تھا اور گندگی کے سمندر میں تیر رہا تھا اور دوسرا بند۔۔۔ تیسری منزل پہ ایسی کیفیت میں جانے کا تصور اس کے ذہن میں کیسے آ سکتا تھا مگر وہ بے سوچے سمجھے تیسری منزل پر تھا۔۔۔ جونہی اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ مارا۔۔۔ اندر سے چٹخنی کھلی اور باہر نکلتی ہوئی مس ڈورتھی پرپیا سے ٹکرا گیا۔۔۔ مس ڈورتھی کے منہ سے آدھی سلگی ہوئی سگریٹ اس کے جاپانی کمونو پر سے ہوتی زمین پر گری اور المونیم کا مگ دروازے سے ٹکرا کر بجا۔۔۔

"ہلو"۔۔۔ ڈورتھی کے منہ سے گھبرا کر نکلا لیکن وہ غسلخانے میں بند ہو گیا۔۔۔ غسلخانے کی عجیب سی بُو اور سگریٹ کا دھواں۔۔۔ "یہ مشترک چیزیں بھی خوب ہوتی ہیں" حنیف کے ذہن میں کوند سی ہوئی۔

اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ عجیب سی کیفیت میں پھنس پڑا۔۔۔ کچھ حیرت، کچھ مایوسی اور کچھ ہمدردی کی سی کیفیت۔۔۔

مس ڈورتھی کو اسے یہاں ملنا چاہیے تھا یا نہیں۔۔۔ یہ الگ بات ہے مگر حنیف ڈورتھی سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ یہ سرے فلم اور ناول والے ناحق ہیرو ہیروئن کو ملانے کے لئے سمندر، باغ اور موٹریں ڈھونڈتے ہیں۔ تب ڈورتھی اسے انگریزی میں گالیاں دینے لگی ہے

ہاں تو حنیف نے وعدے کے مطابق اس شام سینڈل تیار کروا دی۔ کتنی مدت کے بعد جانے کیوں وہ اس سینڈل کو ہاتھ نہ لگا سکا۔۔۔ اللہ جانے یہ محبوب لوگ قسمت نے ذہن میں کیا بن کر لکھتے ہیں کہ بعد میں صدمے پر صدمہ ہی اٹھانا پڑتا ہے۔

اگر اس شام حنیف سینڈل کا ڈبہ اٹھائے تیسری منزل پر نہ جاتا قصہ یہیں ختم ہو جاتا۔

حنیف پہنچا تو ڈورتھی کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔۔۔

نیلی روشنی میں ہر چیز نرم نرم اور خوابناک نظر آ رہی تھی۔ گلابی گرہ لگے پردے۔ نیلی دری، سرخ سوتی قالین،۔۔ کرسیاں اور کاغذی پھول۔۔۔ اور گدے دار کرسی میں دھنسا ہوا گدیلے جیسا ایک آدمی۔۔۔ حنیف کو ایک دم یاد آیا کہ نیچے ایک موٹر کھڑی ہے۔ اور اسے اپنے پاؤں میں پڑا ہوا جوتا پنجے دباتا محسوس ہونے لگا

دوسرے لمحے ڈورتھی گولڈن سینڈل پہنے یہ دیکھ رہی تھی کہ کاٹتی تو نہیں۔ اس وقت اس کے جسم پر سیاہ کاٹن کی ساری تھی۔ حنیف کو اس کے پنوں سے سمٹے ہوئے سنہری بال، سیدھی مانگ اور سانولے چہرے کے ساتھ عجیب سے لگے۔

"بیوٹی فل چوائس"۔ موٹا اسے خوبناک نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"کیا قیمت ہے"؟ پھر وہ حنیف سے مخاطب ہوا تھا۔

"کس کی"؟ حنیف نے طنزاً پوچھا۔

"چالیس روپے ڈیئر"۔۔۔ ڈورتھی نے اپنا بٹوا کھولتے ہوئے جواب دیا۔ اور موٹے نے دس دس کے پانچ نوٹ حنیف کی طرف بڑھا دیئے۔

"سب رکھ لو انعام ہے"۔۔۔ موٹے نے کہا اور حنیف کے پیروں تلے جیسے اسپرنگ آ گئے۔۔۔ وہ اچھلا اور اس نے موٹے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔۔۔ ڈورتھی نئی سینڈل کی ایڑیوں

پر توازن کھونے لگی۔۔۔

"کیا سمجھا ہے ہم تیرے نوکر ہیں بھڑوے۔۔۔"؟ حنیف چیخا۔۔۔ اور ساری خوابناک فضا بدل گئی۔ موٹا گردن نکال کر ہاتھ اٹھانے لگا۔

"آئی۔ ایم ویری سوری۔۔۔ مسٹر ۔۔۔ پلیز ۔۔۔ پلیز ۔۔۔" ڈورتھی دونوں کے بیچ میں آ گئی اور اس نے ایک دم حنیف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ دوسرے لمحے حنیف تیسری منزل سے اتر رہا تھا۔۔۔ جنک کے احساس سے تلملایا ہوا۔ اس نے فٹ پاتھ پر بکھری چمڑے کی رنگین کترنوں پر سے گزرتے ہوئے اس موٹر کو دیکھا جس میں بیٹھ کر ڈورتھی اس موٹے کے ساتھ جانے والی تھی۔۔۔ اس نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کالی موٹر پر ماری اور پھر آگے بڑھ کر مٹی پر گری ہوئی ...و پھونک مار کر اڑا دیا۔

"سالے نے ہمیں موچی سمجھا، ایسا ٹھونکتا کہ بیٹا کو چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ وہ اگر بیچ میں نا آ جاتی تو۔۔۔" حنیف ایرانی کے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے ونت کنکنا رہا تھا۔

"اماں حنیف تمہیں بے وقوف ہو، خواہ مخواہ نواب میرزا غن صاحب کی مثال سامنے رکھ کر یہ جوتے سازی شروع کر دی۔۔۔ بہت کہا کرتے تھے کہ موتی سوتی رہے گا اور اب سوتی جوتیوں میں ٹانک لو۔۔۔ یہاں کراچی میں تمہیں کوئی کیا جانے کہ باوا خاندانی تھے۔۔۔ میاں پڑھ لیتے تو بووا کی طرح دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہوتے۔۔۔ نویں پاس کر کے دسویں کرنے میں کون سے پہاڑ ڈھونا پڑتے"؟

لیکن جب حنیف رات کو کئی گھنٹے ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنی فیکٹری کو خواب گاہ بنانے لوٹا تو وہ اپنے آپ کو سمجھا چکا تھا۔۔۔" ہونہہ! بڑے بڑے لوگ آج کل قسم قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ وہ اپنے سیّد صاحب کھالوں کا کاروبار نہیں کرتے"؟ پھر اس نے باہر نکل کر اپنے کمرے پر لگا ہوا بورڈ پڑھا: "فینسی شومیکرز" اور اس سے اسے بہت تسلی ہوئی۔ شکر ہے کہ ملک میں ایک ایسی زبان موجود ہے جس میں برے سے برا مفہوم بھی کچھ بھلا لگنے لگتا ہے۔۔۔ اگر اس جگہ فصیح اردو میں لکھا ہوتا: "عمدہ جوتے بنانے والے موچی" تو جی پر کیا گزرتی۔۔۔؟

تب اس نے لات مار کر اپنا لپٹا ہوا بستر کھسکایا اور اس پر ایسے تکلف سے بیٹھ گیا جیسے کسی ڈرائنگ روم کے صوفے پر ٹکا ہو۔

"پروپرائٹر فینسی شومیکرز" اس نے زیر لب دہرایا اور دیوار کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے ڈورتھی اسکے سامنے ہو۔ آپ کی تعریف"؟

"مس ڈورتھی مگ وائی"۔۔۔ اس کے ذہن میں ایک دم ابھرا اور وہ متکبرانہ انداز سے ہنس کر

اپنے جوتے اتارنے لگا۔۔۔ اور پھر کپڑے۔۔۔ وہ اس وقت اتنا پر اعتماد تھا کہ ڈورتھی سچ مچ اس کے سامنے ہوتی تو وہ ذرا نہ کانپتا۔۔۔

لیکن ڈورتھی اس وقت آئی جب حنیف سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کی بیوی اور ماں آ گئی ہیں۔۔۔ کراچی میں اسے بغیر پگڑی دیئے اپنے کارخانے کے قریب ہی ایک کمرہ مل گیا ہے۔۔۔ بیوی اور ماں جو لکھنؤ سے آ کر ابھی تک اس کے ماموں کے ہاں راولپنڈی میں پڑی کراچی پہنچنے کے لئے دن گن رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی پاس بیٹھی ہے، وہ چومنا چاہتا ہے تو شرما کر سر ادھر ادھر کر لیتی ہے۔۔۔ ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔ تب اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بدستور روشنی تھی اور ڈورتھی اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلا رہی تھی۔ ہم دیر سے ٹائم (پورے وقت) پریشان ہوا۔۔۔ آئی ایم ویری ساری۔۔۔ وہ تمہارا انسلٹ کیا۔ ہم کو بہت دکھ ہوا تم اپنے چالیس روپیہ فلیٹ میں چھوڑ آیا تھا۔۔۔ یہ لو مسٹر۔۔۔ ڈورتھی انگلش ہندی جانے اور کیا کیا کہے جا رہی تھی۔ اس کے سنہرے بال پنوں کی قید سے کہیں کہیں آزاد ہو کر لیٹے ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔ ہونٹ خشک اور آنکھوں میں نیند کے ساتھ ہمدردی کی آنچ آتی ہوئی۔۔۔ حنیف کو لگا کہ ابھی تک وہ خواب دیکھ رہا ہے۔۔۔

"تم اب ناراض نہیں ہوئیگا۔ ہمارے کو لوگ کا دل ہرٹ کرنا (دکھانا) نہیں مانگتا۔ ام ادھر کسی کا روم میں کبھی نہیں گیا پن ہم سوچا ادھر ضرور آئے گا۔ کسی کو مت بولنا۔۔۔ ہم کسی کا انسلٹ نہیں مانگتا اس کا واسطے ہم ادھر کو سوری بولنے آیا۔۔۔ اپنا پیسہ لو"۔۔۔

اور جانے کیسے حنیف کا چکراتا ہوا سر گھٹنے پر آ گیا۔۔ ایک بار پھر اسے اپنی بے عزتی کا واقعہ جیسے تازہ لگا۔۔۔ یا پھر جانے کیا بات تھی۔ وہ رونا چاہتا تھا رو پڑا۔ ڈورتھی تڑپ کر اس کے قریب آ گئی۔۔۔ اس نے جھک کر اس کے گال پر بوسہ دیا۔۔۔ "نہیں روئیگا۔۔۔ نہیں۔۔۔" ڈورتھی بول رہی تھی۔

مگر حنیف کے اندر دھم سے لاوا پھٹ پڑا۔۔۔ ڈورتھی اس کے کمرے میں تھی نہ اس لئے پولیس کو بلانے کی دھمکی نہ دے سکی۔۔۔

"آئی لو یو۔۔۔ مس ڈورتھی، آئی لو یو" حنیف کے منہ سے جدوجہد کرتی ہوئی ڈورتھی کو لپٹانے کی کوشش میں انگریزی کا یہ فقرہ بار بار ٹپک پڑتا۔

آخر ڈورتھی نے ہار کر جیسے خودحفاظتی کے لئے چاقو کا پھل چمکایا۔

"تب تم چالیس سینڈل کا چھوڑینگا اور دس اور دیں گا"۔

رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں کو اس رات کے سودے کی خبر نہ ہوئی تو کیا ہوا۔۔۔ بعد میں

جو سودے ہوئے ان کا تو رضیہ بیگم کو رتی رتی علم تھا۔ ڈورتھی کے پیروں میں جو روز نئے نئے سینڈل ہوتے وہ کہیں چھت سے تو نہ گرتے، ظاہر ہے کہ نیچے سے آتے۔۔۔ اور وہ جو روز صبح ڈورتھی کا چھوکرا سلیقے سے لگی ہوئی چائے کی ٹرے لے کر نیچے جاتا اور نیچے سے توس چپاتی کی ٹرے لاتا، وہ محض کاروبار نہ تھا۔

رضیہ بیگم بینہ ٹھونک کر کہتیں: "ایسی عورتیں مرد سے چائے بنوا کر پیتی ہیں۔۔۔ اب بھی جب وہ مرد کو چائے بنا کر بھیجنے لگیں تو سمجھ لو کمبخت کی جان کو چمٹی"۔۔۔

رضیہ بیگم کی یہ تھیوری کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔۔۔ بے شک حنیف کئی بار تیسری منزل پر ڈورتھی کے ہاں آیا تھا۔۔۔ مگر بیٹھا کھلے دروازے کے سامنے۔۔۔ رضیہ بیگم منہ پر دوپٹے کی آڑ کئے کئی بار ایسے موقع پر غسلخانے جانے کے بہانے ادھر جھانکیں۔۔۔ لیکن کسی قابل اعتراض اقدام سے محروم رہیں۔۔۔ پھر بھی انہیں یہ غم تھا کہ حنیف جیسا بھلا آدمی خراب ہو کر رہے گا۔۔۔ اور دیکھنے والے دیکھتے کہ حنیف کے خراب ہونے میں کسر بھی کیا رہ گئی تھی۔ یا تو تمام دن اپنے کاریگروں میں گھرا آپ بھی رنگین چمڑے کی پتلی پتلی چٹیں مشین پر سیا کرتا یا چلتے پھرتے انہیں چٹوں کی چوٹیاں سی گوندھتا رہتا۔ اب استاد بندو کاریگر رجب بائی بلڈنگ کے ہر مکین سے حنیف کے کاروباری مستقبل کی تباہی کی پیشین گوئی کرتے رہتے۔۔۔ واقعی وہ تو یکسر بدل گیا تھا۔ جیسے ڈورتھی اسے چائے میں کیا الو کی دم گھوٹ کر بھیجتی تھی۔۔۔ جب دیکھو جب تیسری منزل پر دھادھم چڑھتا، سوٹ ڈالے ہاتھ میں ٹائی پکڑے چلا آ رہا ہے۔ ڈورتھی اسے روز ٹائی باندھنا سکھاتی لیکن وہ روز بھول جاتا اور پھر ڈورتھی سے بندھواتا۔۔۔ وہ دونوں کبھی کبھی رکشا میں بیٹھ کر باہر بھی جانے لگے۔ مگر ڈورتھی رات کو تو اکثر اکیلی ہی فلم کمپنی کو جاتی۔۔۔ ایسی صبح حنیف ڈورتھی کی بھیجی ہوئی چائے واپس کر دیتا۔

"فلم کمپنی کو تو جانا ہی مانگتا۔۔۔ حنیف بہت گلتی (غلطی) کرتا۔ تم بولو بائی ہم ناچ گا نہیں تو مر جائیں گا۔۔۔ تم جانتا بائی ہم کو ناچ کا بہت شوق ہیگا"۔۔۔ ڈورتھی چائے واپس آنے پر اداس ہو کر زینب بائی سے شکایت کرتی۔ اور پھر کوٹھے بند کر کے اپنی صبح صبح کی مشق شروع کر دیتی۔۔۔ اس کا دیوانوں کی طرح مست ہو کر ناچنا زینب بائی تک کو بھلا لگتا۔۔۔ اس پر سے دوسری منزل کے مسٹر ڈگلس کا وائلن جیسے پکارنے لگتا۔ ڈورتھی ناچ رہی ہے۔۔۔ ڈورتھی ناچ رہی ہے۔۔۔ اس اطلاع پر حنیف کے گلے شکوے مٹ جاتے اور زینب بائی دیکھتیں کہ حنیف دروازے میں کھڑا ڈورتھی کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے اس پر مسمریزم کیا گیا ہو۔

ڈورتھی جب حنیف کے ساتھ گھر سے نکلتی تو اس کی ساری کے ساتھ ہم رنگ سینڈل

ہوتی۔ وہ مترنم سے کھٹ کھٹ کرتی زینہ اتر جاتی۔۔۔ تو تیسری منزل کی عورتیں اپنے کمروں سے جھانکنے لگتیں۔۔ ایک دن رضیہ بیگم کی بیٹی نے زینب بائی کی موجودگی میں بڑے چاؤ سے کہا۔ ''اے اماں جان ڈورتھی جیسی سرخ سینڈل ہمیں بھی بنوا دو۔۔۔ ہم کہیں جا کر حنیف بھائی سے؟''

اس پر رضیہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔۔۔ ''لو بھئی، اب ہماری لڑکیاں اس کی ریس کریں گی۔۔ اور یہ حنیف، خدا کی مار ہو اس پر، شریفوں سے تو یوں بھاگتا ہے جیسے کاٹ لیں گے۔۔۔ میری بچی کی سینڈل نہ بنا کر دی کبھی۔۔۔ اور اس حرافہ کے لئے روز بغل میں دبائے حاضر''۔

یہ پہلا موقع تھا کہ رضیہ بیگم چیخی چلائیں نہیں، بلکہ انہوں نے بڑے تدبر سے پوری رابعہ بائی بلڈنگ کے بال بچے دار لوگوں کو خطرے سے آگاہ کیا۔۔۔

''ڈائن بھی اپنا پڑوس چھوڑ کر کھاتی ہے''۔۔۔ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہی تھی۔

دوسرے دن وہ وفد بن گیا جس نے رابعہ بائی بلڈنگ کی مالک حلیمہ بائی سے شکایت کی اور حلیمہ بائی کے کارندے کو تحقیق کے لئے تیسری منزل پر آنا پڑا۔

ڈورتھی کا نیلے پینٹ اور چمکتے ہوئے ہینڈل والا دروازہ بند تھا۔۔۔ زینب بائی کو خوشی ہوئی کہ اس وقت ڈورتھی گھر پر ہی ہے۔ وہ سانس روکے اپنے دروازے پر کھڑی تھیں۔۔۔ اور رضیہ بیگم اپنے میاں کے پیچھے ڈوپٹہ منہ پر ڈالے لیکن سینہ کھولے کھڑی سوچ رہی تھیں۔ ''دیکھیں سب باتوں پر ''نہ'' کر دے مگر حنیف کے قصے پر کیسے مکرتی ہے''؟

دوسری منزل پر وائلن بج رہا تھا اور تیسری منزل کے بند کمرے میں ایڑیوں کی کھٹ کھٹ ہو رہی تھی۔ کچھ دنوں سے ڈورتھی ہسپانوی خانہ بدوش ناچ کی دلدادہ ہو گئی تھی۔

حلیمہ بائی کا کارندہ اپنے بید سے کوریڈور میں تال دیتا رہا۔ اس کے پیچھے بلڈنگ کے بیشتر مکین مرد صف بستہ تھے۔۔۔ وائلن بند ہو گیا۔۔۔ کھٹ کھٹ ہوتی رہی، پھر کارندے نے اپنے بید کی مٹھ سے دروازہ کھول دیا۔

زینب بائی کا دل دھڑکتے دھڑکتے رک گیا۔ ڈورتھی بند دروازے کے پیچھے آج اکیلی نہیں تھی۔

وہ حنیف کی گردن میں بانہیں ڈالے ابھی تک ایڑیاں بجا رہی تھی۔۔۔ جیسے ذبح کی ہوئی مرغی پھڑک رہی ہو۔

''دیکھا۔۔۔ دیکھا یہ رنڈی خانہ بنا رکھا ہے''۔۔۔ دلی والے صاحب سب سے پہلے بولے۔

''باہر نکالو اس رنڈی کو''۔۔۔ دوسری منزل کے بابو صاحب آگے بڑھ کر چیخے۔ ڈورتھی

اچھل کر الگ ہو گئی پھر وہ چھوٹی سی گھگھری اور پیٹ کھلے بلاؤز میں سینہ تان کر باہر آ گئی۔

"تم ہمارا ڈور کیوں کھولا اپن بھائی"؟۔۔۔ بلڈنگ کے لوگوں نے پہلی بار ڈورتھی کی اونچی آواز سنی وہ کارندے سے مخاطب تھی۔ ۔ "تم خود بند کرینگا ہمارا دروزہ۔۔۔ بند کرو ہم بولا بند کرو"۔۔۔ ڈورتھی چیخی۔۔۔

"ہاں تا کہ تم یہاں مزے کرو"۔۔۔ دلی والے صاحب دانت پیس کر آگے بڑھے۔

"تم بھی اپنے گھر میں مزا کرنا مانگتا موہی صاحب"۔۔۔ ڈورتھی چیخی۔ "یہ ہمارا گھر ہے ہم اس کا کرایہ دیتا ہے"۔

"بڑی آئی ہمارے منہ لگنے والی۔۔۔ کیسی رنڈی حرافہ شریفوں کے محلے میں"۔۔۔ رضیہ بیگم چپتے میاں کی بے عزتی برداشت نہ کر سکیں اور بیچ میں کود پڑیں۔

اس کے بعد وہ ہوا جو نہیں ہونا تھا۔۔۔ ڈورتھی نے شریفوں کے اس محلے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اسے انگریزی اور ہندی اردو میں جتنی گالیاں آتی تھیں وہ سب بک ڈالیں۔۔۔ اس نے الزام لگایا کہ رضیہ بیگم خود حنیف کو پھانسنے کی فکر میں تھی۔۔۔ نتیجہ عورتوں کی مارپیٹ کی صورت میں نکلا۔

"ہاں ہم حنیف پر مرتا۔ وہ ہم پر مرتا، ہم اپنا جان بھی اس کو دیں گا"۔۔۔ ڈورتھی رضیہ خانم سے پٹتے اور پیٹتے ہوئے رو رو کر کہہ رہی تھی۔۔۔

تب ایک دم حنیف کے پتھر جیسے جسم میں جنبش ہوئی۔۔۔ وہ کوریڈور میں آ گیا اور بگی بکی ڈورتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خبردار جو کسی نے اب میری عورت کی طرف آنکھ اٹھائی۔۔۔ حنیف آنکھیں نکال کر گمبھیر آواز میں بولا۔

"مگر یہ تمہاری عورت نہیں"۔۔۔ بابو صاحب پیچھے ہٹتے ہوئے کہہ گئے۔

سی وقت نیچے سے حنیف کے سارے کاریگر بھرّا مار کر اوپر پہنچ گئے۔۔۔ اب حنیف اور اکڑ گیا۔۔۔

"یہ میری عورت نہیں؟ اچھا"۔۔۔ حنیف کا منہ لال ہو گیا۔ پھر اس نے بندو خان کاریگر کو دیکھا۔۔۔ "ارے بھائی بندو خان نیچے کسی کو دوڑانا تو ذرا لڈو لے آئے۔۔۔ آیئے مولانا دلی لکھنؤ کا جھگڑا تو وہیں رہ گیا۔۔۔ اب ہم کراچی میں ہیں۔۔۔ دو بول پڑھا دیجئے، اللہ آپ کی مشکلیں آسان کرے گا"۔۔۔

یہ کہہ کر اس نے ڈورتھی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور ہلکا سا دھکا دے کر اسے کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

حلیمہ بائی کے پاس کارندہ گیا تو نکاح کے لئے دے کر۔ حلیمہ بائی کو سارے قصے سے صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ ڈورتھی آئندہ بھی ان کی کرایہ دار رہے گی۔

مگر رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں کی ساری دلچسپی جوں کی توں تھی

استاد بندو کارگر حنیف کے کاروباری مستقبل کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فکرمند رہتے۔۔۔ وہ کہا کرتے: "دیکھ لینا میاں، ایک دن جو خود بیٹھ کر سب رہا ہے تو بدھیا بیٹھی نظر آوے گی۔ میاں جوتا سازی تو جبھی ہووے ہے کہ مالک سر پہ بیٹھا ہو۔۔۔ میں کام کر رہا ہوں تو کاریگروں کے ہاتھوں پہ نظر بھی رکھ رہا ہوں"۔ مگر حنیف پاجامہ پہنے چپلیں گھسیٹتا تیسری منزل پر چلا جاتا اور ڈورتھی کو قورمہ، کباب پکانے کی صحیح ترکیب بتاتا۔ ڈورتھی یوں تو بڑی ذہین تھی لیکن مرچ مصالحے کا صحیح توازن قائم رکھنا بھی کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ روز کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ ہاں جب دیکھو تو ایپرن باندھے انگیٹھی کے سامنے کھڑی جھپا جھپ چپاتیاں اتارتی تو حنیف کو اپنی بیوی کے ہاتھوں کی چپاتیاں یاد آ جاتیں۔ بیوی جو کراچی آنے کے لئے بے تاب تھی اور ہر دوسرے تیسرے دن اس کی اماں کی طرف سے خط لکھوا دیا کرتی تھی اور یہ خط حنیف کی جیب سے ڈورتھی کے اسپرنگ والے پلنگ پر گر جاتے تو وہ انہیں اٹھا کر رضیہ بیگم کے پاس لے جاتی۔ ہر خط میں ایک سی بات پڑھوا کر سننے کے بعد وہ اکتا سی جاتی لیکن ایک ہلکی سی ہمدردی کرنے سے رضیہ بیگم نہ اکتاتیں۔

"ہائے بے چاری کو کتنی دور ڈال رکھا ہے حنیف نے، پھر تمہارا دل کیا کہتا ہو گا؟ ہمیں پہلے معلوم ہوتا کہ حنیف بال بچے دار ہے تو"۔۔۔

"اوہ! فیر کیا سب چلتا"۔۔۔ ڈورتھی شانے اچکا کر کہتی اور کمونو کے اندر جلدی جلدی میں چھڑکا ہوا ٹیلکم پاؤڈر ہاتھ ڈال کر سینے پر ملنے لگتی۔۔۔ "وہ بولتا ہمارے کو اکھا جان سے پیار کرتا۔۔۔ جب سے وہ ہمارے کو دیکھا۔۔۔ کیا ہوے سکتا؟۔۔ پن دیکھو ادھر کراچی میں پگڑی بنا روم نہیں ملتا۔۔۔ ادھر بمبئی میں بھی پگڑی چلتا تھا۔۔۔ ہم ادھر تین روم کا فلیٹ واسطے تین ہزار پگڑی دیا تھا"۔۔۔ ڈورتھی کی نظریں کہتیں جیسے وہ بھی بمبئی سے ہو کر آئی ہے۔۔۔پھر وہ ایک دم اپنی جاپانی کھڑاؤں پر ڈولتی اپنے فلیٹ میں غائب ہو جاتی۔۔۔ اور جب رضیہ بیگم اس امید پر غسلخانے کا چکر لگاتیں کہ دیکھیں سوکن کے سلسلے میں وہ حنیف کی خبر کس طرح لے رہی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ڈورتھی برش لئے دری پر سے حنیف کے جوتوں کا نشان جھاڑ رہی

ہے--- جانے اب حنیف باوجود اسکی ہدایت کے جوتے موزے کی چٹائی پر رگڑنا کیوں بھول جاتا ہے؟ ڈورتھی بڑے پیار سے زینب بائی سے شکایت کر چکی تھی۔

حنیف کا کیا؟ سب دیکھتے کہ حنیف تو ڈورتھی کے قبضے میں آ کر عقل ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ کاریگروں کو استاد بندو کے سپرد کر کے آرام سے کام نمٹانے کے لئے چمڑے کی لمبی لمبی رنگین اور روپہلی سنہری چٹوں کا گچھا لئے اوپر آتا--- مشین تو بہت پہلے سے اوپر ہی رکھی ہوئی تھی۔ وہ چرا مشین پر ڈال کر دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا اور آواز لگاتا

''ڈارلنگ جلدی کھانا دو آج بہت کام کرنا ہے''--- ڈورتھی دوسرے کمرے میں جلدی سے ایپرن کھول کر دوبارہ ٹیلکم پاؤڈر کمر کے اندر چھڑکتی--- چہرے پر پف مارتی اور آ کر مصنوعی غصے سے چلاتی ..

''تم ندو ... فتی زمین پر بیٹھیں گا تو ہم کھانا نہیں دیتے مانگتا''--- وہ منہ بنائے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی--- اندر جو دوسرے کمرے میں اس نے ننھی سی میز سجا رکھی تھی۔ اسے بیکار کیسے چھوڑ دیتی۔

''اوہ بھول گیا تھا میم صاحب--- بھول گیا تھا''--- حنیف اسے چومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا اور کھانے پر ٹوٹ پڑتا... اس کے بعد ''بہت سا کام'' بھول کر ڈورتھی کے پلنگ پر ایسا سوتا کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی کہ ڈورتھی کب اٹھ گئی۔ کب اس نے حنیف کے جھوٹھے برتن دھوئے اور کب اس کے ملے دلے سوٹ پر استری کی--- کب جوتے پر پالش کی؟

''ام بولتا کیسا سلی (بیوقوف) ہے حنیف''--- وہ میلا جوتا اٹھاتے ہوئے ہمیشہ بڑبڑاتی--- ''لوگ بولے گا آپ جوتا فیکٹری کا پروپرائٹر اور اتنا ڈرٹی (گندہ) شو پہنتا--- شام کو کدھر پکچر یا ہوٹل جانے کے ٹائم اسی مافق پہن لیں گا''---

ڈورتھی کو شام اس کے ساتھ باہر جانے کا خطرہ ہر روز ستاتا--- مگر حنیف یہ بھی بھول جاتا۔

''ہمارے کو دیکھ کر سب کچھ بھولیں گا۔ بلی! اپنا بزنس تو کرنا ہی مانگتا''--- ڈورتھی مشین کے پاس چمڑے کی چٹیں دیکھ کر اور بھی غصہ ہونے لگتی، پھر مشین پر جھک کر چمڑے کی چٹوں پر بخیہ کرنے لگتی---

مشین کی آوازیں کر کئی بار زینب بائی اس کے ہاں آئی تھیں--- ایسے موقع پر ڈورتھی ان کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھول دیتی---

''یہ حنیف ہمارے کو پا کر سب چھوڑ دیا، اکھا دن ادھر رہیں گا--- پھر بولتا بڑا باس

(نقصان) ہوتا۔۔۔ وہ اپنا حساب کتاب بھی نہیں کرنے کو مانگتا۔۔۔ ہم مال کا سپلائی کا بل دکان پہ جا کر نہ مانگے تو کاریگر لوگ کو شام میں پیسہ بھی نہیں میں گا۔۔ تم بولو بائی ایسا کیسا چلیں گا"؟۔۔۔ ڈورتھی مشین پہ جھکی مسلسل بولے جاتی اور اسکی سمجھ میں نہ آتا کہ زینب بائی کا بچہ کیوں ٹھٹکے جا رہا ہے۔ دراصل حنیف کے ساتھ رہ کر وہ خود بھی بھلکڑ ہو گئی تھی۔۔۔ خود ہی سویرے جب بید کی ٹوکری لٹکائے سبزی گوشت کے لئے کاریڈور میں سے کھٹ کھٹ کرتی گزرتی تو بچے سے کہہ جاتی "بے بی تمہارا واسطے ٹافی لائیں گا"۔ پھر جب وہ واپس آتی تو یہ وعدہ قطعی بھول جاتی۔۔۔

تم کسی کو مت بولیں گا ہم جانتا حنیف کا بزنس خراب ہو گیا"۔۔۔ وہ کتنی ہی بار زینب بائی کو بتا چکی تھی۔

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ فینسی شو فیکٹری میں کاریگروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور حنیف اپنے کرانی پڑوسی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ اگر وہ کمرہ چھوڑ دے تو وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ پگڑی دینے کو تیار ہے۔۔۔ آخر نئے کاریگروں کو بیٹھنے کی جگہ چاہیے تھی۔۔۔

اسی وجہ سے رضیہ بیگم اور ان کے میاں کا کہنا تھا کہ حنیف ڈورتھی کی کمائی بھی کھاتا ہے"۔۔۔ یہ نکاح تو پردہ ڈالنے کو تھا"۔۔۔ رضیہ بیگم چپکے سے کہا کرتیں۔

"بائی ہم کس طرح بولیں گا، ڈورتھی تو فلم کمپنی جانا بھی چھوڑ دیا شام کو"۔۔۔ زینب بائی پریشانی سے سر ہلاتیں۔

"اے چلو رہنے دو، دن کو جو بن ٹھن کر جایا کرتی ہے"؟۔۔۔ رضیہ بیگم کے پاس منطق موجود تھی۔

"او بی بی ہم کو پتہ ہے۔ حنیف کا بزنس بل لینے جاتا اور سبزی گوشت بھی تو بازار سے لاتا۔۔۔ چھوکرا بھی تو نکالا ہے ڈورتھی نے"۔۔۔ زینب بائی بتاتیں۔

"ہونہہ! سب بہانے ہیں بی۔۔۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو یہ روز روز ناچ کی کھٹ کھٹ نہ بند ہو جاتی اور نیچے اب بھی بڈھا کھٹ کھٹ کے ساتھ انگریزی سارنگی ٹوں ٹوں کرتا ہے"۔۔۔ رضیہ بیگم پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں جا کر پان منہ میں ٹھونس لیتیں۔ اور زینب بائی ایک بار پھر یہ بتانے کو بے چین رہتیں کہ ڈورتھی نے حنیف سے کہہ دیا ہے کہ ناچ تو اس کی زندگی ہے۔۔۔ وہ نہیں ناچے گی تو مر جائے گی۔۔۔ پھر حنیف کی بھی اس کے ہسپانوی ناچ پر جان جاتی ہے۔۔۔ ہاتھوں میں ننھی ننھی مجریاں، جسم پر ذرا سی جھالروں والی گھگھری اور چولی۔۔۔ زینب بائی نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ناچ کے وقت حنیف پاجامے کے بجائے سوٹ پہن کر بیٹھتا اور

ڈورتھی اس کے سامنے ناچتی۔

"ہمارے کو پاجامہ اچھا نہیں لگتا۔ پن حنیف پہنے کو مانگتا۔ ہم بولتا اکھا دن سوٹ پہنے گا تم"۔۔۔ ڈورتھی زینب بائی سے شکایت کرتی۔ اور پھر خود ہی کہنے لگتی۔ "حنیف کا بزنس ڈاؤن ہے۔۔۔ کام بہت کرتا، تھک جاتا۔۔۔ اس کر کے ہم اس کا بہت کھیل کرتا۔۔۔ بزنس اپھ ہوئینگا تو ہم منیجر رکھیں گا فیر ہم دونوں روز ایوننگ کو باہر جائیگا۔۔۔ ہوٹل، پکچر، کافشن"۔۔۔ ڈورتھی یہ سب کہتے کہتے اپنی کالی آنکھیں نیم وا کر لیتی۔۔۔ اس کے جبڑوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں تلے دبے ہوئے رخساروں کی ندی سی نمایاں ہو جاتی اور چوڑا دہانہ ذرا سا کھل جاتا جس میں سے سونے سے مڑھا ہوا دانت چمک اٹھتا۔

نکرانی نے اپنا کمرہ حنیف کو دے دیا۔ کاریگروں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔۔۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ڈورتھی کے کھانے کی ننھی سی میز پہنچ گئی۔ یہاں بیٹھ کر اب حنیف ناولیں پڑھتا جاتا اور کام کی نگرانی بھی کرتا جاتا۔ مال سپلائی کرنے کے جو آرڈرز آتے انہیں بھی لیتا۔۔۔ مگر اس موقع پر ڈورتھی کو دوڑنا پڑتا۔ جیسے ہی کوئی موٹر یا موٹر سائیکل رکشا نیچے رکتی ڈورتھی ہزار کام چھوڑ کر نیچے بھاگتی۔

دیکھا یار آئے ہیں پرانے۔۔۔ رضیہ بیگم ہانک لگاتیں۔۔۔ اور زینب بائی جواب دینا ضروری سمجھتیں۔ اب یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ ڈورتھی کی ان سے دوستی تھی اور وہ انہیں ہر بات بتاتی تھی "ڈورتھی نیچے مال مانگنے والے کے سامنے جا کر ایڈوانس کے واسطے انگریزی بولیں گا بائی۔۔۔ حنیف نہیں بولنے سکتا۔۔۔ ڈورتھی بتاتا، بغیر انگریزی لوگ ایڈوانس نہیں دیتا"۔۔۔ زینب بائی بتاتیں اور رضیہ بیگم کھڑکی سے نیچے جھانکتی ہوئی اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر اتنا ہنستیں کہ ان کے آنسو نکل آتے۔۔۔

دوسری منزل کے بہاری بابو صاحب اپنی بوہرہ پڑوسن کی قسم کھاکر بتا چکے تھے کہ حنیف نے پگڑی کے ڈیڑھ ہزار روپے اس کے بنک ہی سے نکلوا کر نکرانی کو دیئے اور بنک میں اکاؤنٹ ڈورتھی کے نام کا تھا۔۔۔

"اور اب دیکھو اسے چلاتا ہے۔۔۔ کیسا بے غیرت"

لیکن مسٹر ڈگلس ہمیشہ بوہرہ عورت سے کہتے۔ "دیکھ عیسائی وائف اپنے ہسبنڈ کی کتنی مدد کرتی ہے، اس نے حنیف کو کیا بنا دیا۔۔۔ پھر تم کو پتہ ہے وہ ہسپانوی ناچ کتنا اچھا ناچنے لگی ہے۔۔۔ وہ تو ہمیشہ سے ناچ کی دیوانی ہے۔۔۔ جب ذرا سی تھی سیٹھ کی لڑکیوں کو دیکھ کر منٹ بھر میں ناچ کی نقل کر لیتی تھی"۔۔۔ اور بوہرہ عورت بوڑھے ڈگلس کو یوں دیکھتی جیسے وہ پاگل

ہو۔ یہ پاگل پن کی بات نہ تھی تو اور کیا تھا کہ ڈورتھی کی کھٹ کھٹ کے سبب وہ ہمیشہ پیچھے ہو؟ پھر بھی اسے علم تھا کہ ڈورتھی کیسا ناچ کرتی ہے... پھر ایک دن رضیہ بیگم کے لکھے ہوئے خط کے جواب میں راولپنڈی سے حنیف کی بیوی، ماں اور دونوں بیٹیاں آ گئیں۔ روتی، پیٹتی وہ سیدھی تیسری منزل کے کاریڈور میں آ کر برقعے اٹھا کر بیٹھ گئیں۔

"ارے کیا کر ڈالا... ارے پردیس میں ڈال کر منہ پھیر لیا... ارے... نے میں رچا لیا"... حنیف کی بیوی نے سینے پر ہاتھ مار مار کر ایسے درد سے بین کئے کہ رضیہ بیگم، زینب بائی اور بلڈنگ کی دوسری عورتیں بھی اس کے گرد اکٹھا ہو کر رونے لگیں... حنیف کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا...وہ اب اتنی عورتوں کے سامنے اپنی بیوی کا منہ تھپڑوں سے تو بند کرنے سے رہا تھا... اس نے اسے گھسیٹ کر ڈورتھی کے فلیٹ میں ڈال دیا اور پھر آہستگی سے اپنی اماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا...

"اماں کیا کروں یہاں مکان نہیں ملتا، ورنہ آپ کو پہلے بلا لیتا"...

تب ڈورتھی سبزی گوشت کی ٹوکری اٹھائے تیسری منزل پر نمودار ہوئی۔ عورتیں اب تک کوریڈور میں جمع تھیں۔

"حنیف بھائی ڈورتھی آ گئی"... رضیہ بیگم نے منہ پر ڈوپٹہ ڈال کر باآواز بلند یوں اعلان کیا جیسے بھاگا ہوا بچہ پکڑ آیا ہو...

ڈورتھی اندر گئی... سب منتظر رہے... پر سب مایوس ہو گئے۔

ڈورتھی نے اپنا ایک کمرہ خالی کر دیا... بیچ میں سے دروازہ بند ہو گیا۔

"کیا ہونے سکتا، ادھر بنا پگڑی روم نہیں ملیں گا، اور حنیف کا بزنس ڈاؤن ہے"... کاریگر مزدوری بہت مانگتا، فیر دوپہر کا ٹائم کھانے کا چھٹی مانگتا... اکھا دو گھنٹہ کھانا کھاتا رہتا اور ادھر کو کام بند رہتا ہم استاد بندو کو بولا، یہ بات گڑبڑ کا ہے۔ وہ بولا کھانا تو مانگتا... ہم بولا سمجھو ادھر ہم کینٹین بناتا۔ دوپہر کا کھانا ہم دیں گا... کھانے کا پیسہ مزدوری میں کٹواؤ... سب بڑا فیکٹری میں کینٹین ہوتا... اب ادھر ایک روم ہے۔ پن ہم گزر کریں گا... فیر جب حنیف کا بزنس "لاس" نہیں کریں گا تو ہم پگڑی پر بڑا فلیٹ لیں گا"... ڈورتھی نے اپنے ڈرائنگ روم کو سمیٹ کر کونے میں کر دیا اور پردے کے پیچھے اسپرنگ والے پلنگ کے پاس تین جڑی میز پر بڑے سے دیگچے میں گوشت بگھار کر انگیٹھی دھونکنا شروع کر دی۔

"بہن یہ تمہارا سوکن... اس کو بولو کینٹین کا کام کرے"... زینب بائی نے چھیڑا۔

"نوہ! حنیف اس کو کبھی پسند نہیں کیا... وہ بولتا بہت سست عورت ہیں، پکھ حنیف کا

کھیال تمیں کیا کبھی"۔ ڈورتھی ہاتھ جھٹک کر مطمئن انداز سے بولی۔

شام کو بڑی دیر تک مسٹر ڈگلس انتظار کرتے رہے کہ وائلن چھیڑیں۔۔۔ پھر جب وہ مایوس ہو کر اپنا سفید کوٹ پہنے ایک سیٹھ کے ہاں ٹیوشن کے لئے جانے لگے تو ڈورتھی کے کمرے میں کھٹ کھٹ شروع ہو گئی۔۔۔ مسٹر ڈگلس اچھل کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے اور والس بجانے لگے۔ ونڈرفل! ونڈرفل!! وہ بڑبڑاتے رہے۔

ادھر حنیف کی ماں اس کھٹ کھٹ سے گھبرا کر رضیہ خانم کے پاس پہنچیں۔۔۔ اور جب انہیں پتہ چلا کہ اس کھٹ کھٹ کا مطلب کیا ہے تو انہوں نے رونا بین کرنا شروع کر دیا۔۔۔

"ارے حنیف کیا کرم کر رہا ہے"۔۔۔

حنیف ماں کو نہ سمجھا سکا، اور اسے ڈورتھی سے بات کرنا پڑی۔

"یہ مسٹر ڈگلس ہم بولا! حنیف ناچنا ہمارا لائف ہے۔۔۔ ہم ناچیں گا اور تم دیکھیں گا۔ اس کے بنا ہم مر جائیں گا"۔۔۔ فیر حنیف بولا ڈارلنگ تم ہمارا مدر کو نہیں جانتا۔۔۔ اس کر کے تم روز ناچ واسطے مسٹر ڈگلس کے گھر جانا مانگتا ہے آئی ڈانس ہیر؟ (کیا میں یہاں ناچ سکتی ہوں)" ڈورتھی بڑے پیار سے مسکرا کر جھکی۔

ڈورتھی نے ایک کونے میں جا کر گھگھری اور چولی پہنی اور کرسی پر بیٹھ کر حنیف کا انتظار کرنے لگی۔ پھر حنیف سوٹ پہنے ٹائی ہاتھ میں لئے مسٹر ڈگلس کے گھر آ گیا۔۔۔ اور ڈورتھی دیوانہ وار ناچتی رہی۔۔۔ ناچتی رہی۔۔۔

فیکٹری میں کام کی دیکھ بھال کے لئے منیجر آ گیا۔ یہ حنیف کا سالا تھا۔۔۔ ڈورتھی کو کینٹین چلانے اور سینڈلوں کے نئے ڈیزائن تیار کرنے سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ وہ آرڈر بک کرنے اور بل وصول کرنے جا سکتی۔ اس کام کے لئے حنیف کے سالے کی رائے سے ایک اینگلو پاکستانی لڑکی کو پارٹ ٹائم ملازم رکھ لیا گیا۔۔۔

پھر انہی دنوں رضیہ بیگم کی بیٹی سے حنیف کے سالے کی شادی کی بات پکی ہو گئی، ساتھ ہی حنیف کی والدہ کی رائے ہوئی کہ حنیف کی بڑی لڑکی ماشاء اللہ چودہ سال کی ہو گئی ہے اور ماحول اچھا نہیں اس لئے اسے بھی چلتا کیا جائے۔۔۔ رضیہ بیگم نے اس سلسلے میں مدد کی اور حنیف کی لڑکی کی بات بھی طے ہو گئی۔

کاروبار پھیلایا جائے تو نفع یوں بھی کم ہوتا ہے، اس پر سے یہ شادیاں آ پڑیں۔ حنیف کی لڑکی کا جہیز ایک مسئلہ بن گیا۔ ایک دن وہ بغل میں پوٹلی دبائے ڈورتھی کے کمرے میں آ کھڑی ہوئی۔ اور کافی دیر سوچنے کے بعد اسے وہ انگریزی لفظ یاد آیا جس سے اسے ڈورتھی کو

مخاطب کرتا تھا۔

"فیر ڈارلنگ! بے بی بولا"۔ "ممی دیکھ داری ہم کو شادی واسطے یہ کپڑا دیتا۔۔۔ ہم دیکھاڈارلنگ! ہم کو بہت شیم ہوا (شرم) تم کچھ کرتا مانگتا ڈارلنگ" ڈورتھی نے کی رات جہیز کے معاملے میں دخل دینا چاہا۔ مگر حنیف اٹھ گیا۔

"میں کیا کروں تم خود ہی تو بزنس پھیلوا رہی ہو۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتا"۔

"ایک بات بولیں گا ڈارلنگ، ہم گستہ تو نہیں کریگا۔۔۔ ہم تمہارا دیا ہوا چوڑوں ساری "بے بی" کو دے دیا۔۔۔ اور گولڈن سینڈل بھی"۔۔۔

اور حنیف نے غصہ کیا۔۔۔ ڈورتھی اسے پوچھتی رہی، وہ اپنے آپ کو چھڑا کر باہر چلا گیا۔۔۔ یہ اس کے رکنے کا وقت تھا کیونکہ ڈورتھی اس وقت ڈگلس کے ہاں جا کر ناچتی تھی۔۔۔

تب ڈورتھی دھم دھم کرتی کوریڈور سے گزری اور ڈگلس کے ہاں جا کر تا تا ناچی تا ناچی کہ بے دم ہو گئی۔

دونوں شادیاں ہو گئیں۔۔۔ کینٹین چلتی رہی۔۔۔ حنیف کی بیوی کو الٹیاں آنے کی بیماری ہو گئی اس لئے کینٹین کا کھانا ادھر بھی جانے لگا۔۔۔

اور پھر ایک رات بلی کی طرح ایک نوزائیدہ بچہ ڈورتھی کے دوسرے کمرے میں رویا۔۔۔

اسی دن حلیمہ بائی کا کارندہ ڈورتھی کے دروازے پر آیا کہ کچھ کرائے میں اضافہ کرو۔۔۔ ڈورتھی آج اپنے کمرے سے چولی گھگھری پہنے مجیریاں انگلیوں میں پہنے، بغیر کموتو کے باہر آ رہی تھی۔

کارندے کے منہ سے کرائے میں اضافہ کی بات سنکر وہ ایک دم ویسی ہی بن گئی جیسی پانچ سال پہلے اس وقت ہو گئی تھی، جب کارندہ حلیمہ بائی کی طرف سے اس کے خلاف بدکاری کی شکایت لے کر آیا تھا۔۔۔

"کیا بولا کرایہ بڑھائیں گے۔۔۔ ہاں ہمارا کھال کھینچ لو"۔۔۔ وہ سینہ ابھار کر کولھوں پر ہاتھ رکھے اس کی طرف بڑھی۔۔۔ کارندے کی آنکھیں مچ گئیں۔

"کرایہ بولتا۔۔۔ ہم بولتا بے ایمان ہمارا دس سال کا وہائٹ واشنگ اور پینٹ کا پیسہ واپس کریں گا۔۔۔ بھاگ جاؤ اپنا حلیمہ بائی کو بولو ہمارا پیسہ دیں۔۔۔ کیا ہمارے کو دیکھتا"؟۔۔۔ ڈورتھی نے برا سا منہ بنا کر اس کی آنکھوں کے سامنے مجیریاں بجائیں۔۔۔

اور کارندے کے منہ میں جو آیا وہ بکنے لگا۔۔۔ یہ اچھی باتیں نہ تھیں۔۔۔ رضیہ بیگم، زینب بائی اور حنیف کی ماں سب اپنے کمروں سے جھانکنے لگیں۔

اور ڈورتھی برابر سے گالیاں بکتی حنیف کو بلاتے اتری۔۔۔

مگر فیکٹری کی چابیاں لئے حنیف کا سالا اوپر آ رہا تھا اس نے بتایا حنیف مس میا ۔ ماتحہ آرڈر بک کرنے نکل گیا ہے۔

تب ڈورتھی مسٹر ڈگلس کے کمرے میں گالیاں بکتی گھسی۔

"یو سی مسٹر ڈگلس؟"۔۔۔

مسٹر ڈگلس ساری تفصیل سنتے ہوئے اپنا وائلن رومال سے صاف کرتے رہے۔۔۔ اور سر ہلاتے رہے۔

پھر مسٹر ڈگلس نے وائلن پر گز پھیرا۔۔۔ ڈورتھی کھڑے سے بیٹھ گئی۔ دھن بڑھی تو کرسی پر سر ڈال کر ٹانگیں پھیلا دیں۔۔۔

مسٹر ڈگلس نے دیکھا اس کی سوکھی ہوئی ٹانگوں پر ہڈی کی جھیکیں تھیں اور کوئلے کی کالک۔۔۔ ان کا گز اور تیز ہو گیا۔

ڈورتھی نے اپنی آنکھیں نیم وا کر لیں اور ہاتھ کرسی کے ہتھے سے گرا دیے۔ مسٹر ڈگلس نے دیکھا کہ اس کے پالش اڑے ناخنوں میں سوکھا ہوا آٹا بھرا ہوا تھا۔۔۔ اور پھر کہن سے مجیریاں فرش پر گر گئیں۔۔۔

"آئی ایم ٹائرڈ۔۔۔ آئی ایم ویری ٹائرڈ"۔۔۔ (میں تھک چکی ہوں) ڈورتھی بڑبڑائی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔۔۔ مسٹر ڈگلس نے وائلن بکس میں رکھ دیا اور کالی پٹی والا سفید کوٹ پہن کر ٹیوشن کے لئے چلے گئے۔۔۔ پر جانے آج ان کا سر بار بار اس طرح کیوں ہل رہا تھا جس طرح وہ اپنے کسی عزیز کی موت کی خبر پر ہلاتے تھے۔

رات بھر بلی کی طرح کوریڈور میں پھرتی رہی تھی کمبخت۔۔۔ نسبؔ بائی سے کہتی تھی کہ بچہ میں رکھوں گی۔ برقعے والی عورتیں بچے کو رکھنا نہیں جانتیں۔۔۔ بے نا ذات کی آیا؟۔۔۔ بچے کو اس سے بچا کر رکھنا اے بی اس کا کوئی چلن ٹھیک نہیں"۔۔۔ رضیہ بیگم حنیف کی ماں کو چپکے چپکے بتا رہی تھیں۔

تب حلیمہ بائی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے رابعہ بائی بلڈنگ پر ایک نظر ڈالی۔ رابعہ بائی بلڈنگ جو انہیں اپنی دادی کی طرح نظر آتی تھی، بوسیدہ زرد میلی۔۔۔ پھر انہوں نے آنکھیں پچکا کر ڈورتھی کے کمروں کو پہچاننے کی کوشش کی۔۔۔ نیلا رنگ اُڑ چکا تھا۔۔۔ شیشے ٹوٹے اور دھندلے۔۔۔

"اچھا تو ڈورتھی ایسا بولا"۔۔۔ انہوں نے مڑ کر اپنے کارندے کو دیکھا اور تھک کر

بولیں۔۔۔ ''امین بھائی اب اس بلڈنگ کو گرانا ہی پڑیں گا۔۔۔ ایک کرایہ دار بھی اچھا نہیں رہا۔۔۔ اب ادھر بڑا بڑا فلیٹ بنائیں گا۔۔۔ گورا لوگ جتنا کرایہ مانگو دیں گا۔۔۔

گھوڑے کا کرب

برچرن چاولہ

"تو تو گھوڑا ہے۔ تیرا کام تو دوڑنا اور بوجھا ڈھونا ہے۔" میرے دل نے سوچا۔

دور سامنے ان پہاڑیوں پر ہری بھری گھاس آنکھوں کو کتنی سہانی لگتی ہے۔ اس کی ہریالی دل آنکھوں کی راہ پیٹ میں بھوک جگا دیتی ہے۔ پیٹ تو یہاں کی سوکھی سڑی گھاس سے بھی بھر جاتا ہے۔ مگر کچھ اور قسم کی بھوک اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے۔

وہاں اگر میں پکڑا گیا تو یہی ہوگا نا کہ جو بھی میرا نیا مالک ہوگا مجھ پر بوجھ ڈھوئے گا یا کوئی چھکڑا' یکہ یا گاڑی کھچوائے گا۔ یہاں کونسا آرام ملتا ہے۔ روز ٹخوں ٹخوں تانگہ کھینچنا پڑتا ہے۔ اس مالک کو تو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ بھر بھر تک سواریوں سے لاد دیتا ہے اور گالیاں بھی میرے سر پر بے شمار لادتا رہتا ہے۔ سواری نہ ملے تو غصہ مجھ غریب پر۔ بیوی سے جھگڑا تو چھانٹا میری پیٹھ پر۔ ساتھی تانگے والوں سے تو تو میں میں تو سزا دار میں۔ کوئی ڈھنگ ہے جینے کا بھلا۔ یہ نہیں کہ میری سنوائی کہو۔ بس ہر وقت گالی گلوچ۔ ہائے دہائی۔ کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ پھر وقت بھی یہاں کوئی نہیں بندھا ہوا کام کا۔ ابھی آنکھ بھی پوری طرح نہیں کھلتی کہ لگام منہ میں اور بھر دونوں کمر پر۔ شہر سٹیشن' سٹیشن شہر۔ رات گئے تک ایک چکر سا بندھا رہتا ہے پاؤں میں۔ پھر نہ اتوار چھٹی نہ تہوار چھٹی۔

نئی جگہ شاید اچھی نہ ہو مگر اس سے بری کیا ہوگی۔ چل منا اسے بھی دیکھ۔

کتنی دور نکل آیا ہوں۔ آدھا رستہ تو آ چکا ہوں گا۔ وہ جو آنکھوں کو بہاتی تھی۔ وہ ہریالی جانے اور کتنی دور ہے۔ وہ جو نظروں کے قریب تھا قدموں سے کتنا دور ہوتا جا رہا ہے۔ کیا واپس چلوں یا آگے بڑھوں۔ یہاں تک مالک ڈھونڈنے پہنچے گا ہی۔ پھر تو وہ پٹائی ہوگی کہ بس خدا یاد آ جائے گا۔ کئی چھانٹے میری کمر پر توڑ دے گا ظالم۔ جتنا پیچھے جانا ہے اتنا آگے کیوں نہ بڑھوں۔ شام تک ضرور منزل مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔ بس ذرا رستے کے گھوڑا چوروں سے خود کو بچانا ہے۔

اف خدایا کتنا دور ہے وہ دیس۔ وہی جو سامنے نظر آتا ہے۔ جس کی طرف میں سرپٹ پانچ دن سے دوڑ رہا ہوں اور وہ سرپٹ میرے آگے آگے دوڑتا مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ خیر چل منا۔ اب تو نہ پیچھے جانے کا یارا ہے نہ رکنے کا چارا ہے۔

لے بھئی کچھ تو نزدیک پہنچے۔ واہ کیا خوبصورت ندیاں ہیں۔ پہاڑ ہیں۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ بس کوئی مناسب اور شریف سا مالک مل جائے تو باقی زندگی یہاں گزار دوں۔ یہ خوبصورت ہے۔ اب خواہ مخواہ بھاگتا چلوں۔ آگے اور آگے اس سے آگے اس سے خوبصورت بھلا اور کیا ہوگا

اس سے پہلے کہ کوئی شیر بھگیاڑ چیر پھاڑ ڈالے۔ چل منا۔ خود ہی خود کو کسی [illegible]۔

میرا نیا مالک تو ٹھیک آدمی ہے۔ بس ذرا ساتھی گھوڑے مختلف ہیں۔ [illegible] کرتے ہیں۔ اپنے ہاں تو کتے بھونکتے تھے یہاں تو بس ذرا سا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے [illegible] لیتے ہیں۔ شریف اتنے ہیں کہ بلیاں اور مرغیاں تک ان کے اوپر سے نکل جاتی ہیں تو اف تک نہیں کرتے۔ مرغے اپنے ہاں ککڑوں کوں کی آواز سے بانگ دیتے تھے تو سارا محلہ جاگ اٹھتا تھا۔ یہاں [illegible] بولتے ہیں جیسے کوئی ہلکا پھلکا راگ گا رہے ہیں۔ خیر جو بھی ہے ٹھیک ہے۔ میرا دل یہاں خوب لگ گیا ہے۔ مالک بھی اچھا ہے۔ بس کبھی کبھی ایک گاڑی مجھ سے کھچواتا ہے۔ سامان اس میں کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ پہیے اتنے ہلکے پھلکے ہیں کہ گاڑی کشتی کی طرح پانی پر تیرتی محسوس ہوتی ہے۔ شہر جاتا ہوں تو لوگ حیرانی اور خوشی سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ ذرا سی دلکی پکڑتا ہوں تو بڑے خوشی سے نعرے مارنے لگتے ہیں۔ بچے تالیاں بجاتے ہیں اور میرا مالک بڑی شان سے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ جیسے وہ کسی بہت بڑی کار کا اکیلا مالک ہو جو اب بازار میں نایاب ہے۔ یہ بوجھ بھی بس ذرا کھلے موسم میں ڈھونا پڑتا ہے۔ سردیوں میں تو بس اندر کھڑے رہنا ہوتا ہے۔ اور ساتھی گھوڑوں سے گپ شپ کرنی ہوتی ہے باہر برف میں نہ کھیتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ اس لیے لمبی چھٹی مل جاتی ہے۔ بس کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ بس ساتھی گھوڑوں کی زبان سمجھنی ذرا مشکل لگتی ہے۔ مگر میں بھی ایک گھاگ ہوں۔ ان کی ہر بات پر یوں مسکراتا ہوں جیسے مجھے سب کچھ سمجھ آتا ہو زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے تھوڑی سی اداکاری تو کرنی ہی پڑتی ہے

میرے پرانے مالک یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے مجھ پر اپنی ملکیت جتانے کی کوشش کی ہے۔ مگر میرے مالک نے پروں پانی تک نہیں پڑنے دیا۔ کہا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ تمہارا گھوڑا ہے۔ کوئی رسید ہے؟ وہ بھلا کیا رسید پیش کرتے۔ ان کی رسید تو میں اٹھا لایا ہوں۔ ایک نہیں کئی۔ میری پیٹھ پر ان کی مار کے نشان۔ کئی تو مندمل ہو گئے ہیں مگر کچھ ابھی باقی ہیں مگر ڈرتا ہوں کہیں میری رسید خود میری مصیبت کا کارن نہ بن جائے۔ چھوڑ یار۔ تجھے کیا پڑی ہے۔ مست رہ۔

میرے پرانے مالکوں نے بھی میرے نئے مالک کے ہاں مال ڈھونے کا کام شروع کر دیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ وہ بھی اب میری طرح گھوڑے ہی بن گئے ہیں۔ بوجھا ڈھوتے ہیں اور چابک کے لہراتے ہوئے آنکھ کے چھنٹے سے ڈرتے ڈھینچوں ڈھینچوں بھاگتے رہتے ہیں میرا کیا ہے میں تو گھوڑا ہوں مگر انھیں بوجھ ڈھوتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے ارے بھئی تکلیف ہوتی ہے تو چھوڑ دو اور واپس جاؤ میرے جیسے گھوڑوں کی روزی کیوں کھوٹی کرتے ہو۔

میرے کچھ گھوڑے بھائی اور بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی میری طرح گھوڑے ہی لگتے ہیں۔ مگر کہتے سب یہی ہیں کہ وہ وہاں کسی راجہ یا نواب کی سواری میں تھے۔ پانچ کو میرے مالک نے اپنے ہاں پناہ دے دی ہے۔ کچھ آس پاس کے گھروں اور کسانوں کے ہاں تک گئے ہیں۔ کبھی کبھی کھیتوں اور پہاڑوں پہ چرنے نکلتے ہوں تو ان سے دعا سلام ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے سب ہی یہاں خوش ہیں۔ اللہ شالا ہمارا یہ سلسلہ روز بار قائم رکھیو اور ہمیں نظر بد سے بچائیو۔

اب آپ سے کیا چھپانا شروع میں یہاں کا کام تھوڑا مشکل لگتا تھا یعنی سمجھ نہیں آتا تھا۔ میں مشکل کہہ رہا ہوں۔ بھاری نہیں۔ بس یہ بات ذرا ذہن میں رکھیے گا۔ ہولے ہولے سب ٹھیک ہوتا گیا۔ گھاس کا ذائقہ بھی کچھ اور سا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ بھی اچھی لگنے لگی۔ کچھ ہم بدلے کچھ مختلف رہے۔ گاڑی چل پڑی۔ زندگی کی گاڑیاں تو بیچ کے راستے سے ہی چلا کرتی ہیں نا۔

ایک دن ہمارے پرانے مالکوں نے کہا کہ ہم مختلف قسم کے گھوڑے ہیں۔ اس لیے ہمیں دوسرے گھوڑوں سے الگ رکھا جائے۔ مگر ہمارے مالک نے یہ بات نہیں مانی۔ اسے تو ہم میں کوئی بہت بڑا اختلاف نظر نہیں آیا۔ وہ کیا کرتے بیچ رہے چپ مار گئے۔

دکھ سکھ تو رب نے ہر جاندار کے ساتھ رکھا ہے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک بار ہم بیمار پڑ گئے۔ نجانے یہ کیسی بیماری تھی کہ جو صرف ہمارے ہی بھائیوں تک محدود رہی۔ بس آنکھوں سے پانی بہتا جاتا تھا رکتا ہی نہیں تھا۔ ہمارے مالکوں نے ہمیں دوسرے گھوڑوں سے الگ ایک اور اصطبل میں رکھ دیا اور اپنے طور پر علاج کرنے لگے۔ مگر ہمیں کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ہم خود حیران کہ کیا کریں۔ کہاں جائیں مگر یقین کی ایک چمک سی دل میں موجود کہ چند روز کا دکھ ہے آپ ہی آپ دور ہو جائے گا۔

ہمارے پرانے مالکوں کو بہانہ ہاتھ لگا بولے ''دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ مختلف قسم کے گھوڑے ہیں۔ اب آپ کو انھیں الگ رکھنا ہی پڑا نا۔ بہتر یہی ہے کہ ان کے لیے ایک الگ اصطبل بنوا دیجیے۔''

''اور ہمیں ان کا داروغہ اصطبل بنا دیجیے۔'' یہ بات داروغہ اصطبل والی ان کے دل میں تھی مگر ہم تاڑ ہی گئے آخری آدھی زندگی ان ہی کے ساتھ تو گزاری تھی۔

ہمارا مالک بولا "ہم تو اپنے ہاں ہر بیمار گھوڑے کو الگ ہی رکھا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک سوچا ہیں سے تو پھر سب کو ایک ساتھ رکھ دیں گے۔"

ہمارے پرانے مالک بچارے کیا کرتے۔ بس چپ مار گئے اور جب ہماری بیماری طول پکڑنے لگی تو ہمارا مالک گھبرایا۔ پرانے مالکوں نے پھر کہا۔ "دیکھا ہم نہ کہتے تھے۔"

مگر خود ہمیں پتہ تھا کہ یہ وقتی بیماری ہے۔ موسم بدلتے ہی اپنے آپ دور ہو جائے گی۔ ادھر یہ ہمارے پرانے مالک جانے کہاں سے جھوٹے سارٹیفکیٹ لا کر خود کو "گھوڑا سپیشلسٹ" ثابت کر رہے ہیں اور مالک سے ہماری خیر خواہی کے بہانے ہمیں الگ اور اپنی زیر نگرانی رکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ہمارا مالک ان کے مطالبات پر غور کر رہا ہے اور ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم تو جانتے ہیں کہ یہ لوگ کچھ بھی سپیشلسٹ نہیں۔ محض ہماری طرح ہی گھوڑے ہیں۔ اگر یہ سپیشلسٹ ہوتے تو ان کی پریکٹس کا میدان تو وہاں زیادہ وسیع تھا، جہاں سے یہ اور ہم لوگ آئے ہیں۔ بہر حال زیادہ تعداد تو ہم جیسے گھوڑوں کی وہیں ہی تو رہتی ہے۔

خدایا۔ تو تو سب کچھ جانتا ہے۔ ہمیں ان گھوڑا اسپیشلسٹوں سے محفوظ رکھیو۔ ہماری بولی ہمارے مالک کو سمجھ آتی تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اب ہم یہ سب اسے کیسے سمجھائیں۔ ہم تو گھوڑے ہیں

(۲)

میں تو گھوڑا ہوں اور گھوڑے کا کام کرتے ہوئے مجھے کچھ برا تھوڑے ہی لگے گا۔ ہاں گھوڑے سے گدھے کا کام لیا جائے تو دکھ تو ہو گا ہی۔

جب میں وہاں سے بھاگا تھا تو میں نے سمجھا تھا کہ میرے دکھوں کا انت ہو گیا۔ میں ناشکرا نہیں ہوں۔ واقعی میرے وہاں کے کئی دکھ ختم ہو گئے۔ دراصل وہ دکھ یہاں تھے ہی نہیں۔ وہ تو وہیں پیچھے ہی رہ گئے تھے۔

یہاں آ کر وہاں کے دکھوں سے تو چھٹکارا مل گیا، مگر یہاں اور قسم کے دکھ جاگ اٹھے۔ یہ کیسے دکھ ہیں۔ جن کا مجھے پہلے احساس تک نہ تھا۔ مگر دور کہیں وہ میرے ذہن کے ڈھکے چھپے کونے میں دبکے پڑے تھے۔

بات یہ ہے کہ اب جب کہ یہاں رہتے ہوئے مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ مجھے کئی نئی باتوں کی جانکاری ہوئی ہے۔ پہلے میں ہر کبھی یا نا کبھی بات پر مسکراتا تھا، سر ہلاتا تھا اور اداکاری کرتا تھا۔ بھلا کوئی آپ کو گالیاں بھی دے رہا ہو اور بات آپ کو سمجھ نہ آئے تو آپ ہنس سکتے ہیں مگر سمجھ آ جانے کے بعد تو

جواب آپ بھلے ہی نہ دے سکیں مگر کم از کم مسکرا تو نہیں سکتے۔ سیدھی بات ہے۔ اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد اب میں ساتھی گھوڑوں کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ بس ساری بات یہیں سے بگڑتی ہے۔ میرے سارے دکھوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

دوسرے گھوڑوں سے ملنے کے بعد مجھے کئی باتوں کے سننے کا موقعہ ملا ہے۔ ہم بڑے گھوڑے ہیں۔ ہمارا رنگ صاف ہے۔ جلد سنہری ہے بال گھنے ہیں۔ نسلیں بڑی اچھی ہیں ہم نے بڑی بڑی مہموں میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ ہمارے بزرگ ڈربی کی ریس دوڑتے اور جیتتے رہے ہیں۔ ہم ہیک (Hack) ہیں ہنٹر (Hunter) ہیں۔ ہیکنی (Hackney) ہیں۔ ہم نے ریس کورس کو جنم دیا ہے۔ ہمارے وطن عالی شان ہیں۔ جانے کون کون سے ملکوں کے وہ لوگ ہم میں ہیں جو ان ملکوں کا ذکر وہ بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر گول کر جاتے ہیں جن کے گھوڑوں کے ساتھ ہماری نسلوں کا ملاپ ہوا ہے اور جنہوں نے کیا سواری کیا سپورٹس اور کیا دوڑوں کے مقابلہ میں کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ فرانس کی تاریخ اب بھی اس بات کی گواہ ہے۔

میں طعنہ نہیں دے رہا ہوں اور نہ ہی طعنہ زنی سے کوئی بات بنتی ہے۔ بات کام کرنے اور کچھ کر کے دکھانے سے بنتی ہے۔ ایک دن میں نے سوچا۔ بھلے گھوڑے۔ اب کچھ کر کے ہی دکھا۔ اگر تیرے اندر کچھ بات ہوگی تو سامنے آ جائے گی۔ ورنہ گھوڑا ہو کر بھی گدھا بنا رہے گا۔ میں گدھا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے گھوڑا بننے اور ڈینگیں مارنے کا کوئی شوق نہ ہوتا مگر دکھ تب ہوتا ہے۔ جب گدھوں کو بھی گھوڑا بنے دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ سوچتا ہوں۔ کیا میری آنکھوں کی غیرت مر گئی ہے کہ میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی شناخت نہیں دے سکتا۔

وہ جو میں ہلکے پھلکے پہیوں کی گاڑی کھینچتا ہوں اور جو کشتی کی طرح پانی پر تیرتی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل ایک ایسی گاڑی ہے جس میں ایک گھوڑا لدا ہوا ہوتا ہے۔ میرا فرض ہے اسے گھوڑوں کی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے ریس کورس پہنچانا۔ ایک بار میرے دل نے سوچا کہ میں دوڑ کر ہی نہ دوں اور گھوڑے کو ریس میں لیٹ پہنچا کر اسے دوڑ میں حصہ لینے سے محروم کر دوں مگر پھر میرے ذہن نے مجھے سخت ملامت کرنی شروع کر دی۔ ارے بھلے گھوڑے۔ اپنی درتھ ہی دکھانی ہے تو کسی مثبت طریقے سے دکھا جو تیرے بھی کام آئے، اور تیرے مالک کے لیے بھی مفید ہو۔ تو بس میں ایسے موقعے کی تلاش میں رہنے لگا۔ اور کرنا خدا کا کیا ہو کہ یہ موقعہ جلد ہی میرے ہاتھ لگ گیا۔ ہوا یوں کہ میرے مالک اور اس کی بیٹی میں کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ دراصل وہ آج کل گھوڑوں پر کئی مشہور مصنفوں کی کتابیں مثلاً گھوڑے، کھیلوں کے بادشاہ سواری قدم بہ قدم۔ گھوڑ سواری۔ تصاویر میں۔ ننھے ننھے سوار۔ گھوڑوں پر کتاب۔ گھوڑا سواری کے طریقے وغیرہ وغیرہ پڑھ رہی تھی اور کبھی کبھی مجھے باہر گھمانے کے بہانے لے جاتی تھی تو مجھ پر سواری بھی کر

لیا کرتی تھی۔ وہ مجھے کئی قسم کے کھیل تماشے اور پھلانگیں وغیرہ لگانی بھی سکھاتی تھی۔ میں نے سوچا میں گھوڑوں کے کمالات ہی نہیں سیکھ سکتا تو پھر اور کیا سیکھوں گا۔ بس میں نے اس کا دل خوش کرنے کو بہت کچھ سیکھ لیا۔ آج وہ مجھے کسی مقابلے میں لے جانا چاہتی تھی ادھر میرے مالک کو اچانک ریس میں شمولیت کی دعوت مل گئی تھی۔ شاید کوئی دوڑنے والا گھوڑا بیمار پڑ گیا تھا یا خدا جانے کیا بات تھی کہ اسے اپنی بیٹی کی جگہ جانا پڑ گیا۔ باپ بیٹی کی تکرار نے میرے مالک کو کافی اپ سیٹ کر دیا اور جب واپس آ کر اس نے چابک لہرا کر مجھے تیز دوڑانا چاہا تو میں نے دل میں کہا۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔ سیدھی طرح چابک ایک طرف دھر دے اور دیکھ کہ میں تجھے تیری منزل مقصود پر دس منٹ پہلے پہنچاتا ہوں کہ نہیں۔ مالک نے میری بات سمجھی تو اس کے ہاتھ کا چابک ہاتھ میں ہی رہ گیا اور اس کی زبان سے واہ واہ کے تیر اور بے ساختہ تعریفی الفاظ نکلنے لگے۔ اپنی تعریف سن کر۔ ایک بار تو میرے دل میں غرور کی لہر آ گئی مگر میں نے دل کو سمجھایا کہ ابھی تو میں اپنے مقصد کے پاس آدھا قدم بھی نہیں پہنچا ہوں اس تو خواہ مخواہ اوچھا ہونے لگا ہے۔ قدرت نے مدد کی۔ اس دن ہمارا گھوڑا ریس میں بری طرح ہار گیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے مالک کی اداسی محسوس کر لی جو آہستہ آہستہ غصے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نہیں جانتا اسے یہ غصہ اپنی بیٹی پر تھا، اپنے ہارنے والے گھوڑے پر، یا اپنی قسمت پر مگر میں نے سوچا کہ میں اس کی قسمت بدلنے میں ضرور ایک اچھا پارٹ بحسن و خوبی انجام دے کر دکھاؤں گا۔ واپسی پر جب اس نے چابک لہرایا تو میں نے چال پکڑی اور دکھا دیا کہ چال کیا ہوتی ہے۔ تب قسم خدا کی اگر ریل کا انجن بھی مقابلے پر ہوتا تو اسے بھی ایک قدم آگے نہ جانے دیتا۔

اوپر والے کی نظر سیدھی ہو تو راستے بنتے جاتے ہیں۔ موقعے آتے ہی رہتے ہیں اور میرے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ موقعہ جلد ہی فراہم کر دیا۔ غرور کا سر نیچا۔ بڑی بڑی ڈینگیں مارنے والا اور مجھے اور میرے جیسے دوسرے گھوڑوں کو منہ نہ لگانے والا گھوڑا، ایک کے بعد ایک ریسیں ہارنے لگا۔ مگر نجانے میرے مالک کو کیا مسئلہ درپیش تھا کہ اس نے مجھے نہیں دوڑایا۔ میں ٹھہرا غیرت مند گھوڑا۔ میں کیوں منہ چڑھ کر کہتا کہ بھلے آدمی۔ ایک چانس مجھے بھی دے دیکھ۔

ہمارے دوڑانے والے گھوڑے کا نام گولڈن ہیرو ہے۔ ایک دن گولڈن ہیرو نے شام کی ریس میں حصہ لینا تھا مگر اس دن اس کی طبیعت صبح سے ہی ناساز ہو گئی۔ مالک نے اس کی بہت مٹھی چاپی کی، ٹانگوں کو سہلایا۔ اس کے جسم پر قسم قسم کے برش رگڑے ہلکی پھلکی ورزشیں کرائیں۔ بڑھیا دوائیاں اور ٹانک دیے مگر دوپہر تک وہ اور بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اب تو میرے مالک کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھی چپ کر کے دیکھ اوپر والا کیا کرتا ہے اور اوپر والے نے جانے کیا اس کی کھوپڑی میں بٹھا دیا کہ اس نے میری مٹھی چاپی شروع کر دی۔ اب تک سب کچھ جو اس کے ساتھ کیا تھا، میرے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ اب میں ہوں اور

میرا مالک اور اس کے تین نوکر ہیں۔ دے سیوا پہ سیوا۔ دے رگڑائی پہ رگڑائی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ 'کر سیوا' کھا میوہ۔ میں نے کہا بھیا سیوا کا پھل میٹھا ہی ملے گا تجھے۔

جب وہ سب کچھ کر چکا جو اسے کرنا تھا تو اسے اچانک پھر کچھ یاد آ گیا اور وہ پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر جانے کچھ دیر بعد اسے کیا سوجھی کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور قریب ہی کے کھیتوں سے ایک جڑی بوٹی کے پتے توڑ لایا اور انھیں پیس کر اور اس کا لیپ بنا کر میرے جسم پر تھوپنے لگا۔ اسی بیچ اس نے گھڑی دیکھی۔ تو وہ گھبرا گیا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی نہلایا، اور لیپ دھویا اور گاڑی کی طرف لے چلا۔ راستے میں اصطبل کے ایک کونے میں ایک قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ جس میں گھوڑے اپنا منہ دیکھتے تھے۔ میں نے جب اس میں اپنا عکس دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بیچ میں اب ایک مختلف گھوڑا تھا۔ مجھے گاڑی پر چڑھا کر اس نے دروازہ بند کیا اور جب گاڑی چلی تو ہوا سے باتیں کرنے لگی اب میں گاڑی میں سوار تھا اور میرا ہی کوئی بھائی اسے کھینچ رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ واہ رنگی' تیرے رنگ۔

دوڑ کے میدان میں پہلی ہی دوڑ میں میری باری تھی۔ اس ریس کھیلنے والوں کو دکھانے کے لیے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ میری پیٹھ پر میرا آٹھ نمبر لکھا ہوا کپڑے کا بورڈ سا لگا کر مجھے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ ایک چکر میں گھمایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ جنگلے کے باہر کھڑے لوگ میری پر وقار چال دیکھ دیکھ کر نعرے لگا رہے ہیں۔ مجھے شاباش دے رہے ہیں۔ میرے نمبر پر ٹکٹیں خرید رہے ہیں۔ پیسہ لگا رہے ہیں اور آٹھ نمبر آٹھ نمبر کی دھوم مچی ہوئی ہے   تھوڑی دیر بعد ہمیں ریس کے میدان میں ایک ایک مستطیل خانے میں ٹھہرایا گیا۔ جن پر ہمارے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ کل دس 10 نمبر تھے۔ میں اپنے آٹھویں نمبر کے خانے میں کھڑا تھا۔ پھر ہمارے خانوں کے دروازے ہٹ گئے اور جب میرے جاکی نے ایڑ لگائی تو میں تیسرے نمبر پر دوڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ پہلوان آج ہار گیا تو مر جائے گا۔ زندگی بھر گدھگی ہی کرنی پڑے گی۔ اگر تجھ میں کچھ بھی گھوڑ پنائی ہے تو دکھا دے کہ تجھ میں بھی کچھ ہے   یہ سوچتے ہی میری غیرت ایک دم جاگ اٹھی اور پھر میں نے جو چال پکڑی ہے تو ہوا پیچھے اور میں آگے۔ دوسرے گھوڑوں کو تو میری خاک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور باہر سے تو بس یک ٹپ آٹھ نمبر اور یک اپ گولڈن برڈ، اور واہ واہ اور شاباش کے علاوہ اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا   ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ جب ہم گھر سے چلے تھے تب کالے کالے بادل گھرے ہوئے تھے۔ اب دوڑ کے میدان میں ابھی ہم آدھا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی حالانکہ کل ہی ریڈیو پر بادلوں کے گھر آنے مگر بارش نہ ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ خیر مجھے کیا۔ کیا بارشوں سے گھوڑے رکتے ہیں یا شہسوار پیچھے ہٹا کرتے ہیں .. نیت صاف تھی۔ ہمت جوان تھی اور سامنے چیلنج تھا۔ میں فرسٹ آ گیا۔ پھر وہ شور مچا کہ آسمان پھٹنے لگا۔ وہ عزت ملی مجھے کہ میرا سینہ خوشی سے پھول گیا۔

تماشہ گاہ میں جنتا کے عین درمیان ایک گول گھاس کے قطعے کے آس پاس ایک جنگلہ لگا ہوا تھا جس میں جیتنے والے گھوڑے کو بعد جا کر لایا جاتا تھا تاکہ حاضرین اپنے فاتح کو قریب سے دیکھ سکیں۔ مجھے وہاں لایا گیا تو بہت شور مچا۔ اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگ خوشی سے چیخ رہے تھے نعرے لگا رہے تھے۔ ٹوپیاں ہوا میں اچھل رہے تھے۔ میں اندر ہی اندر خوش تھا کہ چلے جوانی اب تیرے دن بدلے۔ کوئی ایک کام کسی ایک کے لیے ریزرو تھوڑے ہی ہو جاتا ہے۔ دوسرے کو موقع دیا جائے تو دوسرا بھی اپنی ورتھ دکھا سکتا ہے۔ مگر یہ کیا وہ خوشی کی چیخوں اور نعروں میں غصے کا عنصر کیوں در آیا ہے۔ یہ تو آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! میرے مالک کی آواز کافی دب گئی ہے۔ دوسرے لوگوں کی آوازیں اس سے کہیں زیادہ کرخت اور اونچی ہیں۔ کچھ لوگ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر پھیر کر ایک اور کتابچہ دکھا دکھا کر میرے مالک سے تو تو میں میں کر رہے ہیں۔ کچھ الفاظ جو میرے پلے پڑ رہے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

یہ گولڈن ایرو نہیں ہے۔ بارش نے اس کا نقلی رنگ اتار دیا ہے۔ کتابچے میں گولڈن ایرو کا رنگ چمک دار سنہری لکھا ہے۔ اسے اندھا بھی دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ پھیکا سنہری ہے جسے جڑی بوٹی کے لیپ سے چمکدار سنہری بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت لے دے کے بعد میرے مالک کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی ہے اور جج لوگ فیصلہ سنا رہے ہیں۔ جو سیکنڈ آیا ہے۔ اسے فرسٹ کر دیا جائے‘ جو تھرڈ آیا ہے اسے سیکنڈ اور اسی طرح آگے۔ میں سب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں۔ میں دوڑا گیا ہوں اور میں نے دوڑ جیت کر دکھائی ہے۔ اس سے رنگ کا کیا تعلق ہے۔ نسل کا کیا واسطہ ہے مگر میں کس سے کیا کہوں‘ کیسے کہوں۔ کون سنے گا۔

سیدھا راستہ

یونس جاوید

یہ اڈا اس ... لئے ... کی کان تھا۔

... یہاں آنے سے پیشتر وہ کئی دن تک سوچتا رہا تھا اور کسی خاص فیصلے کے تحت، آج کی رات اس کان کو دے رہا تھا۔

پہلوان سے قوام لگے پتوں کا ایک جوڑا لے کر اس نے دونوں کلوں میں دبایا اور دو جوڑے بندھوا کر ساتھ لے لئے۔ سگرٹ اس نے پہلے سے بھر رکھے تھے اور یہ سب سامان رات بھیگ جانے کے انتظار کی کوفت سے بچنے کے لئے تھا۔

پان چوستا اور قوام کا مزہ لیتا وہ دوبار اس اڈے کے قریب سے گزرا تھا۔ دوسری بار گزرتے ہوئے ایک لمحے میں اس نے صحیح جگہ کا انتخاب کر لیا تھا اور مطمئن ہو کر پلٹ آیا تھا۔

یہاں اس بازار میں بھیڑیوں سمٹ آئی تھی جیسے ابھی یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ گاہک اور گاہکوں کو پھانسنے والے گورے، کالے، ناٹے، لمبے سبھی قسم کے انسان یہاں موجود تھے، کچھ دیر کے لئے تو ہیرا ان میں یوں گھل مل گیا جیسے اس کے یہاں آنے کا مقصد محض تفریح ہو۔

ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور پھر دوسرے سے پہلے تک آتے آتے اس نے دیکھا کہ کچھ دیر پہلے جو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے اور لوگوں کی تعداد بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔

پھر جب منی بائی نے بالکونی کے ساتھ والی کھڑکی کا پردہ گرایا تو اس نے جان لیا کہ بارہ سے اوپر کا عمل ہے۔

اس وقت رات کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا ہے ...... اسے معلوم تھا ...... اور منی بائی کے علاوہ سرور، پکھراج، جانکی، نرگس اور دوسری بہت سی بائیاں پاؤں سے گھنگھرو اتار پھینکتی ہیں۔ سارنگیوں پر غلاف چڑھ جاتے ہیں اور بالکونیوں کے دروازے بند ہونا شروع ہو جاتے ہیں جن بالکونیوں کے دروازے نہیں ہوتے۔ ان کے پردے کھل جاتے ہیں اور پھر گرم گرم سانسوں کے درمیان ...... رات بھیگ جاتی ہے۔

اسے ایسی بھی بہت سی بائیوں کا علم تھا جو رات کے پہلے پہر ناچتی تھیں۔ اور دوسرے پہر نچواتی تھیں اس

نے دیکھا کہ وہ اپنے انتخاب شدہ اندھیرے کونے میں کھڑا ہے۔ جہاں سے اسے سڑک کا آخری حصہ تک دکھائی دے رہا ہے۔ جس کے آس پاس زندگی سمٹتی جا رہی ہے۔

دودھ والا ابھی ابھی دکان بڑھا کر جا چکا تھا۔ ہوٹلوں کی گھسی پٹی رنگا رنگ بند ہو چکی تھی۔ چرس کے بھرے بھرائے سگرٹ پینے والے بند دکانوں کے تھڑوں پر اونگھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک آدھ ماشے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ چوراہے میں پہلوان تھڑے پر رکھے پان والا ابھی تک گلوریاں بنا رہا تھا اور پان کے ٹوکروں میں پان کی بچی کھچی پتیں اور سگرٹ کی خالی ڈبیاں پھینک رہا تھا۔

ہیرا آدھ گھنٹے سے اس کونے میں کھڑا اپنے آخری پان چبا رہا تھا۔ چرس بھرے سگرٹ اس کی جیب میں تھے نیفے میں اڑسا ہوا لمبا چاقو، آستین میں سلا ہوا دس کا نوٹ جو اس نے ہنگامی حالات کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ پاؤں میں پیچ کی چپل اور کندھوں پر پرانا کمبل۔

اسے اپنا فیصلہ اچھی طرح یاد تھا اور اس کی ساری احتیاط اس کے فیصلے کے تحفظ کے لئے تھی۔

ممکن ہے ۔۔۔ اس نے سوچا ۔۔۔ مجھے نیکی کے راستوں میں پناہ ملے ۔۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔ نیکی کا صرف ایک راستہ ہوگا اور میں اسی راستے کی تلاش میں بھٹک گیا تھا اور آج اسی راستے کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔

سردی سے ٹانگوں کا خون منجمد ہونے لگا۔ تو ایک بند دکان کے برآمدے میں پاؤں کے بل بیٹھ کر اس نے کمبل سے اچھی طرح اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ پھر بڑی احتیاط سے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگرٹ نکالا اور ہونٹوں سے چپکا کر ماچس ٹٹولنے لگا۔

ماچس جلانے کے فوراً بعد اس نے آنے والے کے قدموں کی چاپ سنی تو جلتی تیلی کو پھنکار سے بجھا دیا اور سانس روک کر تھوڑی سی گردن دکان کے برآمدے سے باہر نکالی ۔۔۔ آنے والا ۔۔۔ ابھی منی بائی کے مکان سے سوئز پر تھا ۔ اس نے بڑی آہستگی سے ماچس نکالی اور سگرٹ سمیت برآمدے کے ایک کونے میں ڈال دی پھر اپنا کمبل اتار کر زمین پر رکھا اور نیفے سے لمبا چاقو نکال کر مٹھی میں بھینچ لیا۔

اس کی نگاہیں راہ گیر کے ہر قدم پر جمی تھیں۔ وہ ہر لحظہ چوکنا ہو رہا تھا۔ وہ راہ گیر کے قدم گننے لگا۔

"ہک ۔۔۔ دبی دبی مگر بھیانک سی آواز اس کے حلق سے ابلی اور اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو فضا میں لہرا دیا۔

راہ گیر اتنی تیزی سے گھوم کر گر پڑا ۔۔۔ سنبھلا مگر اٹھ نہ سکا۔ اس کے سر پر موت کا اشارہ تھا۔

ہیرا اس گرے ہوئے انسان پر جھک کر کھڑا ہو گیا سب کچھ نکالو۔ اس نے دبی آواز اور قہر آلود نگاہوں سے کہا

"میرے پاس ۔۔۔ میرے پاس صرف ۔۔" مسافر ہکلایا۔

جو کچھ بھی ہے " ہیرا تھوڑا سا اور جھکا۔ جلدی ۔۔۔ جلدی ۔۔" ۔۔۔ چاقو والا ہاتھ مسافر کے سر پر برابر منڈلا رہا تھا۔

مسافر نے تیزی سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور جب میں بکھری ہوئی چیزوں کو ایک مٹھی میں سمیٹ کر مٹھی باہر نکال دی

"د ـ ـ ـ ـ" وہ بولا۔

ہیرا نے دونوں ہاتھوں سے اوک بنانے کی بجائے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا دی۔

مختلف چیزوں کے اس چھوٹے سے اجتماع کو دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

ایک نیا پیک شدہ بیڑی، سنیما کی کٹی ہوئی ٹکٹ کا آدھا حصہ، ایک کنگھی، فلمی گانوں کی ایک کاپی بھنے ہوئے چنوں کے چند دانے اور نقدروں ـــ پیسے۔

کوٹ، پتلون میں ملبوس اس مسافر سے ہیرے کو یہ توقع نہ تھی۔ اسے سخت کوفت ہوئی۔

غصے اور کوفت ــــ جلے جذبات کو دبا کر اس نے دھیمی آواز سے پوچھا۔ ۔ "کیا کام کرتے ہو؟" پھر اس نے خود ہی بات بڑھائی۔ "جو کچھ پوچھوں بتاتے جاؤ۔"

"کلرک ہوں ۔"

"کیا تنخواہ لیتے ہو۔؟"

"تنخواہ تو خیر سوا سو ہے۔" وہ مسافر خوشگوار حیرت سے ہیرے کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ آٹھ افراد کا کنبہ ہے، اور پھر ہیڈ کلرک کو ماہوار بھی دینا پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ بچے سکول جاتے ہیں۔ ماں بیمار ہے سدا کی اور بہنیں جوان ہو رہی ہیں۔"

"کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" ہیرے نے اس کی بات روک دی۔ "ہیڈ کلرک ماہوار کیوں لیتا ہے؟"

"نہ دیں تو ہماری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ میرے علاوہ دوسرے کلرک بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"اور تم سینما دیکھ کر آئے ہو؟"

"آج پہلی تاریخ ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ اس دن مجھے دو روپے ذاتی خرچ کے لئے ملتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی دن ختم ہو جاتے ہیں۔"

"پتہ ۔؟"

مسافر نے بتا دیا۔

"جلدی اٹھو۔ ہیرے نے کہا۔ "اپنی چیزیں لو اور سیدھے گھر جاؤ۔ راستے میں کسی سے کچھ کہا تو صبح نمٹ لوں گا۔" مسافر تیز تیز چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اگر اس نے گشت کرنے والے حولدار سے سر شام ہی بات پکی نہ کر لی ہوتی تو وہ یہاں ایک سیکنڈ بھی نہ ٹھہرتا ۔ ۔ ۔ ۔ گشت کرنے والے سے تو وہ مطمئن تھا۔ تاہم اصول کے مطابق ہیرے کو اب یہاں نہ ٹھہرنا چاہیے تھا، مگر جس مقصد کے لئے اس نے یہ اڈا منتخب کیا تھا ابھی ادھورا تھا اور وہ یہاں سے سرک بھی نہ سکتا تھا۔

یوں آج تک اس نے سینکڑوں راہ گیروں کو لوٹا ہو گا۔ مگر اس بے تکلفی اور بے خوفی سے کسی سے گفتگو نہ ہوئی تھی۔ یہ

پہلا مسافر تھا۔ جس کے متعلق وہ کچھ دیر سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے سگرٹ ہونٹوں سے چپکا کر کمبل اٹھایا اور ساتھ کے کھنڈر نما مزار کے اندرونی حصے میں چلا آیا۔ یہاں وہ ایک لحاظ سے محفوظ بھی تھا اور سوچ بھی سکتا تھا۔ سگرٹ پیتے اور سوچتے ہوئے اس نے چکنے فرش پر ہاتھ پھیرا۔ جابجا موم بتیوں کے ٹکڑے جمے تھے جو کبھی جلائی گئی ہوں گی۔

اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس مزار پر رنڈیاں اکثر چراغ جلاتی ہیں۔

"چھاپیر پاشا" اس نے سانس کھینچ کر کہا۔ "آج کوئی لمبا ہاتھ پڑ گیا تو راستے پر مندل جلاؤں گا۔

اس آخری کش سے اس نے سگرٹ کی زندگی نگل لی۔ راکھ جھڑی تو اس نے پیر کے نیچے مسل کر بجھا دی اور کچھ دیر گزارہ کر باہر آ گیا۔

ابھی تک کوئی ادھر سے نہیں گزرا تھا۔ اسے دکھیں اور بائیں دور دور تک گاڑھا دھند میں ڈوبا ایک سناٹا تھا۔ گہرا اور سرد۔

دو ہی منٹ بعد اسے کناہٹ محسوس ہونے لگی۔ تو اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ فارغ ہونے کے بعد اسے یوں لگا جیسے اس کی اکتاہٹ کسی حد تک کم ہو گئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس پتلی گلی کو جمن خان کی حویلی کے دوسرے شکستہ دروازے میں داخل ہوں تو راستہ کس گلی میں جا نکلتا ہے۔ بالکل اس گلی میں جس کی بغل میں ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے تھے۔

یوں تو اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی ڈیرے داری نام نہاد ہی ہے۔ مگر ان کے ہاں آنے جانے والوں میں رؤسا ہی کی تعداد زیادہ تھی۔

اس کے خیال میں جمن خان کی حویلی سے نکلنے والا سایہ بھی کسی رئیس کا تھا اور اسے محتاط کر دینے کے لئے کافی تھا۔۔۔ سایہ دیوار ٹٹولتے ہوئے کچھ دور چلا اور پھر دیوار کی طرف منہ کر کے موری پر بیٹھ گیا۔

ہیرے کو اسے پیشاب کرتے دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

"سالا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "کیوں نہ سے وہیں پکڑ لوں۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔ اس کا انتظار کرنا چاہئے۔

مگر جانے وہ کیسا راہ گیر تھا کہ اس نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں۔۔۔ برابر چلتا گیا۔

ہیرا لپک کر سامنے آیا اور اسے گریبان سے پکڑ کر بولا۔ ساری شراب نکال دوں گا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے کھلے چاقو کی نوک اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں چبھو دی۔

مسافر واقعی نشے میں دھت تھا۔ وہ یک لحہ تک تو نشے ہی میں رہا۔ پھر جب ہیرے نے اسکے گریبان کو دو یک جھٹکے دیئے تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

رندھی ہوئی آواز میں چلا کر اس نے کہا۔ "میں بال بچے دار ہوں۔"

نوک اس کے پیٹ میں تھوڑی سی اور چبھو کر ہیرا بولا۔

"آواز بند۔۔۔۔ مال ادھر۔۔۔"

"مال۔" وہ آدمی منہ پھاڑ کر بولا۔ "مال کہاں ہے میرے پاس؟ میرے پاس تو کوڑی بھی نہیں۔۔۔۔ سب اس نے لے لئے۔۔۔۔" اس نے پچھلی سمت اندھیرے میں اشارہ کرکے کہا۔۔۔ "اس نے۔۔"

ہیرا سیدھا کھڑا ہو گیا۔۔۔ "کس ماں کو دے کر آیا ہے؟۔۔۔" ایک دھول جما کر ہیرا بولا۔۔۔۔۔ "جیب ادھر کر۔۔"

ہیرے نے بڑے اطمینان سے اس کی سب جیبوں کی تلاشی لی۔ آخری جیب جھاڑتے ہوئے ٹھن سے اٹھنی سڑک پر گری اور ٹھنک ٹھن ٹھن ٹن ٹن تاں۔۔۔۔۔ کرتی ہوئی رینگ گئی۔

اٹھنی کی آواز کو ہیرے نے اچھی طرح پہچان لیا تھا اور پھنکارتے ہوئے اس نے آدمی کے سر پر زور کا ایک ہاتھ مار کر دبا لیا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ اسے ایک آدھ تھپڑ ابھی مارے، کہ منی بائی کے کوٹھے کے ساتھ والی گلی سے دو آدمی باہر آئے اور اس طرف چلنے لگے۔ اسے بڑی پھرتی سے اس آدمی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹا اور اندر مزار میں لے آیا۔

"خبردار۔۔۔ آواز نکلے۔۔۔" اس نے کہا اور قدموں کی چاپ سننے لگا۔

دو آدمیوں کے مزار کے پاس سے دھیمی آواز میں گفتگو کرنے کی آواز آئی اور ہوئے ہوئے معدوم ہو گئی۔

کچھ لمحوں تک ہیرے نے سانس بھی بڑی آہستگی سے لی۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ راہ گیر دور چلے گئے ہیں تو اس نے اس آدمی کو ٹھوکر مارنے یا گالی دینے کی بجائے بڑے پیار سے پوچھا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"میں۔۔۔؟" اس آدمی نے چونک کر کہا۔۔۔۔ "میں یہاں ٹھیکے دار ہوں۔"

"کوئی بڑا ٹھیکہ ہاتھ لگا ہوگا، جو یوں عیش کر رہے ہو! کس چیز کے ٹھیکے دار ہو؟"

وہ آدمی مسکرایا تو اطمینان اس کے چہرے پر جھلکنے لگا۔ "میں دو قسم کے ٹھیکے لیتا ہوں۔ بڑا ٹھیکہ بلڈنگز بنانے کا ہے

دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹھیکے تو میں اپنے بھائی کو دے چھوڑتا ہوں۔"

"یہ کام کتنے پیسوں سے ہو جاتا ہے؟" ہیرے نے کہا۔

"ٹھیکے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے بھی اور نہیں بھی۔"

"وہ کیسے۔۔؟" ہیرا تڑپ کر بولا۔ "کیا بغیر پیسوں کے یہ کام ہو سکتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔" وہ آدمی بے تکلفی سے بولا۔ "اگر ایس ڈی او ورا انجینئر اپنے ہاتھ میں ہوں اور انہیں قابو میں کرنے کے لئے پیسوں کی اور کچھ چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی شروع شروع میں۔۔۔ بعد میں تو معاہدے کے مطابق۔۔۔ کٹ ہوتا ہے۔۔۔"

وہ آدمی ایک منٹ تک خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "آج بھی مجھے ایس ڈی او کی خاطر یہاں آنا پڑا ہے۔ جب تک اسے اس کی محبوبہ کی ہاں جشن نہ کروائیں اور کچھ خدمت اوپر سے نہ کریں۔ نہ کام پاس ہو سکتا ہے اور نہ بل منظور ہو سکتا ہے۔۔۔ اتنا

مان لیں تو سمنٹ میں دریا کی مٹی ملا کر بھی کام چل جاتا ہے اور پیشگی رقم بھی ملتی ہے۔ یقین کرو۔۔۔۔۔ وہ آدمی رک کر بولا۔۔۔ میں شریف آدمی ہوں۔ سب کچھ بال بچوں کی روٹی کی خاطر کرتا ہوں۔ یوں بے ایمانی کرتا ہوں نہ شراب پیتا ہوں۔ یہ تو صاحب نے زبردستی کروایا ہے۔۔۔۔ اور پان بھی ہے۔۔۔۔ وہ ہے۔۔۔۔۔۔ بد بخت۔۔۔۔ شراب اور وہ بھی رنڈی کے ہاتھ سے۔،، وہ ایک منٹ تک اپنی رندھی ہوئی آواز میں پھس پھس کرتا رہا۔ پھر بڑے اعتماد سے بولا۔ "مجھے گناہ کی کوئی فکر نہیں۔ یہ سب کچھ مجھے مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ مگر مجھے یہی اس رقم کا بہت دکھ ہے جو نہایت بے دردی سے میرے اوپر ہی خرچ ہو رہی تھی۔ صاحب سو گیا۔۔۔ تو میری جان چھوٹی ہے۔ کنجر نے قسم کھانے سے قابل نہیں چھوڑا۔۔۔ میں سگرٹ پی لوں۔۔۔،،

ہاں ہاں۔۔۔ ہیرے نے بے ساختہ کہا۔ "ضرور پیو۔۔۔۔ مگر تم نے اپنے دھندے کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ "وہ آٹا لون سپلائی کرتا ہے۔۔۔۔ بڑا ہی کتا کام ہے یہ بھی۔۔۔۔ اب دیکھو نا۔۔۔ آٹے میں سوکھی روٹیاں اور ہلدی میں کچھ نہ ملایا جائے تو ٹیڈی پیسہ بھی نہیں بچ سکتا۔۔۔۔ اس ٹھیکے سے ہی گزارہ کرنا پڑتا ہے مگر۔۔۔ اللہ معاف کرے، ہے یہ سب کچھ حرام۔۔۔،،

"یہ ٹھیکے داری تم باپ دادا سے کر رہے ہو۔۔۔۔؟،،

"اوں ہوں۔۔۔۔،، اس آدمی نے ہیرے کی بات پوری ہی نہ ہونے دی۔،، اس سے پہلے تو میں ایک اور چکر چلاتا تھا"۔ وہ رکا اور متھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اصل میں محکمہ بجلی میں تھا۔ جب میں نے بجلی کے میٹر کو الٹا چلانے کا فن سیکھ لیا، تو میری آمدنی دوگنی ہو گئی۔ میں مہینے کے آخری دنوں میں کچھ لوگوں کے میٹر الٹ کر پیسے جمع کرنے لگا۔ پھر مجھے تیل کی ایک بڑی مل والے نے اسی کام کے لئے ملازم رکھا تو میں نے نوکری بھی چھوڑ دی اور گلی گلی میٹر الٹانے کا دھندہ بھی بند کر دیا۔ کیونکہ مجھے اتنی رقم ملنے لگی تھی جس سے میں مطمئن ہو گیا۔ تمہیں حیرت ہو گی کہ مجھے وہاں سے چھ سو روپے ماہوار ملتے تھے

اس کا مطلب ہوا۔۔۔۔، ٹھیکے دار جلدی سے بولا۔ "بجلی تو وہ مشکل سے پانچ سو روپے کی جلاتا تھا، جسے میں گھما کر سوا سو پر لے آتا تھا۔،،

"تو پھر اسے فائدہ کیا ہوا؟،، ہیرا پوری بات سنے بغیر بے صبری سے بولا۔

"میں یہی بات تو بتانے والا تھا۔۔۔ مگر سنو تو۔،،۔۔۔۔ سگرٹ کو فرش پر رگڑ کر بجھاتے ہوئے اس نے کہا۔ اس طرح وہ اپنا ٹیکس بچاتا تھا۔ انکم ٹیکس والوں نے بجلی کے بلوں کے ذریعے سے جب آمدنی کا اندازہ کرنا شروع کیا تو مجھے اچھی ملازمت مل گئی۔۔۔ اللہ مجھے معاف کرے۔۔۔۔ میں نے ساڑھے تین برس یہی کام کیا ہے۔۔ اور اسی سے ٹھیکے دار بنا ہوں۔،،

وہ آدمی خاموش ہوا، تو ہیرے نے حیرانگی سے دو ایک بار اس کی طرف دیکھا اور بالکل خاموش رہا۔ ابھی چند منٹ پہلے جو ہیرا یہاں موجود تھا۔۔۔ جانے اب وہ کہاں تھا۔

کسی تیز اور کرخت آواز کی بجائے ہیرے نے بڑے نرم لہجے میں اس سے پتہ پوچھا جب وہ بتا چکا تو ہیرا بولا۔ "بس اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ دیکھنا کسی سے راستے میں کچھ کہنا نہیں۔ سمجھے ناں؟"

"سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔۔۔" ٹھیکیدار جلدی سے اٹھا اور مزار کی اندھیری دہلیز سے نکل کر باہر چلا گیا۔

ہیرا باہر آیا تو وہ ڈولتا ہوا اور چار پا تھا۔ وہ کوفت جو ہیرے نے ذہن میں دب سی گئی تھی۔ باہر آتے ہی اس نے دو ایک بار کندھے اچکائے منہ یوں بنایا جیسے کڑواہٹ محسوس کر رہا ہو اور پاؤں کے بل بیٹھ کر بے چینی سے [illegible] گیر کا انتظار کرنے لگا۔

پھر سے خاموشی سے ڈر گئے۔۔۔

پھر اس نے کرب میں لپٹی ہوئی ایسی چیخ سنی کہ تیزی سے گردن موڑتے ہوئے رگوں میں درد جاگ اٹھا۔

اس نے عمر بھر بہت سی چیخیں سن ڈالی تھیں، لڑائیاں دیکھی اور لڑی تھیں، زخموں کی چیخ پکار سنی تھی۔ مگر یہ کیسی چیخ تھی کہ اس کا دل بھی دہل گیا۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا کہ ایک دبلا پتلا مگر پھرتیلا لڑکا پوری رفتار سے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے بھاگنے والا کوئی موٹا سا آدمی ریچھ کا ریچھ تھا، جو دبلے پتلے لڑکے کی چیخ پکار سے ذرا بھی متاثر نہ ہو رہا تھا۔

ہیرا سگریٹ دور پھینک کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے انہی دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا لڑکا کسی سرخی چیتون میں وحشی دبلا دکھائی دینے لگا تھا۔ جب وہ ہیرے کے قریب پہنچا تو لاشعوری طور پر اس سے چمٹ گیا۔ بچاؤ۔۔۔ مجھے بچاؤ۔۔۔ اس کے منہ سے ہکلاہٹ میں وہ ایک بار نکلا اور پھر اس کی آواز گنگ ہو گئی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

لڑکے کے پیچھے بھاگنے والا ریچھ نما آدمی اس غیر متوقع پناہ کو دیکھ کر الٹے قدموں بھاگ گیا۔

ہیرے نے لڑکے کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے پوچھا، "معاملہ کیا ہے؟"

"یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ مجھے چھوڑتے نہیں تھے۔۔۔" لڑکا برابر ہانپ رہا تھا۔

"کون لوگ ــــــ ؟ اور کیوں؟ تو یہاں آ کیسے گیا؟" ہیرے کی آواز میں اطمینان اور دلاسا تھا۔

"میں گانا سننے آیا تھا۔"

"تم۔۔۔" ہیرے نے حیران ہو کر پوچھا۔۔۔ "تم گانا سننے آئے تھے۔"

"ہاں میں آیا تھا،" لڑکا بولا۔۔۔ "میرے پاس دو ہزار روپے تھے"

"تم ابھی بہت چھوٹے دکھائی دیتے ہو۔ اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟"

لڑکا ایک منٹ کے لئے پریشان سا ہو گیا۔ شاید وہ اس سوال کا جواب نہ دینا چاہتا تھا یا اس کے پاس اس سوال کا جواب تھا ہی نہیں۔

"فکر نہ کرو ــــــ" ہیرا اسے چمکار کر بولا۔ "تمہیں اب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا سب کچھ صاف صاف کہہ دو۔۔۔ گھر سے

لیا تھا۔

"اوں ہوں۔۔۔" لڑکا بولا۔

"پھر۔؟"

"چوری کی تھی۔"

چوری؟ تم چوری کر سکتے ہو؟"

"ہاں۔ ہم نے چوری کی تھی۔"

"چوری؟ تم نے چوری کی تھی۔"

"مگر تم چور ہو کر اس آدمی سے کیوں ڈر گئے؟"

"ہم نے چوری ضرور کی تھی۔۔۔ مگر ہم چور نہیں ہیں۔"

"چوری کرنے والا تو چور ہی ہوتا ہے۔"

مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ لڑکا ایک پل تک رکا رہا۔۔۔ پھر بولا۔۔۔ ہم نے تو مذاق میں ایک آدمی کو نقلی پستول دکھایا تھا، بس۔۔۔ وہ ڈر گیا۔۔۔ اور۔۔۔ اپنا تھیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس تھیلے میں ہماری میڈ کے خلاف چار ہزار کے نوٹ تھے۔ ہم نے دو دو ہزار کے نوٹ تقسیم کر لئے۔"

"پولیس نے تمہیں کچھ نہیں کہا؟" ہیرے نے جیب سے سگرٹ نکالا اور پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اتنا جھکا کہ تیلی جلنے سے روشنی اس کی جھولی ہی میں سمٹ گئی۔ ایک لمبا کش لے کر اس نے سگرٹ مٹھی میں اس حد تک چھپا لیا کہ گہرے اندھیرے کے باوجود سگرٹ کی روشنی دبیز تاریکی میں گھل مل گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے بات آگے بڑھائی۔ دوسرے دن پولیس تو اس جگہ آئی ہو گی؟"

"ہاں ہاں وہاں پولیس آئی تھی۔۔۔ مگر حسیناں پارک میں جو کچی آبادی ہے نا؟ وہ تو وہاں سے آئی تھی اور وہیں سے انہوں نے چار پانچ آدمیوں کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے روپے چھیننے کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔

"تمہارے سب ساتھی محفوظ رہے۔"

"جی ہاں۔۔۔ پولیس انہیں پکڑ ہی نہیں سکتی تھی۔"

"وہ کیوں؟" ہیرے نے حیران ہو کر پوچھا

اس لئے کہ۔۔۔ وہ لڑکا اسی لہجے میں بولا۔ "وہ سب کے سب شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ یعنی۔۔۔ یعنی" اس لڑکے کو ایک لمحے تک کوئی معقول لفظ نہ ملا۔ پھر اس نے کہا۔۔۔ یعنی وہ سب کے سب رئیس خاندانوں سے تھے اور پھر سب کے سب بڑے افسروں کے لڑکے تھے۔ میں خود پولیس کے۔۔۔"

اس سے پہلے کہ لڑکا اپنے والد کے متعلق کچھ بتائے، ہیرا بولا۔ تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔"

"کیوں نہیں؟۔۔۔ ہم نے ایک بار ٹیکسی والے کو بھی۔۔۔"

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔تم یہ کہو کہ یہ روپے تم نے خرچ کیسے کئے؟''

''وہ سب کے سب بار میں شراب پینے چلے گئے تھے۔''لڑکا بولا۔۔۔''اور میں گانا سننے چلا آیا۔''

''سنا پھر گانا۔۔؟''

''ہاں۔۔۔گانا تو سنا تھا۔گھر والوں کے ڈر سے میں نے سارا روپیہ تو چھوٹی ولی کو دے دیا۔پھر جب صبح کے تین بجے اور میرا روپیہ بالکل ختم ہو گیا تو طبلہ بجانے والا شخص مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔اس نے مجھے ایسے سگرٹ پلائے کہ مجھے چکر آ گئے۔پھر میں نے دیکھا کہ اس نے میرے سارے کپڑے اتار دیئے مجھ میں کچھ بولنے تک کی سکت نہ تھی۔دوسرے دن میں دوپہر کے بعد جاگا۔مگر کمرہ باہر سے بند تھا۔میں نے دو ایک بار دروازہ بھی کھٹکھٹایا مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا دوپہر سے لے کر اب تک میں اس آدمی کا انتظار کرتا رہا تھا۔یہ تمام وقت میں نے وہاں بیٹھ کر گزارا ہے حالانکہ میرے جسم کا ہر حصہ دکھ رہا تھا۔اب اس آدمی نے دروازہ کھولا ہے تو میں نکل بھاگا ہوں۔اب یہ میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔۔۔کہ آپ کو دیکھ کر بھاگ گیا۔۔۔آپ کون ہیں؟''

میں کوئی بھی ہوں۔''ہیرا بولا۔اسے چھوڑو۔۔۔اب کیا چاہتے ہو' تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔۔۔میں تمہیں گھر چھوڑ آتا۔''ہیرا خود ہی بول پڑا۔مگر مجھے اس وقت بہت ضروری کام ہے۔۔۔اگر تم تھوڑی دیر انتظار کر سکو تو اس گلی کی بغل میں پیر بادشاہ کا مزار ہے وہاں بیٹھو میں فارغ ہو کر تمہیں اپنی گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

لڑکا مزار کے دروازے پر یک منٹ کے لئے جھجکا مگر پھر اندر چلا گیا۔

ہیرے نے سگرٹ کا کش لے کر نگاہ اٹھائی تو مخالف سمت سے بوسیدہ کمبل اوڑھے کوئی شخص جھکا جھکا چلا آ رہا تھا۔ہیرا اس وقت ذرا بھی نہ چونکا۔اس نے چاقو فضا میں ہرانے کی ضرورت محسوس کی،نہ ہی مٹھی میں دبائے ہوئے سگرٹ کو دور پھینکنے کی کوشش،اس نے پہلے کی طرح نہیں بلکہ بڑے سلیقے سے کہا۔''جناب ذرا سنئے''

کمبل میں لپٹا یا آدمی قریب آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

ہیرے نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے چہرے سے کمبل ہٹایا۔یہ آدمی بالکل نوجوان دکھائی دیتا تھا، مگر اندر کو بڑھتی ہوئی آنکھیں جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں۔۔۔۔اور اس گہرے اور سرد اندھیرے میں اس کی زرد رنگت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں جی؟''ہیرے نے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔

''پیسے۔؟''میرے پاس؟؟''نوجوان نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ مزار کے اندر بیٹھا ہوا لڑکا چونک کر گلی میں آ گیا لیکن گلی سے باہر آنے کی جرات اسے بھی نہ ہوئی۔

ہیرا کچھ دیر تک حیرت سے اس نوجوان کا چہرہ تکتا رہا پھر ذرا تلخی سے بولا''بکواس کئے۔۔۔آہستہ بول۔''

مگر نوجوان اسی آواز میں ہنستا چلا گیا۔اسی دوران اس کے ہاتھ سے کوئی چیز گر پڑی۔دونوں اس شے کی طرف لپکے۔ہیرے نے دیکھا۔وہ کتابیں تھیں۔جنہیں اس نوجوان نے جلدی سے اٹھا لیا تھا۔پھر گہری سنجیدہ آواز میں اس نے کہا۔

"میرے پاس پیسے ہوتے تو میں اس پتھریلی سردی میں کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر پڑھنے کی بجائے گھر میں پڑھ سکتا۔" نوجوان کے چہرے پر اتنا کرب امنڈ آیا تھا کہ کچھ اور کہنے کی بجائے اس نے گردن جھکالی۔ اس کا چہرہ دیکھنے سے بھی تلخ دکھائی دینے لگا تھا۔

ہیرے کا سارا غصہ اس ایک جملے نے شرمندگی میں بدل دیا۔ اس نے چاقو بند کر کے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا ۔کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"ایف اے میں۔۔۔"

"اچھا کالج میں پڑھتے ہو خوب۔" ہیرا مسکرایا۔

"پڑھ کیا رہا ہوں۔۔۔کوشش کر رہا ہوں۔" وہ نوجوان بے دلی سے بولا۔ "بوڑھی ماں ہے بے چاری۔ مجھے جج بنانے کے خواب دیکھتے اور لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھتے اس نے دمے کا روگ بھی پال لیا ہے اور آنکھوں کی بینائی بھی کھو دی ہے میں ابھی ایف اے میں ہوں اس کا خیال ہے میں بہت جلد جج بننے والا ہوں مگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں آئندہ دس سال تک جج کیا کچھ کمانے کے قابل بھی نہیں ہو سکوں گا تو شاید وہ پاگل ہو جائے۔ ویسے اب بھی وہ کچھ کچھ پاگل ہو چکی ہے۔ مجھے ابھی سے جج صاحب کہتی ہے۔۔۔ بے چاری۔ مجھے تو اسی کی فکر ہے۔۔۔ خود فاقے بھی برداشت کر لیتا ہوں اور سردی بھی۔ مگر میری ماں اس قابل نہیں کہ وہ ایک دن کا فاقہ برداشت کر سکے یا ایک رات کی سردی۔"

نوجوان خاموش ہوا تو دور دور تک ایک گہرا سناٹا سا تن گیا۔ وہ کتا جو کچھ دیر پہلے مٹی کی بالٹی کے کوڑے کے سامنے کچھ کرید رہا تھا اب دوسرے کتے سے مل کر رو رہا تھا۔ دونوں کتے دردناک آواز میں رو رہے تھے۔۔۔ بین کر رہے تھے۔

ہیرے نے دکھ سے آہ بھری۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھی سیدھے راستے کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا، یہ نوجوان بھی سیدھے راستے کا متلاشی ہے۔ یہ بند گلی میں آ پہنچا ہے میں اس گلی کی دیوار پھلانگ کر بھٹک رہا ہوں۔ اس کے آس پاس دیواریں ہیں اور میرے اردگرد چٹیل میدان ہیں۔

بڑے اضطراب میں اس نے دو ایک بار پھنکار کر اس نوجوان سے کہا۔ "تم جا سکتے ہو۔۔"

نوجوان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندھیرے میں جذب ہو گیا۔

اب کھمبے کے نیچے دونوں کتے پھر زمین کرید رہے تھے۔

ہیرا کچھ دیر ٹہل کر اپنے اضطراب کو کم کرتا رہا۔ پھر اس نے مزار کی گلی میں جا کر چھی چھی کی آواز نکالی۔ نوکدار جوتوں اور تنگ پتلون والا وہ لڑکا باہر آیا تو ہیرے نے اس کا بازو تھام کر کہا۔۔۔ "میں تمہیں گھر چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ تم جوں توں کر کے خود ہی گھر پہنچ جاؤ۔۔۔ ابھی ابھی تم سے قیمتی انسان یہاں سے گزرا ہے۔ وہ پیدل سردی میں ٹھٹھرتا گھر چلا گیا ہے۔۔۔ تم بھی سیدھے گھر چلے جاؤ اور دوبارہ ان الجھے راستوں کی طرف لوٹے تو یہ سوچ لینا کہ پھر سیدھے گھر نہ جا سکو گے۔۔۔ جاؤ۔"

لڑکا گردن جھکا کر آہستہ آہستہ چلا گیا۔

اسی وقت گھنٹے نے تین بجائے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک چکا ہے۔ تھکن کے اس احساس کے ساتھ ہی اسے سردی سے آدبوچا تو اسے چائے یاد آ گئی۔

اسے معلوم تھا کہ اس خان کی حویلی کے شکستہ گیٹ سے اندر داخل ہوں تو رستہ کس گلی میں جا نکلتا ہے۔ بالکل اس گلی میں جہاں ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے ہیں اور ان کوٹھوں کے نیچے۔۔۔ ایک کبھی نہ بند ہونے والا محرم علی کا ہوٹل ہے۔

وہ سیدھا محرم علی کے ہوٹل میں چلا آیا۔ ہوٹل میں ابھی تک کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی کمبل کندھوں پر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

چائے کی پہلی چسکی کے ساتھ اسے خیال آیا کہ پیسہ تو اس کی جیب میں ہے نہیں۔ صرف دس کا ایک نوٹ ہے۔ وہ آستین میں ہے اور جس کا یہاں نکالنا مناسب بھی نہیں۔

اسی ادھیڑ بن میں دو منٹ گزر گئے۔

پھر ایک نعرے کے ساتھ بلائی والا اندر داخل ہوا۔ "ارے۔۔" اس نے کہا۔

ہیرے نے گردن اٹھا کر آنکھیں کھولیں تو بلائی والے کی سنہری مونچھوں سے مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا کہ میز الٹتے الٹتے بچی۔ دونوں بغل گیر ہو کر یوں ملے کہ سب لوگوں نے مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا

اس نے بلائی والے کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔۔۔ تو بلائی والے نے میز پر مکہ مارتے ہوئے ہوٹل کے چھوکرے سے کہہ دو۔ آج کا آرڈر اپنا چلے گا۔ چائے بھی لاؤ اور کھانے کے لئے بھی۔"

پھر اس نے ہیرے سے کہا۔ "کوئی سگرٹ ہے؟"

ہیرے نے تڑپ کر سگرٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "بھی بھرا ہے۔"

کش پینے سے پہلے ہی بلائی والا جھوم گیا۔ اس نے سگرٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگانے سے پہلے سر دیوار سے لگا کر منہ چھت کی طرف کر لیا اور لمبے لمبے کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے سگرٹ کو بڑی احتیاط سے انگلیوں میں سیدھا پکڑ کر بولا۔ آج کھڑے کھڑے دو چار سودے مل گئے تھے۔"

"سودے ــــــ" ہیرے نے تڑپ کر نگاہیں اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں گاڑ دیں۔ "سودے سے تمہارا کیا تعلق؟"

"یہ ناطہ ٹوٹ بھی سکتا ہے بھلا؟" بلائی والا چہک کر بولا۔

"مگر کیوں۔۔۔؟ تم نے تو مدت ہوئی پیٹھ دکھا دی تھی۔"

"ہاں۔" بلائی والا کہنے لگا۔ "میں نے یوں بھی سوچا تھا۔" اس نے ایک لمبا سانس لے کر سگرٹ ہاتھ سے مسل دیا۔ "خیال تھا اس بک بک سے چھوٹ جاؤں گا۔ دو بچوں کا باپ ہوں۔ جوان ہو کر کیا کہیں گے۔ ہمارا باپ دھاڑیا ہے۔ اس کارن میں نے علاقے میں آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"مگر سودے کا چسکا بھی تو مرنے کا ہوتا ہے۔" ہیرا فوراً بولا۔

"ارے نہیں یار۔ ۔ ۔ تو غلط سمجھا۔۔۔۔" بلا کی والا نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے سودا اٹھاتے تھے اور جیل ویل جاتے تھے۔ حد میں معلوم ہوا۔ سودا لوں یا نہ لوں کوئی فرق نہیں۔ جیل جاؤں گا مار بھی کھاؤں گا۔ ورنہ پولیس کا ماہوار ادا کروں۔ انہیں اس بات سے واسطہ نہیں کہ میں سودا لوں یا چھوڑ دوں۔ انہیں تو بس ماہوار کا حصہ چاہیے۔ اور جی حضوری اور خدمت گزاری۔

"تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تم اب شریف آدمی بن چکے ہو۔" ہیرا بولا۔

"جو ایک بار دس نمبریا ہو جائے لوگ اس کی اولاد پر بھی شک کرتے ہیں۔ تم میری شرافت کا رونا رو رہے ہو۔"

چھوکرے سے دوبارہ چائے منگوا کر دونوں پرچ میں انڈیل انڈیل کر پینے لگے۔ اسی دوران بلا کی والا پھر بولا

"آج پہلا دن تھا۔ بڑی گراؤنڈ کے پاس پل پر ڈھائی بجے تک آٹھ چھلڑ کا سودا ہوا۔"

"نکے یا سبزے۔؟" ہیرے نے بے تابی سے پوچھا۔

"سبزے میاں۔ ایک سنرا تو ابھی گرہ نہیں رہا ان میں۔ وہ علاقے کے حوالدار کی پتی تھی۔ معاملہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ آدمی وہ بھی ایمان دار ہے اور زبان اپنی بھی پتھر پر لکیر ہے۔

"گشت اس طرف آ رہی تھی کہ وہ مجھے سائیکل پر آ کر اطلاع دے گیا۔ بلکہ پیچھے بٹھا کر گوروں کے قبرستان تک چھوڑ آیا۔ ایسا سچا انسان کیا کہوں۔۔۔۔ جب تک گشت گراؤنڈ کے پاس پل پر آئی ہو گی۔ میں نے دو سو روپے اور ہتھا لئے تھے ۔۔۔ ایک چھٹر تو حوالدار کا حق تھا ہی۔۔۔۔ تو اپنی سنا۔۔۔۔ کچھ ملا آج۔؟"

"اوں ہوں۔" ہیرے نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کوئی سگرٹ بیڑی بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

وجہ؟"

"کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں اور رہی بیڑیاں تو وہ زمانہ گیا جب لوگوں کے پاس شیفر اور پارکر کی بیٹریاں ہوتی تھیں۔ اب تو سکول کے چھوکرے سے ہیڈ ماسٹر تک ایک ہی آٹھ آنے والی پنسل ہوتی ہے۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔" بلا کی والا حیرت سے بولا۔ "آدمی نیک نیتی سے اڑے پر کھڑا ہو اور خالی رہے ؟"

"ہاں یار ۔۔ تو نے بڑی دور کی بات کی۔ نیت میری ہی خراب تھی۔ کچھ دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ سودے بازی چھوڑ دوں اور کوئی سیدھا راستہ تلاش کروں۔ سو آج میرا ارادہ تھا کہ کوئی بڑا سودا ملے تو لے لوں ورنہ یہ معلوم کروں کہ لوگ کیسے کماتے ہیں۔ شاید میرے لئے وہی راستہ بہتر ہو۔"

"پھر؟" بلا کی والا جلدی سے بولا۔ "معلوم ہوا راستہ؟"

"راستے تو بہت سے ملے ہیں۔ مگر جس پر بھی چلیں۔ اپنے ہی اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔"

بلاکی والا خوشگوار حیرت سے بولا۔ ”میں نہیں سمجھا تمہاری بات؟“

جتنے لوگ آج ملے تھے۔ میں نے سب سے ان کے پیشے کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان سب کا پیشہ اور میرا تمہارا پیشہ ایک ہی ہے۔“

وہ سب دھاڑیے تھے کیا؟“

”نہیں۔“ ہیرا ہنس کر بولا۔ ”یہ بات نہیں بلکہ کوئی خوراک میں زہر ملاتا ہے اور کوئی سیمنٹ میں دریا کی مٹی کوئی ٹیکس بچاتا ہے تو کوئی مذاق میں لوگوں کو لوٹتا اور ہیرا منڈی آ کر لٹتا ہے۔ ایک ان میں اس بھی تھا جو صحیح معنوں میں بھوکا مر رہا تھا۔ سب سے زیادہ ہمدردی مجھے اسی شخص سے ہوئی، مگر میں اس کا پیشہ کیا بتاؤں؟۔۔۔ وہ بھی میری طرح رات کا مسافر تھا۔ وہ کھمبے کے نیچے کھڑا ہو کر رات بھر سردی میں پڑھتا اور روگ خریدتا ہے۔ فاقوں کا علاج تو اس کے پاس ہے نہیں البتہ وہ اپنے جسم میں پلنے والی بیماریوں کا علاج، پڑھ لکھ کر عمر کے آخری حصے میں ضرور کرا سکے گا۔ میرے لئے سب کے سب بے کار تھے۔ عجب پیشہ ہے ان سالوں کا۔۔۔ سب کے سب ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں۔“

”کمال ہے۔“ بلاکی والا بولا۔ ”ان سے تو ہمارا پیشہ باعزت ہے۔ ہم نے تو کبھی ایک دوسرے کو نہیں لوٹا۔“

ہیرے نے مسکرا کر بلاکی والے کی طرف دیکھا۔ بلاکی والے کی سنہری مونچھیں شرارت سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے بات بڑھائی۔ ”یار تو تو سیانا آدمی ہے جو ایک ہی رات میں سب کچھ سمجھ کر سیدھی راہ پر آ گیا۔۔۔ مجھے دیکھو۔۔۔ سال بھر بھٹک کر پہنچا ہوں یہاں۔۔۔ ذرا ہاتھ ادھر کرو تاں۔۔۔؟

ہیرے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو بلاکی والا نے مضبوطی سے تھام کر کہا۔۔۔ لے۔۔۔ تو آج خالی رہا ہے نا۔۔۔ آدھے تو لے لے۔۔۔“ اس نے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہاتھ کی مٹھی میں کچھ نوٹ دے دیئے۔ لمحے بھر کے تردد کے بعد ہیرے نے نوٹ لے لئے۔۔۔ پھر بولا۔۔۔ ”کل کیا پروگرام ہے؟“

کل کا پروگرام تو کل ہی بتا سکوں گا۔۔۔ بس اتنا یاد رکھو بڑا سودا ہے۔ مل کر اٹھائیں گے۔ سولا نے چاہا تو۔۔۔“

”اچھا۔“ ہیرا بولا۔ ”مگر تم ذرا جلدی آ جانا۔ کام سے پہلے مجھے پیر باشا کے مزار پر موم بتیاں بھی جلانا ہیں“۔ ذرا رک کر اس نے بات بڑھائی۔“ میں نے سیدھے راستے کی تلاش میں منت مانی ہوئی ہے۔“

باہر کسی کتے سے کوئی سائیکل سوار ٹکرا گیا تھا۔ کتے کی چیخ سن کر دونوں نے باہر دیکھا جہاں صبح کا دھندلکا پھیل رہا تھا، اونچی منزلوں میں روشنیاں دم توڑ رہی تھیں اور رات بھر جاگنے والے کتے تھوتھنیاں لٹکائے کھولیوں کی طرف جا رہے تھے۔

ادارہ نقوش نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نقوش کے درج ذیل پرچوں کو C. D. پر منتقل کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ درج ذیل پرچے C. D. پر محدود تعداد میں جلد دستیاب ہوں گے۔

قرآن نمبر اوّل، دوم، سوم، چہارم

قرآن نمبر (انگلش ترجمہ) اوّل، دوم

رسولؐ نمبر (مکمل)

افسانہ نمبر - شخصیات نمبر - لاہور نمبر

غزل نمبر - گولڈن جوبلی نمبر

○

نقوش

اردو بازار، لاہور

افسانے
ہی
افسانے
نقوش
گولڈن جوبلی نمبر
پچاس سالہ انتخاب